ایک کمانڈو کی ہنگامہ خیز داستان، حالات نے اسے بھگوڑا بنا دیا تھا

بھگوڑا



ایک کمانڈو فوجی کی ہنگامہ خیز داستان، حالات نے اسے بھگوڑا بنا دیا تھا۔

بھگوڑا

حصہ اول-دوم (یکجا)

(

راوی: عمر جان گنڈہ پور

تحریر: ریاض عاقب کوہلر

میعاری اور خوب صورت کتابیں
باہتمام محمد علی قریشی

باراول	:	2011
قیمت	:	500
مصنف	:	ریاض عاقب کوہلر

القریش پبلشرز لاہور (پاکستان)

انتساب

محترم استاد جناب میجر سید نور کے نام!
جنھوں نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی

اور

اپنے پیارے بیٹے حنظلہ عبدالرحمٰن
کی ماں کی ساس کے نام!
جو ایک بہترین ماں ہیں

پیش لفظ

کسی بھی کتاب کے سب سے بڑے ناقد قارئین ہوتے ہیں۔ایسے قاری جو دلچسپی اور شوق سے ایک کتاب کا مطالعہ کر کے یا تو اسے پسندیدگی کی سند سے نوازتے ہیں یا پھر ناپسندیدہ وغیر دلچسپ قرار دے کر ہمیشہ کے لیے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔

''بھگوڑا'' میرا پہلا ناول ہے۔میں جناب عنایت اللہ مرحوم کے اس مقولے سے سو فیصد متفق ہوں کہ''حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔''لیکن یہ بات بھی شبے سے بالاتر ہے کہ ایک سچ کو قارئین تک پہنچنے کے لیے مصلحت، مجبوری اور مبالغے کے کئی پردے اپنے گرد لپیٹنے پڑتے ہیں۔البتہ مطالعے کے شوقین حضرات کے لیے یہ پردے رنگین شیشوں کے اس چشمے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، جو تیز دھوپ کو چھاؤں کی شکل میں تو بدل دیتا ہے لیکن اس کی تمازت کم نہیں کرسکتا۔''بھگوڑا'' پڑھنے والے قارئین بھی اگر غور کریں گے تو انھیں اپنے اردگرد''بھگوڑا'' کے ایسے کئی کردار چلتے پھرتے نظر آئیں گے جن کے صرف ناموں میں فرق ہوگا مگر بقول شکسپیئر''گلاب کا نام اگر گلاب نہ ہوتا تو کیا اس کی خوشبو بدل جاتی۔'' کے مصداق نام کا فرق شخصیت میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔

خوش قسمتی سے میں یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ''بھگوڑا'' نے کتابی قالب میں ڈھلنے سے پہلے قارئین کی اکثریت سے اپنی پسندیدگی کا ووٹ حاصل کرلیا ہے۔قارئین کے خطوط اور فون کالز کا تانتا بندھ گیا جنھیں اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔اکثر قارئین کی خواہش تھی کہ''بھگوڑا'' کو اس کی قسطیں مکمل ہونے سے پہلے کتابی صورت میں پیش کردیا جائے۔اس وقت تو یہ ممکن نہ ہوسکا البتہ اب ہم قارئین کرام کی ناراضی کا ازالہ کرتے ہوئے''بھگوڑا'' کو کتابی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔مجھے قوی امید ہے کہ نئے پڑھنے والے بھی اسے پڑھ کر اپنے ان پیسوں کا افسوس نہیں کریں گے جو بھگوڑا کی خریداری کی مد میں صرف ہوئے ہوں۔

آخر میں، میں محترم جناب استاد میجر ریٹائرڈ سید نور حالیہ مقیم لندن جنھوں نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی، برادر محترم رزاق شاہد کوہلر جنھوں نے مجھے لکھنے کی تربیت دی اور مدیر''حکایت'' جناب عارف محمود صاحب جنھوں نے ہر قدم پر میری بہترین رہنمائی کی، کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کی بدولت میں اس قابل ہوا کہ قارئین کی عدالت میں خود کو پیش کرسکوں۔اس امید کے ساتھ کہ قارئین کی حوصلہ افزائی سے میں اپنے اگلے ناول''دلدل'' کے ساتھ دوبارہ حاضر ہوں گا۔

آپ تمام کا:
ریاض عاقب کوہلر

Email :aqibkohlar@gmail.com
mob : 03455883954

''یار مجھ سے تو یہ نوکری نہیں ہونے والی، ٹریننگ کی شروعات ہے اور ابھی سے میرے گھٹنوں کے بال بیرنگ جواب دے گئے ہیں۔ سارے جسم میں درد کی لہریں یوں اٹھ رہی ہیں جیسے کسی نے ڈنڈوں سے پٹائی کی ہو؟ یا پھر ایک سو چار ڈگری کا بخار ہو؟ آرام کے لیے یہ نہیں چھوڑتے، چوبیس گھنٹوں میں چار گھنٹے بھی تو نیند کے لیے نہیں ملتے۔ اور کھانے کی صورت حال ملاحظہ ہو۔'' امجد نے ایک ثابت بینگن اُٹھا کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''تُو نے کبھی سنا ہے کہ انڈے اور بینگن یکجا کر کے پکائے جاتے ہوں اور بینگنوں کو کاٹا بھی نہ جاتا ہو؟''

''یہ ٹریننگ ہے بھائی۔ اس میں کھانے کی حالت بھی یہ ہو گی۔'' میں نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور ہمیں جسمانی طور پر مضبوط کرنے کے لیے مشکل قسم کی مشقیں بھی کرائی جائیں گی۔ آخر ہم فوجی بننے آئے ہیں سکول ماسٹر نہیں، ملک کا دفاع کرنا ہے ہم نے؟''

''مخاطب تو تمیز سے کر سکتے ہیں نا......؟''

''تمیز ہی سے کرتے ہیں اور آرڈر دینے کے لیے عاجزانہ لہجہ اختیار نہیں کیا جاتا۔ اگر ایک انسٹرکٹر یوں حکم دے کہ ''بھائی جان پلیز دوڑ کر جاؤ اور اس دیوار کو ہاتھ لگا آؤ'' تو میرا نہیں خیال کہ ہم پیدل بھی چلے جائیں۔''

''چھوڑو اس بحث کو اور کھانا کھاؤ ٹائم کم ہے ابھی تک لباس بھی بدلی کرنا ہے۔'' ظفر نے نوالہ نگلتے ہوئے ہمیں ٹوکا۔

''آپ اپنا مشورہ اپنے پاس رکھیں۔'' امجد نے اسے جھڑکا۔

''بھاڑ میں جاؤ تم لوگ، میں تو گیا پندرہ منٹ رہ گئے ہیں فالن سے۔'' (ٹریننگ کے لیے فوجیوں کو جمع کرنا) یہ کہہ کر ظفر اپنے کمرے کی طرف چل دیا اور ہم بھی اس کے پیچھے ہی ہو لیے کہ ٹائم واقعی کم تھا۔ وسل کسی بھی وقت بج سکتی تھی (فوجیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے زور سے وسل یعنی سیٹی بجائی جاتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام اکٹھے ہو جائیں)۔

ہم نے وردی اُتار کر جلدی سے خاکی نیکر اور سفید بنیاں پہنی۔ (آج کل ٹریننگ سنٹروں میں نیکر بنیان کی بجائے ٹریک سوٹ استعمال ہونے لگے ہیں)۔ ابھی ہم بوٹوں کے تسمے باندھ رہے تھے کہ سیٹی زوردار آواز میں بجنے لگی اور ہم سب دوڑ کر گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ اگلے 40 منٹ میں ہم کبھی دوڑتے، کبھی ڈڈو چال (مینڈک کی طرح چلنا یعنی دونوں پاؤں پر بیٹھ کر جمپ لگانا) کبھی لانگ اپ (ٹانگیں اوپر دیوار کے ساتھ اور سر نیچے) تو کبھی فرنٹ رول (قلابازیوں کے ساتھ آگے کی طرف حرکت کرنا) کرتے نظر آئے۔ چالیس منٹ کے اختتام پر ایک مرتبہ پھر سیٹی بجی اور ہم ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہو گئے۔ مختلف ٹیمیں بنائی گئیں اور ہر ریکروٹ (انڈر ٹریننگ سپاہی) کو اس کی پسندیدہ گیم کھیلنے کے لیے بھیجا گیا۔ ٹریننگ سنٹر میں ہر قسم کے گراؤنڈز بلکہ جمنازیم تک موجود تھا۔ یہ پیریڈ ڈیڑھ گھنٹے پر مشتمل تھا اس کے اختتام پر تمام کو اکٹھا کر کے رات کے لیے آرڈرز سنائے گئے اور پھر ہم گروپوں کی شکل میں اپنی بیرک میں واپس آ گئے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ایک پیریڈ ستارہ شناسی کے متعلق ہوتا تھا کہ کس طرح ہم ستاروں کے ذریعے اپنی سمت سیدھی رکھ سکیں گے۔ بقول امجد۔

''یہ سالے خودحرکت میں رہتے ہیں ہمیں کیا سمت دکھلائیں گے؟''

صبح کواذان سے پہلے اٹھتے اور کمروں کی صفائی بھی خود ہی کرتے کہ یہ بھی ٹریننگ کا حصہ تھا۔ سات بجے پہلا پیریڈ شروع ہوجاتا جو PT (فزیکل ٹریننگ) کا ہوتا اس کے بعد نقشہ بینی (Map Reading) شروع ہوجاتی۔ دو پیریڈ اس کے ہوتے اور اس کے بعد سنگین لڑائی جس سے امجد کو حد درجہ چڑ تھی۔

''یار اتنا ایمونیشن ہے کہ کمرے بھرے پڑے ہیں پھر بھی ہمیں خالی رائفل سے لڑنا سکھا رہے ہیں۔ ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ہم بھگوڑے ہوجائیں۔''

''جس دن سے ٹریننگ شروع ہوئی ہے تم یہی شور مچارہے ہو کہ نوکری نہیں کرنی، بھاگ جاؤں گا۔ درخواست دے دوں گا، اب چلے بھی جاؤ تاکہ ہم تو آرام سے نوکری کرسکیں۔'' ظفر نے امجد کو چھیڑا۔

''یار میں تو چلا جاتا آپ لوگوں کے لیے رکا ہوا ہوں، تاکہ آپ کو ساتھ لے کر جاؤں۔''

''ام تو مارے سات جائے گی یا اپنے گر؟'' عقل خان نے امجد کو ٹوکا

''خان صاحب آپ کی بات نہیں تھی میں ان کے متعلق کہہ رہا تھا۔'' امجد نے ہمارے جانب اشاہ کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عقل خان میں مذاق کو سمجھنے اور برداشت کرنے کی اتنی بھی اہلیت نہیں تھی جتنی مرچ میں مٹھاس یا پھر لسی میں کالک ہوتی ہے۔

''اچا اچا پر ٹیک اے'' (اچھا اچھا پھر ٹھیک ہے)

+ + +

18 ہفتوں کی ٹریننگ کے اختتام پر ہمیں مڈل بریک (ٹریننگ کے درمیان ایک ہفتے کی چھٹی) ملی واپسی پہ امجد ایک دن لیٹ تھا۔ سزا کے طور پر رات کی ٹریننگ کے بعد وہ ایکسٹرا ڈرل کیا کرتا اس ڈرل میں اس کے ہمراہ کچھ اور لڑکے بھی تھے جو اسی کی طرح لیٹ آئے تھے۔ اس ایکسٹرڈرل سے ایک ہفتے کے بعد ان کی خلاصی ہوسکی۔

''میرے باپ کی توبہ اگر آئندہ چھٹی سے لیٹ آیا'' ایکسٹرا ڈرل سے جان چھوٹنے پر امجد نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''تو ٹائم سے آؤ گے؟'' راشد نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں بھئی واپس ہی نہیں آؤں گا۔''

''تیرا یہ جھوٹ ہم شروع دن سے سنتے آرہے ہیں ۔'' ظفر نے چڑتے ہوئے کہا۔

''اور میرا خیال ہے ٹریننگ کے اختتام تک سننا پڑے گا؟''

''تو میرے اس جھوٹ سے تمھیں کیا تکلیف ہے؟''

''صرف مجھے نہیں تمام کو تکلیف ہوتی ہے، تیری انھی باتوں کی بدولت تین چار لڑکے بھگوڑے ہوگئے ہیں؟''

''میری باتوں کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ان کے برتاؤ کی وجہ سے بھاگے ہیں۔'' امجد کا واضح اشارہ ان لوگوں سے چند گز دور بیٹھے ہوئے انسٹرکٹرز کی طرف تھا۔

''بتادوں ان کو؟'' ظفر نے مذاقاً انسٹرکٹر کی طرف رخ کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ امجد اس کی منت سماجت کرتا زور سے سیٹی بجی جو واضح طور پر بریک کے ختم ہونے کا اعلان تھا۔

اگلے چھ ہفتے فائر کی ٹریننگ تھی۔ اس کے بعد جنگی چالوں کے چھ ہفتے اور آخر میں چار ہفتے پریڈ کی تیاری کے تھے جسے پاسنگ آؤٹ پریڈ کہتے ہیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب ہم سنٹر سے وداع ہو کر یونٹوں میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ خوش قسمتی سے میں اور امجد ایک ہی یونٹ میں پوسٹ ہوئے تھے۔ جس وقت ہم مومنٹ آرڈر لے رہے تھے اس وقت وہاں پر موجود ایک آفیسر نے مجھے اور امجد کو سنٹر کی باکسنگ ٹیم کے لیے روک لیا اور اس طرح ہم چھ ماہ بعد یونٹ جا سکے۔

+ + +

یونٹ میں ہم نے بمشکل دو ماہ گزارے تھے کہ ایک دن حکم ملا نئے آنے والے تمام کے تمام پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہو جائیں۔ وہاں پہ ہمیں دوسری یونٹوں کے ینگ سولجر بھی نظر آئے۔ ہم یونٹ کی ترتیب کے ساتھ کھڑے ہو گئے اسی اثناء میں ہم سے مختلف وردی والے چار بندے وہاں پہنچ گئے۔

''یہ کس فوج سے تعلق رکھتے ہیں؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''ان کا تعلق ایس ایس جی سے ہے۔'' امجد نے جواب دیا۔

''ایس ایس جی......؟''

''ہاں! ایس ایس جی، مطلب سپیشل سروس گروپ۔'' امجد نے وضاحت کی۔ ''انھیں کمانڈوز بھی کہتے ہیں۔''

''ان کی آمد کا مقصد؟''

''تمھیں پتا نہیں ہے......؟'' امجد نے حیرانی سے پوچھا اور پھر میرا سر نفی میں ہلتے دیکھ کر معلومات جھاڑنے لگا۔

''یہ ہر سال آتے ہیں اور آرمی کی یونٹوں سے کمانڈو سروس کے خواہش مند افراد کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں نئے سرے سے ٹریننگ کرنی پڑتی ہے۔ ٹریننگ پاس کرنے والوں کو یہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں، ناکام ہونے والے واپس آجاتے ہیں۔'' امجد کی بات بمشکل ختم ہی ہوئی تھی کہ کمانڈوز کا سینئر اپنا اور کمانڈو سروس کا تعارف کرانے لگا۔ وہ صوبیدار تھا۔ اس نے کمانڈو سروس کے اتنے فوائد اور خصوصیات گنوائیں کہ میں نے بے ساختہ امجد سے کہا۔

''امجد! کیا خیال ہے؟ اپنا نام لکھوا نہ لیں؟''

''صرف نام لکھوانے سے یہ سہولتیں میسر نہیں آنے والی حضرت! ٹریننگ بھی کرنی پڑے گی؟''

''ٹریننگ بھی کرلیں گے۔''میں مصر ہوا۔

''تم ضرور مرواؤ گے''۔اس کا لہجہ رودینے والا تھا۔مگر جس وقت کمانڈو صوبیدار نے اعلان کیا کہ خواہش مند افراد آگے آجائیں تو آگے نکلنے والوں میں امجد بھی میرے ساتھ شامل تھا۔تمام کے ضروری کوائف نوٹ کیے گئے۔

''آپ تمام لوگوں کے نام کمانڈو ٹریننگ میں شمولیت کے لیٹرز اسی ماہ جاری کردیے جائیں گے اکتوبر میں باقاعدہ ٹریننگ شروع ہوگی۔''یہ کہہ کر کمانڈوز اپنی جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوگئے اور ہم بھی یونٹ سدھارے۔

ستمبر کے آخری ہفتے میں امجد اور میرے نام کمانڈو ٹریننگ کا لیٹر آگیا اور ہم اپنی یونٹ (جو کہ اس وقت گوجرانوالہ اسٹیشن پر تھی) سے چراٹ (نوشہرہ) آگئے۔ہمارا ٹریننگ کیمپ جلوزئی میں لگایا گیا۔جمعرات کو ہم جلوزئی کیمپ پہنچے اور سنیچر سے ٹریننگ شروع ہوگئی۔پہلے مرحلے میں ہمیں 40 کلومیٹر پیدل چلنا پڑ گیا شام کے آٹھ بجے ہماری روانگی ہوئی اور صبح کے ساڑھے چار بج چکے تھے جب ہم واپس ہوئے۔

''یار جانو اگر یہ شروعات ہے تو اس کے بعد یہ کیا کریں گے ہمارے ساتھ۔''امجد کے منہ میں یہ الفاظ تھے کہ ٹریننگ آفیسر کی گونج دار آواز سنائی دی۔

''تمام لوگ ریسٹ کریں، ناشتا کریں اور اگر سونا ہے تو بے شک سو جائیں۔ٹھیک پونے پانچ بجے دوبارہ فالن ہوگی ساڑھے چار میل ٹیسٹ کے لیے۔''اور امجد کا چہرہ جو آرام کی بات سن کر 200 واٹ کے بلب کی طرح چمکنے لگا تھا۔بات کے ختم ہوتے وقت لوڈشیڈنگ کی زد میں آگیا۔

''ساری رات چلنے کے بعد اتنا زیادہ ریسٹ۔''وہ منہ بسور کر بولا۔''سنا ہے تم نے، پورے پندرہ منٹ کا ریسٹ ہے۔وہ بھی صرف آٹھ گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد۔واہ بھئی میں تو چلا واپس یونٹ۔''

''بیوقوف مت بنو۔''میں نے اسے جھڑکا۔''اگرچہ ٹریننگ مشکل ہے مگر بعد میں سہولیات بھی تو زیادہ ہیں۔''

''ٹریننگ کو مشکل کہنا تو کسر نفسی ہے حضور کی۔وگرنہ اس کو آسانی سے ناممکن کہا جاسکتا ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے سہولیات کا تو ،سہولیات کے لیے زندہ رہے تو ان سے فائدہ اٹھائیں گے نا؟''

''امجد تجھے شکوہ شکایت کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔اگر ٹریننگ کرنی ہے تو کرو، نہیں تو شوق سے واپس یونٹ چلے جاؤ، مجھے ڈی مورال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''جانوت! تو خفا ہو گیا ہے یار میں تو یونھی......''

''کیا یونھی......؟''میں نے قطع کلامی کی۔

''حقیقت بیان کر رہا تھا۔''نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔

ہم دونوں جرابیں تبدیل کر کے سٹارٹنگ پوائنٹ پر پہنچ گئے۔ جہاں سے ساڑھے چار میل کا آغاز ہونا تھا۔ بلکہ ختم ہونے کی جگہ بھی یہی تھی کہ ہم نے سوا دو میل جا کر وہاں پر پہلے سے موجود انسٹرکٹرز سے ٹوکن لے کر واپس اسی جگہ پہنچنا تھا۔

کمانڈو ٹریننگ کے شروع ہوتے ہی تمام سٹوڈنٹس کو جوڑیوں میں حرکت کرنا پڑتی اس کو عرف عام میں بڈی سسٹم کہا جاتا ہے۔ ساتھی کے چناؤ پر انسٹرکٹر کی طرف سے کوئی قدغن نہیں تھی اس لیے میں اور امجد وہاں بھی اکٹھے ہی رہے۔ ساری رات کی بے آرامی اور تھکن کی وجہ سے گو یہ ساڑھے چار میل کافی مشکل لگے لیکن اتنے نہیں کہ ہمیں کمانڈو بننے سے متنفر کر سکتے۔ حالانکہ 300 بندوں نے دوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ میں چونکہ ہر شخص کی مرضی کا گہرا دخل تھا اس لیے ان لوگوں کو ٹریننگ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ باقی کا دن آرام سے گزارا اگلی صبح فزیکل ٹیسٹ تھا۔ آرمی کی نسبت ان کا ٹیسٹ کافی مشکل تھا، لیکن اتفاق سے ہم دونوں جسمانی لحاظ سے فٹ تھے اس لیے ہمیں یہ ٹیسٹ پاس کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وقت گزرتا رہا، ہر آنے والا دن پہلے سے سخت ثابت ہوا۔ آئے روز بڑھتی سختی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ٹریننگ کی ابتدا میں سٹوڈنٹس کی تعداد 2500 تھی جو ایک ماہ بعد 1200 رہ گئی تھی۔ مزید کچھ ٹریننگ گزرنے کے بعد ہمیں پٹھو (Pack) بھی پہننا پڑ گیا اور وہ بھاگ دوڑ جو ہم بغیر پٹھو کے کرتے اب پٹھو پہن کر کرنی پڑتی۔

''ایک بات بتاؤں جانو۔'' امجد نے حسب عادت مجھے مختصر نام سے پکارا اس وقت ہم فائر کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

''بولیں بھئی ماجے صاحب آپ کو کون روک سکتا ہے۔''

''یار مجھے بیسک (Basic) ٹریننگ کے انسٹرکٹر بہت یاد آتے ہیں بلکہ بہت پیارے بھی لگنے لگے ہیں۔ ان قصائیوں کے مقابلے میں وہ فرشتہ رحمت تھے۔''

''ٹریننگ کی سختی اور مشکلات کے علاوہ بھی تجھے کچھ سوجھتا ہے۔'' میں بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کرتا ہوا بولا۔ کیونکہ اگر میں ہنس پڑتا تو انسٹرکٹرز کے پیچھے اس نے لطائف کا پٹارہ کھول لینا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا ''چھٹی کے بارے، ٹریننگ کے ختم ہونے بارے اور اپنی شادی کے بارے ہر وقت فکر مند رہتا ہوں۔''

''چھٹی بھی جلد مل جائے گی۔ ٹریننگ بھی عنقریب اختتام پذیر ہونے والی ہے البتہ تیری شادی ذرا مشکل ہے کہ بقول تیرے، تیری ساس بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی۔''

اور واقعی اگلے ہفتے ہم دونوں کے لیے گھر جا رہے تھے، فوجی اصطلاح میں اس کو نائیٹ پاس کہتے ہیں۔ امجد کا ارادہ بھی یہی تھا کہ یہ دو دن میرے گھر گزارے۔ کیونکہ اس کا گھر کراچی میں تھا اور نوشہرہ سے کراچی دو دن میں پہنچنا تو ممکن تھا واپس آنا بلا شک و شبہ ناممکن تھا۔ امجد کا آبائی گاؤں مانسہرہ سے تھوڑا سا آگے تھا لیکن اس کا والد تلاشِ معاش کے لیے اپنے پورے خاندان کے ساتھ کراچی جا بسا تھا۔

ان کا خاندان امجد کے والدین، تین بہنوں اور امجد پر مشتمل تھا۔امجد اپنی تمام بہنوں سے عمر میں بڑا تھا۔اس کے برعکس میرا خاندان کافی وسیع تھا میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔مجھ سے بڑی ایک بہن اور تین بھائی تھے سب سے بڑے کا نام حاکم جان، اس سے چھوٹا احمد جان اس کے بعد محمد جان اور ان تینوں سے چھوٹی جمیلہ آپا تھی۔ابو جان اچھے خاصے زمیندار تھے تینوں بھائی اپنی زمینیں ہی کاشت کرتے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدنی کا نہیں تھا لیکن زمینوں سے اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ ہمیں نوکری وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔میں فقط اپنی خاندانی روایت کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہوا تھا کیونکہ ہمارے خاندان میں پُرکھوں سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ خاندان کا ایک نہ ایک بندہ ضرور فوج میں شامل ہو اور اپنے گھر میں یہ قرعۂ میرے نام نکلا تھا۔دادا جان کے دو بیٹے تھے ہاشم جان یعنی میرے ابو جان اور فاضل جان یعنی چچا۔چچا فاضل خود بھی آرمی سے حوالدار ریٹائر ہوا تھا۔اس کے بیٹے ابھی کم عمر تھے اور سکول پڑھ رہے تھے۔دو بیٹیاں البتہ جوان تھیں، شازیہ اور سعدیہ۔جس میں شازیہ کی شادی محمد جان اور سعدیہ کی میرے ساتھ ہو چکی تھی۔جمیلہ باجی کی شادی ماموں زاد اسلم بھائی سے ہوئی تھی۔اسی طرح بڑے بھائی حاکم اور احمد دونوں کی شادیاں ماموں کی طرف ہی یعنی اسلم کی بہنوں سے ہوئی تھیں۔ہم تمام بہن بھائیوں کی اپنی اولادیں بھی تھیں میں خود ایک چاند سے بیٹے کا باپ تھا جس کا نام عدنان تھا۔

''جانو تمھارا والد اچھا خاصا زمیندار ہے، تمھیں فوج کی نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' گاڑی سے اُتر کر ہم دونوں پیدل گھر کی طرف جا رہے تھے کہ امجد مستفسر ہوا۔بس سٹاپ سے ہمارا گاؤں چند کلومیٹر دور تھا۔بس اڈے پر تانگے وغیرہ کھڑے تھے لیکن ہم دونوں نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔

''یار ماجے پہلے بھی تجھے کئی مرتبہ یہ بات بتا چکا ہوں کہ فوج کے اندر بھرتی ہونا میری خاندانی روایت ہے۔''

''خاندان میں ایک تُو ہی مرد ہے؟۔''

''نہیں، لیکن پڑھا لکھا صرف میں ہوں۔باقی تینوں کو بچپن ہی سے کاشت کاری کا شوق تھا اور ابھی تک اسی میں جتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے سکول سے بھی وہ اسی لیے بھاگے اور کاشت کاری میں دلچسپی لی تا کہ بھرتی ہونا نہ پڑ جائے۔'' امجد حسب عادت دور کی کوڑی لایا۔

''اگر میں کہوں کہ تُو گدھا ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، صرف دُم کی کمی ہے، سینگ اس کے بھی نہیں ہوتے۔''

''اس میں گدھے پن کی کیا بات ہے؟ سامنے کی بات ہے تیرے بھائی چار سے تین ہونا چاہتے ہیں اس لیے خاندانی روایت کا جھانسا دے کر تجھے فوج میں بھرتی کروا دیا۔''

''تو کون سا واپڈا میں ہے۔'' میں جھلا کر بولا۔

''میں تو غربت کے ہاتھوں مجبور ہوں ورنہ کب کا بھگوڑا ہو چکا ہوتا۔''

''اچھا اب اپنی چونچ بند رکھو، بھائی جان آرہے ہیں۔'' میں نے دور سے حاکم بھائی کو اپنی سمت آتے دیکھ کر کہا۔

''مجھے نظر آرہا ہے، زیادہ شوخ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' امجد چونکہ پہلے بھی میرے گھر آچکا تھا اس لیے انھیں پہچانتا تھا۔

دو دن ہم نے خوب انجوائے کیا۔ امجد شکار کا بہت شوقین تھا۔ بارہ بور بندوق لے کر ہم سارا دن پرندوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔

''عدنان کو دیکھ کر تو میرا بھی جی کرتا ہے کہ جلد از جلد شادی کرلوں؟'' امجد میرے بیٹے عدنان کو اپنے ساتھ لپٹا کر بولا۔

''اتنے لمبے بندے کو کس نے بیٹی دینی ہے۔'' میں نے اس کے لمبے قد کی طرف اشارہ کیا۔

''تم سے تو انچ ادھ انچ کم ہی ہوگا۔ تجھے اگر مل گئی ہے تو کوئی ہمارے لیے بھی دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھی ہوگی۔''

''ماجے صاحب میرے تو چچا کی بیٹی ہے۔''

''ہم بھی ڈھونڈ لیں گے کوئی چچا۔'' وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا

''اچھا یار ڈھونڈ لینا، فی الحال تو کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔'' میں عدنان کو اس کے ہاتھوں سے لے کر زنانے کی بڑھ گیا۔

اگلے دن ہم سویرے ہی گھر سے نکل پڑے تاکہ وقت سے اپنی جگہ پہنچ سکیں۔ دو ہفتوں کے بعد ہم نے منگلا ڈیم پر تیراکی کی ٹریننگ کے لیے جانا تھا۔ میں تو خیر بچپن سے تیراک تھا امجد البتہ تیرائی نہیں جانتا تھا اور اس وجہ سے خوفزدہ بھی تھا۔

''یار اتنی سردی میں تیراکی ؟'' وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔

''فروری میں کون سی سردی ہوتی ہے؟'' میں نے حسبِ عادت اسے چڑایا۔ ''یہ کوئی جنوری تو نہیں ہے۔ اور یوں بھی کمانڈو بننے کے لیے سردی گرمی نہیں دیکھی جاتی اگر موسم کے اثرات ٹریننگ میں مانع ہو جائیں تو کل کلاں جنگ کے میدان میں یہ سہولیات کون مہیا کرے گا؟''

''کل کی کل دیکھی جائے گی تم آج کے بارے سوچو، ایک کلومیٹر مسلسل تیرنا ہے۔ ہم کوئی مچھلی یا بطخ تو ہیں نہیں؟''

''بگلے تو ہونا......؟''

''یہ میں وقت آنے پر پوچھوں گا بگلا بھگت صاحب؟'' وہ جل کر بولا اور میں مسکرا پڑا۔

ٹریننگ کے باقی مراحل کی طرح یہ مرحلہ بھی گزر گیا اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جس میں ہمیں پیراشوٹ کے ذریے جہاز سے جمپ لگانا تھا۔ اس کے بعد لانگ مارچ جو 50 کلومیٹر پر مشتمل ہوتی ہے۔ مع ساز و سامان کے کرنی پڑتی اور پھر سب سے آخری مرحلہ سکیم کا تھا جس میں ایک ہفتا اپنے بندوبست پر ہمیں جنگل میں گزارنا تھا۔

جس دن ہم جمپ کے لیے جہاز میں سوار ہوئے تو ہماری تعداد صرف 120 تھی حالانکہ ٹریننگ کی ابتدا میں ہم 2500 کے قریب تھے۔

''اگر کوئی چھلانگ نہ لگائے تو......؟'' امجد نے جہاز میں سوار ہوتے وقت سرگوشی کی۔

’’وہ خود نیچے پھینک دیں گے۔‘‘ میں اطمینان سے بولا۔

اس نے منہ بنا کہا’’کبھی تسلی نہیں دینی، بس ڈراتے رہنا ہے۔‘‘

لیکن میں اسے جواب دیئے بغیر آنے والے مشکل وقت کے متعلق سوچنے لگ گیا۔ بہ ہر حال یہ مشکل ٹائم بھی بیت گیا اور جتنا اس سے ڈرے ہوئے تھے اتنا ہی انجوائے کیا۔ ٹریننگ کے خاتمے پر ہمیں چھٹی ملی۔ واپسی پر ہم مکمل کمانڈو تھے اور ہماری چھاتی پر کمانڈوز کی شناخت کمانڈو ونگ لگ چکا تھا۔

+ + +

’’نئی بات سنی ہے؟‘‘ ہم میس میں بیٹھے شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ امجد بوٹی کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

’’سناؤ؟ نہیں سنی تو اب سن لوں گا۔‘‘

’’تو سنو‘‘ امجد نے لمبی ڈکار کے ساتھ کھانے کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔’’صبح سے جوڈو کراٹے کا کورس شروع ہے۔‘‘

’’ہاں مجھے پتا ہے۔‘‘ میں اطمینان سے بولا۔’’کمانڈو کی پوری سروس ہی کورسوں پر مشتمل ہے اور ہماری تو ابھی شروعات ہے۔‘‘

’’مارے گئے۔‘‘ امجد ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا اور میں ہنس پڑا۔

وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا ہم دونوں نے تین سال کمانڈو کی سروس میں گزار دیے اس دوران ہم مختلف پیشہ ورانہ کورس کر کے اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے۔

+ + +

میں دس دنوں کی چھٹی پر تھا اور ابو جان کے کمرے میں بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ چچا بھی ادھر ہی موجود تھے اور ابو جان کے ساتھ زمینوں کی بابت کچھ گفتگو کر رہے تھے۔

چچا جان اور ہم ابھی تک ایک حویلی ہی میں رہائش پذیر تھے۔ چچا جان، ابو کو بالکل اپنے باپ کی طرح سمجھتے تھے اسی طرح ہم بہن بھائیوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت پر شفقت تھا۔ البتہ ہماری غلطیوں پر ٹوکنا یا کوئی مناسب سزا دینے کا کام بھی چچا جان ہی کو سرانجام دینا پڑتا۔

’’پتر! پانی تو پلا دو؟‘‘ دورانِ گفتگو چچا جان مجھے مخاطب ہوئے اور میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ چچا جان چونکہ تازہ پانی کو پسند کرتے تھے اس لیے میں گلاس اٹھا کر نلکے کی سمت بڑھ گیا۔ پانی کا گلاس بھر کر لوٹنے ہی لگا تھا کہ میں نے بھائی محمد جان کو تیز قدموں سے چچا فاضل کے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

’’چچا، ابو کے پاس بیٹھے ہیں۔‘‘ میں نے اسے آواز دی۔ اور وہ سر ہلا کر ابو کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ میں بھی جلدی سے اس

کے پیچھے کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بھائی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا مجھے محمد جان کی تیز آواز سنائی دی جس نے میرے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔

''چچا آج پھر چودھریوں کے مویشی ہماری فصل میں گھس گئے تھے۔ میں نے اکبر خان سے شکایت کی تو وہ الٹا میرے گلے پڑ گیا۔ کہہ رہا تھا۔'' جاؤ تم رپٹ لکھوا دو، یا کچھ اور کر سکتے ہو تو کر لو؟۔''

''دیکھا بھائی جان!'' چچا، محمد جان کو جواب دینے کے بجائے ابو جان سے مخاطب ہوئے۔ ''میں اسی زمین کی بات کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی انور خان کے مویشی وقتاً فوقتاً ہماری فصل کا بیڑہ غرق کرتے رہتے ہیں۔ یہ چکر سات آٹھ مہینوں سے چل رہا ہے۔ پہلے پہل تو میں نے نظر انداز کر دیا اور بجائے اس کے کہ اس کے بیٹے احتیاط سے کام لیتے وہ بالکل بے پرواہ ہو گئے پھر میں نے انور خان سے شکایت کی لیکن وہ ہنس کر ٹال گیا، کہہ رہا تھا بھئی تمھاری زمین چاروں طرف سے ہماری زمین میں گھری ہوئی ہے یہ ہمیں بیچ دو اور اس کے بدلے جنگل کی زمین لے لو۔ مگر میرے سختی سے انکار کر دینے پر بولا چلو ہم احتیاط کریں گے۔ ابھی اس بات کو دو دن نہیں گزرے آج پھر یہ واقعہ ہو گیا۔''

''ہوں۔'' ابو جان لمبی سانس لے کر ایک لحظہ کے لیے سوچ میں پڑ گئے اور میں نے اس اثناء میں آگے بڑھ کر چچا کو پانی پیش کر دیا۔

''فاضل! چند دن مزید دیکھو پھر کچھ کرتے ہیں۔''

''ابو جان آٹھ مہینے سے تو دیکھ رہے ہیں۔'' بھائی محمد جان پست آواز میں بولا لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو کنٹرول کیا ہوا ہے، لیکن یہ صرف اس کی نہیں ہم تمام بھائیوں کی عادت تھی کہ ہم ابو جان سے دب کر بات کرتے تھے۔ چچا فاضل سے البتہ ہم ہر قسم کی گفتگو کر لیتے تھے۔ ''اب تو انھوں ہمیں بزدل سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ پچھلے ہفتے ہماری ایک گائے غلطی سے ان کے کھیت میں چلی گئی تھی، انھوں نے اتنی پٹائی کی کہ اس کی پیٹھ پر نشان پڑے گئے اور تو اور آج اکبر خان کہہ رہا تھا کہ یہ زمین سیدھے طریقے سے ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ لینے کے اور طریقے بھی ہمیں آتے ہیں۔''

''خیر ہے پتر!...... چند دن صبر کر لو'' ابو جان اسی طرح ٹھنڈے لہجے میں بولے۔ ''ان کے لینے کے طریقے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد دینے کے طریقے ان کو دکھائیں گے۔''

محمد جان بھائی۔ ''جی ابو جان!'' کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر آ گیا۔

''بھائی محمد جان! تُو نے اسے کہا کچھ نہیں۔'' جب ہم ابو کے کمرے سے تھوڑا دور آ گئے تو میں نے بھائی سے کہا تا کہ ابو جان یا چچا فاضل نہ سن سکیں۔ ''بس اس کی تڑیاں سن کر چچا سے شکایت کرنے چلے آئے۔''

''وہ اکیلا کہاں تھا فوجی صاحب ! دو مسٹنڈے، وہ بے غیرت پہلوان جو زندگی میں بھی کبھی کشتی نہیں جیتے وہ بھی اس کے ساتھ تھے اور میں اکیلا تھا۔ دوسری بات ہے چچا فاضل نے بھی منع کیا ہے کہ کبھی جھگڑا شروع نہیں کرنا۔''

''ابھی تک وہ وہیں ہوں گے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''تو اور کیا؟ شام تک وہیں پھرتے رہتے ہیں ایک ڈیرہ بنایا ہوا ہے جہاں گرمیوں میں بھنگ اور سردیوں میں چرس کا دور چلتا ہے۔''

''چلو پھر انھی کی طرف چلتے ہیں۔'' میں بیرونی دروازے کا رخ کرتے ہوئے بولا۔

''یار فوجی، ابو کو پتا چل گیا تو خفا ہوں گے۔'' محمد جان نے مجھے روکنے کی واجبی سی کوشش کی۔

''ابو جان کو پتا نہیں چلے گا۔ ہم کون سا ہتھیار لے جا رہے ہیں؟۔''

''چلو پھر، جو اللہ نے چاہا۔'' اس نے میرے ہمراہ قدم بڑھا دیئے۔

چودھری انور خان ہمارے گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ اس کے دو بیٹے اکبر خان اور اعظم خان اور ان دونوں سے چھوٹی ایک بیٹی شہلا تھی۔ دونوں بھائی کنوارے پرلے درجے کے بدتمیز اور جھگڑالو تھے۔ ان کی بہن کے متعلق سنا تھا کہ شہر میں اپنے ماموں کے پاس رہتے ہوئے ایم بی بی ایس کر رہی ہے۔ چودھری انور خان ایک دفعہ ناظم بھی منتخب ہو چکا تھا اور اپنے آپ کو بڑی توپ شئے سمجھتا تھا۔ اس کے بیٹے اس سے بھی چند قدم آگے تھے۔ بھرتی سے پہلے بھی چونکہ میں زیادہ تر پڑھائی لکھائی میں مشغول رہا اور بھرتی ہونے کے بعد پردیسی ہو گیا اس لیے چودھری اور اس کے خاندان کے متعلق میری معلومات واجبی سی تھیں۔ محمد جان بھائی ان کے متعلق کافی معلومات رکھتا تھا جو زمینوں تک پہنچتے ہوئے وہ میرے گوش گزار کر چکا تھا۔

''اس وقت وہ ان درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہیں۔'' جیسے ہی چودھری انور کا ڈیرہ نظر آیا محمد جان نے انگلی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ دور سے ہی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تین بندے نظر آ رہے تھے۔ تینوں کا رخ ہماری سمت ہی تھا، لیکن ہمارے قریب پہنچنے پر بھی انھوں نے اٹھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

''کرم شاہ آج تو اپنے ڈیرے پر سرکار نظر آ رہی ہے۔'' اکبر خان نے اپنے ساتھ موجود دونوں چیلوں میں سے کسی ایک سے مخاطب ہوا۔

''جی چودھری جی!'' وہ دونوں یک زبان بولے اس لیے میں کرم شاہ کو نہ پہچان سکا کہ وہ کون ذات شریف ہے۔

''ان تینوں میں اکبر کون ہے؟۔'' میں نے سلام کہنے کی بجائے محمد جان بھائی سے مستفسر ہوا۔ حالانکہ اکبر خان واضح طور پر چہرے بشرے اور لباس سے پہچانا جا رہا تھا، لیکن میرا مقصد اکبر خان کی بے عزتی سے تھا اسی لیے میں نے اسے چودھری اکبر خان کی بجائے صرف اکبر کہا۔

''میں ہوں چودھری اکبر خان فوجی صاحب!'' اکبر خان چارپائی پر سے اچھل کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے اٹھتے ہی دونوں پہلوان بھی جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

اکبر خان ڈیل ڈول میں امجد کے مشابہ تھا البتہ ٹریننگ نے امجد کی باڈی کو مضبوط اور سخت کر دیا تھا اس کے برعکس اکبر خان کی

باڈی سے نرمی جھلک رہی تھی۔
''اگر اپنے آپ کو چودھری کہنے سے بندہ چودھری بن جاتا ہے تو پھر تو آرمی میں موجود سارے فوجی، نائی اور میراثی بھی چودھری ہیں، کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کو چودھری ہی کہتے ہیں۔''
''زبان سنبھال کر بات کرو۔'' وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ اور میں جان بوجھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا میری ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔
''تیری تو......'' وہ غصے سے باؤلا ہو کر میری سمت دوڑا لیکن ابھی مجھ سے دو تین فٹ دور ہی تھا کہ میری بائیں ٹانگ حرکت میں آئی اور چھاتی پر لگنے والی ضرب سے وہ اچھل کر چارپائی پر جا پڑا۔
''اسے سنبھالو بھائی۔'' محمد جان بھائی کو یہ کہتے ہی میں دونوں پہلوانوں کی سمت مڑا۔
''اپنے حریف کا کمزور پہلو اور اپنے مطلوبہ نتائج مدنظر رکھو، طاقت کے بجائے اپنی عقل پر بھروسا کرو، پہل پن اپنے ہاتھ میں رکھو اور دشمن کے حملہ کرنے سے پہلے حملہ کر گزرو۔'' اپنے استاد صوبیدار مراد صاحب کی یہ باتیں میرے دماغ میں اس طرح گونج رہی تھیں۔ جیسے وہ سامنے کھڑے لیکچر دے رہے ہوں۔ میں اُڑتا ہوا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں پہلوان محمد جان یا میرے خلاف کوئی ایکشن لیتے میں ان کے سر پر جا پڑا۔ میرا مقصد چونکہ ان کو عاضی طور پر ناکارہ کرنا تھا اس لیے ایک کی ٹھوڑی پر میں نے دائروی مکا (Counter Punch) جڑ دیا اور وہ اپنی جگہ گر گیا۔ اسی اثناء میں دوسرے نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھے گریبان سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا گریبان اس سے چھڑا سکتا تھا لیکن میں نے اس طرح کی کوئی کوشش نہ کی۔ جیسے ہی اس نے مجھے اپنے قریب کیا میں نے بایاں گھٹنا اوپر اٹھا کر پوری قوت سے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان مارا۔ وہ ''اوغ'' کی آواز سے نیچے جھکتا چلا گیا اور ٹھوڑی پر لگنے والی دوسری ضرب نے اسے بھی ہوش وخیرد سے بیگانہ کر دیا۔
محمد جان اور اکبر خان دونوں گتھم گتھا تھے۔ جس وقت میں دونوں سورماؤں کو بیہوش کر کے ان کی طرف مڑا اس وقت محمد جان اسے نیچے گرا کے تابڑ توڑ مکے برسا رہا تھا نیچے سے اکبر خان بھی اس کوشش میں مصروف تھا۔
''بس بھائی جان چھوڑ دو اس نمونے کو۔'' میں نے محمد جان کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔
''تھوڑا دل تو ٹھنڈا کرنے دیتے۔'' محمد جان پیچھے ہوتے ہوئے بولا۔ میں بھائی کی بات کا جواب دیئے بغیر اکبر خان کی طرف بڑھا جو محمد جان کے پیچھے ہٹنے پر اٹھ کھڑا تھا۔
''چودھری صاحب!'' میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بڑکیں مارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بندے کے اندر کچھ غیرت بھی ہونی چاہیے۔''
''یہ...... یہ...... تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔'' شرمندگی اور غصے کی شدت سے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ میرا ہاتھ گھوما اور چہرے پر لگنے والے زوردار تھپڑ سے وہ کولہوں کے بل پیچھے جا گرا۔
''اس کے بعد اگر ہمارے کھیت میں تمھارے مویشی گھسے......؟'' میرا فقرہ ادھورا ہونے کے باوجود مکمل تھا۔ ''اور اب جاؤ، جو کر

سکتے ہو کرلینا۔ رپورٹ درج کراتے ہو یا جرگہ بلاتے ہو۔"

اکبر خان آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نفرت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا لیکن کچھ کہنے سے گریز کیا۔ میں نے بھی چند لمحے اسے گھورنے کے بعد محمد جان سے کہا۔"چلو بھائی فی الحال اتنا ہی کافی ہے"۔ اور محمد جان بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چل پڑا۔ دونوں پہلوانوں نے ابھی تک اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اگلا دن خاموشی سے گزر گیا اور اس کا مطلب......اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اکبر خان نے شرمندگی کی وجہ سے والد یا بھائی کو یہ بات بتانے سے گریز کیا تھا۔

میں نے سارا دن محمد جان کے ساتھ زمینوں پر گزارا۔ اکبر خان بھی اپنی زمینوں پر پھرتا نظر آیا مگر آج وہ اکیلا تھا۔

وہ گھر پر میری آخری رات تھی اور صبح میں نے واپس جانا تھا۔ پلک جھپکنے میں دس دن چھٹی گزر گئی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا اور بھائی احمد جان کو بھی سارے واقعے سے آگاہ کر دینا۔" گھر سے چلتے وقت میں نے محمد جان بھائی کو نصیحت کے انداز میں کہا۔

"فوجی صاحب!" وہ مسکرایا"اب تم بڑے بھائی کو بھی نصیحتیں کرو گے؟"

"نصیحت نہیں مشورہ دے رہا ہوں۔" جواباً میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اس سے ہاتھ ملا کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باقی گھر والوں سے میں نے پہلے ہی رخصت لے لی تھی۔

حسب معمول میں کسی خاص واقعے کے بغیر یونٹ پہنچ گیا اور جاتے ہی اپنے سینئر کو Night Pass کا بتا دیا۔

اس نے حیرانی سے پوچھا۔"ابھی تو پہنچے ہو بھئی؟"

"سر! گھر میں ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے؟" میں نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"ابھی جانا ہے......؟" وہ مستفسر ہوا۔

"نہیں سر کل صبح نکلوں گا۔"

"ٹھیک ہے صبح ایس جے سی او (سینئر صوبیدار) کو بتا دوں گا پھر جیسے اس کی مرضی"۔ اور میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

"کیوں بھئی! نائیٹ پاس کا کیا چکر ہے، کیا ابھی تک عدنان کی ماں سے جی نہیں بھرا؟" میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی امجد چہکا۔

"نہیں یار! کوئی اور مسئلہ ہے۔"

اور میرے چہرے پر چھائی سنجیدگی دیکھ کر امجد بھی سنجیدہ ہو گیا۔"خیر تو ہے نا بھائی، مجھے بھی کچھ بتاؤ؟"۔ اور میں نے سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''تمھارے علاقے میں چودھری کہاں سے آگئے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یار! ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے انھیں اپنے گاؤں ہی میں دیکھا ہے۔محمد جان بھائی تو کہہ رہا تھا کہ ان کا اصل علاقہ گجرات ہے۔وہاں سے اکبر خان کا دادا ہجرت کر کے یہاں آن بسا کیونکہ اس کا والد دوسری جنگِ عظیم میں لڑتے ہوئے مارا گیا تھا اور انگریز سرکار نے اس کے اکلوتے بیٹے (اکبر خان کے دادا) کو ایک مربع زمین ہمارے علاقے میں الاٹ کر دی تھی۔اس کے بعد اکبر خان کے والد نے بذاتِ خود بھی کافی زمین خریدی اور گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار بن گیا۔''

''اچھا مٹی پاؤ اور سو جاؤ۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔''میں ذرا اپنے نائیٹ پاس کا بتا دوں۔''

''نائیٹ پاس؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''ہاں نائیٹ پاس، تمھارے ساتھ جانا ہے۔'' اور میرے کچھ اور پوچھنے سے پہلے ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم دونوں نائیٹ پاس جا رہے تھے۔میں نے امجد کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔

''دو دن کی روٹی نہیں کھلا سکتا کمینے، پیسے لے لینا کھانے کے۔'' اور میں نے چپ سادھ لی۔

بس سٹاپ پر اتر کر ہم دونوں حسبِ معمول پیدل چل پڑے ابھی ہم گھر سے کچھ دور ہی تھے کہ بھائی احمد جان بھاگتا ہوا گھر سے نکلا اس نے ہاتھ میں رائفل پکڑی ہوئی تھی۔

''کوئی گڑبڑ ہے۔'' احمد جان کو بھاگتا دیکھ کر امجد نے کہا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں اپنی رفتار کو تیز کرتے ہوئے بولا۔اسی اثناء میں احمد جان بھائی نے ہمیں دیکھ لیا تھا اس لیے اس کا رخ ہماری سمت ہو گیا۔

''فوجی یار! چودھری انور خان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہے چچا اور ابو جان بھی ادھر ہی گئے ہوئے ہیں۔میں ہتھیار لینے آیا تھا۔'' قریب آتے ہی وہ بغیر ہمارے پوچھے بتانے لگا۔

''چلو ادھر ہی چلتے ہیں۔'' امجد نے کہا اور ہمارا رخ زمینوں کے جانب ہو گیا۔راستے میں احمد جان بھائی نے ہمیں تفصیلات بتائیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ صبح وہ اور محمد جان زمینوں پر گئے وہاں انور خان اس کے دونوں بیٹے اور ان کے بیٹوں کے دوست پہلے سے موجود تھے۔جیسے ہی یہ پہنچے انور خان انھیں کہنے لگا کہ ہماری زمین کا وہ ٹکڑا جو ان کی زمین کے ساتھ ملا ہوا ہے ان کو بیچ دیا جائے اور اس کے بدلے ہم انور خان کی جنگل کی زمین لے لیں یا پھر رقم لے لیں۔جواباً محمد جان نے کہا کہ اس کی (انور خان) جو زمین ہماری زمین کے ساتھ ملی ہوئی وہ ہمیں بیچ دو۔محمد جان کی بات پر انور خان نے کہا کہ ہم چودھری لوگ اپنی زمین اور بیٹی کا سودا کبھی نہیں کرتے۔اس پر محمد جان بولا تم چودھری ہو تو ہم بھی کوئی چوہڑے نہیں ہیں۔اس طرح باتوں باتوں میں غصے ہو کر انور خان محمد جان اور احمد جان کو گالیاں بکنے

لگا۔محمد جان نے جواباً گالیاں تو نہ بکیں کہ انور خان اس سے عمر میں بڑا تھا البتہ احمد جان کو بھیجا کہ چچا کو بلا لائے۔وہ جب ادھر آیا تو ابو جان بھی ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔اس طرح وہ ان کو یعنی بھائی حاکم، ابو جان اور چچا فاضل کو لے کر جب احمد جان آدھے راستے تک پہنچا تو اسے خیال آیا کہ رائفل بھی ساتھ لے لینی تھی اور رائفل لینے کے لیے وہ واپس گھر آیا تھا۔

احمد جان کی بات ختم ہونے تک ہم زمینوں پر پہنچ چکے تھے۔

فرلانگ بھر دور سے ہی ہمیں چچا فاضل کی گرج دار آواز سنائی دی۔

''انور خان!تم حد سے بڑھ رہے ہو؟''

''حد سے نہیں بڑھ رہا؟اصولی بات کر رہا ہوں۔''انور خان کی آواز میں بھی کافی بلند تھی۔

''یہ کون سا اصول ہے؟۔''چچا فاضل دھاڑا۔''زبردستی ہماری زمین خریدنے کی کوشش کو تم اصولی بات کہہ رہے ہو۔''

''میں تمھارے کھیت کی منڈیر پر چاروں طرف پہرہ کھڑا نہیں کر سکتا۔''انور خان ترکی بہ ترکی بولا۔''ہمارے مویشی تھوڑا سا قریب آتے ہیں اور تم آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو۔''

''تمھارے مویشی تمھارے اپنے کھیت میں کیوں نہیں جاتے۔''حاکم بھائی بولا اس وقت تک ہم ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ انور خان کے ساتھ اس کے دونوں بیٹوں کے علاوہ چار بندے اور بھی کھڑے تھے۔ہمارے پہنچتے ہی دونوں طرف کے بندوں کی تعداد برابر ہو گئی۔چچا فاضل اور ابو جان ایک لمحہ ہماری جانب دیکھنے کے بعد دوبارہ انور خان کی طرف متوجہ ہو گئے۔محمد جان کا چہرہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔اس کے برعکس اکبر خان اور اس کے دونوں ساتھی گھبرا گئے تھے۔

''جانو اس کی موچھیں دیکھ یار جیسے بلی نے منہ میں چوہا پکڑ رکھا ہو۔''انور خان کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی امجد نے پھلجڑی چھوڑی۔اس نے اپنی آواز آہستہ رکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہاں پر موجود تمام افراد نے یہ بات سن لی تھی۔

''تمھاری یہ جرأت کہ ابو جان کے متعلق ایسی بات کہو۔''اعظم خان غصے سے امجد کی طرف بڑھا۔اس نے امجد کی ظاہری جسامت کو دیکھ کر غلط اندازہ لگایا تھا۔اس کے باوجود کہ امجد اور اعظم قد میں برابر تھے،جسمانی لحاظ سے اعظم خان وزنی تھا اور اس سے پہلے کہ اسے کوئی روکتا وہ امجد کے قریب پہنچ چکا تھا،لیکن یہ قربت اسے مہنگی پڑی چھاتی پر لگنے والی ٹھوکر سے وہ اچھل کر پیچھے جا گرا تھا۔

''لڑو مت لڑو مت۔''ابو جان جو کافی دیر سے خاموش کھڑے تھے جلدی سے بولے،لیکن ابو کی نصیحت صرف ہمارے لیے کارگر ہو سکتی تھی غیروں کے لیے نہیں۔اس لیے ان میں موجود دو نئے بندے امجد کی طرف بڑھے۔نئے بندے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اکبر خان اور اس کے ساتھ موجود دونوں پہلوان جن کا ٹاکرا میرے ساتھ ہو چکا تھا۔انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ دونوں امجد کے قریب پہنچتے میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ان دونوں پر جا پڑا۔ایک کے پیٹ میں گھٹنا مارتے ہوئے میں نے دوسرے کی ٹھوڑی پر لیفٹ پنچ جڑ دیا۔وہ دونوں بھی آرام سے اعظم کی جگہ لیٹ گئے۔اس وقت اعظم کھڑا ہو کر سوچ میں پڑ

گیا کہ حملہ کرے یا اپنے بھائی اکبر کے ساتھ آرام سے کھڑا ہو جائے۔ اس کی مشکل چچا فاضل اور بھائی حاکم نے آسان کر دی تھی کہ حاکم بھائی نے مجھے پکڑ لیا اور چچا فاضل نے امجد کو۔

''نہیں پتر جھگڑا نہیں کرتے۔'' چچا فاضل مدبرانہ لہجے میں بولا۔

''چچا جھگڑا ہم نے نہیں انھوں شروع کیا ہے۔''

اپنے بیٹے اور اس کے دوستوں کا حشر دیکھ کر انور خان نے چپ سادھ لی تھی۔

''انور خان اب تو تجھے یقین آ گیا نا کہ زمین تجھے نہیں مل سکتی۔'' ہمارے پیچھے ہٹ آنے پر ابو جان اس سے مخاطب ہوئے۔

''ہاشم جان یہ تو وقت بتائے گا۔'' انور خان ابو کو یہ کہہ کر اپنے بیٹوں کی طرف مڑا۔ ''چلو بیٹا چلتے ہیں۔'' اور وہ تمام ہمیں کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

''چلو ہم بھی چلیں۔'' بھائی حاکم آہستہ سے بولا اور ہم تمام بھی واپس آ گئے۔

''تم اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے؟'' گھر پہنچتے ہی چچا فاضل مستفسر ہوا۔

''وہ...... چچا...... امجد کا جی کر رہا تھا، عدنان کے ساتھ ملنے کو۔'' میں نے بہانہ گھڑا۔ ''اس کو چھٹی ملی تو یہ کہہ رہا تھا کہ عدنان سے مل کر گھر جائے گا میں نے بھی ایک دن کی چھٹی لے لی تا کہ یہ اکیلا خوار نہ ہوتا رہے۔'' اور چچا سر ہلاتا ہوا ابو جان کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ ہم تمام بھائی امجد کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھ گئے۔

''اب انور خان جرگہ بلائے گا؟'' بیٹھک میں بیٹھتے ہی امجد مستفسر ہوا۔

''انور خان کس چیز کا جرگہ بلائے گا؟'' حاکم بھائی حیرانی سے بولا۔ ''جرگہ تو ہم بلوائیں گے کیونکہ جھگڑا کرنے میں پہل انور خان نے کی ہے۔''

''کب بلوائیں گے؟'' امجد نے دوبارہ سوال کیا۔

''میں پوچھتا ہوں چچا جان سے۔'' حاکم بھائی اٹھتا ہوا بولا۔

''چھٹی کتنے دنوں کی ملی ہے امجد بھائی؟'' محمد جان مستفسر ہوا۔

''چھٹی کون سی بھائی، اسی مسئلے کے لیے نائیٹ پاس آئے تھے۔''

''خواہ مخواہ اتنی تکلیف کی۔'' محمد جان تکلف سے بولا۔ ''ہم موجود تو تھے۔''

''تکلیف کون سی میں تو صرف انور خان کے دیدار کے لیے آیا تھا۔''

''وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔'' احمد جان ہنستے ہوئے بولا اور تمام اس کی بات پر ہنس پڑے۔

اگلا دن خاموشی سے گزرا۔ بھائی حاکم نے بتایا کہ ''اگر انور خان نے جرگہ نہ بلوایا تو اس سے اگلے دن ابو جان خود جرگہ بلوا لیں گے۔''

لیکن اس دن انور خان کی طرف سے ایسی کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہ آئی۔اس سے اگلے دن ہماری واپسی تھی لیکن امجد نے اصرار کیا کہ جرگہ سن کر چلے جائیں گے۔

''یار ماجے لیٹ نہ ہو جائیں۔''میں نے تشویش ظاہر کی۔

''پہنچ جائیں گے یار، پانچ چھ گھنٹوں کا تو فاصلہ ہے۔''اور میں خاموش ہو گیا۔

شام کے وقت چچا فاضل گاؤں کے سرکردہ افراد کو اپنا مسئلہ بتا کر جرگہ بٹھانے کے متعلق بتا چکا تھا۔صبح 10 بجے کے قریب جرگہ شروع ہوا۔انور خان اپنے دونوں بیٹوں اور دس بارہ حامیوں کو لے کر پونے دس بجے کے قریب جرگے کی جگہ پہنچ گیا تھا۔

سب سے پہلے چچا فاضل نے جرگے کے ارکان کے سامنے اپنا مسئلہ اور نقطہ نظر واضح کیا۔اس کے بعد انور علی نے اپنا نقطہ نظر بتانے کے ساتھ ساتھ اس دن والی لڑائی کو بھی موضوع گفتگو بنایا کہ کس طرح ہم نے اس کے بیٹے اور بیٹے کے دوستوں کو زدوکوب کیا۔اس کی کوشش یہی تھی کہ مسئلے کا سارا الزام ہم پر آئے۔آخر میں اس نے اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے دعویٰ کیا کہ اس کا مطلب ہرگز نہیں تھا کہ ہاشم جان کی زمین ہتھیا لے۔بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ اس زمین کے بدلے ہاشم جان منہ مانگی رقم یا من پسند زمین لے سکتا ہے۔

دونوں طرف کے دلائل سن جرگے کے ارکان مخمصے میں پڑ گئے اور آخر میں فیصلہ ہوا کہ کل متعلقہ زمین دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔فریقین اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

''اب کیا کریں ماجے؟ فیصلہ تو کل پر ٹل گیا۔''

''کوئی بات نہیں ایک دن لیٹ چلے جائیں گے۔''

''بڑی بے عزتی ہو گی یار، ایسا کرو تم چلے جاؤ اور میری چھٹی کا بتا دینا۔''

''میں تو جانے والا نہیں البتہ تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔''وہ حتمی لہجے میں بولا اور میں نے حجت بازی کرنے کی بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔

رات گئے تک میں امجد کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا لیکن میرا دماغ اپنی جگہ پر حاضر نہیں تھا رہ رہ کر مجھے اپنے لیٹ ہو جانے کا خیال ستاتا رہا۔مختلف قسم کے اندیشے میرے ذہن میں کلبلاتے رہے۔انور خان کے ساتھ جھگڑے کا بھی کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔جاؤں یا نا جاؤں، اس نفی اثبات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

''جانو صاحب!''امجد بے زاری سے بولا۔''میں گندم کی بابت پوچھتا ہوں تو تمھارا جواب چنے کے متعلق ہوتا ہے۔بکری کے استفسار پہ بھینس کے متعلق بتاتے ہو۔یقیناً تمھیں نیند آرہی ہے یا عدنان کی ماں یاد آرہی ہے، اس لیے آپ کی بڑی مہربانی آپ تشریف لے جائیں اور مجھے بھی سونے دیں۔''

میں خاموشی سے اٹھ کر سونے کے لیے چلا آیا۔سعدیہ نے بھی میری ذہنی حالت بھانپ لی کیونکہ اس کے ساتھ بھی میری گفتگو

ہوں ہاں تک محدود رہی۔

''پریشان کیوں ہو؟'' وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''پریشانی کیسی؟'' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن وہ عورت کہاں جو ٹل جائے۔ عورت نام ہی ایسی صنف کا ہے جو مرد کے دکھ درد کو سمجھے، اس کے زخموں پر پیار کا مرہم رکھے، اس کے ذہن سے بدگمانیوں اور اندیشوں کو رفع کرے، لیکن شرط یہ کہ وہ مرد سے محبت کرتی ہو اور میرے ساتھ سعدیہ کی محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ وہ بچپن ہی سے مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور میں!...... مجھے تو اس کے بغیر زندگی گزارنا ہی محال لگتا تھا۔ میں نے اپنے سارے مسائل اور سارے اندیشے سعدیہ کو سونپ دیئے اور خود سو گیا۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح کی نماز بھی قضا ہوگئی، بستر سے نکلنے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اور بستر میں گزارتا کہ اچانک دروازہ کھٹکھٹا کر بھائی محمد جان کمرے میں داخل ہوا اور۔ ''تمھیں ابو جان بلا رہے ہیں''۔ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں نے جلدی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا، صبح کی نماز تو یوں بھی نیند کی نذر ہوگئی تھی البتہ ابو جان کو دکھانے کے لیے میں نے سفید ٹوپی سر پر رکھ لی اور ان کے کمرے کے جانب چل دیا۔ دروازے کو انگلی سے بجا کر اپنی آمد کا اعلان کرتے ہوئے میں کمرے میں داخل ہوا۔ چچا فاضل بھی وہیں بیٹھے تھے۔

''آؤ پتر! بیٹھو۔'' مجھے دیکھتے ہی چچا فاضل بولا اور میں ان کی چارپائی کی پائنتی پر ٹک گیا۔

''امجد پتر سویا ہوا ہے؟'' ابو جان نے ہاتھ میں موجود تسبیح سرہانے کے نیچے رکھ کر مجھ سے پوچھا۔

''پپ...... پتا نہیں ابو جان میں ابھی تک اس کی طرف نہیں جا سکا ہوں۔''

''ہوں۔'' کہہ کر ابو جان تھوڑی دیر سوچ میں ڈوبے رہے اور پھر گویا ہوئے۔

''عمر بیٹا......! جوان آدمی ہمیشہ دل سے سوچتا ہے کیونکہ جوانی دیوانی ہوتی ہے، اسے ہر مسئلے کا حل اپنی طاقت اور قوت میں نظر آتا ہے۔ وہ بھروسا کرتا ہے تو اپنے زور بازو پر۔ اپنے بڑے اسے کمزور اور لاچار نظر آتے ہیں۔ ان کی سوچ تجربہ اور فہم اس کی نظر میں کچھ نہیں ہوتے، لیکن بیٹا! یاد رکھنا، کہ بغیر عقل اور تجربہ کے مسائل کو حل کرنا ایسا ہی ہے جیسے پٹرول کے بغیر گاڑی چلانا۔ طاقت سے مسائل حل نہیں ہوتے پیدا ہوتے ہیں۔ طاقت بلاشبہ اچھی چیز ہے لیکن اس وقت جب اس کو استعمال کرنے والی عقل بھی ساتھ ہو اور اس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں کہ میرے پاس عقل بھی ہے۔'' ابو نے چچا فاضل کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور طاقت کے نام پر تیرے تین بھائی موجود ہیں وہ عمر میں تم سے بڑے ہیں اور طاقت میں بھی کم نہیں، اس لیے یہ سوچ کہ تمھارے بغیر یہ چھوٹا سا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا......؟ بالکل غلط ہے اور اس دن انور خان کے بیٹے کی پٹائی کر کے تم لوگوں نے مسئلے کو سلجھانے کی بجائے الجھا دیا ہے۔ اب شاید تم یہ کہو کہ پہل تو اعظم نے کی تھی امجد پر حملہ کر کے تو یہ صریحاً حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ امجد پتر اس سے پہلے انور خان کا مذاق اُڑا چکا تھا۔ اگر تم خود کو اعظم کی جگہ رکھ کر سوچو تو اس کا فعل تجھے برا نہیں لگے گا۔ باپ کے خلاف ہونے والا مذاق کون برداشت کر سکتا ہے۔ کیا خیال ہے......؟'' ابو جان نے

اچانک پوچھا۔

''جج......جی......جی بالکل!'' میں ہکلا سا گیا۔

''پُتر! پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ انور خان کے لیے ہم کافی ہیں۔ جرگہ بیٹھا ہوا ہے اور اس کا فیصلہ میں نے ہر دو صورت قبول کرنا ہے۔ چاہے اس میں ہمارا فائدہ ہو یا نقصان......تم دونوں ایسا کرو کہ واپس نوکری پر چلے جاؤ۔ میرا خیال ہے پہلے بھی دونوں لیٹ ہو۔ امجد پُتر کو بھی تم نے اس بے کار مسئلہ میں گھسیٹ کر خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔ آئندہ خیال رکھنا کہ اس قسم کی کوئی حرکت بھی مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کرنی۔ تم دونوں ملک وقوم کا سرمایہ ہو اور یہ سرمایہ میں چند کنال زمین پر قربان نہیں کر سکتا اس لیے جرگے کا فیصلہ سننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمھارا چچا سب کچھ لکھ کر تمھیں چٹھی ڈال دے گا۔ سمجھ گئے نا؟''

''جی ابو جان۔'' میں آہستہ سے بولا۔

''اب جاؤ۔ مہمان کو ناشتا کراؤ اور جانے کی تیاری کرو۔ امجد پُتر کو یہ احساس نہیں ہونے دینا کہ میں تمھاری اس حرکت سے خفا ہوا ہوں۔'' اور میں سلام کہہ کر نکل آیا۔

+ + +

''چل بھئی ماجے اپنا دانہ پانی تو یہاں پر پورا ہو چکا ہے۔'' امجد ناشتا کر چکا تو میں نے اسے واپسی کی نوید سنائی۔

''تو جاؤ نا یار! کس نے منع کیا ہے تجھے، میں تو جانے والا نہیں۔''

''بکواس مت کرو، ابو جان سخت خفا ہیں مجھ پر۔''

''تو مت کرنا اس قسم کی حرکتیں؟''

''کس قسم کی حرکتیں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہی چچا جان کو ناراض کرنے والی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''گدھے۔ ابو کو پتا چل گیا ہے کہ ہم چھٹی سے لیٹ ہیں۔''

''تُو نے بتایا ہوگا......؟''

''کیوں......؟ مجھے احمق سمجھ رکھا ہے؟۔''

''میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، پوری دنیا کہتی ہے۔'' اس کا اطمینان برقرار تھا۔

''ماجے تُو بات کو مذاق میں ٹال رہا ہے۔'' میں جلا گیا۔ ''تجھے اندازہ نہیں ہے کہ ہم ابو سے کتنا ڈرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چند کنال زمین کے لیے میں اپنے ملک وقوم کا سرمایہ داؤ پر نہیں لگا سکتا اور وہ جرگے کا فیصلہ ہر دو صورت ماننے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور مجھے حکم دیا ہے کہ With No Time یہاں سے دفع ہو جاؤں اور تجھے خود سے دو قدم آگے رکھوں۔''

''میں خود بات کرتا ہوں چچا جان سے۔'' امجد واپس نہ جانے پر بہ ضد تھا۔

''جب عقل تقسیم ہو رہی تھی نا......تو تم قد وصول کر رہے تھے۔'' میں غصے سے بولا۔

''تم سے تو چند قدم پیچھے ہی تھا۔'' وہ بھی ترکی بہ ترکی بولا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی کرارا سا جواب دیتا۔ ابو جان بیٹھک میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

''امجد پتر! کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں چچا جان۔''

''پتر! بات یہ ہے کہ جب پہلی بار تم ہمارے گھر آئے تھے اسی دن میں نے جان لیا تھا کہ مجھے پانچواں بیٹا مل گیا ہے۔ اور مجھے فخر ہے اس بات پر کہ اپنے گھر کا ذرا سا مسئلہ سنتے ہی تم بھاگتے چلے آئے۔ لیکن پتر! بات یہ ہے کہ اتنے چھوٹے مسئلے پر میں اتنے قیمتی سرمائے کو استعمال نہیں کر سکتا، جب بھی کوئی ایسا مسئلہ ہوا جو ہم سے حل نہ ہونے والا ہو، میں سب سے پہلے آپ لوگوں کو بلاؤں گا۔'' ابو جان نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ٹھیک ہے نا۔'' اور ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب آپ لوگ جائیں۔ جرگے کا فیصلہ سننے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ فیصلہ جو بھی ہوا مجھے قبول ہو گا۔ میں فاضل کو کہوں گا کہ تمھیں چٹھی لکھ دے، اب جلدی کرو تا کہ لیٹ نہ ہو جاؤ۔''

ابو جان نے امجد کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما اور پیٹھ تھپتھپا کر چلے گئے۔ امجد جو میرے ساتھ حجت بازی کر رہا تھا ابو کے کہنے کے بعد ہنسی خوشی واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ دس بجے کے قریب ہم بس سٹاپ پر پہنچ گئے۔ اس سٹاپ پر ہر گھنٹے بعد بس گزرتی جو وہاں سے شہر پہنچاتی تھی۔ دس بجے کی گاڑی میں سواریاں اتنی زیادہ تعداد میں ٹھنسی ہوئی تھیں کہ ہم اس پر سوار ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ دوسری بس نے گیارہ بجے وہاں سے گزرنا تھا۔

امجد بولا۔ ''چلو یار! ہوٹل پر بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرتے ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم دونوں ہوٹل کی چارپائیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ مختلف قسم کے مزدور، ڈرائیور اور فارغ طبقے کے لوگ چارپائیوں پر بیٹھے گپوں میں مشغول تھے۔ ہم دونوں بھی ان میں شامل ہو گئے۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ رہتے تھے جب چارپائیوں پر بیٹھے لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی کیونکہ بس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ لوگ ہوٹل کے مالک کو چائے اور ناشتے وغیرہ کی ادائی کر رہے تھے۔ ہوٹل کا مالک جیرا پہلوان، جو اپنے وقت میں علاقے کا چمپئن تھا چارپائی پر لیٹا سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے بل وصول کر رہا تھا۔ میں اور امجد بھی اس کی جہازی سائز چارپائی کی طرف بڑھ گئے تا کہ ادائی کر سکیں۔ میں نے رقم نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس وقت ایک شخص موٹر سائیکل گھسیٹتا ہوا پہلوان کی چارپائی کے نزدیک پہنچا۔

''آؤ بھئی شیر خان کیا حال ہے۔'' اسے دیکھتے ہی جیران پہلوان چہکا۔

''حال کو چھوڑ جیرے بھائی ذرا موٹر سائیکل کی چابی دو میں تھانے کا چکر لگا آؤں میری موٹر سائیکل میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔''

''خیر تو ہے، تھانے کس لیے؟''۔ جیرے پہلوان نے حیرانی سے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی موٹر سائیکل کی چابی بھی اس کی جانب اچھال دی جس کو کیچ کر کے شیر خان چارپائی کے نزدیک کھڑی جیرے کی نئے ماڈل کی موٹر سائیکل کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''رحمان خیل میں دو قتل ہو گئے ہیں زمین کا مسئلہ تھا۔ میں تھانے میں اطلاع دے دوں۔ تفصیل تجھے واپسی پر بتاؤں گا۔'' یہ کہتے ہی وہ موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا تھانے کی جانب بڑھ گیا۔ تھانہ وہاں سے دو میل آگے سڑک کے کنارے واقع تھا۔ قتل کا لفظ سنتے ہی میں نے ہاتھ میں موجود دس کا نوٹ جیرے پہلوان کی گود میں پھینکا اور بقیہ لئے بغیر اپنے گاؤں کی جانب دوڑا۔ امجد مجھ سے دو قدم آگے تھا۔

آپ لوگ ہمارے بھاگنے کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے......جی ہاں رحمٰن خیل میرے ہی گاؤں کا نام ہے۔

+ + +

ہم دونوں تیز رفتاری کا ریکارڈ توڑتے رحمٰن خیل کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ یوں بھی بھاگنا دوڑنا کمانڈو سروس کا خاصہ ہے، لیکن اس وقت کا دوڑنا کمانڈو سروس کی بہ نسبت رفتار کی وجہ سے مختلف تھا گاؤں کی حدود میں داخل ہونے تک ہمارے سانس پھول چکے تھے۔ مکانات کی حدود کے قریب جا کر امجد رک گیا۔ یہ دوراہا تھا وہاں سے ایک راستا گھر کی طرف اور دوسرا ہماری زمینوں کی طرف جا رہا تھا۔

''کدھر چلیں؟'' اس نے پھولی سانسوں کے درمیان پوچھا اور میں جواب دینے کی بجائے سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ ہم دونوں حادثے کی جگہ سے لاعلم تھے۔

''کسی سے پوچھ لیتے ہیں؟'' مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ دوبارہ بولا اور میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا مگر وہاں نزدیک کوئی بھی موجود نہیں تھا جس سے پوچھا جاتا۔ ایک خیال کے تحت میں گلی کے سرے پر واقع گھر کے دروازے کی جانب بڑھا اور اس سے پہلے کہ میں میرا ہاتھ دستک دینے کے لیے اٹھتا مجھے گلی کے موڑ سے محمد جان بھائی مڑتا نظر آیا اور میں دستک دینے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے محمد جان کی سمت دوڑ پڑا۔ امجد نے بھی غالباً اسے دیکھ لیا تھا کیونکہ مجھے اپنے پیچھے امجد کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''کیا بات ہے......؟'' ہم جیسے ہی دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچے اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہم نے اڈے پر سنا ہے کہ دو قتل ہو گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر تمھارا اس سے کیا تعلق ہے......؟''

''ہم نے سوچا......شاید انور خان کے ساتھ آپ لوگوں......'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ خیر محمد اور سہراب شاہ کے بیٹوں کے مابین فائرنگ ہوئی ہے دونوں طرف کا ایک ایک بندہ ہلاک ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے آج جرگے کی کارروائی بھی مؤخر ہو گئی ہے۔''

''ان کی تو صلح ہو چکی تھی؟''

''صلح......!'' محمد جان تلخی سے ہنسا۔ ''فوجی صاحب، گنڈاپوروں کی صلح اور جنگ بندی سے تم خوب واقف ہو اس کے باوجود صلح

صفائی کی بابت پوچھ رہے ہو۔"

"ٹھیک ہے لیکن فائرنگ کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی نا؟"

"سنا تو یہی ہے کہ خیر محمد کے بیٹے اکمل کو کل سہراب شاہ کے بیٹے فضل شاہ نے بزدلی کا طعنہ دیا تھا وہ دونوں امیر خان بیلدار کی شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے جھگڑا تو اسی وقت بڑھ جاتا لیکن امیر خان اور دوسرے لوگوں کے بیچ میں پڑنے کی وجہ سے بات رفع دفع ہوگئی۔ آج جب فضل شاہ اپنے ماموں زاد اکبر شاہ کے ساتھ زمینوں کی طرف جا رہا تھا، اکمل خاں کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اکمل خان راستے میں ان کی تاک میں چھپا بیٹھا تھا، لیکن افسوس کہ فضل شاہ کو مار کر وہ خود بھی نہ بچ سکا اور اکبر شاہ کی گولی سے موقع پر ہی ختم ہوگیا۔"

"جانو صاحب، ابھی واپس چلو یہ نا ہو کہ اگلی بس بھی نکل جائے۔" محمد جان کی بات ختم ہوتے ہی امجد مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بالکل، تم لوگ جاؤ میں بھی ذرا زمینوں پر پھیرا لگا آؤں کل جرگے کی وجہ سے نہیں جا سکا تھا۔" یہ کہہ محمد جان ہم دونوں سے ہاتھ ملاتا ہوا زمینوں کی جانب بڑھ گیا جبکہ ہم دونوں سٹاپ کی سمت چل دیئے۔

"خیر محمد اور سہراب شاہ کا کیا قصہ ہے؟" اڈے کی سمت آہستہ روی سے چلتے ہوئے امجد مستفسر ہوا۔

"یار ماجے تُو نے ظہور اسلام سے پہلے عربوں کی جہالت کے قصے تو سنے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں...... بلکہ سیرت کی کتابوں میں خود بھی پڑھے ہیں۔"

"بس ظہور اسلام سے پہلے کے عرب اور ہمارے گنڈاپور ایک ہی طرح کی ذہنیت کے مالک ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بت پرست تھے اور یہ کلمہ گو۔ ان کے پاس تیر تلوار تھے اور یہ جدید اسلحہ سے لیس ہیں، جھگڑے انھی کی طرح چھوٹی چھوٹی اور بے معنی باتوں پر کرتے ہیں۔ کتوں کی لڑائی پر قتل۔ مرغوں اور بیٹروں کے مقابلوں میں قتل، خوب صورت اور بے ریش لڑکوں کی وجہ سے قتل۔ الغرض ہلکی سی گالی گلوچ اور طعنوں پر بھی قتل ہو جایا کرتے ہیں۔ خیر محمد اور سہراب شاہ کے مابین لڑائی کی وجہ بھی کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ وہ بھی انھی باتوں سے متعلقہ ایک جہالت خیز بات ہے۔"

"پھر بھی...... کچھ پتا تو چلے؟" امجد اشتیاق آمیز لہجے میں بولا۔

"مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، لیکن تم اصرار کرتے ہو تو سنو۔" میں ایک لحظہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔

"خیر محمد کا چھوٹا بیٹا اجمل خان کافی خوب صورت لڑکا ہے قریباً دو سال پہلے سہراب شاہ نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی، اس نے اپنے والد کو جا کر بتا دیا۔ بس پھر کیا تھا ایک دوسرے پر رائفلیں تن گئیں قریب تھا کہ فائرنگ ہو جاتی سہراب خان جرمانہ بھرنے پر آمادہ ہو گیا اور اپنی حرکت کے بدلے اسے 20 کنال اراضی خیر محمد کے حوالے کرنی پڑی۔ کل غالباً اسی زمین کا طعنہ اکمل کو دیا گیا تھا۔"

"عجیب بات ہے۔" امجد حیرانی سے بولا۔ "چھیڑا تو لڑکیوں کو جاتا ہے آپ کے علاقے میں انوکھا ڈراما شروع ہے۔ اور یہ جرمانے کے طور پر دیت کیسی......؟"

''یہ اس علاقے کا رواج ہے۔ البتہ چھیڑ چھاڑ کے بدلے رقم یا اراضی وغیرہ قبول نہیں کی جاتی یہ خیر محمد کی بے غیرتی تھی کہ وہ جرمانہ لینے پر راضی ہو گیا تھا، لوگوں کو اس بات سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن ایسے راز کہاں چھپتے ہیں؟''

''اگر یوں ہے تو پھر آپ لوگوں کی انور خان کے ساتھ ابھی تک کوئی فائرنگ نہیں ہوئی حالانکہ دو دفعہ ہاتھا پائی ہو چکی ہے؟''

''ایک تو ابو جان گنڈا پور ہوتے ہوئے بھی ٹھنڈی طبیعت کے مالک ہیں۔ دوسرا زیادتی چونکہ انور خان کی طرف سے ہوئی ہے اس لیے ان کی طرف سے فائرنگ کی کوشش نہیں کی گئی۔ ویسے یہ حتمی بات بھی نہیں ہے وہ کسی وقت بھی اس جہالت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔''

ہم ابھی بس اسٹاپ سے چند گز دور تھے کہ بس کا ہارن سنائی دینے لگا۔ رات گئے ہی ہم اپنی جگہ پہنچ سکے تھے۔ سینئر صوبیدار غصے اور تشویش کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا تھا۔

''کہاں مر گئے تھے تم دونوں......؟'' وہ دھاڑا۔

''سر گھر میں پرابلم کھڑی ہو گئی تھی اس لیے......''

''اور تم؟'' وہ امجد سے مخاطب ہوا۔ اس کی نظر میں ہم اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے۔

''میں بھی عمر کے ساتھ تھا۔''

''ٹیلی فون پر یا ٹیلی گرام دے کر مطلع نہیں کر سکتے تھے؟'' وہ غصے سے بولا۔ ''بہر حال صبح تیار رہنا دونوں کو کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیش ہونا ہے''۔ اور ہم سر ہلا کر اپنے کمرے میں آگئے۔

''چل بھئی ماجے صاحب عزت افزائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''جانی میاں عزت آنے جانے والی چیز ہے اور تُو کیوں گھبرا رہا ہے گھبرانا تو مجھے چاہئے۔ تمھارے ساتھ کوئی پہلی مرتبہ تو ایسا نہیں ہو رہا؟''۔ اور میں اس کی بکواس کو نظر انداز کر کے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

+ + +

صبح کے معمولات سے فراغت کے بعد ہم دونوں وردی پہن کر دفتر پہنچ گئے۔ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سید اجلال شاہ ایک سخت گیر ڈسپلن پسند آدمی تھا۔ آفس میں بلا کر ہماری پرابلم سنے بغیر وہ برس پڑا۔

''سخت، نکمے اور نالائق ہو تم دونوں، بغیر اجازت لیٹ آنے کی سزا معلوم ہے؟......تم دونوں کا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔ ایس ایس جی ایک منظم ادارہ ہے اور کمانڈنگ آفیسر ہونے کے ناطے میں نے ہمیشہ ڈسپلن کی پابندی کی اور کروائی ہے۔ تم دونوں کا پچھلا ریکارڈ دیکھتے ہوئے میں اتنی نرمی کر سکتا ہوں کہ تم لوگوں کو گھر بھجوانے کی بجائے آر ٹی یو (Return To Unit) کر دوں۔ اس لیے اب تم دونوں جانے کی تیاری کرو۔'' یہ کہتے ہی اس نے ہمارے ساتھ کھڑے سنیئر کو ہمیں باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔

''مگر سر......''

''نو آرگومینٹ (Argument) لے جاؤ انھیں۔'' اس نے امجد کو بات کرنے کا موقع دیئے بغیر ہمارے ساتھ آئے سنیئر سے کہا اور ہم سیلوٹ کر کے باہر آ گئے۔

یونٹ واپس جانے میں ہماری بڑی سبکی تھی لیکن ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

''اس کو کہتے ہیں لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔'' اپنا سامان پیک کرتے ہوئے میں آہستہ سے بولا۔

''غلط......اس کو کہتے ہیں دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔'' امجد تلخی سے بولا اور میں بے ساختہ مسکرا پڑا۔

''ماجے اتنی چھوٹی باتوں پر پریشان نہیں ہوا کرتے۔ آرمی کی سروس کرنی ہے یہاں نہ سہی یونٹ میں سہی تنخواہ اور راشن پانی وہاں بھی ملے گا۔'' امجد خلاف توقع خاموش رہا۔

سنیئر صوبیدار اور کمپنی کمانڈر نے اپنی سی کوشش کی کہ ہماری سزا پر عمل درآمد رک جائے، مگر انھیں کامیابی نہ ہوئی مجبوراً اگلی صبح ہم Move Order لے کر یونٹ روانہ ہو گئے ہماری سابق یونٹ اس وقت اسکردو تعینات تھی۔ یونٹ پہنچتے ہی میں نے خط لکھ کر گھر والوں کو اپنے نئے ایڈریس سے مطلع کر دیا۔

ہمارا ایک ہفتہ بٹالین ہیڈ کواٹر میں گزرا اس دوران بٹالین کمانڈر سے ہماری ملاقات بھی کرائی گئی، ہمارے واپس آنے پر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

+ + +

اور پھر ایک دن ہم دونوں اگلی (Forward) پوسٹوں پر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے، دونوں نے مختلف پوسٹوں پر جانا تھا۔ گھر سے دوری کے ساتھ اب ہمیں ایک دوسرے سے دوری کا دکھ بھی جھیلنا تھا۔ چار ساڑھے چار سال کی رفاقت نے ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ اطمینان تھا تو صرف اتنا کہ یہ جدائی عارضی تھی۔

سردی بہت زیادہ تھی گرم لباس بھی ہماری کپکپی دور کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ لیکن یہ سردی ہمارے لیے نئی نہیں تھی اس سے پہلے ہم استور (جو کہ گلگت کی تحصیل ہے) کے مضافات میں موجود ٹو سکول میں اس علاقے سے متعلق ایک خصوصی کورس کر چکے تھے۔ امجد کی پارٹی بٹالین ہیڈ کواٹر ہی سے دوسرے راستے پر روانہ ہو گئی جبکہ میں اپنی پارٹی کے ساتھ اس سے مخالف جانب روانہ ہو گیا۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم پوسٹ پر پہنچ سکے۔ پوسٹ پر ٹیلی فون اور وائرلیس کی سہولیات موجود تھیں، لیکن فون عموماً خراب ہی رہتا کیونکہ برفانی تودے گرنے سے فون کی لائن کٹ جاتی تھی، وائرلیس البتہ رابطہ بحال رکھتا لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس کے ذریعے سیکورٹی قائم رکھنا مشکل ہو جاتی، لیکن مجبوری کی وجہ سے وائرلیس کے ذریعے ہی رابطہ بحال رکھا جاتا۔ البتہ آرڈرز وغیرہ پاس کرنے کے لیے کوڈ ورڈز استعمال کیے جاتے تاکہ سیکیورٹی برقرار رہے۔ امجد سے بھی چند مرتبہ گفتگو ہو چکی تھی۔ لیکن بات چیت سلام دعا سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ گھر سے رابطے کا واحد ذریعہ خط تھا جس کا میں شدت سے منتظر تھا۔

ہمارے سیکٹر کی آٹھ پوسٹیں تھیں اور تمام پوسٹیں ایک ہی بیس سے منسلک تھیں بٹالین سے ڈاک وغیرہ بیس تک پہنچائی جاتی اور اس سے آگے تمام پوسٹیں اپنے سامان کی وصولی کے لیے پارٹیاں روانہ کرتیں۔ پارٹیوں کی نقل وحرکت کا انحصار موسم کی صورت حال پر رہتا لیکن عموماً نومبر کے مہینے میں یہ نقل وحرکت 3 ماہ کے لیے بالکل روک دی جاتی کیونکہ اس عرصہ کے درمیان برف بڑی شدت سے گرتی اور اسی وجہ سے برفانی تودے بھی بڑی تعداد میں گرتے تھے۔

گھریلو پریشانی سے قطع نظر یہ علاقہ دل فریب اور دیدہ زیب نظاروں کا مرجع تھا۔ صاف وشفاف فضا میں دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے عجیب منظر پیش کرتے۔ زیادہ بلندی اور درختوں کی غیر موجودی کی وجہ سے گو آکسیجن بہت کم تھی لیکن یہ کمی صرف نقل وحرکت یا جسمانی مشقت کرتے وقت محسوس ہوتی تھی۔ پوسٹ پر ہم لوگوں کا واحد کام ڈیوٹی کی بجا آوری تھا اور اس کے بعد تمام لوگ عموماً تاش کھیلنے میں مشغول رہتے یا Sleeping Bags میں گھس کر گھر اور گاؤں کی یادوں میں کھو جاتے۔ میں البتہ فارغ اوقات میں ہلکی پھلکی جسمانی مشقوں میں وقت گزارنا پسند کرتا۔ پوسٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ حوالدار کامل اور سگنل کا سپاہی ساجد بھی عموماً میری مشقیں دیکھنے آجاتے تھے۔ جوڈو وغیرہ کے داؤ پیچ کے استعمال میں چونکہ دوسرے آدمی کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے جوڈو کی مشق کرتے وقت میں ان دونوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتا اور وہ دونوں بھی کچھ سیکھنے کے شوق میں تختہ مشق بنے رہتے۔ گرنے اور کسی کو اٹھا کر پھینکنے کے لیے برف بڑی ممد معاون ثابت ہوتی ہے۔ تازہ گری ہوئی برف تو فوم سے بھی زیادہ نرم ہوتی ہے۔ رات کو میں بھی ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول ہو جاتا۔ گنڈا پور ہونے کی وجہ سے تاش کا کھیل میری گھٹی میں پڑا تھا۔ پتا بازی اور چالوں میں تو بڑے بڑے جغادری کھلاڑی میری صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے۔ یہ بے چارے تو فقط پتے پھینکنا جانتے تھے۔ اس لیے پہلے دن سے ہی تمام نے مجھے اپنا گرو مان لیا تھا۔ پوسٹ پر ہم ٹوٹل 12 بندے تھے جس میں ایک صوبیدار ایک حوالدار اور باقی تمام سپاہی یا لانس نائیک تھے۔ ایک بندہ ہم نے کھانا پکانے یعنی Cooking وغیرہ کے لیے مختص کیا ہوا تھا۔ باقی کے نو بندے ڈیوٹی دیتے تھے۔

مجھے پوسٹ پر آئے مہینا ہونے کو تھا جب سیکٹر کے بیس پر تمام پوسٹوں کی ڈاک اور ریفریشمنٹ (Refreshment) کا کچھ سامان پہنچا۔ رات کو جب وائرلیس پر آرڈر پاس ہوا تو صوبیدار صاحب نے کہا۔

”صبح سویرے پارٹی بھیج دیں گے۔“ ڈاک کی آمد کا سن کر تمام لوگ خوش ہو گئے تھے۔

”پتا نہیں کن خوش نصیبوں کے خط آئے ہوں گے۔“ میرے قریب سلیپنگ بیگ میں گھسا علی محمد زور سے بڑبڑایا۔

”کل اس ٹائم تک پتا چل جائے گا۔“ غلام محمد بولا۔

”چلو اس ٹائم تک تو خوش ہو لیں۔“ یہ کہتے ہی علی محمد نے اپنا سر بھی بیگ کے اندر کر لیا۔

لیکن ان دونوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ رات کے قریباً دو بجے تھے جب ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوئی اور صبح تک شدت اختیار کر گئی جس سے پارٹی کا جانا مؤخر ہو گیا۔ برف باری پورا ہفتہ جاری رہی، جس دن رکی اسی دن بٹالین ہیڈ کواٹر کی طرف سے

آرڈر پاس ہوا کہ ہر قسم کی موومنٹ (Movement) فروری تک بند کر دی جائے۔

''اس کا مطلب ہے اگر ہمارا خط ہوا بھی تو اگلے تین مہینوں تک ہمیں نہیں مل سکے گا۔'' میں نے علی محمد سے استفسار کیا۔ اس وقت ہم دونوں ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔

''نہیں یار!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر رانی ہمارے سیکٹر کی طرف آنکلی تو ڈاک لے آئے گی۔''

''رانی......؟'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں یار! رانی،...... برف کی رانی...... کتیا ہے۔ سفید رنگ کی۔ ہلکا پھلکا سامان مثلاً ڈاک، سگریٹ نسوار وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے تمام سیکٹرز اسی کو استعمال کرتے ہیں۔''

''تو کیا یہ مستقل کسی پوسٹ پر نہیں ٹکتی؟۔''

''یہ حرکت میں ہی رہتی ہے۔ جس پوسٹ پر پہنچے اس پوسٹ والے ایک دن اپنے پاس رکھ کر گوشت وغیرہ سے اس کی تواضع کرتے ہیں اور اگلے دن دوسری جگہ اپنے کام سے بھیج دیتے ہیں۔''

''رانی صاحبہ کو بتاتے کیسے ہیں کہ اس نے کس پوسٹ پر جانا ہے؟''

''بہت آسان...... جس پوسٹ پر بھیجنا ہوتا ہے اس کی جانب رانی کا رخ کر کے پیچھے سے تھپکی لگاؤ تو رانی سمجھ جاتی ہے اور سیدھے اسی پوسٹ پر پہنچتی ہے۔''

''بڑی مفید کتیا ہے یار!''

''بالکل، اس نے کئی دفعہ لوگوں کو مشکلوں سے نکالا ہے۔ ایک دفعہ تو ہماری ناصر او پی پر صوبیدار صاحب سخت بیمار ہو گیا تھا۔ راستے بند تھے اور بٹالین ہیڈ کوارٹر سے اس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے جو دوائی تجویز کی وہ رانی نے ہی اس کے پاس پہنچائی تھی اور صوبیدار صاحب کی جان بچ گئی تھی۔ اس طرح کئی دفعہ ایسے مراحل بھی آئے ہیں کہ لوگوں کے پاس سگریٹ نسوار ختم ہونے کی صورت میں رانی نے انھیں یہ سب کچھ مہیا کیا۔''

''بڑی بات ہے یار۔'' کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور دل ہی دل رانی کے بیس پر پہنچنے کی دعا مانگنے لگا۔ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی کہ اس سے اگلے دن سیٹ پر بیس والوں نے بتایا کہ رانی کو ہماری سمت ڈاک دے کر بھیجا جا رہا ہے۔''

''کب تک پہنچ جائے گی؟'' میں نے اپنے ساتھ بیٹھے علی محمد سے استفسار کیا۔

''زیادہ سے زیادہ تین گھنٹوں میں۔''

''ہمیں دس گھنٹے لگ جاتے ہیں وہ بھی رستے صاف ہونے کی صورت میں۔''

''وہ رانی ہے......'' وہ فخر سے بولا۔ ''راستے میں بغیر رُکے سفر کرے گی اور ویسے بھی کتے برف میں آسانی سے چل سکتے ہیں۔''

اڑھائی گھنٹے بعد ہم تمام اپنے رہائشی کمرے کی چھت پر کھڑے رانی کا رستا تک رہے تھے۔

''وہ رہی!'' حوالدار کامل نے دور چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔غور سے دیکھنے پر مجھے ایک سفید دھبا حرکت کرتا دکھائی دیا۔اگر اس کا رنگ سفید نہ ہوتا تو شاید وہ کافی دیر پہلے نظر آنا شروع ہوگئی ہوتی۔اگلے آدھے گھنٹے میں رانی پوسٹ پر پہنچ چکی تھی۔رانی کے لیے دودھ گرم کر کے رکھا ہوا تھا اور اس کے بیٹھنے کے لیے آٹے کی خالی بوریاں بچھائی ہوئی تھیں۔وہ اطمینان سے بوریوں پر بیٹھ گئی۔

صوبیدار صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں لٹکی ہوئی ڈاک نکال لی۔تمام لوگ صوبیدار کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

''یہ ہے سپاہی غلام محمد۔''صوبیدار صاحب نے پہلے خط کا پتا پڑھا۔

''چل بھئی گامے۔''میں نے اپنے ساتھ کھڑے غلام محمد کی پیٹھ پر تھپکی لگائی۔صوبیدار صاحب ایک ایک خط نکال کر اس پر موجود ایڈریس پڑھتے اور مطلوبہ شخص جھپٹ کر اپنا خط وصول کر لیتا۔کئی خوش نصیب ایسے تھے جن کے دو، دو، تین، تین خط آئے ہوئے تھے۔خوش قسمتی سے میرے بھی دو خط آئے تھے۔صوبیدار صاحب کے ہاتھوں میں موجود خطوط کا بنڈل جیسے ہی ختم ہوا تمام لوگ اپنا اپنا خط کھول کر پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔میں نے بھی ''بسم اللہ'' کہہ کر پہلا خط کھولا اس پر کمانڈو یونٹ کا پتا لکھا ہوا تھا۔غالباً چچا افضال نے پہلا خط میرے پرانے پتا پر بھیجا تھا اور کمانڈوز نے اسے یونٹ کے ایڈریس پر ارسال کر دیا تھا۔خط میں سلام ودعا کے بعد چچا افضال نے جرگے کی کارروائی کے متعلق لکھا تھا کہ جرگے نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا ہے اور چودھری انور کو منہ کی کھانی پڑی۔خط پڑھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی لیکن یہ خوشی دوسرا خط پڑھ کر تشویش میں بدل گئی۔یہ پہلے خط کے مقابلے میں مختصر تھا۔چچا نے لکھا تھا،''جتنی جلدی ہو سکے چھٹی لے کر گھر پہنچو حالات بہت خراب ہیں۔میں تاکیداً دوبارہ لکھ رہا ہوں کہ خط ملتے ہی روانہ ہو جانا۔چاہے چھٹی ملے یا نہ ملے۔''میں نے خط پر لکھی تاریخ دیکھی دس دن پہلے کا لکھا ہوا خط تھا،اس کا مطلب تھا کہ راستے میں رکے بغیر یہ مجھ تک پہنچا تھا۔میں نے خط کے مضمون سے نظر اٹھا کر دائیں بائیں گھمائی چاروں طرف دور و نزدیک برف کی چادر اوڑھے پہاڑی سلسلے دکھائی دیے۔

''چھٹی ملے یا نہ ملے آجاؤ۔''میرے دماغ میں چچا افضال کے لکھے الفاظ گونجے۔

''کیسے آجاؤں؟''میں نے خود کلامی کی۔

''کچھ کرنا پڑے گا...... کچھ تو کرنا ہی پڑے گا؟''میری سوچوں میں ہلچل مچ گئی تھی۔

+ + +

رات کو ڈیوٹی کے دوران میں آپریٹر کے پاس پہنچا۔سگنل مین ساجد ڈیوٹی پر بیٹھا تھا۔میں نے اس کو کہا۔

''ساجد بھائی!آج سردی بہت زیادہ ہے اگر آپ دس بارہ منٹ کے لیے باہر چلے جائیں۔میں ذرا گرم ہو لوں۔''

''کیوں نہیں۔''وہ خوش دلی سے بولا۔اور رائفل لے کر باہر چلا گیا۔اس کے باہر جاتے ہی میں نے وائرلیس کا ریسیور پکڑا اور امجد کی پوسٹ کو پکارا۔

’’ٹاپ تھری فار لیاقت اوور!‘‘ (لیاقت امجد کی پوسٹ کا فرضی نام ہے۔ پوسٹوں کے نام بدلنے سے چونکہ کہانی کی سچویشن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس لیے ان کے اصلی نام بتانے سے گریز کیا جارہا ہے۔یوں بھی آرمی سے متعلقہ معلومات شائع کرنے کا آرڈر نہیں اور قارئین کو بھی واقعات سے دلچسپی ہوگی نہ کہ آرمی سے متعلق معلومات سے ’’مصنف‘‘)

’’لیاقت فار ٹاپ تھری سینڈ یور میسج اوور!‘‘

’’نک نیم امجد کو بلاؤ......اوور!‘‘

’’ویٹ۔اوور!‘‘

’’امجد......اوور!‘‘ چند لمحوں بعد ریسیور سے امجد کی آواز گونجی۔

’’امجد تمھارا لاسٹ نمبر اوور۔‘‘ میں نے امجد سے کوڈ ورڈز میں کہا اور اس کا صاف مطلب تھا کہ کوئی خفیہ بات ہے اور امجد اپنے آرمی نمبر (ہر فوجی جوان کو آرمی نمبر الاٹ کیا جاتا ہے جو سیون فگرز پر مشتمل ہوتا ہے) کے لاسٹ 4 فگرز پر مشتمل سیٹ کی فریکوئنسی استعمال کرے۔اس طرح ایک تو بٹالین میں ہماری باتیں نہیں سنی جاسکتی تھیں اور دوسرے امجد بھی اپنے ساتھ موجود آپریٹر کو کسی بہانے دائیں بائیں کرسکتا تھا۔(وائرلیس سیٹ بھی ریڈیو کی طرح کام کرتا ہے اس کی بھی مختلف فریکونسیز ہوتی ہیں دو سیٹوں پر جب ایک ہی فریکوئنسی لگائی جائے تو دونوں کا رابطہ ہو جاتا ہے۔البتہ اس کی رینج ریڈیو سے بہت کم ہوتی ہے۔کچھ وائرلیس سیٹ ایسے بھی ہیں جن سے کافی دور دور تک بات کی جاسکتی ہے لیکن ایسے سیٹ صرف سگنل کور والوں کو ہی ایشو کیے جاتے ہیں اور مخصوص اور اہم مقامات پر استعمال ہوتے ہیں۔)

میں نے مطلوبہ فریکوئنسی سیٹ کی چند ہی لمحوں بعد امجد کی آواز آئی۔’’جانی اوور!‘‘

’’لیس......اوور!‘‘

’’بولونا کیا بات ہے۔میں نے آپریٹر کو چائے بنا
نے کے لیے بھیج دیا ہے۔اوور!‘‘ اور میں نے مختصراً اس کو خط کی آمد اور اپنے اندیشوں کے متعلق بتا دیا۔

’’ٹھیک ہے پرتُو کرنا کیا چاہتا ہے؟......اوور!‘‘ میری ساری بات سن وہ مستفسر ہوا۔

’’میں گھر جانا چاہتا ہوں......اوور!‘‘

’’مشکل بلکہ ناممکن ہے......اوور!‘‘

’’یار کوئی ترکیب سوچو مجھے لگتا ہے گھر میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے......اوور!‘‘

’’اللہ خیر کرے گا یار!ابھی راستوں پر چلنا بھی تو مشکل ہے نا......اوور!‘‘

’’ماجے صاحب میں آج رات کو یہاں سے نکل جاؤں گا آگے اللہ مالک ہے......اوور!‘‘

’’یار بٹالین ہیڈ کو اٹر بات کرو شاید کوئی صورت نکل آئے......اوور!‘‘

''کوئی صورت بھی نہیں نکل سکتی۔ تمام راستے بند ہیں اور ہیلی کاپٹر کا پوسٹ پر پہنچنا یوں بھی ناممکن ہے۔ میرے لیے کمانڈنگ آفیسر دس بندوں کی قربانی نہیں دے سکتا۔ اوور!''

''تُو نے ضرور اپنی جان سے کھیلنا ہے......اوور!'' امجد کی جھلائی ہوئی آواز آئی۔

''میری کامیابی کے لیے دعا کرنا......اوور!''

''یار جانی اگر ایسا ہے تو میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں......اوور!''

''نہیں!'' میں نے سختی سے اس کی بات رد کی۔ ''تم مت جاؤ اپنے وقت پر چھٹی لے کر ہی جانا یہ نا ہو ہم دونوں برف میں پھنس کر اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ دشمن سے بدلہ کون لے گا......اوور!''

''ٹھیک ہے گھر پہنچتے ہی خط ضرور لکھنا۔ ورنہ مجھے پریشانی رہے گی......اوور!''

''اوور اینڈ آل'' کہہ کر میں نے رابطہ ختم کیا اور باہر آ کر ساجد سے رائفل پکڑ کر ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔ رات کے نو بج رہے تھے، دس بجے میری ڈیوٹی ختم ہونا تھی۔ ڈیوٹی کے لیے دوبارہ میں نے دو بجے اٹھنا تھا۔ رہائشی کمرے میں تمام لوگ جاگ رہے تھے۔ احمد علی نامی لڑکے کا بچہ ہوا تھا اور اس کی خوشی میں گانے بجانے کی محفل شروع تھی۔ ککّ انڈوں کا حلوہ، کباب پکوڑے اور چاولوں کی تیاری میں مشغول تھا۔ علی محمد اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ (پوسٹوں پر ہمیں انڈوں کا خشک پاؤڈر ملتا تھا اسی سے ہم آملیٹ اور حلوہ وغیرہ بناتے تھے) دس بجے میں نے ڈیوٹی ختم کی، کمرے میں جا کر اپنا پٹھو اٹھایا اور سٹور میں گھس گیا۔ کسی کی بھی توجہ میری سمت نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت تمام ساتھی حوالدار کامل کی طرف متوجہ تھے جو اپنی سریلی آواز میں کوئی گانا گا رہا تھا۔ میرا ذہن چونکہ ڈسٹرب تھا اس لیے گانوں کے بولوں پر میں توجہ نہ دے سکا۔ پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی میں میں نے راستے کے لیے ضروری سامان پٹھو میں ڈالا اور پٹھو تیار کر کے سٹور میں رکھ کر کمرے میں آ کر چپ چاپ سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ گھر کے متعلق مختلف قسم کے اندیشوں نے مجھے ماحول سے لاتعلق کر دیا تھا۔ میں نامعلوم اور کتنی دیر اسی طرح سوچوں میں گم رہتا کہ اچانک کسی نے سلیپنگ بیگ میرے اوپر سے کھینچا۔

''سو گئے کیا؟'' مجھے خوش دل خان کی آواز سنائی دی۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں یار! بس سر میں درد ہے۔''

''کھانا تیار ہے کھا کر سو جانا۔'' وہ میرا سر سہلاتا ہوا بولا۔

''ہاں چلو۔'' میں اٹھ گیا۔ مجھے بھوک بالکل ہی نہیں تھی۔ لیکن راستے کی مشقتوں اور صعوبتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ کھانا میں نے ضروری سمجھا۔ کھانا کھا کر تمام لوگ ایک مرتبہ پھر تاش کی بازی جما کر بیٹھ گئے، میں سنتری کی بدلی کے لیے تیار ہونے لگا تا کہ وہ کھانا کھا لے۔

''عمر جان تم آرام کرو میں چلا جاتا ہوں۔'' خوشدل خان نے مجھے تیار ہوتا دیکھ کر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

لیکن میں ''مجھے نیند نہیں آرہی۔'' کہہ کر باہر نکل آیا۔ سنتری کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں رائفل دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے سٹور میں گھس گیا۔ سنتری کے کھانا کھانے سے پہلے مجھے نکل جانا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ واپسی پر سنتری نے رائفل اُٹھا کر اپنی ڈیوٹی دینی شروع کر دینی ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ بدلی کرنے والا آدمی رائفل دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے دائیں بائیں ہو گیا ہو۔ فرنٹ والا سنتری البتہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہلتا تھا جب تک اس کی بدلی نہ آ جاتی۔

پٹھو اُٹھا کر میں پوسٹ کی مغربی سمت میں موجود نالے کی طرف بڑھ گیا۔ برف ابھی تک کچی تھی یعنی اس میں پاؤں دھنس رہے تھے ورنہ نالے میں اترنے کے لیے چند منٹ ہی لگتے۔ جنوری فروری میں جب برف سخت ہو جاتی تو اترائی میں چلنے کی بجائے پھسل کر جانا پڑتا اور گھنٹوں کے فاصلے منٹوں میں طے ہوتے۔ میرا اور امجد کا اس علاقے میں بہت کم وقت گزرا تھا لیکن اس کے باوجود ہم برفانی علاقے میں رہنے کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی وجہ کمانڈو سروس کے دوران کیے جانے والا وہ کورس تھا جو ہم دونوں نے رٹو سکول میں کیا تھا۔

ٹاپ تھری سے بیس پر جانے کے لیے عموماً شمالی جانب کا راستا اختیار کیا جاتا۔ مغربی سمت میں اتر کر بھی میں نے شمالی نالے میں ہی سفر کرنا تھا لیکن اس طرف بیس راستے میں نہ آتا اور میں اپنے سنتریوں سے بچ کر نکل سکتا تھا۔ گھپ اندھیرا تھا اور راستا نظر نہیں آ رہا تھا دھند کی وجہ سے میں ستاروں کو بھی اپنے گائیڈ کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ نالے میں اترتے ہوئے مجھے پون گھنٹا لگ گیا۔ ٹارچ جلائے بغیر میں اندازے سے شمال کی طرف نالے میں بڑھ گیا تازہ پڑی برف کی وجہ سے میں رینگنے کی رفتار سے حرکت کر رہا تھا۔

اس علاقے میں سرحد کی تقسیم بڑے عجیب انداز میں ہوئی ہے۔ جس جگہ بھی دونوں ملکوں کی آرمی کو پوسٹ کے لیے مناسب جگہ ملی وہیں پوسٹ بنا دی گئی اس لیے کئی جگہیں تو ایسی ہیں کہ ہماری پوسٹیں دشمن کے علاقے میں گہرائی تک چلی گئیں ہیں اور کہیں وہ دور تک ہمارے علاقے میں گھس آئے ہیں۔ ایک دوسرے پر فائر کھولے رکھنا روزانہ کا معمول تھا۔

پوسٹ پر کسی نے ہاتھ سے اردگرد کے علاقے کا نقشہ بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے نقشے سے بھی مجھے اس علاقے کو سمجھنے میں کافی مدد ملی تھی۔ اگر میں مسلسل تین دن چلتا رہتا تو روڈ تک پہنچ سکتا تھا جہاں سے مجھے سکردو کے لیے گاڑی مل جاتی۔ برف گو نرم تھی لیکن میرے ارادوں کو متزلزل کرنے میں ناکام رہی۔ کچھ دور آنے کے بعد راستا نیچے کی طرف اترنا شروع ہو گیا اور میری رفتار بڑھ گئی۔ ٹاپ تھری سے ہموار نظر آنے والا نالا اب ڈھلوان کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میں چلتے چلتے گاؤں کے خیالوں میں کھو گیا۔ گھر والوں کے بارے سوچ کر راستے کی دشواری کا احساس مٹ گیا تھا۔ ابو جان، چچا جان اور بھائیوں کی شکلیں میرے دماغ میں گھوم رہی تھیں نہ جانے ان میں کون مجھے واپسی پر نہ ملتا۔ راستے میں ایک دو موڑ آئے میں لیکن میں نے مغربی سمت ہی اختیار کی۔

''پوسٹ پر اب تک میرے بھاگنے کا پتا چل گیا ہوگا۔'' میرے ذہن میں سوچ ابھری اور تصدیق کے لیے میں نے اپنی گھڑی کے چمکتے ڈائل پر نظر دوڑائی، سوئیاں اڑھائی بجنے کا اعلان کر رہی تھیں مجھے چلتے ہوئے قریباً تین گھنٹے ہونے کو تھے۔ چند لمحوں کے لیے رک

کر میں نے سانس درست کیا پٹھو سے واٹر بوتل نکال ایک دو گھونٹ پانی پیا اور دوبارہ چل پڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ صبح روشنی ہونے کے بعد اگر موقع ملے تو تھوڑی دیر آرام کروں ورنہ چلتا رہوں دو تین دنوں کا راشن میرے پٹھو میں تھا۔ صبح آہستہ آہستہ طلوع ہونے لگی لیکن دھند کی وجہ سے اردگرد کے منظر صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ تھوڑی دیر رک کر میں نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور ایک مرتبہ پھر ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دیا۔ گیارہ بجے کے قریب دھند چھٹنا شروع ہوئی۔ میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تاکہ بیٹھنے کے لیے کوئی آڑ تلاش کروں۔ اس علاقے میں کسی بھی جگہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے میں اپنے پٹھو میں برفانی علاقے کا مخصوص گرم لباس (جو سنتری ڈیوٹی کے دوران پہنتے تھے) لانا نہ بھولا تھا۔

ایک کھو جیسی جگہ دیکھ کر میں نے پٹھو اتارا اس میں گرم جیکٹ پاجامہ نکال کر پارکے کے اوپر ہی پہن لیا (پارکہ برف کے اندر حرکت کرنے کے لیے پیراشوٹ کپڑے کا بنا ہوا ہلکا پھلکا لباس ہوتا ہے) پٹھو بطور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر میں برف پر ہی لمبا لیٹ گیا۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے میں تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ دھند مکمل طور پر غائب ہو گئی تھی۔ لیٹے لیٹے ہی میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی تاکہ دیکھ سکوں کہ کتنا فاصلہ میں طے کر چکا ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ میں بیس کو کافی پیچھے چھوڑ آیا ہوں، لیکن لیٹے ہوئے اردگرد کے مناظر مجھے نامانوس سے لگے میں بے اختیار اٹھ بیٹھا اور یہ دیکھ کر میں اچھل پڑا کہ میں نے سرحد عبور کر لی ہے اور اب دشمن کے علاقے میں بیٹھا تھا۔ گھر کی پریشانی اس وقت میرے دماغ سے محو ہو گئی اور میں نئی الجھن میں پڑ گیا۔ پیچھے نگاہ دوڑانے پہ مجھے نالے کے درمیان مجھے اپنے پاؤں کے واضح نشان نظر آئے اور یہ نشان دشمن کو میری آمد سے مطلع کر سکتے تھے۔ میں ایک مرتبہ پھر آڑ میں ہو گیا اور موسم کے خراب ہونے کی دعا مانگنے لگا۔ مگر وہ موسم جو بغیر دعا کے ہی اکثر خراب رہتا تھا آج دعا مانگ کے بھی صاف ہی رہا۔ اگر شام تک میں دشمن کی نظر سے محفوظ رہتا تو اندھیرا ہوتے ہی میں واپسی کا سفر طے کر سکتا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی، 12 بجنے والے تھے اس علاقے میں شام کے پانچ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اچھا خاصہ اندھیرا چھا جاتا تھا اور میں اسی وقت ہی واپسی کا سفر شروع کر سکتا تھا۔

میں دشمن کی دو پوسٹوں کے درمیان سے گزر کر آیا تھی ایک پوسٹ نالے کی جنوبی سمت ٹیکری پر تھی اسے لالی پوسٹ کہتے تھے اور دوسری شمالی سمت میں لالی پوسٹ سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر تھی اور لالی ٹو کہلاتی تھی۔ دونوں پوسٹوں کے پاس لامحالہ رات کی دیدبانی میں استعمال ہونے والے آلات موجود ہوں گے مگر دھند کی وجہ سے میں ان کی نظروں سے اوجھل رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر گھڑی کی سوئیوں پر نظر دوڑائی، ابھی تک سوا بارہ بجے تھے۔ ٹائم رینگ رینگ کر گزار رہا تھا۔ میرے چاہنے سے ٹائم کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ موسم اسی طرح صاف وشفاف تھا بلکہ اکا دکا نظر آنے والے بادل بھی آسمان سے غائب ہو گئے تھے۔ اب تو میں یہی دعا مانگ سکتا تھا کہ ''یا الٰہی! دشمن کو ہی چند گھنٹوں کے لیے اندھا کر دے'' لیکن اس وقت میری دعائیں بالکل ہی بے اثر ثابت ہوئیں۔ چند لمحے بعد ہی مجھے اس راستے پر جس پر میں رات کو چل کر آیا تھا۔ چند سفید دھبے دور سے قریب حرکت کرتے نظر آئے۔ میرے چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی میں بھاگ سکتا تھا۔ ہتھیار کے نام پر میرے ہاتھ میں صرف آئس اسٹک تھی

یعنی برف پر چلنے کے لیے مددگار چھڑی۔ ایس ایم جی یا رائفل کے مقابلے میں یہ ایسے ہی تھی جیسے ہاتھی کے مقابلے میں چیونٹی۔ دشمن اگر خالی ہاتھ ہوتے تو ان سے لڑ کر بھاگنے کے چانس موجود تھے مگر سوال یہ تھا کہ میں بھاگ کر کہاں جاتا؟ میرے پاؤں کے نشان دشمن کو کھینچ کر میری طرف لا رہے تھے۔ ایک خیال کے تحت میں نے جلدی جلدی اپنے پٹھو کی تلاشی لی لیکن اس میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس سے دشمن میرے ملک کے خلاف کوئی فائدہ اٹھا سکتا۔ میری جیب کے اندر میرے ہاتھ کا بنا ہوا نقشہ اور گھر سے آنے والے دونوں خط موجود تھے۔ نقشہ اور کمانڈو ایڈریس والے خط کا لفافہ میں نے پرزے پرزے کر دیا اور دانتوں سے چبا کر برف میں پھینک دیا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کو میرے کمانڈو ہونے کا پتا چلے۔

آنے والے جلد ہی قریب پہنچ گئے۔ ان کی تعداد پانچ تھی اور تمام نے ہاتھوں میں ایس ایم جی گنیں پکڑی ہوئی تھیں۔ انڈیا کی فوج میں عام طور پر جرمنی کی بنی ہوئی رائفل استعمال ہوتی ہے جسے جی ٹو کہتے ہیں اس کا اصل نام جی ون ہے لیکن انڈیا نے اس کے اندر تھوڑی بہت تبدیلی کر کے اسے G-2 کا نام دے دیا اور پاکستان آرمی میں بھی یہی رائفل تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ G-3 کے نام سے استعمال ہو رہی ہے یہ رائفل قریب و دور ہر دو قسم کی لڑائی میں استعمال ہوتی ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ برفیلے علاقے میں یہ اپنا کام چھوڑ دیتی ہے اور جام ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس علاقے میں دونوں ملکوں کی افواج چائنہ یا روس کی بنی ہوئی ایس ایم جی استعمال کرتی ہیں۔

اس وقت بھی آنے والوں نے یہی گنیں پکڑی ہوئی تھیں اور ان کے خوفناک دھانوں کا رخ سامنے کی جانب تھا۔ ان کے ساتھ مزاحمت کرنا لاحاصل تھا اس لیے ان کے نزدیک پہنچنے سے پہلے میں دونوں ہاتھ اٹھائے ان کے سامنے پہنچ گیا۔ تمام مجھ سے 60,50 گز دور رک گئے۔

''اسی طرح ہاتھ اٹھائے اِدھر آ جاؤ۔'' ان میں سے ایک درشت لہجے میں بولا۔ اور میں آہستہ روی سے ان کی جانب چل پڑا۔ تمام نے اپنی گنوں کا رخ میری جانب کیا ہوا تھا اور میری ہلکی سی بے قاعدگی پر وہ فائر کھولنے کے لیے تیار کھڑے تھے، لیکن میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ان کے قریب جا کر میں رک گیا۔

''روی اس کی تلاشی لو۔'' مجھے بلانے والا تھا اپنے ساتھی سے بولا غالباً وہ ان کا سینئر تھا۔ اس کے رینک کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل تھا کیونکہ پارکے (برفانی لباس) کی وجہ سے اس کا رینک نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں بھی اس علاقے میں وردی کا استعمال نہیں ہوتا تھا تمام لوگ زیادہ تر ٹریک سوٹ وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ البتہ چہرے مہرے سے وہ صوبیدار ہی لگتا تھا (بعد میں میرے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔)

''یس سر۔'' روی نامی جوان آگے بڑھا۔ اپنی رائفل سلنگ اپ کی (یعنی کندھے پر لٹکائی) اور میری تلاشی لینے لگا، لیکن میری

جیب سے سوائے خطوط کے اور کچھ نہ نکلا۔ پانی کی بوتل اور ٹارچ اس نے میری جیب میں رہنے دی تھیں۔

''اس کے پاس کچھ نہیں ہے سر۔''

''یہ کاغذ میرے پاس لے آؤ۔''اس کے سینئر کا اشارہ میرے خطوط کی جانب تھا۔ وہ خطوط لے کر اپنے سینئر کی جانب بڑھا تو میں بولا۔''میں اپنے ہاتھ نیچے کر سکتا ہوں۔''

''کرلو۔''وہ مختصراً بولا اور میں نے اپنے ہاتھ نیچے کر لیے۔

''ہوں۔''دونوں خط پڑھ کر اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولا۔''تو تیرا نام عمر جان ہے...... سامان وغیرہ نہیں ہے تیرے پاس۔''

''ہے''اور اپنے سامان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''وہاں پڑا ہے۔''پٹھو کی تلاشی ان کے لیے لا حاصل رہی تھی۔

''تیرا ہتھیار کدھر ہے۔''ان کا سینئر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ہتھیار میرے پاس نہیں ہے۔''

''صوبیدار صاحب!۔''روی نامی آدمی بولا۔''اس نے اپنا ہتھیار برف میں نہ چھپا دیا ہو۔ روی کی بات سن کر تمام بے اختیار دائیں بائیں دیکھنے لگے جیسے سچ مچ وہاں پر میں نے کوئی ہتھیار برف میں دفن کر رکھا ہے۔

''تمام لوگ دائیں بائیں، ڈھونڈو شاید اس نے برف میں دفن کر رکھا ہو۔''صوبیدار بولا اور چاروں میرے چھپنے کی جگہ کے اردگرد برف میں ڈھونڈنے لگے۔ صوبیدار میری نگرانی کے لیے کھڑا رہا۔

''تیری آمد کا مقصد کیا ہے؟''۔ صوبیدار مستفسر ہوا۔

''سر!۔''اس کے رینک کا احترام کرتے ہوئے میں مؤدب لہجے میں بولا۔''میں ادھر غلطی سے آ گیا ہوں میرا ارادہ اپنے گھر جانے کا تھا۔ یہ دونوں خطوط جو آپ کے پاس ہیں مجھے کل رات موصول ہوئے ہیں اور راستے بند ہونے کی وجہ سے چھٹی کا ملنا مشکل تھا اس لیے میں بغیر چھٹی لیے پوسٹ سے اکیلا بھاگ کھڑا ہوا لیکن بدقسمتی سے بھٹک کر آپ کی طرف آ نکلا۔''

''کہانی اچھی ہے برخوردار لیکن صرف میرے لیے ہماری انویسٹی گیشن ٹیم کو یہ کتنا متاثر کرتی ہے یہ تمھاری قسمت پر منحصر ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ میں موجود واکی ٹاکی کی طرف متوجہ ہوا اور میرے بارے رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''داس فار ٹو اوور۔''

''ٹو فار داس سینڈ یور میسج اوور۔''

''سر ایک ہی پرندہ تھا، پکڑ لیا ہے لیکن چونچ کٹی ہوئی ہے...... اوور۔''(چونچ کٹی ہونے کا مطلب میرے پاس ہتھیار کا نہ ہونا تھا۔)

''ٹھیک ہے اسے نمبر 5 پر پہنچا کر تم لوگ کل واپس آ جانا...... اوور۔''

''یس سر......اوور۔'' دوسری جانب لازماً کوئی افسر تھا اس لیے صوبیدار اس کو سر کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''اوور اینڈ آل۔'' کہہ کر دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ چاروں آدمی اپنی تلاش میں ناکام ہو کر ایک مرتبہ پھر ہمارے نزدیک آن موجود ہوئے تھے۔

''چلو بھئی عمر صاحب۔'' صوبیدار داس طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تیرے چھٹی جانے کے شوق نے ہمیں بھی خوار کر دیا ہے۔''

''اس کو کہاں لے جانا ہے سر؟'' وہ آدمی جو میری رائفل کی تلاش میں کافی دور تک نکل گیا تھا اور وائرلیس سیٹ سے دیئے گئے آرڈر کو نہیں سن سکا تھا مستفسر ہوا۔ حالانکہ اگر اس میں ذرا بھر بھی عقل ہوتی تو وہ اسی جگہ تک تلاشی لیتا جس جگہ تک میرے پاؤں کے نشان بنے ہوئے تھے۔

''اسے گجران پر پہنچا کے واپس آنا ہے۔'' صوبیدار داس کی بجائے روی بولا۔

''اس کا مطلب ہے واپسی کل ہی ہوگی۔'' پہلا آدمی سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اپنا پٹھو اٹھاؤ اور لکشمن کے پیچھے چلو۔'' صوبیدار داس مجھ سے مخاطب ہوا اور میں اپنے پٹھو کے جانب بڑھ گیا جبکہ لکشمن نامی شخص گجران پوسٹ کے راستے پر چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے ہو گیا اور باقی تمام میرے پیچھے سنگل لائن میں چل پڑے صوبیدار داس سب سے آخر میں تھا۔ چلتے چلتے میں نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی تین بجنے والے تھے۔ ہم شام تک چلتے رہے، راستے میں چڑھائیوں کی بہ نسبت اترائیاں زیادہ آئی تھیں اس لیے ہم کافی فاصلہ طے کر چکے تھے۔ بادل ٹکڑیوں کی صورت آسمان پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چلنے کی وجہ سے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ برف پچھلے دن کی نسبت سخت ہو گئی تھی اس لیے پاؤں بہت زیادہ گہرائی میں نہیں اتر رہے تھے۔ ایک سیدھی چڑھائی کے قریب جا کر ہمارا گائیڈ رک گیا۔

''کیا بات ہے موہن''۔ صوبیدار داس نے چلا کر پوچھا۔ راستے میں ہمارے گائیڈ بدلتے رہے تھے اور اس وقت لکشمن کے بجائے موہن نامی جوان ہمارا گائیڈ تھا۔

''سر۔ اس جگہ ایوالانچ (برفانی تودا) گرنے کا خطرہ ہے۔'' موہن بولا۔ ''اگر اجازت ہو تو فائر کر کے تسلی کر لیں؟'' (بعض اوقات برفانی تودے کو تحریک دینے کے لیے ہلکی سی آواز کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ایسی حساس جگہوں پر آرمی عموماً کسی بھی ہتھیار کا فائر کرتی ہے اور برفانی تودہ اگر گرنے والا ہوتا تو گر پڑتا)

''نہیں اس جگہ کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' صوبیدار داس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور موہن ایک مرتبہ پھر چل پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ ساری رات کے سفر اور پھر دن کو بھی آرام نہ ملنے کے باعث میں تھکاوٹ سخت محسوس کر رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ آرام کیا جائے، لیکن دشمن کے سامنے میں اس قسم کی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ برفانی تودے کے متعلق سن کر میری آنکھیں اس ملگجے اندھیرے میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ جہاں برفانی تودہ گرنے کی صورت میں بچا جا سکتا۔ تمام لوگ خاموشی سے چڑھائی چڑھ

رہے تھے حالانکہ راستے میں ان کے منہ کسی بھی جگہ بند نہیں ہوئے تھے اور وہ سارے راستے مجھے کوسنے کے ساتھ ساتھ پاکستان آرمی کا بھی مذاق اُڑاتے رہے تھے۔ مذاق اُڑانے میں لکشمن نامی آدمی پیش پیش رہا تھا۔ پاک آرمی کے متعلق سینکڑوں لطائف اور بے سروپا باتیں اسے ازبر تھیں، جنھیں وہ سارے راستے منہ سے اگلتا رہا تھا جبکہ میری کوشش یہ تھی کہ دائیں بائیں کے مناظر دیکھنے میں مشغول رہوں اور ان کی باتوں کو نہ سنوں، لیکن یہ سماعت بڑی ظالم ہوتی ہے اور ایسی باتیں جو آپ نہیں سننا چاہتے ان کو سنانے میں کوشاں رہتی ہے۔

چڑھائی کافی مشکل تھی اس لیے ہماری رفتار بہت سُست ہوگئی تھی۔ ان تمام کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس چڑھائی کے بعد گجران تک کوئی قابل ذکر چڑھائی نہیں تھی۔ ہم اس چڑھائی کے درمیان تک ہی پہنچ پائے تھے کہ اچانک ایک تیز گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ آواز میرے کانوں کے لیے نامانوس نہیں تھی۔ ٹاپ تھری پر رہتے ہوئے میں نے یہ آواز کئی مرتبہ سنی تھی اور یہ بلاشبہ اس آفت کی آواز تھی جسے برفانی تودہ کہتے ہیں۔ اس کی ہلاکت آفرینی سے صرف وہی لوگ واقف ہوں گے جن کو برفانی علاقے میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اس میں پھنسنا ننانوے فیصد موت تھی۔

”تیرا بیڑا غرق جائے مُسلے!“ لکشمن اس نازک ٹائم میں بھی مجھے کوسنے سے باز نہ آیا۔ میں سارے راستے کسی ایسی جگہ کی تلاش میں رہا تھا جہاں برفانی تودہ گرنے کی صورت بچا جا سکے۔ اس وقت بھی میری نظر کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھی مگر اردگرد کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی۔ گڑگڑاہٹ کی آواز سنتے ہی میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنا پٹھو اپنے کندھوں سے نکال پھینکا۔ اس کے ہوتے ہوئے میں اپنا دفاع کھل کر نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں رٹو سکول کے سینئر انسٹرکٹر میجر آفتاب کی ہدایات تازہ ہوگئی تھیں۔

”جوانو کسی بھی موقع پر گھبرانا نہیں جب بھی کبھی کوئی ایسی صورت حال میں پھنسو حرکت میں رہنا ہے اور اس طرح ہاتھ چلانا جیسے تیرائی کی جاتی ہے۔“

میں بھی نیچے کی طرف دوڑا اور جیسے ہی برف کی بوچھاڑ مجھ پر پڑی میں جسم ڈھیلا چھوڑتے ہوئے تیرائی کے انداز میں ہاتھ چلانے لگا۔ وہ تمام بجائے کسی حرکت کے زور زور سے اپنے بھگوان اور رام کو پکار رہے تھے مگر ایک دو آوازوں کے بعد برفانی تودے نے ان کی آوازیں بند کر دی تھیں یا شاید میری سماعتوں پر ہی مہر لگا دی تھی وہ بلندی جس تک پہنچنے کے لیے ہمیں گھنٹا بھر لگا تھا۔ برفانی تودے نے منٹ سے بھی کم عرصے میں ہمیں واپس تہہ میں پہنچا دیا۔ نیچے گرتے ہی میں نے اپنی حرکت بند نہیں کی تھی بلکہ اسی طرح حرکت میں ہی رہا تھا۔ اپنے چہرے اور جسم کے لیے میں نے کافی جگہ بنالی تھی۔

”سب سے پہلے اپنے چہرے اور جسم سے برف کو دور دھکیلو“ میرے انسٹرکٹر کی آواز اس وقت بھی مجھے اتنی ہی واضح سنائی دی جتنی برفانی تودے کی ہلاکت خیزی سے بچنے کے طریقے کے بارے لیکچر دیتے وقت سنائی دی تھی۔ ”اس کے بعد آہستہ سے تھوکو اگر تھوک واپس تمھارے منہ پر گرتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ تمھارا منہ اوپر ہے اس کے برخلاف ہونے کا مطلب ہے تمھارا منہ نیچے ہے۔ برفانی تودے میں کئی ایسے لوگ بھی پھنس کر ہلاک ہو چکے ہیں جنھوں نے اپنی کوششیں ترک نہیں کیں لیکن بجائے اوپر آنے کے نیچے ہی نیچے برف کھودتے

رہے۔ نتیجے میں موت ہی ان کا مقدر بنی۔اس لیے سب سے پہلے آپ اپنی کوشش کی سمت کا تعین کریں۔''

میں نے آہستہ سے تھوکا۔میرا تھوک میرے چہرے پر ہی گرا میں سمجھ گیا کہ میرا چہرہ اوپر کی سمت ہے۔میں نے اس کے بعد اپنے استاد سے رہنمائی حاصل کی۔

''اپنی توانائی ضائع نہیں کرنی۔سب سے پہلے اپنا ایک ہاتھ اوپر کی طرف سیدھا کرو اگر تمھارے اوپر برف کم ہوئی تو ہاتھ برف سے باہر نکل جائے گا۔ورنہ چہرے کے سامنے برف کھود کر نیچے ڈالتے جاؤ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاؤ۔تیزی کی صورت میں زیادہ آکسیجن ضائع ہوگی اور شاید تم سوراخ میں موجود تمام آکسیجن ختم کر کے دم گھٹ کر مر جاؤ۔''

میں نے اپنا بایاں بازو اوپر اٹھایا برف گرنے کی وجہ سے کافی سخت ہوگئی تھی،لیکن میرے ہاتھ کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔یہ محسوس کر کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ میرا ہاتھ کلائی کے اوپر سے آزادانہ حرکت کر رہا تھا۔میں نے ہاتھ جیسے ہی اندر کھینچا تازہ ہوا کا جھونکا بھی اس کے ساتھ ہی در آیا۔چند لمحوں بعد ہی میں اپنے ہاتھوں کے بنالے ہوئے سوراخ سے باہر نکل آیا تھا۔

باہر نکلنے کے بعد لکشمن کو پاگلوں کی طرح حرکت کرتے دیکھ کر میں حیران رہ گیا اس کے دونوں خالی تھے اور وہ کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری طرح سے کھدائی کر کے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہا تھا۔کھدائی کے ساتھ وہ زور زور سے آوازیں بھی دے رہا تھا اور اس کی آواز سے ہی میں نے اسے پہچانا تھا۔

''صوبیدار صاحب......موہن......روی......شنکر''جس وقت میں برف کے ڈھیر سے باہر آیا اس وقت میرے جانب اس کی پیٹھ تھی۔وہ شاید ایوالانچ کے نیچے آنے سے بچ گیا تھا۔اس کا رخ جیسے ہی میرے جانب ہوا اس وقت تک میں کھڑا ہو گیا تھا۔

''روی یہ تم ہونا......؟''وہ دور ہی سے پکارا۔روی نامی آدمی بھی بالکل میری طرف ہی لمبا تڑنگا تھا اس لیے اسے مجھ پر روی کا شبہ ہوا۔

''یہ میں ہوں مسٹر لکشمن۔''وہ جیسے ہی قریب آیا میں آہستہ سے بولا۔

''تم......گندے مسلے......تُو زندہ بچ گیا ہے......یہ......یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا ہے۔''وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔''ٹھہرو پہلے میں تجھے نرگ میں پہنچادوں پھر باقیوں کو ڈھونڈوں گا۔''یہ کہتے ہی وہ ایک سمت کو دوڑا۔شاید ادھر اس نے اپنا ہتھیار رکھ چھوڑا تھا۔اس کے پیچھے مڑتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلا اور بجائے دوڑ کر اس کو پکڑنے کے پانی کے اندر چھلانگ لگانے کے انداز میں اس پر جا پڑا۔میں چونکہ اس سے زیادہ بلندی پر تھا اس لیے اتنے بھاری لباس کے باوجود مجھے چھلانگ لگانے میں دقت نہ ہوئی اس کے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہوئی۔مجھے پتا تھا کہ اگر وہ ہتھیار حاصل کر لیتا تو بغیر تاخیر کے پوری میگزین اس نے مجھ پر خالی کر دینی تھی۔

''نہیں مٹھو!اب تیری باری ختم ہوگئی ہے۔''میں اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔سیدھا ہوتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچنے کی کوشش کی۔مگر میرا بھرپور تھپڑ کھا کر برف پر جا گرا۔اس کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ

صرف ہتھیار چلانے کی حد تک ہی ٹرینڈ شدہ ہے۔خالی ہاتھوں شاید وہ عام آدمی پر بھی قابو نہ پا سکتا۔

میرا تھپڑ کھا کر اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نیچے جھک کر میں نے ایک مرتبہ پھر اسے گریبان سے پکڑا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔

''ہاں لکشمن اب بتاؤ؟...... پاکستان آرمی ہیجڑوں کا گروپ ہے یا انڈین آرمی۔''

''مم...... مجھے...... مار کر تم بچ نہیں سکتے۔'' وہ دھمکی دینے سے باز نہ آیا۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے گدھے...... تیرے جیسے احمق نہ زندگی لے سکتے ہیں اور نہ ہی دے سکتے ہیں۔''

''مم...... میں اس سارے علاقے سے واقف ہوں، تجھے تیرے علاقے تک پہنچا سکتا ہوں۔'' اس نے ایک اور چال چلی یا شاید سچ مچ وہ اس علاقے سے واقفیت رکھتا تھا۔۔''

''مجھے تیرے جیسے کسی کمینے کی مدد کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنی سمت کھینچا۔دوسرے ہی لمحے اس کی گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں تھی اور کٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی وہ مردہ چھپکلی کی طرح میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔اس کی تلاشی لینے پر مجھے اس کی جیبوں سے ایک فالتو میگزین، تھوڑی نقدی اور چند فوٹو ملے تھے۔فوٹو میں نے واپس اس کی جیب میں ڈال دیئے تھے۔البتہ پیسے اور میگزین اپنے پارکے کی جیب میں ڈال لیں اور پھر اسے گھسیٹ کر اسی گڑھے میں ڈال دیا جس سے میں خود نکلا تھا۔گڑھے کو برف سے پاٹ کر میں اس کا ہتھیار تلاش کرنے لگا تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے اس کا ہتھیار مل گیا۔اپنا پٹھو مجھے تلاش کرنے پہ بھی نہ ملا حالانکہ اس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔اس کے بغیر خوراک کی ضروریات کا پورا کرنا مشکل ہو جاتا۔بہر حال میں پٹھو کے لیے وہاں کھدائی نہیں کر سکتا تھا اور میرے لیے اس جگہ کا جلد از جلد چھوڑ دینا نہایت ضروری تھا۔

آسمان پر بادلوں کی حکمرانی تھی ستارے بالکل نظر نہیں آ رہے تھے۔ایسی صورت میں سمتوں کی پہچان میرے لیے مشکل ہو گئی تھی۔ میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا اور اندازے سے ہی میں ایک سمت کو بڑھ گیا۔کچھ قارئین کو میرے سمت کا اندازہ نہ ہو سکنے کی بات ہضم نہیں ہو رہی ہو گی اور ایسا محسوس کرنے والے وہ ساتھی ہوں گے جن کو اپنے علاقے سے باہر جانے کا موقع نہ ملا ہو ورنہ ایسے حضرات جن کو دور دراز سفر کا موقع ملا ہو وہ بلا شبہ مجھ سے متفق ہوں گے۔

میری نے کوشش کی کہ جس راستے پر ہم چل کر آئے تھے اس سے تھوڑا ہٹ کر چلوں البتہ سمت وہی برقرار رکھی کیونکہ اسی طرف چلتے ہوئے میں جلد از جلد انڈیا کی حدود پار کر سکتا تھا۔

پوسٹ سے چلتے وقت پانی کی جو بوتل میں نے جیب میں ڈالی تھی وہ اب تک میری جیب میں ہی تھی۔ بوتل نکال کر میں نے دو گھونٹ پانی پیا۔ بلکہ پانی پینے کی بجائے میں برف چبانا کہوں تو زیادہ بہتر ہو گا کیونکہ پانی اس وقت تک برف میں تبدیل ہو چکا تھا البتہ برف میٹھی تھی کہ اس میں وافر مقدار میں چینی حل تھی۔تھکن اور بھوک سے میرا برا حال تھا، لیکن میں چلنے پر مجبور تھا، اپنی زندگی سے محبت سے

زیادہ مجھے گھر کی فکر تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ''جلدازجلد گھر پہنچو'' سے چچا جان کی مراد کیا تھی۔ گنڈاپوروں کے درمیان جتنی آسانی سے دشمنی شروع ہوتی ہے اس کا ختم ہونا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ خاندان کے خاندان دشمنی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ان سخت دلوں میں اگر کوئی اچھائی تھی تو صرف اتنی کہ عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، لیکن گولی اور آگ کسی عورت کو نہیں پہچانتی کیونکہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مخالفین کے گھر کو آگ لگادی گئی جس کے باعث عورتیں اور بچے تک جل گئے تھے۔ مختلف قسم کے اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ گرم جیکٹ اور پاجامہ پٹھو میں رہ گیا تھا اس لیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ آرام کیلئے رکنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

مجھے چلتے ہوئے بمشکل گھنٹا سوا گھنٹا ہی ہوا ہوگا کہ ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوگئی۔ میں نے اپنا سفر جاری رکھا کہ رکنے کا مطلب موت تھا اور برف کی موت! آگ میں جلنے سے بھی زیادہ بھیانک ہوتی ہے۔ برف باری آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی۔ آگے جاکر راستا دو اطراف میں منقسم ہوگیا تھا۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کر میں نے اللہ کا نام لیا اور ایک سمت منتخب کر کے چل پڑا راستا تقریباً ہموار ہی تھا۔ اچانک مجھے دور سے ہلکی سی روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ انڈیا کی کوئی پوسٹ ہی ہوسکتی تھی میں نے اپنا رخ روشنی کے جانب موڑلیا کہ کچھ کھانے کی سبیل کی جائے۔ راستا بتدریج اوپر کو اٹھنا شروع ہوگیا تھا۔ نالے کی شمالی سمت (شمالی سمت میرے اندازے کے مطابق تھی وہ کوئی اور سمت بھی ہوسکتی تھی، لیکن مجھے شمالی سمت محسوس ہورہی تھی) ایک کافی اونچی ٹیکری تھی۔ وہیں سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے یہ پارٹیوں کے لیے راستے میں قائم کی گئی چوکی محسوس ہورہی تھی بعد میں میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس قسم کی چوکیوں پر سنتری بہت زیادہ مستعدی سے ڈیوٹی نہیں دیتے اور ویسے بھی موسم اس قسم کا تھا کہ سنتری کا چوکس رہنا ازحد مشکل تھا، لیکن اس کے باوجود ٹیکری کے اوپر چڑھتے وقت میں نے احتیاط سے کام لیا۔ روشنی کھڑکی میں لگے ایک شیشے سے نکل رہی تھی۔ یہ شیشہ غالباً سنتری کی دیدبانی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

چڑھائی چڑھتے ہی میں برف پر لیٹ گیا اور کرالنگ کرتا ہوا رہائشی کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ نرم برف کے اندر کرالنگ کا اپنا ہی لطف ہے لیکن وہ ایسا وقت نہیں تھا کہ میں وہ شغل جاری رکھ سکتا۔ جیسے ہی میں عمارت کے نزدیک پہنچا مجھے داخلی دروازہ دکھائی دیا۔ روشن کھڑکی اور دروازے کے مابین دس فٹ کے قریب فاصلہ تھا۔ کچھ اور نزدیک جانے پر مجھے ریڈیو پر نشر ہونے والے وہ گانے بھی سنائی دینے لگے جو لازماً سنتری سن رہا تھا۔

میں آہستہ سے زمین سے اٹھا اور رائفل کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹی سی گیلری تھی جس میں تیل کے کین کے اوپر رکھا ریڈیو بج رہا تھا، ایک لالٹین دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھی۔ سنتری غائب تھا۔ مجھے دور سے جس کھڑکی کی روشنی نظر آئی تھی وہ رہائشی کمرے کی کھڑکی تھی۔ دروازے کے سامنے باتھ روم تھا جس میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا اس کے اندر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں دبے قدموں اندر کی طرف بڑھا جہاں کسی کے باتیں کرنے کی مدہم آواز آرہی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ کوئی وائرلیس سیٹ پر بات کر رہا تھا۔ اس کی زوردار آواز دروازہ بند ہونے کی وجہ سے مجھے نہایت مدہم سنائی دے رہی تھی۔

''پارٹی کے واپس پہنچتے ہی میں اطلاع دے دوں گا سر......اوور'' دوسری جانب سے بھی کچھ کہا گیا لیکن مجھے واضح سنائی نہ دیا۔

''ٹھیک ہے سر......اوور'' وہ دوبارہ بولا۔دوسری طرف سے شاید رابطہ ختم کر دیا گیا تھا کہ اس کے بعد مجھے کوئی آواز نہ سنائی دی۔

میں دروازے کے ساتھ اس طرح پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا کہ سنتری کے اندر داخل ہوتے ہی اسے سنبھال سکوں۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے دروازے پر آہٹ سی سنائی دی۔ میں چوکنا ہو گیا لیکن کمرے سے کوئی بھی برآمد نہ ہوا۔مزید چند لمحے گزرنے پر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں کمرے کے اندر گھسنے پر تیار ہو گیا۔گن دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر میں نے ٹھوکر مار کر دروازہ کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر دو آدمی ہاتھوں میں تاش پکڑے کھیل میں مشغول تھے باقی تمام کمرہ خالی پڑا تھا۔میرے اندر گھستے ہی انھوں نے ہڑبڑا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن میری دھاڑ سن کر اپنی جگہ پر ساکن ہو گئے۔

''خبردار اگر کسی نے حرکت کی تو بھون ڈالوں گا۔''

دیوار کے ساتھ ہتھیاروں کے لیے ریک بنا ہوا تھا جس میں دو تین ہتھیار پڑے تھے۔ایک مشین گن دیوار کے ساتھ کھڑی تھی جو لازماً سنتری کی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا سا کچن بنا ہوا تھا۔مٹی کے تیل کے تین چولہے بھی پڑے تھے ایک چولہے پر چھوٹے دیگچے میں کچھ پک رہا تھا۔

''تت......تم......کون ہو؟'' دونوں میں سے ایک ہکلا کر بولا۔

''مجھے چھوڑو، اپنی سناؤ، باقی بندے کہاں گئے ہیں۔'' میں چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا ان کے نزدیک پہنچ گیا۔

''بب......باقی......باقی بھی ادھر ہی ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔'' اس بار بھی وہی بولا جو پہلی مرتبہ مجھ کو مخاطب ہوا تھا۔

''بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔......تم لوگوں کی گفتگو میں سن چکا ہوں۔''

''کون سی گفتگو۔'' ایک آدمی ہی مجھ کو مخاطب تھا دوسرا خاموش کھڑا مجھے کینہ توز نظر گھور رہا تھا۔

''وہی بکواس جو تم لوگ وائرلیس سیٹ پر کر رہے تھے۔''

''سن لی تو کیا ہوا......؟'' یہ کہتے ہی اس نے میرے پیٹ میں مارنے کے لیے لات گھمائی اور اپنے دائیں ہاتھ سے گن کی بیرل پکڑنے کی کوشش کی، لیکن اس کی ٹانگ کو حرکت میں آتا دیکھ کر میں ہلکے سے جمپ کے ساتھ تھوڑا سا پیچھے کو ہوا۔وہ وار کے خطا ہونے پر اپنی جگہ ڈگمگا سا گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میری بائیں ٹانگ حرکت میں آئی اور برفانی علاقے کا وزنی بوٹ ہتھوڑے کی طرح اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگا۔وہ اچھل کر نیچے بستر پر جا گرا۔ مجھے امید تھی کہ اگلے آدھے گھنٹے کے لیے اس کا ہوش میں آنا مشکل تھا۔

''کک ایسے لگائی جاتی ہے۔'' خاموش کھڑے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں مزاحیہ انداز میں بولا۔''کیا خیال ہے تمھارا۔'' مگر اب بھی وہ خاموش ہی رہا تھا۔

''گونگے صاحب یہ باقی لوگ کہاں گئے ہیں؟......یہ تو بتانے کے قابل نہیں رہا۔'' میں نے نیچے پڑے آدمی کی طرف اشارہ کر

کے کہا۔

''ہماری ایک پارٹی گم ہوگئی ہے تمام لوگ اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔''

''پارٹی گم ہوگئی ہے؟ مگر کیسے؟''

''جیسے اس علاقے میں گم ہوتی ہیں بھئی۔ ویسے ہی گم ہوئی ہے۔ آ گئی ہوگی کسی ایولانچ کے نیچے یا پھر راستا بھٹک گئی ہوگی۔''

''کب سے گم ہے؟'' میں مستفسر ہوا۔

''آج شام سے ہی رابطہ نہیں ہو رہا۔'' میں سمجھ گیا کہ صوبیدار داس کی پارٹی کی تلاش کے لیے دائیں بائیں کی نزدیکی پوسٹوں سے پارٹیاں روانہ کی گئی ہوں گی۔

''اچھا یہ بتاؤ یہاں سے پاکستانی سرحد کتنی دور ہے۔''

''یہاں سے؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''جی۔''

''یہاں سے تو کافی دور ہے۔ راستے میں ہماری چند پوسٹیں آتی ہیں ان سے گزر کر ہی آپ پاکستانی علاقے میں پہنچ سکتے ہیں۔''

''فاصلہ کتنا ہوگا؟''

''اندازاً 35,30 کلومیٹر ہوگا۔''

''کوئی مختصر راستا؟''

''نہیں اس موسم میں ناممکن ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تمھارا نام؟''

وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ''عبداللہ......''

''اور اس کا؟'' میں نے نیچے پڑے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''ہری چند۔''

''تو عبداللہ بھائی پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو موجود ہے تو میرے حوالے کرو۔ دوسرا میری تھوڑی سی رہنمائی کرو تاکہ میں واپس پاکستان میں پہنچ سکوں۔ کیونکہ میں غلطی سے آپ کے علاقے میں آن پھنسا ہوں اور میرا اپنے علاقے بلکہ اپنے گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔ جتنی دیر ہوتی جائے گی میرا نقصان بڑھتا جائے گا۔ کیا آپ میرے ساتھ تعاون کرنا پسند کریں گے؟'' دوستانہ صورتِ حال پیدا کرنے کے لیے میں نے رائفل کندھے کے ساتھ لٹکالی تھی۔

''آپ جو بھی ہیں بھائی صاحب میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو کیونکہ کسی بھی لمحے وہ تمام

یہاں پہنچ سکتے ہیں اور تم اکیلے شاید دس بندوں کا مقابلہ نہ کر سکو۔"

"اس دیگچی میں کیا ہے؟" اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے چولہے پر رکھی دیگچی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"چائے!" وہ مختصراً بولا۔

"وری گڈ" کہہ میں آگے بڑھا اور چولھے کے ساتھ رکھے کپ میں چائے نکال کر گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔عبداللہ نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہیں کی تھی میں بظاہر اس سے غافل بنا ہوا تھا لیکن حقیقتاً اس کی ذراسی حرکت پر میں ایکشن میں آسکتا تھا۔

چائے پی کر میں نے بقیہ چائے ایک بوتل میں انڈیلی اور عبداللہ سے پوچھا" کھانے کو کچھ پڑا ہے۔"

"پارٹی کے لیے حلوہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔" اس نے ایک دوسرے برتن کی طرف اشارہ کیا۔تھوڑا سا حلوہ کھا کر باقی حلوہ ایک شاپر میں ڈالتے ہوئے میں نے عبداللہ سے کہا۔

"عبداللہ بھائی چلو سٹور میں۔" اور وہ خاموشی سے میرے آگے چل پڑا۔سٹور میں جا کر میں نے ایک خالی پٹھو میں دو تین دنوں کا راشن، تین چار فالتو میگزین۔پانی حلوہ چائے اور گرم لباس ڈال کر میں آگے جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"عبداللہ بھائی! آپ کی بہت بہت مہربانی......اگر آپ تعاون نہ کرتے تو میں اتنی جلدی تیار نہ ہو پاتا لیکن اگر تجھے میں نے یونہی چھوڑ دیا تو تیرے اپنے ساتھی تجھ پر شک کریں گے......اس لیے سوری لیکن یہ ضروری ہے ۔" یہ کہتے ہی میں نے بجلی سی تیزی سے اسٹین گن کا بٹ اس کے سر میں مارا اور وہ "اوغ" کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔اسے اٹھا کر میں نے ایک بستر پر ڈالا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔گو اس کے سر پر بٹ مارے بغیر بھی میں اسے بیہوش کر سکتا تھا لیکن اس طرح بھی اس کی شخصیت مشکوک ہو جاتی تھی۔ہری چند ابھی تک اسی پوزیشن میں پڑا تھا۔میں بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکلا اور عبداللہ کی بتائی ہوئی سمت کی طرف قدم بڑھا دیئے۔بمشکل چند قدم اٹھائے ہوں گے کہ میری سماعتوں میں لوگوں کے بولنے کی آواز آئی۔میں نے جلدی سے رہائشی مکان کی عقبی سمت کا رخ کیا اور تیزی سے اس جگہ سے دور ہٹنے لگا۔گو اس طرح میں عبداللہ کی بتائی ہوئی سمت سے بالکل مخالف سمت کو روانہ ہو گیا تھا لیکن گرفتاری سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔برف باری کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی۔میں پوسٹ سے چند سو گز ہی دور آپایا تھا کہ مجھے کسی کی چیختی آواز سنائی دی۔

"یہ رہے اس کے قدموں کے نشان!" اور اس کے ساتھ ہی چند اور آدمیوں کی آواز آئی ۔"ہاں ہاں یہی ہیں۔چلو، جانے نہ پائے۔" اور میں اپنے بائیں ہاتھ پر موجود ابھری ہوئی چٹان کے پیچھے لیٹ کر زندگی اور موت کا معرکہ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔میں کسی بھی قیمت پر زندہ گرفتار ہونے پر راضی نہ تھا۔

+ + +

جانے نہ پائے" کی آوازوں کے ساتھ وہ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے لیکن ان کی یہ حرکت نہایت بیوقوفانہ تھی۔اس کا خمیازہ ان کو دو تین لاشوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔میری ایس ایم جی سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے ان کے نعروں کو چیخ و پکار میں بدل دیا۔گو

اچھا خاصا اندھیرا تھا لیکن مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ میرے پاؤں کے بنے ہوئے نشانات کی سیدھ میں ہی آگے بڑھیں گے اور ہوا بھی یہی تھا۔

کچھ گولی لگنے کی وجہ سے اور کچھ گولی سے بچنے کے لیے برف پر لیٹ گئے اور جوابی فائرنگ شروع کر دی، لیکن میں آڑ میں تھا اس لیے محفوظ رہا۔ ان کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع رہی جبکہ میں نے پہلے برسٹ کے بعد گولی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہتھیاروں کی لڑائی میں ہمیشہ وہ فریق غالب رہتا ہے جو مخالف کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر لڑے۔ میرے لیے اس جگہ پر ٹک کر لڑنا ناممکن تھا کیونکہ جلد یا بدیر ان کو اپنی کسی بھی پوسٹ سے کمک مل جاتی یا مرے پاس ایمونیشن ختم ہو جانا تھا ہر دو صورتوں میں میرا پکڑا یا مارا جانا ضروری تھا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ میرا تعاقب نہ کر سکیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں ایسی فضا پیدا کروں کہ وہ میرے فرار سے لاعلم رہیں، اسی مقصد کے لیے ان کی دھڑا دھڑ فائرنگ کا جواب دینے کی بجائے میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

جلد ہی انھیں محسوس ہو گیا کہ وہ یک طرفہ فائرنگ میں مشغول ہیں۔

''فائرنگ بند کرو۔'' ان میں کوئی چیخ کر بولا۔ ''دو بندے ان کو پوسٹ میں لے جاؤ اور سیٹ پر نمبر ٹو کو بھی اس کی اطلاع کر دینا۔ باقی تمام میرے ساتھ چلیں اس کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنا ضروری ہے۔'' وہ غالباً لاشوں کو پوسٹ میں لے جانے کا آرڈر دے رہا تھا۔

''سر! کہیں وہ ابھی تک موجود نہ ہو۔'' ایک سہی ہوئی آواز آئی۔

''تمھارا باپ اگر موجود ہوتا تو جوابی فائر نہ کرتا۔'' آرڈر دینے والا لازماً ان کا سینئر تھا۔ ''تم اگر ڈرتے ہو تو ان لاشوں کے کے ساتھ پوسٹ پر چلے جاؤ باقی چلو میرے ساتھ۔''

میں آنکھیں پھاڑے ان کے ہیولوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ کو جہنم واصل کر کے اپنے تعاقب کے قابل نہ چھوڑوں۔ گو صاف موسم کی صورت میں برفانی علاقے میں چاندنی رات کے بغیر بھی اتنی روشنی ہوتی ہے کہ چالیس پچاس گز کے حدود اربعہ میں کسی چیز کا ہیولا محسوس کیا جا سکے۔ مگر اس وقت آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا اور برف باری شدت سے جاری تھی ایسی صورت میں ان کی آوازوں یا قدموں کی آہٹ سے ہی میں ان کی سمت کا اندازہ کر سکتا تھا اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔ البتہ ٹارچ میرے پاس موجود تھی لیکن اس کو جلانے کا مطلب اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنا تھا۔ میں ان کے قریب آنے کا منتظر رہا یہاں تک کہ وہ چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ گن کو میں نے پہلے سے برسٹ پر سیٹ کیا ہوا تھا...... ٹریگر کے دباتے ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی اور ان کی چیخ و پکار سے ماحول گونج اٹھا۔ میں نے بھی ٹریگر سے اس وقت تک انگلی نہیں ہٹائی جب تک کہ میگزین خالی نہیں ہو گئی۔ نئی میگزین چڑھا کر میں نے ایک ہلکا سا برسٹ چلایا اور وہاں سے کرالنگ کرتا ہوا دور ہٹنے لگا۔ پشت پر موجود پہاڑی کی آڑ میں آتے ہی میں کھڑا ہو گیا اتنی زیادہ احتیاط کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ میں کسی اندھی گولی کا شکار نہ ہو جاؤں آڑ میں آتے ہی میں وہاں سے تیزی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

مجھے حتمی طور پر اندازہ نہیں تھا کہ کتنے بندے جہنم واصل ہو چکے تھے البتہ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ وہ میرے تعاقب کے قابل نہیں رہے تھے۔ کچھ دور آنے کے بعد میں نے نارمل انداز میں چلنا شروع کر دیا۔ مسلسل سفر اور بے آرامی نے میرے اعصاب کو شل سا کر

دیا تھا۔ نیند کی شدت سے میری آنکھیں جل رہی تھیں لیکن ان سب کے باوجود میں چلنے پر مجبور تھا۔ صبح صادق کے قریب مجھے ایک کھوہ نظر آئی جس کا منہ برف سے اٹا ہوا تھا۔ بس ایک چھوٹے سے سوراخ سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی غار ہے۔ ٹارچ جلا کر میں نے سوراخ کے اندر جھانکا، کافی لمبی غار نظر آئی۔ میں نے غار کے منہ سے صرف اتنی برف ہٹائی جس سے کہ میں آسانی سے اندر گھس سکوں۔ برفانی طوفانوں کی بدولت برف غار کے اندر بھی کافی مقدار میں ڈھیر ہوئی پڑی تھی لیکن میری خوش قسمتی کہ غار کافی لمبا تھا۔ آخری کونے میں جا کر میں نے اپنے لیٹنے کے لیے جگہ صاف کی۔ گرم جیکٹ اور پاجامہ نکال کر پہنا۔ بوٹ اتار کر برف جھاڑی جرابیں تبدیل کیں اور حلوے کو جڑ گیا خوب پیٹ بھرنے کے بعد باقی حلوہ شاپر میں لپیٹ کر پٹھو میں ڈالا اور ٹھنڈی چائے پی کر آرام کے لیے لیٹ گیا۔

برف باری کی یہ خاصیت ہے کہ جب تک یہ شروع رہے سردی نارمل رہتی ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ ہوا نہ چلے۔ اس وقت بھی ہوا بند تھی اور برف روئی کے گالوں کی طرح مسلسل آسمان سے گر رہی تھی مجھے پتا تھا کہ میرے پاؤں کے نشانات زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں برف میں چھپ جانے تھے اس کے بعد دشمن کے لیے میری لوکیشن کا پتا چلانا نہایت مشکل تھا۔

حالات کی سنگینی اور گھریلو تفکرات بھی میری نیند کو نہ روک سکے اور میں گہری نیند سو گیا۔

میں پتا نہیں کتنی دیر تک سویا رہتا لیکن اچانک تیز گڑگڑاہٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ ٹائم دیکھا تو دن کے دو بجنے والے تھے۔

''ہیلی اور اس موسم میں......؟'' میں نے حیرانی سے سوچا، لیکن جب میری نظر غار کے سوراخ سے آنے والی روشنی کی کرنوں پر پڑی تو میری حیرانی دور ہو گئی ''اس کا مطلب ہے موسم صاف ہو گیا ہے'' میں آہستہ سے بڑبڑایا اور اٹھ کر غار کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ سوراخ سے سر گزار کر جب میں نے باہر جھانکا تو سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا نظر آیا۔ آسمان پر بادلوں کا نشان تک نہیں تھا۔ میں شاید باہر نکل کر دھوپ سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا کہ اچانک میری نظر غار سے پچاس گز فاصلے پر بنے ہوئے قدموں کے تازہ نشانوں پر پڑی اور میں اچھل پڑا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ نشانات مجھے اسی سمت کو جاتے دکھائی دیئے جس سمت سے میں چل کر آیا تھا۔ ہیلی کی آواز بھی اسی سمت کو جاتی سنائی دی تھی اور ہیلی کا مقصد بھی لازماً زخمیوں اور لاشوں کی ترسیل تھا۔

میں غار کے دہانے سے اندر کو ہٹ آیا اور پٹھو سرہانے کے نیچے رکھ کر ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس بار میں ناکام رہا۔ یادوں کا ریلا مجھے پتا نہیں کہاں سے کہاں بہا لے گیا۔ سعدیہ اور عدنان کی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ پھر ان کی جگہ امی اور ابو نے لے لی۔ باری باری تمام رشتہ دار میرے خیالات میں آتے چلے گئے۔ پتا نہیں رحمان خیل میں حالات کیسے تھے آیا میرے بھائیوں میں سے کوئی مارا گیا تھا یا اس کے برعکس انھوں نے مخالفین میں سے کسی کو مار کر حوالات میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ جیسے بھی تھا اتنا اندازہ بہر حال مجھے بھی تھا کہ حالات سخت خراب ہیں اور گنڈہ پوروں میں حالات کی خرابی کا ایک ہی مطلب تھا یعنی ایک یا زیادہ بندوں کا قتل ہو جانا۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو روزانہ کا معمول تھے۔ گنڈہ پوروں جیسی تندخو اور دشمنیاں پالنے کی شوقین شاید ہی کوئی قوم پاکستان

میں ہواور انھی کے متعلق یہ کہاوت مشہور ہے کہ۔

''گنڈہ پور دوست سے زیادہ دشمن بنانے پر خوش ہوتے ہیں۔''

میں کافی دیر تک گھر اور گاؤں کے خیالات میں کھویا رہا لیکن جیسے ہی غار کے اندر موجود روشنی مدہم پڑی اور اندھیرے نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا میں نے بھی وہاں سے کوچ کی تیاری شروع کر دی۔ گو میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن سفر کی سختی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے کچھ نہ کچھ کھانا مناسب سمجھا۔ پٹھو پیٹھ پر لاد کر میں نے گن کندھے پر لٹکائی اور ہاتھ میں آئس سٹک (Icestick) پکڑ کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گو پٹھو کی غیر موجودی میں مَیں زیادہ تیزی سے سفر کر سکتا تھا، لیکن زیادہ عرصہ اس برف زار میں پھنسے رہنے کی صورت میں پٹھو میں موجود سامان ہی میری زندگی کا ضامن بن سکتا تھا۔ ایک لحظہ کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ پٹھو میں موجود فالتو سامان جیسے رسہ یا ایس ایم جی کی سپیئر میگزین پھینک دوں...... لیکن پھر کسی ناگہانی صورتِ حال میں پھنسنے کے خوف نے مجھے اس کام سے باز رکھا۔

آسمان پر بادلوں کا نام نشان بھی نہیں تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، لیکن روشنی کافی تھی۔ انڈیا ہمارے ملک کے مشرق میں واقع ہے لیکن اس علاقے میں دونوں ملکوں کی سرحد اتنی ٹیڑھی میڑھی ہے کہ واضح طور پر اپنی فوج کی ڈیپلائمنٹ کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل تھا۔ نقشے کی موجودی اس مشکل کو آسانی میں بدل سکتی تھی لیکن افسوس کہ نقشہ میرے موجود نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ جنوب کی سمت اختیار کر کے میں باقی اطراف کی بہ نسبت جلد ہی دشمن کے علاقے سے نکل سکتا تھا۔ تارے ابھی تک واضح نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے سورج کے غروب ہونے کے مقام سے جنوب کی سمت کا تعین کیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ تھوڑی دور ہی چلنے کے بعد رستا بتدریج گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ اس لیے میری رفتار برف کے نرم ہونے کے باوجود کافی تیز رہی۔ راستے میں میری کوشش رہی کہ دشمن سے مڈبھیڑ نہ ہو، کیونکہ اس صورت میں لازماً میرا وقت ضائع ہو جاتا جو مجھے بالکل گوارا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مجھے ایوالانچ کے خطرے کا علاقہ بھی کراس کرنا پڑا لیکن دشمن کو بائی پاس کرنے کے لیے میں یہ بھی کر گزرا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی میری نگاہیں دن گزارنے کے لیے جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئیں جلد ہی مجھے ایک بڑے پتھر کے نیچے اتنی جگہ نظر آ گئی جہاں میں آسانی سے لیٹ بھی سکتا تھا اور دشمن کی ہوائی اور زمینی دیکھ بھال سے آڑ بھی میسر تھی۔ گرم پاجامہ اور جیکٹ پہن کر میں نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا اور پٹھو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ موسم صاف ہونے کی وجہ سے سردی کافی زیادہ تھی لیکن سورج بلند ہونے کے ساتھ اس میں کمی ہوتی چلی گئی۔ میرا ذہن عجیب قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور ان خیالات سے میں نیند میں بھی جان نہ چھڑا سکا۔ برے خیالات اور پریشان سوچوں نے پرچھائیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے اپنے باپ کو پھانسی پر لٹکے ہوئے دیکھا۔ پھر میں نے اپنے چچا کو دیکھا کہ اس کا سر گردن سے کٹا ہوا ہے اور وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے اور میں اس کی طرف جانے کی بجائے چودھری انور کے پیچھے دوڑ رہا ہوں میرے ہاتھ میں ایک بڑا سا ٹوکہ تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ میں نے دوڑتے ہوئے ٹوکہ اس کی طرف پھینکا لیکن وہ جلدی سے نیچے بیٹھ گیا اور ٹوکہ اس کی بجائے عدنان کو جا لگا جو ہاتھ پھیلائے میری جانب دوڑ رہا تھا۔ میرے منہ

سے چیخ نکلی اور میری نیند اکھڑ گئی۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، دن کے دو بجنے والے تھے۔ مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی پٹھو سے بوتل نکال کر میں نے پانی پیا اور ایک مرتبہ پھر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر خواب کے بے ترتیب اور بھیانک مناظر میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ ''کیا پتا یہ خواب سچا ہو اور اس کی تعبیر......'' مگر میں اپنے اندر اس بے ترتیب خواب کی تعبیر سوچنے کی جرأت پیدا نہ کر سکا اور سر جھٹک کر تمام پراگندہ خیالات کو ذہن سے نکال کر اس برف زار سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔

سورج کے سر چھپاتے ہی میں ایک مرتبہ پھر چل پڑا اردگرد اکا دکا درخت نظر آرہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جس علاقے میں موجود تھا اس کی بلندی چودہ ہزار فٹ سے کم تھی۔ کیونکہ اس سے زیادہ بلندی پر درخت نہیں اُگتے۔ یہ علاقہ اس لحاظ سے بہت عجیب ہے کہ کم بلندی پر سبزے کی بہتات درختوں کے جھنڈ جس میں ہر قسم کے درخت شامل ہیں یعنی پھلدار اور بغیر پھل کے۔ کثیر تعداد میں موجود ہیں اس کے برعکس جب چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر چلے جاؤ تو اتنے ہی بنجر اور سنگلاخ پہاڑ نظر آتے ہیں حالانکہ پانی ہر دو جگہ وافر مقدار میں موجود ہے اور وہ اس لیے کہ برف پگھلتے ہی ہر جگہ چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

چھپنے کی جگہ سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر مجھے راستا سا بنا ہوا نظر آیا جو مغرب کی سمت سے آتے ہوئے اس مقام سے جنوب کی سمت مڑ رہا تھا۔ میں نے بھی اس راستے کو غنیمت جانا اور اس پر چل پڑا۔ راستا تقریباً ہموار ہی تھا۔ تھوڑا سا آگے بڑھنے کی بعد مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر عمودی خطرناک ڈھلانیں نظر آئیں جو راستے سے دو تین میٹر ہی دور پڑتی تھیں۔ یہ اتنی سیدھی تھیں کہ برف بھی ان پر نہ جم سکی تھی اس لیے ان کی پتھریلی اور سنگلاخ سطح واضح نظر آرہی تھی۔ دائیں ہاتھ پر ہموار ڈھلان تھی۔ راستا بنا ہونے کی وجہ سے میری رفتار کافی تیز تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ دشمن کی پوسٹ جیسے ہی نظر آئے گی میں راستا تبدیل کرلوں گا مگر کسی پوسٹ کے نظر آنے سے پہلے ہی میں ایک ناگہانی آفت میں پھنس گیا تھا۔

وہ چند لوگوں کے بولنے کی آواز تھی جو تھوڑے فاصلے پر موجود موڑ سے آرہی تھی۔ بے اختیار رکتے ہوئے میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی مگر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں ناکام رہا جہاں میں چھپ سکتا۔ سورج کو ڈوبے کچھ ہی دیر گذری تھی اور ملگجے اندھیرے میں کافی دور تک نظر کام کر رہی تھی۔ میرے پاس چھپنے کے لیے بہت کم ٹائم تھا پچھلا موڑ بھی مجھ سے فرلانگ بھر دور تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے فی الفور اس پر عمل کر ڈالا۔ پٹھو سے رسی نکال کر میں نے راستے کے بائیں طرف موجود درخت کے تنے کے ساتھ اس طرح باندھی کہ رسی برف میں چھپ گئی۔ رسی کا دوسرا سرا مضبوطی سے اپنی کمر کے ساتھ باندھ کر میں بائیں ہاتھ پر موجود کھڑی چٹانوں کی طرف بڑھ گیا۔ میرے نیچے اترتے ہی وہ موڑ مڑے، اگر مجھے چند سیکنڈ کی بھی دیر ہو گئی ہوتی تو میرا دیکھا جانا لازمی تھا۔ تمام افراد زور زور سے باتیں کرتے ایک سیدھی لائن میں جا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے جو نتیجہ میں نے اخذ کیا وہ یہی تھا کہ کچھ تخریب کار سرحد کے اندر گھس آئے تھے جس کی وجہ سے مختلف پوسٹوں سے پیدل پٹرولنگ شروع کر دی گئی تھی۔

جیسے ہی ان کی باتوں کی آواز معدوم ہوئی میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ دوسرا موڑ مڑنے والے تھے۔ میں آہستہ سے اوپر آ گیا۔ جونہی وہ تمام میری نظر سے اوجھل ہوئے میں نے درخت کے نزدیک جا کر پٹھو اتارا اور رسی کھولنے کے لیے نیچے جھکا تا کہ رسی لپیٹ کر پٹھو میں ڈالوں اچانک مجھے اپنی پشت پر غراہٹ سنائی دی۔ میں پھرتی سے پیچھے مڑا اور یہ دیکھ کر میرا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا کہ ایک دیوقامت ریچھ آہستہ آہستہ چلتا میری سمت آ رہا تھا۔ میرے پیچھے مڑتے ہی وہ دونوں پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا اپنے ہاتھ میں موجود ایس ایم جی پر میری گرفت مضبوط ہو گئی لیکن جیسے ہی تھوڑی دیر پہلے گزرنے والی پٹرولنگ پارٹی کا خیال آیا میں نے ریچھ پر فائر کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ سکول کے زمانے کی پڑھی ہوئی ایک کہانی میرے دماغ میں در آئی جب دو دوست اکٹھے سفر کر رہے ہوتے ہیں اور ریچھ آ جاتا ہے، ایک دوست تو درخت پر چڑھ جاتا ہے جبکہ دوسرا جو درخت پر چڑھنا نہیں جانتا تھا کہ وہ سانس روک کر لیٹ جاتا ہے اور ریچھ اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

میں اس وقت درخت کے قریب ہی کھڑا تھا اور درخت پر چڑھنا بھی خوب جانتا تھا مگر اس علاقے میں درخت پر چڑھنا از حد مشکل تھا کیونکہ درخت کے تنے بالکل صاف اور لمبائی میں بہت زیادہ تھے۔ سانس روک لینے کا طریقہ بھی میں نہیں آزمانا چاہتا تھا کہ اس میں بھی بہت زیادہ خطرہ تھا۔ میں نے ان سب تدابیر کو چھوڑ کر ایک نئی تدبیر اختیار کی گو اس میں رسک زیادہ تھا لیکن اس کے علاوہ نہ تو کچھ اور سوجھا اور نہ سوچنے کا ٹائم تھا اور یہ رسک بھی میں اس لیے لے سکا کہ درخت کے تنے اور اپنی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی رسی میں نے ابھی تک کھولی نہیں تھی۔

ریچھ جیسے ہی اپنے پچھلے قدموں پر کھڑا ہو کر میری جانب بڑھا، میں بھی اس کی طرف دوڑ پڑا۔ میرے اس ردِعمل پر ایک لمحے کے لیے وہ اپنی جگہ پر ساکن ہو گیا تھا۔ میں نے پانچ چھ میٹر کا فاصلہ بجلی کی سی تیزی سے طے کیا اور اچھل کر ریچھ پر چھلانگ لگائی ریچھ اس وقت عمودی ڈھلان کے بالکل کنارے پر کھڑا تھا۔ میرے چھلانگ لگاتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ مجھے جکڑنے کے لیے بڑھائے، لیکن میری توجہ اس کی گرفت سے بچنے کی بجائے اسے نیچے گرانے کی تھی اور اس صورت میں میرا اپنا گرنا بھی لازمی تھا۔ ریچھ اس صورت میں ضرور گرنے سے بچ جاتا اگر میں فلائنگ کک لگا کر پیچھے کی طرف گرتا۔ اس کے برعکس میں نے اپنا پورا بوجھ اس کے اوپری دھڑ پر ڈالا اور اسے ساتھ لیتا ہوا۔ پچھلی جانب موجود عمودی ڈھلان پر گرتا چلا گیا۔ ریچھ کے منہ سے ایک تیز غراہٹ نکلی اور مجھے پکڑنے کی بجائے اسے اپنی جان بچانے کی فکر لاحق ہو گئی مگر اس جگہ ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کے سہارے اپنی جان بچانے کے لیے سہارا لے سکتا۔ ریچھ کے پاؤں اکھڑتے ہی میں اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ میرے پاؤں کا رخ پہاڑ کی سمت رہے اس کے برعکس ہونے کی صورت میں میرا ناکارہ ہو جانا لازم تھا۔ رسی کے ٹوٹنے کا مجھے اندیشہ نہیں تھا۔ یہ رسی خصوصی طور پر تیار کی گئی تھی وزن میں ہلکی اور کارکردگی میں لوہے کی زنجیر سے بھی مضبوط۔ اس کے متعلق ہم نے اپنے کورس میں پڑھا تھا کہ یہ 25 ٹن تک وزن سہار لیتی ہے۔ اس کی لمبائی 35 سے 40 میٹر کے قریب تھی۔

جیسے ہی رسی کی لمبائی ختم ہوئی میری کمر کو جھٹکا لگا اور میں تیزی سے پہاڑ کی سمت بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس عمودی دیوار کے قریب پہنچتا میرے پاؤں دیوار کی سمت ہو گئے تھے۔ ایک ہاتھ سے میں نے رسی کو اپنے پیٹ کے سامنے پکڑ کر اپنا توازن درست کیا اور پھر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنا شروع کر دیا، 40,35 میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہوئے مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ ہموار سطح پر پہنچتے ہی میں نے سانس درست کیا رسی کو لپیٹ کر پٹھو میں ڈالا اور ایک مرتبہ پھر سفر کے لیے تیار ہو گیا۔ ریچھ سے ٹکراؤ کی وجہ سے کافی ٹائم ضائع ہو گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مجھے اپنی رفتار تیز کرنی پڑی۔ دو تین فرلانگ چلنے کے بعد مجھے دور ہلکی سی روشنی نظر آئی اور میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی پوسٹ تھی اس سے بچ کر گزرنے کے لیے مجھے اپنی سمت تبدیل کرنی پڑی اور میں نے اپنا رخ جنوب مغرب کی طرف موڑ لیا۔

راستے سے ہٹنے کی وجہ سے مجھے کچی برف میں چلنا پڑ گیا اور میری رفتار ایک مرتبہ پھر آہستہ ہو گئی۔ آدھی رات گزرنے کے بعد موسم آہستہ آہستہ خراب ہونا شروع ہو گیا۔ صبح تک چاروں طرف دھند چھا گئی تھی چند گز دور کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن خوش قسمتی سے برف باری شروع نہ ہوئی۔ صبح کو دھند کی وجہ سے میں نے رکنا گوارا نہ کیا اور چلتا رہا 12 بجے کے قریب دھند چھٹنا شروع ہو گئی اور میں نے بھی کسی کمین گاہ کی تلاش میں اپنی نظریں دائیں بائیں دوڑانی شروع کر دیں، ایک گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد میں تھک کر برف کے اوپر ہی آرام کرنے کا سوچ رہا تھا کہ میری نظر برف کے اندر چھپی ہوئی مورچہ نما جگہ پر پڑی۔ پہلی نظر میں تو مجھے وہ کوئی پوسٹ لگی اور مجھے وہاں سے بھاگنے کی فکر لاحق ہوئی لیکن اس کے ارد گرد قدموں کے نشان نہ بنے دیکھ کر میں جھجکتا ہوا اس کے قریب چلا گیا۔

وہ ایک پوسٹ ہی تھی لیکن کسی نامعلوم سبب کی بدولت دشمن اسے خالی کر گیا تھا۔ ساز و سامان تو ادھر کوئی بھی موجود نہیں تھا البتہ عمارت ابھی تک جوں کی توں کھڑی تھی۔ میں نے اپنے گھسنے کے لیے راستا بنایا اور اندر گھس گیا۔ دیواروں کے ساتھ بستر لگانے کے لیے جو لکڑی کے تختے لگائے گئے تھے وہ ابھی تک صحیح حالت میں موجود تھے۔

آلو بھجیا کا ڈبہ کھول کر میں نے پیٹ پوجا کی، پانی چونکہ میرے پاس ختم ہو چکا تھا اس لیے اس کی جگہ تھوڑی سی برف چوس کر گزارا کیا اور اپنے جسم کو رات کے سفر کے لیے تیار کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ تھکن کے ساتھ کھانے کے خمار نے مجھے ہر قسم کے تفکرات سے دور کر دیا تھا اور میں گہری نیند سو گیا۔

میں تھوڑی دیر ہی سو پایا ہوں گا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ میں تڑپ کر اٹھا مگر یہ دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا کہ جیسے میں زلزلہ سمجھا تھا وہ واقعی زلزلہ تھا لیکن کسی اور صورت میں۔ میں چاروں طرف دشمن کے سپاہیوں کے نرغے میں آیا ہوا تھا اور انھی میں سے ایک نے مجھے لکڑی کے تختے سے اٹھا کر نیچے پھینکا تھا جو مجھے زلزلے کی طرح محسوس ہوا تھا۔ وہ دس کے قریب تھے تمام کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے جن کا رخ میرے جانب تھا۔ میری ایس ایم جی بھی ان کے قبضے میں آ چکی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا لیکن بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

''کھڑے ہو جاؤ۔'' ان میں سے ایک مجھے ٹھوکر لگاتا ہوا غرایا۔

میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ میری پیٹھ پر ایک زبردست ٹھوکر لگی اور میں بمشکل اپنا چہرہ زمین کے ساتھ لگنے سے بچا سکا۔

''سنا نہیں کیپٹن صاحب نے کیا کہا ہے۔'' ٹھوکر لگانے والا غیض و غضب سے چلایا اور میں کسی تیسری ٹھوکر لگنے سے پہلے کھڑا ہو گیا۔تمام کے چہرے غیض و غضب سے سرخ ہو رہے تھے۔

''تمھارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟'' ان کا سینئر جو کیپٹن تھا میرے نزدیک آکر مستفسر ہوا۔

''میں اکیلا ہوں، غلطی سے آپ کے علاقے میں آنکلا ہوں۔''

''نہیں یہ غلطی تو بہر حال نہیں ہے۔'' کیپٹن طنزیہ لہجے میں بولا۔''غلطی تو تم سے بہت پہلے ہو چکی ہے اور وہ ہے پیدا ہونے کی غلطی۔''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں سر......؟''

''تم بالکل غلط بک رہے ہو۔'' وہ غرایا اور اپنے سپاہیوں کو اشارہ کر کے کہا۔''اس کے پٹھو کی تلاشی لو۔''

دو آدمی آگے بڑھے اور میرے پٹھو کو الٹا کر دیا مگر اس میں سوائے کھانے پینے کے سامان ، فالتو میگزین اور رسی کے انھیں کچھ نہ ملا۔

کیپٹن نے سبزی کا ڈبہ اٹھا کر اس کا لیبل پڑھا اور بولا۔''یہ پیکنگ تو ہمارے ملک کی ہے تیرے پٹھو میں ہمارے ملک کا سامان کیسے پہنچ گیا؟۔''

میں نے ایک لحظہ کے لیے سوچا اور پھر بولا۔''سر بات دراصل یہ ہے کہ میں نے واقعی سرحد غلطی سے عبور کی تھی اور آپ کی ایک پارٹی کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا جس میں صوبیدار داس شامل تھا۔خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہ تمام لوگ جو مجھے گرفتار کر کے لے جا رہے تھے وہ ایوالانچ میں آگئے اور میں چونکہ ان تمام سے آگے چل رہا تھا اس لیے برف کے نیچے آنے سے محفوظ رہا۔یہ پٹھو اور ایس ایم جی مجھے وہیں سے ملی تھی جو نا معلوم کس وجہ سے برف کے نیچے آنے سے محفوظ رہی تھی اور اب میں اس کوشش میں تھا کہ اپنے علاقے میں واپس چلا جاؤں۔''

''اور تیری یہ کوشش ناکام بنا دی گئی ہے نا......؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔''اُلو کا پٹھا سمجھتے ہو مجھے۔رشی پوسٹ پر حملہ تیرے باپ نے کیا ہے؟۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں انکار میں سر ہلایا۔

''ہو جائے گا پھر سب کچھ معلوم ہو جائے گا بڑے بڑے مان گئے ہیں تم کس باغ کی مولی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔''اس کا سامان پٹھو میں ڈالو میں اس کے پکڑے جانے کی رپورٹ فارورڈ کر دوں۔''

''جی سر۔'' جن دو سپاہیوں نے میرا سامان پٹھو سے باہر نکالا تھا وہ بیک زبان بولے اور سامان کو دوبارہ پٹھو میں ڈالنے لگے جبکہ کیپٹن وائرلیس سیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔''ٹو فار ون اوور۔''

''ون فار ٹو سینڈ یور میسج اوور۔''

''سر پرندہ ہم نے پکڑ لیا ہے۔اب ہمارے لیے کیا حکم ہے اوور۔''

''شاباش......اس کو لے کر سی پی پر پہنچو۔باقی احکام وہیں پر مل جائیں گے اور احتیاط سے جانا یہ نہ اُڑ جائے۔اوور۔''

''آپ فکر نہ کریں سر۔ہم پورا انتظام کر کے چلیں گے اوور۔''

''او کے......وش یو گڈ لک اینڈ اوور اینڈ آل۔''

''پٹھو اٹھاؤ اور آگے ہو جاؤ۔'' رابطہ ختم ہوتے ہی کیپٹن مجھ سے مخاطب ہوا اور میں خاموشی سے پٹھو اٹھا کر پوسٹ سے باہر نکل آیا۔پوسٹ سے باہر بھی ان کے آدمی موجود تھے۔میں نے گنے وہ بھی دس ہی تھے۔مجموعی طور پر 20 آدمی مجھے پکڑنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔میں پوسٹ سے باہر رک کر کیپٹن کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

پوسٹ سے باہر آ کر اس نے دس آدمی مجھ سے آگے اور دس آدمی میرے پیچھے رکھتے ہوئے واپسی کا سفر شروع کروا دیا۔راستا وہی تھا جس پر میں چل کر آیا تھا راستے میں ان کی باتوں سے پتا چلا کہ جس پوسٹ کو دیکھ کر میں نے اپنا راستا تبدیل کیا تھا اس پوسٹ سے شب دید آلات کے ذریعے مجھے دیکھ لیا گیا تھا پوسٹ پر بندے کم ہونے کی وجہ سے وہ بروقت میرا تعاقب نہ کر سکے تھے اور دوسری پوسٹ سے آدمی منگواتے منگواتے ان کے دو تین گھنٹے ضائع ہو گئے تھے۔ان کی گفتگو سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میں پاکستانی سرحد کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا اور اس مقام سے جہاں پر میں پکڑا گیا تھا سرحد صرف چند کلو میٹر دور تھی اور اس کے بعد انڈیا کی صرف ایک ہی پوسٹ تھی جس کو ہائی الرٹ کیا جا چکا تھا۔میرے ذہن میں بے اختیار کسی شاعر کا شعر گونجا۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

گھر جانے کے لیے میری بے چینی جتنی بڑھتی جا رہی تھی اتنی زیادہ رکاوٹیں میری راہ میں پیدا ہو رہی تھیں۔عموماً کہا جاتا ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔آج مجھ پر اس کی حقیقت آشکارا ہو رہی تھی واقعتاً اگر میں صبر کر لیتا اور راستے کھلنے کا انتظار کرتا تو زیادہ سے زیادہ تین ماہ مزید پوسٹ پر گزارنے پڑتے جبکہ اب میں نامعلوم وقت تک کے لیے دشمن کی قید میں جا چکا تھا بلکہ یہ کہوں کہ میری سلامتی بھی داؤ پر لگ چکی تھی تو بے جا نہ ہو گا۔ایک دفعہ تو میرے دماغ میں ایسا فتور اٹھا کہ میں ان سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔وہ تمام بے فکری سے چل رہے تھے اور اپنی اکثریت کے زعم میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑے ہوئے تھے،لیکن پھر میرے جذبات پر عقل غالب آ گئی۔کچھ بھی تھا 20 ہتھیار بند آدمیوں سے ٹکرانا آسان کام نہ تھا جبکہ علاقے کی نوعیت بھی تیز نقل و حرکت میں مانع تھی۔فلموں،ناولوں میں شاید یہ آسان دکھائی دے مگر حقیقی زندگی میں ایسا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔

شام ہوئی پھر رات بھی آہستہ آہستہ گزر گئی،مگر ہمارا سفر جاری رہا اور ہم مسلسل چلتے رہے۔دوپہر کو جا کر ہم اس جگہ پر پہنچے جس کا اصلی

یا کوڈ نام سی پی تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں رسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ کر انھوں نے مجھے سٹور نما کمرے میں بند کر دیا اور باہر دو سنتری کھڑے کر دیئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی میرے لیے ایک پلیٹ ترکاری اور چھابے میں چند روٹیاں لے آیا۔ دونوں سنتری دروازے پر کھڑے نگرانی کرنے لگے۔ کھانا لانے والے نے میرے ہاتھ کھولے چھابہ اور پلیٹ میرے سامنے رکھی اور چلا گیا۔ تقریباً ہفتہ ہونے کو تھا کہ میں نے روٹی نہیں کھائی تھی صرف ڈبہ پیک آلو وغیرہ پر دن گزارے تھے۔ کھانے کو دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی اور میں حالات سے بے پرواہ کھانے کو جت گیا۔ جب تک میں کھانا کھاتا رہا دونوں سنتری دروازے پر چوکس کھڑے رہے کھانا لانے والا بعد میں ایک ٹن (جس میں ملک پاوڈر پیک ہو کر آتا ہے) میں پانی لا کر رکھ گیا۔

خوب سیر ہو کر کھانا کھایا، جی بھر کے پانی پیا اور ہاتھ دوبارہ بندھوا کر آرام سے لیٹ گیا اور ایک مہربانی انھوں نے یہ کی کہ ایک پرانا سا سلیپنگ بیگ میرے اوپر ڈال گئے تھے ورنہ اس کی غیر موجودی میں میرا آرام کرنا ناممکن ہوتا سٹور نما کمرہ حجم میں بہت چھوٹا تھا۔ فرش پر کمبل بچھے ہوئے تھے اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز وہاں پر موجود نہیں تھی۔ کمرے کے باہر کھڑے ہوئے سنتریوں کی باتوں کی آواز مجھے واضح سنائی دے رہی تھی۔ سخت تھکن کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں سونے سے پہلے یہ پتا چل گیا تھا کہ مجھے اس پوسٹ سے آگے لے جانے کے لیے ہیلی کاپٹر آنے والا ہے۔

میری آنکھیں دروازہ کھلنے کی آواز سے کھلیں۔ آنے والے کے ہاتھ میں لالٹین تھی کمرے میں چھایا اندھیرا لالٹین کی وجہ سے ہلکی پیلی روشنی میں ڈھل گیا۔ لالٹین دیوار کے ساتھ لٹکا کر وہ باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد کھانے کے برتنوں کے ساتھ آن موجود ہوا۔

’’میں نے ٹوائیلٹ جانا ہے۔‘‘ میں نے اپنی حاجت بیان کی۔

’’ٹھہرو! میں صوبیدار صاحب سے پوچھ کر آتا ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ واپسی پر دونوں سنتریوں کو اس نے کچھ کہا اور وہ بھی اس کے ساتھ اندر چلے آئے میرے ہاتھ پہلے سے کھلے ہوئے تھے، روٹی لانے والے نے مجھے پاؤں کھولنے کو کہا۔ پاؤں کھول کر میں اس کی رہنمائی میں اس چھوٹے سے کمرے سے نکلا۔ دونوں سنتری چوکنے انداز میں میرے پیچھے چل پڑے۔ وہ جتنے بھی چوکس ہوتے ان دونوں پر قابو پانا میرے لیے کوئی خاص مشکل نہیں تھا اور اس کی وجہ ان دونوں کی ناتجربہ کاری تھی کہ وہ مجھ سے صرف ایک قدم پیچھے تھے، حالانکہ قاعدے کی رو سے انھیں فاصلہ رکھ کر آنا چاہیے تھا۔ لیکن ان دونوں پر قابو پانے کے باوجود میرا وہاں سے بھاگنا مشکل تھا کیونکہ پوسٹ پر کم و بیش تیس بندے موجود تھے اور یہ تعداد میرے گمان کے مطابق تھی ہو سکتا ہے کچھ زیادہ ہی ہوتے۔ اس صورت میں ان دو یا چند اور کو مار کر میں اپنی مشکلات بڑھانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے اندر اس قسم کی کوئی خواہش پیدا نہ ہونے دی اور مناسب موقع کے انتظار میں چپ چاپ ٹوائیلٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پوسٹ کا رقبہ کافی بڑا تھا، میں جس گیلری میں چل رہا تھا اس کی دیواریں پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ دیواروں کے بنانے میں کسی قسم کا مصالہ استعمال نہیں کیا گیا تھا اس لیے دیواروں میں ہلکے ہلکے سوراخ

باقی رہ گئے تھے اور ان سے ہوا کی سنساہٹ سنائی دے رہی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے موسم خراب ہو۔ اس علاقے میں سردی کی شدت میں اضافے کا ایک سبب تیز ہوا کا چلنا بھی ہے۔ اس کی وجہ سے عموماً لوگوں کے چہرے کالے پڑ جاتے ہیں اور جسم کے کھلے حصے پھٹ جاتے ہیں۔

ٹوائیلٹ کی چھت کافی نیچی تھی مجھے سر جھکا کر اندر داخل ہونا پڑا۔ اندر مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا اس کی روشنی میں مجھے ٹوائیلٹ کی پچھلی دیوار کے ساتھ بوری لٹکتی نظر آئی جو ہوا سے ہل رہی تھی۔ میں نے بوری کو ہٹا کر دیکھا تو ایک سوراخ نما روشندان نظر آیا، بوری کے ہٹتے ہی تیز ہوا اندر داخل ہوئی۔ کونے میں پڑے ہوئے دیے کی لو پھڑ پھڑائی اور وہ بجھنے کے قریب ہو گیا میں نے جلدی سے بوری کو روشندان کے اوپر برابر کر دیا، لیکن اس ایک لمحے میں مجھے آسمان پر سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اگر موسم صاف ہوتا تو ضرور تارے چمکتے نظر آتے۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر میں ٹوائیلٹ سے نکل آیا۔ دونوں سنتری باہر موجود تھے، ان کی نگرانی میں واپس چل پڑا، ٹوائیلٹ سے آگے ان کے رہائشی کمرے تھے اور دوسری سائیڈ پر قید خانے سے ملحق بھی دو تین رہائشی کمرے نظر آ رہے تھے۔ اس کے بعد گیلری دائیں طرف مڑ جاتی تھی اس طرف شاید ان کا کچن اور راشن سٹور وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ کھانا کھا کر جب وہ میرے ہاتھ پاؤں باندھنے لگے تو میں نے ان سے چائے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب اگر چائے مل جاتی......؟“

”قیدی ہو، مہمان بننے کی کوشش نہ کرو اور شکر ادا کرو بھگوان کا کہ تجھے کھانا دیا جا رہا ہے۔“ ان میں سے ایک تلخی سے بولا اور میں نے چپ سادھ لی۔ مجھے چائے کی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ قیدی ہی کیا جس کی کوئی خواہش پوری ہو۔ میں آنکھیں بند کر کے گھر کے خیالات میں کھو گیا۔ سعدیہ کے ساتھ گزارے ہوئے پیار بھرے لمحات میری سوچوں میں فلم کی صورت چلنے لگے۔ میری شادی میں والدین کا عمل دخل ہونے کی باوجود شادی بہت کامیاب رہی تھی۔ شادی سے پہلے بھی ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور اشاروں کنائیوں میں اس کا اظہار کرتے رہتے تھے مگر شادی کے بعد تو یہ چاہت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ کسی کو اپنانے اور اس پر اپنی ملکیت جتانے کے احساس میں ہی عجیب لذت ہے۔ آرمی جوائن کرنے کے بعد ہمارے درمیان جدائی بڑھی اور ہمیں احساس ہوا کہ ہم دونوں کتنا زیادہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ عدنان کی آمد نے ہماری محبت کے بندھن کو پختہ اور مضبوط کر دیا تھا۔ آج بھی سعدیہ سے سینکڑوں میل دور اس برف زار میں مجھے تمام گھر والوں سے زیادہ اسی کی یاد آ رہی تھی۔ کہتے ہیں انسان خود غرض ہوتا ہے اور یہ شاید میری خود غرضی ہی تھی کہ مجھے سب سے زیادہ سعدیہ اور عدنان کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ خدانخواستہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ باقیوں کی طرف سے میں بے فکر تھا ان کی بھی مجھے فکر تھی مگر سعدیہ اور عدنان سے ذرا کم اور وہ شاید اس لیے کہ مرد ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، تکلیفات کو برداشت کر لیتے ہیں۔ کسی کی زیادتی کا جواب دے سکتے ہیں۔ جبکہ عورتیں اس معاملے میں کمزور ہوتی ہیں۔ ساری رات میں سونے جاگنے کی کیفیت میں لیٹا رہا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے میری حالت کافی غیر آرام دہ تھی مگر میں اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

اگلے دن موسم زیادہ خراب ہو گیا اور ایسے موسم میں ہیلی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے شب و روز پہلے دن کی طرح گزرتے رہے۔ چائے مجھے صرف صبح کے ٹائم ہی ملتی یہ بھی میرے لیے شکر کا مقام تھا۔ اس پر میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتا کم

تھا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے علاوہ مجھے وہاں پر کوئی تکلیف نہیں تھی، لیکن یہ صورت حال زیادہ دن تک برقرار نہ رہ سکی مجھے پوسٹ پر آئے پانچواں دن تھا جب رات کے نو بجے میں اپنے دماغ میں پیاروں کی یادیں سجائے سونے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ میں چونک پڑا لیکن ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے میں اپنے اوپر سے سلیپنگ بیگ نہ ہٹا سکا کہ آنے والے کی صورت دیکھتا۔ اس کی پھنکارتی ہوئی آواز سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کیپٹن ہے۔ اس کا نام ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے میرا اسلیپنگ بیگ کھینچ کر ایک طرف پھینکا اور مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی اس کے ساتھ اس کے گندے منہ سے گندی گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔ بندھے ہونے کی وجہ سے میں اپنا دفاع بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے پاؤں میں برفانی علاقے کے وزنی اور مضبوط بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس کی لگائی ہوئی ہر ٹھوکر مجھے ہتھوڑے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے کہ مبادا میرے منہ سے کوئی آہ یا سسکی نہ نکل جائے، مگر کب تک پسلیوں پر لگنے والی چوٹوں نے مجھے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”بولو...... کتے کے بچے، اور کون کون تیرے ساتھ تھے؟...... بولو۔ جلدی بتاؤ ورنہ میں تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ بکو جلدی بکو ؟۔“ اس کے منہ سے مسلسل خرافات نکل رہی تھیں۔ مجھے کچھ پتا ہوتا تو میں بتاتا۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کن کی بابت پوچھ رہا ہے۔ میرے منہ سے کسی قسم کا جواب نہ پا کر وہ اور زیادہ جنون میں آ گیا۔ سر پر لگنے والی ضربات نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا آخر میں بھی انسان تھا۔ گو ایک کمانڈو عام انسان سے جسمانی لحاظ سے مضبوط اور زیادہ قوت برداشت کا مالک ہوتا ہے، لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور میں اس حد سے گزر چکا تھا۔

+ + +

چہرے پر ٹھنڈا پانی چھڑک کر مجھے ہوش میں لایا گیا۔ میں اسی طرح بندھی ہوئی حالت میں پڑا تھا۔ کمرے میں اس کیپٹن کے علاوہ تین افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ دروازے پر البتہ کافی تعداد میں سپاہی جمع تھے۔

میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بندھے ہونے کی باوجود میں نے زور لگا کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو حرکت دی۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، لیکن ایک اطمینان مجھے حاصل ہو گیا کہ میری کوئی ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی تھی۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کا درد بالکل مختلف ہوتا ہے۔

”صوبیدار صاحب پوچھو اس کمینے سے ورنہ میں اس کی کھال اتار لوں گا۔“ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر کیپٹن ایک آدمی سے مخاطب ہوا جو عمر میں باقی تمام سے بڑا دکھائی دے رہا تھا۔

”ہاں جوان...... اگر زندگی عزیز ہے تو جو کچھ کیپٹن صاحب پوچھ رہے ہیں، صحیح صحیح بتا دو۔ ورنہ تجھے عبرت ناک موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔“ صوبیدار کا لہجہ نرم تھا مگر الفاظ سخت میں اسے کوئی جواب دینے کی بجائے خاموشی سے اسے تکتا رہ گیا۔

”تمھیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی ؟۔“ مجھے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ مستفسر ہوا۔

’’تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟‘‘میں آہستگی سے بولا۔

’’تمھارے ساتھ کتنی پارٹیوں نے سرحد عبور کی اوران کے ٹاسک (مقاصد) کیا کیا تھے؟‘‘

’’سرحد عبور کرنے کی وجہ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔‘‘

’’بکتے ہو تم۔‘‘اس مرتبہ کیپٹن غصیلی آواز میں بولا۔’’تم بھی تخریب کاروں کے ساتھی ہو۔البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی نا معلوم وجہ سے تم ان سے بچھڑ گئے ہو۔‘‘

’’تم جنھیں تخریب کار کہتے ہو۔ہم اسے مجاہد سمجھتے ہیں......کاش میں بھی انھی میں سے ہوتا......مگر افسوس میں ان میں سے نہیں ہوں۔میرے جیسے دنیادار سے وہ لاکھ درجے اچھے ہیں۔‘‘

’’دیکھا رنجیت صاحب۔‘‘ کیپٹن صوبیدار سے مخاطب ہوا۔’’میں نہیں کہتا تھا کہ یہ بھی انھی میں سے ایک ہے......اب تو تمھیں میری بات کا یقین آگیا ؟۔‘‘

’’سر میں نے پہلے بھی آپ کی بات کو نہیں جھٹلایا تھا۔‘‘صوبیدار رنجیت دھیمے لہجے میں بولا۔’’لیکن میں ابھی تک اپنی بات پر قائم ہوں اس کو فیلڈ انوسٹی گیشن کے حوالے کرنے میں ہی دھرتی ماتا کی بہتری ہے۔وہ اس سے سب کچھ اگلوالیں گے۔‘‘

’’رنجیت صاحب میرا خون کھول رہا ہے۔‘‘ کیپٹن میرے نچلے دھڑ میں ٹھوکر لگاتا ہوا غرایا۔

’’پلیز سر۔‘‘صوبیدار رنجیت کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔’’تھوڑا سا صبر کرلیں۔یوں بھی ہیڈ کواٹر سے یہی آرڈر پاس ہوا ہے کہ آپ ہی اسے ساتھ لے کر جائیں گے۔وہاں اپنا جی ٹھنڈا کرلینا۔‘‘اور کیپٹن بغیر اس کی بات کا جواب دیئے جھلائے ہوئے انداز میں کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

’’تمھارا نام......؟‘‘ کیپٹن کے کمرے سے نکلتے ہی صوبیدار رنجیت بولا۔

’’عمر جان۔‘‘

’’تو عمر جان بات یہ ہے کہ تم سچ سچ بتادو......تم نے کس مقصد کے تحت سرحد عبور کی اور تمھارے ساتھ کون کون تھا۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم عبرت ناک موت سے بچ جاؤ گے اور کسی وقت بھی قیدیوں کے تبادلے میں تمھاری خلاصی ہوسکتی ہے۔‘‘

’’سر......زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے......البتہ اتنی بات پر میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ میں نے غلطی سے سرحد عبور کی ہے اور میرے ساتھ دوسرا کوئی بھی نہیں تھا۔‘‘

’’میں کیسے یقین کرلوں ؟۔‘‘ وہ بے یقینی سے بولا۔

’’آپ کو کیسے یقین آئے گا؟۔‘‘

’’مجھے یقین آئے یا نہ آئے......جن کے حوالے کیے جاؤ گے وہ خود اگلوالیں گے۔‘‘ کہتے ہوئے صوبیدار رنجیت کمرے سے نکل

گیا۔ باقی بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ان کے جانے کے بعد ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا اور مسکراتے ہوئے مجھے کہنے لگا۔'' بھاجی بڑی مشکل سے بچے ہو۔ ورنہ کیپٹن سریش تو تمھیں زندہ برف میں دفن کرنے لگا تھا۔ یہ صوبیدار رنجیت کا احسان مانو کہ وہ آڑے آ گیا۔''

'' کیپٹن سریش کو مجھ سے کیا تکلیف پہنچی ہے ؟''

'' تمھیں اس نے بتایا نہیں ہے......؟'' وہ مستفسر ہوا اور میرا سر نفی میں ہلتا دیکھ کر بولا '' جس پوسٹ پر حملہ ہوا ہے اس میں کیپٹن سریش کا چھوٹا بھائی جو لیفٹیننٹ تھا وہ بھی مارا گیا ہے۔ مارنے والے تو نکل گئے تیری بدبختی کہ تم پھنسے ہوئے ہو۔''

'' آپ کا نام؟'' اسے گفتگو پر آمادہ دیکھ کر میں نے سلسلہ گفتگو بڑھانا چاہا کہ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو۔

'' میرا نام تو دلیر سنگھ ہے، لیکن ابھی آپ خاموشی سے لیٹ کر آرام فرمائیں کیپٹن صاحب نے تم سے گفتگو کرتے دیکھ لیا تو میری کم بختی آجائے گی۔''

'' ٹھیک ہے دوست۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ مگر ایک چھوٹا سا کام کر دو کہ یہ سلیپنگ بیگ مجھے اوڑھا دو......آپ کی مہربانی ہوگی۔''

'' ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' وہ سلیپنگ بیگ اٹھا کر مجھے اوڑھاتے ہوئے بولا۔'' اس مقصد کے لیے تو اندر آیا تھا۔''

+ + +

اگلے دو دن آرام سے گزرے دلیر سنگھ نے دوسروں سے چھپا کر درد کش گولیاں بھی مجھے کھلا دی تھیں۔ جس سے میری تکلیف میں خاطر خواہ کمی ہوئی تھی۔ اس دوران موسم ٹھیک رہا۔ دلیر سنگھ سے پتا چلا کہ ہیلی پیڈ تیار ہو گیا ہے اور ہیلی مجھے لینے کے لیے کسی وقت بھی پہنچ سکتا ہے۔

وہ میری گرفتاری کا نواں دن تھا جب دوپہر کے 10 بجے کے قریب مجھے ہیلی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں ذہنی طور پر وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر ہیلی کاپٹر وہاں رکنے کی بجائے آگے گزرتا چلا گیا، اس کی آواز دو گھنٹے بعد دوبارہ سنائی دی اس مرتبہ وہ وہیں اتر گیا۔ دو رائفل بردار کمرے میں داخل ہوئے میرے ہاتھ پاؤں کی بندش کو کھولا اور مجھے باہر چلنے کو کہا۔

پائلٹ نے ہیلی اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ یہ مال بردار ہیلی تھا اس میں 25 سے 30 بندوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مجھے ایک سیٹ پر بٹھا کر چاروں جانب رائفل بردار بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں کیپٹن سریش بھی ہیلی میں داخل ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے لگا جیسے وہ روتا رہا ہو۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کے بھائی لیفٹیننٹ اجیت کی لاش بھی اس ہیلی میں لوڈ تھی۔ کیپٹن سریش نے مجھ پر ایک قہر بھری نظر ڈالی لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بیٹھتے ہی ہیلی کے پروں کی رفتار میں تیزی آئی اور وہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھنے لگا۔ آدھے گھنٹے کی پرواز کے بعد ایک جگہ اتار کر اس میں تیل ڈالا گیا دوبارہ ہم ایک گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا محو پرواز رہے اور پھر زمین پر اتر آئے اس دفعہ جس جگہ ہیلی اتارا گیا وہ کوئی ائیر بیس تھا۔ نیچے اترتے ہی سول کپڑوں میں ملبوس دو جوان میرے جانب بڑھے، سرعت سے تلاشی لی میری گھڑی اتاری اور مجھے بازو سے

پکڑ کر ایک طرف کھڑی گاڑی کے جانب بڑھ گئے۔

گاڑی کی شکل پولیس کی وین کی طرح تھی جس میں ملزموں کو عدالت میں لے جایا جاتا ہے۔گاڑی میں سوار کر کے انھوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی گاڑی سٹارٹ ہو کر نا معلوم منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ میں آنے والے وقت کے لیے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کرنے لگا۔ مجھے پتا تھا کہ کسی بھی ملک کی انٹیلی جنس کا طریقہ تفتیش کیا ہوتا ہے۔ خصوصاً پاکستانی اور انڈین انٹیلی جنس تو تشدد کے ذریعے ملزم سے حقائق جاننے کی کوشش کرتی ہیں۔اس میں بعض اوقات ملزم ذہنی یا جسمانی طور پر ناکارہ بھی ہو جاتے ہیں البتہ یورپین ممالک کے متعلق جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ زیادہ نفسیاتی حربے استعمال میں لاتے ہیں، لیکن ان کے پاس بھی آخری حربہ یہی ہوتا ہے کہ بندے کو جسمانی طور پر ٹارچر کیا جائے۔

گھنٹا پون گھنٹا سفر کے بعد گاڑی رک گئی۔دائیں بائیں بیٹھے ہوئے بندوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر گاڑی سے اتارا اور پھر مختلف موڑ مڑنے اور سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک کمرے میں لا کر قید کر دیا گیا۔ جاتے ہوئے اتنی مہربانی انھوں نے ضرور کی کہ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی۔ کمرے میں ایک بلب جل رہا تھا۔اس کی روشنی میں مَیں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ سازوں سامان سے بالکل خالی تھا۔دائیں ہاتھ پر دیوار میں ایک کھڑکی نما دروازہ نظر آیا۔میرے اندازے کے مطابق وہ ٹوائیلٹ کا دروازہ تھا۔آگے بڑھ کر جھانکنے پر میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ چونکہ ہیلی سے اترتے ہی انھوں نے میرے برفانی بوٹ اتروا لئے تھے اس لیے میں ابھی تک ننگے پاؤں تھا۔کمرے کا فرش ٹھنڈا تھا مگر میں جس علاقے سے ہو کر آ رہا تھا اس کی نسبت یہ ٹھنڈک کچھ بھی نہیں تھی یہاں کا موسم مجھے اپنے صوبہ پنجاب کے موسم جیسا محسوس ہو رہا تھا۔میں کونے میں دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔میرے دونوں ہاتھ ابھی تک ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ جلدی ہی انھوں نے تفتیش کے نام پر تشدد شروع کر دینا ہے۔میں ذہنی طور پہ خود کو اس مرحلے کے لیے تیار کر رہا تھا۔میرے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جو میں نے اپنی پوسٹ سے اترتے وقت پہنا ہوا تھا یہ ٹریک سوٹ اور تھرمل سوٹ پر مشتمل تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل اس لباس کو استعمال کرنے کی وجہ سے اس میں سے پسینے وغیرہ کی بو آ رہی تھی اور میرے دل میں شدت سے یہ خواہش اٹھ رہی تھی نیم گرم پانی سے نہا کر کپڑے بدل لوں۔مگر خواہش نام ہی اس چیز کا ہے جو کبھی پوری نہیں ہوتی، ہمیشہ دل میں رہتی ہے۔میں بھی صبر کیے ان کے اگلے اقدام کا انتظار کرتا رہا۔

زیر زمین کمرے میں وقت کا اندازہ لگانا، ممکن نہیں تھا۔ جب میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔کافی دیر بعد دروازہ کھلا دو آدمی اندر آئے دونوں پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔ان کے انداز میں بہت زیادہ خود اعتمادی نظر آ رہی تھی۔ان میں سے ایک نے میری ہتھکڑی کھولی جبکہ دوسرے نے اپنے ہاتھ میں موجود کیمرے سے میری تصویریں نکالنی شروع کر دیں چند تصویریں نکالنے کے بعد وہ دوسرے سے مخاطب ہوا۔

”باربر (حجام) کو بلا لاؤ۔“ اور وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔اس کے کمرے سے نکلتے ہی ایک لمحے کے لیے تو میرے جی میں آیا کہ

میں کمرے میں موجود آدمی پر قابو پا کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں مگر پھر اس عمارت سے عدم واقفیت کی بنا پر میں اس اقدام سے باز رہا۔ یوں بھی اس کیمرہ مین پر آسانی سے قابو پانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ جسامت میں وہ مجھ سے کچھ ہلکا تھا قد میں بھی کم تھا لیکن لڑائی کے طور طریقوں میں قد و جسامت کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی۔ ایک چھوٹے قد و قامت کا بندہ بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر ہو سکتا ہے۔

چند لمحوں بعد جانے والا ایک ایسے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ جس نے ہاتھ میں ایک فولڈنگ سٹول اور اٹیچی کیس اٹھایا ہوا تھا۔ سٹول کمرے کے وسط میں رکھ کر وہ اٹیچی کیس کھولنے لگا۔

''بیٹھو'' کیمرہ مین مجھ سے مخاطب ہوا اور میں خاموشی سے سٹول پر بیٹھ گیا۔ حجام میری چھاتی پر سفید کپڑا بچھا کر استرے سے میری شیو بنانے لگا۔ کمانڈو کی ٹریننگ سے پہلے میں شیو کرتا رہا تھا مگر اس کے بعد چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی۔ برفانی علاقے میں گزارے عرصہ میں مَیں نے داڑھی کو بالکل نہیں چھیڑا تھا اور اس وقت میری داڑھی کافی بڑی نظر آ رہی تھی۔

حجام نے استرے کی مدد سے چند منٹوں میں میری داڑھی صاف کر دی۔ سر کے بال بھی کافی بڑے ہو گئے تھے مگر اس نے ان کو نہ چھیڑا اور داڑھی مونڈنے کے بعد وہ اپنے اوزار دوبارہ اٹیچی کیس میں ڈالنے لگا اس دوران دوسرے دونوں خاموشی سے کھڑے رہے اور حجام کو کسی قسم کی ہدایات نہ دیں اور اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی سے بریف کیا گیا تھا۔

کیمرہ مین دوبارہ میری تصاویر اتارنے لگا۔ تصاویر اتار کر اس نے دوسرے آدمی سے کہا۔ ''اسے کپڑے دو۔''

دوسرے نے ہاتھ میں موجود بنڈل میری طرف بڑھایا اور کہا۔ ''یہ پہن لو اور اپنے کپڑے اتار کر میرے حوالے کرو۔'' میں کپڑوں کا بنڈل اس کے ہاتھ سے لے کر باتھ روم کی طرف بڑھا مگر کیمرہ مین جلدی سے بولا۔

''کپڑے یہیں بدلو۔''

''کیوں؟'' میں احتجاجی لہجے میں بولا۔

''جیسا کہا جا رہا ہے ویسا کرو زیادہ چوں چرا کی ضرورت نہیں۔'' کیمرہ مین غرایا۔

''اچھا......'' کہہ کر میں حجام سے مخاطب ہوا۔ ''بھائی جان ذرا سفید چادر دینا'' اور حجام سوالیہ نظروں سے کیمرے والے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیمرہ مین نے ایک لحظہ کے لیے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر اپنی منظوری کا عندیہ دے دیا حجام نے اٹیچی سے سفید کپڑا نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے کپڑوں کا بنڈل کھول کر دیکھا وہ ایک شلوار نما پاجامہ قمیص اور انڈر ویئر پر مشتمل تھا۔ مجھے وہ بالکل سی ایم ایچ (CMH) میں مریضوں کو دیا جانے والا لباس لگا۔

میں نے چادر دھوتی کی طرح کمر سے لپیٹ کر اپنا تمام لباس اتار دیا اور پھر ان کا دیا ہوا لباس پہن کر کپڑا حجام کو واپس کر دیا۔ کیمرہ مین نے دوسرے آدمی کو میرے اتارے ہوئے کپڑے اٹھانے کا اشارہ کیا اور وہ تینوں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ دروازہ باہر سے

بند کرنا وہ نہیں بھولے تھے۔

نئے کپڑے پہن کر میرے دل میں نہانے کی خواہش جاگی اور میں ٹوائیلٹ کی طرف بڑھ گیا کہ باتھ روم تو ادھر تھا ہی نہیں مگر جب پانی کو ہاتھ لگایا تو نہانے کی خواہش دم توڑ گئی۔ اتنے زیادہ ٹھنڈے پانی سے نہانے کا مطلب خودکشی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں چپ چاپ کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازہ کھلا اندر داخل ہونے والے نئے آدمی تھے۔ ایک نے ہاتھ میں ایک میلا سا گدا ایک کمبل اور ہلکا سا تکیہ پکڑا ہوا تھا جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے۔ کھانے میں تین روٹیاں اور پالک نما سبزی میرے سامنے رکھی گئی۔ مجھے کھانا کھائے ہوئے کافی دیر گزر گئی تھی اس لیے میں تینوں روٹیاں چٹ کر گیا وہ دونوں برتنوں کے انتظار میں ادھر ہی کھڑے رہے۔ جیسے ہی میں کھانے سے فارغ ہوا وہ برتن اٹھا کر چلے گئے۔ میں نے گدا فرش پر بچھایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا ویسے بھی اس کے علاوہ میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹریننگ کے دوران ہمیں قیدی کیمپوں سے فرار کے طریقے سکھائے گئے تھے مگر وہ مروجہ قیدی کیمپوں کے متعلق تھے اور اس جگہ قابل عمل نہیں تھے اس قسم کے حالات کے لیے ہمارے انسٹرکٹرز کہتے تھے کہ "یہ بندے کی اپنی صوابدید ہے کہ ایسے حالات میں وہ بچ نکلنے کے لیے کیا طریقہ کار اپناتا ہے لیکن اتنا ضروری ہے کہ صبر سے کام لے اور تیزی میں درستی نہ بھولے اور سب سے اہم یہ کہ بچ نکلنے کے لیے اگر کسی اخلاقی ضابطے کی قربانی دینی پڑے تو دریغ نہ کرے۔"

میں بھی کمبل میں سر چھپا کر وہاں سے فرار ہونے کے طریقوں کے بارے سوچنے لگا۔ مگر کوئی ترکیب ذہن میں نہ آتی دیکھ کر اُکتا گیا اور میری سوچوں کا دھارا ایک دفعہ پھر اپنے گاؤں کی طرف مڑ گیا اور یہی کچھ سوچتے میں گہری نیند سو گیا۔ اگلی صبح ناشتا لانے والوں کی آواز سے ہی میری آنکھ کھلی۔ گو اس کمرے میں وقت کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا لیکن چائے کے برتن دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ صبح کا ٹائم ہے۔

حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر میں نے ناشتا کیا جو چائے اور ڈبل روٹی پر مشتمل تھا ناشتا کرنے کے دوران ناشتا لانے والے خاموشی سے مجھے گھورتے رہے ان کے چہروں پر مجھے کوئی خاص تاثرات نظر نہ آئے۔ ان کے سپاٹ چہروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے بارے لاعلم تھے۔

+ + +

اگلے دو دن میں نے اسی کمرے میں گزارے تاحال مجھ سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی۔ تیسرے دن ناشتے کے قریباً دو گھنٹے بعد بلاوا آ گیا۔ مجھے بلانے والے وہی دونوں تھے جنھوں نے میری تصاویر نکالی تھیں۔ اس دفعہ دونوں نے ہاتھوں میں پستول پکڑے ہوئے تھے میں خاموشی سے ان کے آگے ہو لیا لیکن کمرے سے نکلتے ہی مجھے ان کے سہارے چلنا پڑ گیا کہ انھوں ایک کالے نقاب سے میرا چہرہ ڈھانپ دیا جس کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مختلف موڑ مڑنے کے بعد مجھے سیڑھیوں سے اوپر لے جایا گیا۔ میں نے سیڑھیاں گنیں وہ تعداد میں 16 تھیں۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے کافی گھما پھرا کر ایک کمرے میں لایا گیا اور اس سے ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ میں اس عمارت کے بارے میں کسی قسم کا اندازہ نہ لگا سکوں۔ میری آنکھوں سے پردہ ہٹا تو میں نے خود کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس

کی دیواریں شیشے کی تھیں جن سے باہر کا منظر نہیں آ رہا تھا شاید باہر سے اندر دیکھنا ممکن ہو لیکن یہ بات میں اندازے سے ہی کہہ سکتا ہوں۔ کمرے کے وسط میں ایک کرسی رکھی تھی مجھے اسی پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ چاروں کونوں میں ہتھیار بند افراد چوکنے انداز میں کھڑے تھے۔ میرے سامنے ایک صوفہ سیٹ اور شیشے کی ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ صوفہ سیٹ خالی پڑا تھا۔ چند لمحوں بعد شیشے کا دروازہ کھلا اور تین اشخاص اندر داخل ہوئے۔ ان میں دو مرد اور ایک عورت تھی۔ دونوں مرد تھری پیس سوٹ میں جبکہ عورت کھلے بلاؤز کی ساڑھی میں ملبوس تھی دونوں مردوں کی بہ نسبت عورت کم عمر نظر آ رہی تھی اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ تینوں خاموشی سے آ کر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے، چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد ان میں سب سے بڑی عمر کا جو میرے خیال کے مطابق سب سے سینئر تھا اور اس خیال کی وجہ مرد اور عورت کا مؤدبانہ انداز تھا، وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تمھارا نام؟۔''

''عمر جان۔'' میں مختصراً بولا۔

''آرمی سے تعلق رکھتے ہو؟۔''

''جی۔''

''نمبر اور رینک کیا ہے؟''

''نمبر......اور سپاہی ہوں۔'' (سیکورٹی کے لحاظ سے میں اپنا نمبر لکھنے سے گریز کر رہا ہوں البتہ قارئین کی معلومات کے لیے اتنا بتاتا چلوں کے آرمی سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو ایک نمبر الاٹ کیا جاتا ہے جو کہ سات فگر پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلکہ آرمی میں گھوڑوں، خچروں، کتوں اور ہتھیاروں تک کو مخصوص نمبر الاٹ کیے جاتے ہیں۔)

''ہونہہ! اس کا مطلب ہے تیرا تعلق فرنٹیئر فورس سے ہے؟۔''

''جی۔'' مجھے اس کی معلومات پر اچنبھا نہیں ہوا کیونکہ مجھے علم تھا کہ دونوں ملکوں کی آرمی ایک دوسرے سے متعلق کافی معلومات رکھتی ہے۔

''یونٹ؟۔''

''سوری سر۔'' میں مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ جنیوا معاہدہ کے خلاف ہے۔''

اس کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''جوان وہ معاہدہ جنگی قیدی کے لیے ہے جبکہ تم جاسوس بلکہ تخریب کار ہو۔ ہم تمھارے لیے اس قسم کا کوئی حق ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بہرحال وہ بعد کی بات ہے......فی الحال تم یہ بتاؤ کہ تم نے سرحد کس مقصد کے لیے عبور کی اور تمھارے ساتھ اور کون کون تھا۔''

جواباً میں نے اپنے بھگوڑا ہونے کی وجوہات اور راستا بھول کر سرحد عبور کرنے کی تفصیلات سے لے کر اپنے گرفتار ہونے کے

واقعہ تک من وعن سب کچھ تفصیل سے بتا دیا البتہ رشی پوسٹ پر حملے کا ذکر میں گول کر گیا۔

''خوب۔کہانی اچھی ہے اور کوئی خاص جھول بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔اس کا مطلب ہے۔گھڑی ہوئی ہے...... میں صرف حقائق جاننے میں دلچسپی رکھتا ہوں مسٹر عمر جان کمانڈو!'' وہ میرا نام چبا چبا کر بولا۔

''کمانڈو؟۔'' میں سچ مچ حیران ہو گیا۔

''ہاں کیا تمھیں اپنے کمانڈو ہونے میں شبہ ہے؟''۔

''نہیں!اگر آپ مجھے کمانڈو سمجھ کر خوش ہوتے ہیں تو مجھے کمانڈو بننے میں کوئی اعتراض نہیں۔''

''مسٹر!تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ صوبیدار داس کی پوری پارٹی کی لاشیں تلاش کر لی گئی ہیں۔پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق لکشمن کے علاوہ تمام کی موت برف میں دبنے سے ہوئی ہے اور لکشمن گردن ٹوٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوا ہے اور اس کی گردن جس مخصوص انداز میں توڑی گئی ہے وہ پاکستانی کمانڈوز کا خاص انداز ہے۔دوسرے تیرے ہاتھ میں پائے جانے والی شارٹ مشین گن بھی لکشمن ہی کی تھی اور یہ تو تجھے معلوم ہوگا کہ آرمی میں ہر جوان کے نام پر ہی ہتھیار ایشو کیا جاتا ہے۔اس لیے ہمیں ایس ایم جی کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔'' وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر بولا۔''رشی پوسٹ پر ہمارے چھ جوان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ان کے جسموں میں پائے جانے والے بلٹ اسی گن سے فائر ہوئے ہیں۔اب تم کیا کہتے ہو؟''

''لکشمن کی گردن کسی اور وجہ سے بھی ٹوٹ سکتی ہے اور ضروری نہیں کہ گولیاں اس گن سے چلائی گئی ہوں وہ اس کیلبر کی کسی بھی گن سے چلائی گئی گولیاں ہو سکتی ہیں اور اس قسم کی گنیں ہمارے مجاہدین کے پاس عام ہیں۔''

''ہونہہ!تمھارے مجاہدین''۔وہ طنزیہ انداز میں بولا۔''تم نے بچکانہ باتیں کر رہے ہو؟۔حالانکہ تمھیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ کسی بھی فائر شدہ بلٹ سے اس ہتھیار کو پہچاننا مشکل نہیں ہے جس سے یہ فائر ہوا ہو۔دنیا میں کہیں ایسے دو ہتھیار موجود نہیں جن سے فائر کیے گئے بلٹ بالکل ایک جیسے ہوں یہ اسی طرح سے ہے جیسے دنیا میں دو بندوں کے انگلیوں کے نشان آپس میں نہیں ملتے،لیکن پھر بھی تجھے اعتراض ہے تو میں وہ بھی دور کیے دیتا ہوں۔ہری چند۔'' اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی اور اگلے ہی لمحے کمرے میں وہ بندہ داخل ہوا جسے میں نے رشی پوسٹ پر کک مار کر بے ہوش کیا تھا۔وہ وردی میں ملبوس تھا اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے بات چیت کرنے والے کو سیلوٹ کیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''اسے جانتے ہو؟'' وہ اس سے مستفسر ہوا۔

''جی سر......اس نے اس رشی پوسٹ پر لات مار کر مجھے بے ہوش کیا تھا۔''

''ہاں جی......کمانڈو صاحب اب بتاؤ۔'' اس بار اس کے لہجے میں استہزا کا پہلو نمایاں تھا۔

''وہ سب جان بچانے کی فطری کوشش تھی ورنہ قتل وغارت میرا مقصود ہوتا تو میں اس کو۔'' میں نے ہری چند کی طرف اشارہ کیا۔

’’اور اس کے ساتھ موجود دوسرے بندے کو زندہ نہ چھوڑتا۔‘‘

’’ہری چند تم جاؤ۔‘‘ وہ ہری چند سے مخاطب ہوا اور وہ ایک مرتبہ پھر سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

’’گپ شپ بہت ہوگئی مسٹر اب تم فرفر اپنے ساتھیوں کے نام اور سرحد پار کرنے کا مقصد بیان کرنا شروع کر دو؟‘‘

’’میں نے جو بتانا تھا وہ بتا چکا......اس کے علاوہ میرے پاس بتانے کو کچھ نہیں۔‘‘

’’اس کو نمبر چار میں لے جاؤ۔‘‘ وہ اپنے ساتھ بیٹھے مرد سے بولا۔’’میں دیکھتا ہوں کہ اس کے پاس بتانے کو کچھ ہے کہ نہیں۔‘‘

’’یس سر۔‘‘ وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

مجھے پتا چل گیا کہ میری بدبختی کی شروعات ہوگئی ہے،لیکن ایک امید کے سہارے میں سٹول پر بیٹھے بیٹھے اچھلا میرا ارادہ ان کے سینئر کو قابو کر کے فرار ہونے کا تھا۔گو صوفہ سیٹ اور سٹول کے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا اور درمیان میں ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی لیکن وہ چند قدم کا فاصلہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا میں پہلی چھلانگ میں ٹیبل تک جا پہنچا اور جیسے ہی دوسری مرتبہ اچھلا میرے سینے پر ایک زبردست کک لگی اور میں کولہوں کے بل فرش پر گر گیا۔یہ حملہ سینئر کے ساتھ بیٹھے قد آور شخص نے کیا تھا۔میں تیزی میں درستی بھول گیا تھا اور حملہ کرتے وقت اپنے دفاع سے غافل ہوگیا تھا۔اس کے خمیازے میں مجھے اپنے سینے پر ایک زبردست چوٹ کھانی پڑی تھی۔

میرے گرتے ہی وہ ٹیبل پھلانگ کر آگے آیا اور بولا۔

’’مجھے میجر شرما کہتے ہیں۔‘‘ ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ میں نے زمین پر اپنے دونوں ہاتھوں کو ٹیک کر کمر کو جھٹکا دیا اور اس کے مدمقابل کھڑے ہوتے ہی اپنی دائیں ٹانگ بجلی کی سی سرعت سے اس کے پیٹ میں لگائی اور وہ ’’اوغ‘‘ کی آواز نکلتا ہوا ٹیبل سے گزر کر اپنے سینئر کے قدموں میں جا گرا۔

اس کے گرتے ہی میں بولا۔’’اور مجھے عمر جان گنڈہ پور کہتے ہیں۔‘‘ مجھے پتا تھا کہ ابھی اسے اٹھنے اور سنبھلنے میں چند لمحے لگ جانے تھے۔اس اثناء میں مَیں ان کے سینئر کو قابو میں کر سکتا تھا،لیکن میرے ایکشن میں آنے سے پہلے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی لڑکی اچھل کر کھڑی ہوئی اور اپنے کھلے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چھپا سا پستول نکالتے ہوئے للکاری۔

’’خبردار......ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو پستول کی ساری گولیاں تیری کھوپڑی میں اتار دوں گی۔‘‘ چہرے کی طرح اس کی آواز بھی دلکش تھی مگر اس وقت مجھے یہ آواز کسی چڑیل سے بھی بدتر لگی۔میں ٹھٹک کر رک گیا۔کمرے کے اندر چاروں کونوں میں کھڑے محافظ بھی اس کی للکار سنتے ہی گویا ہوش میں آگئے اور رائفلیں سونتے میری جانب بڑھے۔

’’ہینڈز اپ۔‘‘ ان میں سے ایک گرجا اور میں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لئے۔

ایکشن میں آتے وقت میں نے کونوں میں کھڑے محافظوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔میرا اندازہ تھا کہ جب تک وہ صورت حال کو سمجھ پاتے میں حالات اپنے موافق کر چکا ہوں گا۔اور یہ سب کچھ میرے اندازے کے مطابق ہو جانا تھا اگر درمیان میں پہلے

میجر شرما اور بعد میں وہ لڑکی رکاوٹ نہ بنتے۔
وہ ابھی تک مجھ پر پستول تانے کھڑی تھی۔ میجر شرما بھی آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے کی زیادتی اور خفت کے مارے اس کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے نام کا استعمال کرتے ہوئے بہت بڑی بڑھک ماری تھی مگر اسے منہ کی کھانی پڑی اور اب یہ خفت اور شرمندگی میری ٹھکائی کرنے کے باوجود ختم ہونے والی نہیں تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دوران ان کا سینئر سپاٹ چہرہ لیے صوفے پر براجماں رہا۔ لیکن جیسے ہی میجر شرما ڈگمگاتے قدموں سے میری جانب بڑھا وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔
''نہیں شرما!'' اور اس کے الفاظ نے جیسے جادو اثر کام کیا اور شرما خاموشی سے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی بھی پستول کو اس کے مقام پر غائب کر کے میجر شرما کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
''مسٹر کمانڈو! تیرا کیا خیال تھا مجھ پر قابو پا کے تم یہاں سے فرار ہو جاتے۔ نہایت بیوقوفانہ اور احمقانہ خیال تھا تیرا...... مجھ پر قابو پا کے صرف مجھے قتل ہی کر سکتے تھے اور اس کے نتیجے میں اپنی تکلیفات بڑھانے کے علاوہ تجھے کیا ملتا؟ اب بھی تم اپنے لیے ہر قسم کی رعایت کا حق ختم کر چکے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکی کی جانب متوجہ ہوا۔
''نیلم۔''
''جی سر۔''
''اسے نمبر 6 میں بھجوا دو، اس کا کیس بھی اب تم نے ہی ہینڈل کرنا ہے...... اور شرما تم اس وقت تک اس تفتیش سے لاتعلق رہو گے جب تک انکوائری مکمل نہیں ہو جاتی۔'' دونوں نے ''یس سر'' کہہ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
''شرما تم میرے ساتھ چلو۔'' ان کا جواب سنتے ہی وہ اٹھتے ہوئے بولا اور میجر شرما اس کے ساتھ چل پڑا۔
ان کے کمرے سے نکلتے ہی مجھے لانے والے دونوں کمرے میں داخل ہوئے اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو ہتھکڑی میں جکڑتے ہوئے ان میں سے سینئر نیلم سے مستفسر ہوا۔
''اسے کہاں لے جانا ہے میڈم؟''
''آں...... ہاں۔'' نیلم جو بڑے غور سے میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''وکرم اسے نمبر چھ میں لے جاؤ۔''
اور وہ ''یس میڈم'' کہہ کر مجھ سے بولا۔ ''چلو'' میں خاموشی سے ان کے آگے ہو لیا۔
غلطی سے یا جان بوجھ کر انھوں نے میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی تھی۔ کمرے سے نکلتے ہی ہم ایک گیلری میں پہنچے وکرم نے مجھے بائیں جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ چاپ اس جانب چل پڑا گیلری کی دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ آگے ایک چوراہا آیا وکرم نے مجھے ایک مرتبہ پھر بائیں جانب مڑنے کو کہا موڑ مڑنے کے بعد ہم 15 بیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک کمرے کے دروازے پر چھ نمبر کی تختی لٹکتی نظر آئی اور وکرم کی ہدایت پر میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کے وسط میں لوہے کی ایک کرسی پڑی

تھی اور دروازے کی سائیڈ کے علاوہ باقی تین اطراف میں دیوار کے اندر الماریاں بنی ہوئی تھیں جن کے پٹ غائب تھے ان کے اندر مجھے مختلف قسم کے اذیت رسانی کے آلات دکھائی دیئے۔ ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آیا کہ ان پہ ٹوٹ پڑوں اور لڑتا ہوا مارا جاؤں اس طرح کم از کم میری موت تو آسان ہو گی ورنہ تو انھوں نے اذیتیں دے دے کر میرا جینا حرام کر دینا تھا، لیکن پھر اچھے موقع کی امید اور زندہ رہنے کی خواہش نے مجھے اس اقدام سے باز رکھا۔

وکرم نے کرسی پر بٹھا کر میری ہتھکڑی کھولی اور کرسی کے دستوں کے ساتھ لگے لوہے کے کلپوں میں میرے ہاتھ جکڑ دیئے اسی طرح میری دونوں پنڈلیاں گھٹنوں تک کرسی کے مضبوط پائیوں کے ساتھ جکڑ دیں۔ اس اثنا میں تین رائفل بردار مجھے ہتھیار کی زد پر لیے کھڑے رہے میری ذرا سی حرکت پر وہ فائر کھولنے کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔

مجھے کرسی سے جکڑ کر وہ تمام کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی میں نے اپنے جسم کو ہلا جلا کر کرسی کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ کرسی مضبوطی کے ساتھ فرش میں گڑی ہوئی تھی اور کسی انسانی طاقت سے باہر تھا کہ اسے زمین سے باہر نکال سکے۔ اسی طرح کرسی کے دستوں اور پائیوں میں لگے لوہے کے کلپ بھی مضبوط سٹیل کے بنے ہوئے تھے۔ اپنی توانائی ضائع کرنے کی بجائے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد دروازہ کھول کر تین آدمی اندر داخل ہوئے تینوں میں مَیں صرف نیلم سے واقف تھا۔ باقی دونوں چہرے نئے تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ رحم نام کی چیز کبھی ان کے قریب سے بھی نہیں پھٹکی ہو گی۔ وہ دونوں تو الماریوں کی طرف بڑھ گئے اور نیلم سبک قدموں سے چلتی ہوئی میرے سامنے آ کر رک گئی۔

"تو پھر کیا خیال ہے جان......" جان کی نون پر زور دیتے ہوئے وہ مترنم آواز میں مستفسر ہوئی۔ "کرنل صاحب کے پوچھے گئے سوالوں کے جواب یاد آئے ہیں یا ہمیں کوشش کرنی پڑے گی۔"

"جو حقیقت تھی وہ میں نے بتلا دی، اب آپ بتائیں کہ مجھ سے کیا سننا چاہتی ہیں۔ جو کہیں گی وہی بولوں گا۔"

"تمھارا خیال ہے کہ گھنٹا دو گھنٹا ایک کرنل جو تمھارے ساتھ مغز ماری کرتا رہا ہے وہ ڈراما تھا۔ مسٹر جان...... تمھیں سزا دینے کے لیے ہمیں کسی فردِ جرم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے وہ حقائق معلوم کرنے ہیں جن کی وجہ سے تم نے سرحد عبور کی ہے۔ جو ڈرامائی سچویشن تم بیان کر رہے ہو۔ یہ صرف ڈراموں اور ناولوں میں اچھی لگتی ہے۔ حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"آپ کو میری کہانی میں ایسا کون سا جھول یا ڈرامائی سچویشن نظر آئی ہے جس سے آپ اسے جھوٹ سمجھنے پر مصر ہیں؟"۔

"ایک مرتبہ ہمارا جاسوس کشمیر کی طرف سے سرحد عبور کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس کے کاغذات وغیرہ بھی مکمل تھے۔ جب اسے ایک آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے جاسوس سے چھ کلمے سنے جو اس جاسوس کو اچھی طرح ازبر تھے۔ آفیسر نے اسے ایف آئی یو کے حوالے کر دیا کہ یہ لازماً جاسوس ہے اور انوسٹی گیشن والوں کی سختی کے سامنے اس جاسوس کو اقرار کرنا پڑا۔ اب آپ کو میرے شک کرنے کی وجہ سمجھ آ گئی ہو گی۔"، نیلم شک کی وجہ تفصیل سے بتاتے ہوئے بولی۔

''میں جھوٹ موٹ بھی تو کچھ بول سکتا ہوں؟۔''

''ناممکن۔''اس نے انکار میں سر ہلایا۔''آج کل آپ کے ملک میں جو کھچڑی پک رہی ہے ہمارے ناک اس کی خوشبو سونگھ سکتے ہیں۔''

''کون سی کھچڑی؟''میں مستفسر ہوا۔

''وہ...... یہ دونوں تمھیں بتا دیں گے، میری زبان تمھیں سمجھ نہیں آرہی۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔اس کے باہر نکلتے ہی دونوں جلاد میرے قریب آگئے۔ایک نے ہاتھ میں بجلی کا ننگا تار پکڑا ہوا تھا جبکہ دوسرا خالی ہاتھ تھا۔اس نے بجلی کا تار لوہے کی کرسی سے ٹچ کیا۔ مجھے بے اختیار جھٹکا لگا اور جب تک اس نے تار کرسی سے لگائے رکھی یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی میری روح کھینچ کر نکال رہا ہو۔ چند سیکنڈز کے بعد اس نے تار ہٹالی۔تار کے کرسی سے دور ہوتے ہی میں نے گہرا سانس اندر کھینچا اس ظالم نے اچانک دوبارہ تار کرسی سے لگا دی اس مرتبہ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی اور پھر یہ چیخیں جاری رہیں۔اس دوران میں دو دفعہ بے ہوش ہوا۔مگر ان دونوں ظالموں کے کان پر جوں بھی نہ رینگی وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے پلگ نکال کر تار کو لپیٹا میں نے سوچا شاید انھیں میری بے گناہی کا یقین آگیا ہے مگر یہ میری خام خیالی تھی۔وہ دونوں الماری سے پلاسٹک کی ایک تھیلی نکال کر لے آئے اور میرے سر پر چڑھا کر نیچے سے اس کی سٹرپ بند کر دی۔سٹرپ کے بند ہوتے ہی میرا سانس گھٹنا شروع ہو گیا۔میں نے بے ساختہ منہ کھول کر سانس لینا شروع کر دیا مگر اس تھیلے کا کپڑا پلاسٹک نما تھا اور اس سے ہوا کا گزرنا ناممکن تھا میں بمشکل ایک منٹ تک برداشت کر پایا،اس کے بعد میرے جسم کو بے ساختہ جھٹکے لگنے شروع ہو گئے میری حالت بے پانی کے مچھلی جیسی ہو گئی۔غشی طاری ہونے سے پہلے ہی انھوں میرے چہرے سے وہ تھیلا اتار لیا۔میرے مردہ جسم میں جیسے زندگی دوڑ گئی اور میں گہرے گہرے سانس لینے لگا لیکن ایک دو سانس ہی لے پایا ہوں گا کہ انھوں نے تھیلا دوبارہ چڑھا دیا......بجلی کے کرنٹ کی طرح یہ کھیل بھی کافی دیر جاری رہا۔میرے سر میں سخت قسم کا درد شروع ہو گیا تھا۔بدن میں گویا جان ہی نہیں رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ تفتیش کے خاتمے تک شاید میں ٹھکانے لگ جاؤں،مگر وہ دونوں جلاد اس کام میں مہارت رکھتے تھے۔ان کی پہلی ترجیح قیدی کو زندہ رکھنا تھا،لیکن وہ زندگی بھی ایسی تھی کہ قیدی ہزار بار مرنے کی خواہش کرے۔کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہمیں فرضی تفتیش کے مرحلے سے بھی گزارا گیا تھا۔جس میں ہمیں مختلف قسم کی اذیتیں دی گئی تھیں،لیکن وہ تکالیف اور اذیتیں جتنی زیادہ بھی ہوتیں۔بطور ٹریننگ تھیں۔

دونوں نے تھیلا نما غلاف میرے سر سے اتارا۔دونوں بازو کرسی کے دستے سے آزاد کیے اور چھت کے کنڈوں کے ساتھ لٹکتی زنجیر میں جکڑ لیے۔اس کے بعد کرسی سے جکڑے پاؤں بھی آزاد کیے اور کرسی کے نٹ کھول کر اس کو فرش سے جدا کر کے ایک طرف رکھ دیا۔اگلے مرحلے میں انھوں نے زنجیر کو کھینچ کر ٹائیٹ کیا یہاں تک کہ میرے پاؤں ایک فٹ کے قریب ہوا میں بلند ہو گئے۔دونوں بڑی ترتیب اور انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سائنسدان اپنی لیبارٹری میں یا کوئی، ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں مشغول ہو۔دوران کارروائی انھوں نے مجھ سے یا آپس میں کوئی بات چیت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ چھت سے لٹکا کر انھوں

نے میرے پاؤں کے ساتھ وزن باندھا اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر دلچسپی سے مجھے گھورنے لگے۔

کچھ دیر تو میں نے اپنے بازوؤں کو اکڑا کر اپنے جسم اور فالتو وزن کو سہارا مگر کہاں تک آخر تھک کر مجھے جسم ڈھیلا چھوڑنا پڑا۔ جلد ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے بازو کندھوں سے جدا ہو جائیں گے۔ میں ہونٹ بھینچے اس تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کب تک۔ بظاہر نظر سادہ سی نظر آنے والی یہ سزا پہلی سزاؤں سے کم نہیں تھی۔

اچانک دروازہ کھول کر نیلم اندر داخل ہوتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''ہاں کچھ بتایا ہے اس نے۔''

''ابھی تک تو خاموش ہے میڈم۔''ایک مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے آج کل تمھاری کارکردگی کچھ اچھی نہیں جا رہی۔'' وہ خفگی سے بولی۔''تم دونوں کو میں نے آدھا گھنٹا دیا تھا اور اب گھنٹا ہونے والا ہے۔''اس کی بات سن کر میں حیران رہ گیا کیونکہ میرے خیال میں مجھے اذیتیں برداشت کرتے کافی دیر گزر گئی تھی۔ جبکہ وہ کہہ رہی تھی ابھی تک صرف گھنٹا گزرا ہے۔

''بکواس کر رہی ہے۔''میں نے دل ہی دل میں سوچا۔''یہ میرا مورال ڈاؤن کرنے کی نفسیاتی کوشش ہے۔''

''ہاں جان...... کچھ یاد آیا؟''وہ میرے قریب آکر لگاوٹ سے بولی مگر میں خاموش رہا۔

''واہ بھئی! مٹھو کی تو بولتی ہی بند ہوگئی ہے۔''یہ کہہ کر وہ ان سے مخاطب ہوئی۔''ونو ذرا اس کے پاؤں سے وزن ہٹاؤ۔''

ونو د نامی شخص نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں سے وزن کھولا اور ایک طرف رکھ دیا۔ میرے بازوؤں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا مگر تکلیف میں کوئی واضح کمی نہیں ہوئی۔ میرا اپنا وزن بھی کچھ کم تو نہیں تھا۔ بھرتی کے وقت میرا وزن 86 کے جی کے قریب تھا جو ٹریننگ کے بعد 76، 77 کلوگرام ہو گیا تھا۔

''ہاں جان! اب تو کچھ پھوٹو۔''میرے پاؤں سے وزن ہٹتے ہی وہ بولی۔

''جو حقیقت ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔ اب میرے پاس ایسی کوئی بات نہیں جس سے آپ لوگوں کی تسلی ہو اور جہاں تک تعلق ہے ہمارے ملک کا آپ کے ملک کے خلاف کسی سازش کے حوالے سے، اگر ایسا ہے بھی سہی تو میں اس سے ناواقف ہوں۔''

''چلو جب یاد آجائے پھر بتلا دینا...... ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔''اس کی بندشوں کو ڈھیلا کر دو تاکہ یہ فرش پر کھڑا ہو سکے اور تم دونوں بھی اب آرام کرو۔ باقی کا کام کل کر لیں گے۔''یہ کہہ کر وہ باہر کے جانب چل دی۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی ان دونوں نے میری بندشیں اتنی ڈھیلی کر دیں کہ میرے پاؤں آسانی سے زمین پر لگنے لگے۔ باہر نکلتے ہوئے وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولے تھے۔

میرے پاس وقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ بس اندازے سے میں یہی کہہ سکتا تھا کہ شام ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے۔ صبح ناشتے کے بعد میں نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا اس وقت مجھے بھوک سے زیادہ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

''شاید مجھے کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جائے۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ بھی اذیت دینے کا ایک طریقہ تھا۔ مجھے جلد ہی بھاگنے کی ترکیب کرنی تھی ورنہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری توانائی نے کم ہو جانا تھا، اس کے علاوہ دشمن مجھے کوئی ایسا نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ کہ میں بالکل ناکارہ ہو جاتا۔

میں نے ہاتھوں کو ہلا جلا کر زنجیر کی مضبوطی کا اندازہ کیا مگر محسوس یوں ہوا کہ اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے کا مطلب اپنے آپ کو تھکانا ہی ہے۔ اس کو توڑنا کسی انسان کی طاقت سے باہر تھا۔

میں مسلسل مختلف تدابیر سوچتا اور انھیں مسترد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کافی دیر ہوگئی۔ اس دوران مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔ سچ کہتے ہیں کہ نیند سولی پہ بھی آجاتی ہے۔ میں سونے جاگنے کی کیفیت میں تھا کہ اچانک اذیت خانے کا دروازہ کھول کر نیلم اندر داخل ہوئی۔ اس نے گاؤن پہنا ہوا تھا جس کا گریبان کافی نیچے تک کھلا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی گویا اس کے بدن سے منعکس ہو کر آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو ہتھیار بردار مرد تھے جنھوں نے ہاتھوں میں شارٹ گنیں پکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا شاید میری تفتیش کا دوسرا راؤنڈ شروع ہونے والا ہے، لیکن اس کے برعکس نیلم آہستہ آہستہ چلتے میرے قریب پہنچی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔

''جان...... تھک تو نہیں گئے۔'' وہ اپنا دایاں ہاتھ میری چھاتی پر پھیرتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔ ''بھوک بھی لگی ہوگی چلو میں تمھیں کھانا کھلاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ ان دونوں میں سے ایک سے مخاطب ہوئی۔

''رابندر اس کو کھولو''

رابندر نامی شخص نے اپنی گن سلنگ اَپ کی اور چھت سے لٹکتی زنجیر سے میرے ہاتھ کھول کر ہتھکڑی میں جکڑ دیئے، لیکن اس کے باوجود مجھے اتنا آرام محسوس ہوا جو بیان سے باہر ہے۔

ان دونوں کی نگرانی میں چلتا ہوا میں اذیت خانے سے نکلا نیلم میری راہنمائی کے لیے آگے چل رہی تھی۔ اس کی چال میں بھی ایک مخصوص قسم کا ردھم اور لے تھی۔ موٹا گاؤن بھی اس کے نشیب و فراز کو چھپانے میں ناکام نظر آرہا تھا۔ دو تین موڑ مڑنے کے بعد ہم سیڑھیاں اُترے اور پھر تہہ خانے میں اتر کر رکنے کی بجائے ایک سرنگ میں چل پڑے کچھ دور جا کر سیڑھیاں نظر آئیں۔ وہاں سے اوپر چڑھ کر ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ یہ ایک پُر تکلف خواب گاہ تھی۔

''تم دونوں دروازے کے باہر کھڑے رہو اور جب تک میں نہ بلاؤں اندر نہیں آنا۔''

دونوں ''جی میڈم'' کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

''جان ادھر بیٹھو۔'' ان کے کمرے سے نکلتے ہی نیلم مجھے ایک لگژری بیڈ پر بٹھا کر میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ میں سحر زدہ سا تھا اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ التفات کس لیے ہے۔

''یہ...... یہ...... سب کس لیے؟''۔ میرا لہجہ حیرانی سے پر تھا۔

''یہ......'' وہ زبردستی قہقہہ لگا کر بولی۔ ''یہ تو خود مجھے بھی پتا نہیں کہ کیا ہے؟'' اور میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔

''پریشان ہوگئے؟'' وہ میری حیرانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ''بات یہ ہے جان کہ تم مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے ہو۔ میں نے آج تک تم جیسا بھرپور مرد نہیں دیکھا۔ تم نے تو میری راتوں کی نیند اُڑا دی دیکھو۔'' وہ دیوار پر گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''رات کے دو بج رہے ہیں اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ تمھیں میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر بولی اور میں حیرانی سے اس کی طرف تکتا رہ گیا۔ وہ میری نظروں کی پرواہ کیے بغیر بستر سے اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں لگے فریج کی طرف بڑھ گئی اور وہاں سے ٹرے میں مختلف لوازمات سجا کر میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ میرے ہاتھ ہنوز ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ مگر اس نے میرے ہاتھ کھولنے کی بجائے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے مجھے کھلانا شروع کر دیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس سچویشن سے لطف اندوز ہوتا، مگر اس وقت حالات ایسے تھے کہ میری توجہ صرف کھانا کھانے کی طرف مبذول رہی اور میں بے جھجک اپنا پیٹ بھرنے میں مشغول رہا۔

چند ہی لمحوں میں مَیں ٹرے صاف کر چکا تھا۔

''اور لاؤں؟''۔ وہ لگاوٹ بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''نو تھینکس''

اس نے ٹرے تپائی پر رکھی اور میرے قریب کھسک آئی۔

''بہت مارا ہے ظالموں نے...... ہے نا؟'' وہ میرے بالائی دھڑ پر اپنے ملائم ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''آپ کے کہنے ہی سے تو سب کچھ ہوا ہے۔'' میں شکایتاً بولا۔

''بالکل جھوٹ۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں بے بس تھی وہ سب کچھ کیمرے کی آنکھ سے دیکھا جا رہا تھا۔ اگر میں تمھیں تکلیف میں دیکھنا پسند کرتی تو کبھی بھی کمرے سے باہر نہ جاتی۔''

''آپ کے باہر جانے کا مجھے کیا فائدہ ہوا؟''۔ میں ہنوز اس سے خفگی کا اظہار کر رہا تھا جیسے کوئی اپنوں سے کرتا ہے اور اس ساری ڈرامابازی کا مقصد وہاں سے بھاگنے کے لیے کوئی موقع تلاش کرنا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اس سے اچھا اور بہترین موقع شاید ہی پھر کبھی مل پاتا۔ اس وقت میرے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہتھکڑی تھی۔ اگر میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو نیلم اور اس کے دونوں باڈی گارڈز پر قابو پانا میرے لیے مشکل نہ ہوتا، میں چاہ رہا تھا کہ کسی بہانے نیلم سے اپنے ہاتھ آزاد کروالوں۔ مگر اس کے انداز سے نظر آ رہا تھا کہ وہ اس قسم کا

رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہے اور میرے ہاتھ بندھے رکھے ہوئے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہے جبکہ میں اپنے ہاتھ کھلوانے کے لیے تمام حدیں پار کرسکتا تھا بشرطیکہ اس کے بعد وہ میری ہتھکڑی کھول دیتی۔

''کم ازکم مجھے تو تکلیف نہیں ہوئی نا؟''اس نے اپنا فلسفہ جھاڑا۔

''نیلم تجھے میری بے گناہی کا یقین ہے؟۔''

''پتا نہیں،لیکن میں تجھے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔''

''کیوں؟''میں مستفسر ہوا۔

''پیارے جو لگنے لگے ہو۔''یہ کہہ کر وہ اپنی دونوں بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔اس کے نرم وگداز بدن نے میرے اندر آگ سی بھڑکا دی تھی،لیکن میں اس وقت اس قسم کی کسی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔مجھے پتا تھا کہ اپنی پیاس بجھانے کے بعد نیلم نے واپس مجھے اس اذیت خانے میں دھکیل دینا ہے اور یہ پیار کا اظہار اس کی خواہش کے پورے ہونے تک ہے۔

''نیلم!اگر چائے مل جاتی ؟۔''اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیتے ہوئے میں آہستہ سے بولا۔''میں نے کئی دنوں سے چائے نہیں پی۔''

''کیوں نہیں۔''وہ بمشکل مجھ سے جدا ہوتے ہوئے بولی۔''ابھی منگواتی ہوں۔''کہہ کر وہ دروازے کی سمت بڑھ گئی۔جیسے ہی اس کی پشت میری طرف ہوئی میں اپنے ہتھکڑی میں جکڑے ہاتھ سر سے گزار کر اپنے سامنے لے آیا کہ ایکشن لینے کے لیے ہاتھوں کا سامنے ہونا ضروری تھا۔

(کچھ قارئین کو شاید اس بات پر اچنبھا ہو کہ پیچھے جکڑے ہوئے ہاتھ کس طرح سر سے گزارے جاسکتے ہیں لیکن جن لوگوں نے بذات خود یہ مظاہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا ہو ان کے لیے یہ حیرانی کا باعث نہ ہوگا)

نیلم نے کمرے کے دروازے پر جاکر سکھدیو نامی باڈی گارڈ کو چائے لانے کے لیے بھیج دیا اور پھر دروازہ بند کر کے مستی میں لہراتی میرے جانب بڑھی لیکن نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی اسے گڑبڑ کا احساس ہوگیا اور اس میں لامحالہ میرے بندھے ہوئے ہاتھوں کا قصور تھا جو میری پشت کی بجائے سامنے نظر آرہے تھے۔وہ ٹھٹک کر رکی اور اپنے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا جو سراسر اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ پستول نکالنے والی ہے۔مگر میں اسے اس قسم کا کوئی موقع فراہم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔اس کا ہاتھ گریبان میں داخل ہونے سے پہلے میں اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ پستول لے کر باہر نمودار ہوتا میں اپنے دائیں پاؤں پر گھوما اور بائیں پاؤں کی چاپ اس کی گردن میں ماری وہ''اوغ''کی آواز کے ساتھ دبیز قالین پر ڈھیر ہوگئی۔میرے پاؤں ابھی تک ننگے تھے اس وجہ سے میں اسے جچی تلی چوٹ لگا سکا تھا۔اس طرح کہ وہ مرنے سے بچ جائے جیسا بھی تھا وہ میرے ساتھ ہمدردی سے پیش آئی تھی اور میں احسان فراموش نہیں تھا۔میں نے نیچے جھک کر اس کے گریبان کے نشیب میں پھنسا چپٹا سا پستول کھینچ کر نکال لیا۔

دروازے پر کھڑا اس کا باڈی گارڈ اندر کی کارروائی سے لاعلم تھا۔ پستول اپنی جیب میں ڈال کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ حسب توقع باہر ایک آدمی ہی نظر آیا جو دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''میڈم اندر بلا رہی ہے۔'' وہ مجھے دیکھ کر چوکنا ہو گیا تھا لیکن میڈم کے بلاوے کا سن کر ڈھیلا پڑتے ہوئے اندر کی طرف بڑھا۔ میں نے ایک طرف ہو کر اسے راستا دیا۔ نیلم جس جگہ گری ہوئی تھی وہ دروازے کے رُخ سے تھوڑا ہٹ کر تھی اس لیے آنے والا جب تک اندر داخل نہ ہو جاتا اسے دیکھ نہیں سکتا تھا اسی وجہ سے میں نے اسے وہاں سے ہٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا میں نے لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔ اس اثنا میں اسے بھی قالین پر ڈھیر ہوئی نیلم کو دیکھ کر خطرے کا احساس ہو گیا تھا مگر یہ احساس اس کے کسی کام نہ آسکا اور پیٹ میں لگنے والی میرے گھٹنے کی ضرب نے اسے ''آہ'' کی آواز کے ساتھ رکوع کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھ ملا کر اپنی کہنیوں کو دائیں بائیں سیدھا کیا اور دائیں کہنی کی ایک بھرپور ضرب اس کی کنپٹی پر لگائی جس سے وہ ترچھا ہو کر کمرے فرش پر بچھے قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کارروائی میں بمشکل چند سیکنڈ لگے تھے۔ میں نے جھک کر باڈی گارڈ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر بیڈ کی دوسری سمت ڈال دیا۔ اس کے بعد نیلم کو بھی گھسیٹ کر اسی کے ساتھ لٹا دیا اور باڈی گارڈ کی گری ہوئی شارٹ گن کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ چائے کے لیے جانے والا سکھدیو کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحوں کے بعد ہی دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری اور پھر ہلکی سی دستک دے کر وہ چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس کا اس طرح داخل ہونا اس بات کا مظہر تھا کہ وہ نیلم کے ساتھ کافی بے تکلف ہیں یا شاید اپنے ساتھی کو غیر موجود پا کر اس نے اسے کمرے کے اندر تصور کیا تھا اور یہ اس کے لیے بھی اندر آنے کا اجازت نامہ تھا۔

گن اس نے کندھے سے لٹکائی ہوئی تھی۔ کمرے کو خالی دیکھ کر وہ بے ساختہ رک گیا اور حیرانی سے دائیں بائیں نظریں دوڑانے لگا۔ مگر میں نے اسے زیادہ دیر اس حالت میں نہ رہنے دیا۔ سر پر لگنے والی شارٹ گن کی ضرب نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ٹرے میں رکھے چائے کے برتن بھی قالین پر بکھر گئے تھے۔

شارٹ گن کے سیفٹی لیور کو سنگل فائر پہ سیٹ کرتے ہوئے میں نے ہتھکڑی کی زنجیر کو شارٹ گن کی بیرل پر رکھا اور پاؤں کے انگوٹھے سے ٹریگر پریس کر دیا۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ ہتھکڑی درمیان سے ٹوٹ گئی اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ البتہ ہتھکڑی کے حلقے میری دونوں کلائیوں میں پھنسے رہ گئے تھے، لیکن وہ میری جسمانی نقل و حرکت میں مانع نہیں تھے۔ ان کو بھی گولی سے توڑا جا سکتا تھا مگر اس طرح ہاتھوں کے زخمی یا ناکارہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ جو مجھے کسی بھی صورت گوارا نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ آزاد ہوتے ہی سکھدیو اور دوسرے گارڈ کی تلاشی لے کر دونوں کی جیبوں سے بٹوے نکال لیے۔ سکھدیو کی چمڑے کی جیکٹ اتار کر میں نے پہن لی۔ اس ساری کارروائی میں بمشکل دو تین منٹ لگے۔ گن پکڑ کر میں دروازے کی سمت بڑھا ہی تھا کہ دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ قدموں کی آواز سے

مجھے اندازہ ہوا کہ دو آدمی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر دروازے کے نزدیک دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے سے قریب پہنچ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے نیلم کو آواز دی۔

''میڈم...... میڈم، خیر تو ہے۔ گولی چلنے کی آواز آئی ہے۔'' میڈم ہوش میں ہوتی تو ان کو آواز دیتی۔ اس لیے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

''لگتا ہے کمرے میں کوئی موجود نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' دوسری آواز آئی۔ ''ابھی چند منٹ پہلے تو یہاں فائر ہوا ہے۔''

پہلے نے کہا ''اندر داخل ہو کر دیکھ لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے غالباً دروازے پر دباؤ ڈالا اور دروازہ آہستہ آواز سے کھلنے لگا۔

اسی وقت میری نظر سکھدیو کے بے ہوش جسم پر پڑی اور مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس کا جسم بالکل دروازے کے سامنے پڑا تھا، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی دروازہ اتنا کھلا جس سے سکھدیو باہر کھڑے ہوئے آدمی کو نظر آ سکتا اندر آنے والا جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ہراساں آواز سنائی دی۔

''گوبند اندر گڑبڑ ہے۔''

''کون سی؟'' گوبند بولا اس کی نظر ابھی تک سکھدیو پر نہیں پڑی تھی۔

''اندھا ہے کیا؟'' پہلا آدمی دوسرے کواڑ کو بھی ٹھوکر مار کر کھولتا ہوا بولا۔ ''وہ سامنے سکھدیو مرا یا بے ہوش پڑا ہے۔''

''ارے یہ کیا؟'' گوبند نے سکھدیو کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں اندر داخل ہونے میں احتیاط برتیں گے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ زیادہ آدمیوں کو بلوا لیتے میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا اور گن دونوں ہاتھوں میں تھامے ان کے سامنے نمودار ہوا۔ دونوں نے کلاشنکوفیں (قارئین کی اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ کلاشن کوف اور ایس ایم جی بنیادی طور پر ایک ہی ہتھیار ہے فوج میں اس کو ایس ایم جی یا شارٹ مشین گن کہتے ہیں جبکہ سول لوگ عموماً کلاشنکوف یا مشین گن کہتے ہیں۔ اس کا اصل نام AK-47 اسالٹ رائفل ہے۔ یہ روس کی بنی ہوئی ہے۔ روس کے بعد یہ چائنہ نے بنائی اور آج کل تو پاکستان میں بھی بن رہی ہیں۔ ہر ملک کی بنائی ہوئی گن کی ساخت اور کارکردگی میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ اس کہانی میں کسی جگہ آپ کو شارٹ گن لکھا ہوا ملے یا کلاشنکوف لکھا ہوا ملے ہر دو ایک ہی چیز ہیں۔) پکڑی ہوئی تھیں لیکن میں نے انھیں ہتھیار سیدھا کرنے کا موقع نہ دیا، میرے ہاتھ میں موجود گن گرجی وہ دونوں چیختے ہوئے اپنی جگہ پر ڈھیر ہو گئے۔

میں نے ان دنوں کے ہتھیاروں کی میگزینیں اتار کر جیکٹ کی جیب میں ڈالیں اور ایک سمت متعین کر کے دوڑتا چلا گیا، میرے دونوں پاؤں ابھی تک ننگے تھے اور میرے پاس اتنا ٹائم بھی نہیں تھا کہ زخمیوں یا مرنے والوں کے پاؤں سے اپنے لیے جوتوں کا انتخاب کر سکتا۔

راہداری کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جو دور سے ہی کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے سامنے میں ایک لحظہ کیے رکا مگر کوئی آہٹ

یا آواز نہ سن کر آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک ڈرائنگ روم نما کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر اعلیٰ کوالٹی کے صوفہ سیٹ رکھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں وہاں رُکے بغیر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دروازے کے سامنے ایک مرتبہ پھر رک کر میں نے باہر جھانکا تو عمارت کے گیٹ پر دو افراد کھڑے نظر آئے۔ دونوں نے ہاتھوں میں ہتھیار پکڑے تھے۔ ان کی نظریں اسی سمت کو تھیں جہاں سے میں نے جھانکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں حرکت میں آئے اور ہتھیار کاک کرتے ہوئے میری سمت دوڑے، لیکن یہ بات انکی سوچ میں نہ آسکی کہ میرے پاس بھی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ میری گن ایک مرتبہ پھر گرجی اور وہ دونوں راستے میں ہی ڈھیر ہو گئے۔

پرانی میگزین اُتار کر میں نے نئی میگزین لگائی کیونکہ اس میگزین سے میں کافی گولیاں فائر کر چکا تھا اور گن کسی بھی اہم صورت حال میں دھوکا دے سکتی تھی۔ نئی میگزین اٹیچ کر کے میں نے باہر جھانکا مگر کوئی ذی روح نظر نہ آیا ساتھ والے بنگلے سے البتہ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے صحن میں نگاہ دوڑائی۔ ایک سوزوکی اور ایک سفید کلر کی ڈبل ڈور صحن میں کھڑی نظر آئیں۔ میں نے بھاگ کر مین گیٹ تک کا فاصلہ طے کیا دروازے پر ایک بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ گیٹ کے ساتھ بنی چیک پوسٹ میں جھانکنے پر دیوار کے ساتھ لٹکا چابیوں کا گچھا نظر آیا گچھا اُتار کر میں نے سب سے بڑی چابی تالے میں گھمائی تو وہ ایک کھٹکے سے کھل گیا۔ دروازے کے دونوں پٹ کھول کر میں ڈبل ڈور کی سمت بڑھا۔ گاڑی کے دونوں دروازے لاک تھے۔ گن کا بٹ مار کر میں نے کھڑکی کا شیشہ توڑا۔ اندر بیٹھ کر اگنیشن کی تاریں توڑ کر اسے سٹارٹ کیا اور دوڑاتے ہوئے مین گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں تھا کہ میں سوچ سمجھ کر کسی سمت کا تعین کرتا۔ اس لیے گیٹ سے نکلتے ہی میں بائیں جانب کا رخ کیا۔ سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں مجھے ایک دو چوکیدار نما بندے نظر آئے مگر انھوں نے میرے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا۔ مگر تھوڑی دور جانے کے بعد ہی مجھے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ وہاں بلاشبہ شہر کا امیر طبقہ رہائش پذیر تھا اور ایسے لوگوں کی رپورٹ پر پولیس ہمیشہ جلدی عمل کرتی ہے۔ بالکل اپنے پیارے ملک پاکستان کی پولیس کی طرح۔

میں جس گلی میں جا رہا تھا وہ مین سٹریٹ تھی اور پولیس نے بھی اپنی آمد کے لیے وہی گلی استعمال کرنی تھی۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اپنے گمان پر عمل کیا اور گاڑی ایک بغلی گلی میں موڑ دی جو نسبتاً تنگ تھی۔ دو تین موڑ مڑنے کے بعد وہ گلی ایک روڈ پر جا نکلی۔ یہ اچھا شگون تھا۔ پولیس سے مڈبھیڑ نہ ہونا میرے حق میں بہتر تھا۔ رات کافی بیت چکی تھی لیکن اس وقت بھی اکا دکا گاڑیاں دائیں بائیں حرکت کرتی نظر آرہی تھیں۔ پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔ روڈ پہ آتے ہی میں نارمل رفتار سے ایک سمت کو چل پڑا۔ دشمن کی قید سے تو میں آزاد ہو گیا تھا لیکن ہتھکڑی کے حلقے قید کی نشانی کے طور پہ میری کلائیوں کی زینت بنے ہوئے تھے۔ ان حلقوں سے چھٹکارے کے ساتھ مجھے اس ملک سے بھی نکلنا تھا، جو کافی مشکل نظر آرہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ہی پورے شہر کی پولیس اور خفیہ ایجنسیوں نے میری تلاش شروع کر دینی ہے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ میرے تازہ ترین فوٹو ان کے پاس تھے اور ان کی مدد سے انھیں میری تلاش میں دشواری پیش نہ آتی۔

میری سوچ کے گھوڑے گاڑی سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے لیکن کوئی واضح لائحہ عمل مجھے نہیں سوجھ رہا تھا۔ایک دفعہ تو میرا ارادہ ہوا کہ اسی گاڑی پر شہر سے نکل جاؤں لیکن پھر حالات کو مدِ نظر رکھ کر مجھے یہ فیصلہ ترک کرنا پڑا، کیونکہ گاڑی کا نمبر اور ساخت بشمول میرے حلئے کے پولیس کی چیک پوسٹوں پر پہنچ چکا یا پہنچنے والا تھا اور ایک کلاشنکوف کے سہارے پولیس کی بھاری نفری کا مقابلہ کرنے کے بارے سوچنا نری حماقت تھی۔

راستے میں مجھے ہوٹل بھی نظر آئے لیکن ان میں رہائش اختیار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ایک ویران روڈ پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں مجھے راگیر نظر آیا جو ہاتھ اٹھا کر مجھ سے لفٹ مانگ رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور آگے گزرتا گیا مگر پھر خیال آیا کہ اس اجنبی شہر میں آخر کب تک یونہی سرگرداں رہوں گا۔ سر چھپانے کے لیے کسی ٹھکانے کو تو تلاش کرنا ہے تو اسی راگیر سے ابتدا کیوں نہ کر لی جائے۔ یہ سوچ کر میں نے بریک لگائی اور گاڑی ریورس کرتا ہوا اس راگیر کے قریب آرکا۔اس کے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی میں نے گن اٹھا کر دروازے کے جانب اس طرح رکھ لی تھی کہ اسے نظر نہ آسکے۔اندرونی لائٹ میں نے پہلے سے بجھائی ہوئی تھی۔

وہ کوئی سکھ تھا۔گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے مجھے پرنام کیا۔میں نے بھی سر ہلا کر اسے جواب دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''کہاں جانا ہے۔''میں نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

''اگلے چوک تک۔''وہ مختصراً بولا۔

''جس جگہ اترنا ہو بتا دینا۔''

''جی۔''اس دفعہ اس کا جواب پہلے سے بھی مختصر تھا۔

''عجیب کم گو شخص ہے۔''میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے ذہن میں اپنا مدعا ترتیب دینے لگا،لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی واضح لائحہ عمل پر پہنچتا اچانک ہی وہ بولا۔

''بس جی یہیں روک دیں۔''اور میں نے بے اختیار بریک لگا دی۔اس کا ہاتھ دروازہ کھولنے والے ہینڈل کی بجائے اپنی اندرونی جیب کی طرف بڑھا اور جب باہر آیا تو ایک لمبے پھل کا خنجر اس کے ہاتھ میں جگمگا رہا تھا۔

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہیں اُتر جائیں۔''وہ خنجر لہراتا ہوا بولا۔''تھوڑی دیر تک کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی جو آپ کو گھر تک لفٹ دے دی گی۔''

''ہا......ہا......ہا......واہ بھئی واہ۔''میں قہقہہ لگا کر بولا۔''اس کو کہتے ہیں چور کو مور پڑنا۔''

''اے مسٹر۔''وہ میرے قریب ہوتا ہوا بولا۔''ہنسنے کا نہیں کا ہے، گاڑی سے اترنے کا بولا ہے۔''

اس مرتبہ اسے جواب دینے کی بجائے میں نے سرعت سے بائیں ہاتھ کے ساتھ اس کی کلائی پکڑی اور اپنی انگلیوں کا دباؤ مخصوص انداز میں اس کی کلائی پر ڈالا تو خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔جو میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھا لیا۔خنجر ہاتھ سے نکلتے ہی اس

کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی اس نے گڑگڑا کر اپنی جان بخشی کی درخواست کرنی تھی۔ اس طرح کے سڑک چھاپ پاکستان میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن انڈیا میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیئے ہوتے ہیں اور اس طرح کے بندوں کو معاف کر دینے کا میں کبھی بھی قائل نہیں رہا، لیکن اس وقت میں خود اس قسم کے بندے کی تلاش میں تھا۔ جو زیر زمین دنیا تک میری رہنمائی کرتا۔ کسی بھی بڑے غنڈے کا آشیر باد حاصل کر کے میں آسانی سے سرحد پار کر سکتا تھا بصورت دیگر میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ دشمن ملک میں ایک جاسوس کا سب سے بڑا سہارا اسی قسم کے دو نمبر لوگ ہوتے ہیں۔

''مم معافی چاہتا ہوں۔ آپ تو بڑے لوگ ہیں جناب۔'' میری انگلیوں کے دباؤ سے ہی اسے میری فنکاری کا اندازہ ہو گیا تھا اور اس نے بجائے میرے ساتھ ہاتھا پائی کرنے کے ہار ماننے میں عافیت سمجھی۔

''سمجھدار ہو۔'' میں نے اس کی کلائی اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

''شش شکریہ۔'' وہ اپنی کلائی کو مسلتا ہوا بولا۔ ''مم میں جا سکتا ہوں۔''

''چلے جانا۔'' میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا اس کا خنجر میں نے اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ ''اتنی بھی کیا جلدی ہے۔''

''وہ......وہ......میں نے؟''

''مجھے پتا ہے تُو نے جو کرنا ہے۔'' میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا اور وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔

''ویسے یہ گاڑی کیسی ہے۔'' میں نے گفتگو آگے بڑھائی۔

''اچھی ہے۔''

''اس کو ٹھکانے لگانا ہے۔''

''کیا؟'' وہ اچھل پڑا۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' میں نے گاڑی کی اندرونی لائٹ روشن کر کے اسے وہ جڑی ہوئی تار دکھاتے ہوئے کہا۔ جس سے میں نے گاڑی سٹارٹ کی تھی۔ ''تم خود دیکھ لو۔''

اس اثنا میں اس کی نظریں میری کلائیوں میں پڑے ہتھکڑی کے حلقوں پر پڑی۔ کیونکہ جیکٹ کی آستین اتنی لمبی نہیں تھی کہ ان کو ڈھانپ سکتی۔

''یہ ہتھکڑی ہے؟''

''ہاں۔ یہ ہتھکڑی ہی ہے۔'' میں اطمنان سے بولا۔ ''کنگن نہیں ہے۔ وہ عورتیں پہنتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے؟''

''بالکل اس کا مطلب واضح ہے کہ میں پولیس کی حراست سے بھاگا ہوا ہوں۔'' میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

وہ مستفسر ہوا۔''اب میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''اس گاڑی کوٹھکانے لگانا ہے۔ففٹی پرسنٹ تمھارے۔''میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا''اور میرے ففٹی پرسنٹ میں سے بھی آدھے تمھارے اور میرے لیے محفوظ ٹھکانہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری تمھاری۔''

''ٹھیک ہے ڈن ہوگیا۔''

''چلو پھر یہ رکھو۔''میں نے خنجراس کی سمت بڑھایا۔جواس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے پوچھا''کس طرف جانا ہے، میں اس علاقے سے بالکل انجان ہوں؟۔''اور وہ مجھے راستا بتانے لگا۔جلد ہی ہم ایک بڑی سی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔جو دیکھنے میں چھوٹا موٹا کارخانہ لگ رہی تھی۔

''بس یہیں روک لو۔''اوراس کے کہنے پر میں نے گاڑی عمارت کے گیٹ پر روک دی اس نے نیچے اتر کر کال بیل بجائی اور بغیر کسی دیر کے اندر سے چوکیدار ٹائپ بندہ نمودار ہوا یقیناًوہ گاڑی کی آواز سن کر پہلے سے تیار کھڑا تھا۔

''اوہو سردار جی تسی؟''میرے ساتھی کو پہچان کراس نے گرمجوشی دکھائی۔''بڑے دنوں بعد چکر لگایا ہے۔''

''کی کریئے رنجیت بھرا، جدوں تک کوئی چنگی شئے نئیں لبھدی میں اس طرف چکر نئیں لاسکدا''(کیا کروں رنجیت بھائی جب تک کوئی اچھی چیز نہ ملے میں اس طرف چکر نہیں لگا سکتا ہوں)

''اے تے فیر ہیے۔''رنجیت قہقہہ لگا کر بولا۔(یہ تو پھر ہے)''چلو میں گیٹ کھولتا ہوں تسی گڈی نوں اندر لے آوٗ۔''سردار سر ہلاتا ہوا ایک مرتبہ پھر میرے قریب آبیٹھا، جبکہ رنجیت نامی شخص نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

اس کے گیٹ کھولتے ہی میں گاڑی اندر لے گیا۔

''بس ادھر روک لو۔''وہ گاڑی کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب کرتے ہوئے بولا۔

''اور آپ گاڑی میں رہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن اپنی چادر مجھے دے کر جاوٗ۔''میں نے اس کی گرم چادر کی طرف اشارہ کیا جواس نے سردی سے بچنے کے لیے لپیٹی ہوئی تھی۔

''ہاں یہ لو۔''اس نے چادر میرے حوالے کی اور نیچے اتر گیا۔اس کے وہاں سے غائب ہوتے ہی میں جلدی سے نیچے اترا۔گن کو کندھے میں ڈالا اور اوپر سے گرم شال اوڑھ لی اس طرح کہ گن کے ساتھ ساتھ ہتھکڑی بھی چھپ گئی۔رنجیت نامی چوکیدار نے گیٹ بند کرنے کے بعد اس طرف آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چند لمحوں بعد میں میرا ساتھی ایک شخص کے ساتھ نمودار ہوا آنے والے نے ہاتھ میں ایک ٹارچ بھی پکڑ ہوئی تھی۔اس نے ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی اور پھر گاڑی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''دلیر سنگھ، چیز تو اچھی ہے۔'' وہ گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا تعریفی لہجے میں بولا۔

''کمال بھائی آپ کو تو پتا ہے کہ دلیر ہمیشہ اچھی چیزیں ہی لاتا ہے۔'' دلیر سنگھ فخریہ انداز میں بولا۔ اور کمال ہنس پڑا۔

''تو پھر کیا خیال ہے تیس بہت ہیں۔''

''کمال بھائی کچھ تو اپنے خدا کا ہی خوف کرو۔'' دلیر سنگھ بولا۔ ''یہ تیس کی ہے۔''

''چلو پچیس کر لو۔'' کمال نے رقم بڑھائی۔

''نہیں۔'' دلیر سنگھ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ستر سے ایک روپیہ بھی کم نہیں لوں گا۔''

''اب تم بھی اپنے واہ گرو کا خوف کرو۔'' اس مرتبہ کمال دلیر سنگھ پر چوٹ کرتا ہوا بولا۔ ''یہ بغیر کاغذات کے اور چوری کی گاڑی ہے۔'' وہ دونوں تھوڑی دیر قیمت پر بحث کرتے رہے آخر میں پچپن پر سودا طے ہو گیا۔ کمال جلدی سے اندر گیا اور ایک شاپر میں مطلوبہ رقم بھر کر لے آیا۔ جسے دلیر سنگھ نے گنے بغیر اپنی بغل میں داب لیا جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اسے کمال پر اعتماد تھا۔

''اب دلیر بھائی کوئی چائے پانی ہو جائے۔''

''مہربانی کمال بھائی۔'' دلیر سنگھ انکار کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے کہیں جانا ہے پھر کبھی آپ کی دعوت سے لطف اندوز ہوں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' کمال نے الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جسے دیر سنگھ نے تھام لیا۔

''بھائی کا تعارف آپ نے کرایا ہی نہیں۔'' اس مرتبہ کمال نے میری جانب ہاتھ بڑھایا اور میں نے ہاتھ چادر میں رکھتے ہوئے ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے گرمجوشی سے دبایا۔ یہ شکر تھا کہ اس کی نظر میرے ننگے پاؤں پر نہیں پڑی تھی۔

''یہ اپنا نیا ساتھی ہے۔'' دلیر سنگھ بات کو گول مول کرتا ہوا بولا۔ ''پھر کبھی اس کا تعارف کرا دیں گے یوں بھی اس سے اب ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔'' اور کمال بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''او کے پھر خدا حافظ؟'' کمال یہ کہہ کر اندر کی جانب چلا گیا جبکہ ہم بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گئے اور چوکیدار سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے اس عمارت سے باہر آ گئے۔

''یہ اپنے پاس رکھو۔'' گیٹ سے باہر آتے ہی دلیر سنگھ نے رقم والا شاپر میری جانب بڑھایا اور میں نے خاموشی سے شاپر اس کے ہاتھ سے لے کر جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

''آپ کا نام؟'' دلیر سنگھ مستفسر ہوا۔

''امیر خان۔''

''اس کا مطلب ہے آپ مسلمان ہیں۔''

''الحمدللہ۔''میں آہستہ سے بولا۔

''کس جرم میں گرفتار ہوئے تھے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔''میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔''فرصت میں بتاؤں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔''اس نے بھی اصرار نہ کرتے ہوئے کہا۔''اب جلدی چلو تاکہ صبح کی روشنی سے پہلے اپنی جگہ پر پہنچ جائیں۔''
اور میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیزی کر دی۔اس طرح کہ دلیر سنگھ کو میرا ساتھ دینے کے لیے آہستہ قدموں سے دوڑنا پڑا۔

''خان بھائی اتنا بھی تیز نہیں کہا ہے!اور میں نے ہنس کر اپنے قدموں کی رفتار اتنی آہستہ کر دی کہ دلیر سنگھ آسانی سے میرا ساتھ دے سکتا۔ہم مختلف ٹیڑھی میڑھی،تنگ اور چوڑی گلیوں سے گزرتے ہوئے آخر ایسے مکان کے سامنے پہنچے جو بمشکل دو کمروں اور ایک چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل تھا۔

دلیر سنگھ نے جیب سے چابی نکال کر بیرونی دروازہ کھولا اور جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے اسے اندر سے کنڈی لگا دی۔کمرے کے دروازے کو بھی تالا لگا ہوا تھا۔جسے کھول کر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔دلیر سنگھ نے لائٹ جلائی اور کمرے کے وسط میں پڑی واحد چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب بیٹھو۔''میں نے چادر اتار کر دلیر سنگھ کے حوالے کی اور کلاشنکوف کندھے سے اتار کر چارپائی کے ساتھ کھڑی کر کے بیٹھ گیا۔دلیر سنگھ کلاشنکوف کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''دلیر بھائی ان کنگنوں کا کچھ کرو۔''میں اپنی کلائیاں اس کے سامنے کرتے ہوئے مزاحیہ لہجے میں بولا۔

''ابھی لو خان صاحب یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''یہ کہہ کر وہ کمرے کے کونے میں رکھے ٹرنک کی طرف بڑھا اور اس کو کھول کر چابیوں کا ایک گچھا نکال لایا جس میں مختلف اقسام کی چابیاں شامل تھیں۔

میرے ہاتھ کو پکڑ کر اس نے ہتھکڑی میں چابی کے سوراخ کو دیکھا اور پھر ایک مناسب چابی کا انتخاب کر کے ہتھکڑی کے ساتھ زور آزمائی میں مصروف ہو گیا۔

چند لمحوں میں ہی وہ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی سے آزاد کرا چکا تھا۔

''بہت بہت شکریہ دلیر سنگھ''۔میں نے صدق دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''کوئی بات نہیں۔''کہہ کر وہ چابیاں واپس رکھنے کے لیے ٹرنک کی طرف بڑھ گیا۔جیسے ہی وہ چابیاں رکھ کر مڑا میں نے رقم کا شاپر اس کی طرف بڑھا کر کہا۔''اسے معاہدے کے مطابق تقسیم کر دو۔''اس نے شاپر کھول کر رقم نکالی اور کچھ رقم گن کر میرے حوالے کر دی جبکہ بقیہ اس بکس میں رکھ دی۔میں نے بھی بغیر گنے وہ رقم جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لی۔

''آپ کیا کھانا پسند کریں گے۔''رقم بکس میں رکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''صرف چائے اور اگر ہو سکا تو اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کرنے کو ترجیح دوں گا۔''

''ہاں نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔'' وہ جمائی لیتا ہوا بولا ''بہر حال آپ بیٹھیں میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' اس کے کمرے سے نکلتے ہی تکیہ سر کے نیچے رکھ کر میں مستقبل کے بارے سوچنے لگا۔ دلیر سنگھ ایک سڑک چھاپ غنڈہ تھا اور اس کے قسم کے غنڈوں میں ظرف بہت کم ہوتا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ مجھے گرفتار کرانے کے لیے کسی انعام وغیرہ کا اعلان کر دیا جاتا۔ ایسی صورت میں مجھے حوالۂ پولیس کرنے والا سب سے پہلا شخص یہی دلیر سنگھ ہی ہو سکتا تھا۔

لیکن اس پر اعتبار نہ ہوتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کسی بھی مجرم ٹولے سے روابط استوار کرنے کے لیے مجھے دلیر سنگھ کے واسطے کی ضرورت تھی اس کے بغیر بھی یہ رابطہ ہو سکتا تھا لیکن اس طرح ٹائم زیادہ ضائع ہوتا اور ان حالات میں مَیں وقت ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں انھی سوچوں میں غلطاں پیچاں لیٹا تھا کہ دلیر سنگھ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

''سو گئے کیا؟'' اس نے میری بند آنکھوں کو دیکھ کر آواز دی۔

''نہیں تو؟'' میں جلدی سے اٹھتا ہوا بولا۔

''چلو پھر چائے پیو۔'' وہ میرے سامنے ٹرے رکھتا ہوا بولا جس میں چائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کے لوازمات بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں بھی بے تکلف ناشتے کو جڑ گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ دلیر سنگھ نے اپنے لیے ایک گدا فرش پر بچھا لیا تھا۔

میں نے رضائی اوڑھی اور سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا، لیکن تھکن کے باوجود مجھے جلدی نیند نہ آسکی اور میں کافی دیر اپنے موجودہ اور آنے والے حالات کے متعلق سوچتا رہا لیکن کب تک آخر نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی اور میں سو گیا۔

میں پتا نہیں کتنی دیر اور سوتا لیکن اچانک ایک نامانوس سی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں جاگ اٹھا۔ جاگتے ہی میری حسات بیدار ہو گئیں۔ ایک کمانڈو اور عام آدمی کی نیند میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ کمانڈو ایک آنکھ کھول کر سوتا ہے اور ماحول میں ہلکی سی بے قاعدگی سے بھی جاگ جاتا ہے۔ اسی طرح جاگتے ہی ایک کمانڈو کا ذہن نہ صرف ماحول کا ادراک کر لیتا ہے بلکہ اپنے دفاع کے بارے بھی مستعد ہو جاتا ہے۔

اس وقت بھی میں نے بروقت فیصلہ کیا اور چارپائی سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھا، لیکن ابھی دروازے سے چند قدم دور ہی تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ آنے والے تعداد میں تین نظر آ رہے تھے اور تینوں پستولوں سے مسلح تھے۔ میری گن چارپائی کے نیچے تھی۔ لے دے کے ایک نیلم والا چھوٹا سا پستول ہی رہ جاتا تھا جو میں نے قمیض اندر چھپایا ہوا تھا۔ اگر میں گن کی طرف بڑھتا تو وہ مجھے گن تک پہنچنے سے پہلے آسانی سے شوٹ کر سکتے تھے۔

کمرے میں ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جبکہ وہ تینوں تیز روشنی سے آ رہے تھے۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے ننھا سا پستول نکالا۔

اس دوران میری نظر سب سے آگے والے کی اس انگلی پر تھی جو اس نے ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔

''ہینڈز اپ''۔سب سے آگے والا دھاڑا۔

الفاظ ابھی اس کے منہ میں تھے کہ میں اپنے آپ کو فرش پر گراتے ہوئے پستول کا ٹریگر دباتا چلا گیا۔ ہلکے دھماکوں کے ساتھ تینوں بندے فرش پر ڈھیر ہو گئے میں اچھل کر کھڑا ہو گیا...... لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان تینوں میں درمیان والا بندہ ابھی صحیح سالم میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں موجودہ پستول کا رخ میری جانب تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گولی سے بچنے کے لیے اس نے بھی میری طرح اپنے آپ کو فرش پر گرا دیا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ حائل تھا اور دونوں کے ہتھیاروں کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ ہم دونوں کا مرنا یقینی تھا۔

''ہاں کمانڈو!'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''تو پھر کیا خیال ہے تمھارا، ان کھلونوں کو سائیڈ پر نہ کر دیں۔''

میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے تولا وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط شخص تھا ہلکے گھنگریالے بال چھوٹی چھوٹی سانپ کی مانند چمکیلی آنکھیں۔ کالی سیاہ رنگت، چھ فٹ کے قریب قد۔ دیکھنے میں وہ ہر لحاظ سے آئیڈیل لڑاکا لگ رہا تھا۔ مجھے چیلنج کر کے اپنے اوپر اسے جو اعتماد تھا اس کا اظہار بھی اس نے کر دیا تھا۔

''منظور ہے۔'' ایک لحظہ خاموش رہنے کے بعد میں اطمنان سے بولا۔

''امیر خان یہ غضب نہ کرنا۔'' اپنے بستر پر بیٹھا دلیر سنگھ جو پتا نہیں کس وقت جاگا تھا۔ تیزی سے بولا۔ ''یہ کوبرا ہے۔ تم اس سے واقف نہیں ہو، خالی ہاتھ اس کا مقابلہ کرنا تیرے بس سے باہر ہو گا۔''

''دلیر سنگھ تم سے تو بعد میں باتیں ہوں گی۔'' کوبرا پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آج سے پہلے تم صرف چور تھے۔ اب تم نے بھارت ماتا کے ساتھ غداری شروع کر دی۔''

''واہ گرو دی سوں (واہ گرو کی قسم) کوبرا میں اس کو نہیں جانتا ہوں۔'' دلیر سنگھ کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

''گھر میں تو اس طرح سلایا ہوا ہے جیسے بہنوئی ہو تیرا۔'' کوبرا زہر خند لہجے میں بولا۔

''اس نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی کہ یہ کار چور ہے۔'' دلیر سنگھ منمنایا۔

''افسوس یہ گاڑی تمھارے لیے پھندا ثابت ہوئی اس کے پیسے تم ہضم نہ کر سکے۔ بلکہ اس کی وجہ سے تو وہ کمینہ کمال بھی میرے شکنجے میں آ گیا ہے۔''

''کوبرا میں نے جتنی رقم کمال سے وصول کی تھی وہ ساری کی ساری واپس کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''رقم......'' کوبرا نے ایک بھیانک قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تم سے تو اب کافی وصولیاں ہوں گی۔''

''میرا خیال ہے کافی ڈائیلاگ بازی ہوگئی ہے۔'' میں جو کافی دیر سے ان کی بکواس سن رہا تھا اچانک بولا۔ ''اب کوئی کام کی بات ہونی چاہیئے۔''

''عمر جان یہی نام ہے تمھارا'' وہ میری طرف متوجہ ہوگیا۔

''عمر جان گنڈاپور عرف جانو کمانڈو!'' میں مزاحیہ لہجے میں بولا۔

''چلو پھر کمانڈو صاحب پستول سائیڈ پر کرو۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنا بازو جھکا لیا اور میں نے بھی اپنا پستول والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

''پستول جیب میں نہیں رہے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا پستول کمرے سے باہر پھینک دیا اور اپنے پاؤں میں پڑی دونوں لاشوں کے پستول بھی اٹھا کر باہر پھینک دیئے۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو آسانی سے اس کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

''کوبرا!'' جیسے ہی اس نے پستول باہر پھینکے میں نے اسے آہستہ سے پکارا اور اس نے بے ساختہ میری جانب دیکھا۔

''کہتے ہیں جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور میرا پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔'' میری بات سن کر کوبرے کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر یہ مسکراہٹ اعتماد سے محروم تھی۔

''تم اس طرح نہیں کر سکتے جانو کمانڈو۔''

''کیوں......؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''کیونکہ یہ تیرے کردار کی موت ہوگی۔ میں شاید جسمانی طور پر مر جاؤں مگر تُو روحانی طور پر فنا ہو جائے گا۔''

''صحیح کہا۔'' میں نے اپنا پستول باہر پھینکنے کا ارادہ کیا۔

''نہیں۔'' اس سے پہلے کہ پستول میرے ہاتھ سے نکلتا دلیر سنگھ چیخ کر بولا۔ ''اپنی موت کے پروانے پر دستخط مت کرو تم اسے نہیں جانتے۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' میں نے مڑ کر دلیر سنگھ کو کہا اور اس کے ساتھ ہی پستول کمرے سے باہر اچھال دیا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' کوبرا زہرخند لہجے میں بولا۔ ''لیکن تجھے دلیر سنگھ کی بات مان لینی چاہیئے تھی۔ پستول کے سہارے تم یہاں سے فرار ہو سکتے تھے۔''

مگر میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔

''کیوں۔ بولتی بند ہوگئی کیا؟'' مجھے خاموشی دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر گویا ہوا۔

''کوبرا تمھیں کیسے پتا چلا کہ میں اس گھر میں ہوں۔''

''ہاہاہا......'' اس نے ایک مرتبہ پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ''تم کوبرا کو جانتے نہیں ہو نا۔ اس لیے یہ بات کر رہے ہو۔ تم اگر پاتال میں بھی جا کر چھپ جاتے، کوبرا تمھیں وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ اب چونکہ تیری سانسیں پوری ہونے والی ہیں اس لیے بتائے دیتا ہوں

کہ تم نے جو ڈبل ڈور کمال ورکشاپ میں فروخت کی تھی اس کے بارے میں مجھے علم ہو گیا۔ کمال سے پتا کرنے پر دلیر سنگھ کا نام معلوم ہوا اور اس کے بعد۔ دو جمع دو چار۔" یہ کہتے ہی وہ اچھلا اور اس کی زوردار فلائنگ کک میری چھاتی پر لگی، میں اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے بے خبری میں مار کھا گیا اور کولہوں کے بل زمین پر جا گرا۔ نیچے گرتے ہی میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن کوبرا مجھ سے پہلے سیدھا ہو چکا تھا اور حملے کے لیے پینترے بدل رہا تھا۔ میرے کھڑے ہوتے ہی وہ بائیں پاؤں پر گھوما اور دائیں پاؤں کی ایڑی میری چھاتی میں ماری لیکن اس وار کو میں نے دونوں کلائیوں پر روکا...... ابھی میں اس وار سے سنبھلا ہی تھا کہ اس کی بائیں ٹانگ میرے پیٹ میں لگی میں اُڑ کر چارپائی پر جا گرا۔ میری سانسیں رکنے لگی تھیں، دلیر سنگھ کے کہنے کی طرح وہ واقعی بہت اچھا لڑاکا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چارپائی پر لیٹا رہوں مگر اس وقت آرام کرنے کا مطلب تھا ہمیشہ کا آرام۔ اس لیے میں چارپائی پر گرنے کے بعد کروٹیں بدلتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا اور میرا یہ ہٹنا کام آ گیا ورنہ جہاں میں ایک لمحہ پہلے گرا تھا اس جگہ پر کوبرا نے اپنے دونوں پاؤں ملا کر چھلانگ لگائی تھی۔ پیٹ میں ایک ضرب کھانے کے بعد اسی جگہ دوسری چوٹ برداشت کرنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا۔ چارپائی پر گرتے ہی وہ اچھلا اور تیر کی طرح میری طرف بڑھا مگر اس بار جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا میں تیزی سے سائیڈ پر ہوا اور اس کے تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی میں نے زوردار قسم کی کک اس کے کولہوں پر جڑ دی، لیکن دیوار کے ساتھ ہاتھ ٹیک کر وہ بڑی خوب صورتی سے اپنے آپ کو بچا گیا۔ اس کے سیدھا ہونے تک میں دوڑ کر مخالف کونے میں پہنچ گیا تھا۔ مجھے دوڑتا دیکھ کر اس نے استہزائی قہقہہ لگایا اور بولا۔

"بس...... عمر جان گنڈہ پور عرف جانو کمانڈو اتنی ہی ہمت تھی۔"

اس کے الفاظ اور لہجہ مجھے آگ لگانے کے لیے کافی تھا، لیکن میں نے اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھا اور اپنی سوچوں کا دھارا اپنے مشفق انسٹرکٹر صوبیدار مراد کی جانب موڑا۔

"جانو سب سے پہلے اپنے مخالف کو جانچو۔ اس کی لڑائی کے طریقے پر نظر رکھو۔ دیکھو کہ وہ کس ہاتھ اور کس پاؤں کا استعمال زیادہ کر رہا ہے کہیں وہ کھبا (بائیں ہاتھ والا) تو نہیں ہے۔ دوران لڑائی اس کے مضبوط پہلو نظر رکھو۔ اس کے ساتھ اپنے لباس کا بھی جائزہ لو کہیں تم نے کوئی ایسا لباس تو نہیں پہنا جو لڑائی میں مانع ہو۔ مخالف کی کمزوری ڈھونڈو۔ اکثریت ایسے لڑاکوں کی ہے جو حملہ کرنے میں تو بہت تیز ہوتے ہیں لیکن اپنے دفاع سے غافل رہتے ہیں۔ اسی طرح بہت اچھے لڑاکے عموماً غصے کی حالت میں مار کھا جاتے ہیں تم لوگ بھی یہ بات یاد رکھنا کہ چاہے کتنی مار کیوں نہ کھا لو غصے کا اظہار نہیں کرنا۔ ابتدائی لڑائی میں مار کھا کر کبھی بھی ہتھیار نہیں پھینکنا۔ لڑائی کا پانسہ کسی وقت بھی پلٹ سکتا ہے۔"

میں نے اپنے لباس کا جائزہ لیا چمڑے کی جیکٹ اور قمیض میرے تیزی سے حرکت کرنے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی قمیض اور جیکٹ اتار کر سائیڈ پر پھینک دی۔

"تم اگر شلوار بھی اتار دو تب بھی مجھ سے بچ نہیں سکتے۔" کوبرے نے مجھ پر چوٹ کرتے ہوئے کہا لیکن میری باڈی دیکھ کر اس

کی آنکھوں میں جو مرعوبیت کی لہر اٹھی تھی وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتی تھی۔

''وہ میں نیلم کے سامنے اتاروں گا۔'' میں ترکی بہ ترکی بولا، اور میرا تکا، نشانے پر لگا کیونکہ نیلم کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر چھائی استہزائیہ ہنسی غیض وغضب میں بدل گئی تھی۔

''تیری تو......'' اس نے گالیاں بکتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگائی، مگر اس مرتبہ میں تیار تھا۔ اس کے نیچے گرنے سے پہلے میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ نیچے گرتے ہی وہ سرعت سے پلٹا مگر میں اس وقت اپنے دائیں پاؤں پر گھوما اور بائیں پاؤں کی ایڑی تیر سے نکلے ہوئے کمان کی طرح اس کی چھاتی میں لگی اور وہ پشت کے بل نیچے گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میں وحشیانہ انداز میں اس پر پل پڑا۔ وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ہم کافی دیر ایک دوسرے کو رگیدتے رہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کوئی اس طرح اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا تھا۔ ہم دونوں کے سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے لیکن ہم میں کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا اور پھر کوبرے کی بدقسمتی کہ میری کک سے بچنے کے لیے اس نے اچھل کر پیچھے ہونا چاہا مگر پیچھے دیوار ہونے کی وجہ سے وہ دیوار کے ساتھ بڑی زور سے ٹکرایا، اس ٹکر کا بدلہ لینے کے لیے وہ سر جھکا کر مجھے ٹکر مارنے کے لیے دوڑا لیکن میں تھوڑا سا دائیں سائیڈ پر ہوا اور اگلے ہی لمحے اس کی مضبوط گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی۔

میں نے نفرت کے ساتھ اس کی گردن کو جھٹکا دیا اور کڑاک کی آواز کے ساتھ ہی وہ میرے بازو میں جھول گیا۔ اسے فرش پر پھینک کر میں اپنی پھولی سانسوں پر قابو پانے لگا۔ یہی موقع اگر اسے ملتا تو شاید وہ مجھے مارنے کی بجائے بے ہوش کرنے پر اکتفا کرتا کیونکہ اس نے مجھے گرفتار کرنا تھا۔

دلیر سنگھ جو ہماری فائٹ کے دوران دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کوبرے کی ہلاکت کے ساتھ ہی بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا اور میرے بازوؤں پر بوسہ دیتا ہوا بولا۔ ''مان گیا ہوں جانو صاحب تم ایک عظیم لڑاکے ہو۔''

لیکن میں اس نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اسے خود سے علیحدہ کیا خاموشی سے چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

''پانی لے آؤں؟'' دلیر سنگھ عقیدت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''پانی کو چھوڑو میرے لیے لباس اور جوتوں کا بندوبست کرو ہم نے یہاں سے فی الفور نکلنا ہے۔''

''آپ چند منٹ انتظار کریں میں یہ گیا اور یہ آیا۔'' دلیر سنگھ مستعدی سے بولا ''البتہ اپنے پاؤں کا ناپ بتا دیجئے گا۔''

''دس نمبر۔'' میں مختصراً بولا اور دلیر سنگھ سر ہلاتا ہوا گھر سے نکلتا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے تینوں لاشوں کی جامہ تلاشی لی مگر کوئی کام کی چیز نہ پا سکا۔ نقدی کے علاوہ سارا سامان میں نے ان کی جیبوں میں واپس ڈال دیا اور نقدی اپنے پاس رکھنے کا مقصد بھی کوئی روپے پیسے کا لالچ نہیں تھا، بلکہ دشمن ملک میں میرا سب سے بڑا مددگار یہی پیسہ ہو سکتا تھا۔

نیلم اور کوبرے کے پستول میں نے اپنی جیب میں ڈال لیے تھے، خصوصاً نیلم کا چھوٹا پستول تو مجھے بہت پسند آیا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا اس کے دستے کے دونوں جانب چمڑے کے چھوٹے چھوٹے بیلٹ لگے ہوئے تھے جن میں سات سات راؤنڈ پڑے جگمگا رہے تھے۔ اس کی میگزین کے اندر مجھے سات راؤنڈ کی گنجائش نظر آئی۔ جس میں سے تین راؤنڈ میں کوبرے اور اس کے دونوں ساتھیوں پر استعمال کر چکا تھا۔ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کی میگزین دوبارہ فل کر دی۔

میرا ارادہ تھا کہ گن دلیر سنگھ کے پاس ہی چھوڑ دوں گا، گو پستول اور گن کی کارکردگی میں زمین آسمان کا فرق تھا کہ پستول کی رینج کے ساتھ ایکوریسی (نشانے میں درستی) بھی بہت کم تھی، لیکن چھوٹا ہونے کی وجہ سے با آسانی چھپایا جا سکتا تھا اس لیے میں نے اس کا انتخاب کیا تھا۔

دلیر سنگھ میرے اندازے سے پہلے واپس پہنچ گیا۔ لباس کے نام پر اس نے میرے لیے جینز ٹی شرٹ اور چمڑے کی ایک کھلی جیکٹ پسند کی تھی۔ سر پر رکھنے کے لیے گرم ٹوپی جس میں میرے لمبے بال آسانی سے چھپ سکتے تھے اور منہ پر لپیٹنے کے لیے ایک کالے رنگ کا مفلر بھی وہ ساتھ لیتا آیا تھا جبکہ پاؤں میں پہننے کے لیے سپورٹس شوز لایا تھا۔ یہ تمام چیزیں مجھے اپنی شناخت چھپانے میں مدد دے سکتی تھیں۔ میں نے دل کھول کر اس کے انتخاب کی داد دی۔ جسے سن کر دلیر سنگھ کے چہرے پر بشاشت چھا گئی تھی۔

”دلیر سنگھ میں نے کوبرے کی جیب میں گاڑی کی چابی دیکھی ہے۔ گاڑی انھوں نے کہیں قریب ہی پارک کی ہو گی۔ تم گاڑی اندر لے آؤ تا کہ ان لاشوں کو غائب کریں ورنہ بعد میں تمھارے لیے پرابلم بنے گی۔ اس وقت تک میں لباس بدل لوں۔“

اور دلیر سنگھ سر ہلاتا ہوا کوبرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اور ہاں۔“ اچانک ایک خیال کے تحت میں نے دوبارہ دلیر سنگھ کو آواز دی۔

”دھیان رکھنا گاڑی میں ان کا کوئی بندہ موجود نہ ہو۔“

”بے فکر رہو، میں خیال رکھوں گا۔“ دلیر سنگھ نے کوبرے کی لاش سے چابی نکالتے ہوئے کہا اور میں کپڑے اٹھا کر باتھ روم کی سمت بڑھ گیا جس کے بارے میں نے دلیر سنگھ سے پہلے سے معلومات حاصل کر لیں تھیں۔ پانی ٹھنڈا تھا لیکن اس سے لطف اندوز ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ کافی عرصے کے بعد مجھے نہانے کا موقع ملا تھا۔ صابن سر اور بدن پر اتنی مرتبہ رگڑا کہ اس کی ٹکیہ میرے ہاتھوں ختم ہو کر رہ گئی۔ جب میں باہر نکلا تو بالکل فریش تھا۔

دلیر سنگھ لاشوں کو کار میں منتقل کر چکا تھا۔ اس کے لیے اس نے کار کی ڈگی استعمال کی تھی۔ میری اور کوبرے کی فائیٹ کے دوران جو افراتفری مچی تھی اور جو سامان درہم برہم ہوا تھا دلیر سنگھ نے اس کو بھی ترتیب سے رکھ دیا تھا۔

میں نے کلاشنکوف دلیر سنگھ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس کی ضرورت ہے تو اپنے پاس کہیں چھپا کر رکھ لو۔“

”کیوں......؟ آپ کو نہیں چاہیے۔“ وہ مستفسر ہوا۔

''میں اسے کہاں لیے پھروں گا۔میرے لیے یہ دو پستول ہی کافی ہیں۔''میں نے اسے پستول دکھاتے ہوئے کہا۔

''اب کہاں جائیں گے۔''

''یار میں تو اس علاقے سے بالکل ناواقف ہوں بلکہ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ یہ شہر کون سا ہے۔''

''یہ انبالہ ہے۔''دلیر سنگھ بولا۔''ویسے آپ کو اس شہر کا نام کیوں معلوم نہیں۔''

''دلیر سنگھ ابھی ٹائم کم ہے۔یہاں سے چلتے ہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر میری سٹوری سن لینا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''وہ مستعدی سے بولا۔''میں تیار ہوں۔صرف دو منٹ لوں گا یہ کلاشنکوف اور پیسے میں محفوظ مقام پر رکھ دوں۔''

اور میں نے سر ہلا کر اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔

دلیر سنگھ حقیقتاً دو منٹ میں واپس آ گیا اور ہم دونوں اس کے گھر کو تالا لگا کر چل پڑے۔ڈرائیونگ دلیر سنگھ نے سنبھالی تھی کہ میں اس شہر کے گلی کوچوں سے ناواقف تھا۔میں اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ کشمیر کی سرحد کے ساتھ جالندھر واقع تھا اور اس کے بعد انبالہ آتا تھا۔

''اب کیا کریں۔''گھر سے نکلتے ہی دلیر سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سب سے پہلے تو اپنے کسی واقف کار کو کمال ورکشاپ بھیجو اور کمال کا پتا کراؤ آیا کو برا اسے اپنے کسی اڈے پر لے گیا تھا یا وہیں پر اس نے اس پوچھ گچھ کی تھی اور اس کے بعد ان لاشوں کو ٹھکانے لگائیں گے۔''

''پہلے ان لاشوں کو کیوں نا ٹھکانے لگا دیں۔''دلیر سنگھ نے مجھے مشورہ دیا جو مجھے نہایت معقول لگا۔

''ٹھیک ہے کار کسی مشہور مارکیٹ میں لے چلو جہاں گاڑیوں کا رش رہتا ہو اور دلیر سنگھ سر ہلا کر ایک جانب روانہ ہو گیا جلد ہی ہم ایسے بازار میں پہنچ گئے جہاں رش بہت زیادہ تھا اور گاڑیاں بہت دھیمی رفتار میں آگے بڑھ رہی تھیں۔بازار میں سڑک کے دونوں جانب لوگوں نے گاڑیاں پارک کی ہوئی تھیں۔ایک مناسب جگہ دیکھ کر دلیر سنگھ نے بھی گاڑی پارک کی اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔باہر نکلنے سے پہلے میں مفلر اپنے منہ پر لپیٹنا نہیں بھولا تھا۔

''دلیر سنگھ پہلے کھانا نہ کھا لیں۔''ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ پر میری نظر پڑی تو میں نے دلیر سنگھ کو اس طرف متوجہ کر کے کہا۔

''بھوک تو مجھے بھی لگی ہوئی ہے۔''وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا اور ہم دونوں ریسٹورنٹ میں گھس گئے اندر ایک نسبتاً ویران اور اندھیرے کونے میں بیٹھ کر ہم نے نشستیں سنبھال لیں۔

کھانا کھا کر ہم نے چائے بھی وہیں پی اور پھر بل پے کر کے باہر نکل آئے۔

''جانو صاحب میرا خیال ہے میں آپ کو اپنے ایسے ٹھکانے پر لے چلتا ہوں جس سے کوئی بھی واقف نہیں ہے وہیں قریب فون

کی سہولت بھی موجود ہے وہاں سے کمال ورکشاپ میں فون کر کے کمال کے بارے معلومات لے لیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔"اس طرح کم سے کم خطرہ مول لیتے ہوئے ہم کمال کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں گے۔"

میری تائید حاصل ہوتے ہی دلیر سنگھ نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھتے ہی دلیر سنگھ نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس جگہ کا پتا بتا دیا جہاں پر ہم نے جانا تھا۔ٹیکسی کے چلتے ہی میں دائیں بائیں مناظر کو گہری نظر سے دیکھنے لگا تا کہ اس انجان شہر سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کر سکوں۔دلیر سنگھ اور میرے تعلق کا فیصلہ کمال کی خیریت معلوم ہونے کے بعد ہونا تھا۔اگر کمال کو کوبرا اپنے کسی ٹھکانے میں لے گیا تھا پھر تو میں نے فی الفور دلیر سنگھ سے علیحدہ ہونا تھا کیونکہ کوبرے کی طرح کوئی اور بھی دلیر سنگھ کو ڈھونڈ کر مجھ پر قابو پانے آ سکتا تھا۔اس کے برعکس اگر کوبرا کمال سے دلیر سنگھ کا پتا حاصل کرتے ہی بغیر کسی کو اطلاع دیئے دلیر سنگھ کے گھر پر چڑھ دوڑا تھا تو تب دلیر سنگھ کا ساتھ میرے لیے کافی مفید ثابت ہوتا یوں بھی کوبرے کی موت کے بعد دلیر سنگھ کافی عقیدت سے پیش آ رہا تھا۔علاوہ ازیں جہاں تک شواہد نظر آ رہے تھے اس سے مجھے یہی لگ رہا تھا کہ کوبرا کمال سے دلیر سنگھ کے بارے میں معلوم ہوتے ہی ہم پر چڑھ دوڑا تھا اور اپنے اوپر اسے جو اندھا اعتماد تھا اس کی وجہ سے اس نے کسی کو بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی ہوگی۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ہم جس علاقے میں پہنچے وہ ایک رہائشی علاقہ تھا۔

ایک جگہ ٹیکسی رکوا کر دلیر سنگھ نے اسے کرایہ دے کر رخصت کیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک جانب چل پڑا۔تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد ہم ایک تین منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوئے۔گیٹ پر ایک چوکیدار نما شخص ڈنڈا سونتے کھڑا تھا لیکن اس نے ہم سے کوئی تعرض نہ کیا اور بھی کافی لوگ آ جا رہے تھے۔

دلیر سنگھ مجھے ساتھ لیے سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوسری منزل پر پہنچا اور ایک فلیٹ کے دروازے پر رک کر اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔دروازے کے اوپر فلیٹ کا نمبر 73 جگمگا رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا،کھولنے والی ایک خوش شکل لڑکی تھی جو آسمانی کلر کی ساڑھی میں ملبوس بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔دلیر سنگھ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کی چمک ابھری۔

"بڑے عرصے بعد راستا بھولے ہو۔" اس نے اپنی جلترنگ سی آواز میں کہا اور دروازے سے ایک طرف ہو کر بولی۔"اندر آ جائیں۔"

"جو ہی تمھیں پتا بھی ہے کہ میں کتنا مصروف رہتا ہوں۔" فلیٹ میں داخل ہوتے ہی دلیر سنگھ آہستہ سے بولا۔"اس کے باوجود تم گلہ کرنے سے باز نہیں آتی ہو۔"

"میں نے کب گلہ کیا ہے۔" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

"تو اور کیا تم شکر ادا کر رہی تھیں۔" دلیر سنگھ ایسے لہجے میں بولا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''بس جب جواب نہ بن پڑے تو ہنس پڑو ساری غلطیاں ختم۔'' اسے ہنستے دیکھ کر دلیر سنگھ چڑ کر بولا، جس کے جواب میں اس نے ایک عدد اور ہنسی اچھالی اور کہا۔

''مہمان کا تعارف تو آپ نے کرایا ہی نہیں ہے۔''

''یہ میرا نیا دوست ہے۔ کچھ دشمنوں سے چھپنے کے لیے اسے ٹھکانے کی تلاش تھی اس لیے میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔''

''اچھا آپ لوگ بیٹھیں۔'' اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چائے لاتی ہوں۔''

''یہ اس قابل ہے کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے۔'' اس کے باہر نکلتے ہی میں نے سرگوشی میں دلیر سنگھ سے پوچھا۔

''جانو صاحب مجھے اپنے سے زیادہ اس پر اعتماد ہے۔'' دلیر سنگھ فخریہ لہجے میں بولا۔

''اچھا کمال کو فون کس وقت اور کہاں سے کرو گے۔'' میں موضوع بدلتا ہوا بولا۔

''بس چائے پیتے ہی جاتا ہوں اس بلڈنگ میں ایک پی سی او ہے اور اسی سے بات کر لوں گا۔''

''چائے تیار ہونے تک تم بات کر بھی لیتے۔'' میں بے صبری سے بولا۔ ''کیونکہ اس سے ہم نے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ''آپ یہیں بیٹھیں میں فون کر کے ابھی آیا۔''

دلیر سنگھ کے باہر نکلنے کے چند منٹ بعد ہی جوہی لہراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھوں میں ایک منقش ٹرے اٹھائی ہوئی تھی جس میں چائے کے برتنوں کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی نظر آ رہے تھے۔

''یہ دلّو کدھر چلا گیا؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''پی سی او تک گیا ہے ایک ضروری فون کرنا تھا۔'' میں اس کی جانب دیکھے بغیر آہستہ سے بولا۔

''ایک تو اس کی ضروری باتیں ختم نہیں ہوتیں۔'' وہ میرے سامنے دھری ٹیبل پر چائے کے برتن رکھتے ہوئے بولی۔ وہ خود بھی ٹیبل کے ساتھ ہی قالین پر بڑے انداز سے بیٹھ گئی تھی، لیکن میں نے دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔

''چینی کتنی ڈالوں۔'' وہ میرے لیے کپ میں چائے بناتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''دلیر سنگھ کو آنے دو پھر پی لیتے ہیں۔''

''کیوں اس کی غیر موجودی میں مَیں آپ کو زہر پلا دوں گی۔'' وہ خفگی سے بولی۔ ''اور یہ مفلر بھی اب اپنے چہرے سے ہٹا دو، ادھر ایسا کوئی موجود نہیں جس سے آپ کو پردہ کرنے کی ضرورت پڑے۔'' میں نے اسے کوئی جواب دیئے بغیر مفلر اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔

''تھینک یو۔'' وہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔

''آپ دلیر سنگھ کی کیا لگتی ہیں۔'' اس کے سوالات سے بچنے کے لیے میں نے اس کا انٹرویو شروع کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ۔''

''کیا مطلب؟''میں حیرانی سے بولا۔

''مطلب ظاہر ہے۔''وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''اگر ہماری شادی نہ ہوئی تو کچھ بھی نہیں ورنہ بہت کچھ بلکہ سب کچھ۔''

''انتظار کس بات کا ہے۔''میں مستفسر ہوا۔

''دِلو کی اِچھا کا۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''دلو شادی کرنے سے پہلے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔اس کے ساتھ وہ اس بات کا بھی خواہاں ہے کہ اپنا ذاتی گھر بنالے۔''

''آپ کی کیا مرضی ہے۔''

''میں دلو کی خوشی میں خوش ہوں۔''یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ بیرونی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دلیر سنگھ تیزی سے اندر داخل ہوا۔اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''خیر تو ہے؟''میں نے بے تابی سے پوچھا۔

مگر اس نے میری بات کا جواب دیئے بغیر ہاتھ میں پکڑ ہوا اخبار میری جانب بڑھا دیا۔جس کے اندرونی صفحہ پر میری دو عدد تصاویر جگمگا رہی تھیں۔ایک داڑھی والی اور دوسری بغیر داڑھی کے......اس کے ساتھ لکھی تحریر میں مجھے تخریب کار اور دہشت گرد کے القاب سے نوازا گیا تھا اور اطلاع دینے والے کے لیے 50 ہزار انعام کا وعدہ کیا گیا تھا۔

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''میں نے اخبار واپس اس کی جانب پھینکتے ہوئے پوچھا۔

''میں ان تصاویر کی وجہ سے تو پریشان نہیں ہوں۔''وہ جلدی سے بولا۔

''تو پھر؟''

''کمال کے بارے مجھے ایک دوست سے پتا چلا ہے کہ وہ اور کوبرا بزنس پارٹنر ہیں''۔

''کیا کہہ رہے ہو؟''میں حیرانی سے اچھل پڑا۔

+ + +

یہ کیسے ہوسکتا ہے۔کوبرا تو ایجنسی کا بندہ تھا اور کمال کے بارے تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ کیسا شخص ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''دلیر سنگھ اطمینان سے بولا۔''لیکن مجھے بھی پکی اطلاع ملی ہے۔''

''تُو نے کوبرا کی باتیں سنی تھیں۔''میں نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔''وہ کمال کو کن الفاظ میں یاد کر رہا تھا۔''

''وہ سارا ڈراما تھا۔حقیقت یہی ہے کہ وہ اس کاروبار میں کمال کا ساجھی تھا اور جیسے ہی کل ہم نے گاڑی فروخت کی اس نے اچھی

گاڑی دیکھ کر کوبرا کو بھی گاڑی دکھلا دی یہ اب ہماری بدقسمتی تھی کہ کوبرا اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا اس لیے اس نے ہم تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔"

"میرا خیال ہے اس نے کسی کو بتائے بغیر یہ قدم اٹھایا تھا۔" میں نے کہا۔"اس کی کوشش یہی تھی کہ مجھ پر قابو پانے کے بعد یہ بات آگے بتائے۔"

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔" دلیر سنگھ بولا۔"البتہ یہ بات کنفرم ہے کہ کمال کو یہ معلوم ہے کہ کوبرا میرے گھر کی طرف آیا تھا اور اس کی لاش دریافت ہوتے ہی کمال کو پتا چل جائے گا کہ یہ کس کی کارستانی ہے اور شاید اس کے بعد کمال اس بات کی اطلاع کسی اور ایجنسی والے کو دے دے کیونکہ اگر اس کے کوبرے کے ساتھ روابط تھے تو اوروں سے بھی آشنائی ہوسکتی ہے۔"

"کوبرے کو کس نے مارا ہے۔" جوہی جو خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھی مجھ سے مخاطب ہوئی مگر میرے بجائے دلیر سنگھ بولا۔

"وہ جانو صاحب کے ہاتھوں نرک میں پہنچا ہے۔"

"اس کے ہاتھوں؟" جوہی نے حیرانی سے میری جانب اشارہ کیا۔"مگر تم تو کہتے تھے کہ کوبرا بہت اچھا لڑاکا ہے اور اس کے ساتھ خالی ہاتھ مقابلہ کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔"

"جانو صاحب اس سے بھی اچھے لڑاکے ہیں۔" دلیر سنگھ فخریہ لہجے میں بولا۔

"مجھے تو ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آرہی۔" جوہی بے پرواہی سے بولی لیکن اس کی آنکھوں میں میرے لیے ابھرنے والے ستائش کے تاثرات مجھ سے چھپے نہ رہ سکے۔

"چھوڑو اس قصے کو۔" میں چائے کا کپ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے دلیر سنگھ سے بولا۔"پہلے چائے پی لیں۔"

"صبر کرو نا بنا کر دیتی ہوں۔" جوہی میرے سامنے سے خالی کپ جھپٹتے ہوئے بولی اور اس کی حرکت پر دلیر سنگھ کھل کھلا کر ہنس پڑا، لیکن میں نے مسکرانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جوہی ضرورت سے زیادہ ہی میرے ساتھ فری ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور میں کسی صورت میں بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کتنی چینی ڈالوں۔"

"دو چمچ" کہہ کر میں دلیر سنگھ کی طرف متوجہ ہوگیا۔"اب کمال کی زبان کیسے بند کریں گے؟"

"میرا خیال ہے چائے پی کر اس کی طرف چلتے ہیں۔" دلیر سنگھ نے تجویز پیش کی۔

"ہوسکتا ہے وہ اب تک یہ بات آگے پہنچا بھی چکا ہو" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے، لیکن کوبرے کی لاش ملنے سے پہلے شاید وہ یہ قدم نہ اٹھائے۔" دلیر سنگھ بولا۔

"یہ کیا آپ لوگوں نے کمال اور کوبرے کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔" جوہی خفگی سے بولی۔"اس کے علاوہ آپ لوگوں کے پاس کوئی

موضوع نہیں۔"

"چلو پھر جانو صاحب سے اس کی سٹوری سن لیتے ہیں۔" دلیر سنگھ بولا۔

"ہاں اب بات کی ہے نا؟" جوہی جلدی سے بولی۔ "چلیں بھئی جانو صاحب اب آپ اپنے بارے کچھ بتائیں۔"

"کیا بتاؤں یار، بس مختصراً یہی ہے کہ کسی گھریلو مجبوری کی وجہ سے مجھے چھٹی کی ضرورت پڑی جبکہ چھٹی بند تھی کیونکہ جس علاقے میں مَیں تعینات تھا وہاں برف پڑنے کی وجہ سے راستے بند تھے۔ مجبوراً مجھے بھاگنا پڑا اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ میں غلطی سے سرحد عبور کر کے اس طرف آنکلا اور انڈین فوج کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ آرمی والوں نے مجھے جاسوس سمجھ کر اپنے انوسیٹی گیشن والوں کے حوالے کر دیا وہاں سے کل رات میں جان چھڑا کر بھاگا تھا جب آپ مجھے راستے میں مل گئے اور اس کے بعد کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔"

"آپ نے سچ مچ کمانڈو کی تربیت حاصل کی ہوئی ہے نا؟" دلیر سنگھ نے استفسار کیا۔

"ہاں!" میں مختصراً بولا۔

"اس کا مطلب ہے آپ سے کافی داؤ پیچ سیکھے جاسکتے ہیں۔" دلیر سنگھ اشتیاق سے بولا۔

"تمھیں تربیت دینے میں مجھے کوئی عار نہیں لیکن افسوس کہ تیرا میرا ساتھ بہت مختصر ہے۔"

"کیا مطلب؟" دلیر سنگھ بولا۔

"مطلب واضح ہے دوست۔" میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "خفیہ ایجنسی والے میری تلاش میں سرگرداں ہیں اور جیسے ہی انھیں تمھارے میرے تعلق کے بارے میں معلوم ہوگا وہ ہم تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم علیحدہ ہو جائیں اور تم بھی اس سے پہلے کہ وہ جلاد تم تک پہنچیں ان کے پاس خود چلے جاؤ اور انھیں ساری کہانی بلا کم و کاست سنا دو۔ اس طرح کم از کم تم ان کے تشدد سے بچ جاؤ گے۔ یوں بھی تم نے اسی ملک میں رہنا ہے۔ جبکہ میں نے جلد یا بدیر یہاں سے نکل جانا ہے اگر زندگی رہی تو۔"

"میں اتنا کمینہ بھی نہیں ہوں کہ اپنی جان کے خوف سے تیرا ساتھ چھوڑ دوں۔" دلیر سنگھ جذباتی لہجے میں بولا۔

"دلیر سنگھ سمجھنے کی کوشش کرو اس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ تیرے ذریعے انھیں مجھ تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔" میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"لیکن آپ یہاں تو چھپ کر رہ سکتے ہیں۔ جوہی کے ساتھ میرے تعلق کو تو کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"میں نے چھپ کر نہیں رہنا، یہاں سے نکلنا ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"چلے جانا چند دن ہمیں بھی اپنی سیوا کا موقع دو۔" جوہی جلدی سے بولی۔

"میرا بھی یہی مطلب ہے۔" دلیر سنگھ جلدی سے اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے دلیر سنگھ۔" میں ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ "لیکن زیادہ سے زیادہ آج کا دن۔"

''کم از کم تین چار دن تو رہیں۔'' دلیر سنگھ بولا۔''اس وقت تک آپ کی تلاش کرنے والوں میں جو سرگرمی پائی جاتی ہے اس میں بھی کمی آجائے گی۔''

''تلاش کرنے والے اتنے بھولے بھی نہیں ہیں کہ تین چار دن میں تھک جائیں۔'' میں نے ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔''ہوسکتا ہے وہ اگلے دو تین ہفتے شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھریں۔جس وقت تک کہ انھیں میرے انڈیا سے فرار ہونے کی اطلاع کسی معتبر ذرائع سے نہیں مل جائے۔''

''کم از کم دو دن ضرور۔'' جوہی چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے حتمی لہجے میں بولی۔''اور اب اس بارے آپ کا کوئی بہانہ نہیں سنا جائے گا۔''

''اچھا پھر مجھے آرام کرنے کی جگہ دکھا دیں۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

اور دلیر سنگھ''آئیں سر۔'' کہہ کر مجھے ڈرائنگ روم سے ملحقہ ایک چھوٹی سی خواب گاہ میں لے آیا۔جس میں ایک سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔دلیر سنگھ مجھے کمرہ دکھا کر باہر نکل گیا اور میں بوٹ اتار کر لیٹ گیا۔کوبرے سے لڑائی کرتے ہوئے میری اچھی خاصی ورزش ہوگئی تھی اور میں اس وقت سخت تھکن محسوس کر رہا تھا۔اس کے علاوہ میرا مقصد ان دونوں کو تنہائی فراہم کرنا بھی تھا میں کافی دیر مختلف سوچوں میں گھرا رہا اور پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی۔

+ + +

سعدیہ کمرے میں داخل ہوئی اور میرے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔

''بہت تھکے ہو۔'' وہ اپنی مدھر آواز میں بولی۔

''ہاں بہت زیادہ۔'' میں آہستہ سے بولا۔

''کھانا کھاؤ گے۔'' وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

''نہیں، بس تم اسی طرح اپنے ملائم ہاتھوں سے میرا سر سہلاتی رہو۔''

''اچھا جیسے تمھاری مرضی۔'' وہ اسی طرح ہاتھوں سے میرے سر میں کنگھی کرتے ہوئے بولی اور پھر اچانک وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی اور مجھے لگا میں گھر میں نہیں کسی اور جگہ پر ہوں اور پھر آہستہ آہستہ میرا شعور جاگا اور مجھے یاد آگیا کہ میں دلیر سنگھ کی محبوبہ کے فلیٹ میں تھا،لیکن جاگ جانے پر بھی مجھے اپنے سر میں انگلیاں پھرتی محسوس ہوتی رہیں۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ جوہی تھی اور بڑے پیار بھرے انداز میں میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔کمرے کے اندر ٹیوب لائیٹ روشنی تھی اس کا مطلب تھا کہ رات ہوگئی تھی۔ٹیوب لائیٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا وہ کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آرہی تھی۔

میں اپنے سر سے اس کا ہاتھ ہٹا کر جلدی سے اٹھ بیٹھا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

''کک۔کیا بات ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔''ڈر گئے ہیں۔اتنی بری شکل بھی نہیں ہے میری۔''

''بات کیا ہے؟''میں چڑ کر بولا۔''اور تم یہاں کیسے۔''

''حضور داسی آئی تھی۔کھانے کا بتانے کہ کھانا تیار ہے اور سرکار کا انتظار ہے۔''

''اچھا تم چلو، میں آرہا ہوں۔''

''جلدی آنا ورنہ میں پھر آجاؤں گی۔''یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور میں اٹھ کر کمرے سے ملحقہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔منہ ہاتھ دھو کر میں ان کے پاس آیا تو وہ ٹیبل پر کھانا سجائے بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''آ بھئی جاؤ یار آپ کی تو نیند ہی پوری نہیں ہو رہی۔''مجھے دیکھتے ہی دلیر سنگھ بے صبری سے بولا۔

''سوری۔''میں معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔''تمھیں کو میرا انتظار کرنا پڑا۔''

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں''۔جوہی جلدی سے بولی۔''یہ تو ہے ہی ایسا بے صبرا۔بس ہر وقت جلدی میں پڑا رہتا ہے۔''

''ہاں سوائے شادی کے۔''میں آہستہ سے بولا۔

اور دلیر سنگھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا جبکہ جوہی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

کھانا کھانے کے دوران ہم خاموش رہے۔بہت دنوں بعد اتنا اچھا کھانا کھانے کو ملا تھا میں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

''چائے چلے گی یا کافی''کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے جوہی نے پوچھا۔

''چائے بہتر رہے گی۔کیوں جانو صاحب۔''دلیر سنگھ بولا۔

''بالکل۔''میں نے بھی دلیر سنگھ کی تائید کی اور جوہی سر ہلاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''جانو صاحب۔''جوہی کے جاتے ہی دلیر سنگھ بولا۔''آج رات میں بھیس بدل کر حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلوں گا اور کوشش کروں گا کہ کمال سے بھی ملاقات ہو جائے۔اگر میں واپس نہ آوں تو پریشان نہیں ہونا۔''

''میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔''

''نہیں۔ابھی تک آپ کے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔میں کوشش کروں گا کہ آپ کے انبالے سے نکلنے کا کوئی بندوبست کر سکوں۔''

''اس طرح اگر ہو جائے تو بہتر ہوگا۔''میں نے اس کی تائید کی۔

''آپ کو کوئی چیز تو نہیں چاہیے؟''اس نے پُر خلوص لہجے میں پوچھا۔

''بس کپڑوں کا ایک اور جوڑا لیتے آنا۔'' میں بے تکلف بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' دلیر سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی وقت جوہی بھی چائے لے کر پہنچ گئی۔ چائے پیتے ہی دلیر سنگھ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم کہاں چلے۔'' جوہی حیرانی سے بولی۔

''بس ذرا مارکیٹ تک جانا تھا۔'' وہ جوہی سے نظر بچا کر مجھے آنکھ مارتا ہوا بولا۔

''جلدی واپس آنا۔'' جوہی بولی، اور دلیر سنگھ سر ہلاتا ہوا فلیٹ سے نکلتا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ جبکہ جوہی برتن سمیٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں جا کر میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مختلف قسم کی پریشان سوچوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں جتنی جلدی گھر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا اتنا زیادہ راستے میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ رہ رہ کر چچا جان کے خط کے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے۔ ''چھٹی ملے یا نہ ملے گھر پہنچو۔''

پتا نہیں وہ کون سی مصیبت تھی جس کے زیراثر چچا جان کو یہ الفاظ لکھنے کی ضرورت پڑی تھی۔ میں انھی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ جوہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میرے چہرے پر یکدم بیزاری کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے اس کا آنا ناگوار گزرا تھا۔ دلیر سنگھ کسی بھی وقت لوٹ کر آ سکتا تھا اور ہمیں اکٹھا کمرے میں دیکھ کر کسی قسم کا شک بھی اس کے ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا۔ اگر وہ نہ بھی آتا تب بھی جوہی کا میرے ساتھ بیٹھ کر گپیں ہانکنا بہتر نہیں تھا اور یہ بات بھی تھی کہ جوہی جس طرح میری ذات میں دلچسپی لے رہی تھی وہ میرے لیے کسی مشکل کا باعث بن سکتی تھی۔

''آپ کو شاید میرا آنا ناگوار گزرا ہے۔'' جوہی میرے چہرے پر ناگواری کے واضح آثار محسوس کر کے بولی۔

''نہیں...... نہیں۔'' میں جلدی سے بولا کیونکہ آخر میں اس کے گھر میں تھا اور بن بلایا مہمان تھا۔ ''یہ تو میں یونہی گھر یاد آنے کی وجہ سے میں کچھ پریشان سا تھا۔''

''جانو صاحب۔'' جوہی سنجیدہ سے لہجے میں بولی۔ ''مجھے پتا ہے کہ میں آپ کو اچھی نہیں لگی ہوں اور اگر لگتی تو تب بھی آپ کا میرا ملاپ اس جنم میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ آپ مجھے پہلی نظر میں کیوں اچھے لگنے لگے ہیں۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ ابھی میں آپ کے پاس اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے نہیں آئی تھی بلکہ میرا مقصد آپ کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا ہے۔''

''کیسا خطرہ۔'' میں جو اس کی باتیں بیزاری سے سن رہا تھا خطرے کا نام آتے ہی میری بیزاری کافور ہو گئی اور میں چوکنا ہو گیا۔

''دلیر سنگھ۔ کمال کے پاس گیا ہے اور وہاں سے دونوں انویسٹی گیشن والوں کے پاس جائیں گے۔ اس طرح ایک تو دلیر سنگھ اس خطرے سے بچ جائے گا جو اسے آپ کا دینے سے لاحق ہو سکتا تھا۔ دوسرے وہ انعام کی اس رقم کا بھی حقدار پائے گا جو آپ کو گرفتار

کرانے والے کو دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

اور میرے ذہن نے بغیر کسی تردد کے اس کی بات کو تسلیم کر لیا، لیکن پھر بھی میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"تم اتنے یقین سے یہ سب کچھ کیسے کہہ سکتی ہو۔"

"کیونکہ جس وقت آپ سوئے تھے اس وقت دلیر سنگھ نے میرے ساتھ بیٹھ کر یہی منصوبہ بنایا تھا اور آپ کے چائے کے کپ میں میں نے نیند والی دوائی بھی ڈالی تھی۔"

"کیا؟" میں پریشانی سے اچھل پڑا اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"سوری منصوبہ اسی طرح تھا، لیکن میں نے اس پر عمل نہیں کیا۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔" میں جلدی سے بوٹ پہنتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو اسی فلیٹ میں چھپا لیتی۔ البتہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنی ایک سہیلی کا پتا دے سکتی ہوں جہاں آپ جب تک چاہیں چھپ کر رہ سکتے ہیں۔"

"شکریہ" میں گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔ "میں اب چلوں گا کیونکہ دلیر سنگھ کو گئے کافی دیر ہو گئی ہے یہ نہ ہو وہ انھیں ساتھ لیے سر پر آ پہنچے۔"

"اگر رقم کی ضرورت ہو تو میرے پاس تھوڑی بہت موجود ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں رقم میرے پاس کافی ہے۔" یہ کہہ کر میں اس کی جانب بڑھا اور اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا جن میں نمی تیرتی واضح نظر آ رہی تھی اور بولا۔ "جوہی تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ مجھے بھی پہلی نظر میں بہت اچھی لگی ہو لیکن افسوس کہ میں شادی شدہ ہوں بالکل تمھاری طرح کی ایک پیاری سی لڑکی میری شریکِ حیات ہے۔ جس سے میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ تمھاری ذات میں دلچسپی لے کر میں اس سے بے وفائی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ تمھارے ساتھ بھی دھوکا ہوتا اسی وجہ سے میں تمھارے ساتھ ناگواری سے پیش آ رہا تھا۔ ورنہ بخدا تم نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہو۔ اس کے علاوہ یہ دلیر سنگھ سے بھی دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنا تھی۔" میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ "تم نے میرے ساتھ جو اچھائی کی اس کا بدلہ دینا تو میرے بس میں نہیں البتہ اگر میری کسی بات پہ تمھارا دل دکھا ہو تو اس کی معافی ضرور چاہوں گا...... اگر ہو سکے تو اس پردیسی کو معاف کر دینا۔" یہ کہہ میں نے جیسے ہی اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹائے وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی اور میرے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ میرے پاس ان چونچلوں کے لیے ٹائم نہیں تھا۔ دلیر سنگھ کسی بھی وقت میرے دشمنوں کو ساتھ لیے وہاں پہنچ سکتا تھا، لیکن اس کے احسان کو دیکھتے ہوئے مجھے اس کا دل رکھنا پڑا اس لیے میں نے نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی آنسوؤں کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

"جوہی پاگل مت بنو۔" میں نے اسے پیار سے جھڑکا۔ "تمھارے آنسو دیکھ کر میں رکنا چاہوں بھی تو نہیں رک سکتا کہ میرے

دشمن پہنچنے والے ہوں گے اور وہ مجھے زبردستی تم سے جدا کر کے لے جائیں گے۔ اگر تم یہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے میں نہیں جاتا۔''

''نہیں نہیں میں اب نہیں روؤں گی۔'' وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''اپنا خیال رکھنا اور اگر ہو سکے تو دلیر سنگھ کو بھی معاف کر دینا۔ بھگوان تمھاری رکھشا کرے۔'' یہ کہہ کر وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی اور میں نے بھی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے ''خدا حافظ'' کہا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا۔

گرم ٹوپی اور مفلر اوڑھنے کے بعد میرا چہرہ کافی حد تک چھپ گیا تھا۔ ویسے بھی سردی کافی تھی اور کسی کو میرے حلیے پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی رفتار نارمل رکھی کیونکہ تیز رفتاری سے خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ میری جانب مبذول ہو جاتی۔ میں جیسے ہی بلڈنگ کے گیٹ سے نکلنے لگا مجھے بائیں طرف سے ایک تیز سی چمک نظر آئی جو کسی گاڑی کی ہیڈ لائیٹ کی تھی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا اس لمحہ بہ لمحہ قریب آتی گاڑی سے مجھے خطرہ سا محسوس ہوا حالانکہ گاڑیوں کی آمد و رفت وہاں جاری رہتی تھی کیونکہ وہ کافی معروف روڈ تھی لیکن میری چھٹی حس نے بے ساختہ مجھے چوکنا کر دیا تھا اور میں جلدی سے دیوار کی آڑ میں بیٹھے چوکیدار کی طرف بڑھ گیا۔ میرا انداز ایسے تھا جیسے میں اس سے کچھ پوچھنے جا رہا ہوں۔ اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ بھی سوالیہ انداز سے میری جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

''پانی مل جائے گا۔'' کوئی بہانہ نہ سوجھتے ہوئے میں نے جلدی سے پوچھا۔

اس وقت گاڑی اسی بلڈنگ کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی لیکن میں دیوار کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے اس کی ہیڈ لائیٹ کی روشنی میں آنے سے بچ گیا تھا۔ یہ ایک ویگن نما گاڑی تھی اس کی اندرونی لائیٹ کی روشنی میں مجھے دلیر سنگھ کا منحوس چہرہ نظر آیا اس کے ساتھ اور کافی بندے بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''بابو سامنے برآمدے میں کولر لگا ہوا ہے۔'' چوکیدار اندرونی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں سے پی لو۔ میرے پاس تو......''

''دھنے واد''۔ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہندوؤں کے انداز میں ہاتھ باندھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور ان کے گاڑی سے باہر آنے سے پہلے میں بلڈنگ کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔

ان کی گاڑی بائیں جانب سے آئی تھی میں نے بھی وہی سمت اختیار کی واپسی پر انھوں نے فطری طور پر دائیں طرف جانا تھا کیونکہ بائیں طرف سے آتے وقت راستے میں میرا ان سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد صرف دائیں جانب ہی رہتی تھی جدھر وہ میری تلاش میں جا سکتے تھے، لیکن یہ حتمی بات نہیں تھی۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا کہ چوکیدار سے پوچھنے پر انھیں میرے فرار کی صحیح سمت معلوم ہو جاتی۔

اس لیے تھوڑی دیر چلنے کے بعد میں نے روڈ کی بجائے گلیوں میں سفر کرنا مناسب سمجھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ صبح ہونے میں ابھی تک سات آٹھ گھنٹے پڑے تھے۔ گو دن کو میں کافی آرام کر چکا تھا اور اس وقت بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس کے باوجود میرا دل چاہ رہا تھا کہ سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانہ مل جائے کیونکہ بغیر پلاننگ کے انبالہ سے فرار ہونا

مشکل تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ اس شہر کے محلِ وقوع سے ناواقفیت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ پولیس یا خفیہ ایجنسی والے میری تلاش کس نہج پر کر رہے تھے اس سے بھی میں ناواقف تھا۔ ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرتے ہوئے جوہی کے فلیٹ سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اکا دُکا راہگیروں کو دیکھ کر مجھے گلیوں میں اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں مٹر گشت کے انداز میں ٹہلتا ہوا دائیں بائیں کے راہگیروں کو گہری نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ راہگیروں میں اکا دُکا کے ساتھ لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

میں گلی کے آخری سرے پر ایک پولیس والے کو دیکھ کر ایک چھوٹی گلی میں مڑ گیا۔ وہ گلی آگے روڈ پر جا نکلی۔ روڈ پر سفر کرنا تو گلیوں کی نسبت زیادہ خطرناک تھا لیکن میں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔

روڈ پر میں تھوڑی دور ہی گیا ہوں گا کہ ایک بس سٹاپ پر ایک لڑکی کھڑی دکھائی دی۔ رات کے اس وقت اکیلی لڑکی کو دیکھ کر مجھے اچنبھا سا ہوا۔ وہ شوخ کلر کی ساڑھی میں ملبوس ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر بجائے اس نے دائیں بائیں یا نیچے دیکھنے کے جو کہ عموماً عورتوں کی فطرت ہوتی ہے۔ براہ راست میری آنکھوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کی آنکھیں عجیب سی قسم کی دعوت دیتی محسوس ہوئیں۔ میرا واسطہ الحمدللہ اس سے پہلے کبھی بھی غلط قسم کی عورتوں سے نہیں پڑا تھا لیکن اس کو دیکھ کر بے ساختہ میرے ذہن میں کسی کال گرل کا خیال آ گیا اور میں اس سے چند قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ میرے خیال کی تصدیق ہو گئی جب اس نے مجھے پیچھے سے پکارا۔

”بابو رات کے لیے ساتھی چاہیے؟“

اس کی کھلی ڈھلی دعوت سن کر ایک بار تو میرے کانوں کی لویں تک گرم ہو گئیں اور میں نے چاہا کہ اپنے قدموں کو تیز کر کے وہاں سے نکل جاؤں مگر پھر رات گزارنے کے خیال نے میرے قدموں کو روکا اور ایک فیصلے پر پہنچ کر میں اس سے مخاطب ہوا۔

”جگہ کا بندوبست ہو جائے گا۔“

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی مگر پھر بولی۔ ”ہو جائے گا مگر اس کے لیے علیحدہ پیسے دینے ہوں گے۔“

”منظور ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”مگر رازداری شرط ہے۔“

”وہ تو آپ نہ بھی کہیں وہ گی۔“ یہ کہہ کر تو ہو میرے قریب آئی اور میرا ہاتھ تھام کر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ بالکل سرد اور جذبات سے خالی لمس تھا۔ مجھے تھوڑی دیر پہلے ہونے والی جوہی کے ساتھ اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی۔ اس کے ہونٹوں کی حدت ابھی تک مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

”اگر ریٹ طے کر لیتے؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں گھٹیا پن کی حد کراس کرتے ہوئے بولا۔

عام حالات میں کبھی بھی اس قسم کی گھٹیا بات میرے منہ سے نہ نکلتی لیکن اس وقت حالات ایسے بن گئے تھے کہ مجھے اس روپ میں ڈھلنا پڑا۔ ورنہ عورت کی تکریم و تقدیس تو بچپن سے مجھے سکھائی گئی۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی جیسے مقدس رشتوں کے علاوہ میں عورت کے کسی اور روپ سے واقف نہیں تھا۔ یہ تو عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ مرد کی عیاری نے عورت کو کئی قسم کے بھیس بدلنے پر

مجبور کر دیا اور اس پھولوں سی نزاکت اور شبنم کے قطروں جیسی پاکیزگی رکھنے والی صنف کو اتنا پستی میں گرا دیا کہ اس سے زیادہ پستی کا تصور ناممکن ہے۔ گو اس جرم میں عورت بھی مرد کے ساتھ شریک ہے لیکن اس میں زیادہ ہاتھ مرد کا ہے اور عورت کو اس کی سادگی نے اس جرم میں ملوث کر رکھا ہے۔ شاید کچھ قارئین کو میرے اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہو بہر حال یہ میری اپنی سوچ ہے اور اختلاف رکھنے والے اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

''دو سو اور پچاس کمرے کے۔''

''کمرہ ہوٹل کا ہوگا؟'' میں بے اختیار رک گیا کیونکہ اس صورت میں مجھے اپنا پلان فیل ہوتا ہوا نظر آیا۔

''نن......نہیں......میرا اپنا گھر ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''اور کون کون ہے اس میں۔'' میں مطمئن ہو کر پھر اس کے ساتھ چلنے لگ گیا۔

''اس سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''آپ کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہمیں کوئی بھی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

''سوری۔'' اس کے لہجے کی ناگواری محسوس کر کے میں بے ساختہ بولا۔ ''اصل میں میرا ارادہ ہے کہ میں پوری شب ہی آپ کے ہاں گزاروں اور معاوضے میں میں اڑھائی سو کی بجائے پانچ سو روپے دینے کو تیار ہوں۔''

''لل......لیکن میں پوری شب آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔'' اتنے زیادہ معاوضے کا سن کر اس سے انکار نہ کیا گیا۔

''مجھے صرف آرام کے لیے جگہ درکار ہے۔'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''پھر ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہوگئی۔

(قارئین کی معلومات کے لیے عرض کرتا چلوں کہ انڈیا میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں پنجابی، ہندی، گجراتی، اردو وغیرہ شامل ہیں، لیکن ان کی اردو میں ہندی کے بہت زیادہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ انڈیا میں مَیں نے جتنا عرصہ گزارا میرا واسطہ بھی ایسی ہی اردو سے پڑتا رہا قارئین کی سہولت کی خاطر کہ زیادہ تر قارئین ہندی کے الفاظ سے ناآشنا ہوں گے میں نے مکالمے میں ایسے الفاظ کے استعمال سے احتراز برتا ہے۔ البتہ جوا کا دکا لفظ مکالمے میں مستعمل ہوئے ہیں وہ بھی اتنے عام فہم ہیں کہ انشاءاللہ کسی کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی۔)

میں اس کے ہمراہ ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرتا ایک بوسیدہ سی بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہوا اس کی عمارت تین منزلہ تھی۔ وہ مجھے دوسری منزل کے ایک پرانے سے فلیٹ کے سامنے لائی اور بے دھڑک دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا اس فلیٹ کی حالت جوہی والے فلیٹ سے بہت خستہ تھی لیکن ان دونوں فلیٹوں کے رقبے میں کوئی خاص فرق مجھے نظر نہ آیا۔ یہ فلیٹ بھی تین چھوٹے کمروں اور کچن باتھ روم پر مشتمل دکھائی دیا۔ جس میں داخلی کمرہ لازماً ڈرائنگ روم تھا۔ اس میں دو پرانی سی چارپائیوں کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر چیز مجھے نظر نہ آئی۔ وہ مجھے لے کر ایک اندرونی کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی

پڑی تھی اوراس کی حالت باہر والی چار پائیوں کی نسبت بہتر تھی چار پائی پر ایک پھولدار چادر بھی بچھی ہوئی تھی۔ یہ وہ واحد چیز تھی جو اس فلیٹ میں مجھے ستھری دکھائی دی۔

''بیٹھیں۔''اس نے چار پائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور میں آرام سے چار پائی پر بیٹھ گیا جبکہ وہ منتظر نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی اور پھر میری جانب سے کوئی حرکت نہ ہوتی دیکھ کر بولی۔''میرا خیال ہے آپ کا یہ پہلا موقع ہے۔''اور میں اس کے اندازے پر حیران ہو گیا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''مجھے۔''وہ آہستہ سے ہنسی۔''مجھے اس طرح پتا چلا ہے کہ آپ نے ابھی تک طے کی ہوئی رقم ادا نہیں کی ہے۔''

''رقم ادا نہیں کی ہے؟''میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔''کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں کوئی بھاگا جا رہا ہوں۔''

''بھاگنے کی بات نہیں ہے بابو۔ عورت واحد جنس ہے کہ خریدار کے حوالے ہونے سے پہلے اپنا معاوضہ وصول کرتی ہے۔''

''اوہ......سوری مجھے واقعی معلوم نہیں تھا۔''میں کوٹ کی اندرونی جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا اور اس نے چپ چاپ پیسے وصول کر کے کہا۔ ''میں ابھی آئی۔''

اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں چار پائی پر لیٹ گیا۔ پتا نہیں یہ چار پائی کتنے رازوں کی امین تھی اور نا معلوم کتنے مرد یہاں پر اپنی جوانی لٹا چکے تھے۔ مجھے اس چار پائی پہ کراہت سی محسوس ہوئی۔ میں بے اختیار اٹھ بیٹھا۔

چند لمحوں بعد ہی وہ آن موجود ہوئی اور آتے ہی بولی۔

''بابو آپ کے پاس صرف ایک گھنٹا ہے اس کے بعد میں آپ سے چلی جاؤں گی۔''

''اس ایک گھنٹے کے دوران آپ میری ہر بات ماننے کی مجاز ہیں نا؟''میں مستفسر ہوا۔

''بالکل''وہ مدہم لہجے میں بولی۔

''اچھا تو پھر ادھر آؤ بیٹھو۔''میں نے اسے قریب بلایا اور وہ قریب آ کر بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

''تھوڑا سا اُدھر ہو جاؤ۔''میں نے اسے اپنے قریب سے دور کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ بے ساختہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

''تمھارا نام۔''میں نے اطمینان سے پوچھا۔

''بابو آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔''وہ تلخ ہوتے ہوئے بولی۔''اپنا مطلب پورا کریں اور مجھے جانے دیں۔''

''اپنا مطلب ہی پورا کر رہا ہوں نا؟''میں مسکراتے ہوئے بولا۔''آپ خود تصدیق کر چکی ہیں کہ آپ ایک گھنٹے کے دوران میری ہر بات ماننے کی مجاز ہوں گی۔''

''بات ماننے سے میری مراد......''

''مراد وغیرہ چھوڑو۔'' میں نے قطع کلامی کی۔ ''اپنا نام بتائیں۔''

''شرلا۔'' وہ جھلا کر بولی۔

''شادی شدہ ہو؟''

''ہاں شادی شدہ ہوں ایک بچے کی ماں ہوں۔ میرا پتی ٹیکسی چلاتا ہے اور اپنی زیادہ تر آمدنی شراب نوشی کی نذر کر دیتا ہے۔ میرا بچہ سخت بیمار ہے ڈاکٹر نے علاج کے لیے دس ہزار کی رقم طلب کی ہے۔ اسی رقم کو پورا کرنے کے لیے ایک ہفتے سے کوشاں ہوں اور ابھی تک بمشکل دو ہزار جمع کر پائی ہوں۔ بس یا اور کچھ؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''اب جلدی کرو تا کہ میں اپنے بچے کے پاس جاسکوں۔''

یہ کہہ کر اس نے کھڑے ہو کر اپنی ساڑھی کے بل کھولنے شروع کر دیئے۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک قبول صورت عورت تھی اور کسی بھی مرد کے لیے اس کو نظر انداز کرنا بہت مشکل تھا مگر میں ایک تو اس لائن کا بندہ نہیں تھا اور دوسرے حالات نے بھی مجھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ اس قسم کی عیاشی کا متحمل ہو سکتا۔

''کیا کر رہی ہو۔'' میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور اس کو ہاتھوں سے پکڑ کر چارپائی پر دھکیل کر بٹھا دیا۔

''بابو تمھارا مقصد کیا ہے۔'' وہ حیرانی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمھارا خاوند اس وقت کہاں ہوگا۔'' میں اس کے سوال کو نظر انداز کر کے بولا۔

''پڑا ہوگا کسی شراب خانے میں بیہوش۔'' وہ نفرت سے بولی۔ ''بس شادی کرنے اور بچہ پیدا کرنے کا شوق تھا۔''

''کب واپس آئے گا۔'' میں اس کی بات پر مسکرا کر بولا۔

''بھگوان جانے۔ کوئی مقرر ٹائم تو ہے نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے کوئی رضائی، کمبل یا گرم چادر وغیرہ ہو تو مجھے لا کر دے دو اور اس کے بعد آپ اپنے بچے کے پاس جاسکتی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''سمجھنے کو چھوڑو اور جو کہا ہے وہ کرو۔''

''تو کیا آپ......''

''ہاں مجھے بالکل تمھاری حاجت نہیں اور میں سونا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔

''کیوں۔ کیا میری شکل اتنی بری ہے۔'' اس کا عورت پن اپنے ٹھکرائے جانے کو برداشت نہ کر سکا اور وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''مجھے صرف رات گزارنے کے لیے ٹھکانہ چاہئے تھا ورنہ آپ تو اس قابل ہیں کہ۔'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو پھر شرما کیوں رہے ہو۔ رقم تو آپ نے یوں بھی ادا کر دی ہے۔'' وہ مجھے اکساتے ہوئے بولی۔

''فی الحال تو مجھے کوئی حاجت نہیں ہے۔'' میں اس سے جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ رات گئے تیری ضرورت ہوئی تو بلوا لوں گا۔''

''اور اس وقت اگر میں نہ آسکی تو؟''

''تو پھر میری قسمت۔''

''چلو جیسے تمھاری مرضی۔'' وہ چارپائی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اور ہاں آپ پہلے مرد ہیں جس کو میں اپنے گھر لائی ہوں۔ اس لیے صبح سویرے جلدی نکلنے کی کوشش کرنا ویسے میرا پتی تو نو دس بجے ہی واپس آتا ہے، لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، وہ پہلے بھی واپس آسکتا ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتی چلوں کہ وہ میری ان کارروائیوں سے ناواقف ہے۔''

''بات سنو۔'' وہ جیسے ہی اپنی بات ختم کرکے جانے کے لیے مڑی میں نے اسے پیچھے سے پکارا۔

''جی۔'' وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے پیچھے مڑی۔ شاید اس نے میرے پکارنے کا کوئی اور مطلب سمجھا تھا۔

''اگر تم واقعی کسی مجبوری کے تحت اس گندگی میں ملوث ہوئی ہو تو فکر نہ کرو صبح مجھ سے اپنے بچے کے علاج کے لیے جتنی رقم چاہے ہو لے لینا۔''

''کیا؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ''تم اتنی رقم مجھے کیوں دو گے۔''

''اس سے تمھارا کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''نہیں تم مجھے اتنی رقم بغیر کسی غرض سے کیوں دینے لگے۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''انسانیت سے تمھارا اعتبار اتنا زیادہ اٹھ گیا ہے کہ کسی کی پُر خلوص کوشش بھی غرض پر مبنی نظر آتی ہے۔ حالانکہ تم سے کسی قسم کی کوئی غرض ہوتی تو وہ میں ان پیسوں کے دینے کا وعدہ کیے بغیر پوری کر لیتا۔ بہر حال تمھیں یقین نہیں آتا تو یہ لو۔'' میں نے جیب میں موجود دلیر سنگھ کے دیئے ہوئے پیسے نکال کر اس میں سے دس ہزار کی رقم گن کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ گومگوی کیفیت میں کھڑی رہی بے یقینی اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

''یہ اصلی نوٹ ہیں۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس سے پہلے کہ میرا ارادہ بدل جائے یہ لے لو۔''

''میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔'' وہ میرے ہاتھ سے پیسے پکڑ کر ممنونیت بھرے لہجے میں بولی خوشی اور تشکر سے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''اسی منہ سے کرلو۔'' میں شرارتاً بولا۔

''کیا......؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''شکریہ......ادا۔'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''تم پوچھ رہی تھیں نا کہ کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ تو تمھارا یہ منہ بھی

کافی اچھا ہے۔اسی سے کرلو۔"
اور میری بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔وہ ہنستے ہوئے مجھے کافی اچھی لگی۔
"چائے لاؤں آپ کے لیے۔"
"نہیں شکریہ۔اب آپ جائیں میں بھی آرام کروں گا۔" یہ کہہ کر میں چارپائی پر لیٹ گیا۔
"ہاں۔آپ آرام کریں۔میں آپ کے لیے رضائی لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی اور چند لمحوں بعد ہی صاف ستھری رضائی لیے واپس آئی اور میرے منع کرنے کے باوجود بڑے پیار سے رضائی مجھے اوڑھا کر دوبارہ واپس لوٹ گئی۔

+ + +

دن کو سونے کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔میں بھارت سے نکلنے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگا۔سرحد عبور کرنے کے لیے مجھے یا تو واپس مقبوضہ کشمیر والا راستا اختیار کرنا پڑتا کیونکہ پہاڑی علاقوں میں سیکورٹی جتنی بھی زیادہ سخت رکھی جائے پھر بھی ایسے کئی محفوظ راستے مل جاتے ہیں جہاں سے بندہ آسانی سے سرحد عبور کر سکے اور اس کے لیے مجھے انبالہ سے جالندھر اور پھر وہاں سے مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں باہر نکل پڑتا،لیکن یہ ایک طویل اور دشوار سفر ہوتا۔اس کے برخلاف دوسرا راستا سمندر کا تھا اور اس کے لیے مجھے انبالہ سے بمبئی تک کا طویل سفر کرنا پڑتا۔
بمبئی ویسے بھی مجرموں کی جنت ہے اور وہاں پر لازماً مجھے کئی ایسے جرائم پیشہ افراد مل جاتے جو رقم لے کر مجھے پاکستان جانے میں مدد دے سکتے تھے۔اس رستے کو اختیار کرنے کے لیے مجھے بھاری رقم کی ضرورت پڑسکتی تھی اور رقم کا یہ مسئلہ بمبئی کے جوا خانے آسانی سے حل کر سکتے تھے۔تاش کھیلنے میں مہارت رکھنے کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ میں مطلوبہ رقم آسانی سے پیدا کر لیتا،لیکن یہ ایک لمبی بات تھی مجھ سے بڑا کوئی بھی پتاباز میرے اس منصوبے کو خاک میں ملا سکتا تھا۔
میں رقم کے حصول کے متبادل طریقوں پر غور کرنے لگا۔جس میں چوری ڈکیتی سے لے کر اغوابرائے تاوان کی سکیمیں تک شامل تھیں اور پھر انھی خیالوں میں نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔
رات کا جانے کون سا پہر تھا جب مجھے اپنے بستر میں کسی دوسرے شخص کی موجودی کا احساس ہوا۔کمرے کی لائیٹ آف تھی، لیکن کسی جوان عورت کے جسم کا لمس اپنی پہچان کرانے کے لیے روشنی کا محتاج نہیں ہوتا۔
"کون؟" یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کون ہوسکتی تھی میں نے آہستہ سے پوچھا۔
"میں ہوں شرلا۔" وہ مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔"میں نے سوچا شاید اب آپ میری ضرورت محسوس کر رہے ہوں۔" اس کے گداز بدن کی گرمی نے ایک آگ سی میرے اندر بھڑکا دی اور مجھے محسوس ہوا کہ اگر چند لمحے اور وہ مجھ سے لپٹی رہی تو اپنی خواہشات پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہوجائے گا۔میں جلدی سے اٹھ بیٹھا اور سخت لہجے میں بولا۔

’’شرم آنی چاہئے تمھیں۔اب کون سی سے مجبوری ہے کہ غیر مرد کے بستر میں گھسی ہوئی ہو۔‘‘

’’ش......شش......شما چاہتی ہوں مہاراج۔‘‘ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔’’مم مجھ سے بھول ہوگئی۔‘‘ اور میں نے اسے جواب دینے کی بجائے بازو سے پکڑ کر چارپائی سے نیچے دھکیل دیا اور اتنا غصہ کرنے کا مقصد صرف اسے کمرے سے باہر نکالنا تھا۔کیونکہ میرے اندر نفسانی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی اور مجھے پتا تھا کہ اس کے بعد شرلا کی ہلکی سی پیش قدمی بھی مجھے ثابت قدم نہ رہنے دیتی۔

’’مم......‘‘

’’نکل جاؤ یہاں سے۔‘‘میں دھاڑا۔اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔مجھے اپنے رویے پر ندامت سی محسوس ہوئی۔چند ٹکے دے کر ایک عورت کو میں نے اس کے گھر میں بے عزت کر دیا تھا۔یہ غصہ مجھے اپنی ذات پر آنا چاہئے تھا۔جو غلطی سے شرلا کی طرف منتقل ہو گیا،لیکن کیا کرتا کہ اپنی عزت بچانے کے لیے اس سے اس برتاؤ سے پیش آنا میری مجبوری تھی۔اس کے بعد مجھے صبح تک نیند نہ آسکی۔صبح کی اذانیں میرے کانوں میں پڑیں تو میرے قدم بے ساختہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے ہوئے مجھے عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔کمرے میں آکر میں نے بستر کی چادر سے فرش کو جھاڑا اور پھر ننگے فرش پر ہی نماز کی نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔انڈیا میں داخلے کے بعد یہ میری پہلی نماز تھی۔نماز کے بعد میں نے گڑگڑا کر اپنے گھر والوں کی خیریت کی دعا کی۔دل کو نماز پڑھنے کی بعد بہت سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

فرش سے اٹھ کر میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔پتا نہیں شرلا کا خاوند واپس آیا تھا کہ نہیں۔بہرحال جیسے بھی تھا میرا وہاں سے کوچ کرنے کا ٹائم ہو گیا تھا اور میں زیادہ دیر وہاں ٹھہر کر شرلا کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ شرلا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کے برتن پڑے تھے۔آملیٹ اور ابلے ہوئے انڈے نظر آ رہے تھے۔

’’بابو ناشتا کر لو۔‘‘ وہ آہستہ سے بولی۔رات والے واقع کی وجہ سے وہ بجھی بجھی اور نادم دکھائی دے رہی تھی۔

’’اتنے سویرے ناشتا؟ کیا روزانہ اسی ٹائم ناشتا تیار کرتی ہو۔‘‘

’’یہ ناشتوں والا گھر نہیں ہے بابو۔‘‘ وہ دکھی لہجے میں بولی۔’’یہ تو صرف آپ کے لیے بنایا ہے۔‘‘

’’تمھیں کیسے پتا چلا میں جاگ گیا ہوں؟‘‘میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

’’میں نے آپ کو باتھ روم میں جاتے دیکھ لیا تھا۔‘‘

’’چلو یہ اچھا ہو گیا۔میں ویسے بھی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ناشتا کرتے ہی نکل پڑوں گا۔‘‘

’’اگر آپ کی اچھا ہو تو آپ یہاں چند دن اور بھی ٹھہر سکتے ہیں۔‘‘ وہ چائے کپ میں ڈال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

’’کیوں......اپنے شوہر سے پٹوانے کا ارادہ ہے کیا؟‘‘میں مزاحیہ لہجے میں بولا۔

’’نن......نہیں......نہیں۔‘‘ وہ میرے مذاق کو نہ سمجھتے ہوئے جلدی سے بولی۔’’اصل میں ہم چند دنوں کے لیے دہلی جا رہے تھے

نا۔تو پیچھے گھر خالی رہے گا اس لیے میں نے سوچا کہ آپ رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔''

''دہلی؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔''وہاں کس لیے۔''

''اب آپ کی مہربانی سے اتنے پیسے ہو گئے ہیں کہ ہم اپنے بچے کا علاج دہلی میں کرواسکیں۔''

''یہاں سے بس کے ذریعے جاؤ گے؟'' میں نے معلومات لینے کی غرض سے پوچھا۔

''نہیں......اپنی ٹیکسی میں جائیں گے۔وہاں پر میری بہن کا گھر ہے۔میرا پتی بھی وہیں اپنی ٹیکسی چلا کر ٹوٹی پھوٹی مزدوری کرتا رہے گا جب تک کہ منا ٹھیک نہیں ہو جاتا۔''

''اگر میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ دہلی جانا چاہوں تو۔''

''آپ کی ہر خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''لیکن ایک بات بتا دوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔''میں مجرم ہوں اور پولیس سرگرمی سے میری تلاش میں ہے۔''

''پھر بھی اگر آپ کی یہی اِچھا ہے تو ہم آپ کو لے جانے کے لیے تیار ہیں۔البتہ پولیس سے بچنا آپ کا اپنا مسئلہ ہے۔''

''تمھارا پتی راضی ہو جائے گا؟'' اتنا مشکل کام اتنی آسانی سے ہوتے دیکھ کر میں اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔''اگر وہ کچھ نہ کہے تو میں ٹیکسی کی ڈگی میں گھس کر سفر کرلوں گا۔''

''ڈگی میں......؟'' وہ حیرانی سے بولی۔''مگر اتنا کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کر لینا۔''

''بتایا تو ہے کہ پولیس شدت سے میری تلاش میں ہے۔''

''اوہ مجھے خیال نہیں رہا تھا۔بہر حال جو آپ کی اِچھا ہو۔''

''ٹھیک ہے تم اپنے پتی کو تیار کر لینا۔میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔''

''اس کو تیار ہی سمجھو۔''

''او کے۔'' کہہ کر میں سر ہلاتا ہوا فلیٹ سے نکلتا چلا گیا۔مجھے معلوم تھا کہ اس طرح گھومنا میرے لیے نقصان دہ تھا،لیکن میری غرض صرف تازہ اخبار کا حصول تھی تاکہ میں تازہ حالات سے باخبر رہ سکتا۔اس کام کے لیے شرلا کو بھیجنا مجھے خلاف مصلحت لگا۔شرلا کے فلیٹ کی طرف آتے وقت رستے میں مجھے ایک بکسٹال نظر آیا تھا۔میرا اندازہ تھا کہ صبح سویرے اس پر اخبار مل جائے گا۔مفلر نے میری آنکھوں کے علاوہ تمام چہرے کو ڈھانپا ہوا تھا اور مجھے آسانی سے پہچاننا مشکل تھا۔لے دے کے میری قامت تھی جس سے مجھے پہچانا جا سکتا تھا۔میرا قد چھ فٹ دو انچ کے قریب تھا،لیکن یہ کوئی اتنا بڑا قد بھی نہیں تھا کہ میری شناخت کا خصوصی سبب بن جاتا۔سورج نکل آیا تھا اور گلیوں میں لوگوں کی آمدورفت جاری ہو گئی تھی،لیکن ان میں زیادہ تر لوگ کاروباری قسم کے تھے۔

مطلوبہ بکسٹال ابھی تک نہیں کھلا تھا۔میں اس سے آگے گزرتا چلا گیا۔خوش قسمتی سے مجھے بہت زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔نزدیک

ہی مجھے دوسرا بکسٹال کھلا ہوا مل گیا۔ بکسٹال سے انگریزی کے دو اخبار لے کر میں نے واپسی کا قصد کیا۔

شرلا کے فلیٹ تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ دستک دینے پر دروازہ شرلا نے ہی کھولا۔

''آئیں جی۔'' شرلا نے ایک طرف ہو کر مجھے اندر آنے کا رستا دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ڈرائنگ روم کی چارپائی پر ایک نحیف و نزار شخص بیٹھا دکھائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کو شرلا کا شوہر ہونا چاہیے تھا۔ میرے اندازے کی تصدیق شرلا کے اس کا تعارف کرانے سے ہوئی۔ شرلا ابھی تک میرے نام سے ناواقف تھی لیکن اپنے شوہر کو اس نے میرا نام موہن بتایا اور میں نے بھی اس خود ساختہ نام کی تردید کرنی مناسب نہ سمجھی۔

شرلا کا شوہر جس کا نام شنکر تھا نہایت سرسری انداز میں مجھے ملا۔ پتا نہیں شرلا نے اس کو میرے بارے کیا بتایا تھا۔ ہمارا تعارف کرا کے شرلا کچن میں گھس گئی اس کا ارادہ راستے کے لیے کوئی کھانے وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا۔ میں بھی شنکر کو اکیلا چھوڑ کر اندرونی کمرے میں گھس آیا تاکہ آرام سے اخباروں کی ورق گردانی کر سکوں۔ حسبِ توقع فرنٹ پیج پر مجھے اپنی ایک درمیانے سائز کی تصویر نظر آ گئی۔ جس کے نیچے میرا نام حلیہ وغیرہ تفصیل سے لکھا ہوا تھا۔ اطلاع دینے والے کے لیے انعام کی رقم =/50,000 سے بڑھا کر ایک لاکھ تک کر دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک منسلک خبر کوبرے اور اس کے ساتھیوں کے متعلق تھی اور ان کی موت کا ذمہ دار بھی مجھے ہی ٹھہرایا گیا۔ یہ دونوں خبریں دونوں اخباروں میں تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کافی تلاش کے باوجود مجھے اپنے متعلق کوئی خبر نہ مل سکی۔

دونوں اخباروں کے اپنی تصویر والے صفحات میں نے پھاڑ کر ان کے ٹکڑے چارپائی کی ادوان میں چھپا دیئے۔ گھنٹے دو کے بعد انھوں نے جانے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔

شنکر کی ٹیکسی بلڈنگ کے احاطے میں پارک تھی۔ شرلا نے میری آرام کی خاطر ڈگی کے اندر ایک کمبل بچھا دیا تھا۔ دائیں بائیں احتیاط سے نظر دوڑانے کے بعد میں تیزی کے ساتھ اس کھٹارا ٹیکسی کی ڈگی میں منتقل ہو گیا۔ شرلا نے رقم کی پوٹلی اور کپڑوں والا سوٹ کیس بھی ڈگی میں رکھ چھوڑا تھا۔ ڈگی کے اندر سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔

ٹیکسی جھرجھری لے کر اسٹارٹ ہوئی اور دہلی کی جانب ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ چند موڑ مڑنے کے بعد ہی سمتوں کا اندازہ لگانا میرے لیے دشوار ہو گیا، لیکن اتنا اندازہ بہر حال مجھے تھا کہ دہلی انبالہ سے جنوب کی سمت میں ہے۔

راستے میں ایک دو چیک پوسٹوں پر پولیس والوں نے روکا مگر سرسری تلاشی لے کر گاڑی کو جانے دیا۔ گو دیکھنے میں ٹیکسی خاصی خستہ دکھائی دے رہی تھی لیکن چلنے میں کافی بہتر تھی۔ ایک ویرانے میں گاڑی روک کر ہم نے کھانا کھایا اور پھر آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس جگہ شرلا نے مجھے بتایا کہ ہم میرٹ سے نکل آئے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر ڈگی میں منتقل ہوا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ مجھے امید تھی کہ انبالہ کی نسبت دہلی میں میرے لیے خطرہ کم ہو گا، لیکن یہ ایک ظنی بات تھی اور انڈین انٹیلی جنس کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس پیمانے پر میری تلاش میں تھی پاک بھارت ہر دو ممالک میں جاسوسوں کی بڑی تعداد ایک دوسرے کے مخالف متحرک رہتی ہے اور ایسے جاسوس مستقل بنیادوں پر

مخالف ملک میں براجمان رہتے ہوئے آستین کا سانپ بنے رہتے ہیں، لیکن ان کی شناخت نہایت ہی مشکل ہوتی ہے اور پہچانے جانے کے بعد کوئی معجزہ ہی کسی جاسوس کو پکڑے جانے سے بچا سکتا ہے ورنہ متحرک اور فعال ایجنسیاں اسے گھیرنے میں دیر نہیں لگاتیں۔

میں بھی اس وقت انھی حالات سے گزر رہا تھا۔ میری شناخت پہلے ہی دن سے ہو چکی تھی بلکہ شناخت کیا میں ان کی حراست سے بھاگا ہوا تھا۔ ابھی میری گرفتاری ملک کے تحفظ سے زیادہ ان کی انا کا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ میں موت سے نہیں ڈرتا تھا، لیکن گاؤں کے حالات جانے بغیر مرنے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔ اگر کچھ عرصے کے لیے میں نے چھپنا ہوتا تو ان انٹیلی جنس والوں کا باپ بھی مجھے تلاش نہ کر سکتا لیکن افسوس کہ اس وقت ایک ایک منٹ گزارنا میرے لیے کار دار تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر اپنے گاؤں پہنچ جاؤں۔

اچانک ٹیکسی جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ”شاید کسی ایکسیڈنٹ سے بچنے کے لیے شنکر نے بریک لگائی ہوگی۔“ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ مگر ایک گرجدار آواز نے میری سوچ کو جھٹلا دیا۔

”باہر آ جاؤ تم دونوں۔“

”مہاراج ہم سے کیا بھول ہوئی ہے۔“ جواباً شنکر کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

”بھول کے بچے۔ سنا نہیں کہ گاڑی سے باہر نکلو۔“ پہلے والی گرجدار آواز آئی۔

”میرا خیال ہے چھوری کو ساتھ لے چلتے ہیں۔ کچھ موج میلا لگا رہے گا۔“ کسی دوسرے نے مشورہ دیا۔

”واہ کیا ذہن پایا ہے پرنس۔“ وہی پہلے والی گرجدار آواز سنائی دی۔ ”اسی لیے ہم تجھے پلان میکر کہتے ہیں۔ جُورا ہوتا تو تیرا منہ چوم لیتا۔“

”دادا بس تمھاری کرپا ہے۔“ پرنس نامی شخص کی خوشامدانہ آواز آئی۔ اسی اثنا میں مجھے شرلا کی منت بھری آواز سنائی دی۔

”بھائی بھگوان کے لیے ہمیں جانے دو، ہم نے بچے کو ہسپتال لے کر جانا ہے۔“

”بھگوان کے لیے۔ ہاہاہا۔“ وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ”کون سا بھگوان اور کون سا واہ گروان سے ہم بہت عرصے سے پیچھا چھڑا چکے ہیں۔ اب شیطان ہی ہمارا بھگوان ہے اور وہی ہمارا واہ گرو۔“ یہ غلیظ الفاظ دادا کے منہ سے نکلے تھے، لیکن ہنسنے والے وہ دونوں تھے۔

”اس کا مطلب ہے ان کی تعداد دو ہے۔“ میں اپنے دل میں سوچا۔

اچانک ٹیکسی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی شنکر کی منمناتی آواز آئی۔ ”مہاراج بنتی کرتا ہوں شما دے دو۔“ جبکہ شرلا زور زور سے رونے لگ گئی تھی۔ انھوں نے غالباً شنکر کو گھسیٹ کر باہر پھینکا تھا اور ان کا ارادہ لازماً شرلا اور ٹیکسی دونوں پر قبضے کا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ جس جگہ وہ ٹیکسی روک کر کسی قسم کی غلط حرکت شرلا کے ساتھ کریں گے تو بے خبری میں ان پر جا پڑوں گا۔ لیکن پھر سوچا کہ اس طرح ٹائم کے ضیاع کا خطرہ تھا اور شنکر کی غیر موجودی میں ہمارا دہلی پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ شنکر شرلا کا شوہر بھی تھا۔ اس کو بچانا بھی میرا فرض تھا۔ میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے اسی جگہ حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا یوں بھی احتیاطاً میں نے ڈگی کے لاک کے نیچے

رسی کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا تاکہ کسی بھی سچویشن میں میں چوہے دان کی طرح ڈگی میں نہ پھنس جاؤں اور وہ احتیاط میرے کام آ گئی تھی۔

ایک جھٹکے کے ساتھ ڈگی کا ڈھکن اٹھا کر میں نے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت تک ان میں سے ایک شرلا سے بچہ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا جو ایک چادر میں لپیٹ کر شرلا نے سینے سے لگایا ہوا تھا جبکہ دوسرا اپنے گرگے شنکر کی سمت بڑھ رہا تھا اور اس کا ارادہ لازمی طور پر شنکر کو عارضی یا مستقل خاموش کرنے کا تھا۔ ڈگی کے کھلنے کی آواز سن کر وہ دونوں چونک کر میری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ شرلا کے ساتھ زور آزمائی کرنے والا ہلکی پھلکی جسامت کا ٹیڈی نما شخص تھا اس کے برعکس شنکر کی سمت بڑھنے والا پہلوان نما آدمی قد میں بمشکل مجھ سے ایک دو انچ کم ہو گا لیکن جسامت میں دوگنا تھا اور میرے خیال میں اسی کو دادا ہونا چاہئے تھا۔ وہ دونوں مجھے خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے شاید ہتھیار وغیرہ ان کی جیب میں پڑے تھے۔

''اوئے پرنس یہ بالک کہاں سے نکلا ہے۔'' دادا اپنی منحوس آواز میں گرجا۔

پرنس مزاحیہ لہجے میں بولا۔''دادا میرا خیال ہے یہ اس چھوری کا کوئی پریمی ہے اس کی حفاظت کے خیال سے ڈگی میں چھپ کر سفر کر رہا تھا۔''

ہم ایک روڈ پر کھڑے تھے اور میں زیادہ دیر ان سے ڈائیلاگ بازی میں وقت نہیں گزار سکتا تھا اور یہ تو مجھے خوب پتا تھا کہ وہ لاتوں کے بھوت تھے، انھیں باتوں سے سمجھانا اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ جبکہ میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت وقت کی تھی۔ میں نے اپنے دونوں اہداف پر نگاہ دوڑائی پرنس نامی شخص میرے لیے آسان ہدف تھا اور اس کو چھوڑ دینے کی صورت میں دادا سے لڑائی کے دوران وہ کوئی ہتھیار نکال کر سچویشن کو پیچیدہ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے پہلے اسی کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی میرے استاد صوبیدار مراد صاحب کی نصیحت تھی کہ سب سے پہلے اپنے مخالفین کی تعداد گھٹاؤ کیونکہ ایک سے زیادہ مخالف تمھیں بے خبری میں آسانی سے نشانہ بنا سکتے ہیں اس موقع پر وہ ''ایک اکیلا دو گیارہ'' والی کہاوت ضرور سنایا کرتے تھے۔

میں اپنی جگہ پہ اچھلا اور پرنس جو دادا سے اپنے جوک کی داد چاہنے کے انتظار میں تھا پہ جا پڑا۔ کنپٹی پر لگنے والی بوٹ کی ضرب نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ گھنٹے ڈیڑھ میں اس کا ہوش میں آنا ناممکن تھا۔ اس سے فارغ ہوتے ہی میں دادا کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ پرنس کی حالت دیکھ کر شاک کی سی کیفیت میں کھڑا تھا۔ مگر پھر مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ناقابل بیان گالیاں بکتا ہوا میرے جانب بڑھا۔ اس نے پہلوانوں کے انداز میں اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا لیے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس صرف طاقت تھی یا اگر ٹیکنیک تھی بھی سہی تو وہ پہلوانوں والی ہو سکتی تھی جس کی ضرورت فری سٹائل لڑائی میں نہ ہونے کے برابر پڑتی ہے۔

اس کے قریب جاتے ہی میں اچھلا اور اپنے دونوں پاؤں اس کی چھاتی پر مارنے کی کوشش کی۔ مگر اس کو سمجھنے میں مَیں نے غلطی کی تھی وہ بجلی کی سی سرعت سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وار خطا جانے پر میرا پختہ روڈ پر گرنا لازمی ہو گیا مگر میں نے آخری وقت میں اپنے آپ

کو سنبھال لیا اور شدید چوٹ کھانے سے بچ گیا۔

جیسے ہی میں گر کر کھڑا ہوا مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دادا نے مجھے پوری قوت سے پیچھے سے چھاڈال دیا۔ طاقت کے لحاظ سے میں نے کبھی اپنے آپ کو کمزور نہیں پایا ہے لیکن وہ شاید جناتی قسم کی قوت کا مالک تھا کہ مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے مجھے بازوؤں کے اوپر سے اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ میں کہنی وغیرہ کا وار بھی اس پر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے سر کو زور سے پیچھے کی طرف جھٹکا دیا کہ سر کی عقبی چوٹ اس کے ناک پر لگاؤں، لیکن اس نے اپنا چہرہ بائیں سمت میں جھکایا ہوا تھا اور مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ میں تیزی سے اس کے شکنجے سے نکلنے کے متعلق سوچنے لگا اگر کچھ دیر اور وہ مجھے اسی حالت میں رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تو میری مدافعاتی قوت بالکل ختم ہو جاتی اور میں حقیر کینچوے کی طرح مارا جاتا۔

پہلوان نما دادا نے مجھے اوپر اٹھایا ہوا تھا اس طرح کہ مجھے زور آزمائی کرنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک فیصلے پر پہنچ کر میں نے اپنا بائیں پاؤں گھٹنے سے موڑا اور اس کی ایڑی پوری قوت سے اس کی ٹانگوں کے درمیان دے ماری۔ میں نے اپنی طرف سے پوری قوت استعمال کی تھی مگر خاطر خواہ چوٹ اس کو نہ لگ سکی البتہ اس کی گرفت میرے جسم پر تھوڑی سے کمزور ہوئی اور میرے لیے اتنا ہی غنیمت تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور پوری قوت لگا کر اپنی کہنیوں کو دائیں بائیں پھیلایا۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ پھسلتے ہوئے اوپر کی جانب کھسکے، جیسے ہی اس کی گرفت میری کہنیوں پر ڈھیلی ہوئی میں نے اپنی بائیں کہنی پوری قوت سے اس کی پسلیوں میں دے ماری۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ''اوغ'' کی آواز نکلی اور میں اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا میں دو تین قدم آگے دوڑ کر پھر مڑا تا کہ اس کے اچانک داؤ سے بچ سکوں اور میری یہ احتیاط کام آ گئی۔

میں جیسے ہی پیچھے مڑا میں نے دیکھا کہ وہ سانڈ کی طرف سر جھکا کر میری طرف دوڑ پڑا تھا۔ اگر وہ ٹکر مجھے لگ جاتی تو میرا بچنا محال تھا۔ میں اس کی سخت جانی پر حیران رہ گیا۔ کہنی کی اتنی شدید ضرب کھانے کے باوجود اس کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا میں تیزی سے اپنے دائیں سمت میں ہٹا اور اگلے لمحے ہی اس کی موٹی گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں تھی۔ وہ اتنا تیزی میں تھا کہ میں بے ساختہ چند قدم اس کے ساتھ گھسٹتا گیا لیکن یہ اس کی زندگی کے آخری قدم تھے اور جیسے ہی میرے پاؤں کی مومنٹ رکی میں نے اپنے بائیں بازو کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور کڑاک کی آواز کے ساتھ ہی دادا کا رابطہ زندگی سے منقطع ہو گیا۔ آخری لمحے میں اس نے اپنی گردن میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی جگہ اگر کوئی سانڈ بھی ہوتا تو اپنی گردن نہ چھڑوا سکتا وہ تو پھر بھی انسان تھا۔

اسے نفرت کے ساتھ زمین پر پٹک کر میں جیسے ہی سیدھا ہوا اچانک کوئی پوری قوت سے میرے ساتھ آن لپٹا۔ وہ شرلا تھی اور ہیجانی لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''بابو تم ٹھیک تو ہونا۔ بابو تم ٹھیک تو ہو۔''

''ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں آہستہ سے اس کی گرفت سے نکل کر بولا۔ ''اب جلدی کرو یہ مین روڈ ہے کسی بھی وقت کوئی

گاڑی آسکتی ہے۔''

''ہاں...... ہاں چلو۔'' وہ ٹیکسی کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

شنکر سڑک سے اٹھ کر ٹیکسی کی فرنٹ سیٹ پر آ کر اترچھا ہو کر بیٹھا تھا۔ پختہ سڑک پر گرنے کی وجہ سے اس کو اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔

''ڈرائیونگ کر لو گے؟'' میں نے شنکر سے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ شرلا کو وارفتگی سے میرے ساتھ لپٹتے دیکھ کر شاید اس نے برا محسوس کیا ہو۔ مگر اس قسم کا کوئی تاثر مجھے اس کے چہرے پر نظر نہ آیا اور اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ شرلا کی چھپی ہوئی سرگرمیوں سے واقف تھا۔

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں؟'' وہ سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ ''میں تو آپ کے لیے پریشان بیٹھا تھا کہ آپ نے ہماری خاطر اتنا کشٹ اٹھایا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں شنکر بھائی۔ یہ میرا فرض تھا اور آپ گاڑی سٹارٹ کریں۔ یہ نہ ہو کوئی آجائے۔'' یہ کہہ کر میں ڈگی کی طرف بڑھ گیا جبکہ شنکر گاڑی سٹارٹ کرنے لگ گیا۔

اس کے بعد دہلی پہنچنے تک کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ ہم رات گئے ہی دہلی پہنچ سکے۔

ایک ویران سی سڑک پر گاڑی روک کر شنکر نے مجھے ڈگی سے نکالا اور میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر منتقل ہو گیا۔

''کسی غیر معروف ہوٹل کے قریب مجھے اتار دینا۔'' ٹیکسی کے آگے بڑھتے ہی میں شنکر سے مخاطب ہوا۔

''ہوٹل میں کیوں؟'' شرلا تیزی سے بولی۔ ''آپ ہمارے ساتھ رات گزاریں۔ میری دیدی کا گھر بہت بڑا ہے۔''

''گھر کی بات نہیں ہے شرلا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے کہ تیری دیدی کا گھر بہت بڑا ہوگا لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ لوگوں پر کوئی مصیبت آئے۔''

''ایک ہی رات کی تو بات ہے۔'' وہ مصر ہوئی۔ ''وہ بھی آدھی گزر چکی ہے۔''

''نہیں شرلا یہ ناممکن ہے۔'' میں حتمی لہجے میں بولا اور شرلا نے اداسی سے سر جھکا کر چپ سادھ لی۔ شنکر نے کسی قسم کا مشورہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہاں تک کہ ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل کے قریب پہنچے۔ شنکر نے گاڑی روک کر پوچھا۔

''مہاراج یہ ہوٹل سستا بھی ہے اور رہائش کا انتظام بھی کافی اچھا ہے۔ یہیں اترنا چاہیں گے یا پھر کوئی اور ہوٹل دیکھیں۔''

''نہیں یہی ٹھیک ہے۔'' میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

شرلا نے خفگی سے سر کو نیچے جھکا لیا تھا۔ اس کے شوہر کی موجودی میں میں اسے کسی قسم کی تسلی نہیں دے سکتا تھا، لیکن پھر بھی اس کی دلجوئی کی خاطر بولا۔

''شرلا اپنی دیدی کا پتا مجھے لکھ دو اگر موقع ملا تو میں تمھیں ملنے ضرور آؤں گا۔''

''وہ پتا بہت آسان ہے۔'' شرلا دھیرے سے بولی۔ ''آرمی ہسپتال کے پیچھے سٹریٹ نمبر 2 میں 10 نمبر کوارٹر ان کا ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی مجھے موقع ملا میں ضرور آؤں گا۔'' کہہ کر میں نے شنکر سے ہاتھ ملایا اور پھر شرلا سے ہاتھ ملا کر وہاں سے چل پڑا۔

''بھگوان تمھاری رکھشا کرے۔'' شرلا دھیرے سے بڑبڑائی اور شنکر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں ان کو دکھانے کی غرض سے ہوٹل کے دروازے تک گیا لیکن اندر گھسنے کی بجائے آگے نکلتا چلا گیا۔ میرا ارادہ وہاں سے آگے نکلنے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے بس اڈے پر پہنچنے کی فکر ہوئی۔ تھوڑا آگے چلنے کے بعد ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔

''لاری اڈے......'' میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بولا۔

اور ڈرائیور نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں آج آسانی سے دہلی سے آگے جا سکتا تھا۔ شاید مجھے ڈائریکٹ بمبئی کے گاڑی مل جاتی اور بمبئی پہنچنے کے بعد میرا کام آسان ہو جاتا۔ مجھے امید تھی کہ سمندر کے راستے میں بغیر کسی خطرے سے دوچار ہوئے پاکستان میں داخل ہو جاتا اور اس کے بعد اپنے علاقے میں پہنچنا کوئی مشکل نہ ہوتا۔

میں مستقبل کے منصوبے بنانے میں گم تھا کہ ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی، میں نے دائیں بائیں دیکھا تو وہ ایک زیر تعمیر عمارت کے اندر آ کر رکی تھی۔

''میں نے لاری اڈے کا بتایا تھا۔'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔ مگر ڈرائیور میری بات کا جواب دیئے بغیر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا اور میں بھی جلدی سے دروازہ کھول کر ٹیکسی سے باہر آ گیا۔ اس اثناء میں مجھے اندرونی کمرے سے تین افراد باہر آتے دکھائی دیئے تینوں نے ہاتھوں میں ہتھیار تھامے ہوئے جن کا رخ میری جانب تھا۔

ڈرائیور نے بھی اپنی جیب سے ریوالور نکال کر مجھ پر تانتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''آپ ہاتھ اٹھانے کا کشٹ کریں گے۔'' میں اپنے ہاتھ سر بلند کرتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس کیا ہے برادر جو آپ لوٹیں گے۔ کوئی تگڑی اسامی تو دیکھنی تھی۔''

''یہ تو تمھاری تلاشی لینے پر پتا چلے گا نا بالک۔'' ٹیکسی ڈرائیور مکروہ آواز میں بولا۔ باقی تینوں بھی اس کے ساتھ آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والا گروہ تھا۔ ایسے گروہوں کا کام اکیلے مسافر کو لوٹ لینا۔ کسی راہگیر کی جیبوں کا بوجھ ہلکا کر لینا۔ دکان کا تالا توڑ کر نقدی سامان وغیرہ لے اُڑنا وغیرہ ہوتا ہے۔ کسی بڑے کام میں ہاتھ ڈالنے سے یہ لوگ زیادہ تر احتراز برتتے ہیں۔ البتہ وقت پڑنے پر کسی کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس قسم کے گروہ بھارت کے مختلف شہروں میں مکڑی کے جالوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، خصوصاً بمبئی تو ان کا گڑھ ہے۔ آج پاکستان میں بھی ایسے گروہوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سندھ والی سائیڈ پر تو شام کے بعد اکیلے بندے کا رات کو باہر نکلنا دوبھر ہو گیا ہے۔

’’بلے اس کی تلاشی لو۔‘‘ ڈرائیوان میں سے ایک سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’اوکے باس۔‘‘ بلا نامی شخص بڑے سٹائل سے اپنی پستول دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتا ہوا میری جانب بڑھا۔ میں اسے آڑے ہاتھوں لینے کے لیے مستعد ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب پہنچتا سڑک سے گزرنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائیٹ کی روشنی ہم پر پڑی اور ایسا چار دیواری کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن ایسی وارداتیں کرنے والے ان باتوں سے نہیں گھبراتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عام لوگ یہ سب کچھ نظر انداز کر کے گزر جانے والے ہوتے ہیں پرائی آگ میں کون کودتا ہے۔ کوئی بہت نیک ہوا بھی تو وہ تھانے اطلاع دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور پولیس ایکشن لینے میں جتنی مستعد ہے اس سے کون ناواقف ہے۔

مگر اس وقت ان کی بدقسمتی یا میری خوش قسمتی کہ گاڑی کے ڈرائیور نے یہ منظر دیکھنے کے بعد اپنی گاڑی کا رخ اسی طرف کر لیا۔

’’یہ کون...... ہے؟‘‘ ٹیکسی ڈرائیور جو اس گروہ کا سرغنہ تھا، نے ناقابل بیان گالی دیتے ہوئے کہا۔

لیکن جیسے ہی اس نے چندھیائی آنکھوں سے ادھر دیکھا اور اسے گاڑی کی چھت پر رنگ برنگی روشنی والی لائیٹیں نظر آئیں وہ چیخا۔

’’ارے باپ رے؟ یہ تو پولیس ہے...... بھاگو۔‘‘ تمام نے اندرونی عمارت کی طرف دوڑ لگائی پولیس کا نام سنتے ہی میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ چھوٹے خطرے سے میں بڑے خطرے میں گھرنے والا تھا۔ میں نے بھی عمارت کے دائیں جانب دوڑ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے پولیس کا للکارا اور ہوائی فائر سنائی دیا لیکن میں نے رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رکنے کا مطلب تھا گرفتاری، جس کا میں بالکل متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

زیر تعمیر عمارت کی چاردیوری سے نکل کر میں جونہی آگے بڑھا مجھے دوسری زیر تعمیر بلڈنگ نظر آئی اور میرا رُخ اُسی جانب ہو گیا۔ پولیس والوں کی آوازیں پہلی عمارت کی اندرونی جانب سنائی دے رہی تھیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب میں نے پولیس کو کسی کے کام آتے دیکھا۔ بیشک ایسا نادانستگی میں ہوا تھا۔ مگر ہوا ضرور تھا۔

دوسری زیر تعمیر عمارت سے گزرتا ہوا میں اُس کے عقبی جانب نکلا اور سامنے موجود پہلی گلی میں گھس کر بجائے دوڑنے کے تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور جانے لگا۔ سٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں گلی دور دور تک خالی دکھائی دے رہی تھی۔

پے در پے حادثوں نے مجھے کسی منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میں سوچتا کچھ تھا ہوتا کچھ تھا۔ بھارت کی سرزمین میرے لیے دلدل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ میں اس دلدل سے نکلنے کے لیے جتنے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اتنا زیادہ نیچے دھنستا جا رہا تھا۔ اگر ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے سیدھا اڈے پر پہنچا دیا ہوتا تو شاید اب تک میں بمبئی کی طرف گامزن ہوتا۔ بہر حال یہ قانون فطرت ہے۔ کہ آدمی جو چاہتا ہے عموماً اُس کے برعکس نتیجہ نکلتا ہے۔ اور جب تک رب کی مرضی تھی میرا بھارت سے نکلنا دشوار تھا لیکن میں رب کی رضا پر راضی ہوتے ہوئے بھی ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور تھا کہ یہی میرے بس میں تھا۔ میں نے اپنی کوشش کرنی تھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے

رہنے کا مطلب تھا میں نے شکست تسلیم کر لی ہے اور رب کی رحمت سے مایوس ہو گیا ہوں۔ جبکہ مایوس کفر تھی اور شکست تسلیم کر لینا میرا شیوہ نہیں تھا۔ میری رگوں میں گنڈہ پوری خون دوڑ رہا تھا میں کسی قیمت پر ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

میں تیز قدموں سے چلتا اس جگہ سے دور ہٹتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی مشکل تھا کہ پولیس والے ہمارے تعاقب میں آتے۔ یہی بہت تھا کہ انہوں نے واردات ہوتی دیکھ کر اس کے خلاف ایکشن لے لیا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد گلی بائیں جانب مڑ گئی میں جیسے ہی مڑا مجھے سامنے سے دو بندے آتے دکھائی دیئے۔ اُن کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ ان میں سے ایک ڈرائیور اور دوسرا بلا نامی آدمی تھا۔ باقی دو شاید کسی اور راستے سے فرار ہوئے تھے ان دونوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور سٹریٹ لائیٹ کی روشنی میں مجھے پہچاننے میں انھیں دیر نہ لگی۔ میرا ارادہ ہوا کہ ان کے سنبھلنے سے پہلے ان پر جا پڑوں مگر وہ دس پندرہ گز مجھ سے دور تھے کہ رک گئے اور ایک میکانیکی عمل کے تحت اُن کے ہاتھ اپنی جیبوں میں غائب ہوئے اور جب باہر آئے تو ہتھیار اُن کے ہاتھوں میں تھے۔ میں نے بھی بجلی کی سی سُرعت سے کوبرے سے حاصل کیا ہوا پستول نکال کر ان پر تان لیا تھا۔

+++

ایک عجیب سی سچویشن بن گئی تھی۔ گولی چلانے میں جو بھی پہل کرتا اس کا اپنا بچنا محال ہو جاتا کہ مخالف نے مرتے مرتے بھی اس کا کام تمام کر دینا تھا۔ ہم نا معلوم کتنی دیر اس حالت میں رہتے کہ اچانک ڈرائیور پارٹی کی پشت کے جانب دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ میری نظر بے اختیار اس جانب اٹھی، سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں مَیں نے بھاگنے والے دور ہی سے پہچان لیے ان کی تعداد تین تھی اور وہ پولیس والے تھے۔ انڈین پولیس سے مجھے اس مستعدی کی توقع نہیں تھی۔ آج دوسری بار بھی ان کی آمد نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ حیرانی کے ساتھ ساتھ میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے خطرہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ڈرائیور پارٹی کو اس خطرے سے آگاہ کرتا۔ بلے نے بھی پیچھے مڑ کر آنے والوں کو دیکھ لیا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہراساں آواز برآمد ہوئی۔

"مارے گئے باس یہ تو......"

اچانک پولیس والوں نے ہوائی فائر کیا اور بلے کی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔

"بھاگو" خطرہ بھانپتے ہی ڈرائیور چیخا۔ ان دونوں کے حرکت کرنے سے پہلے ہی میں یہ رسک لے چکا تھا البتہ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے مڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اسی طرح الٹے قدموں بھاگتے ہوئے وہاں سے دور جانے لگا۔ مگر جیسے ہی ڈرائیور نے "بھاگو" کا نعرہ بلند کیا۔ میں پیچھے مڑ کر پوری رفتار سے بھاگا۔ یوں بھی سپورٹس شوز مجھے بھاگنے میں مدد دے رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے میں نے پستول کوٹ کی جیب میں منتقل کر دیا تھا۔ موڑ مڑتے ہی میں پولیس والوں اور ڈرائیور وغیرہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پولیس والوں کے للکارنے کی آوازیں تواتر سے میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ میں نے اپنی دائنی طرف کی دیوار کے جانب نگاہ دوڑائی دیوار کی اونچائی آٹھ فٹ کے قریب تھی۔ بجلی کی سی سرعت سے اچھلتے ہوئے میں دیوار پہ چڑھا اور اسی تیزی سے دوسری جانب اتر گیا۔ یہ موڑ کے

ساتھ پہلا مکان تھا۔ میں ڈرائیور پارٹی کے موڑ مڑنے سے پہلے دوسری جانب اتر گیا تھا۔ نیچے اترتے وقت میں نے یہ احتیاط برتی کہ دیوار سے لٹک کر پنجوں کے بل نیچے کودا تاکہ کوئی آواز پیدا نہ ہونے پائے۔ سردی جوبن پر تھی اور بند کمروں میں رضائیاں اوڑھے لوگ بے فکر سو رہے تھے۔ اس شور شرابے کی آواز شاید ہی ان کے کانوں تک پہنچ پاتی۔ البتہ اس مکان میں گھسنے سے پہلے ایک خوف میرے ذہن میں ضرور جاگزین ہوا تھا کہ کہیں گھر میں کتا وغیرہ نہ ہو، کتے کی موجودی میرا بھانڈا پھوڑ دیتی اور پھر وہ گھر میرے لیے چوہے دان ثابت ہوتا، لیکن میری خوش قسمتی کہ میں اس خطرے سے بچ نکلا۔

گھر کے اندر گھسنے کا رسک بھی میں نے اس لیے لیا تھا کہ پولیس سے آگے مڈ بھیڑ ہونے کا خطرہ بھی موجود تھا۔

''ارے یاس وہ پنچھی کدھر اُڑ گیا۔'' مجھے بلے کی متحیر آواز سنائی دی۔

''بھاڑ میں جائے۔'' ڈرائیور کی جھلاہٹ بھری آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی ان کے دوڑتے قدموں کی آواز دور جاتی سنائی دی۔ لمحہ بھر بعد ہی پولیس والے وہاں سے للکارتے ہوئے گزرے۔ اس اثنا میں مَیں نے وہاں سے حرکت نہیں کی تھی اور اپنی چڑھی ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یکدم دوڑ لگانے کی وجہ سے میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ اگر زیادہ فاصلے تک مجھے بھاگنا پڑا ہوتا تو میری سانسیں دوڑتے دوڑتے ہی ہموار ہوگئی ہوتیں۔

پولیس والوں کے قدموں کی آواز جیسے ہی معدوم ہوئی۔ میں مکان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا چھوٹا سا مکان تھا۔ سامنے تین چھوٹے کمرے ان کے آگے برآمدہ دائیں بائیں کچن اور باتھ روم (ان کے سائز کی وجہ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کچن اور باتھ روم ہوں گے، بعد میں چیک کرنے پر میرا اندازہ درست نکلا) گلی کی سائیڈ پر بھی دیوار کے ساتھ ایک اکلوتا کمرہ دکھائی دیا۔ جس طرح ہمارے ہاں بیٹھک وغیرہ کے لیے بناتے ہیں اس کا مقصد بھی شاید کچھ اسی طرح کا ہو۔

ایک سرسری جائزہ لے کر میں اس اکلوتے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے گمان کے موافق دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کنڈی کھولی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اپنے پیچھے دروازے کو بھیڑ کر میں بجلی کے بورڈ کی تلاش میں دروازے کے دائیں جانب ہوگیا مگر اندھیرے میں دیوار پر ہاتھ پھیرنے کے باوجود مجھے بورڈ نہ ملا۔ میں دوسری جانب بڑھا اور بورڈ تلاش کر کے اس کے اوپر موجود بٹنوں کو یکے بعد دیگرے آن کرتا گیا۔ جیسے ہی لائٹ جلی میں نے ایک لمحے کے لیے کمرے کا جائزہ لیا اور دوبارہ لائٹ آف کر دی۔ کمرے کے اندر تین چار پائیاں دیواروں کے ساتھ سلیقے سے بچھی ہوئی پڑی تھیں اور ان کے اوپر منقش چادریں اور تکیے پڑے ہوئے تھے۔ البتہ ہمارے علاقے کی بیٹھک کے برعکس گلی کی سمت اس کا کوئی دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اندازے سے چل کر ایک چار پائی پر نیم دراز ہو کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔ اندرونی کمروں کا رخ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ لامحالہ سونے والوں نے دروازے اندر سے بند کر رکھے ہوں گے اور رات گئے وہ بغیر تصدیق کے کبھی بھی دروازہ نہ کھولتے الٹا شک پڑنے پر وہ شور مچا کر محلے والوں کو متوجہ کر دیتے یا ٹیلی فون کی سہولت میسر ہونے کی صورت میں پولیس کو بھی مطلع کر دیتے۔

کھانا کھائے مجھے کافی دیر ہوگئی تھی اور بھوک کافی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، لیکن میں نے کچن کا رخ کرنے کی بجائے اسے صبح پر اٹھا رکھا، چند گھنٹے بھوک برداشت کرنا چنداں دشوار نہیں تھا کہ ہم پاکستانی گوریلے اپنی ٹریننگ کی بدولت کئی کئی دن بھوکے پیاسے گزار سکتے ہیں۔

صبح ہونے تک میری سوچوں کا دھارا مختلف سمتوں میں بہتا رہا۔کبھی گھر کی یاد اور کبھی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے۔لڑائی جھگڑا اور مار کٹائی کبھی بھی مجھے محبوب نہیں رہے،گنڈہ پور ہونے کے باوجود مجھے خونخواری پسند نہیں تھی اور حتی الوسع میں قتل و غارت سے پرہیز کرتا تھا،لیکن انڈیا آمد کے بعد حالات نے میری امن پسندی کی خو بدل دی تھی، یہاں تک کہ کئی آدمی میرے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔بلاشبہ وہ کافر تھے اور ان کو قتل کرنے کا محرک بھی حالات تھے،لیکن پھر بھی کسی کے خون سے ہاتھ رنگنے کا احساس میرے اندر جاگزین رہا۔یوں بھی قتل و غارت کا جو سلسلہ شروع ہو چکا تھا اس کے رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔اگر میں خیریت کے ساتھ پاکستان پہنچ جاتا تو وہاں بھی حالات کوئی بہتر نہیں لگ رہے تھے۔

صبح کی اذانوں اور مختلف گھروں سے اٹھتی ہوئی بھجن کی آوازوں کے ساتھ مجھے اندرونی کمروں کی جانب کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر جھری سے جھانکا تو ایک نورانی چہرے والا شخص باتھ روم کے دروازے سے نکلتا دکھائی دیا۔دونوں آستینیں اس نے کہنیوں تک اڑسی ہوئی تھیں جن سے پانی ٹپک رہا تھا جو لامحالہ وضو کا پانی تھا میرا دل عجیب طرح کی خوشی سے بھر گیا۔

''اس کا مطلب ہے انجانے میں مَیں نے کسی مسلم گھرانے میں پناہ لے لی ہے۔'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔بزرگ صورت شخص باتھ روم سے نکل کر بغلی کمرے میں گھس گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد سر پر سفید ٹوپی رکھے وہ بیرونی دروازے کی طرف آتا دکھائی دیا۔

میں آہستہ سے پیچھے ہٹا اور پھر چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ابھی مجھے بابا کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔اس کی غیر موجودی میں گھر کے اندر گھسنا مجھے نامناسب لگ رہا تھا۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد مجھے بیرونی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی جھری سے جھانکا تو وہ بابا ہی تھا۔ہاتھ میں تسبیح پکڑے وہ آہستہ روی سے چلتا ہوا برآمدے کی سمت بڑھتا دکھائی دیا۔

''باباجی بات سنیں۔'' میں آہستہ سے بولا۔وہ ٹھٹک کر رک گیا اور حیرانی سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

''میں ادھر ہوں بزرگو۔'' میں نے دروازہ ہلکے سے بجا کر کہا۔اس دفعہ اس نے مجھے دیکھ لیا اور چہرے پر حیرانی کے تاثرات سجائے وہ کمرے کی جانب بڑھ آیا۔اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے دروازہ کھول کر لائٹ جلائی جس سے کمرے میں چھایا ملگجا اندھیرا روشنی میں بدل گیا۔

''السلام علیکم۔'' اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مَیں نے سلام کرنے میں پہل کی۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ و برکاۃ۔'' وہ خشوع وخضوع سے بولا۔''بیٹھیں آپ غالباً اقبال میاں کے مہمان ہیں۔''

''نہیں بزرگوار!'' میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔''میں زبردستی کا مہمان ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''مطلب یہ کہ گزشتہ شب اپنی جان بچانے کے لیے میں آپ کے گھر گھسا تھا۔''

''کس سے......؟ پولیس سے یا......؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''پولیس سے بھی اور مجرموں سے بھی۔'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''برخوردار یہ گھر مجرموں کو پناہ دینے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔'' وہ متانت سے بولا۔''البتہ آپ کے مسلمان ہونے کے ناطے میں اتنا کرسکتا ہوں کہ آپ کو ناشتا کرا کر یہاں سے رخصت کردوں اور پولیس کو بھی اطلاع نہ دوں۔''

''اس کے ساتھ اگر آپ مجھ پر ایک اور مہربانی کریں کہ میری کہانی سن لیں تو کیسا رہے گا؟''

''کہانی۔'' اس نے بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی دستی گھڑی پر ٹائم دیکھا اور پھر ایک لحظہ سوچ کر بولا۔''چلو سنا دو۔''

''میرا تعلق پاکستان آرمی سے ہے۔'' اس کی طرف سے اجازت پا کر میں نے اپنی آپ بیتی شروع کی اور پاکستان کا لفظ سنتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اپنے گاؤں کے واقعات سے شروع کر کے شمالی علاقہ جات، خط کا ملنا، بھگوڑا ہونا پھر گرفتاری اور فرار تک کی تمام کہانی اس کے گوش گزار کردی۔ اس دوران وہ خاموشی سے بیٹھ کر میری طرف متوجہ رہا۔

''تمھارا نام عمر جان ہے؟'' میرے خاموش ہوتے ہی وہ مستفسر ہوا۔

''جی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔''آپ نے غالباً......''

''ہاں آپ صحیح سمجھے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''پچھلے چند دن سے اخبارات میں آپ کے متعلق بڑی گرم خبریں شائع ہورہی ہیں۔''

''بس یہ تو ذرہ نوازی ہے انڈیا والوں کی کہ مجھے تخریب کار۔ دہشت گرد اور پتا نہیں کیا کیا بنا دیا۔''

''اب تمھارا کیا ارادہ ہے۔'' اس کے لہجے میں اپنائیت در آئی۔''اور میں تمھاری کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''آپ میری کیا خدمت کرسکتے ہیں؟'' میں بھی بغیر تکلف کے بولا۔

''بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے مجرم سمجھ کے میں تمھیں یہاں سے جانے کے بارے کہہ چکا ہوں اور اس بات پر میں شرمندہ بھی نہیں ہوں کیونکہ یہ گھر واقعی مجرموں کو پناہ دینے سے قاصر ہے البتہ تمھاری بیگناہی اس بات کی متقاضی ہے کہ میں حتی الوسع تیری کی مدد کروں اور جہاں تک تعلق ہے تمھارے کام آنے کا تو تمھیں جتنے پیسے چاہیے ہوں وہ مجھ سے لے سکتے ہو۔ یا پناہ چاہیے ہو تو میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمھارے لیے کھلے ہیں جتنا عرصہ چاہے یہاں آرام سے رہو۔ اس کے علاوہ اگر تم یہ کہو کہ میں تمھیں سرحد پار کرادوں تو معاف کرنا بیٹا

یہ میرے بس سے باہر ہے۔''

''مہربانی چچا جان۔ مجھے بس آج کا دن ہی یہاں پر گزارنا ہے شام تک شاید میں یہاں سے نکل جاؤں آپ نے اتنا کرنا ہے کہ دہلی سے بمبئی جانے والے کسی ایسے راستے کی طرف میری رہنمائی کر دینا جس پر میرے لیے خطرہ کم ہو۔''

''اس بارے بھی میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔'' مجھے دہلی سے بمبئی جانے والے کسی بھی ایسے راستے کے متعلق معلومات نہیں ہیں جس پر سفر کر کے آپ کی پولیس سے مڈ بھیڑ نہ ہو۔''

''اچھا...... پھر ناشتا ہی کرا دیں۔'' میں مسکراتا ہوا بولا۔

''نہیں۔'' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔'' پہلے آپ اٹھیں گرم پانی سے غسل کریں۔ کپڑے بدلی کریں اس کے بعد ناشتا ملے گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی چچا جان۔'' میں فوراً اس سے متفق ہو گیا کہ میرا اپنا جی نہانے کو کر رہا تھا۔

''چلو۔'' وہ اٹھتا ہوا بولا اور میں بھی بے ساختہ اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ گھر کے صحن میں ہلکی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے میں ایک درمیانے قد کا جوان کھڑا تھا جس کا تعارف اس بزرگ نے اقبال کے نام سے کرایا۔ ان کا اپنا نام عبدالمنان تھا اس کی بیوی عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی جبکہ اولاد میں ایک اقبال اور ایک اس سے چھوٹی بہن رقیہ شامل تھے اور دونوں شادی شدہ تھے اقبال خود ایک چھوٹے سے بچے بلال کا باپ تھا۔ اس کی بیوی ماریہ ایک قبول صورت گھریلو خاتون تھی۔ وہ خود ایک دفتر میں کلرک تھا جبکہ عبدالمنان کا اپنا ایک جنرل سٹور بھی تھا ان کی گزر اوقات بہت اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔

نیم گرم پانی سے نہا کر میری سستی اور کسلمندی دور ہو گئی۔ لباس کے نام پر میرے حوالے ایک چادر اور قمیص کی گئی کہ اقبال اور عبدالمنان دونوں کی شلواریں میرے ناپ سے چھوٹی تھیں۔ قمیص کا البتہ کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ وہ لباس زیب تن کر کے میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میرے باتھ روم سے باہر آتے ہی ماریہ (اقبال کی بیوی) باتھ روم میں گھس کر میرے کپڑے دھلائی کرنے لگ گئی وہ دونوں باپ بیٹا ناشتے پر بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ناشتے میں سبزی کے پراٹھے، آملیٹ، دودھ، دہی وغیرہ شامل تھے۔ نہانے سے میری بھوک مزید چمک اٹھی تھی اور میں نے ناشتے کے ساتھ خوب انصاف کیا۔

''اچھا عمر بھائی میں تو دفتر چلا۔'' ناشتے پر چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے اقبال بولا۔'' واپسی پر انشاءاللہ آپ سے گپ شپ ہو گی۔''

''ضرور۔'' میں اس سے ہاتھ ملاتا ہوا بولا اور اگر ہو سکے تو واپسی پر دو تین اخبار لیتے آنا۔''

''اخبار تو ابھی لے لو۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔'' اس گھر میں باقاعدگی سے اخبار بنی ہوتی ہے ابو جان تو اخبار پڑھے بغیر سٹور نہیں کھولتے، یہ تو آج آپ کی آمد نے انھیں اس شغل سے باز رکھا۔'' اس کے بعد وہ کمرے سے دو تازہ اخبار نکال لایا جو لازماً اخبار فروش صبح

صبح ان کے گھر پھینک گیا تھا۔

اقبال تو اخبار دے کر دفتر چلا گیا اور ہم دونوں اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ مجھے صرف اپنے بارے چھپی ہوئی خبر پڑھنے سے دلچسپی تھی اور اس کے لیے مجھے اخبار کھنگالنے کی ضرورت نہیں پڑی فرنٹ پیج پر ہی میری دو تصاویر جگمگا رہی تھیں۔ جن میں ایک تصویر داڑھی والی اور دوسری بغیر داڑھی کے تھی۔ نیچے پرانے جھوٹ سچ کے ساتھ نئی تفصیلات بھی دی ہوئی تھیں۔ دہلی میرٹ روڈ پر میرے ہاتھ سے قتل ہونے والے اٹھائی گیر کے علاوہ بھی دہلی میں ہونے والے چند قتل میرے نام سے منسوب کیے گئے تھے۔ روڈ والے قتل کا سہرا میرے سر اس لیے بندھا تھا کہ اس کے ساتھی کو میں بیہوش چھوڑ آیا تھا جو بعد میں پولیس کے ہاتھ چڑھ گیا تھا جس سے میرا دہلی میں وارد ہونا راز نہ رہ سکا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور بلا نامی شخص بھی پولیس کی گرفت سے بچ نہ سکے تھے۔ ان کی گرفتاری کا سارا کریڈٹ ایک مسلمان انسپکٹر کو جاتا تھا جس نے جان پر کھیل کر ان دونوں کو گرفتار کیا تھا۔ ان دونوں نے بھی اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے سارا الزام میرے سر دھرا تھا کہ کس طرح میں نے ان سے ٹیکسی چھیننے کی کوشش کی تھی جو پولیس کی مداخلت سے ناکام ہو گئی تھی۔ ان کے اس بیان پر پولیس نے بھی اپنی ازلی بے حسی کا ثبوت دیا تھا ورنہ ان سے صرف اتنا ہی پوچھ لیا جاتا کہ اگر وہ بے قصور تھے تو پولیس کو دیکھ کر بھاگے کیوں تھے۔
بہر حال میں نے زیادہ دیر اس بات پر سر نہ کھپایا اور عبدالمنان سے دوسرا اخبار لے کر پڑھنے لگا۔ اس میں بھی کم و بیش پہلے اخبار والی قصہ کہانی دہرائی گئی تھی البتہ عبدالمنان کے محلے میں میری روپوشی کو بنیاد بنا کر لکھا تھا کہ میں ابھی تک اسی محلے میں ہو سکتا ہوں اور پولیس کو سارے محلے کا گھیراؤ کر کے گھر گھر کی تلاشی لینے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

یہ خبر عبدالمنان بھی پڑھ چکا تھا لیکن اس نے اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے گریز کیا تھا۔

''چچا جان اگر اجازت ہو تو میں تھوڑی دیر آرام کر لوں۔'' اخبار سے فارغ ہوتے ہی میں عبدالمنان سے مخاطب ہوا۔

''ہاں ہاں بیٹا۔ کیوں نہیں۔'' وہ پُر خلوص لہجے میں بولا۔ ''ماریہ بیٹی نے تمھارے لیے بیٹھک میں بستر لگا دیا ہے۔''

اور میں بیٹھک میں آ کر سو گیا۔ ساری رات کی تھکن اور پھر پیٹ بھرنے کے بعد نیند کی مہربان دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لیے دیر نہ لگائی۔ میں کافی دیر سوتا رہا دن کا کھانا بھی اس نیند کی نذر ہو گیا۔ سہ پہر کو دفتر سے واپس آ کر اقبال نے مجھے اٹھایا۔ اس وقت تک میری نیند پوری ہو چکی تھی اور میں اپنے آپ کو نہایت چاق چوبند تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

''عمر بھائی آپ تو گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں اور شہر میں سارے محکمے آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔''

''یہ کوئی آج کی بات تو نہیں ہے۔'' میں انگڑائی لے کر اٹھتا ہوا بولا۔ ''جب سے میرے قدم یہاں پر پڑے ہیں۔ یہاں کے لوگ میری محبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

''واقعی تمھاری بات صحیح ہے۔'' اقبال ہنس کر بولا۔ ''بہر حال اٹھو غسل کر لو اس کے بعد چائے پئیں گے، کھانے کا ٹائم تو یوں بھی گزر گیا ہے۔''

اور میں سر ہلاتا ہوا باتھ روم کی سمت بڑھ گیا۔ میرا اپنا لباس استری شدہ باتھ روم میں لٹکا ہوا تھا۔ نہا کر میں نے اپنے کپڑے پہنے اور باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ دونوں باپ بیٹا چائے کے برتن سجائے میرا انتظار میں بیٹھے تھے۔ چائے خاموشی سے پی گئی اس کے بعد عبدالمنان بولا۔

''عمر بیٹے اب تمھارا کیا ارادہ ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ چند ہفتے ہمارے گھر ہی روپوش رہو جیسے ہی تمھاری تلاش کی سرگرمیاں کچھ مدہم پڑیں تب یہاں سے چلے جانا۔ فی الحال تمھارا باہر نکلنا بہت بڑے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔''

''میں آپ سے متفق ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جب تک مجھے گھر کی طرف سے اطمینان حاصل نہیں ہو جاتا مجھے چین نہیں آسکتا۔''

''یہ نہ ہو کہ اس تیزی کی بدولت خدانخواستہ ہمیشہ کے لیے گھر پہنچنے سے ہی رہ جاؤ۔'' عبدالمنان نے کہا۔''اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ زیادہ نہیں تو کم از کم ایک ہفتہ باہر نکلنے سے گریز کرو۔''

''آپ کی مہربانی چچا جان، لیکن یہ ناممکن ہے۔''

''چلو جیسے تمھاری مرضی۔'' وہ بادل نخواستہ راضی ہوتا ہوا بولا۔

''عمر بھائی ہمیں اپنے شہر اور پاکستان کے بارے کچھ بتاؤ نا؟'' اقبال نے موضوع بدلا۔ اور میں انھیں اپنے پیارے ملک اور شہر کے بارے تفصیل سے بتانے لگ گیا۔ ہم اسی گفتگو میں محو تھے کہ مسجد سے مغرب کی اذانیں بلند ہوئیں وہ دونوں باپ بیٹا تو مسجد کی سمت روانہ ہو گئے اور میں وضو کر کے گھر میں ہی نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

ان کی مسجد سے واپسی پر ہم تینوں نے اکٹھے بیٹھ کر پُر تکلف کھانا تناول کیا۔ اقبال کی بیوی نے البتہ ہمارے ساتھ بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور ہمارے آگے کھانا چننے کے بعد وہ اپنے بچے کو لے کر کچن میں گھس گئی تھی۔

کھانے کے بعد ایک مرتبہ پھر چائے کا دور چلا اور پھر وہ دونوں باپ بیٹا روٹین کے مطابق عشاء کی نماز کے لیے روانہ ہو گئے۔

ان کی واپسی کے بعد میں وہاں سے کوچ کرنے کے تیار ہو گیا تھا۔

''بیٹا کم از کم آج کی رات تو ہمیں میزبانی کا موقع دے دیتے۔'' عبدالمنان پُر خلوص لہجے میں بولا۔

''چچا بخدا میرا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے ورنہ میں کبھی بھی آپ کی بات نہ ٹھکراتا۔''

''اچھا یہ رکھ لو راستے میں کام آئیں گے۔'' وہ نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میرے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

''رقم میرے پاس کافی ہے البتہ آپ کی نشانی کے طور پر میں یہ رکھ لیتا ہوں۔'' میں نوٹوں کی گڈی میں سے ہلکی مالیت کا ایک نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔''باقی آپ رکھیں مجھے ضرورت ہوتے تو میں آپ سے مانگتے ہوئی قطعاً نہ شرماتا۔''

اقبال نے پوچھا۔''اس کے علاوہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو......؟''

''بہت بہت مہربانی اقبال بھائی۔'' میں گھڑی پر نگاہ ڈال کر کھڑا ہوگیا۔''اب میں اجازت چاہوں گا۔'' رات کے دس بجنے والے تھے جب میں ان سے رخصت ہو کر گلی میں نکلا راستے کے لیے کوئی حتمی لائحہ عمل میں طے نہیں کر سکا تھا لیکن ایک جگہ پر ٹک کر بیٹھے رہنے سے مسلسل حرکت میں رہنا ہی میرے لیے مناسب تھا۔

عبدالمنان کے گھر سے میں تھوڑا آگے ہی آیا ہوں گا کہ سامنے سے آتا ہوا ایک نوجوان مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بھائی صاحب ماچس ہوگی؟''

''نہیں!'' میں مختصراً بولا۔

''اڑے اجیت! یہ تُو ہے بے۔'' مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر اچانک ہی وہ جھپٹا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا اس نے میرے چہرے سے مفلر کھینچ لیا۔

''اوشما چاہتا ہوں مہاراج۔'' سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی وہ جلدی سے ہندوؤں کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھتا ہوا بولا۔''میں نے سمجھا کہ اپن کا بیلی اجیت ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں مفلر دوبارہ اپنے چہرے کے گرد لپیٹ کر بولا اور وہاں سے جانے کے لیے آہستہ سے مڑا اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر یکدم پلٹا تو میرے اندازے کے مطابق وہ نوجوان میرے مڑتے ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہتھیار نکال رہا تھا جیسے ہی میں پلٹا وہ ہتھیار میری سمت سیدھا کرنے ہی والا تھا۔ وہ میری کک کی رینج میں تھا میں اپنے دائیں پاؤں پر گھوما اور بائیں پاؤں کی ایڑی کی ضرب اس کے داہنے ہاتھ پر پڑی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔

''عمر جان...... تیرا کھیل ختم ہو چکا ہے اور تم چاروں طرف گھیرے میں ہو۔'' اس بار وہ موالیوں والا لہجہ اختیار کرنے کی بجائے انگلش میں بولا۔

''کھیل ختم نہیں بلکہ ابھی شروع ہوا ہے مسٹر۔'' میں سرد لہجے میں بولا اس کے ساتھ ہی میرا بایاں مکہ بجلی کی سی سرعت سے اس کے چہرے پر پڑا اور وہ اچھل کر نیچے جا پڑا اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے سر میں لگی جس سے اس کا سر ایک دھما کے کے ساتھ گلی کے پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میں چند قدم دور گرے ہوئے پستول کو اٹھانے کے لیے جیسے ہی جھکا فضا میں فائر کی آواز گونجی اور شوں کی آواز کے ساتھ گولی میرے اوپر سے گزر گئی ہے۔ میں نے تو آنے والے حالات سے نمٹنے کے لیے پستول اٹھانا چاہا تھا کہ میرے پاس موجود کو برے والے پستول میں راؤنڈ کم تھے لیکن اس جھکنے نے میری جان بچا دی۔ پستول ہاتھ میں پکڑتے ہی میں بجائے سیدھا کھڑا ہونے کے اسی جگہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ سامنے سے دو افراد دوڑتے ہوئے میری سمت بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ نیچے لیٹتے ہی میرے ہاتھ میں موجود پستول نے دو شعلے اگلے اور وہ دونوں نیچے گر گئے۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور دو فائر مزید ان پر جھونک دیئے۔ تیس پینتیس گز دور سے فائر کے خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فائر کرتے ہی میں رکا نہیں بلکہ ان کے تڑپتے

اجسام کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ گلی کے سرے سے دو آدمی آتے دکھائی دیئے میں ان پر گولی ضائع کیے بغیر اپنے بائیں ہاتھ موجود موڑ مڑ گیا۔ بیس پچیس گز آگے جا کر وہ گلی دائیں طرف مڑ گئی۔ میں جیسے ہی موڑ مڑا مجھے سامنے سے ایک اور بندہ تقریباً دوڑتا ہوا اپنی سمت بڑھتا نظر آیا میں نے بجائے گولی چلانے کے دوڑتے دوڑتے ہی اس پر چھلانگ لگا دی اور اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ میں موجود ہتھیار سیدھا کرتا اس پر جا پڑا۔ میرے سر کی ضرب نے اس کی دو تین پسلیاں تو ضرور توڑ دی تھیں اس کے منہ سے ایک بلند کراہ خارج ہوئی اور وہ مرغ بسمل کی طرح پھڑ کنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پستول دور جا پڑا تھا۔ میں نے صرف ایک لحظہ کے لیے رک کر اس کے پستول سے میگزین نکالی اور ایک مرتبہ پھر دوڑ پڑا۔

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ تمام گلیوں میں خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار پھیل چکے تھے۔ کسی گھر میں گھسنا بھی میرے لیے مفید نہیں تھا کہ وہ علاقے کو گھیرے میں لے کر گھر گھر تلاشی شروع کر دیتے۔ مجھے عبدالمنان کی بات نہ ماننے پر افسوس ہوا۔ مجھے ان کی بات مان کر زیادہ نہیں تو دو تین دن ضرور انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تمام گلیوں میں انھوں نے ایک دو، دو بندے چھوڑے ہوئے تھے۔ میری سب سے بڑی پرابلم علاقے سے ناواقفیت تھی۔ وہ گلیاں مجھے کسی طلسمی عمارت کی بھول بھلیاں لگ رہی تھیں۔ اس وقت رک کر کوئی لائحہ عمل ترتیب دینا ناممکن تھا۔ مجھے دوڑتے بھاگتے ہی اس جال سے نکلنے کی سعی کرنی تھی۔

تھوڑی دور جا کر ایک گلی دائیں ہاتھ نکلتی دکھائی دی، لیکن میرے اس گلی میں گھسنے سے پہلے مجھے گلی کے مخالف سرے سے دو سائے داخل ہوتے دکھائی دیئے اور میں اپنا ارادہ بدل کر ایک مرتبہ پھر اس گلی میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ گلی کافی طویل تھی اور اس سے دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی گلیاں نکل رہی تھیں۔ چھوٹی گلی کے سرے پر نظر آنے والے سائے کسی بھی لمحے اس گلی میں طلوع ہو سکتے تھے اور پشت کی طرف سے مجھے نشانہ بنانا ان کے لیے دشوار نہ ہوتا۔ اس لیے میں اپنے بائیں ہاتھ پر آنے والی پہلی گلی میں مڑ گیا۔ وہ ایک تنگ سی گلی تھی جو تھوڑی دور جا کر ہی ایک مین سٹریٹ میں نکلی۔ میں جیسے ہی مین سٹریٹ میں نکلا اسی وقت ایک کوٹھی کے دروازے سے سفید رنگ کی شیورلیٹ نکلی اس کا رخ میری جانب ہی تھا اس کے سپیڈ پکڑنے سے پہلے میں اس کے قریب پہنچ گیا اور اگلے لمحے ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر میں ڈرائیور کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ گاڑی چلانے والی کی طرف تھا۔ ان مخدوش حالات میں بھی میں بمشکل اس حسین جلوے کی تاب لا سکا اس کی موٹی موٹی آنکھیں جو حیرانی سے اور زیادہ پھیل گئی تھیں میں ان کی گہرائیوں میں جیسے ڈوب سا گیا تھا۔

''کک......کون ہیں آپ۔'' اس نے ہکلاتی زبان سے پھول بکھیرے اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔

''سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں اپنے آپ کو بمشکل سنبھال پایا۔ ''بس اسی طرح چلتی جاؤ''

''مم......مگر۔''

''شٹ اپ۔'' میں اس کی بات سنے بغیر دھاڑا۔ ''جتنا کہا ہے اتنا کرو...... ورنہ۔'' میں نے خوفناک شکل والا پستول اس کی

آنکھوں کے سامنے لہرایا اور اس نے گھبرا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک مجھے کوئی دشمن بھی اس گلی میں نظر نہیں آیا تھا۔ گاڑی جیسے ہی تھوڑا سا آگے بڑھی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسی وقت چھوٹی گلی سے دو افراد اپنے ہاتھوں میں پستول لہراتے برآمد ہوئے لیکن انھوں نے گاڑی پر توجہ دینے کی بجائے دائیں بائیں نگاہیں دوڑانی شروع کر دیں اور پھر گاڑی کی مخالف سمت دوڑتے چلے گئے۔ اس وقت مجھے اپنے پیچھے ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائیٹیں بھی نظر آئیں۔

''یہ اچھا ہوا۔'' میں آہستہ سے بڑبڑایا۔

''کیا؟'' وہ جو میری طرف ہمہ تن گوش تھی مستفسر ہوئی۔

''کچھ نہیں تم ڈرائیونگ پر توجہ دو۔'' میں نے جان بوجھ کر اسے جھڑکا اور اس نے ہونٹ بھینچ کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی یہ شاید اپنے اندرونی ابال پر قابو پانے کی اضطراری کوشش تھی۔

''گڈ۔'' میں مسکرا کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ اچھی خاصی ڈرائیونگ کر لیتی ہیں؟'' لیکن اس نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''گاڑی کی اندرونی لائٹ بجھا دو۔'' سامنے سے آتے دو مشکوک بندوں کو دیکھ کر میں نے کہا اور اس نے اس مرتبہ بھی میری بات کا جواب دیے بغیر لائٹ بجھا دی۔ اب باہر سے میرا دیکھا جانا مشکل تھا۔ اس گلی میں مجھے ایک دو اور گاڑیاں بھی حرکت کرتی دکھائی دیں اور یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ جلد ہی ہم اس گلی سے نکل کر روڈ پر آ گئے۔ مین روڈ پر ہم تھوڑا آگے ہی بڑھے ہوں گے کہ پولیس کی دو تین گاڑیاں سائرن بجاتیں ہمارے پاس سے گزر گئیں۔

''مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ شور مچانے کا مطلب تیری موت ہی ہے اس کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہو گا اس سے میں نمٹ لوں گا۔'' پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے تھے ان کی وجہ سے میں نے اسے متنبہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس نے میری بات سن کر حسب سابق بولنے سے گریز کیا تھا۔

روڈ پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہماری کار درمیانی رفتار سے چلتی وہاں سے دور ہٹتی گئی۔ میں ایک بہت بڑے حملے سے بچ نکلا تھا۔ دشمن نے بڑی چالاکی اور عیاری سے مجھے گھیرا تھا۔ مجھے اپنی بیوقوفی پر بہت غصہ آیا۔ گزشتہ شب پولیس والوں کے آگے بڑھ جانے کے بعد مجھے عبدالمنان کے گھر سے نکل کر وہ محلہ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ خفیہ ایجنسیاں اپنی پوری قوت کے ساتھ میرے خلاف سرگرم عمل تھیں کسی بھی قسم کا رسک میرے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ میری سب سے بڑی مشکلات میں ایک تو علاقے سے ناواقفیت تھی اور دوسرے دشمن میرے حلیے سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایسی صورت میں مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی اور دشمن کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر چلنے میں میری عافیت تھی۔ میں اندھی کھائی کے کنارے چل رہا تھا ایک غلط قدم مجھے اوندھے منہ کھائی کے اندر گرانے کے لیے کافی تھا۔ میں نے دل ہی دل اپنے آپ کو اس غلطی پر سرزنش کی اور دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنے کا عہد کیا، لیکن یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ دشمن میری کسی

غلطی سے ہی مجھ پر قابو پاتے۔ ہوسکتا تھا کہ میں اپنی طرف سے ہر قسم کی احتیاط برتتا لیکن دشمن اپنی چالاکی اور عیاری کی بدولت مجھ پر قابو پالیتا۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں تھیں اس وقت مجھے موجودہ صورتِ حال سے بننٹے کی ضرورت تھی۔ ابھی تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ کارکارخ کدھر تھا۔ اس لڑکی سے پوچھنا بھی نامناسب تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو علاقے سے میری ناواقفیت کے بارے معلوم ہو۔

''اگر آپ میرے پتاجی سے تاوان وصول کرنے کے لیے مجھے اغوا کر رہے ہیں تو آپ کو مایوسی ہوگی ان کی اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود انھیں مجھ سے زیادہ دولت عزیز ہے۔'' وہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد اچانک بولی۔

''میں ایسے بندوں سے پیسے نکلوانا جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی غلط فہمی برقرار رکھی۔

''آ......اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو ڈیڑھ دولاکھ تک کی رقم میں اپنے اکاؤنٹ سے ادا کرسکتی ہوں'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاہاہا......'' میں نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔ ''ڈیڑھ دولاکھ کے لیے تمھیں کون چھوڑ سکتا ہے۔'' اور وہ میری ذومعنی بات سن کر جھینپ سی گئی۔

''اسے اگر آپ اپنی جیب میں رکھ لیں۔'' اس نے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''ضرورت پڑنے پر بھی تو آپ نکال سکتے ہیں۔ یہ نا ہو غلطی سے گولی چل جائے اور......''

''جیب میں ایک اور بھی موجود ہے۔'' میں نے خوفناک شکل والا بریٹا اسے نکال کر دکھایا۔ ''لیکن تمھیں ڈر لگ رہا ہے تو میں جیب میں رکھ لیتا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا اسے جیب سے باہر نکالنے میں کوئی ٹائم نہیں لگتا۔''

پستول کوٹ کی جیب میں رکھ کر سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کو مسلسل دیکھنے سے الٹے سیدھے خیالات میرے ذہن میں پرورش پانے لگ گئے تھے۔ وہ خطرناک حد تک حسین تھی۔ مجھے سیدھا ہوئے ایک دومنٹ ہی گزرا تھا کہ اچانک اس نے زور سے بریک لگائی اور میں جھٹکے سے آگے بڑھا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود میں اپنا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرانے سے نہ بچا سکا۔ میں ابھی تک پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ میری گردن پر ایک سخت ضرب لگی میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں۔ ''اس کا مطلب ہے یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔'' میرے دماغ سے سوچ ابھری۔ گردن پر لگائی گئی چوٹ سے شاید میں سنبھل نہ پاتا لیکن گردن میں لپیٹے ہوئے مفلر نے مجھے بیہوش ہونے سے بچالیا تھا۔ اس کے نرم ونازک دکھائی دینے والے ہاتھوں میں بلا کی سختی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسری ضرب لگا پاتی میں جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اس کی لگائی ہوئی دوسری ضرب سے بال بال بچ گیا اس کی ہتھیلی کی چاپ میری ران پر لگی اور اگلے ہی لمحے اس کا داہنا ہاتھ میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اپنے بائیں ہاتھ سے میرے چہرے پر حملہ آور ہوئی اب اس کے حملے کامیاب ہونے کا مطلب میری نااہلی ہوتی۔ اس کے دوسرے ہاتھ کو بھی اپنی گرفت میں لے کر میں نے زور سے دبایا تو اس کے منہ سے کراہ سی نکلی اس کے ساتھ ہی وہ چلائی۔

''چھوڑو مجھے جنگلی......سؤر......'' اس کے منہ سے مغلظات کا لاوا ابل پڑا۔ اتنے خوب صورت ہونٹوں سے اتنے کریہہ الفاظ

سننے کی توقع مجھے نہیں تھی۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ کر بائیں ہاتھ کا ایک بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا اور وہ اپنی سیٹ پر ہی غش کھا کر گر پڑی۔اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان کو یکدم بریک لگ گئی تھی۔

”اگر میں اتنا ہی موم کا پتلا ہوتا تو ایسے کاموں میں ہاتھ نہ ڈالتا۔“ میں غصیلے لہجے میں بولا ”اور اب آرام سے گاڑی چلانا۔اس کے بعد غلطی کی گنجائش بالکل نہیں ہوگی۔تیری گردن توڑنے کے لیے مجھے پستول کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

میرا تھپڑ کھا کر اس کا سرخ و سفید چہرہ لازماً سرخ ہو گیا ہوگا،لیکن سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں مَیں اس کے چہرے کو اتنی باریکی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔وہ لرزتی ہوئی اٹھی اور سٹیئرنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔مجھے اپنے رویے پر ندامت محسوس ہوئی۔میں اس وقت ایک غنڈے اور غلط شخص کے روپ میں تھا اور ایسے بندے سے جان چھڑانے میں وہ حق بجانب تھی مجھے شروع سے ہی اسے حقیقت بتلا دینی چاہیے تھی۔

”سوری......آئی ایم ویری سوری۔“ میں شرمندہ لہجے میں بولا۔”میں کوئی غلط بندہ نہیں ہوں اور نہ ہی میں تجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہوں۔میں تو خود دشمنوں سے بچتا پھر رہا ہوں اور تیری کار میں بھی میں اپنے مخالفین سے چھپنے کے لیے گھسا تھا۔میری غلطی کہ میں نے تیرے ساتھ ڈرامابازی شروع کر دی۔پلیز اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو اور مجھے مزید شرمندہ نہ کرو۔“

میری بات ختم ہوتے ہی اس نے اپنا سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔”تم جھوٹ بول رہے۔“ وہ تو شکر تھا کہ گاڑی کی اندرونی لائٹ بند تھی ورنہ میں کبھی بھی ان آنسوؤں سے دھلی آنکھوں کی تاب نہ لا سکتا۔

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں،کسی بھی محفوظ مقام پر پہنچتے ہی میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“

”کھاؤ بھگوان کی قسم۔“

”بھگوان کی قسم تو نہیں البتہ اپنے رب کی قسم کھا سکتا ہوں۔“

”تم مسلمان ہو؟“

”الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔“ میرا لہجہ فخریہ تھا۔”اور مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“

”کہاں جاؤ گے؟“ اس مرتبہ اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”دہلی سے قریب ترین شہر کون سا ہے۔“

”آپ کسی سمت کا پوچھ رہے ہیں۔دہلی سے تو آگرہ بھی قریب ہے جے پور بھی ہے اسی طرح میرٹ بھی تقریباً اتنے فاصلے پر ہے۔“

”آپ مجھے کس شہر تک پہنچا سکتی ہیں۔“ میں دانستہ اس کے آگے بمبئی کی سمت کا تذکرہ نہیں کر رہا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ

کسی کو بھی میرے سفر کی سمت معلوم ہو جائے۔

''کسی شہر تک بھی نہیں...... پتا جی میری گمشدگی سے سخت پریشان ہوں گے۔ کیونکہ کئی دشمن میری تاک میں ہیں۔''

''گمشدگی!''میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔''ابھی گھر سے نکلے تجھے گھنٹا بھی نہیں گزرا اور تمھارے پتا جی تمھاری گمشدگی سے واقف ہو گئے۔''

''میں نے اپنی کوٹھی سے نکل کر سو دو سو گز دور اپنی ایک سہیلی کے گھر جانا تھا اور وہاں پہنچتے ہی میں پتا جی کو خیریت سے آگاہ کر دیتی۔ اب لازماً پتا جی میری سہیلی سے میری آمد کی بابت دریافت کر چکے ہوں گے اور جواب منفی میں پا کر متفکر ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے تیرے ابو کافی امیر ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''تو پھر وہ تیرے ساتھ باڈی گارڈ کیوں نہیں رکھتا۔''

''باڈی گارڈ میرے ساتھ ایک چھوڑ دو دو ہوتے ہیں۔ آج بس میری بدقسمتی کہ میں انھیں ساتھ نہ لے سکی۔''

''ایک بات پوچھوں مائنڈ تو نہیں کرو گی؟''

''پوچھو۔''

''آپ کے دشمن کون ہیں؟''

''دشمن میرے نہیں پتا جی کے ہیں۔''

''دشمنی کی وجہ؟''میں مستفسر ہوا۔

''کچھ کاروباری رقابت اور کچھ مزدور برادری اپنے مطالبے پورے نہ ہونے پر دشمنی پر کمربستہ ہے۔''

''مزدور برادری؟''

''ہاں پتا جی دو فیکٹریوں کے مالک ہیں۔ ان فیکٹریوں میں آئے دن جھگڑے اور ہڑتالیں چلتی رہتی ہیں۔ وہی مالک اور مزدور کی ازلی چپقلش۔''

''لیکن مالک اور مزدور کی چپقلش میں مالک کی اولاد کو کیا خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔''

''اس کے پس منظر میں بھی ایک کہانی ہے۔''

''کیا؟''

اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''پتا جی کی انتظامیہ کے ہاتھوں دو تین مزدوروں کا قتل ہو گیا تھا۔ ان کا خون بہا ادا کرنے سے پتا جی انکاری ہو گئے کہ یہ شرپسند تھے ان کے ساتھ یہی ہونا چاہئے تھا۔ بس یہ چھوٹی سی غلطی بہت بڑی دشمنی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔''

''اسے آپ چھوٹی سی غلطی کہتی ہیں۔''میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

''بھئی لڑائی جھگڑے میں تو یہ ہوتا ہے نا؟ جب دنگا فساد ہوگا تو ہلاکتیں بھی ہوں گی۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا ہے۔ کسی کی کرنی کا پھل فیکٹری کا مالک کیوں بھگتتا رہے۔''

ہم اس وقت ایک معروف ہوٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے جس کے باہر رنگ برنگی روشنیوں سے لکھا ہوا اس کا نام جگمگا رہا تھا لیکن وہ ہندی زبان میں لکھا ہوا تھا اس لیے میں پڑھ نہ سکا۔ جیسے ہی ہماری گاڑی گیٹ کے سامنے سے گزری ایک کھلی چھت والی جیپ ہمارے ساتھ سے ہو کر گزری شیتل (اس لڑکی کا نام شیتل تھا جو مجھے بعد میں معلوم ہوا) اس وقت میری طرف متوجہ تھی لیکن میری نظر اتفاقاً کار کے ڈرائیور پر پڑی جو ہماری گاڑی کو دیکھ کر واضح طور پر چونکا تھا اور پھر جیپ روک کر اپنے ساتھی کو کچھ کہنے لگا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب میں رینگ گیا۔''اس کا مطلب ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔''میرے دماغ میں فوراً خطرے کی گھنٹی بجی لیکن پھر مجھے خود ہی اپنی سوچ پر ہنسی آگئی کہ کار کے اندر چھائے اندھیرے میں وہ مجھے کس طرح پہچان سکتا تھا جبکہ اپنے چہرے پر میں نے مفلر بھی لپیٹا ہوا تھا۔

''اگرچہ مزدوروں کی غلطی تھی تب بھی تمھارے ڈیڈی کو کچھ نہ کچھ رقم ادا کر دینی چاہئے تھی۔ اس سے ان کی دولت میں بھی کوئی خاص کمی نہ ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دشمنی بھی پیدا نہ ہوتی۔''

''دشمنی کے اور بھی کئی اسباب ہیں، اسی طرح تمام اسباب پتا جی ختم کرتے رہے تو اپنی دونوں فیکٹریوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

''ماشاء اللہ بہت سکھا پڑھا رکھا ہے۔ پتا جی نے آپ کو۔''

''میں آپ کو کبھی بھی مطمئن نہیں کر سکوں گی۔''وہ بحث ختم کرتے ہوئے بولی۔''بہرحال آپ کو کہاں ڈراپ کروں۔''

اس سے پہلے کہ میں اس کو کوئی جواب دیتا ایک گاڑی ہمیں تیزی سے اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکلی اور ہماری گاڑی کے سامنے اس طرح ترچھی ہو کے کھڑی ہوگئی کہ ہماری کار کا آگے جانا ناممکن ہوگیا۔ یہ وہی جیپ تھی جو چند لمحے پہلے میں نے ہوٹل کے سامنے دیکھی تھی۔

''یہ کون کمینے ہیں؟''شیتل جھلاتے ہوئے بولی لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے جیپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تین افراد بھاگتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ تینوں کے ہاتھ میں ہتھیار تھے ایک نے مجھ پر ہتھیار تان لیا اور دوسرے نے شیتل پر جبکہ تیسرا پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''کک کیا بات ہے؟''شیتل نے گاڑی کی اندرونی لائیٹ جلا کر ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ لیکن وہ تینوں خاموشی سے ہمیں گھورتے رہے۔

اسی وقت جیپ کا ڈرائیور ڈرامائی انداز میں جیپ سے اتر کر ہماری سمت بڑھا وہ جیسے ہی ہماری کار کی ہیڈ لائٹ کے سامنے سے گزرا بے ساختہ شیتل کے ہونٹوں سے نکلا''اوہ تو یہ کمینہ ہے۔''

وہ شیتل کے قریب پہنچ کر بولا۔''چچ چچ بیچاری بے بی شیتل۔ آگئی ہو نا قابو میں چاہنے والوں سے کب تک بھاگا جا سکتا ہے۔''

''یہ حرکت تمھیں بہت مہنگی پڑے گی مسٹر انیل۔'' شیتل زہر خند لہجے میں بولی۔

''تم غالباً اس ہیجوے نما باڈی گارڈ پر انحصار کیے بیٹھی ہو۔'' وہ میری طرف اشارہ کر کے استہزائی لہجے میں بولا۔'' اگر تیرا باڈی گارڈر گھوداداکی طرح ہوتا تو تمھیں بے شک اس طرح کہنے کا ادھیکار تھا۔ یہ تو خود بھی رورو کر اپنی جان بخشی کی بنتی کرے گا۔''

''اگر اپنے اوپر تجھے اتنا ہی وشواس ہے تو آجاؤ میں عورت ذات ہو کر تمھیں خالی ہاتھ لڑائی کی دعوت دیتی ہوں۔''

''ضرور لیکن اپنے ٹھکانے پر جا کر۔'' انیل نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے ائیر فریشنر نما بوتل نکالی اور اپنا ہاتھ کھڑکی کے قریب کر کے ایک زوردار بو چھاڑ سپرے کر دی۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم سا بجایا اور میں نے بے ساختہ سانس روک لی، لیکن وہ سانس روکنا میرے کام نہ آسکا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو زمین پر لیٹے پایا۔ دائیں بائیں دیکھنے پر شیتل بھی زمین بکھری پڑی نظر آئی۔ بیہوشی کی حالت میں اس کا لباس بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ اس بے ترتیبی میں بھی ایسی ترتیب تھی کہ شاید ہوش کی حالت میں وہ یہ پوزیشن اختیار نہ کر سکتی۔ میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ میں نے جلدی سے اس دلکش نظارے سے نظر ہٹائی اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ میرے کوٹ کی جیب میں موجود دونوں پستول غائب تھے۔ نیلم سے حاصل کیا ہوا چھوٹا سا پستول جو میں نے اپنی کلائی کے ساتھ باندھا ہوا تھا وہ بھی انھوں کھول لیا تھا۔ پیسوں اور گھڑی کو بھی انھوں نے معاف نہیں کیا تھا۔

وہ یقینی طور پر شیتل کے دشمن تھے انیل نامی شخص کو دیکھ کر شیتل نے جس نفرت کا اظہار کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھی۔

ایک دفعہ تو میرے جی میں آیا کہ شیتل کو اس کے حال پر چھوڑ کر اپنا اُلو سیدھا کروں اور انیل پارٹی سے تعلقات بنا کر دہلی سے نکلنے کی کوشش کروں، مگر بعد میں مجھے اپنی سوچ پر ندامت سی محسوس ہوئی شیتل میری وجہ سے ان حالات سے دوچار ہوئی تھی اس کو ان غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا اس کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ان گھٹیا خیالات سے اپنا پیچھا چھڑایا اسی وقت شیتل کے منہ سے ایک کراہ بلند ہوئی اور اس نے ہلکے سے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں چند لمحے وہ اسی طرح لیٹی چھت کو تکتی رہی اور پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر اٹھ بیٹھی۔

میں بھی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے اپنا چہرہ میری جانب پھیرا اور آہستہ سے بولی۔

''آپ غالباً......؟''

''بالکل آپ نے صحیح پہچانا۔'' میں نے قطع کلامی کی۔'' میں وہی ہوں جس کے کارن آپ اس حالت کو پہنچی ہیں۔''

وہ آہستہ سے ہنسی عجیب خمار آلود ہنسی تھی اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے سے نظر آ رہے تھے یوں جیسے وہ ساری رات مئے نوشی کرتی رہی ہو۔ میرے ذہن میں بے ساختہ عدم کا شعر گونجا

آپ کی آنکھ بھاری بھاری ہے
رات کس شغل میں گزاری ہے

میرا دل چاہا کہ اسے یہ سنادوں مگر صرف سوچ کر رہ گیا۔

''اس میں آپ کا کوئی دوش نہیں ہے۔میری اپنی قسمت ہی ایسی تھی۔'' وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔

''کبھی شراب پی ہے آپ نے۔'' میں اس کا فلسفہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''دو تین دفعہ پی ہے۔'' وہ جواباً بولی۔''لیکن اتنی نہیں کہ مدہوش ہو جاؤں ویسے آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یونہی بس تمھاری حالت دیکھ کر یوں لگ رہا ہے کہ شراب پی کر آپ بالکل ایسے ہی لگتی ہوں گی۔''

''ہاہاہا۔'' اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور میرے کانوں میں جلترنگ سی بجی۔

''اچھا چھوڑیں اس سلسلے کو اپنا تعارف تو کروا دیں۔میرے نام کا پتا تو آپ کو چل ہی گیا ہوگا۔پتا جی کا نام سیٹھ ہری چرن داس ہے اور میں اس کی اکلوتی بیٹی ہوں۔''

''میرا نام اسلم ہے۔'' میں اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔''اور کہانی وہی ہے جو کسی بھی حالات کے مارے عام شخص کی ہو سکتی ہے۔''

''اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔عمر جان۔'' وہ جان کی جا کو کھینچتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔

میں کھسیانا ہو کر بولا۔''سوری......لیکن یہ میری مجبوری ہے ہر شخص کے سامنے میں اپنی اصلیت ظاہر نہیں کر سکتا۔''

''اچھا آ آ......اب میں بھی عوام کی لسٹ میں آگئی ہوں۔''

''تو آپ خواص کی لسٹ میں کب تھیں۔'' میرے منہ سے غیر ارادتاً نکلا بعد میں مجھے اپنے فقرے کی تلخی کا احساس ہو گیا لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے سوئے الفاظ واپس نہیں آسکتے۔

''اوہ......آئی ایم سوری۔'' وہ نادم ہو کر بولی۔''مجھے اتنا فری نہیں ہونا چاہئے تھا۔''

''آپ نے تو مائنڈ کر لیا۔'' میں جلدی سے بولا۔''میں صرف مذاق کر رہا تھا۔''

''آپ کا اور میرا مذاق کب سے ہو گیا۔'' اس نے جوابی چوٹ کی۔

مجھے پتا چل گیا کہ اس کا موڈ بحال ہونے میں کافی دیر لگے گی اس لیے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس صورتِ حال سے نمٹنے کی تدبیر سوچنے لگا۔انڈیا کی زمین نے میرے لیے دلدل کی صورت اختیار کر لی تھی۔اس سے نکلنے کے لیے میں جتنے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اتنا دھنستا جا رہا تھا۔

''آپ تو بالکل چپ سادھ لی ہے۔'' وہ زیادہ دیر خاموشی برداشت نہ کر سکی اور بول پڑی، لیکن میں اسے جواب دینے کی بجائے

آنکھیں بند کیئے بیٹھا رہا۔

''مسٹر جان سو گئے کیا؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''میرا نام عمر جان ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔''میں نے میری جان نہیں صرف جان کہا ہے۔''

''مطلب ایک ہی بنتا ہے۔'' میں بھی ترکی بہترکی بولا

''غلط فہمی ہے جناب کی۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''اچھا چھوڑو اس چوٹ بازی کو۔'' میں نے موضوع بدلا۔''اس انیل کے بارے مجھے بتاؤ آپ کے انداز سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

''کمینہ......'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔''یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ موصوف کو مجھ سے محبت کا دعویٰ تھا۔ بلکہ ہے اور اس سلسلے میں ایک دن پتاجی کے پاس میرا رشتہ مانگنے چلا گیا۔ پتاجی نے اسی وقت مجھے بلا کر پوچھ لیا کہ موصوف اس وجہ سے تشریف لائے ہیں اور تیری کیا رائے ہے ان کا خیال تھا کہ شاید اس کے آنے میں میری مرضی شامل ہے۔ لیکن میں نے پتاجی کے سامنے اسے خوب بے عزت کیا نتیجے میں پتاجی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکلوا دیا۔ اس بات کو دو ہفتے ہونے کو ہیں اسی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے کسی غنڈے کو ہائر کیا ہے جسے پتا نہیں کون سا دادا کہہ رہا تھا...... باقی کے واقعات تمھاری نظروں کے سامنے ہیں۔''

''ہوں......'' میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔

''اب آپ بھی اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے۔'' وہ مستفسر ہوئی۔''اخبارات میں تو آپ کے متعلق کافی کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں حقیقت کتنی ہے اس کی وضاحت کر دیں۔''

''اخبارات میں کتنی حقیقت بیان ہوتی ہے اس سے آپ واقف ہیں۔''

''اسی لیے تو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں؟''

جواباً میں نے اسے مختصراً اپنی کہانی سنا دی لیکن بہت سی باتیں اس میں حذف کر گیا۔ وہ بڑے اشتیاق سے میری کہانی سنتی رہی۔ میں بمشکل اپنی بات ختم کر پایا تھا کہ بند دروازے کے پیچھے قدموں کی چاپ ابھری تالے میں چابی گھومنے اور پھر ہلکی سی کلک کے ساتھ تالا کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا ایک شخص ہاتھ میں ٹرے پکڑے کمرے میں داخل ہوا جبکہ اس کی پشت پر مجھے دو ہتھیار بردار نظر آئے جنھوں نے ہاتھوں میں ہلکی مشین گنیں پکڑی ہوئی تھیں۔

کمرے میں داخل ہونے والے شخص نے ٹرے ہمارے سامنے رکھی اور بغیر کچھ بولے واپس مڑ گیا۔ دروازے پر موجود دونوں

سنتریوں نے بھی کچھ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کھانا لانے والے کے کمرے سے نکلتے ہی انھوں نے دروازہ بند کیا اور دروازے سے ہٹتے چلے گئے۔ کھانا سبزی کے سالن اور تندور کی روٹیوں پر مشتمل تھا۔

''اس کا مطلب ہے دن کافی گزر گیا ہے کہ یہ ناشتے کی بجائے کھانا دے گئے ہیں۔'' میں نے ٹرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''شاید''۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''چلو کھانا کھاتے ہیں۔'' میں نے ٹرے اس کی سمت کھسکائی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئی بولی۔ ''آپ کھائیں۔''

میں نے اصرار کیا۔ ''تھوڑا سا تو کھالیں۔''

میرے کہنے پر اس نے ایک نوالہ لیا اور پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس وقت اچھی خاصی بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں تین چار روٹیاں کھا گیا۔

''آپ کو اس صورت حال میں بھی بھوک لگتی ہے۔'' وہ حیرانی سے بولی۔

''ہم کمانڈوز کے لیے ماحول کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ مثلاً مجھے یہاں سے بھاگنے کا موقع مل جاتا ہے تو راستے میں بھوک کے پیٹ میری کارکردگی تو آدھی رہ جائے گی نا؟''

''نہیں اصل بات یہ ہے کہ تم مردوں کو صرف ایک خطرہ ہوتا یعنی جان کا خطرہ جبکہ عورت ذات کو اس کے ساتھ ساتھ عزت لٹنے کا بھی خوف ہوتا ہے جو اس کے لیے موت سے بھی بھیانک سزا بن جاتی ہے۔''

میں اس جیسی آزاد خیال لڑکی کے اس قدر قدامت پرست خیال سن کر حیران رہ گیا۔ دروازے کے باہر ایک مرتبہ پھر قدموں کی آواز آئی اور باورچی نما شخص دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اس نے ہاتھ میں ایک کرسی پکڑی ہوئی تھی جو اس نے کمرے کے فرش پر رکھ دی اور کھانے کے برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں گن مین دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے دونوں نے گنوں کو مضبوطی سے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا اور ہماری ہلکی سی جنبش پر فائر کرنے کے لیے تیار تھے۔

چند لمحوں بعد انیل آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے کمرے میں داخل ہوا اور بڑے انداز سے کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''ہاں تو شیتل بے بی کیا حال ہے؟'' وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا لیکن شیتل نے جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

''ویسے مجھے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر بڑا افسوس ہوا ہے۔'' شیتل کو خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا۔ ''ایک سیٹھ زادی اور اس لاچاری کی حالت میں زمین پر لیٹی ہوئی ہے۔''

''حوالات میں بھی چارپائی نہیں ملتی جو تیری آخری منزل ہے۔'' شیتل غصے سے بولی۔

''ہاہاہا'' اس کا استہزائی قہقہہ گونجا۔ ''اس کو کہتے ہیں کہ رسی جل گئی پر بل نہیں نکلے۔''

اس سے پہلے کہ اس کے جواب میں شیتل کچھ بولتی کسی گاڑی کا تیز ہارن سنائی دیا۔

''میرا خیال ہے رگھو دادا واپس آ گیا ہے۔'' انیل ہتھیار برداروں سے مخاطب ہوا۔

''دونوں میں سے ایک گیٹ کھولنے کے لیے چلے جاؤ۔'' اور ایک سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دیو قامت شخص تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا۔ دروازہ کھولنے کے لیے جانے والا اور ایک دوسرا شخص اس کے ہمراہ تھے۔

وہ رگھو دادا تھا اس کے چہرے پر زخموں کے تین چار نشانات نظر آ رہے تھے نہایت کریہہ شکل اور بھیانک چہرہ تھا۔ عام لوگ تو اس کو دیکھ کر ہی کانپ جاتے ہوں گے۔ وہ قد اور جسامت ہر دو لحاظ سے مجھ پر بھاری نظر آ رہا تھا۔

''بابو وہ چڑی مار سیٹھ تاوان دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔'' وہ انیل سے مخاطب ہوا جو اس کو دیکھ کر بے ساختہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''رگھو دادا آپ فکر نہ کریں۔'' انیل اعتماد سے بولا۔ ''میں اسے راضی کر لوں گا۔ بس تھوڑی دیر لگے گی۔''

''نہیں بابو میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے میرا طریقہ کار کچھ اور ہے۔'' اس نے انیل کے چہرے سے نظر ہٹا کر ایک سرسری نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر شیتل کی طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ شیتل کی طرف دیکھتے ہی اس کی سانپ کی مانند چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی تھی جو واضح طور پر خباثت کی چمک تھی ایک عورت ہونے کے ناطے شیتل ان احساسات سے زیادہ واقف تھی وہ بے ساختہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''رگھو دادا آپ مجھے ایک ہفتے کی مہلت تو دیں۔'' انیل آہستہ سے بولا میں نے محسوس کیا کہ وہ رگھو دادا سے دب کر بات کر رہا تھا۔ ''میں سیٹھ سے منوا لوں گا۔''

''تم چھوڑو اس بات کو۔'' رگھو دادا شیطانی انداز میں شیتل کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ''میں اس کے باپ کو ایسا تحفہ بھیجوں گا کہ اس کو رگھو دادا کے ساتھ پنگا لینے کا انجام معلوم ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے سمٹی سمائی شیتل کا بازو پکڑا شیتل نے زور لگا کر اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن یہ چیونٹی اور ہاتھی کا مقابلہ تھا۔

''چھوڑو مجھے کمینے ...... کتے''۔ وہ چلائی۔ جواباً رگھو دادا قہقہہ لگا کر ہنسا اور اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا رگھو دادا کو روکنے کے لیے میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر دروازے کے اطراف میں کھڑے ہتھیار برداروں میں سے ایک دھاڑا۔

''خبردار اگر اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی۔'' اور میں ہونٹ کاٹتا ہوا بیٹھا رہ گیا۔

''جان مجھے اس وحشی سے بچاؤ۔'' شیتل جب اپنا ہاتھ اس کے پنجے سے نہ چھڑا پائی تو مجھے پکار کر بولی۔ جبکہ انیل جو رگھو دادا کے

اس اقدام پر ہکا بکا کھڑا تھا۔

''نہیں رگھوادا نہیں۔'' کہتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑا۔ رگھودادا جو شیتل کو اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑے دروازے سے نکلنے والا تھا اچانک گھوما اور اپنے سیدھے ہاتھ کا زوردار تھپڑ انیل کے چہرے پر مارا وہ اُڑتا ہوا میرے قدموں میں آ گرا اور پھر ادھر ہی پڑا رہا۔

''اس کو حویلی سے باہر پھینک دو۔'' رگھودادا غرایا اور پھر چیختی چلاتی شیتل کو گھسیٹتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا۔

''جی دادا'' کہہ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور انیل کو گریبان سے پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا جبکہ دوسرے مجھ پر ہتھیار تانے کھڑے رہے۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی باقی دونوں بھی کمرے سے نکلے اور دروازہ بند کر کے دور ہوتے گئے۔ میرا ذہن اس وقت شیتل کی چیخوں کی طرف متوجہ تھا جو بڑے زور سے چلا رہی تھی اور بھگوان کے واسطے دے کر اپنی جان بخشی کی منت کر رہی تھی۔ میرا خون کھول اٹھا، مجھ سے بیٹھا نہ گیا، میں مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا اور اضطراب کی حالت میں ٹہلنے لگا۔

''کیا میری موجودی میں ایک بے بس لڑکی کو بے عزت کر دیا جائے گا۔'' میرے ذہن میں سوچ ابھری۔

''نہیں کبھی نہیں۔'' میں زور سے بولا۔ ''اسے اس حالت میں پہنچانے کا ذمہ دار میں ہوں۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔''

میں دروازے کی سمت بڑھا۔ ٹائم بہت کم تھا رگھودادا پر شیطان سوار تھا ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ اس نے اپنے باقی بندوں کو حکم دیا تھا کہ انیل کو اس حویلی سے باہر پھینک آئیں اور اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت تھا۔ میں نے دروازے کو ہاتھ لگا کر دیکھا دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن اس کے باہر لگی ہوئی زنجیر مجھے کوئی خاص مضبوط نظر نہ آئی۔

سب سے اچھی بات یہ تھی کہ دروازہ عام اصول کے برخلاف باہر کی طرف کھل رہا تھا میں دروازے سے چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر دوڑ کر اپنے بائیں کندھے کی ضرب دروازے کے درمیان میں لگائی۔ پہلی ضرب کامیاب رہی اور میں دروازے کی کنڈی توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ شیتل کی چیخیں دائیں طرف دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے سے آ رہی تھیں۔ میں زمین سے اٹھ کر اس سمت دوڑتا چلا گیا۔ آس پاس کے مناظر سے میں بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کمرے تک کا فاصلہ میں نے دوڑ کر طے کیا۔ میری یا شیتل کی خوش قسمتی کہ جذبات میں اندھے ہو کر رگھودادا کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس کمرے کے دروازے کو بھی میں نے باہر کی طرف کھلتا پایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس عمارت کے سارے دروازے اس طرح باہر کی طرف کھلتے تھے۔

میں آندھی و طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس دیو قامت کریہہ شکل رگھودادا کے بدن پر صرف ایک جانگیہ نظر آ رہا تھا جبکہ شیتل مادرزاد برہنہ کمرے کونے میں کھڑی دونوں ہاتھوں سے اپنی برہنگی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ رگھوداد کے جسم پر ریچھ کی طرح لمبے لمبے بال تھے اور شیتل کے چیخنے چلانے اور منتوں سے بے پرواہ اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے ساختہ اس بلّے کا خیال آیا جس نے ننھی سی چوہیا کو کونے میں اس طرح گھیر لیا ہو کہ اس کے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ بچا ہو۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ شیتل چلائی۔

''جان، جان اپنے خدا کے واسطے مجھے اس سے بچاؤ۔'' میں شاید بے خبری میں رگھو دادا پر وار کرنے کی کوشش کرتا۔ گو یہ میری مردانگی کے خلاف ہوتا لیکن ایک لڑکی کی عزت بچانے کے لیے مجھے اس قسم کا طعنہ گوارا تھا۔ کیونکہ اٹیل کو باہر پھینکنے والوں نے واپس آ جانا تھا اور تمام پر اکیلے قابو پانا میرے لیے ناممکن ہو جاتا لیکن شیتل نے میرا یہ منصوبہ ناکام کر دیا اور اس کی طرف مستی سے جھوم کر بڑھتا ہوا رگھو پھرتی سے پیچھے گھوما۔ مجھے دیکھ کر اس کا کریہہ چہرہ بھیانک انداز میں بگڑ گیا تھا۔ اس کو پیچھے مڑتا دیکھ کر میں اپنی جگہ پر رک گیا اور پھر الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے اس طرح پیچھے ہٹنے کو اس نے میرے بھاگنے پر محمول کیا اور استہزائی انداز میں ہنسا۔ شیتل بھی یہی سمجھی کہ میں وہاں سے ڈر کر بھاگ رہا ہوں۔ وہ چلائی۔

''نہیں جان نہیں مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

اس کو جواب دینے کی بجائے میں دروازے کے قریب پہنچا اور دروازے کی اندر سے کنڈی لگا دی۔ ایسا میں نے اپنے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا تھا۔ کنڈی بند کر کے میں پلٹا میرے سامنے ایک سخت حریف کھڑا کینہ توز نظروں سے میری جانب گھور رہا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا اور ایک مرتبہ پھر مجھے زندگی اور موت کا معرکہ درپیش تھا۔ رگھو دادا کو زندگی کی قید سے آزاد کر کے ہی میں شیتل کی عزت بچا سکتا تھا۔

+++

''بالک تم نے اپنے لیے بہت بری موت کا چناؤ کیا ہے۔'' رگھو دادا بھیانک آواز میں گرجا۔

''رگھو دادا، کمزور نہتی عورتوں کو اپنی مردانگی کے جوہر دکھانا بہت آسان ہوتا ہے۔'' میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن جس وقت سامنے مرد آئیں تب تیرے جیسے ہیجڑوں کو پتا چلتا ہے کہ مردانگی کیا ہے۔''

اس وقت دروازے پر دستک سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نے زور زور سے پکارا ''رگھو دادا، رگھو دادا قیدی بھاگ گیا ہے۔''

''دفع ہو جاؤ...... کتو۔'' میری باتیں سن کر رگھو کا پارہ یوں بھی آسمان کو چھو رہا تھا اور وہ غصہ اس نے انھی پر نکال دیا۔ ''تمھارا باپ بھاگا نہیں ادھر ہی ہے۔''

رگھو کو اپنے گرگوں کے ساتھ مصروفِ گفتگو دیکھ کر میں نے اپنی جیکٹ اور قمیض اتار کر چارپائی پر ڈال دیں تھیں کیونکہ اس دیو کے ساتھ لڑائی کے دوران مجھے بہت زیادہ تیزی کی ضرورت پڑتی جس میں جیکٹ اور قمیض لازماً رکاوٹ بنتی۔

''دادا پھر ہم کیا کریں......؟'' باہر سے سہمی ہوئی آواز آئی۔

''بتایا تو ہے دفع ہو جاؤ، اس کی ہڈیاں توڑنے کے لیے رگھو دادا کو کسی کتے کی مدد نہیں چاہیے۔''

''جی دادا۔'' کہہ کر وہ دروازے سے ہٹتے چلے گئے اس بات کا اندازہ مجھے ان کے دور جاتے قدموں کی چاپ سے ہوا۔

میں نے نظریں ترچھی کر کے شیتل کی طرف دیکھا وہ ابھی تک اسی حالت میں کھڑی تھی۔ کپڑے کا تار تک اس کے بدن پر موجود نہیں تھا رگھو نے اس کے لباس کو چیر پھاڑ کے اس کے جسم سے علیحدہ کیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چارپائی پر پڑی اپنی جیکٹ اٹھائی اور اس

کی طرف اچھال کر بولا۔

''یہ پہن لو۔'' گو وہ جیکٹ اس کے جسم پر بہت کھلی تھی لیکن برہنگی چھپانے کے لیے غنیمت تھی۔

شیتل نے جھپٹ کر جیکٹ کو پکڑا اور پہن لی۔ جیکٹ نے رانوں تک اس کے بدن کو چھپا لیا تھا۔

''واہ بھئی واہ!'' رگھو اپنی منحوس آواز میں گرجا۔ ''بڑی تکلیف ہو رہی تھی تجھے، لیکن کب تک چھپاؤ گے اسے، جس پر رگھو کا دل آجائے اسے رگھو ضرور حاصل کرتا ہے۔''

''رگھو بھونک اچھا لیتے ہو۔'' شیتل کی طرف سے بے فکر ہو کر میں نے اسے چھیڑا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اتنا غصے میں کر دوں کہ وہ اپنے دفاع سے غافل ہو جائے اور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ رگھو غصے میں دھاڑتا ہوا میری طرف بڑھا میں اپنی جگہ پر تیار کھڑا تھا میرے قریب پہنچ کر اس نے پوری قوت سے اپنا دایاں بازو گھمایا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کا وار خطا کیا وہ اپنی جھونک میں گھوم گیا تھا پشت پر لگنے والی میرے پاؤں کی ٹھوکر سے وہ بے ساختہ چند قدم دوڑتا چلا گیا۔ اس کے مڑنے سے پہلے میں اپنے دائیں پاؤں پر گھوم چکا تھا۔ میرے بائیں پاؤں کی ایڑی اس کی چھاتی سے ٹکرائی اور وہ کولہوں کے بل زمین پر گر پڑا لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہ لگائی اور اٹھ کر اپنے دائیں پاؤں کی ٹھوکر پوری قوت سے میری چھاتی پر دے ماری میں نے دونوں ہاتھوں کا کراس بنا کر اس کی ضرب سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں میرے پاؤں ان بیلنس ہو گئے اور میں نیچے گرا پڑا۔ رگھو نے مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیا اس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے لیکن اس کی ہر ٹھوکر مجھے ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ غصے کی شدت میں پھنکار رہا تھا اور اس کے منہ سے کسی گندے گٹر کی گندگی کی طرح واہیات گالیاں نکل رہی تھیں تیسری چوتھی ٹھوکر پر اس کا پاؤں میرے ہاتھ میں آ گیا جسے کھینچ کر میں نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

میں اچھل کر کھڑا ہوا اور اپنے پاؤں کی ایڑی پوری قوت سے زمین سے اٹھتے رگھو کے ماتھے پر دے ماری اس کا سر ایک دھماکے کے ساتھ زمین سے ٹکرایا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ فرش پختہ نہیں تھا ورنہ اس کا کام ہو گیا ہوتا۔ زمین کچی ہونے کے باوجود اس کے منہ سے کراہ خارج ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گندی گالیوں کی بوچھاڑ نکلی۔

''کھڑے ہو جاؤ زنخے۔'' میں اسے غصہ دلاتا ہوا بولا۔ ''عورتوں کی طرح کوسنے دینے سے بات نہیں بنے گی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر بکتا جھکتا کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی ٹانگ لہرا کر اس کی چھاتی میں مارنے کی کوشش کی لیکن میری ٹانگ اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس نے میرے پاؤں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ کر مجھے ہوا میں گھمانا چاہا اگر وہ اس بات میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو آسانی سے گھما کر مجھے کسی دیوار سے ٹکرا دیتا، لیکن میں نے وہ پاؤں اس کے ہاتھ میں رہنے دیتے ہوئے اچھل کر اپنے دوسرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے کریہہ چہرے پر دے ماری۔ میرا پاؤں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں منہ کے بل زمین پر گرنے لگا، لیکن میں اس بات کے لیے تیار تھا اس لیے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر میں اپنے چہرے کو زمین پر گرنے سے بچا گیا۔ رگھو دادا میری طرف بڑھنے کی بجائے اپنے کپڑوں کی طرف دوڑا مجھے پتا چل گیا کہ وہ کوئی ہتھیار لینے کے چکر میں ہے۔ میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑا وہ اس وقت جھک کر اپنے

کپڑوں سے کچھ نکالنے کی کوشش میں مصروف تھا اگر میں اسی طرح دوڑ کر اس کی طرف بڑھتا تو وہ لازماً ہتھیار نکالنے میں کامیاب ہو جاتا میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں تیرتا ہوا اس پر جا پڑا۔ اپنی کمر پر لگنے والی میرے سر کی چوٹ سے وہ منہ کے بل گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

اسے ٹھوکریں لگاتے ہوئے مجھے عجیب سی لذت محسوس ہو رہی تھی اور ایسا شاید شیتل کے ساتھ اس کے ناروا سلوک کرنے کی وجہ سے تھا۔

اس نے میرا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی لیکن میری پھرتی کی وجہ سے اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا میرے پاؤں کی پہنچ سے دور ہٹا اور پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں ہم دونوں کے جسموں سے بہہ رہا تھا۔ رگھو کسی تھکے ہوئے کتے کی مانند ہانپ رہا تھا۔ اس کی پہلی اکڑ فوں اور دم خم رخصت ہو چکا تھا۔ اب اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔

''رگھو'' میں نے اسے استہزائیہ انداز میں پکارا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ لڑائی بھڑائی مردوں کا کام ہے۔ اب بھی اگر تم چوڑیاں پہن کر ایک ٹھمکا لگا کر دکھا دو تو میں تمھیں زندگی کی بھیک دے سکتا ہوں۔''

میری بات سنتے ہی رگھو ایک مرتبہ پھر غصے سے بکتا جھکتا میری جانب بڑھا غصے کی شدت میں وہ اپنے دفاع سے بالکل غافل ہو گیا تھا جو کہ میرا مطمع نظر تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا میں نے اپنا سیدھا پاؤں اس کی بائیں سائیڈ کی پسلیوں کے نیچے مارا وہ ''اوغ'' کی آواز کے ساتھ رکوع کے بل جھک گیا مجھے بھی اس کی یہی پوزیشن درکار تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی موٹی گردن میرے بائیں بازو کی گرفت میں تھی۔

''رگھو تجھے کہا تھا نا چوڑیاں پہن کر اپنی جان بخشی کروا لے۔'' میں اس کی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر تُو یہ نہ مانا، اب اپنے گرو شیطان کو یاد کر لے کہ یہ تیرا آخری وقت ہے۔''

رگھو نے تڑپ کر اپنی گردن میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش اتنی ہی ناکام گئی جتنی بلی کے منہ میں پھنسے کسی چوہے کی جان بچانے کی کوشش ناکام جاتی ہے۔

میں نے اپنے بائیں بازو کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور ''کٹاک'' کی آواز کے ساتھ رگھو کا جسم میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔

میں نے اسے نفرت سے زمین پر پھینک دیا۔

کونے میں سمٹی شیتل بھاگ کر قریب آئی اور وارفتگی کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ میرے سینے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے چاہت سے بولی۔

''ہاں۔'' میں گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کا اس طرح وارفتگی سے میرے ساتھ لپٹنا مناسب نہیں تھا لیکن کوشش کے باوجود میں اسے خود سے علیحدہ نہ کر سکا بڑی مشکل سے میں اپنے بازوؤں کو اس کے گرد گھیرا ڈالنے سے باز رکھ سکا تھا۔

''سردی کے باوجود اتنا پسینہ؟'' وہ اپنے ہاتھوں سے میرے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔

''میں کھانا نہیں کھا رہا تھا، زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔''

''میری خاطر، ہے نا؟'' میرے سینے کے ساتھ اپنا رخسار رگڑتے ہوئے وہ پیار سے بولی۔

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی اور شیتل کے اپنی طرف بڑھتے قدموں کو روکنے کے لیے میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ تیری جگہ پر کوئی بھی عورت ہوتی میں نے یہی کرنا تھا۔''

''ہاں......آپ ہیں ہی اتنے اچھے......اتنے پیارے۔''

''اچھا آپ مجھ سے علیحدہ ہونے کی زحمت کریں گی۔'' میں ناچاہتے ہوئے بھی مجبوراً بولا۔ ''ابھی تک اس کے گرگے صحیح سلامت باہر موجود ہیں۔''

''آپ کی موجودی میں مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔''

''میں کب تک تیرے پاس رہوں گا۔'' میں نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔ جس کا جواب اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے مجھ سے علیحدہ ہوئی اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس مضحکہ خیز لباس میں بھی وہ اتنی ہی سندر اور پیاری لگ رہی تھی جتنی کسی بھی نئے فیشن کے لباس میں لگتی۔ لباس اور زیورات ہمیشہ سے عورت کی کمزوری رہے ہیں۔ بلا امتیاز کسی رنگ، مذہب، نسل اور قومیت کے، عورتیں ان لوازمات کی دلدادہ ہوتی ہیں لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ عورتوں کا پاگل پن ہے۔ حسن کبھی بھی لباس یا آرائش کا محتاج نہیں رہا ہے۔ اچھی صورت ہر لباس اور بغیر آرائش کے بھی اچھی ہی لگتی ہے۔ جس طرح چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس شیتل لگ رہی تھی۔

میں نے اس کے سراپے سے نگاہیں ہٹائیں اور زمین پر بکھرے رگھو کے لباس کی طرف متوجہ ہو گیا اس کی تلاشی لینے پر کوبرے کا بریٹا اور نیلم کا چھوٹا پسٹل دونوں اس کی جیب میں پڑے مل گئے۔ ایک تیز اور لمبی چوڑی دھار کا خنجر بھی چمڑے کے کور میں بند مجھے نظر آ گیا۔

نیلم کا پسٹل میں نے پتلون کی جیب میں ڈالا جبکہ خنجر کا کور اپنی جراب کے نیچے پنڈلی کے ساتھ ایک تسمے سے باندھ دیا۔

شیتل اس دوران خاموشی سے چارپائی پر بیٹھی میری حرکات کو دیکھتی رہی۔ بریٹا ہاتھ میں لے کر میں دروازے کی سمت بڑھا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ ایک سادہ سی عمارت تھی تمام کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ سورج کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہر کمرے کا دروازہ مشرقی سمت میں تھا۔ عمارت کی شمالی اور جنوبی دیوار کے ساتھ بھی ایک ایک کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا جن کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔ تمام کمروں کے سامنے ایک کھلا اور وسیع برآمدہ تھا اور اس کے بعد ایک لمبا چوڑا وسیع صحن تھا۔ کمروں کے دروازے باہر کی جانب کھلتے تھے اس لیے میں نے احتیاط سے باہر جھانکا کہ دور سے ہی دروازہ کھلتا نظر آ جاتا لیکن خوش قسمتی سے مجھے برآمدہ اور صحن خالی نظر آئے بائیں ہاتھ کے ایک کمرے سے مجھے ہلکی ہلکی گانے کی آواز آ رہی تھی شاید کوئی ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر گانا سن رہا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر شیتل کو اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا وہ تو جیسے میرے اشارے کی منتظر تھی بھاگ کر میرے

قریب آ گئی۔ میں نے چھوٹا پستول اس کے حوالے کر کے کہا۔

''میں بائیں سمت کو جا رہا ہوں تم کمرے کے اندر رہتے ہوئے دائیں جانب پر نظر رکھنا۔ یہ نہ ہو پشت کی جانب سے کوئی مجھے پار کر دے۔''

''بھگوان نہ کرے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''برے شبد تو نہ نکالو منہ سے۔''

''گولی تو چلا لو گی نا......؟'' میں مستفسر ہوا۔

''یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا؟'' وہ شرارت سے مسکرائی۔ اور میں سر ہلاتا آواز والے کمرے کی سمت بڑھتا چلا گیا۔ وہ ریڈیو کی آواز تھی کیونکہ جس وقت میں کمرے کے نزدیک پہنچا اس وقت کمپیئر سامعین کے خطوط پڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ رگھو کے گرگوں کی بات چیت کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں دبے قدموں دروازے کے قریب پہنچا کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود پستول فائرنگ پوزیشن میں ریڈی تھا۔

''ہینڈز اپ۔'' میں دروازے کو مکمل کھول کر کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ وہ دونوں چار پائیوں کے اوپر لیٹے مصروف گفتگو تھے ان کا تیسرا ساتھی ادھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری دھاڑ سن کر وہ اچھل پڑے لیکن ہاتھ اٹھانے کی ضرورت انھوں نے محسوس نہ کی اور جھپٹ کر اپنی کلاشن کوفیں اٹھانی چاہیں، لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی بریٹا پستول کی مزل سے نکلنے والی بے رحم گولیاں ان سے زیادہ تیز ثابت ہوئیں دونوں کی کھوپڑیوں میں سرخ روشندان کھل گئے تھے۔ میں نے پستول اپنے بیلٹ میں اڑسا اور جھپٹ کر چار پائی کے ساتھ کھڑی کلاشن کوف اٹھا لی تیسرے بندے کا کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر چھپا ہوا تھا۔ میں جیسے ہی باہر نکلنے کے لیے مڑا مجھے ہلکے ہلکے دو دھماکے سنائی دیئے یہ نیلم کے پستول کی آواز تھی۔ میں بھاگ کر باہر نکلا برآمدے میں تیسرا آدمی پڑا اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

میرے سامنے رگھو، انیل اور ان کے ساتھ یہی تین بندے آئے تھے جو اس وقت جہنم رسید ہو چکے تھے لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ ان کے علاوہ بھی اس جگہ ان کا کوئی اور ساتھی پوشیدہ ہو۔

مجھے دیکھ کر شیتل بھی کمرے سے نکل آئی۔

''ادھر ہی رہو۔'' میں نے اسے واپس کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور وہ جلدی سے کمرے کے اندر ہو گئی۔ لاش کے قریب پڑی کلاشن کوف اٹھا کر میں بھی شیتل کے پیچھے کمرے میں گھس گیا۔

''ادھر کتنے بندوں کو ختم کر آئے ہو۔''

''دو تھے......اور تیسرا تیرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔''

''وہ باورچی بھی تو تھا نا جو ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔'' وہ مجھے یاد دلاتے ہوئے بولی میں اس کی بات سن کر حقیقتاً اچھل پڑا۔

''تم اسی کمرے میں رہو اور اندر سے کنڈی لگا لو جب تک میری آواز پہچان نہ لو دروازہ نہیں کھولنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی اور میں احتیاط سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔شیتل نے میرے باہر آتے ہی اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔

میں نے ایک طرف سے کمروں کی تلاشی لینی شروع کر دی مطلوبہ شخص مجھے بائیں جانب کے آخری کمرے میں مل گیا،لیکن اس حالت میں کہ کوئی کام کرنے قابل نہیں تھا۔وہ کسی نامعلوم نشے کے زیر اثر دھت پڑا تھا۔وہ افیون، چرس، بھنگ،شراب سے لے کر کوکین پاؤڈر تک کسی چیز کا نشہ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے اسے ہلایا جلایا مگر اس میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔اس کے کمرے کی تلاشی لینے پر مجھے تھوڑی سی نقدی کے علاوہ کوئی کام کی چیز نہ ملی۔وہ غالباً ان کا باورچی تھا اور دوپہر کے کھانے کے بعد آرام فرمار ہا تھا۔یوں بھی نشئی بندہ اپنا نشہ لیے بغیر سو نہیں سکتا۔اس کی چارپائی کے نیچے جھانکنے پر گھٹیا شراب کی تین چار بوتیں پڑی نظر آئیں ان بوتلوں پر کوئی لیبل وغیرہ لگا ہوا نہیں تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب تھی۔انڈیا میں شراب کی بھٹیاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں اور شوقین حضرات بھی اتنی ہی کثرت سے ہیں مسلمانوں کے علاوہ کسی بھی مذہب کے پیروکار اس سے احتراز نہیں برتتے۔بلکہ آج کل تو خال خال ہی ایسے مسلم پائے جاتے ہیں جو اس ام الخبائث سے پرہیز کرتے ہوں۔

وہ باورچی مختصر قامت کا شخص تھا اس کا لباس شیتل کو فٹ آسکتا تھا۔میں نے اس کے سامان میں سے ایک صاف ستھری پینٹ شرٹ اٹھائی اس کے کمرے کو باہر سے کنڈی چڑھائی تا کہ ہوش میں آنے پر وہ کوئی گڑبڑ نہ کر سکے اور شیتل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔میری آواز پہچانتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

''وہ باورچی اپنے کمرے میں نشے میں دھت پڑا ہے، میرا اندازہ ہے کہ اس کا لباس تجھے فٹ آئے گا۔لو یہ پہن لو۔'' میں نے لباس اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔''اور میری جیکٹ واپس کرو۔''

''تیری جیکٹ تو میں کھا ہی جاؤں گی نا؟'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔''یہ لو'' اس نے زپ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

''ادھر دفع ہو جاؤ۔'' میں نے باتھ روم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ہاہاہا...... '' وہ شرارت سے ہنسی۔''دل تو بڑا کر رہا ہے لیکن اوپر اوپر سے کہہ رہے ہو کہ ادھر چلی جاؤ تا کہ میں ضد میں آ کر اِدھر ہی چینج کر لوں۔تمھاری یہ حسرت میں کبھی بھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''سب کچھ کو میرا دیکھا بھالا تو ہے۔''

''صحیح کہا......لیکن اب دل کر رہا ہو گا ناں دوبارہ دیکھنے کو...... یوں بھی میں ہوں ہی ایسی کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہے وہ یہی کہتا۔

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

''اتنا ٹائم نہیں ہے کہ میں تیری بکواس سن سکوں۔''

''سچی بات سن کر غصہ آ ہی جاتا ہے۔'' وہ شوخی سے بولی اور میں پاؤں پٹختا کمرے سے نکل آیا باہر آ کر میں ایک مرتبہ پھر تمام کمروں کی تلاشی تفصیل سے لینے لگا، تھوڑی سی نقدی کے علاوہ مجھے کام کی کوئی چیز نہ ملی۔ سارے کمروں میں گھٹیا شراب، فحش تصاویر، چرس، سگریٹ اور اسی قسم کی دیگر اشیاء وافر مقدار میں موجود تھیں۔ میں ایک مرتبہ پھر اس باورچی نما شخص کے کمرے میں گھس گیا اس کے چہرے پر پانی چھینکنے اور تھپڑ مارنے پر بھی میں اسے ہوش میں نہ لا سکا۔ مجبوراً میں اسے اپنے حال پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ کمرے کی کنڈی لگانا میں نہیں بھولا تھا۔

شیتل منہ پھلائے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ باورچی کا لباس اسے بالکل فٹ آیا تھا میں اس سے بات کے لیے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ میری قمیص اور جیکٹ چارپائی پر پڑی تھیں۔ جیکٹ وغیرہ پہن کر میں نے پتلون کی جیبوں میں ٹھونسا ہوا سارا سامان جیکٹ کی جیبوں میں منتقل کیا اور وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ رگھو کے گرگوں کی تعداد تین چار ہی ہو۔ حویلی کی ساخت سے تو لگتا تھا کہ اس میں کافی بندے رہائش پذیر تھے۔

حویلی کے صحن میں شیتل کی کار اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ یہ وہی جیپ تھی جس میں کل رات انیل اور اس کے ساتھی سوار تھے۔

''چلو'' میں کلاشن کوف کی دو فالتو میگزینیں جیب میں ڈال کر شیتل سے مخاطب ہوا۔ ''یہ جگہ ہمیں فی الفور چھوڑنی پڑے گی۔''

''نہیں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''میں یہیں پہ ٹھیک ہوں۔'' اس نے اپنا منہ بالکل کسی بیوی کی طرح پھلایا ہوا تھا۔ خدا حسن دیتا ہے اور ناز و ادا حسین خود سیکھ لیتے ہیں۔ اپنی اداؤں سے کسی کی بھی عقل خبط کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ بھولپن اور سادگی ان کے ایسے تیر ہوتے ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔

شیتل بھی ہزاروں نہیں لاکھوں، کروڑوں میں ایک تھی اس کی عام حرکات بھی ناز و ادا کے غلاف میں لپٹی دکھائی دیتی تھیں۔ کسی مرد کے خلاف اگر وہ میدانِ عمل میں کود پڑتی تو اس مرد کا بچنا ناممکنات میں سے ہوتا۔

مجھے بھی اس کی حرکات دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے خلاف وہ سرگرم عمل ہو گئی ہے۔ اگر وہ مجھے عام حالات میں ملی ہوتی تو اس سے دامن چھڑانا میرے لیے حقیقی معنوں میں کارِ دشوار ثابت ہوتا لیکن اس کی یا میری بدقسمتی کہ حالات ناموافق تھے۔ بقول شاعر:

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

ور میرے اندر خزاں کا موسم پھیلا ہوا تھا۔ حالات کی سنگینی اور گھر کی یاد نے مجھے ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب کیا ہوا تھا کہ صنفِ نازک کے لیے میرے لطیف جذبات پر اوس پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت شیتل کی خواہش تھی کہ میں اسے مناؤں لیکن میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں تھا کہ کسی عاشق کی طرح اس کی قدم بوسی کرتا رہوں۔

''زیادہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں سمجھیں۔''میں نے اسے بازو سے پکڑ کر صحن کی طرف دھکیلا۔

''کہہ جو دیا نہیں جانا۔''وہ اپنا ملائم بازو ایک جھٹکے سے میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

''جہنم میں جاؤ۔''میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا صحن میں کھڑی گاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔دونوں گاڑیوں میں مجھے سفر کرنے کے لیے شیتل کی کار مناسب معلوم ہوئی۔خنجر نکال کر میں نے جیپ کے دونوں اگلے ٹائر بیکار کر دیئے تا کہ اس میں بیٹھ کر کوئی ہمارا تعاقب نہ کر سکے،گو اس کا امکان نہیں تھا لیکن احتیاط کے طور پر میں نے ایسا کرنا ضروری سمجھا۔

حویلی کا داخلی دروازہ کھول کر میں نے باہر جھانکا،خلافِ توقع باہر مجھے چھدرے چھدرے درخت نظر آئے جو دور تک بتدریج گھنے ہوتے چلے گئے تھے۔عمارت کے نزدیک مجھے کوئی اور تعمیر نظر نہ آئی۔

''اس کا مطلب ہے ہم شہر سے کافی دور لائے گئے تھے۔''میں آہستہ سے بڑبڑایا اور واپس مڑ کر کار میں آبیٹھا۔وہ مجھ سے پہلے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھی،لیکن میں نے اس سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔میں اس کی ناراضگی کے سبب سے بھی واقف تھا اور اس کی خفگی دور کرنے کے فن سے بھی آشنا،مگر حالات اور میری دماغی پریشانیاں اس اضافی بوجھ کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔شیتل سے تعلقات بڑھانا اپنی منزل کھوٹی کرنے کے مترادف تھا۔اس لیے اس لا یعنی مسئلہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے میں نے گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

گیٹ سے باہر مجھے دو راستے مخالف سمتوں میں جاتے دکھائی دیئے۔جس وقت رگھو گروپ نے ہمیں اغوا کیا تھا اس وقت ہم دہلی شہر کے جنوب مشرقی سمت میں تھے اور میرا گمان تھا کہ ابھی ہم دہلی کے مضافات میں شہر سے مشرقی سمت میں موجود تھے۔دہلی شہر کی طرف واپس جانا اوکھلی میں سر دینے کے مترادف تھا۔یہ سوچتے ہوئے میں نے گاڑی کا رخ جنوب کی سمت موڑ دیا۔

شیتل آنکھیں بند کر کے سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اس طرح گویا گاڑی میں وہ بالکل اکیلی ہو میں نے بھی خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔راستا ناہموار اور ٹیڑھا میڑھا تھا۔نارمل رفتار سے چلتے ہوئے بھی مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔میرا ارادہ تھا کہ پختہ روڈ پر پہنچتے ہی کار مع شیتل کے چھوڑ دوں گا اب زیادہ دیر اس کو اپنے ساتھ لگائے رکھنا غیر مناسب تھا،لیکن تقدیر کی ہمیشہ ارادوں سے مخالفت رہی ہے بقول حضرت علیؓ۔''میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔''

ہمیں روانہ ہوئے بمشکل آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ کار یکدم بند ہو گئی۔میں نے سلف گھمایا لیکن کار''گھوں گھوں''کر کے خاموش ہو گئی اور میری دو تین مرتبہ کوشش کرنے پر بھی سٹارٹ نہ ہوئی۔

''کمانڈو صاحب!''شیتل جو جانے کس ٹائم سے آنکھیں کھولے میری کوششوں کو دیکھ رہی تھی طنزیہ لہجے میں بولی۔''فیول گیج کو دیکھنے کی زحمت فرمائیں گاڑی میں پٹرول ختم ہو چکا ہے۔''

''آپ اگر چند ٹکے خرچ کر کے ٹینکی فل رکھتیں تو آج ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔''

''میں نے تو منت کر کے مہاراج کو بلایا تھانا؟'' وہ تلخی سے بولی۔ ''ایک تو مفت اپنے ساتھ خوار کر دیا ہے اوپر سے طعنے سنو۔''

''مجھے اگر پتا ہوتا کہ اتنی کنجوس سیٹھ زادی سے واسطہ پڑے گا جو کار میں پٹرول ڈالنے کی زحمت ہی نہیں کرتی تو میں کبھی بھی تیری کار کے قریب نہ پھٹکتا۔''

''اونہہ...... کنجوس...... تُو بڑا دیالو ہے۔''

''اپنے سے بڑے کو تُو نہیں کہتے۔''

''میں کہوں گی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''اور تجھے میرا بڑا کس نے بنا دیا ہے۔''

''بدتمیز!...... تمھارے ساتھ سفر کرنا ہی گناہ ہے۔'' یہ کہہ کر میں کار سے نکلا اور زوردار جھٹکے سے دروازہ بند کر کے اسی ٹیڑھے میٹرھے راستے پر روانہ ہو گیا۔

''اے'' وہ بھی تیزی سے کار سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''بدتمیز کس کو کہا ہے۔ بدتمیز تُو خود ہو گا۔''

لیکن میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے پیچھے ہی آئے گی۔

''واہ......'' وہ دوڑ کر میرے قریب پہنچی اور میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''جب تک میرے پاس کار تھی اس وقت تک میرے ساتھ سفر کرنا پُن تھا جو کار کے خراب ہونے پر پاپ ہو گیا۔''

''ہاہاہا'' میں اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''ہی ہی ہی۔'' وہ منہ ٹیڑھا کر کے مجھے چڑاتے ہوئے بولی۔ ''زہر لگ رہی ہے مجھے تمھاری ہنسی۔''

جواباً میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میری اپنی ہنسی ہے، جس ٹائم میرا جی چاہے گا میں ہنسوں گا۔ اگر کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔''

''صحیح کہا کسی نے پاگلوں کے ہنسنے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا۔''

''اے!...... پاگل کسے کہا ہے۔''

''کسی کو بھی نہیں...... صرف پاگلوں کی نشانی بتلائی ہے۔''

''اچھا یہ بات ہے۔ ایک نشانی میں بھی بتلا دیتا ہوں۔''

''بتاؤ؟'' اس کے لہجے میں اشتیاق نمایاں تھا۔

''پاگلوں کا کوئی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس ٹائم کیا کر گزریں۔''

''ایگزیکٹ۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر تم ایگری ہو تو یہ لو میں تو گیا۔'' یہ کہہ کر میں نے راستے کو چھوڑ کر جنگل کی اندرونی سمت میں دوڑ لگا دی۔

''جان......جان......تم کہاں چلے۔'' وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

''پاگل کو کیا پتا؟ وہ کہاں جارہا ہے۔'' میں نے دوڑتے دوڑتے جواب دیا اور اپنی رفتار مزید بڑھا لی۔اس نے دوڑ کر میرے قریب پہنچنے کی کوشش کی لیکن فیشن ایبل چپل پہن کر وہ کہاں میرا مقابلہ کرسکتی تھی اس کے برعکس میرے پاؤں میں سپورٹس شوز تھے اور یوں بھی میری رفتار کافی تیز تھی۔

جلد ہی میں اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کی آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ایک گھنے سے درخت کا انتخاب کر کے میں اس کے اوپر چڑھ گیا اور ایک دوشاخے کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنی چڑھی ہوئی سانسیں بحال کرنے لگا۔

''تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اس کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''جان......پلیز......سوری......دوبارہ بدتمیزی نہیں کروں گی۔تم کہاں ہو۔جان مجھے ڈر لگ رہا ہے۔سامنے آجاؤ ورنہ میں رونے لگی ہوں۔'' اور میں دوشاخے سے ٹیک لگائے اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔نامعلوم کیوں اسے تنگ کرنے میں مجھے مزہ آرہا تھا۔حالانکہ مجھے پتا تھا کہ اس کا اور میرا ساتھ مزید چند گھنٹوں تک کا تھا۔اگر ہم دونوں چاہتے تب بھی ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ سعدیہ کے ساتھ بیوفائی کرنے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں میں اس طرح کی غیر ضروری حرکت کر بیٹھا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر ان فضول خیالات سے اپنا پیچھا چھڑایا اور بمبئی پہنچنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا بمبئی تک پہنچنا میرے لیے اتنا مشکل ہوگیا تھا نامعلوم وہاں پہنچ کر کون سے ہنگامے میرے منتظر تھے اور کن چیلنجز کا مجھے سامنا کرنا پڑتا۔

تھوڑی دیر بعد ہی شیتل مجھے نظر آگئی وہ اندازے سے صحیح سمت اختیار کیے ہوئے تھی جھاڑیوں کے اندر جھانکتی وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی گاہے گاہے وہ مجھے آواز بھی دے لیتی تھی۔جیسے ہی وہ اس درخت کے قریب سے گزری جس پر میں چھپا بیٹھا تھا میں نے بھیڑیے کی طرح غراہٹ نما آواز نکالی وہ خوف سے اچھل پڑی اور زور زور سے مجھے پکارنے لگی۔نیلم والا پستول اس نے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا اور فائر کھولنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر منہ سے غراہٹ کی آواز نکالی۔اس مرتبہ اس نے آواز کی سمت کا اندازہ لگا لیا اور جلدی سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا جہاں پر میں دانت نکالے بیٹھا تھا۔

''وحشی،جنگلی،گنوار'' وہ غصے سے تپ کر بولی۔''نیچے اترو ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔''

''پھر وہی بدتمیزی'' میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔''میں دوبارہ بھاگ جاؤں گا اور اس دفعہ تجھے ملوں گا بھی نہیں۔''

''تم ایک قدم تو لے کر دکھاؤ'' وہ پستول میری طرف تانتے ہوئے بولی۔

اور میں نے جواباً قہقہہ لگانے پر اکتفا کیا،لیکن اس مرتبہ مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے بس غصے سے گھورتی رہی میں نے اس سے نظریں ملانے سے گریز کیا کہ اس کی موٹی غلافی آنکھیں میرے حواس پر چھانے لگ جاتیں۔

''اچھا اب غصہ تھوکو اور چلو۔'' میں اس کے قریب پہنچتا ہوا بولا۔

''نہیں جانا مجھے تیرے ساتھ۔'' وہ جیسے غصے سے پھٹ پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پستول نیچے پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگ گئی۔

ایک مفکر کا قول ہے کہ ''عورت کا سب سے بڑا ہتھیار اس کے آنسو ہیں وہ مرد جو بڑے بڑے طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں ان چند آنسوؤں میں تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں۔''

میں بھی اس کے رونے سے گھبرا سا گیا تھا مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسے چپ کراؤں۔

''سوری شیتل'' میں ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ سوری رئیلی سوری دوبارہ ایسے نہیں ہوگا۔''

''کھاؤ قسم کہ دوبارہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔'' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ میں اس کی ذو معنی بات سن ٹپٹا گیا تھا۔

''کہا تو ہے دوبارہ ایسے نہیں ہوگا۔''

''نہیں تم قسم کھاؤ۔''

''پاگل مت بنو شیتل!'' میں نے اس کی کلائیوں سے پکڑ کر اس کے ہاتھوں کو اس کے چہرے سے دائیں بائیں کیا۔ ''مین روڈ پر پہنچتے ہی تیرے میرے راستے جدا ہونے والے ہیں۔''

''نہیں۔'' اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جب تک تم مجھے خیریت سے پتا جی کے پاس پہنچا نہیں دیتے تم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔''

''اچھا بابا...... تمھیں خیریت سے تیرے پتا جی کے حوالے کرنے کے بعد ہی جاؤں گا۔ اب تو چلو۔'' اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
کمبخت ایک تو حسین بلا کی تھی اوپر سے ناز و انداز ایسے کہ صد سالہ عابد کو بھی اپنا گرویدہ کر لے۔

میں نے نیچے جھک کر پستول اٹھاتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں منتقل کیا اور اندازے سے راستے کی طرف چل پڑا۔ سورج مغرب کی جانب زوال پذیر تھا ڈیڑھ دو گھنٹے میں شام کا اندھیرا چھا جاتا اور اس سے پہلے ہمیں کسی محفوظ ٹھکانے کے قریب پہنچنا تھا۔

''مسٹر میرا پستول واپس کرو۔'' وہ میرے ساتھ بمشکل قدم ملا کر چلتے ہوئے بولی۔

''یہ تمھارا کب سے ہو گیا۔''

''تم نے خود میرے حوالے کیا تھا اور دی ہوئی چیز واپس لینا تھوکا چاٹنے کے مترادف ہے۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے عارضی استعمال کے لیے تیرے حوالے کیا تھا اور دوسرے میں نے تجھ سے واپس نہیں لیا ہے تم نے خود پھینک دیا تھا۔''

''بس مجھے پتا نہیں ہے۔'' وہ ضدی پن سے بولی۔ ''تم پستول میرے حوالے کرو۔''

''یہ لو میری ماں۔'' میں نے بچ مچ زچ ہو کر پستول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس طرح تو میں نے نہیں لینا۔''

''تو اور کیا ٹرے میں رکھ کر پیش کروں۔'' میں غصے سے بولا۔

''نہیں تھوڑا پیار سے کہو نا؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو مس شیتل۔'' میں ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔'' میں شادی شدہ ہوں، ایک بچے کا باپ بھی ہوں اور اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنا کوئی بھی پسند کی شادی کرنے والا کر سکتا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولی لیکن اس کے لہجے میں اعتماد کی کمی تھی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور سر جھٹک کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ جلد ہی ہم دوبارہ اسی ٹیڑھے میڑھے اور ناہموار راستے پر آگئے۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد ہم کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں اور اس مقصد کے لیے میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز رکھی تھی۔ شیتل کو میرے ساتھ ملنے کے لیے دوڑنا پڑ رہا تھا۔ ہم آدھا گھنٹا ہی چلے ہوں گے کہ وہ رک گئی اور روہانسی ہو کر بولی۔

''میں تھک گئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے تم اپنی مرسڈیز میں آجانا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اے شادی شدہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمھیں لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز بھی نہ رہے۔'' مجھے نہ رکتا دیکھ کر وہ دوبارہ دوڑ کر میرے ساتھ ملتی ہوئی بولی۔

''احمق لڑکی سورج کو دیکھ رہی ہو۔'' میں نے غصے سے تپ کر کہا۔'' یہ گھنٹے ڈیڑھ میں غروب ہو جائے گا اور اس کے بعد اس جنگل میں سفر کرنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہو گا۔''

اس کے بعد اسے میری تیزی کی وجہ معلوم ہو گئی تھی اس لیے وہ میرے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ مجبوراً مجھے اپنی رفتار میں کمی کرنی پڑی۔

اچانک شیتل ٹھوکر کھا کر نیچے گر گئی میں نے جلدی سے جھک کر اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کرنا چاہا مگر وہ میرے ہاتھ میں جھول گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینہ چمکتا نظر آرہا تھا۔

''شیتل...... شیتل۔'' میں جلدی سے اس کا سر گود میں رکھ کر زمین پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''پپ...... پانی۔'' وہ جیسے نیند میں بڑبڑائی۔

میں نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا مگر پانی وہاں ہوتا تو نظر آتا۔ اس کا کملایا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ وہ ناز و نعم میں پلی سیٹھ زادی ایک پاکستانی گوریلے کے ساتھ قدم ملا کر کہاں چل سکتی تھی۔ مجھے اس کی رعایت رکھ کر چلنا چاہیے تھا۔ میں اپنی

سخت جانی کے زعم میں ایک کمزور لڑکی کو اذیت دینے کا باعث بنا تھا۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے...... مسلسل اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا ہوں۔'' میں نے خود کلامی کی۔

میں نے کچھ سوچ کر اسے کندھے پر اٹھایا اور چل پڑا سورج غروب ہونے والا تھا اور اس سے پہلے کہ بالکل اندھیرا چھا جاتا میں چاہتا تھا کہ کوئی محفوظ ٹھکانہ ڈھونڈ لوں۔

''مم...... میں ٹھیک ہوں۔'' میں چند قدم اسے اٹھا کر چلا ہوں گا کہ اس کی منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہاں بالکل۔آپ یہیں پہ ٹھیک ہیں۔'' میں مزاحیہ لہجے میں بولا گو وہ ایک صحت مند لڑکی تھی لیکن مجھے بالکل پھول کی طرح ہلکی پھلکی لگ رہی تھی۔یوں بھی آرمی کے اندر ٹریننگ کے دوران لاش اور زخمی کو اٹھانے کی تربیت دیتے ہیں اور اس طرح ایک آدمی اپنے وزن کے بقدر آدمی کو آسانی سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتا ہے۔وہ تو وزن میں مجھ سے بہت کم تھی۔میں تو امجد کو دوران تربیت اپنے کندھے پر اٹھا کر پھرا تا رہا تھا۔

''مجھے نیچے اتارو میں چل سکتی ہوں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر بولی۔

''آرام سے پڑی رہو۔'' میں مصنوعی غصے سے بولا۔''اگر تم چل سکتیں تو یوں نہ لیٹ جاتیں۔''

''تُو بہت تگڑا ہے نا؟'' وہ جل کر بولی۔''کمزور لڑکی سے مقابلہ کر کے اترا رہے ہو۔''

''تُو کمزور کہاں ہے...... اچھی خاصی دو فیکٹریوں کی وارث سیٹھ زادی ہے۔''

''تو آپ کو کیا تکلیف ہے میرے سیٹھ زادی ہونے میں۔''

''یوں ہی بس امراُ مجھے بہت برے لگتے ہیں۔''

''جلومت...... محنت کرو اور دولت کماؤ۔''

''میں باز آیا ایسی دولت سے...... اور اب نیچے بھی اترو تم نے تو پکی سواری گانٹھ لی ہے۔'' ایک گھنے درخت کو دیکھ کر میں اسے کندھے سے نیچے اتارتا ہوا بولا۔

''میں نے کب تمھاری منت کی تھی۔'' وہ بگڑ کر بولی۔''خود ہی شوق تھا ایک خوب صورت لڑکی کو کندھوں پر اٹھانے کا۔''

''یہ تجھے کس نے کہہ دیا کہ تُو خوب صورت ہے۔'' میں اس درخت کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''ساری دنیا کہتی ہے۔'' وہ میرے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے بولی۔

''اس دنیا میں کم از کم میں شامل نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر میں بوٹ اتارے بغیر اس مضبوط تنے والے درخت پر چڑھنے لگا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''دیکھتی جاؤ۔'' کہہ کر میں اوپر چڑھتا چلا گیا۔درخت کی نصف اونچائی پر پہنچ کر مجھے ایسی جگہ نظر آ گئی جو مچان بنانے کے لیے موزوں

تھی۔سنائپرکورس کے دوران میں یہ کام کر چکا تھا۔ قارئین کی معلومات کے لیے شاید یہ بات دلچسپی کا باعث بنے کہ سنائپر ایک چھوٹے سے تیز رفتار اور چست و چالاک پرندے کا نام ہے۔جو کبھی ٹک کر نہیں بیٹھتا اور اپنا سر تھوڑا سا زمین سے اٹھا کر پھر نیچے چھپ جاتا ہے۔ برطانیہ کی افواج میں جو شخص اس پرندے کو نشانہ بنالیتا اس کو بہت ماہر نشانہ باز گردانا جاتا اور کہا جاتا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے سنائپر کو نشانہ بنایا ہے۔آہستہ آہستہ اچھی نشانہ بازی کی تربیت لینے والوں کو سنائپر کہا جانے لگا اور پھر یہ فن رفتہ رفتہ ترقی کر کے اس نہج پر پہنچا کہ دشمن ملک کی اہم شخصیات کو نشانہ بنانے کے لیے اچھے نشانہ بازوں کو نشانہ بازی کے ساتھ کسی جگہ پر چھپ کر بیٹھنے کے لیے مختلف طریقے بھی سکھائے جانے لگے اس مقصد کے لیے درختوں پر مچان بنا کر بیٹھنا۔چھت یا ٹیکری پر مورچہ بنانا اور مورچہ بھی ایسا جو محسوس نہ ہو کہ مورچہ ہے۔اس طرح زمین میں گڑھا کھود کر چھپنا وغیرہ اس میں شامل تھے۔انڈین آرمی میں بھی سنائپرز کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے اور پاکستان آرمی بھی اس کام میں پیچھے نہیں۔

میں اور امجد دونوں اکٹھے یہ کورس کر چکے تھے۔کورس کے شروع میں تو مچان بنانے کے لیے ہم رسیاں استعمال کرتے رہے بعد میں ہمیں بغیر رسیوں کے بھی مچان بنانے کی تربیت دی گئی تھی۔

ایک سنائپر کو مچان میں دو تین دن بھی گزارنے پڑ جاتے ہیں اس وجہ سے مچان بناتے وقت سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مچان آرام دہ ہو اتنی مضبوط بنی ہو کہ اس میں بیٹھنے یا لیٹنے والا بندہ نیچے نہ گر جائے اور دور یا نزدیک سے کسی کو دکھائی بھی نہ دے۔

وہ درخت مچان بنانے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھا۔میں نے چھپاؤ سے زیادہ اس کی مضبوطی پر زور دیا۔اگلے پونے گھنٹے میں مَیں دو بندوں کے آرام کے لیٹنے کے لیے جگہ بنا چکا تھا۔رسیوں کی جگہ میں نے اسی درخت کی چھال استعمال کی تھی۔

اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا تھا اور سرِ شام چہچہانے والے پرندے خاموش ہوتے جا رہے تھے۔

”اوپر آجاؤ۔“ کام ختم کر کے میں نے شیتل کو آواز دی جو درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

”مجھے نہیں آتا درخت پر چڑھنا۔“ وہ لاتعلقی سے بولی۔

”تو پھر بیٹھی رہو۔“ میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔”میں تو سو رہا ہوں۔“

”اونہہ...... مطلبی...... خود غرض۔یہ نہیں کہ کسی کمزور کی مدد کرے۔مہاراج کو نیند آرہی ہے۔“

”ہاہاہا“ اس کے کوسنے دینے کے انداز پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

”ہنس لو...... ہنس لو۔“ وہ میری ہنسی سے چڑتے ہوئے بولی۔”بھگوان پوچھے گا۔“

”بڑی آئی ملانی۔“ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر نیچے اترتا ہوا بولا۔

”ملانی؟“ وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔”یہ ملانی کیا ہوتی ہے۔“

”مولوی کی بیوی۔“ میں نے وضاحت کی۔”ویسے آپ کی آسانی کے لیے میں پجارن کہہ لیتا ہوں۔“

''میں نے ایسی کون سی بات کرلی ہے کہ تم نے مجھے پجارن سمجھ لیا ہے۔''اس وقت تک میں اتنا نیچے اتر گیا تھا کہ بازو لمبا کر کے ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام سکتے تھے میں اس کی بات کا جواب گول کر گیا۔

''ہاتھ پکڑو''۔ میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور اس نے ایڑیاں اٹھاتے ہوئے اپنا ملائم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

''مضبوطی سے پکڑنا ہے۔ یہ نہ ہو درمیان میں چھوٹ جائے۔''وہ اپنے چپل ایک ہاتھ پکڑتے ہوئے ذومعنی لہجے میں بولی مگر میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ایک جھٹکے سے اسے اوپر کھینچا اور اگلے لمحے وہ درخت کے اوپر تھی۔

''یہاں سے آہستہ آہستہ اوپر چڑھا جاؤ۔'' میں نے کہا۔''ڈرنا نہیں میں تمھارے ساتھ ہی ہوں۔''اور وہ سر ہلاتے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف حرکت کرنے لگی۔

''واؤ۔''وہ حیرانی سے چلائی۔''یہ تو بہت ہی پیاری جگہ بن گئی ہے۔تم تو بڑے کاریگر ہو۔ جان میں تو تمھیں ایویں ہی سمجھتی تھی۔''

''ہاں......تُو تو گویا بچپن سے میرے ساتھ کھیلتی آئی ہو نا اور میری شخصیت سے مکمل واقف ہو۔''

وہ بے ساختگی سے بولی۔''مجھے تو یونہی محسوس ہو رہا ہے۔''

''کیسے؟''

''جیسے میں بچپن سے تمھارا ساتھ رہتی آرہی ہوں۔''

''فتور ہے تمھاری سوچ کا۔اگر یوں ہوتا تو میں کب کا پاگل ہو چکا ہوتا۔''

''وہ کیوں؟''وہ مستفسر ہوئی۔

''تمھاری باتیں سن کر شریف بندے نے پاگل ہی ہونا ہے۔''

''اگر تمھاری طرح چند اور شریف پیدا ہو گئے تو دنیا میں بدمعاشوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''اب اپنی کیں کیں بند کرو اور مجھے سونے دو۔''میں اس کے قریب لیٹتا ہوا بولا۔

''مجھے سخت بھوک اور پیاس لگی ہے۔''

''تو میں کیا کروں۔''میں بغیر آنکھیں کھولے بولا''تمھیں کہا تھا نا کہ کھانا کھالو......اب تمھیں پتا چلا ہوگا کہ میں نے کیوں ڈٹ کر کھانا کھایا تھا۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسی صورت حال پیش آئے گی۔''وہ روہانسی ہونے لگی۔

''تجھے کہا تو تھا کہ کھانا کھالو مگر تم ایک نوالہ لے کر سیٹھ زادیوں کی طرح پیچھے ہٹ گئی تھیں۔اب بھگتو۔''

''بھگوان کرے تجھے بھی بھوک لگے اور کھانے کو کچھ نہ ملے۔''

''میں الحمداللہ بھوک برداشت کر سکتا ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تیری طرح نہیں ہوں کہ ہلکی سی بھوک لگتے ہی چلانے لگوں۔''

''برداشت کر سکتا ہوں؟'' وہ مجھے چڑاتے ہوئے بولی۔ ''جب بھوک لگے گی نا پھر پوچھوں گی۔''

''اچھا اب اپنا منہ بند کرو اور مجھے سونے دو۔'' میں نے اسے جھڑکا اور غیر متوقع طور پر وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے اس سے مخالف سمت میں کروٹ بدلی اور تھوڑا سا مچان کے کنارے کی طرف کھسک کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اس کے بدن کی حدت سے میرے ذہن میں عجیب قسم کے خیالات پرورش پانے لگ گئے تھے۔ اس سے دور رہنے کا نسخہ کارگر رہا اور میں چند لمحوں میں ہی گہری نیند سو گیا۔ حالانکہ ان حالات اور اس ماحول میں کسی عام بندے کے لیے سونا تو کجا لیٹنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، لیکن میں پاکستانی کمانڈو تھا اور ہماری ٹریننگ اس نہج پر کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے ماحول میں ڈھل جانا ہمارے لیے آسان ہوتا ہے۔

ٹریننگ کے دوران کئی مواقع ایسے بھی آتے کہ ہمیں پتھریلی سنگلاخ زمیں پر سونا پڑتا یہ تو پھر بھی آرام دہ مچان تھی۔ میرے برعکس شیتل جاگتی رہی ایک تو مچان پر لیٹنے کا اس کا پہلا موقع تھا اور دوسرے بدقسمتی سے وہ صرف پینٹ شرٹ میں ملبوس تھی اور یہ لباس سردی روکنے کے لیے ناکافی تھا۔ یوں بھی سردیوں کی طویل رات بڑی مشکل سے گزرتی ہے لیکن جس وقت سردی سے بچنے کا انتظام بھی نہ ہو تو پھر تو سونے پر سہاگہ والی بات ہو جاتی ہے۔

رات کے نو دس بجے ہوں گے جب شیتل کے کپکپانے کی آواز سن کر میں جاگ گیا۔

''کیا ہوا۔'' میں نے کروٹ بدل کر اس سے پوچھا۔

''سس۔ سردی لگ رہی ہے۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''ادھر سے کوئی کوٹ یا سویٹر وغیرہ پہن لی ہوتی نا؟'' میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''تجھے پتا نہیں تھا کہ سردی کا موسم ہے۔''

''مم...... میں ...... جج...... جادوگرنی ہوں۔ آپ ہی بتا دیتے۔ مم...... میرا تو اس قسم کے حالات سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔''

''ہاہاہا۔'' اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔ ''اچھا یہ پہن لو۔'' میں اپنی چمڑے کی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آ...... آپ کیا پہنیں گے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''میں۔'' میں ایک لمحہ رک کر بولا۔ ''مجھے سردی نہیں لگتی۔'' اور اس نے جیکٹ مجھ سے لے کر پہن لی۔

جیکٹ اتارتے ہی مجھے سردی کا احساس ہوا لیکن یہ سردی جتنی زیادہ بھی ہوتی کارگل سے کئی گنا کم تھی۔ مجھ پر اس سردی کا صرف

اتنا اثر ہوتا تھا کہ میں سو نہیں سکتا تھا۔ درخت کی گھنی شاخوں نے بھی سردی کے خلاف اچھی خاصی آڑ مہیا کی ہوئی تھی۔

ہم دونوں کے درمیان تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی اور پھر اس خاموشی کو شیتل ہی نے توڑا۔

''جان......ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''آپ نے شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ یا......والدین کی مرضی سے؟'' جیکٹ لینے کے بعد قدرتی طور پر وہ مجھے تم سے آپ پکارنے لگی تھی۔

''پسند سے کی تھی۔'' میں مختصراً بولا۔ ''ویسے والدین کی بھی یہی مرضی تھی۔''

''رشتہ دار ہے؟''

''ہاں...... چچا کی بیٹی ہے۔''

''کیا......وہ بہت زیادہ خوب صورت ہے۔'' شیتل عجیب مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔

''پتا نہیں......لیکن بات تو پسند کی ہوتی ہے نا...... مجھے وہ دنیا کی ہر عورت سے پیاری اور خوب صورت لگتی ہے۔''

''بہت خوش قسمت ہے۔'' شیتل رشک بھرے لہجے میں بولی۔

''یہ بھی پتا نہیں کہ خوش قسمت میں ہوں یا وہ۔''

''ہاں...... صحیح کہہ رہے ہو......اپنے اپنے نقطہ نظر کی بات ہے۔''

میں جواباً خاموش رہا۔ شیتل نے بے خبری میں میری سوچوں کے دھارے کو میرے پیاروں کی جانب موڑ دیا تھا۔ سعدیہ کی من موہنی صورت میرے تصور میں در آئی۔ شیتل بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھی۔ اس جیسی لڑکی اس سے پہلے میری نظروں سے نہیں گزری تھی، لیکن اس کے لیے میرے دل میں سوائے ہمدردی کے اور کوئی احساس نہیں جاگا تھا۔ وقتی فلرٹ کا میں یوں بھی قائل نہیں تھا۔ عورت ہمیشہ ہر روپ میں میری لیے قابل احترام رہی ہے اور اس میں میری خاندانی شرافت کے ساتھ ساتھ گنڈہ پوروں کی ازلی خو بھی شامل تھی۔ گنڈہ پور قوم اپنے دشمن کے لیے جتنی تندخو اور خونخوار ہے اتنی ہی دشمن کی عورتوں کے لیے نرم خو اور رحمدل۔ کوئی گنڈہ پور کبھی بھی دشمن کی عورت پر ہاتھ اٹھانا گوارا نہیں کرتا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ غلط فہمی میں کوئی عورت ماری جائے۔

شیتل اگر سعدیہ سے پہلے میری زندگی میں آئی ہوئی تو شاید میں اس کے سحر انگیز حسن سے نہ بچ پاتا، لیکن اب اس کی یا میری بدقسمتی کہ میں پہلے سے ہی کسی کی زلف کا اسیر تھا۔

''چپ کیوں ہو گئے ہو؟'' مجھے خاموش پا کر وہ مستفسر ہوئی۔

''آں......ہاں...... کچھ نہیں۔'' میں گڑبڑا سا گیا۔

''داسی عرض کر رہی ہے کہ چپ کیوں ہو گئے ہو۔'' وہ مجھے گڑبڑاتے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

''مجھے کوئی یاد آ گیا تھا۔''

''کون بھلا؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''ماں، باپ، بیوی، بیٹا......کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔''

''جان مجھے اپنے گھر والوں کے بارے کچھ بتاؤ ناں......اپنے گاؤں......اپنے شہر اور خاص کر اپنے بارے۔'' وہ اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔

اور میں بے ساختہ اسے اپنے اور سعدیہ کے بارے بتانے لگا۔ اس کے ساتھ گزرے لحات، پھر اپنے عدنان کی باتیں امی ابو اور بھائیوں کی باتیں۔ چودھری انور علی اور اس کے بیٹوں سے لڑائی کی وجوہات، فوج میں بھرتی اور ٹریننگ کے قصے اور آخر میں اپنے بھگوڑا ہونے کی وجوہات اور راستے کی مشکلات یہاں تک کہ اپنی بات میں نے شیتل کی ملاقات پر ختم کی۔ انڈیا وارد ہونے کے بعد شیتل واحد ہستی تھی جس سے میں نے اپنے تمام حالات بشمول گھریلو پریشانیوں کے بیان کیے تھے۔

وہ سحر زدہ سی لیٹی میری باتوں کو غور سے سنتی رہی۔ درمیان میں اس نے مجھے کسی جگہ پر ٹوکنے کی کوشش نہ کی۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ بولی۔

''جان، تم نے تو حقیقتاً ہنگاموں سے لبریز جیون گزارا ہے۔ تیرے مقابلے میں میری کہانی تو بہت مختصر ہے۔ میں منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی۔ پیدائش کے چند سال بعد ہی ماتا پرلوک سدھاریں پتا جی نے اس کے بعد دوسری شادی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کالج یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم کافی لڑکوں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی مگر میرے رویے سے ان کو منہ کی کھانی پڑی۔ انیل بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس کے علاوہ میری زندگی میں کوئی ایسے اتار چڑھاؤ نہیں آئے جن کی بابت میں آپ کو کچھ بتلا سکوں۔''

''ہاں سیٹھوں کی زندگی میں کیا نشیب و فراز ہوں گے۔'' میں آہستہ سے بولا۔ ''ان کی زندگی میں تو صرف فراز ہی فراز ہوتے ہیں۔''

''تجھے سیٹھوں سے بڑی نفرت ہے۔''

''نہیں!'' میں انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو میں نے حقیقت بیان کی ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس فضول بحث کو کوئی اور بات کرو۔''

''اپنے متعلق سب کچھ تو بتا چکا ہوں اور کیا بات کروں۔''

''یہ باتیں تو سب کو پتا ہوں گی۔ مجھے تو آپ اپنی زندگی کے خفیہ گوشوں کے متعلق بتائیں خصوصاً اپنے معاشقوں کے متعلق۔''

''ہونہہ معاشقے۔ میرا دامن ان خرافات سے پاک ہے بے بی...... میں نے صرف سعدیہ کے ساتھ محبت کی ہے۔ وہ میرے

بچپن سے لے کر اب تک کی پسند ہے۔''

''میں کیسے لگتی ہوں؟'' وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی، لیکن اس کی شرارتی مسکراہٹ میں پنہاں سنجیدگی مجھ سے نہ چھپ سکی۔

اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب موجود نہیں تھا، لیکن اسے ٹالنے کی خاطر میں بولا۔

''شیتل...... میری ایک بات یاد رکھنا۔ اچھا یا برا لگنے کا دارومدار ہمیشہ خوب صورتی یا بدصورتی پر منحصر نہیں۔ اسی طرح کسی سے محبت ہو جانے میں بھی صورت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ لیلیٰ کے متعلق تُو نے پڑھا ہوگا کہ وہ عام شکل کی کالی رنگت کی لڑکی تھی لیکن مجنوں کے نزدیک وہ پوری دنیا سے پیاری اور دلکش تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت ایک غیر اختیاری جذبہ ہے۔ وہ کسی کے لیے بھی، کسی کے دل میں، کسی بھی وقت پیدا ہو سکتا ہے، لیکن اس میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو وقتی پسندیدگی کو محبت کا نام دے دیتے ہیں اور بعد میں ساری زندگی اپنی جلد بازی پر پچھتاتے رہتے ہیں۔ میرے اپنے مشاہدے میں کئی ایسے جوڑے موجود ہیں جنھوں نے اپنے گھر اور خاندان والوں کی مخالفت مول لے کر شادی کی لیکن چند مہینے بھی اکٹھے نہ رہ سکے اور ایک دوسرے سے اکتا کر انھوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔''

''میں بھاشن سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔'' میری بات ختم ہوتے ہی وہ منہ بنا کر بولی۔ ''مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔''

''زندگی کی پُر پیچ راہوں پر ملنے والے اس اجنبی کی طرح جس نے اگلے دوراہے پر آپ سے جدا ہو جانا ہو۔'' میں تلخ حقیقت بیان کرتے ہوئے بولا۔

جواباً وہ خاموش رہی۔ شاید اس کو اپنے گمان کے خلاف سننے کو ملی تھی، لیکن میں اسے خوش کرنے کے لیے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق رات کے تین یا چار بج رہے تھے۔ یہ اندازہ میں نے ستاروں کو دیکھ کر لگایا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہمیں مشہور ستاروں اور جھمکوں سے روشناس کرایا گیا تھا۔ جس کی بدولت سمت کا برقرار رکھنا اور ٹائم کا اندازہ لگانا میرے لیے آسان ہو گیا تھا۔

ستارہ شناسی یا علم فلکیات ایک بہت بڑا علم ہے۔ ماہرین فلکیات تو آسمان پر موجود ایک ایک ستارے سے واقف ہوتے ہیں، لیکن اگر ایک عام آدمی بھی کوشش کرے تو ستاروں کے متعلق اتنا علم آسانی سے حاصل کر سکتا ہے جس سے سمت کی پہچان یا ٹائم کا اندازہ کر سکے۔

زمین کی محوری گردش کی وجہ سے ستارے ہمیں حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ ستارے بھی مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتے ہیں اور جو ستارے سر شام مشرقی افق پر نظر آئیں رات کے تین چار بجے وہ مغربی افق کے نزدیک ڈوبتے نظر آتے ہیں۔ اس وقت بھی میں نے ''اورین'' (Orion) نامی جھمکے اور آسمانی دنیا کے سب سے روشن ستارے ''سائرس'' (Sirius) کے ذریعے ٹائم کا اندازہ لگایا تھا۔ جو اس وقت جنوب مغرب میں غروب ہونے کو تھے۔

سردی اپنے جوبن پر تھی۔ جنگلی جانوروں کی آوازوں کا ملا جلا شور میری سماعتوں میں گونج رہا تھا۔ سب سے زیادہ شور گیدڑوں نے مچایا ہوا تھا۔ جو ایک کورس کی صورت میں اپنی بھیانک آواز میں ''ہکو ہو'' چلا رہے تھے۔

میں نے سونے کی کوشش کی جو ناکام رہی اور میرا ذہن مستقبل کے متعلق لائحہ عمل طے کرنے میں مصروف ہو گیا اور باقی کا ٹائم میں اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ شیتل ہلکی غنودگی میں تھی۔ میری جیکٹ پہن کر وہ کافی حد تک سردی سے بچ گئی تھی۔ میں بغیر شور کیے آہستہ سے نیچے اترا اور اسی درخت کے ساتھ ہلکے ہلکے دوڑ کر اپنے جسم کو گرم کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے شیتل کی آواز سنائی دی وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آنکھ غالباً پرندوں کی چہچہاہٹ سے کھلی تھی۔

''مسٹر جان تم کہاں ہو؟''

''یہیں پر ہوں......تم بھی نیچے آ جاؤ تا کہ چلیں۔''

''میں گر جاؤں گی۔''

''میں نیچے ہی ہوں کیچ کرلوں گا۔'' میں مزاحیہ انداز میں بولا۔

''نہیں تم اوپر آ جاؤ۔'' وہ ہٹ دھری سے بولی، مجبوراً مجھے دوبارہ اوپر چڑھنا پڑا۔

میرا سہارا پا کر اس نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ نیچے اتر آئی۔

''چلیں؟'' اس کے نیچے اترتے ہی میں نے اس سے پوچھا۔

''کہاں؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''کہاں کیا مطلب......کیا تمھارا ارادہ یہیں اپنی زندگی گزارنے کا ہے۔''

''ہاں......'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میرا من تو چاہ رہا ہے کہ اپنا تمام جیون یہیں بتا دوں۔''

''ٹھیک ہے تم یہیں رہو......میں تو چلا۔'' یہ کہتے ہی میں نے اپنی مطلوبہ سمت قدم بڑھائے۔

''واہ......میں یہ کب کہہ رہی تھی کہ میں یہاں اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے بولی۔

''تو ٹھیک ہے نا جس کے ساتھ رہنا ہے اسے بلا لو۔'' میں نے درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے کہا۔

''یہی تو دکھ ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''کہ وہ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی انجان بنتا ہے۔''

''شیتل......تمھارے اندازے کے مطابق ہم کس جگہ پر ہیں۔'' میں اس کی باتوں سے انجان بنتے ہوئے بولا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی......میں دہلی سے بہت کم باہر نکلی ہوں۔''

ہم تھوڑا سا آگے گئے ہوں گے کہ ایک جھاڑی کے نیچے مجھے خرگوش بیٹھا نظر آیا۔

''شش......'' میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شیتل کو خاموش کرایا اور کوٹ کی جیب سے چھوٹا پستول نکال کر نشانہ لیتے ہوئے خرگوش پر فائر داغ دیا۔ خرگوش اچھل کر اپنی جگہ پر گرا اور پھڑکنے لگا۔ میں نے جلدی سے پنڈلی کے ساتھ باندھا ہوا خنجر نکالا اور بھاگ کر خوگوش کے

نزدیک پہنچا اور اس سے پہلے کہ اس کی سانسیں پوری ہوتیں اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ یہ کام میں کلاشن کوف یا بریٹا پستول کے ذریعے بھی کر سکتا تھا۔ مگر اس کا نقصان یہ ہوتا کہ فائر کی آواز دور تک سنائی دیتی۔ اس کے برعکس نیلم کے پستول کے فائر کی آواز بہت ہلکی تھی۔

اگلے چند منٹ میں میں اس کی کھال اتار رہا تھا۔ شیتل پہلے تو حیرانی سے مجھے یہ سب کچھ کرتا دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتی میرے قریب آ کر بولی۔

''کیا کر رہے ہو؟ اور اس معصوم کو کیوں ہلاک کر دیا ہے۔''

''تم دیکھتی جاؤ۔'' میں نے خرگوش کا گوشت الائشوں سے پاک کر کے ایک نزدیکی جھاڑی پر رکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر اپنے دائیں بائیں موجود خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے لگا جلد ہی سوکھی لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا انبار اکٹھا کر کے میں نے لائیٹر سے آگ سلگائی اور خرگوش کو لمبے پھل والے خنجر میں پرو کر آگ پر بھوننے لگا۔ یہ لائیٹر مجھے ان کے باورچی کی جیب سے ملا تھا۔ جو مفید خیال کرتے ہوئے میں نے رکھ لیا تھا۔

''یہ آپ کھائیں گے کیا؟'' وہ آگ پر ہاتھ تاپتے ہوئے بولی۔

''تو اور کیا۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔''

میں گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو اپنے اندر سموتا ہوا بولا۔

''میں نے تو یہ نہیں کھانا۔'' وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولی۔''چاہے میں بھوک سے مر ہی کیوں نا جاؤں۔''

''تو منت کس نے کی ہے؟'' میں خرگوش کو آگ پر الٹ پلٹ کرتے ہوئے بولا۔ جلد ہی خرگوش بھن کر تیار ہو گیا۔

''آ جاؤ۔'' میں نے خرگوش کی بھنی ہوئی ران سے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔''ورنہ بعد میں پچھتاتی رہو گی۔ تُو نے کل سے کچھ نہیں کھایا اور ابھی پتا نہیں مزید کب تک کھانے کیلئے کچھ نہ ملے۔''

''نہیں؟'' وہ سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے بولی۔''میں نے اپنے جیون میں کبھی بھی یہ نہیں کھایا ہے۔ ہمارے دھرم میں ماس (گوشت) کھانا منع ہے۔''

''اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو دھرم کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنا پڑے گا۔ ویسے بھی ماس خوری سے منع کرنے والے آپ کے بڑے بڑے پجاری خود چھپ کر اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔''

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔''مم...... مگر...... کہیں اسے کھا کر مجھے کچھ ہو نہ جائے۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' اس کے انکار میں دراڑ پڑتی دیکھ کر میں نے بھنی ہوئی ران اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔''یہ کھا کر دیکھو اگر اچھی نہ لگے تو نہ کھانا۔''

''نن...... نہیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر کمزور سا احتجاج کیا۔

’’تم کھا کر تو دیکھو۔‘‘ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ اور اس مرتبہ اس نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بھنی ہوئی ران میرے ہاتھ سے لے لی اور آہستہ آہستہ اسے منہ کے قریب لے جا کر اپنے اگلے دانتوں سے چھوٹی سی بوٹی لے کر کراہت آمیز انداز میں اسے چبانے لگی۔

بھنے ہوئے گوشت کے لذیذ ذائقے نے زیادہ دیر تک اس کا یہ انداز برقرار نہ رہنے دیا۔ جلد ہی وہ پُرشوق انداز میں ران کو جُت گئی اور تھوڑی ہی دیر میں ران کو صاف کر کے مزید گوشت کی طلب میں میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے بھی اسے شرمندہ کیے بغیر گوشت کا ایک اور ٹکڑا اس کی جانب بڑھا کر کہا۔ ’’مزیدار ہے نا؟ لو یہ بھی کھاؤ۔‘‘

اور اس نے اثبات میں سر ہلا کر وہ ٹکڑا بھی پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم پورا خرگوش چٹ کر گئے تھے۔

میں نے زیادہ تر گوشت شیتل کو کھلانے پر اکتفا کیا کیونکہ وہ کل سے بھوکی تھی اور اس کے بعد بھی نا معلوم کب کوئی چیز کھانے کو ملتی۔

’’چلیں۔‘‘ میں خنجر کو صاف کر کے اپنی جگہ پر رکھتا ہوا بولا۔

’’چلو۔‘‘ وہ میرے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ’’اب پانی ڈھونڈتے ہیں۔‘‘

’’وہ بھی مل جائے گا۔‘‘ میں نے ایک متعین سمت میں قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’اتنے زرخیز جنگل میں کوئی ندی تالاب یا نالا وغیرہ ضرور ہوگا۔‘‘

فرلانگ بھر چلنے کے بعد میری بات کی تصدیق ہو گئی جب ہم اچانک درختوں کے جھنڈ سے ایک بہتی ندی پر جا نکلے۔ ندی کا پانی نہایت ہی شفاف تھا، لیکن مقدار میں بہت کم تھا البتہ گرمیوں میں یہ ندی ضرور اپنے جوبن پر ہوتی ہو گی۔ ہم نے اپنے ہاتھوں کا اوک بنا کر وہ ٹھنڈا میٹھا پانی پیا۔

’’الحمدللہ۔‘‘ خوب جی بھر کے پانی پی کر میں نے پُرزور آواز میں اپنے مالک کا شکر ادا کیا۔

سردیوں کا سورج پُرلطف تمازت کے ساتھ اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا، ہم دونوں ندی کے بہاؤ کے رخ چل پڑے۔ شیتل کی وجہ سے میں نے اپنی رفتار آہستہ رکھی تھی۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی شیتل نے یہ کہہ کر جیکٹ اتار کر میرے حوالے کر دی کہ ’’اس کو پہن کر مجھ سے چلا نہیں جاتا۔‘‘

میں نے بھی جیکٹ اس کے ہاتھ سے لے کر بغیر کوئی بات کیے پہن لی۔ جنگل کافی گھنا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ندی کے کنارے ہمیں کوئی آبادی ضرور مل جاتی۔ اچانک جنگل فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔

میں نے شیتل کو بازو سے پکڑا اور جلدی سے ایک جھاڑی کی آڑ میں دبک گیا۔ جیکٹ کے نیچے لٹکتی کلاشن کوف چند سیکنڈ میں میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی۔

’’یہ...... یہ کون ہے۔‘‘ شیتل ہکلاتے ہوئے بولی۔

’’شش‘‘ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں ہمیں با آسانی سنائی دے رہی تھیں۔ اسی لمحے ایک پیدل بھاگتا ہوا شخص درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوا۔ اس کا رخ ہماری جانب ہی تھا۔ مگر ہمارے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ ایک جھاڑی سے الجھ کر گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کے دھونکنی کی طرح چلتے سانس کی آواز ہم دونوں آسانی سے سن رہے تھے۔ چند لمحے بعد ہی گھڑ سوار اسی راستے پر نمودار ہوئے۔ وہ تعداد میں چھ تھے اور تمام کے تمام ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ وہ شخص چونکہ راستے میں گرا تھا اس لیے ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہو سکا اور تمام اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ ہماری سمت موجود سوار اتنا نزدیک تھا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اس کے گھوڑے کو چھو سکتا تھا، لیکن تمام کی نظریں چونکہ گرے ہوئے شخص پر مرکوز تھیں اس لیے ہم ان سے چھپے رہ گئے۔

میں نے شیتل کو اشارے سے بتایا کہ وہ اس جھاڑی سے ملحقہ جھاڑی کی طرف کھسکے تاکہ ہم ان سے دور ہو سکیں۔ پرائے پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑانا ویسے ہی مجھے پسند نہیں تھا۔

شیتل میرا اشارہ سمجھ گئی اور سر ہلاتے ہوئے اپنی جگہ سے رینگنے کے انداز میں دوسری جھاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔

''تجھے کہا تھا ناٹھاکر رنجیت سنگھ۔'' مجھے ایک گھڑ سوار کی گرجدار آواز سنائی دی۔ ''کہ تُو بلونت سے نہیں بچ سکتا۔ دیکھ لے آج تُو میرے چرنوں میں پڑا ہے۔''

مگر گرے ہوئے شخص نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اپنا سر دونوں بازوؤں کے درمیان زمین پر ٹیکے پڑا رہا۔

بولنے والا چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور اکڑ کر چلتا ہوا نیچے گرے ہوئے شخص کے قریب پہنچا۔ دوسرے لمحے فٹ بال کو کک مارنے کے انداز میں دو ٹھوکریں اس شخص کو رسید کیں اور چیختا ہوا بولا۔

''اٹھ جا ٹھاکر اور بلا اپنی پلس نوں (پولیس کو) میں دیکھتا ہوں تجھے کتے کی موت مرنے سے کون بچاتا ہے۔''

ٹھوکریں کھا کر گرا ہوا شخص جسے گھڑ سوار ٹھاکر رنجیت سنگھ کہہ کر پکار رہا تھا تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی سانسیں ابھی تک ہموار نہیں ہوئی تھیں شاید وہ بہت دور سے دوڑتا ہوا آیا تھا۔ وہ ڈھلتی ہوئی عمر کا ایک کمزور سا شخص تھا اس کے چہرے پر مجھے عجیب قسم کی لاچاری اور بے بسی نظر آئی۔ نامعلوم وہ کس قسم کا ٹھاکر تھا اس کے لباس اور انداز ہر دو طرف سے وہ عام سا شخص نظر آتا۔ شاید اپنے سادہ لباس کی وجہ سے وہ مجھے ایسے دکھائی دے رہا تھا۔

''بلونت......'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ''ایک کمزور نہتے آدمی کو مار کر تُو صرف اپنے پاپوں میں ہی اضافہ کرے گا اور جہاں تک تیرے غصے کا تعلق ہے میں اب بھی واہ گرو کی سوں کھا کر کہتا ہوں کہ رام پورہ کا بچہ بچہ تیرے خلاف گواہی دے گا۔ تُو ہتھیارا ہے تُو پاپی......'' اور بلونت کی ٹھوکر کھا کر بغیر اپنی بات پوری کیے وہ پیچھے کی طرف گر پڑا۔

''میں نے بھی پورے رام پورہ کو آگ نہ لگا دی تو میرا نام بھی بلونت نہیں۔''

''یہ تیری بھول ہے بلونت!'' ٹھاکر رنجیت سنگھ کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ ''تُو صرف نہتوں اور کمزوروں پر ہاتھ اٹھانا مردانگی سمجھتا ہے۔ پرائی بیٹیوں کو رسوا کرنے کو بہادری سمجھتا ہے۔ تُو مان یا نہ مان میرے نزدیک تُو صرف ہیجڑہ ہے ہیجڑہ۔''

ٹھاکر کی بات سن کر بلونت نے غصے سے پاگل ہو کر ٹھاکر پر ٹھوکروں کی بارش برسا دی۔

''تُو بھونکتا ہے کتے۔'' وہ اسے مارنے کے ساتھ ساتھ زور زور سے کہے جا رہا تھا۔ ''جا کسی مائی کے لعل کو پکڑ کر لے آ جو بلونت کا مقابلہ خالی ہاتھ سے کر سکے۔ جا لے آ کسی سور ما کو۔'' ٹھاکر کوشش کے باوجود اس کی ٹھوکروں سے بچ نہیں پا رہا تھا۔

شیتل کھسکتی ہوئی مجھ سے پندرہ بیس گز دور پہنچ گئی تھی اور اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی، لیکن میرا ذہن اس وقت کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ بلونت کے للکارے اور ٹھاکر کی سسکیاں میرے پاؤں کی بیڑیاں بن گئی تھیں۔ غصے کی شدت سے میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ بلونت اور ٹھاکر کا مکمل معاملہ تو میری سمجھ میں نہ آ سکا تھا لیکن اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ ٹھاکر مظلوم اور حق پر تھا اس کے برعکس بلونت بدی کا نمائندہ تھا۔ بلونت اور اس کے تمام ساتھیوں کے ہاتھوں میں پرانے زمانے کی سنگل شاٹ رائفلیں تھیں جو ہر فائر کے لیے کاک کرنی پڑتی تھیں جبکہ میں ایک جدید کلاشن کوف سے مسلح تھا۔ اس کے باوجود ان کو للکار کر ان کے سامنے جانے میں مجھے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

اگر میں بے خبری میں ان پر فائر کھولتا تو مشکل تھا کہ ان سے کوئی بچ پاتا وہ تمام اس وقت ٹھاکر رنجیت سنگھ کے تڑپنے کے پُرلطف منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے شیتل کو اشارے سے زمین پر لیٹ جانے کو کہا اور دوسرے لمحے کلاشن کوف کو برسٹ پر سیٹ کر کے میں نے گھوڑوں پر بیٹھے ڈاکوؤں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ میں نے ٹریگر کو پریس کر کے گن اس سرعت سے گھمائی کہ پانچوں گھڑ سوار مری ہوئی چھپکلیوں کی مانند زمین پر آ گرے۔ ان کے گھوڑے بدک کر دوڑ پڑے بلونت سنگھ اس ناگہانی افتاد سے ششدر کھڑا رہ گیا تھا۔

کلاشن کوف کی میگزین خالی ہوتے ہی میں نے اسے نیچے پھینکا کہ نئی میگزین لگانے کا ٹائم نہیں تھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جلدی سے بریٹا پستول نکال لیا۔

بلونت نے بھی ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر رائفل سیدھی کرنی چاہی مگر اس وقت تک میرے ہاتھ میں موجود بریٹا فائر کر چکا تھا اور جس کے نتیجے میں بلونت کو اپنی رائفل سے محروم ہونا پڑا۔

''بلونت اپنے ہاتھ اٹھا لو۔'' میں کرخت لہجے میں بولا۔

''تت......تم...... تمھیں بہت مہنگا پڑے گا۔ بلونت سے ٹکر لینا۔''

''میں تم سے ٹکر تو نہیں لے رہا۔'' میں استہزائی انداز میں بولا۔ ''تجھے جہنم واصل کر رہا ہوں۔''

''پچھتاؤ گے۔'' وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''میں کہہ رہا ہوں پچھتاؤ گے۔''

مگر میں اس کی بکواس کو نظر انداز کر کے قدم بہ قدم چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے قدموں میں پڑا ٹھاکر اپنا زخمی بدن سمیٹ کر ایک سائیڈ پر ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی تھی بس حیرانی سے مجھے تکے جا رہا تھا۔

''بلونت تُو واقعی ہیجڑہ ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں سرد لہجے میں بولا۔ ''اگر تجھ میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو اپنے والد کی عمر کے کمزور اور بے بس آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاتا۔''

''پستول ہاتھ میں لے کر تُو اپنے آپ کو بڑا سورما سمجھ رہا ہے۔'' بلونت نفرت سے زمین پر تھوکتا ہوا بولا۔ ''اس کھلونے کو سائیڈ پر کرو پھر میں بتاتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔''

''خالی ہاتھ تو بہر حال تُو بھی نہیں تھا۔'' میں اطمینان سے بولا۔ ''یہ تو میرا کمال ہے کہ تیرے گرگوں کو جہنم واصل کر کے تجھے بھی نہتا کر دیا، لیکن تیری خالی ہاتھ لڑنے کی خواہش میں ضروری پوری کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے پستول دور اچھال دیا۔

پستول کا میرے ہاتھ سے نکلنا اور بلونت کا دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھنا اکٹھے وقوع پذیر ہوئے۔ اس کا انداز بالکل پہلوانوں کی مانند تھا۔ وہ اس طرح میری جانب بڑھا جیسے مجھے کسی بھی طرف نکلنے نہیں دے گا اور اسی جگہ گھیر کر پکڑ لے گا۔ مگر میں اطمنان سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ جیسے ہی وہ میرے نزدیک ہوا میں اپنے دائیں پاؤں پر گھوما اور بائیں پاؤں کی ایڑی پوری قوت سے اس کے منہ پر دے ماری۔ وہ بے ساختہ کولہوں کے بل زمین پر جا گرا اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور سامنے والے دو تین دانت زمین پر آپڑے۔ وہ خون تھوکتا ہوا ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کا الاؤ سلگ رہا تھا۔

''بلونت تم رک کیوں گئے۔'' اسے آگے بڑھتا نہ دیکھ کر میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بس اتنی ہی جرأت تھی۔''

''تیری تو......'' وہ غصے سے بکتا جھکتا دوبارہ میری طرف بڑھا اس دفعہ میں نے اسے بالکل قریب آنے دیا اور جیسے ہی اس کا جسم میرے بدن سے متصادم ہونے لگا میں یکدم نیچے بیٹھا۔ دوسرے لمحے وہ میرے ہاتھوں پر اٹھتا چلا گیا۔ سیدھا کھڑے ہوتے ہی میں نے اسے ایک طرف اچھال دیا۔ میرا قد چھ فٹ دو انچ کے قریب تھا اور پھر دو فٹ بازوؤں کی لمبائی تھی۔ آٹھ فٹ کی بلندی سے جب وہ پہلو کے بل گرا تو بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کی دائیں ٹانگ شاید بری طرح مجروح ہوئی تھی کیونکہ وہ مسلسل کراہ رہا تھا اور اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش اس نے نہیں کی تھی۔

''اٹھو بلونت۔'' میں اس کی مجروح ٹانگ پر ٹھوکر لگاتے ہوئے غرایا۔ ''میں خالی ہاتھ ہوں۔''

میری ٹھوکر پر اس کے منہ سے دردبھری کراہ خارج ہوئی اور وہ چلایا۔ ''مت مارو۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے نیچے جھک کر اسے گریبان سے پکڑا اور کھینچ کر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''کمینے اب تجھے بھگوان یاد آیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تجھے اس کی یاد نہ آئی۔'' یہ کہتے ہی میں نے اسے ٹھاکر رنجیت سنگھ کی سمت پھینک دیا۔

''ہائے رام!'' وہ نیچے گرتے ہی چلایا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا اور اپنی مجروح ٹانگ کو پکڑے وہ مسلسل کانپ رہا تھا۔

''ٹھاکر مجھے اپنے واہ گرو کے لیے معاف کر دے۔'' مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے اپنی ٹانگ چھوڑ کر رنجیت سنگھ کے

پاؤں پکڑ لیے۔ ”مم...... میں دوبارہ رام پورہ کا رخ نہیں کروں گا بھگوان کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں دوبارہ غلط حرکت نہیں کروں گا۔“

”بب...... بیٹا اسے چھوڑ دے۔“ اس کی فریاد سے رنجیت سنگھ پسیج گیا اور ملتجی لہجے میں مجھے بولا۔ ”کافی سزا مل گئی اس پاپی کو۔ آئندہ اگر شرم ہوئی تو پاپ کا راستا کبھی بھی اختیار نہیں کرے گا۔“

”شرم اس میں کہاں ہے ٹھاکر جی۔“ میں پاؤں کے بل بلونت کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔ ”موقع ملتے ہی دوبارہ یہ اسی طرح کرے گا اس لیے اس کا نہ ہونا۔ ہونے سے بہتر ہے۔“ یہ کہتے ہی میں نے ایک ہاتھ بلونت کے سر پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی پر رکھتے، ہوئے مخصوص جھٹکا دیا اور ”کٹاک“ کی آواز سے اس کی گردن ٹوٹ کر ایک طرف کو مڑ گئی اور وہ بے اختیار ہاتھ پاؤں جھٹک کر ہر قسم کی تکلیف سے بے نیاز ہو گیا۔

میں ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جھک کر میں نے ٹھاکر کو بھی اٹھنے میں مدد دی۔

”واہ گرو تجھے سکھی رکھے پتر۔“ ٹھاکر نے کھڑے ہوتے ہی میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر میرے ماتھے پر بوسہ دیتا ہوا بولا۔ ”تُو نے ایک بے کس و کمزور بوڑھے کی لاج رکھ لی۔“

”یہ ساری اس کی کرپا ہے چاچا۔“ میں آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا ہوا بولا۔

اسی وقت شیتل بھی جھاڑی سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔

”تم ٹھیک تو ہو نا۔“ وہ فکر مندی سے میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ”تم ذرا ٹھاکر چاچا کو سنبھالو میں گھوڑے اکٹھے کر لوں۔“

اور وہ ٹھاکر رنجیت سنگھ کے ہاتھ پاؤں ٹٹولنے لگی۔ جبکہ میں نے پستول اٹھا کر جیب میں ڈالا اور دائیں بائیں بکھرے گھوڑوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں تین گھوڑوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔

ٹھاکر رنجیت سنگھ اور شیتل لاشوں سے تھوڑا ہٹ کر کھلی جگہ پر بیٹھ کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے گھوڑے ایک جھاڑی سے باندھے اور ان کی طرف بڑھ گیا۔

”آؤ پتر۔“ مجھے دیکھ کر ٹھاکر اٹھنے کی کوشش کی۔

”او چاچا! تکلیف مت کرو۔“ میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بٹھاتا ہوا بولا اور وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کی عقیدت مندی اور شکر گزاری کو دیکھ کر اچانک ایک خیال سرعت سے میرے ذہن میں در آیا۔ شیتل سے جان چھڑانے کا یہ اچھا موقع تھا اس طرح ٹھاکر کی مہمان نوازی سے جان چھوٹتی اور اپنا سفر بھی میں اسی وقت شروع کر سکتا تھا۔ شیتل کو ٹھاکر با آسانی اس کے باپ تک پہنچا دیتا۔

میں نے اپنے ذہن میں اپنے مدعا کو الفاظ کی شکل میں ڈھالا اور گلا کھنکار کر گویا ہوا۔

”چاچا ٹھاکر...... جی تو بڑا چاہ رہا تھا کہ آپ کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں۔ آپ کی کہانی سنوں لیکن افسوس کہ میں ذرا جلدی

میں ہوں۔ بس آپ اتنی مہربانی کریں کہ میرا ایک چھوٹا سا کام کر دیں۔“

”ہاں ہاں بولو پتر۔“ وہ جلدی سے بولا۔”ایک نہیں دس کام بولو۔“

”چچا یہ......۔“ میں نے شیتل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔”دہلی کے سیٹھ ہری چرن داس کی بیٹی ہے۔ آپ کے ذمہ بس اتنا کام ہے کہ آپ اسے اس کے باپ تک خیریت سے پہنچا دیں آپ کی بڑی نوازش اور مہربانی ہوگی مجھے یہیں سے آپ سے جدا ہونا پڑے گا۔ کیونکہ میں نے کافی سفر کرنا ہے، آپ بس بمبئی کے راستے کی جانب میری رہنمائی کر دیں۔“

”جان......تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔“ ٹھاکر رنجیت سنگھ کے بولنے سے پہلے شیتل نے غصے سے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبکا ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کے تاثرات دیکھ کر میں سچ مچ حیران ہو گیا۔

”تم اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“ وہ غصے سے چلائی۔”اگر جانا ہی تھا تو میری مانگ میں سیندور کیوں بھرا تھا؟ مجھے گھر سے بھگا کر کیوں لائے تھے؟ اب جب میں تیرے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو تُو مجھے بیچ منجدھار چھوڑ کر بھاگنے کی فکر میں ہے۔“

اس کے منہ سے الزامات کی بوچھاڑ سن کر میری سٹی گم ہو گئی اور میں حیرت سے گنگ اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

+++

شیتل مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی اس بات کو میں خوب جانتا تھا۔ بلکہ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ میں اس کی پسندیدگی کے جذبات سے واقف ہو جاؤں۔ جبکہ اس کے برعکس میں تفصیلاً اس کے سامنے اپنے حالات اور مجبوریاں دہرا چکا تھا۔ اس کا اور میرا ملاپ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اور اس میں میرے شادی شدہ ہونے کے علاوہ ہمارے مذہب و قومیت میں فرق کا بھی گہرا دخل تھا۔

گو اس میں شک نہیں کہ اس کی طرح خوب صورت، پُرکشش اور جاذب نظر لڑکی آج تک میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ سعدیہ (میری بیوی) شکل وصورت میں اس کے عشرِ عشیر بھی نہیں تھی لیکن صرف اتنی بات ہمیں ایک بنانے کے لیے کافی نہیں تھی اور یہ کوئی اتنی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں تھی کہ مجھے اسے سمجھانے کی ضرورت پڑتی۔ وہ خود اس بات سے اچھی طرح واقف تھی پھر نا معلوم کیوں......؟ اس نے اس گھٹیا انداز میں خود کو میرے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات میرے لیے شدید حیرت کا باعث تھی۔

اگر وہ اس وجہ سے مجھ پر اپنا کوئی خصوصی حق سمجھ رہی تھی کہ میری وجہ سے اسے اغوا ہونے کی ذلت اٹھانی پڑی تھی تو اس کے بدلے اسے وہاں سے باعزت بازیاب کرانے کا سہرہ بھی تو میرے سر بندھا تھا۔ اور جہاں تک تعلق تھا میرے وعدے کا کہ اسے اس کے والد کے پاس پہنچاؤں گا تو ٹھاکر کے ذریعے میں اپنا وعدہ ہی پورا کر رہا تھا ضروری تو نہیں تھا کہ میں بنفسِ نفیس اسے اس کے والد کے حوالے کرتا۔ اتنی سی بات پر اسے سیخ پا ہونے کی کیا ضرورت تھی اور بالفرض میری جدائی کی خبر اس کے لیے شاک ثابت ہوئی تھی اور وہ ٹھاکر کے ساتھ اکیلے جانا نہیں چاہتی تھی اور میرے ساتھ رہنے پر ہی بضد تھی تو اس کا اظہار وہ برملا بھی میرے سامنے کر سکتی تھی اس کے لیے اسے

میری ذات پر الزامات تھوپنے کی کیا ضرورت تھی اور الزامات بھی ایسے کہ مجھ سے زیادہ اس کی اپنی ذات ان سے متاثر ہو رہی تھی۔

لیکن اس کے یہ الزامات مجھے مشتعل کرنے میں ناکام رہے تو شاید اس کی وجہ وہ چاہت تھی جو ان الزامات کے بین السطور مجھے نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک فطرتی بات ہے کہ ہر شخص چاہے جانے کو پسند کرتا ہے۔ اس میں عورت، مرد یا خوب صورت بدصورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ میں خود کتنا خوب صورت یا پُرکشش تھا میں حقیقی معنوں میں اس بات سے ناواقف تھا اور اس بات کی ایک منطقی وجہ گندہ پوروں کی معاشرت تھی کہ بقول یونس بٹ صاحب ''سرحد کے کچھ علاقوں میں عورت کا چہرہ نظر آنا ایسے ہی ہے جیسے سڑک پر ہزار کا نوٹ پڑا ہو۔''

اور ہمارا علاقہ بالکل ایسا ہی ہے۔ جس میں عورتوں اور مردوں کے باہم میل جول کی بالکل گنجائش نہیں۔ پردے کی پابندی کے ساتھ ساتھ عورتوں میں تعلیم کا بھی فقدان ہے۔ دوسرے میں بالغ ہوتے ہی اپنی پسندیدہ لڑکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کی وجہ سے عشق و محبت کی گھاتوں اور کسی کو اپنے پیار میں آزمانے کے مراحل سے دُور رہا۔ گو اپنی جوانی کے گزرے ہوئے پانچ چھ سال میں نے اپنے علاقے سے باہر گزارے تھے لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہ سارے ماہ و سال میں نے فوج کے زیرِ سایہ مختلف قسم کی جسمانی مشقتوں میں گزارے تھے جہاں صنفِ نازک تک رسائی صرف خواب میں ہی ممکن تھی البتہ انڈیا وارد ہونے کے بعد یہ تیسری یا چوتھی لڑکی تھی جس کی بدولت میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں بھی کسی طور صنفِ نازک کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

میں چند لمحے ششدر کھڑا شیتل کی بات کے عواقب پر غور کرتا رہا۔ ان الزامات کی تردید نہ کرنا گویا ان کی خاموش تائید تھی مگر اس کا شیتل کو کیا فائدہ یا میری ذات کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اگر میں اس وقت اسے زبردستی ٹھاکر کی تحویل میں دے کر اپنی راہ لیتا تو اس کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جس سے مجھے وہ روک سکتی۔ ٹھاکر بھی میرے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اگر اس کے برعکس بھی ہوتا تب بھی وہ میرا کیا کر لیتے۔

ٹھاکر رنجیت سنگھ غور سے میرے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا اور اس جہاندیدہ شخص سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔

شیتل نے بھی کہنے کو تو جو منہ میں آیا تھا کہہ دیا تھا لیکن بعد میں مجھ سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے شیتل کی باتوں کی تردید کرنا مناسب نہ سمجھا کہ اس طرح ٹھاکر کی نظروں میں اس کی بڑی سبکی ہوتی اور ہو سکتا تھا کہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بیوقوف لڑکی کوئی غلط قدم اٹھا لیتی۔ اس سے محبت نہ رکھنے کا دعویدار ہونے کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات پنہاں تھے اور یہ جذبات ہر مرد خوب صورت عورتوں کے لیے رکھتا ہے۔ میں کبھی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری وجہ سے اپنی ذات کو کوئی ایسا نقصان پہنچا دے جو ہمیشہ میرے ضمیر پر بوجھ بنا رہے۔ اس لیے میں نے سر جھٹک کر تمام سوچوں کو اپنے دماغ سے نکالا اور شیتل کی بجائے ٹھاکر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ٹھاکر چچا آپ کی بستی یہاں سے کتنی دور ہے۔ کیا آپ اکیلے وہاں تک جا سکیں گے۔''

''پتر بستی تو نزدیک ہے۔''وہ آہستہ سے بولا۔''پر تو اس سے میرا اکیلے جانا مشکل ہے۔''

''ٹھیک ہے چچا میں آپ کو بستی تک چھوڑ آتا ہوں لیکن اس کے بعد فی الفور ہمیں وہاں سے نکلنا ہوگا کہ ہمارے پاس ٹائم بالکل ہی نہیں ہے۔''''میں'' کی بجائے''ہم'' کا لفظ استعمال کرنے پر شیتل کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا تھا۔

''واہ گرو تجھے سکھی رکھے پتر!''وہ دعائیہ لہجے میں بولا۔''اگر میری خاطر تھوڑا اور کشٹ اٹھا لو اور ان رائفلوں کو میرے لیے اکٹھا کر دو کہ ان پاپیوں کے مقابلے کے لیے ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔''

''ابھی لو ٹھاکر چچا۔''میں خوشدلی سے بولا۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے تمام رائفلوں کو اکٹھا کر کے اس ترتیب سے باندھا کہ وہ آسانی سے گھوڑے کی پیٹھ پر لادی جا سکیں۔اس کے ساتھ ان رائفلوں کے تمام کارتوس بھی ایک ڈاکو کی چادر میں باندھ کر ایک گھوڑے پر لاد دیئے اور اسی گھوڑے پر رنجیت کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔اس دوران شیتل خاموش کھڑی انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی۔

میں نے دوسرے گھوڑے کی رسی کھولی اور اس کے قریب جا کر بولا۔''چلو بیٹھو۔''

اس نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی مجھے واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ میرے منہ سے نکلنے والے تسلی کے چند الفاظ اس نمی کو آنسوؤں میں بدل سکتے تھے۔اس طرح میری طرف سے غصے یا نفرت کا اظہار بھی اسے رونے پر مجبور کر سکتا تھا۔اس لیے میں نے اپنا لہجہ اور موڈ نارمل رکھا۔

وہ خاموشی سے میرا سہارا لے کر گھوڑے پر بیٹھ گئی۔

میں بھی اچھل کر تیسرے گھوڑے پر بیٹھا اور ہم دونوں ٹھاکر کے گھوڑے کے پیچھے چل پڑے تینوں گھوڑے سدھائے ہوئے تھے اس لیے مجھے شیتل کے گرنے کا خوف نہیں تھا ورنہ اس کے بیٹھنے کے انداز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ گھڑ سواری کی ابجد سے بھی ناواقف تھی۔

میرے ذہن میں برسوں پہلے سنی ہوئی ایک کہاوت گونجی کہ''میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔''

شیتل بھی میرے لیے وہی کمبل بن گئی تھی میں جتنا اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی میرے ساتھ لپٹ کر مجھے پیار و محبت کے گہرے پانیوں میں دھکیل رہی تھی کہ جس میں ڈوبنے والے کے لیے بچنے کا امکان نہیں رہتا۔اگر میرے گھریلو حالات موافق ہوتے اور سعدیہ میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو شیتل کب کا مجھے اسیر کر چکی ہوتی۔ میں نے اپنا گھوڑا ٹھاکر رنجیت سنگھ کے متوازی کیا اور اسے کہا۔

''ایک بات پوچھوں ٹھاکر چاچا۔''

''ایک چھوڑ دس پوچھو پتر۔''اس کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔

''بلونت کے ساتھ آپ کا کیا جھگڑا تھا؟''میں مستفسر ہوا۔

''اس راکھشس کے ساتھ میرا کیا جھگڑا ہونا تھا پتر وہ پاپی تو اس دھرتی کا ناسور تھا اس کارن کتنی کنواریوں کی عزتیں لٹیں۔کتنی

سہاگنوں کے سہاگ اُجڑے۔ کتنے بچے بے گھر ہوئے، کتنے پریوار اُجڑے اس کا کوئی شمار نہیں ہے۔ وہ موذی......'' ٹھاکر رنجیت سنگھ مجھے بلونت کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ جس کا لب لباب یہی تھا کہ بلونت اس علاقے کا نامی گرامی ڈکیت تھا۔ اس کا ایک پورا گروہ تھا جو پچیس تیس ڈاکوؤں پر مشتمل تھا۔ سارے علاقے میں ان کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ پولیس بھی اپنا حصہ لے کر ان کے معاملات کو نظر انداز کیے رکھتی تھی اور اپنی روایتی سستی کی بدولت ہمیشہ سانپ نکلنے کے بعد لکیر پیٹنے پہنچتی۔ پھر اس علاقے کے لوگوں کی خوش قسمتی کہ انسپکٹر اکبر خان اس علاقے میں تعینات ہو گیا اس کی آمد کے ساتھ علاقے میں وارداتیں ہونا کم ہو گئیں اس نے علاقے کے سر کردہ لوگوں کو جمع کر کے بلونت کے خلاف مدد کی اپیل کی اور اس کی آواز پر صرف رام پورہ کے ٹھاکر رنجیت سنگھ نے لبیک کہا۔ باقی بستیوں کے سر کردہ افراد نے بلونت کے خلاف گواہی دینے یا پولیس کی کسی اور قسم کی مدد سے معذوری ظاہر کی۔ ان کا مؤقف تھا کہ انسپکٹر اکبر خان نے تو ایک دن چلے جانا تھا اس کے بعد بلونت کا سامنا کون کرتا۔ حالانکہ تھوڑا سا بھی وہ سوچتے تو یہ باور کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا کہ تمام علاقے کا اتحاد ہی بلونت کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی تھا۔ مٹھی بھر ڈاکو پورے علاقے کا مقابلہ کیسے کرتے۔ مگر یہ بات نہ آج تک پاکستانی عوام سمجھے ہیں اور نہ ہی اس علاقے کے لوگ اس کو سمجھنے کے لیے تیار تھے۔

ٹھاکر کی جرأت کو دیکھ کر اکبر خان بہت خوش ہوا اور اس بستی کی حفاظت کے لیے اس نے رام پورہ میں موجود چوکی پر پولیس والوں کی تعداد دگنی کر دی۔

بلونت کے پاس بھی ٹھاکر رنجیت سنگھ کی پولیس کے ساتھ گٹھ جوڑ کی خبر پہنچ چکی تھی اس نے اپنا ایک کارندہ رنجیت سنگھ کو متنبہ کرنے کے لیے اس کے پاس بھیجا۔ جسے ٹھاکر نے اپنے ملازمین کے ذریعے قابو کر کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے جواب میں بلونت نے رام پورہ کے ایک آدمی کے ہاتھ ٹھاکر کو پیغام بھجوایا کہ ''جلد ہی وہ ٹھاکر سے اپنا بدلہ لے گا۔''

اور اس کے بعد وہ ٹھاکر کی تاڑ میں رہا اس کی حویلی پر تو پولیس کی وجہ سے وہ دھاوا نہ بول سکا، لیکن ٹھاکر کی غفلت نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔

ٹھاکر انسپکٹر اکبر خان سے ملاقات کے لیے رام پورہ سے شانتی نگر روانہ ہوا۔ پولیس تھانہ شانتی نگر میں تھا۔ اسی نسبت سے اکبر خان کی رہائش بھی وہیں تھی۔ ٹھاکر نے سوچا کہ وہ چوری چھپے شانتی نگر پہنچ جائے گا اس وجہ سے اس نے صرف اپنے دو ملازموں کو ساتھ لیا۔ ہتھیار کے نام پر ان کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور تینوں گھوڑوں پر سوار تھے۔

بلونت کو بھی یہ خبر پہنچ گئی اور وہ جنگل میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس حملے میں ٹھاکر کے دونوں ملازم تو موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ ٹھاکر کا گھوڑا بھی گولی لگنے کی وجہ سے اس کا ساتھ نہ نبھا سکا۔ نتیجتاً اسے پیدل ہی وہاں سے بھاگنا پڑا۔ بلونت بھی اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا اس لیے اس وقت تک اسے دوڑاتا رہا جب تک ٹھاکر بے دم ہو کر گر نہ گیا۔ اس کے بعد کے واقعات تفصیلاً قارئین کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ جب تک ٹھاکر کی کہانی ختم ہوتی ہم جنگل سے باہر نکل کر رام پورہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ ڈیڑھ دو سو گھروں پر مشتمل آبادی تھی۔

جس میں کچے پکے ہر وہ قسم کے مکان شامل تھے۔ٹھاکر کا حویلی نما مکان بھی پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔جس کی چار دیواری کافی اونچی تھی۔ جنگل کی طرف سے جاتے وقت ٹھاکر کی حویلی ہی سب سے پہلے پڑتی تھی۔

حویلی کے دروازے کے قریب پہنچ کر میں ٹھاکر سے بولا۔

''ٹھاکر چچا اب ہمیں اجازت دو۔''

''کیا؟'' وہ حیرانی سے بولا۔''پتر بغیر بھوجن کے لیے جانا آپ کو شوبھا نہیں دیتا۔''

''مگر چچا......۔''

''اگر مگر چھوڑو۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''رات پڑنے والی ہے آج یہیں رہ جاؤ کل سویرے چلے جانا...... چچا کہا ہے تو اس ناطے اتنا ادھیکار مان لو کہ آج نہ جاؤ۔''

میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔شیتل بھی بے کہے مجھے ٹھاکر کی بات سے متفق نظر آ رہی تھی۔

''کس وچار میں پڑ گئے، ہو پتر''۔ٹھاکر مستفسر ہوا۔''مجھے چچا بھی کہتے ہو اور میری بنتی بھی نہیں سنتے۔''

''ٹھیک ہے ٹھاکر چچا پر آپ ہمارا ذکر کسی سے بھی نہیں کریں گے؟......اور بلونت کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری بھی آپ خود قبول کریں گے۔البتہ ہمارے جانے کے بعد بے شک آپ تمام لوگوں کو ہمارے متعلق بتا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے پتر پر ابھی اندر تو چلو۔'' ٹھاکر نے حویلی کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔''کیا شام تک ادھر ہی کھڑے رہیں گے۔'' ٹھاکر کے انداز پر ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔حویلی کا دروازہ کھول کر ایک ملازم نے باہر جھانکا اور پھر ٹھاکر کو دیکھ کر دروازہ مکمل کھول دیا۔

ٹھاکر کو دستک دینے کے لیے گھوڑے سے اترنا پڑا تھا جبکہ ہم دونوں ابھی تک گھوڑوں پر سوار تھے۔ٹھاکر نے اپنے گھوڑے کی لگام ملازم کے حوالے کی اور اسے بولا۔

''یہ تینوں گھوڑے اصطبل لے جا کر باندھ دو اور یہ بندوقیں اتار کر اندر سٹور میں رکھوا دو۔''

ٹھاکر کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے بھی گھوڑے سے اتر کر شیتل کو سہارا دے کر اتارا اور ہم دونوں اپنے گھوڑوں کی لگامیں نوکر کے حوالے کرتے ہوئے ٹھاکر کے ساتھ حویلی کے اندر بڑھ گئے۔

حویلی کا طرز تعمیر سادگی لیے ہوئے تھا اور اس کی بناوٹ دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ اس کو بناتے وقت کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی اور بغیر نقشے کے ضرورت کے اصول کے مطابق کمرے بنائے گئے تھے۔کمرے دو منزلہ تھے۔جن کا رخ شمالاً جنوباً تھا جبکہ چھ کمرے شرقاً غرباً بنائے گئے تھے جن کے آگے برآمدہ بھی تھا۔باتھ روم وغیرہ حویلی کے بڑے دروازے کے ساتھ بنائے گئے تھے۔بڑے دروازے کے دونوں اطراف میں باتھ روم اور ٹائیلٹ کی دیواروں پر چھت ڈال ڈیوڑھی کی شکل دے دی گئی تھی۔باورچی خانہ ڈبل سٹوری کمروں کے

سامنے بنایا گیا تھا اور اس کے ساتھ دو کمرے جو اسٹور کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ گھوڑوں کے لیے اصطبل حویلی کے پچھواڑے بنایا گیا تھا اور اس سے تھوڑا سا ہٹ کر ملازموں کی رہائش کے لیے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔

ہمیں لے کر ٹھاکر دوسری منزل پر چڑھ گیا اور درمیانی کمرہ کھول کر بولا۔ ”آپ لوگ پدھاریئے میں آپ کے لیے بھوجن کا بندوبست کرتا ہوں۔“

میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرہ سادہ انداز میں سجایا گیا تھا لیکن اس میں سب سے دیدہ زیب جنوب کی سمت میں کھلنے والی وہ کھڑکی تھی جس سے دور دور تک پھیلے ہوئے کاشت شدہ علاقے کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک پرانے طرز کی مسہری رکھی ہوئی تھی جس کے اوپر ہاتھ سے کشیدہ کاری کی گئی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی تین چار کرسیاں اور ان کے سامنے ایک میز بمعہ میز پوش پڑی تھی۔

کمرے کے اندر پڑی اکیلی مسہری کو دیکھ کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ شیتل کے بقول ٹھاکر نے شاید ہمیں شادی شدہ سمجھ کر اس کمرے کا انتخاب کیا تھا، جو بلاشک وشبہ نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے ایک آئیڈیل کمرہ سمجھا جاسکتا تھا۔ ٹھاکر کے لیے ہمیں شادی شدہ سمجھنے کی ایک وجہ شاید میری خاموشی بھی تھی جو سراسر شیتل کے لگائے گئے الزام کی تائید کر رہی تھی۔

بہرحال میں نے زیادہ دیر اس بات پر سر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور ایک کرسی پر ٹک گیا۔

شیتل بھی خاموشی سے مسہری پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک مجھ سے بات کرنے اور میرے ساتھ نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے بھی بلاوجہ اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اگلے دن کے لیے اپنا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ علاقے کی مناسبت سے معلومات مجھے ٹھاکر رنجیت سنگھ سے مل جانی تھیں۔ سواری کے لیے بلونت والے گھوڑے موجود تھے۔ وہ ہمیں کسی بھی ایسی جگہ پہنچا سکتے تھے جہاں سے ہمیں بمبئی کے لیے گاڑی مل جاتی۔

بمبئی پہنچنے سے پہلے مجھے شیتل سے جان چھڑانی تھی اور اس کا بہترین حل یہی تھا کہ میں دہلی واپس جا کر اسے اس کے والد کے حوالے کرتا۔ مگر اس کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ دہلی میں میرے لیے قدم قدم پر انڈین خفیہ ایجنسیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ جس کی زد سے بچ کر نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دہلی کے برعکس دوسرے شہروں میں ان کی تلاش میں وہ شدت اور تندہی نہیں پائی جارہی ہوگی اور اس کی ایک منطقی وجہ یہی تھی کہ وہ میرے دہلی سے فرار سے لاعلم تھے۔ اس بنا پر میں نے شیتل کے ساتھ دہلی جانے کے پروگرام کو پس پشت ڈال دیا۔

شیتل سے جان چھڑانے کا ایک بہترین حل تو یہ بھی تھا کہ میں ٹھاکر کو اعتماد میں لے کر وہاں سے نکل جاتا۔ بعد میں شیتل بے شک مجھے کوستی رہے یا ٹھاکر کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کی کوشش کرتی میری بلا سے مجھے انڈیا سے نکلنے کے ساتھ غرض تھی کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے متعلق میری تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ آخر میں نے شیتل کو ٹھاکر کے پاس چھوڑ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلے پر جہاں

مجھے اطمینان ہوا وہیں یہ ہلکا سا افسوس بھی ہوا، لیکن میں مجبور تھا اور شیتل کی دلی خواہش پوری کرنے سے قاصر۔ وہ جتنا زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتی اس کی یک طرفہ محبت میں مضبوطی آتی جاتی۔ ہمارے جدا ہونے میں ہی ہم دونوں کی بھلائی تھی۔ میں اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ دروازہ کھٹکھٹا کر ٹھاکر اندر داخل ہوا اس کے پیچھے دو نوجوان لڑکیاں، ان سے کچھ بڑا دکھائی دینے والا لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر خاتون داخل ہوئی۔ دونوں لڑکیوں نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے ہوئے تھے جن میں کھانے پینے کے لوازمات رکھے ہوئے تھے۔

ہم انھیں کو دیکھتے ہی بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھو بچو بیٹھو۔'' ٹھاکر نے ہمیں کھڑے ہوتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔''میں نے سوچا کہ بھوجن کے ساتھ اپنے پریوار کو بھی اپنے محسنوں سے ملوا دوں...... یہ میرا پتر ہے پرکاش۔ وہ دونوں للیتا اور کامنی۔''اس نے ٹیبل پر کھانا چنتی لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا''اور یہ میری استری سرلا دیوی ہے''۔اس نے ادھیڑ عمر عورت کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر کہا۔اس کی اس حرکت پر سرلا شرما سی گئی تھی جبکہ ہم بے ساختہ ہنسنے لگے۔

اس تعارف کے دوران شیتل اور میں نے فرداً فرداً تمام کو ہندوؤں کے انداز میں ہاتھ باندھ کر پرنام کیا تھا۔

''اور یہ دونوں ہیں میرے محسن۔''اس نے ہماری طرف اشارہ کر کے گھر والوں سے کہا۔

''میری پتری کا نام ہے شیتل اور میرے پتر کا نام ہے جان۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''اس نے گھر والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ہم سے استفسار کیا۔

''جی چچا جان۔''میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''چلو آپ دونوں بھوجن کرو۔ میں ذرا چوکی سے ہو آؤں۔ میرے دونوں بندوں کی لاشیں ادھر جنگل میں ہی پڑی ہیں پولیس کے پاس میں نے اپنا بندہ بھیجا تھا مگر انھوں نے مجھے بلایا ہے کیونکہ انھیں جگہ کا پتا نہیں ہے۔ آپ لوگ بھی چلو۔'' ہمارے بعد وہ اپنے گھر والوں سے مخاطب ہو کر بولا۔''انھیں اطمینان سے بھوجن کرنے دو بعد میں آ کر ان سے گپ شپ کر لینا۔''

وہ تمام سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکلتے چلے گئے ٹھاکر پیچھے تھا میں نے اسے آہستہ سے آواز دے کر یاد دلایا۔''ٹھاکر چچا میری بات یاد ہے نا؟''

''او یاد ہے پتر۔'' ٹھاکر نے رکتے ہوئے کہا اور پھر یکدم ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔''میری بدھی کو بھی جانے کیا ہو گیا ہے۔ شما چاہتا ہوں پتر آپ سے اشنان کا تو پوچھا ہی نہیں ہے اس سے پہلے بھوجن پروس دیا ہے آپ کے سامنے۔''

''کوئی بات نہیں ٹھاکر چچا ہم شام کو نہا لیں گے۔''

''دھنے واد پتر۔'' کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ جبکہ میں کھانے کا جائزہ لینے لگا۔اس نے ہمیں ہندو خیال کرتے ہوئے کھانے میں گوشت کی کوئی ڈش بھی شامل نہیں کی تھی، لیکن گوشت کے علاوہ بہت پُر تکلف کھانا تیار کیا گیا تھا۔

''آؤ کھانا کھالو۔'' میں نے شیتل کو کھانے کے لیے بلایا اور وہ خاموشی سے اٹھ کر قریب آ گئی۔

ہم دونوں نے جنگل میں پورا خرگوش بھون کر کھایا تھا اور اس وقت کوئی خاص بھوک نہیں لگی تھی لیکن پھر بھی ہم نے کچھ نہ کچھ کھانا مناسب سمجھا۔

کھانے کے دوران میں شیتل کا جائزہ لیتا رہا۔ عجیب اضمحلال میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی اداسی دیکھ کر مجھے اس پر بے پناہ ترس آیا۔ مجھے پتا تھا کہ جدائی کے خوف کے ساتھ میری نظروں سے گر جانے کے کرب نے اسے رنجیدہ کر دیا تھا۔

تھوڑے سے دال چاول کھا کر اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور وہ خاموشی سے کھانے کی میز سے اٹھ کر چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔

مجھے پتا تھا کہ شرمندگی کی وجہ سے وہ مجھ سے گریز کر رہی تھی۔ میرا ارادہ رات کے پچھلے پہر اس کو چھوڑ کے چلے جانے کا تھا۔ میرے بعد نا معلوم اس پر کیا گزرتی لیکن اپنی ذات سے اس کی محبت دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس کی یہ غلط فہمی دور کرتا جاؤں کہ میں اس سے ناراض ہوں اور اس کے لیے میں اتنا کر سکتا تھا کہ اس سے وداع ہوتے ہوئے اس کے دامن کو ان الزامات کی آلودگی سے صاف کرتا جاؤں جو اس نے مجھ پر لگائے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید میرے جانے کے بعد وہ کوئی غلط قدم اٹھا لیتی کہ میرے اس طرح روپوش ہونے کو وہ سراسر اپنا قصور گردانتی اور میری مجبوریاں اس کی نظر سے اوجھل رہتیں۔ اس کے برعکس اگر میں ہنسی خوشی اس کے ساتھ گھلا ملا اس سے جدا ہوتا تو وہ لازماً میری مجبوریوں کے بارے سوچنے پر مجبور ہوتی جو میں اس سے بیان کر چکا تھا۔

میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی کی طرف بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ سے اس مخاطب ہوا۔ ''شیتل خفا ہو مجھ سے۔'' اور وہ مجھے اپنے قریب پا کر گود میں رکھے ہاتھوں کو اضطراب سے مروڑنے لگی تھی۔ میری بات سن کر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ پھر بغیر میری بات کا جواب دیئے اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور دوبارہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے مضطرب ہاتھوں کو تھاما اور کہا۔

''سوری شیتل مجھے پتا ہے کہ میں نے آپ کو ٹھا کر چچا کی تحویل میں دینے کا جو ارادہ کیا تھا وہ غلط تھا اس طرح میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے اس ارادے سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور غصے میں آپ کے منہ سے کچھ نازیبا کلمات نکل گئے، لیکن بخدا مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میرے یوں چلے جانے کو آپ دل سے لگا لیں گی۔'' میں ایک لحہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''شیتل آپ بہت پیاری دلکش...... چاہے جانے کے قابل ایک آئیڈیل لڑکی ہیں، لیکن میری بدقسمتی کہ میں مجبوریوں کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا ہوں۔ چاہنے کے باوجود میں تمھیں اپنا نہیں سکتا۔ تیرے میرے ملن کے درمیان جو رکاوٹیں ہیں ان سے تو خود بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اس لیے تیرے اور میرے لیے بہتر یہی ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی اپنی راہ لیں بعد کے رونے سے ابھی کا افسوس بہتر ہے۔''

وہ خاموشی سے سر جھکائے میری باتیں سنتی رہی اور جیسے ہی میری بات ختم ہوئی اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اس کی آنکھیں آنسوؤں

سے ترتھیں۔ اپنے ہاتھ آہستگی سے میرے ہاتھوں سے چھڑا کر اس نے پرنام کے انداز میں باندھے اور گلوگیر آواز میں بولی۔

''صاحب..... آپ مہان ہیں...... مجھے کوئی ادھیکار نہیں تھا کہ آپ کی ذات پر اتنے گھٹیا الزامات دھرتی۔لل لیکن مجھے سمجھ ہی کچھ نہ آئی اور میں وہ کچھ بول گئی جو مجھے بالکل شوبھا نہیں دیتا تھا۔ میں شما......''

''پلیز شیتل۔''میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔''میں آپ سے بالکل خفا نہیں ہوں۔بس تم روؤ مت اور جو کچھ ہو گیا ہے اسے بھول جاؤ۔ سمجھو ہمارے درمیان ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔''

''ویسے میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں ہے نا؟''وہ آنسو صاف کرتے ہوئے دکھی لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔''میں باآواز بلند بولا۔دروازہ کھول کر ایک ملازم اندر داخل ہوا اور خاموشی سے کھانے کے برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔

''آپ مجھ پر بالکل بوجھ نہیں ہیں۔''ملازم کے کمرے سے نکلتے ہی میں بولا۔''لیکن آخر کب تک ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں۔انڈیا سے جلد از جلد باہر نکلنا میری مجبوری ہے۔اس میں جتنی دیر ہوتی جائے گی۔میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔تیرا ساتھ کتنا ہی پیارا اور سہانا سہی ہے تو عارضی نا؟اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کل بچھڑنے سے بہتر ہے کہ ہم آج ہی علیحدہ ہو جائیں اور دوسری بات۔''میں ایک لحظہ کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔''انڈیا سے نکلنے کے لیے مجھے دو نمبر یعنی غنڈہ ٹائپ لوگوں سے روابط قائم کرنے پڑیں گے اور تیری شکل وصورت ایسی ہے کہ وہ مجھے انڈیا سے باہر بھیجنے کی بجائے دنیا سے ہی نکالنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

''یہ روابط آپ نے بمبئی جا کر بڑھانے ہیں وہاں تک تو آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں نا......اس کے بعد''......اس نے بات ادھوری چھوڑ کر زخمی نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''شیتل...... تمھیں ایک سے بڑھ کر ایک اچھا، ہینڈسم، تیرا ہم مذہب اور پیار کرنے والا رشتہ مل سکتا ہے۔''

''پر مجھے تو عمر جان چاہے نا۔''وہ جیسے پھٹ پڑی۔

میں نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔''ناممکن۔''

''ناممکن کیوں؟''وہ چیخ پڑی۔''مم...... میں اپنا دھرم بدل لوں گی۔''

''میں شادی شدہ ہوں''

''تمھارے مذہب میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔''وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''شیتل پاگل مت بنو۔''میں زچ ہوتے ہوئے بولا۔''ہمارے ہاں شادیاں اس طرح نہیں ہوتیں ایک تجھے اپنا کر مجھے اپنی ساری برادری سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔میری بیوی میرے چچا کی بیٹی ہے۔چچا بھی ایسا جس نے ہمیں باپ بن کر پالا۔اس کی مرضی کے بغیر میں اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں۔''

''تم مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤ میں تیرے پورے پریوار کو راضی کر لوں گی۔''

''شیتل پلیز۔'' میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑتے ہوئے بولا۔

''اچھا مجھے ایک وچن دو۔'' وہ گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے بولی۔

''کیا؟''

''بمبئی تک مجھے ساتھ لے جاؤ اس کے بعد آپ کی مرضی چاہے مجھے ساتھ لے جانا۔ چاہے......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

مجھے پتا تھا کہ وہ بمبئی تک مجھے اپنے حق میں ہموار کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ اسے بتائے بغیر میں اسے ٹھاکر کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ پہلے سے کر چکا تھا۔ اس وقت وعدہ کرنے سے بعد میں مجھے وعدہ خلاف بننا پڑتا۔ اس لیے میں ڈپلومیٹ انداز میں بولا۔

''اچھا میں کوشش کروں گا کہ تجھے وہاں تک ساتھ لے جاؤں۔''

''کوشش نہیں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ''پکا وچن دو۔''

''نہیں پکا وعدہ نہیں کر سکتا۔'' میرا جواب نفی میں تھا۔ ''ہو سکتا ہے حالات ہمیں بمبئی سے پہلے جدا کر دیں۔''

''مگر تم جان بوجھ کر......'' اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''آجاؤ۔'' میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

دروازہ کھول کر ٹھاکر کی بیوی اور تینوں بچے اندر داخل ہوئے۔ سب سے چھوٹی نظر آنے والی بچی نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائی ہوئی تھی جس کے اندر چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ ہم انھیں دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھو بچو۔'' ٹھاکرائن ہمارے قریب آ کر ہمارے سروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''اصل میں ان کے باپو کو تھانے گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے خبر نہیں کس ٹائم لوٹے۔ وہ کہہ رہا تھا آپ لوگوں نے کل چلے جانا ہے۔ میں نے سوچا تھوڑی گپ شپ بھی کر لیں اور چائے بھی پی لیں۔''

''مہربانی آنٹی۔'' میں پُرخلوص لہجے میں بولا۔

''مہربانی تو آپ لوگوں نے کی ہے پتر۔'' ٹھاکرائن گلوگیر ہوتے ہوئے بولی۔

''یہ تو ہمارا فرض تھا آنٹی۔'' میں نے اس موقع پر کہا جانے والا فقرہ دہرایا۔ ''ٹھاکر چاچا کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تب بھی ہم یہی کرتے۔'' اسی وقت ٹھاکر کی چھوٹی بیٹی نے ہمیں چائے کے کپ پکڑا دیئے۔ ٹھاکر کا بیٹا تقریباً میرا ہم عمر تھا وہ چور نظروں بار بار شیتل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کمبخت تھی ہی اتنی خوب صورت اور پُرکشش کہ اس کو دیکھ کر مردوں کی مت ماری جاتی تھی۔

''بھیا آپ لوگ چند دن کے لیے رک نہیں سکتے۔'' ٹھاکر کا بیٹا مخاطب مجھ سے تھا مگر اس کی نظریں ہنوز شیتل کے پُرکشش چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''سوری''۔ میرا سر نفی میں ہلا۔ ''ہم چاہنے کے باوجود رک نہیں سکتے ،آج بھی ہم ٹھاکر چچا کے اصرار پر رک گئے تھے ورنہ نکل گئے ہوتے۔''

''ایسی بھی کیا تیزی ہے پتر!'' ٹھاکرائن مستفسر ہوئی۔

''بس آنٹی کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جو بتائی نہیں جاسکتیں۔''

''اچھا چھوڑیں بھیا ان مجبوریوں کو۔'' ٹھاکر کی بڑی بیٹی شوخی سے بولی۔ ''یہ بتائیں آپ نے اتنی خوب صورت دولھن کہاں سے ڈھونڈی''۔اس کے ریمارکس پر شیتل کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تھا۔

''ہاں بھیا ہمیں بھی بتاؤ۔'' ٹھاکر کی دوسری بیٹی بولی۔ ''ہم نے بھی اپنے پرکاش بھیا کے لیے ایسی ہی دولھن ڈھونڈنی ہے۔''

''اگر اتنی ہی پسند آ گئی ہے تو یہی رکھ لو۔'' میں مزاحیہ انداز میں بولا۔اور تمام قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جبکہ شیتل غصیلے انداز میں مجھے گھورنے لگی۔

''اتنا بھی کیا غصہ بھابی۔'' پرکاش شیتل کے غصیلے انداز پر چوٹ کرتا ہوا بولا۔ ''جان بھیا کون سا تمھیں سچ مچ میرے حوالے کرنے لگے ہیں۔''

''نا......نا......پتر......ایسا نہیں کہتے۔'' ٹھاکرائن جلدی سے بولی۔

''میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔'' پرکاش نے وضاحت کی۔

''کیوں......؟ تیرا میرا اس قسم کا مذاق ہے؟'' شیتل جو پرکاش کی بات پر تلملا رہی تھی بدلہ لیتے ہوئے بولی۔ مجھے پتا چل گیا کہ بات چیت مذاق کے زمرے سے نکل کر لڑائی کی طرف جانے والی ہے۔اس لیے پرکاش کے بولنے سے پہلے میں ٹھاکر کی بیٹیوں سے مخاطب ہوا۔

''آپ دونوں میں للیتا کون سی ہے اور کامنی کون سی ہے۔''

''میں کامنی ہوں بھیا۔'' ٹھاکر کی چھوٹی بیٹی جلدی سے بولی۔

''اور میں للیتا۔'' بڑے والی مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ٹھاکر کی دونوں بیٹیاں ماں پر گئیں تھیں۔ ہلکی سانولی رنگت، لمبا قد، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں۔ مناسب جسم۔ کسی بھی مرد کو آسانی سے اپنا اسیر کر سکتی تھیں۔لیکن شیتل کے سامنے ان کی جاذبیت بالکل اسی طرح ماند پڑ گئی تھی جس طرح سورج کے سامنے چراغ۔

''ہم دونوں پڑھتی ہیں۔'' للیتا نے کہا۔

''یہاں پر سکول ہے؟'' میں مستفسر ہوا۔

''نہیں ہم گھر میں ہی پڑھتی ہیں اور ہر سال امتحان دینے کے لیے چند روز کے لیے شانتی نگر اپنی موسی کے گھر چلی جاتی ہیں۔''

''اور آپ۔'' میں پرکاش سے مخاطب ہوا۔

''میں اس سال کالج سے فارغ ہوا ہوا اور ابھی دہلی جا کر یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے۔''

ہم ابھی اسی گفتگو میں مصروف تھے کہ ٹھاکر رنجیت سنگھ کمرے میں داخل ہوا۔

''شما چاہتا ہوں بچو مجھے ذرا دیر ہو گئی۔'' وہ میرے ساتھ بیٹھتا ہوا بولا۔

''کیا آپ لوگ نے بلونت اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں بھی اٹھوائی ہیں۔'' میں مستفسر ہوا۔

''نہیں پتر۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔''ان کی لاشیں ڈاکو لے گئے تھے اور دھرمو اور گوبند کی لاشوں کے ساتھ تھانیدار صاحب کے لیے چٹھی چھوڑ گئے تھے کہ آج رات شانتی نگر میں اکبر خان (تھانیدار) سے اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لیا جائے گا۔ چٹھی بھیجنے والا بلونت کا بھائی آنند ہے جو بلونت کی موت کے بعد اس گروہ کا سردار بن گیا ہے۔''

''اس بارے اکبر خان نے کچھ کہا ہے؟''

''وہ تو موقع پر نہیں پہنچا تھا۔'' رنجیت سنگھ جواباً بولا۔''البتہ چٹھی اس کے پاس پہنچا دی گئی ہے اور احتیاط کے طور پر اس نے رام پورہ چوکی سے اضافی نفری منگوالی ہے۔''

''آپ نے میرے بارے تو انھیں کچھ نہیں بتایا تھا؟''

''بتایا تھا۔ کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ البتہ آپ کے بجائے میں نے تین جوانوں کا ذکر کیا تھا جو دہلی سے شکار کے سلسلے میں جنگل میں آئے ہوئے تھے اور میری سہائتا کر کے چلے گئے۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔'' میں اطمینان سے بولا۔

''بھیا آپ پولیس سے کیوں چھپنا چاہتے ہیں؟'' کامنی مجھ سے مخاطب ہوئی۔''ڈاکوؤں کو مار کر آپ نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا ہے کہ پولیس سے چھپتے پھریں۔''

''گڑیا میں خود پولیس کو مطلوب ہوں۔ وہ بجائے انعام دینے کے مجھے حوالات میں بند کرنے کی میں دلچسپی لیں گے۔''

''آپ کس سلسلے میں پولیس کو مطلوب ہیں۔'' پرکاش مستفسر ہوا۔

''بس بھائی گھریلو پریشانیاں انسان کو مجرم بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ اس وقت ایک ملازم دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا اور بولا۔

''ٹھاکر جی کھانا تیار ہے۔ ادھر ہی لے آؤں یا نیچے کمرے میں لگا دوں۔''

''ہم نیچے ہی آ رہے ہیں۔'' ٹھاکر جواباً بولا اور نوکر سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

''ٹھاکر چاچا ہم نے تو ابھی کھانا کھایا ہے۔''

''ابھی کدھر کھایا ہے؟''للیتا جلدی سے بولی۔''آپ لوگوں نے پانچ بجے کھانا کھایا تھا اور اب نو بجنے والے ہیں۔''میں نے گھڑی دیکھی واقعی ٹائم گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔کمرے میں لگی ٹیوب لائٹ نے ہمیں اندھیرے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

''کوئی بات نہیں پتر......کھانا بعد میں کھالیں گے ابھی گپ شپ کرتے ہیں۔''ٹھاکر رنجیت سنگھ نے مشورہ دیا۔

''نہیں انکل''۔میں نے نفی میں سر ہلایا۔''ابھی چلیں ہم آپ لوگوں کے ساتھ ٹائم ملا لیں گے۔کیونکہ ہم رات بھی آرام نہیں کر سکے تھے اور صبح سویرے یہاں سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تھوڑی سی نیند لے لیں۔''

''واقعی۔''پرکاش ذو معنی لہجے میں بولا۔''نیند لینا بہت ضروری ہے۔

لیکن اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے میں نیچے اترنے کے لیے کھڑا ہوا اور میرے ساتھ باقی تمام بھی کھڑے ہو گئے۔کھانے کا کمرہ کچن کے ساتھ نزدیک ہی تھا۔درمیان میں صرف برآمدہ پڑتا تھا۔شیتل نے میرے ساتھ کرسی سنبھال تھی کھانے کے دوران رنجیت سنگھ نے لطائف کا پٹارہ کھولے رکھا۔کھانے کے بعد ملازم نے چائے کے برتن لا کر رکھے تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹھاکر سے کہا۔

''ٹھاکر چچا میں نے چائے نہیں پینی۔جب تک یہ چائے پیتے ہیں ہم دونوں چہل قدمی کر لیں اس بہانے میں حویلی بھی دیکھ لوں گا۔''

''ہاں ہاں چلو پتر۔''وہ جلدی سے اٹھتا ہوا بولا۔شیتل نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی اور ہم دونوں انھیں ڈائننگ ٹیبل پر چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

''ٹھاکر چچا۔''کمرے سے باہر نکلتے ہی میں آہستہ سے بولا۔''مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''مجھے پتا ہے۔''وہ اطمینان سے بولا۔

''کیا پتا ہے؟''

''یہی کہ آپ نے مجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے اسی لیے چہل قدمی اور حویلی دیکھنے کے بہانے مجھے علیحدہ لے آئے ہو۔

''اس کا اطمینان برقرار تھا۔

''ٹھاکر چاچا اگر میں یہ کہوں کہ میں مسلمان ہوں۔''میں سسپنس پیدا کرتا ہوا بولا۔

''اس کے بعد آپ کہو گے کہ میرا نام عمر جان ہے اور پھر کہو گے کہ میں بھارتی سرکار کو مطلوب ہوں اور میرے متعلق جان کاری دینے والے کو ایک لاکھ انعام دیا جائے گا اور یہ کہ شیتل میری بیوی نہیں ہے اور......''

میں ٹھاکر کی بات سن کر حقیقتاً اچھل پڑا اور قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان کیوں بنے رہے؟''

''پتر آپ نہ صرف میرے لیے مسیحا ثابت ہوئے بلکہ آپ کے کارن مجھے اپنے دشمن سے بھی چھٹکارا ملا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے حقیقت آشکارا کر کے آپ کو شرمندہ کروں۔''

''پر ابھی تو آپ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔''میں ہلکے سے ہنس کر بولا۔

''ابھی آپ خود مجھے یہی بتانا چاہ رہے تھے۔''وہ جواباً بولا۔

''کیا آپ کے تمام گھر والوں کو میرے بارے پتا چل چکا ہے۔''میں مستفسر ہوا۔

''نہیں۔''اس کا جواب نفی میں تھا۔''صرف مجھے ہی یہ حقیقت معلوم ہوئی ہے۔''

''آپ نے غالباً......میرے متعلق اخبار میں پڑھا ہے۔''

''صحیح کہا۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہر حال اخبار والوں نے بھی سب کچھ سچ نہیں لکھا ہے۔''میں نے کہا۔''میں نہ تو جاسوس ہوں اور نہ ہی تخریب کار......گھریلو مجبوریوں کے باعث میں اپنی فوج سے بھگوڑا ہوا اور راستا بھول کر انڈیا آنکلا۔انھوں نے پکڑ کر جاسوس،تخریب کار اور پتا نہیں کیا کیا ثابت کرنا چاہا۔مجبوراً مجھے ان کی قید سے بھی بھاگنا پڑا اور ابھی تک بھاگ رہا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے پتر!''ٹھاکر گہری سانس لے کر بولا۔''چہرہ بتاتا ہے کہ آپ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔یوں بھی دہشت گرد کسی کی اس طرح سہایتا نہیں کرتے جس طرح آپ نے میرے سہاتا کی ہے۔''

''چھوڑیں انکل اس ذکر کو۔''میں جلدی سے بولا۔''آپ مجھے بمبئی جانے کا شارٹ رستا بتائیں اور......''

''اور کیا؟''

''اور یہ کہ شیتل کو خیریت سے دہلی پہنچانے کی ذمہ داری بھی آپ کی ہے۔''میں اپنی بات کی وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے پتر۔''وہ اطمینان سے بولا۔''پرنتو آپ یہاں سے کس ٹائم نکلیں گے۔''

''تقریباً رات کے تین ساڑھے تین کے قریب۔''

''اگر آپ بائی روڈ جاؤ تو جے پور سے بمبئی تک کی ڈائریکٹ گاڑی مل جائے گی اور رستا لمبا ہونے کے باوجود جلدی بمبئی پہنچ جاؤ گے......اس کے برعکس اگر آگرہ اور جے پور کے درمیان سے ہوتے ہوئے جنوب مغرب کی سمت اختیار کرو تو رستا سڑک کی نسبت نصف پڑے گا،لیکن وقت زیادہ لگے گا کیونکہ اس رستے میں آپ کو ٹریفک تو ملے گی مگر لوکل۔البتہ خطرہ اس سمت میں نہ ہونے کے برابر ہو گا......باقی مختصر رستے کے بارے میں نقشہ بنا لیتا ہوں تین بجے یہاں سے رخصت ہوتے وقت مجھ سے لے لینا۔''

اس وقت تک ہم حویلی کے پچھواڑے گھوڑوں کے اصطبل کے قریب پہنچ چکے تھے۔اصطبل کے اندر تین گھوڑے ڈاکوؤں کے اور ان کے ساتھ دو ٹھاکر کے ذاتی گھوڑے کھڑے تھے۔جنگل میں بلونت کے ہاتھوں دو ملازموں کے ساتھ ٹھاکر کے تین گھوڑے بھی مارے گئے تھے گھوڑوں کے بدلے گھوڑے تو مل گئے،لیکن جانی نقصان کا ازالہ ناممکن تھا۔

ٹھاکر نے پوچھا۔''کون سا گھوڑا آپ لیے تیار کرادوں؟''

''ڈاکوؤں کے گھوڑے کے علاوہ کوئی سا بھی تیار کروا دینا۔''

''اور کوئی خاص چیز جو آپ کو ضرورت ہو؟''

''نہیں۔'' میرا جواب نفی میں تھا۔'' فی الحال نہیں اگر ہوئی تو تین بجے بتا دوں گا......اور اب واپس چلیں، تا کہ میں تھوڑا سا آرام کرلوں۔'' ٹھا کر نے سر ہلا کر میری تائید کی اور ہم واپس چل پڑے۔ ٹھا کر کمرے کے دروازے تک میرے ساتھ آیا اور پھر واپس چلا گیا۔ شیتل بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

''کہاں رہ گئے تھے، اتنی دیر لگا دی۔'' اس کا انداز ہو بہو شکی مزاج محبت کرنے والی بیوی کا سا تھا۔

''بس ذرا حویلی کا جائزہ لے رہا تھا۔'' میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اگر حویلی دیکھنی تھی تو دن کو نکلتے۔ یہ کون سا ٹائم ہے حویلی دیکھنے کا۔''

لیکن میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ایک کمبل اور تکیہ اٹھا کر کمرے کے کونے میں اپنے لیٹنے کے لیے جگہ بنانے لگا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''سونے کے لیے جگہ بنا رہا ہوں۔'' میں کوٹ اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے بولا۔

''تو یہ اتنا بڑا بیڈ کس لیے ہے۔''

''آپ ہیں نا بیڈ پر۔'' میں جواباً بولا۔

''کیوں؟ آپ کو ڈاکٹر نے بیڈ پر سونے سے منع کیا ہے یا مجھ سے ڈر رہے ہو۔''

''بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں سنجیدگی سے بولا۔'' خاموشی سے لیٹ جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح سویرے نکلنا ہے۔''

''اچھا پھر آپ اوپر آ جائیں۔'' وہ مسہری سے اترتے ہوئے بولی۔'' میں نیچے سو جاؤں گی۔''

''چپ چاپ لیٹ جاؤ۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔'' ہر بات میں اپنا کہا مت منوایا کرو۔ اگر دوبارہ ضد کی تو پھر تیری میری راہیں بمبئی سے پہلے جدا ہو جائیں گی۔''

''ہنہ۔ راہیں جدا ہو جائیں گی۔'' وہ مجھے چڑاتے ہوئے بولی۔'' تم ایسا کر کے دیکھو......اور مجھے کیا لیٹے رہو فرش پر میں تو عزت دے رہی تھی کہ چلو تھوڑا آرام کرلو گے تم جانے کیا سمجھ بیٹھے۔'' یہ کہہ کر وہ دھم سے چارپائی پر بیٹھی اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں نے بھی زیر لب مسکراتے ہوئے کمبل اوڑھا اور فرش پر بچھے کارپٹ پر لیٹ گیا۔ اگر میں یہ انداز نہ اپناتا تو اس نے لازماً میرے ساتھ سونے کی ضد کرنی تھی اور ایسی پُرکشش لڑکی کے ساتھ ایک چارپائی پر لیٹ کر پاکدامنی کا دعویٰ کوئی زاہد صد سالہ ہی کر سکتا تھا مجھ جیسے دنیادار کے لیے یہ بہت مشکل تھا۔

میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے نکال کر اپنے دماغ کو ایک نقطے پر مرتکز کیا تھوڑی دیر بعد ہی میں نیند کی مہربان آغوش میں پہنچ

گیا۔میری آنکھ دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سے کھلی۔ میں نے چہرے سے کمبل ہٹایا تو مجھے ٹھاکر نظر آیا جو زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں میری طرف بڑھ رہا تھا اس کا ارادہ مجھے جگانے کا تھا۔میری پہچان اس نے لازماً میری قامت سے کی تھی۔اسے دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

وہ مجھے اٹھتے دیکھ کر خاموشی سے پیچھے مڑ کر چلا گیا۔ میں نے الماری سے مشین گن نکال کر کندھے سے لٹکائی اور اس کے اوپر جیکٹ پہن کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

شیتل منہ سر لپیٹ کر نیند کی گہری وادیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔اس پر ایک الوداعی نظر ڈال کر میں باہر آ گیا۔ٹھاکر سیڑھیوں کے نیچے میرا منتظر تھا۔

''ٹھاکر چاچا تیاریاں مکمل ہیں؟۔''میں سرگوشی میں مستفسر ہوا۔

''ہاں پتر!''اس نے کہا۔''گھوڑا تیار ہے اس کے ساتھ دو تین دن کا خشک راشن کپڑوں کا فالتو جوڑا اور تھوڑی سی رقم ایک تھیلے میں ڈال کر زین کے ساتھ لٹکا دی ہے۔''

''رقم؟''میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔''مگر کس لیے۔''

''پتر پردیس میں ہو اور میرے پاس واہ گرو کا دیا بہت کچھ ہے ہو سکتا ہے کہیں ضرورت پڑ جائے اس وقت کدھر مانگتے پھرو گے۔''اور میں کچھ سوچ کر خاموش رہا۔

گھوڑے کی رسّی تھام کر میں نے ٹھاکر رنجیت سنگھ سے معانقہ کیا اور کہا۔''چاچا دعاؤں میں یاد رکھنا اور شیتل کو آج ہی کوشش کر کے اس کے والد تک پہنچا دینا اور میری طرف سے اس سے بہت بہت معذرت کر لینا۔اسے کہنا میں مجبور تھا اگر زندگی نے وفا کی اور میرے گھر کے حالات ٹھیک ہو گئے تو میں لامحالہ اسے ملنے کے لیے آؤں گا۔''آخری فقرہ میں نے یونہی شیتل کی تسلی کے لیے ٹھاکر سے بول دیا تھا۔ورنہ مجھے معلوم تھا کہ میرا دوبارہ انڈیا آنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس وقت وہاں سے نکلنا مشکل بنا ہوا تھا۔

ٹھاکر سے ملنے کے بعد میں نے رکاب میں پاؤں ڈالا۔میرا ارادہ اسی جگہ ٹھاکر سے الوداع ہونے کا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں گھوڑے پر سوار ہو پاتا۔''ٹھک''کی آواز سنائی دی۔یہ آواز اصطبل سے متصل دیوار کے سرے کی طرف سے آئی تھی۔میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی اور میں چوکنا ہو گیا۔

''میرا خیال ہے ڈاکو ہیں۔''ٹھاکر ہراساں ہو گیا تھا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''میں ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔''آپ ذرا برآمدے کی آڑ میں ہو جائیں۔''میں نے گھوڑے کو اصطبل کے دروازے کے اندر کر کے تھپکی دی اور مشین گن کی سلنگ کا ہک کھول کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ٹھاکر جلدی سے برآمدے کی آڑ میں ہو گیا۔اس وقت دیوار کے سرے پر ایک سر نمودار ہوا اور پھر دائیں بائیں سن گن لے کر آنے والا دیوار کے اوپر لمبا لیٹ کر باہر موجود اپنے ساتھیوں سے کوئی بات کرنے لگا۔رفتہ رفتہ وہ اوپر آتے گئے۔جب ان کی تعداد دیوار پر پانچ کے قریب ہوئی تو ان میں سے تین دیوار سے

لٹک کر نیچے کود گئے جبکہ دوان کی حرکت کو کور مہیا کرنے لگے۔

میرے ایکشن میں آنے کے لیے وہی ٹائم مناسب تھا ورنہ اس کے بعد وہ حویلی میں پھیل کر پوزیشیں پکڑ لیتے اوران کا مقابلہ کرنا نسبتاً مشکل ہوجاتا۔

مشین گن کے سیفٹی لیور کو سنگل شاٹ پر سیٹ کرتے ہوئے میں نے کاکنگ ہینڈل کھینچا اور اگلے ہی لمحے میں نے ٹریگر دبایا گن نے دوراؤنڈ اُگلے اوردیوار پر لیٹے دونوں افراد چیختے ہوئے باہر جا گرے۔دیوار سے نیچے کودنے والے اپنے ہتھیار سنبھال کر آڑ کی تلاش میں بھاگے.....مگران کا یہ بھاگنا رائیگاں گیا۔مشین گن کی نال سے نکلنے والی بے رحم گولیاں انھیں راستے میں ہی چاٹ گئیں تھیں۔

میرے لیے اس جگہ رک کرڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے میں یہ قباحت تھی کہ حویلی کی دوسری دیواریں میری نظروں سے اوجھل تھیں۔

اس وقت میرے لیے سب سے بہتر جگہ دومنزلہ عمارت کی چھت تھی۔جس سے میں اردگرد کے تمام علاقے پر نظر رکھ سکتا تھا۔حویلی کے اندر گھسنے والے تینوں بندوں کے گرتے ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے اندر کے جانب دوڑ لگادی۔اچانک فضادھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔میں نے اپنے آپ کو سینے کے بل زمین پر گرالیا۔گولی چلانے والے کا ٹارگٹ میں ہی تھا مگر میری خوش قسمتی کہ زگ زیگ کے انداز میں دوڑنے کی وجہ سے وہ میرا صحیح نشانہ نہ لے سکا تھا۔

زمین پر گرتے ہی میں نے دوتین کروٹیں لیں اوراپنا رخ فائر کرنے والے کی سمت کرلیا۔

وہ چاردیواری کی مشرقی دیوار پر اپنی ٹانگیں دائیں بائیں لٹکائے بیٹھا مجھے نشانہ بنانے کی فکر میں تھا۔اس کی جانب سے تیسرا فائر ہونے سے پہلے میری مشین گن گرجی۔میں نے مسلسل تین مرتبہ ٹریگر دبایا تھا۔میرے اندازے کے مطابق آخری دونوں گولیاں نشانے پر لگیں اوروہ چیخ مار کر باہر کے جانب جا گرا۔

میں برآمدے کی سمت دوڑا۔برآمدے میں داخل ہوتے ہی میں جنوبی اور مغربی سمت میں آنے والی گولیوں سے محفوظ ہوگیا تھا۔

ٹھاکر ہاتھ میں رائفل پکڑے مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔برآمدے کے ستون کے ساتھ بیٹھ کر میں نے حویلی کے صحن میں جھانکا۔اس وقت رائفل کے تین چار فائر ہوئے اورحویلی کے صحن کو روشن کرنے والے تینوں بلب ٹوٹ کر کرچیوں میں بدل گئے۔ایک لمحے کیلئے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا مگر چند لمحوں بعد سترہ اٹھارہ تاریخ کے چاند کی روشنی میں اردگرد کے مناظر نظر آنے لگے۔ٹھاکر نے میرے ساتھ پوزیشن لینی چاہی مگر میں اس سے مخاطب ہوا۔

”چچا تم عورتوں اور بچوں کواوپر پہنچادو۔ہم دوسری منزل سے ان کا مقابلہ کریں گے یہاں پر ہم محفوظ نہیں۔ان کی تعداد زیادہ ہے اوروہ چاروں طرف سے حویلی کے اندر گھسے چلے آرہے ہیں۔“

ٹھاکر”جی پتر“ کہتے ہوئے اندر کی طرف بھاگا۔

بلب ٹوٹنے کے بعد فائر کی آواز تو نہیں آئی البتہ صحن میں تین چار بندوں کے کودنے کے دھماکے ضرور سنائی دیئے۔یہ دھماکے

جنوبی دیوار کی سمت سنائی دیئے تھے جو میری نظروں سے اوجھل تھی۔ میری نظریں مسلسل چاروں طرف گھوم رہی تھیں ڈیوڑھی کی چھت پر مجھے ایک ہیولہ نظر آیا۔ میں نے بے دریغ دو گولیاں اس سمت میں جھونک دیں مگر وہ جلدی سے چھت پر لیٹ کر گولی سے بچ گیا۔ نامناسب روشنی کی وجہ سے مجھے صحیح نشانہ لینے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ جب تک کلاشن کوف کی ریئر سائیٹ سے فرنٹ سائیٹ کی ٹپ کو ملا کر فائر نہ کیا جاتا گولی کا نشانے پہ لگنا غیر یقینی تھا۔ دفاعی جنگ کے اصول کے مطابق ایک گولی سے ایک بندہ گرنا چاہئے اور مجھے ایک بندے کو مارنے کے لیے دو تین گولیاں چلانی پڑ رہی تھیں اور اس کا سب سے بڑا نقصان مجھے ایمونیشن کے ختم ہونے کی صورت بھگتنا پڑتا...... میرے پاس اس وقت اٹیچ میگزین کے علاوہ دو میگزینیں فالتو تھیں۔ تیس راؤنڈ فی میگزین کے حساب سے میرے پاس نوے راؤنڈ موجود تھے جن میں سے گیارہ بارہ راؤنڈ میں فائر کر چکا تھا۔

میں نے تین چار راؤنڈ صحن کے مختلف گوشوں میں داغ دیئے۔ مقصد ان کی پیش قدمی کو سُست کرنا تھا۔ میری طرف سے خاموشی کی صورت میں وہ میری پوزیشن پر ہلہ بول سکتے تھے اور تعداد کے لحاظ سے انھیں لامحالہ ہم پر فوقیت حاصل تھی اسی اثنا میں سیڑھیوں کی طرف سے مجھے ٹھاکر اور اس کے بچوں کی تیز تیز چلنے کی آواز آئی میں نے بے دریغ چند راؤنڈ مزید ہوا میں اڑا دیئے۔ گو ایک ایک راؤنڈ قیمتی تھا لیکن اس جگہ فائر کے ذریعے ہی ان کی پیش رفت کو روکا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ٹھاکر اپنے بیوی بچوں سمیت اوپر پہنچ چکا ہوگا، میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ میرے چند قدم پیچھے ہٹنے کی دیر تھی مشین گن کا ایک برسٹ اسی جگہ پر آ کر لگا جہاں چند سیکنڈ پہلے میں موجود تھا۔

''اس کا مطلب ہے ان کے پاس مشین گن بھی ہے۔'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا اور میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچتے ہی میں دو، دو، تین، تین سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے بجلی کی سی سرعت سے دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ ہمارا کمرہ سیڑھیوں کے سامنے ہی تھا میں غڑاپ سے کمرے میں داخل ہوا۔

مشین گن ایک مرتبہ پھر گرجی اور تمام گولیاں کمرے کے دروازے سے گزرتی ہوئی اندر آ گئیں مگر تمام لوگ دروازے کی دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے یوں وہ گولیوں سے محفوظ رہے۔

''جان!'' میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی شیتل ہیجانی لہجے میں چلائی۔ ''تم کہاں تھے۔'' یہ کہتے اس نے ٹھاکرانی کے پہلو سے اٹھ کر میری طرف بڑھنے کی کوشش کی، میں یکلخت چلایا۔

''بیٹھی رہو۔ کھڑکی کے سامنے سے مت گزرو'' اور وہ سہم کر دوبارہ ٹھاکرائن کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ للیتا اور کامنی بھی اپنی ماں کے پہلو میں گھسی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حد تو یہ کہ پرکاش بھی سکڑا سمٹا انھی کے درمیان موجود تھا۔

دو منزلہ کمروں کی چھت اس وقت میرے لیے بہترین مورچہ ثابت ہو سکتی تھی مگر اس صورت میں مجھے وہ کمرہ چھوڑنا پڑتا اور چھت پر رہ کر اس کمرے کی حفاظت میرے لیے ناممکن ہو جاتی۔ ڈاکو کسی بھی وقت ہلہ بول کر سیڑھیوں سے اوپر آ سکتے تھے اور ان کو روکنے کے لیے اکیلا ٹھاکر ناکافی تھا۔ عورتوں کو یرغمال بنا کر وہ آسانی سے میرے اوپر بھی قابو پا لیتے۔

کمرے میں رہ کر گو میں صحیح طریقے سے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اتنا اطمنان بہر حال مجھے حاصل رہتا کہ میری موجودی میں کسی بھی ڈاکو کا کمرے میں داخل ہونا آسان نہ ہوتا۔

کمرے کی لائٹ بجھا کر میں نے دروازہ مکمل کھول دیا اور خود دیوار کی آڑ میں لیٹ کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ڈاکوؤں کی طرف سے فائرنگ میں شدت آ گئی تھی، لیکن میں ایمونیشن کی کمی کے باعث ان کو مسلسل جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میری زیادہ توجہ سیڑھیوں کے اوپر تھی کہ وہاں سے اوپر کوئی نہ آ جائے۔

اچانک مجھے ڈیوڑھی کی چھت سے کود کر تین بندے برآمدے کی طرف آتے دکھائی دیئے میں نے شست لیتے ہوئے ٹریگر دبایا مگر گن سے ''ٹرچ'' کی آواز نکلی جو میگزین کے خالی ہونے کا اعلان تھا۔ میں نے خالی میگزین اتار کر نئی میگزین چڑھائی مگر اس وقت تک وہ تینوں برآمدے میں پہنچ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

''مُنّر!'' ٹھاکر جو میرے ساتھ لیٹا خاموشی سے باہر صحن میں جھانک رہا تھا مجھے میگزین بدلتے دیکھ کر آہستہ سے مجھے مخاطب ہوا۔

''جی چچا۔'' میں مختصراً بولا۔

''مُنّر ساری گولیاں ان کے مقابلے میں صرف نہ کر دینا۔ کم از کم میرے پریوار کی عورتوں کے لیے چند گولیاں ضرور بچا لینا۔ میں اپنے ہاتھ سے شاید انھیں نہ مار سکوں۔'' ٹھاکر کی بات سن کر میں حقیقتاً کانپ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ شیتل کو بھی مجھے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا پڑتا۔

''آپ اندیشہ نہ کریں چچا۔'' میں مضبوط لہجے میں بولا۔ ''یہ مرداران شاءاللہ اتنی جلدی ہم پر قابو نہیں پا سکیں گے۔''

''انشاءاللہ۔'' ٹھاکر ایک عجیب وارفتگی سے بولا۔ اس کے منہ سے ''ان شاءاللہ'' سن کر مجھے ایک عجیب سی لذت محسوس ہوئی تھی۔

سیڑھیوں کی طرف ہلکا سا کھٹکا سن کر میں اس سے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے سیڑھیوں کے جانب متوجہ ہو گیا۔ مگر بغور دیکھنے پر بھی مجھے کوئی ہیولہ دکھائی نہ دیا۔ میں نے اندازے سے دو فائر اس جانب داغ دیئے۔ ''تڑتڑ'' کی آواز سے کمرے کے جانب گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ مگر ہم محفوظ رہے۔ ڈائریکٹ گولی کی زد سے تو ہم محفوظ تھے البتہ پختہ دیوار سے اُچٹ کر کوئی گولی ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔

''ٹھاکر چچا آپ کے پاس کتنی گولیاں ہیں؟''

''دس بارہ راؤنڈ ہیں۔''

''کیوں؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔ ''اس دن تو کافی راؤنڈ اٹھا کر لائے تھے۔''

''وہ رائفلیں اور ایمونیشن سٹور کے اندر ہے۔'' ٹھاکر مایوسی سے بولا۔ ''میں جلدی میں وہ نکال نہیں سکا ہوں۔''

''ویسے یہ بلونت کا گروہ ہی ہے نا؟''

''اسی راکھشش کا گرہ ہے پتر۔انھوں نے غالباً انسپکٹر اکبر خان کو جو دھمکی آمیز چٹھی بھیجی تھی وہ دھوکا دہی کے لیے تھی ان کا اصل ٹارگٹ ہم تھے۔'' یہ الفاظ ٹھاکر کے منہ میں تھے کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ تین بندوں نے بھاگ کر سیڑھیوں سے اوپر آنا چاہا مگر ان کی بدقسمتی کہ میں تیار لیٹا تھا۔ہتھیار انھوں نے بھی فائرنگ پوزیشن میں رکھے ہوئے تھے لیکن فائر کی حسرت دل میں لیے ہی وہ پرلوک سدھارے۔میری مشین گن نے انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ان کے گرنے کے بعد بھی میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ان پر دو تین فائر کر دیے۔ان میں سے سب سے آگے والا بالکل دروازے کے سامنے آ کر گرا تھا۔

اچانک میگافون کے ذریعے کوئی زور سے بولا۔

''تمام لوگ ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔''

''پپ...... پولیس آ گئی پتر''۔ٹھاکر فرطِ خوشی سے کانپتا ہوا بولا۔

''شکر ہے اللہ کا چچا۔اب ڈاکو بھاگنے کی کوشش کریں گے۔آپ کمرے کی کنڈی لگا دیں۔میں انھیں چھت پر چڑھ کر روکتا ہوں۔''

''مگر پتر چھت۔''

''بحث کا ٹائم نہیں ہے۔'' میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''جب تک میری آواز نہ سنو دروازہ نہیں کھولنا۔'' یہ کہہ کر میں نے صحن میں جھانکا مگر کوئی ڈاکو مجھے نظر نہ آیا۔میں اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف دوڑا جن کے ذریعے میں چھت پر پہنچ سکتا تھا۔سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ کر میں نے مشین گن کندھے سے لٹکائی اور جلدی سے لوہے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر پہنچ کر میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ڈیوڑھی کی چھت پر مجھے دو بندے لیٹے ہوئے نظر آئے منڈیر کے قریب لیٹ کر میں نے نشست لی اور فائر کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔دونوں اسی جگہ ڈھیر ہو گئے۔

جنوبی دیوار کی طرف جھانکنے پر مجھے اصطبل کے قریب ڈاکوؤں کے چھ سات بندے نظر آئے جو کسی اہم مشورے میں مشغول تھے۔پولیس کی طرف سے بار بار اعلان دہرایا جا رہا تھا۔میں نے مشین گن سیدھی کی اور ان میں سے درمیان والے کا نشانہ لے کر سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں لبلبی دباتا تمام نے ہتھیار زمین پر پھینکتے ہوئے ڈیوڑھی کا رخ کیا۔''اس کا مطلب ہے یہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر رہے ہیں۔'' سوچتے ہوئے میں نے مشین گن کی بیرل نیچے جھکا دی۔خواہ مخواہ کی قتل و غارت مجھے پسند نہیں تھی۔جیسے ہی وہ تمام ڈیوڑھی میں داخل ہوئے میں بھاگ کر نیچے اترا اور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر آواز دی۔

''چچا دروازہ کھولو۔'' ٹھاکر شاید دروازے سے ہی لگا کھڑا تھا۔میری آواز سنتے ہی جھٹ دروازہ کھول دیا۔

''کیا ہوا پتر؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔''کیا تمام بھاگ گئے۔''

''نہیں چچا انھوں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔'' یہ الفاظ میرے منہ میں تھے کہ ڈیوڑھی سے پولیس کے سپاہی دندناتے

ہوئے اندر داخل ہوئے اور حویلی میں پھیلتے چلے گئے۔

''چچا میں چھت پر چھپنے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ مشین گن پکڑ لو میرے بارے میں انھیں پتا نہ لگنے پائے۔'' یہ کہتے ہی میں نے مشین گن اور اس کی فالتو میگزین ٹھاکر کے حوالے کی اور چھت کی طرف دوڑا۔ وہی ایسی جگہ تھی جہاں میں پولیس کی نظروں میں آنے سے بچ سکتا تھا۔

میں بمشکل چند قدم ہی لے سکا ہونگا کہ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

''رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔'' اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے مجھے ہی آواز دی تھی۔ میں نے بے ساختہ رکتے ہوئے دونوں ہاتھ اوراوپر اٹھا لیے۔

''پیچھے پھرو۔'' اسی آواز نے دوسرا حکم صادر کیا۔

میں جیسے ہی گھوما میرے چہرے پر تیز روشنی پڑھی اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

''یہ میرا بندہ ہے تھانیدار صاحب۔'' ٹھاکر غالباً اس کی آواز پہچان کر باہر نکلا تھا۔

''اچھا...... میں سمجھا تھا۔'' اچانک کچھ کہتے کہتے تھانیدار سوچ میں پڑ گیا اور پھر جیسے یکدم اسے کچھ یاد آیا اور اس نے ایک مرتبہ پھر ٹارچ جلا کر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور ہیجانی انداز میں چلایا۔

''ہاں یاد آیا...... یہ تو عمر جان کمانڈو ہے۔''

+++

میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ انسپکٹر اکبر خان نے مجھے پہچان لیا تھا اور میں چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں تھا۔ مشین گن میں اپنے ہاتھوں ٹھاکر کے حوالے کر چکا تھا۔ میں تھوڑی کوشش کر کے اگر انسپکٹر کو یرغمال بنا لیتا تو شاید وہاں سے بخیریت نکل جاتا مگر اس صورت میں ٹھاکر مجھے پناہ دینے کے الزام میں دھر لیا جاتا اور دلیش سے غداری کا انجام اس کے لیے کوئی اچھا نہ ہوتا۔ یہ ساری سوچیں ایک لمحے کے لیے میرے دماغ میں گھومیں اور اس سے پہلے کہ میں کوئی تدبیر کرتا ٹھاکر انسپکٹر اکبر خان کا میری طرف اٹھا ہوا پستول والا ہاتھ آہستگی سے پکڑ اینچے کرتا ہوا بولا۔

''کیا کر رہے ہو تھانیدار صاحب...... بتایا تو ہے اپنا بندہ ہے، اور تم اندر جاؤ پتر۔'' تھانیدار کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ میں تھانیدار کے چہرے کو دیکھتا کمرے کے اندر چلا گیا۔ سارے پولیس والے نیچے پوری حویلی میں پھر رہے تھے۔ اوپر تھانیدار کے علاوہ کوئی نہیں آیا تھا۔

''ٹھاکر تم نہیں جانتے......؟''

''مجھے پتا ہے''۔ ٹھاکر نے قطع کلامی کی۔''آپ کمرے میں آ کر میری ایک بات سن لیں۔

انسپکٹر گومگو کی کیفیت میں ٹھاکر کے ساتھ کمرے کے اندر چلا آیا۔

’’تمام اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔‘‘ ٹھاکر کمرے کی لائیٹ آن کرتا ہوا بولا۔’’شیتل کو بھی ساتھ لے جاؤ۔‘‘

سرلا دیوی ’’جی اچھا‘‘ کہہ کر شیتل کا ہاتھ پکڑے کمرے سے باہر چل دی۔ پرکاش کامنی اور للیتا بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔

’’بیٹھو تھانیدار صاحب۔‘‘ ٹھاکر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

’’ٹھاکر!۔‘‘ اکبر خان عجیب سے لہجے میں بولا۔’’تجھے پتا ہے کہ رشوت لینا میرے مذہب میں حرام ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے آج تک نہ رشوت لی ہے نہ دی ہے۔اس لیے تم بھی اس طرح کی کوئی کوشش نہ کرنا۔‘‘

’’یہ بات اگر مجھے پتا نہیں ہوگی تو کس کو ہوگی۔‘‘ ٹھاکر اطمینان سے بولا۔’’پرنتو آپ ظالم بھی تو نہیں ہیں......نا......؟ عمرجان اگر تخریب کار یا دہشت گرد ہوتا تو آپ کو پورا ادھیکار تھا کہ اسے گرفتار کر کے سرکار کے حوالے کریں۔‘‘

’’تمھیں کیسے پتا چلا کہ عمرجان، دہشت گرد نہیں ہے؟‘‘ تھانیدار مستفسر ہوا۔’’اور یہ بھی یاد رکھنا کہ دہشت گرد سے مراد خالی خولی بم دھماکے کرنے والا نہیں ہوتا۔کسی دوسرے ملک میں ناجائز داخل ہو کر اس کے راز حاصل کرنے والا یعنی جاسوس بھی اس زمرے میں آتا ہے اور قانوناً وہ بھی مجرم ہی ہوتا ہے۔‘‘

’’یہ بھی ٹھیک ہے۔‘‘ ٹھاکر کا اطمینان برقرار تھا۔’’پرنتو کوئی ان میں سے کسی جرم میں ملوث نہ پایا جائے اور بھٹک کر کسی دوسرے ملک کی سرحد پار کر لے تو اس کے لیے آپ کا قانون کون سا ایکٹ لاگو کرتا ہے۔‘‘

’’اس کا فیصلہ کرنے والے میں اور تم نہیں کہ آیا بھٹک کر سرحد پار کرنے والا واقعی بھٹک کر آیا ہے۔یا ہمیں بھٹکا رہا ہے۔‘‘

’’نہیں تھانیدار صاحب، اب آپ بات کو گول مول کرنے لگے ہیں ایسے پھوکٹ میں کسی کو ٹارچر کرنا جبکہ وہ بے قصور بھی ہو صرف انڈین ایجنسیوں کو ہی شوبھا دیتا ہے۔‘‘

’’ٹھاکر تُو بھی انڈیا کا ہی ہے......اور دھرتی ماتا کی حفاظت کی ذمہ دار صرف پولیس، کوئی سرکاری اہلکار یا ’’را‘‘ کا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔اس کی حفاظت کرنا تمام جنتا کا فرض ہے۔‘‘

’’اوش فرض ہے، لیکن اس کے لیے کسی بے قصور کی بھینٹ دینا کہاں کی دانش مندی ہے۔‘‘ میں اس دوران خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ٹھاکر میرے حق میں بڑے اچھے دلائل دے رہا تھا۔شاید میں اس انداز میں انسپکٹر سے بحث نہ کر سکتا۔

’’تمھارے پاس اس کی بیگناہی کا کیا ثبوت ہے۔‘‘ انسپکٹر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے مستفسر ہوا۔

’’ثبوت سے اگر آپ کی مراد کوئی دستاویزی ثبوت ہے تو میں شما چاہوں گا۔‘‘ ٹھاکر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔’’البتہ اگر آپ میری شاکسی (گواہی) پر اعتبار کر سکتے ہیں تو پھر مان لو کہ عمرجان نردوش ہے۔‘‘

’’ٹھاکر مجھے مطمئن کرنے کے لیے صرف تمھاری گواہی کافی نہیں ہے۔‘‘

''تھانیدار صاحب۔'' میں نے کہا۔'' آپ مسلمان ہیں اور الحمدللہ میں بھی خدائے وحدہ لاشریک کو ماننے والا ہوں اور اس علیم وخبیر ہستی کی قسم کھا کر میں یہ کہتا ہوں کہ میں کسی منصوبے کے تحت انڈیا میں داخل نہیں ہوا۔ میں بالکل لاعلمی میں اور راستا بھول کر ادھر آنکلا ہوں۔ ابھی اس سے بڑا کوئی اور ثبوت میرے پاس نہیں ہے جو میں آپ کو پیش کروں۔''

''اس کے علاوہ کسی اور ثبوت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' انسپکٹر اکبر خان مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔

''اس کی بات سن کر ٹھاکر نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی تھی۔

''ٹھاکر صاحب۔'' تھانیدار نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔'' آؤ چلیں فی الحال حویلی کا جائزہ لیتے ہیں اس کے بعد ڈاکوؤں کے بارے تفصیلی رپورٹ وغیرہ بھی تیار کرنی ہوگی۔ میں دوپہر کے ٹائم آؤں گا پھر عمر جان کے مسئلے پر تفصیلی بات چیت کریں گے کہ اس کو پاکستان پہنچانے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''دھنے واد تھانیدار صاحب۔'' ٹھاکر اس کے ساتھ اٹھتا ہوا بولا۔'' عمر پتر آپ بھی آرام کرو۔''

''ٹھیک ہے چچا جان۔'' میں نے کہا اور وہ دونوں سر ہلاتے کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

چارپائی پر لیٹے مجھے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ شیتل کمرے میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا کہہ رہا تھا انسپکٹر؟'' وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔''ٹھاکر مطمئن دکھائی دے رہا ہے اور آپ پریشان سے لگ رہے ہیں۔''

''آں...... ہاں...... انسپکٹر؟'' میں اپنے خیالات سے چونکتا ہوا بولا۔'' وہ مجھے بے گناہ سمجھتے ہوئے میری مدد پر آمادہ ہو گیا ہے۔''

''پھر آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔''

''خوش ہی تو ہوں۔'' میں خوشدلی سے بولا۔''بس تھوڑی تھکن ہے جس کی وجہ سے تمھیں پریشان لگ رہا ہوں۔''

''ہاں آپ کافی دیر ڈاکوؤں سے مقابلہ بھی تو کرتے رہے ہیں۔ کہیں چوٹ تو نہیں لگی ہے۔''

وہ ہنوز میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور اس کے ملائم ہاتھوں کا لمس مجھے بہت سکون دے رہا تھا۔''

''نہیں۔'' میں بمشکل بول پایا۔ نیند مجھ پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ کو نیند آ رہی ہے۔'' وہ چاہت سے بولی۔''چلو سو جاؤ۔'' اور میں اسے جواب دیئے بغیر نیند کی گہری وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

میری آنکھ کھلی تو شیتل مجھے ادھر ہی بیٹھی نظر آئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے بڑی محویت سے میرے چہرے کو گھور رہی تھی اور اس کا ایک ہاتھ مسلسل میرے بالوں میں سرسرا رہا تھا۔ اس کی دلکش خوب صورت گہری سیاہ آنکھوں میں مجھے اپنے لیے بے پایاں محبت کا احساس ہلکورے لیتا ہوا

محسوس ہوا۔ مجھے یکدم اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی جھیل ایسی گہری آنکھوں میں جھانک کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں وہ میری کمزوری نہ بھانپ لے۔

''اٹھو...... نا...... دوپہر ہونے والی ہے۔'' وہ لگاوٹ سے بولی۔ ''نہا لو۔ دیکھو کپڑے کتنے میلے ہو رہے ہیں۔ بدل لو۔'' میں جلدی سے اٹھ بیٹھا اور کہا۔

''تم بھی نہا لو نا......اور للیتا سے کوئی ڈھنگ کے کپڑے لے کر پہن لو۔''

''میں بھی بس آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ مترنم لہجے میں بولی۔ ''ابھی میں جاتی ہوں سرلا آنٹی دو دفعہ ادھر آ چکی ہیں لیکن صاحب جی کی نیند ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔''

''تو اٹھا دیا ہوتا...... نا؟''

''کیوں؟'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

''شاید انھوں نے کوئی ضرورت بات کرنی ہو۔''

''میرے لیے آپ کی نیند سے کوئی چیز اہم نہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ میرے پاس سے اٹھ کر باہر چل دی۔ میں نے بھی بستر سے اُٹھ کر بوٹ پاؤں میں ڈالے۔ میرا ارادہ نہا کر کپڑے بدلنے کا تھا۔ اسی وقت پرکاش ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا۔

''بھیا، انسپکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔''

''ان سے ملنے سے پہلے نہا نہ لوں؟''

''نہیں۔'' پرکاش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے مجھ سے مل لو۔''

''چلو پھر۔''

انسپکٹر اکبر خان سول کپڑوں میں تھا۔ دن کی روشنی میں میں نے اس کا بغور مشاہدہ کیا۔ درمیانہ قد۔ متناسب جسم، سیاہ گھنگریالے بال، کشادہ پیشانی، چمکدار آنکھیں جو مقابل کو اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوتیں اور اٹھی ہوئی ستواں ناک مجموعی طور پر وہ پُر رعب اور وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آؤ عمر بھائی۔'' اس نے معانقے کے لیے اپنے بازو پھیلائے۔ میں نے بھی اسے چھاتی سے لگا کر پُر جوش انداز میں دبایا۔

''بیٹھو۔'' وہ کرسی کی طرح اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

میں جواباً بولا۔ ''آپ بھی بیٹھیں نا؟'' ہم دونوں کرسیاں سنبھال کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''سناؤ انسپکٹر صاحب کیا ہوا ڈاکوؤں کے مسئلے کا؟'' میں بیٹھتے ہی مستفسر ہوا۔

''وہ تو تقریباً حل ہی سمجھو۔ تیرہ ڈاکو تو آپ کے ہاتھوں جہنم واصل ہو گئے تھے۔ باقی کے آٹھ نے گرفتاری پیش کر دی۔ ہلاک

ہونے والوں کی ہلاکت کا سہرا پولیس کے سر ڈال دیا ہے۔ ایس پی صاحب سے فون پر بات ہوئی ہے۔ یہ سب سن کر بہت خوش ہوا اور نمایاں کارکردگی دکھانے والے پولیس اہلکاروں کے لیے انعام اور ترقی کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اب صرف آپ کا مسئلہ حل طلب ہے۔''

''میرا مسئلہ تو انڈیا سے نکلنا ہے......اس سلسلے میں آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔''

''میرے بس سے باہر ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''البتہ انڈیا کے جس کونے کا کہو وہاں تک پہنچا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے مجھے بمبئی تک پہنچا دو۔''

''ہاں یہ میرے لیے اتنا مشکل نہیں ہوگا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ''ٹھاکر صاحب نے بھی مجھ سے یہی درخواست کی تھی۔'' مجھے یہ کہتے ہی وہ پرکاش سے مخاطب ہوا۔ ''پرکاش گلو کو بلا لاؤ۔'' اور پرکاش جو بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ ''جی اچھا'' کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور پھر ایک ملازم نما شخص کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

''یہ میرا ذاتی حجام ہے۔ بلکہ خاندانی حجام کہوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔'' انسپکٹر اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا اور میں نے کرسی سے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور ساتھ پڑی کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''بیٹھو۔''

''نہیں گلو۔'' اکبر خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم اس کے بال چھوٹے کر دو اور اس کی داڑھی مونچھیں بھی صاف کر دو۔''

''جی سر'' کہہ کر گلو نے اپنے کندھے سے لٹکا تھیلا اتارا اور اس میں سے مطلوبہ اوزار اور سفید کپڑا نکالا اور سفید کپڑا مجھے اوڑھا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ میرے بال کافی بڑے ہو گئے تھے۔ کیونکہ تین چار مہینے سے کٹوانے کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔

''ایک بات پوچھ سکتا ہوں......عمر؟'' انسپکٹر مستفسر ہوا۔

''کیوں نہیں۔''

''بمبئی پہنچ کر آپ کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟''

''یہ آپ کو تو خود بخود جاننا چاہئے۔'' میں حیرانی سے بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن میں آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''

''میرا ارادہ انڈر گراؤنڈ لوگوں سے روابط بڑھا کر سمندر کے راستے پاکستان جانے کا ہے۔ کیونکہ جائز اور قانونی طریقے سے تو یہ کام ناممکنات میں سے ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' انسپکٹر اکبر خان نے کہا۔ ''لیکن اس طریقے سے بھی آپ کا انڈیا سے نکلنا مشکل ہے۔''

''کیوں؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''اس کی وجہ ہے شیش ناگ۔'' انسپکٹر اکبر خان پُراسرار لہجے میں بولا۔

''شیش ناگ؟''

''ہاں......شیش ناگ......کوبرے کا چھوٹا بھائی۔ جو تیرے خون کا پیاسا ہے۔ اس نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ عمر جان عرف جانو کمانڈو کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرے گا چاہے اس کے لیے اسے پاکستان کیوں نہ جانا پڑے۔''

''میرا خیال ہے یہ سارا سانپوں کا خاندان ہے۔'' میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''بہر حال اس کی قسم سے میرا سمندر کے راستے جانا کیوں کر مشکل ثابت ہوا۔'' اس وقت ٹھاکر کمرے میں داخل ہوا اور ہمیں گفتگو میں مشغول دیکھ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''شیش ناگ زیرِ زمین دنیا کا ایک بڑا نام ہے۔ بمبئی زیرِ زمین ورلڈ پر آج کل سیٹھ رابندر ناتھ کی حکمرانی ہے اور شیش ناگ اس کا دایاں بازو سمجھا جاتا ہے۔ آپ کا انبالہ سے دہلی پہنچنا اور پھر وہاں سے بھی فرار ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کا رخ بمبئی کی طرف ہے۔ اگر آپ انبالہ سے دہلی کی بجائے جالندھر کا رخ کرتے تو آپ کا ارادہ پہاڑی راستے سے سرحد عبور کرنے کا ہوتا۔ اب تو ایک اوسط درجے کی ذہنیت کا مالک بھی سمجھ سکتا ہے کہ آپ بمبئی کا راستا ہی اختیار کریں گے اور آپ کے سواگت کے لیے انھوں نے پہلے سے بمبئی میں تیاریاں مکمل کر رکھی ہیں۔''

''ایک رابندر ناتھ گروہ ہی تو بمبئی میں نہیں رہتا نا......بمبئی تو جرائم پیشہ افراد کا گڑھ ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انسپکٹر کا اطمینان برقرار تھا۔ ''لیکن ان جرائم پیشہ افراد کے روابط ایک دوسرے سے بہت راسخ ہوتے ہیں۔ مخالفت کے باوجود کسی تیسرے یعنی باہر کے آدمی کے لیے یہ ایک ہو جاتے ہیں۔''

''تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''اس صورت میں میرا مشورہ ہے کہ آپ کم از کم ایک ماہ تک منظرِ عام سے ہٹ جائیں تاکہ آپ کی تلاش کا کام سرد پڑ جائے، اس کے بعد آپ کسی بھی راستے انڈیا سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس دوران میں کوشش کروں گا کہ کسی اعتبار والے آدمی کے ساتھ مل کر آپ کے لیے نقلی کاغذات تیار کرا دوں اور یوں آپ بڑی آسانی سے انڈیا سے کسی دوسرے ملک ہوائی راستے سے جا سکتے ہیں اور پھر وہاں سے پاکستان پہنچنا بالکل آسان ہوگا۔ جہاں تک تعلق ہے چھپ کر مہینا گزارنے کا اس کے لیے میری نظر میں ٹھاکر کی حویلی بالکل فٹ ہے۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' ٹھاکر جو خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا اکبر خان کے چپ ہوتے ہی اس کی تائید میں نعرہ لگاتے ہوئے بولا۔

''بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔'' میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ انسپکٹر صاحب آپ میرے گھریلو حالات سے واقف نہیں۔ یہاں پر میرا ایک ایک منٹ جیسے صدیاں بن کے گزر رہا ہے۔ میرے بس میں ہو تو میں اُڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کی مرضی۔'' انسپکٹر کندھے اچکاتا ہوا بولا۔ ''میں نے آپ سے بمبئی پہنچانے کا وعدہ کیا ہے اور کل تک انشاء اللہ میں اپنا وعدہ پورا کر دوں گا۔'' اس کے جواب میں مَیں کچھ نہ بول سکا کیونکہ شیو کے لیے صابن لگانے کے بعد گلوُ اُسترا سنبھال چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب گلو نے ایک دستی آئینہ میرے سامنے پکڑا تو ایک لمحے کے لیے میں خود کو نہ پہچان سکا۔

''ویسے آپ کو خود اس چیز کا خیال نہیں آیا تھا۔'' مجھے حیرانی سے اپنا چہرہ تکتے دیکھ کر اکبر خان مستفسر ہوا۔

''آیا تھا......لیکن موقع نہ مل سکا۔''

''گلو باہر گاڑی میں رکھا سوٹ، عمر بھائی کے لیے نکال لاؤ۔''

''جی سر۔'' کہہ کر گلو باہر نکل گیا۔

''یہ قابل اعتماد ہے؟'' اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے انسپکٹر اکبر خان سے پوچھا۔

''بالکل یہ پولیس کا ایک قابل اعتماد مخبر ہے......اور باقاعدہ تنخواہ دار سپاہی ہے لیکن اس نے کبھی وردی نہیں پہنی اپنی تنخواہ سے زیادہ یہ حجام کے کام میں پیسے کما لیتا ہے۔ میرے لیے یہ بالکل چھوٹے بھائیوں جیسا ہے اور میں نے مستقل اسے اپنے لیے مختص کیا ہوا ہے۔ میری کوئی بھی بات اس سے مخفی نہیں۔ اس کے کارآمد ہونے کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ سیٹھ ہری چرن داس کی بیٹی کو ایک نظر دیکھ کر اس نے پہچان لیا۔ حالانکہ اصولاً ایک انسپکٹر ہونے کے ناطے مجھے اسے پہچاننا چاہیے تھا، لیکن اس کا فوٹو دیکھنے کے باوجود میں اس پر دھیان نہ دے سکا۔''

''شیتل کو اس نے کس وقت دیکھا؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''اگر سیٹھ ہری چرن کی بیٹی کا نام شیتل ہے تو اس کو گلو نے ابھی باتھ روم جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اسے ٹھاکر کی کوئی رشتہ دار سمجھ رہا تھا۔'' انسپکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے یہ یہاں کیسے پہنچی؟''

''یہ میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔'' میں نے ٹھاکر سے پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کے ساتھ......مگر کیسے؟'' اور اس کے استفسار پر میں نے مختصراً شیتل کی کہانی سنا دی۔

''رگھو دادا......وہی دہلی کے مشہور دادا کے متعلق کہہ رہے ہو نا؟''

''شاید وہی ہو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا آپ اس مکان کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟'' انسپکٹر اکبر خان بے چینی ظاہر کی۔

''کیوں نہیں۔'' میں اعتماد سے بولا۔ ''آپ کاغذ پنسل لا دیں میں آپ کو اس جگہ کا مکمل نقشہ بنا کر دے سکتا ہوں۔''

''ابھی لو۔'' انسپکٹر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا ارادہ شاید اپنی کار سے پنسل کاغذ لانے کا تھا۔ مگر گلو کو کمرے کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''گلو سوٹ ادھر کرسی پر رکھو اور بھاگ کر گاڑی سے پنسل کاغذ نکال لاؤ۔''

''جی سر۔'' کہہ کر گلو ایک مرتبہ پھر کمرے سے نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ بہت جلدی واپس لوٹا۔ اس نے ایک نوٹ بک اور پین لا کر اکبر خان کے حوالے کیا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے نوٹ بک کھول کر ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اندازے سے ٹھاکر کی بستی رام پورہ سے رگھوداداکے اڈے تک کا خاکہ ساتیار کردیا۔ بعض جگہوں پر میں نے ضروری اندراج بھی کر دیئے۔اس دوران انسپکٹر اکبر خان بے چینی سے پہلو بدلتا رہا اور یہ بے چینی اس بات کی غماز تھی کہ رگھوداداکی موت کا کارنامہ وہ اپنے نام سے کیش کروانا چاہ رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے اپنے کام سے فارغ ہوکر نوٹ بک اس کے حوالے کی اس نے جھپٹ کر نوٹ بک پکڑلی اور جلدی جلدی اس پر نگاہ دوڑانے لگا۔

ایک دو جگہوں کے متعلق مجھ سے استفسار کرنے کے بعد اس نے مطمئن ہوکر نوٹ بک جیب میں ڈالی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''عمر بھائی ابھی آپ مجھے اجازت دیں کل انشاءاللہ میں سویرے آجاؤں گا۔پھر بمبئی کی طرف چلیں گے۔''

''کھانا تو کھا کر جائیں۔''ٹھاکر جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا جلدی سے بولا۔

''نہیں ٹھاکر صاحب کھانے کا ٹائم نہیں ہے۔''

''اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''میں نے پُر خلوص پیش کش کی۔

''آپ کی مدد کی ضرورت تو تھی لیکن مجھے ڈر ہے کہ کوئی پولیس والا آپ کو پہچان نہ لے اور ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے پھر ہمیں اجازت۔''انسپکٹر اور گلو ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

''پتر آپ جلدی سے نہالیں بھوجن تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہے۔''

''میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔''میں چٹکی بجاتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی انسپکٹر اکبر خان کا لایا ہوا سوٹ اٹھا کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔راستے میں مجھے ٹھاکر کا ایک ملازم کمرے کے جانب آتا ہوا ملا۔اس نے ہاتھ میں ایک ڈبہ سا پکڑا ہوا تھا۔مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔

''صاحب جی!......تھانیدار صاحب نے آپ کے لیے جوتے بھیجے ہیں۔''

''اچھا کمرے میں رکھو میں آرہا ہوں۔''اور وہ سر ہلاتا ہوا کمرے کے جانب بڑھ گیا۔

خوب جی بھر کر نہانے کے بعد میں نے سوٹ پہنا۔وہ حیران کن انداز میں مجھے فٹ تھا واقعی اکبر خان کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ ٹائی باندھنے کا طریقہ مجھے نہیں آتا تھا اس لیے وہ لپیٹ کر میں نے جیب میں ڈال لی۔پستول اور رقم میں دوسرے کوٹ کی جیب میں منتقل کرنا نہیں بھولا تھا۔

کمرے میں شیتل بن ٹھن کر میرے انتظار میں بیٹھی تھی اس نے للیتا سے شلوار قمیض لے کر پہن لی تھی۔وہ خاموشی سے میرے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور ہم دونوں کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔پورا خاندان ہم دونوں کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ہمیں دیکھ کر ان

کی آنکھوں میں ستائش کے آثار بڑی شدت سے ابھرے تھے۔

''آؤ پتر! بیٹھو۔'' ہمیں دیکھتے ہی ٹھاکر نے کہا۔''بڑی دیر کر دی۔''

''ہاں انکل۔'' میں مسکراتا ہوا بولا۔''بس ذرا لش پش نکال رہے تھے۔''

''واہ گرو کی کرپا سے آپ دونوں ہر لباس میں اچھے لگتے ہو پتر۔'' ٹھاکر پُر خلوص لہجے میں بولا۔

''یہ آپ کی خوب صورت نظر کا کمال ہے ٹھاکر چچا۔'' میں ممنونیت سے بولا۔ اسی وقت ایک ملازم ٹیبل پر ہمارے آگے کھانا چننے لگا۔

''چچا...... ڈاکوؤں کے حملے سے کتنا نقصان ہوا ہے۔''

''ایک چوکیدار سورگباش ہوا ہے۔ باقی کے دونوں ملازموں نے گھوڑوں کے اصطبل میں چھپ کر اپنی جان بچالی تھی۔'' ٹھاکر نے کہا۔''یہ تو واہ گرو کی کرپا سے آپ ادھر موجود تھے ورنہ پتا نہیں وہ ہمارا کیا حشر کرتے۔''

''پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی تھی۔'' میں نے وہ سوال پوچھا جو مجھے انسپکٹر اکبر خان سے پوچھنا چاہئے تھا، لیکن اپنے مسئلے میں الجھ کر مجھے اس سے یہ پوچھنے کا خیال نہیں رہا تھا۔

''تھانیدار صاحب کو پہلے سے شک تھا کہ بلونت کے بھائی آنند میں اتنی جرأت نہیں کہ تھانے پر حملہ کر سکے۔ یہ ضرور کوئی چال ہے۔ اس لیے وہ پولیس فورس کے ساتھ رام پورہ تھانے میں ان کے حملے کا منتظر رہا۔ اس کی نظر میں ڈاکو یا تو رام پورہ چوکی پر حملہ آور ہوتے یا پھر میرے گھر پر...... اور اس کا دوسرا اندازہ ٹھیک نکلا، لیکن تھانیدار صاحب سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ اسے اپنی فورس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھی فورس میری حویلی میں رکھنی چاہئے تھی اور باقی ماندہ چوکی میں۔ یہ تو شکر ہے واہ گرو کا کہ آپ حویلی میں موجود تھے ورنہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ڈاکو ہمارا کام کر دیتے۔''

''اچھا اب کھانا شروع کرو۔ گپ شپ بعد میں ہوتی رہے گی۔'' سرلا دیوی روسٹ مرغے کا ڈونگہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ گوشت کے بارے میں شاید ٹھاکر نے ان کو کوئی خصوصی حکم دیا تھا کہ گوشت سے بنی ہوئی دو تین ڈشیں ڈائننگ ٹیبل پر نظر آ رہی تھیں اور اس کی وجہ یہی تھی کہ پہلے وہ میرے مسلمان ہونے سے ناواقف تھے ٹھاکر نے بھی کسی مصلحت سے ان کو نہیں بتایا تھا۔ بہر حال کل کا ازالہ انھوں نے آج کے مینو سے کر دیا تھا۔

یوں بھی جس کھانے میں گوشت شامل نہ ہو تو مسلمان آدمی کو وہ کھانا ہی نہیں لگتا شیتل نے البتہ صرف سبزی پر اکتفا کیا تھا اور اس کا ساتھ صرف سرلا دیوی نے دیا تھا۔ باقی تمام نے بڑی رغبت سے گوشت کی ڈشوں پر ہاتھ صاف کئے تھے۔

کھانے کے بعد چائے پی گئی اور اس کے بعد میں اور ٹھاکر حویلی میں چہل قدمی کرنے لگے۔ پرکاش نے اس مرتبہ بھی عورتوں میں بیٹھنا پسند کیا تھا۔ اس کا محبوب مشغلہ شیتل کو گھورنا تھا۔ وہ کمبخت تھی ہی اتنی خوب صورت کہ اچھے بھلے ہوش مندوں کے ہوش اُڑا دیتی تھی۔ پرکاش کی یہ دلچسپی ٹھاکر یا دوسروں سے ڈھکی چھپی نہیں تھی، لیکن اس بات پر ٹوکنے کی ضرورت ٹھاکر نے شاید اس لیے محسوس نہیں کی

تھی کہ وہ میرے اور شیتل کے تعلق سے واقف تھا۔اس کی ماں اور بہنوں نے اسے روکا ٹوکا تھا یا نہیں اس بارے میں لاعلم تھا۔ بہر حال انڈین ثقافت کے لحاظ سے یہ کوئی اتنی معیوب بات نہیں تھی۔

''ابھی تو شیتل آپ کے ساتھ ہی جائے گی نا؟'' ٹھاکر خاموشی توڑتا ہوا بولا۔

''مجبوری ہے۔'' میں کندھے اچکا کر بولا۔

''اگر میں اپنی بہو کے طور پر اسے پسند کرلوں......تو؟'' ٹھاکر مستفسر ہوا۔

''میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔'' میں رضامندی سے بولا۔''اگر شیتل مانتی ہے تو آج ہی دونوں کو بیاہ دو۔''

''خیر اتنی آسانی سے تو وہ نہیں ماننے لگی۔'' ٹھاکر ہنستے ہوئے بولا۔''اس کے پتا جی سے بات کرنی پڑے گی۔''

''چلو جیسے آپ کا جی چاہے اسی طرح کرلینا۔'' میں اس لایعنی موضوع سے جان چھڑاتے ہوئے بولا۔شاید لاشعوری طور پر مجھے شیتل کی کسی اور کے ساتھ شادی کی بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''صبح تو تھانیدار صاحب کے آنے کے بعد ہی جانا ہو سکے گا۔''

''جی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہم گھنٹا ڈیڑھ حویلی میں چہل قدمی کرتے رہے۔اس دوران ٹھاکر مجھے بمبئی کے بارے مختلف قسم کی معلومات مہیا کرتا رہا۔

''اس کا مطلب ہے اگر ہم بغیر آرام کیے چلتے رہیں تو بمبئی تک بیس پچیس گھنٹوں میں ہی پہنچیں گے۔''

''بالکل۔'' ٹھاکر نے کہا۔''لیکن راستے میں آرام نہیں کرو گے تو کھانے پینے اور دوسری ضروریات کے لیے تو رکنا پڑے گا نا؟''

''چلو پھر کمرے میں چلیں تاکہ میں زیادہ سے زیادہ آرام سٹور کرلوں۔'' میں ہنستے ہوئے بولا اور ہم دونوں اندرونی حویلی کی جانب بڑھ گئے،لیکن آرام میری قسمت میں نہیں تھا۔دور ہی سے مجھے پرکاش اور کامنی کے نعرے سنائی دینے لگے۔

''کیا ہو گیا بھئی؟'' ہم جیسے ہی کمرے میں گھسے ٹھاکر مستفسر ہوا۔

وہ چاروں کارپٹ پر آمنے سامنے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔شیتل اور للیتا غالباً بازی ہار گئے تھے۔ٹھاکر کے پوچھنے پر کامنی نے یہی کچھ جوش وخروش سے بتایا تھا۔

''اچھا۔اب ہم دونوں کے ساتھ کون کھیلے گا؟'' ٹھاکر بچوں کے سے لہجے میں بولا۔یہ اس کی خوبی تھی کہ روزمرہ کے مسائل میں وہ سنجیدہ،بُردبار،اور نہایت ہوش مند نظر آتا تھا۔مگر اس کے برعکس جب اپنے بچوں کے درمیان گپ شپ کے لیے بیٹھتا تو روایتی سکھ دکھائی دیتا تھا۔

''مگر مجھے تو کوئی خاص کھیلنا نہیں آتا۔'' میں نے جان چھڑانی چاہی۔

''جیسے بھی کھیلنا آتا ہے،اب تو کھیلنا پڑے گا۔تمھاری وائف نے پرکاش بھیا کو چیلنج کیا تھا اور ہار گئی۔اب کیا بدلہ نہیں لو گے؟''

کامنی تیز لہجے میں بولی۔

''اچھا'' میں گویا ہار مانتے ہوئے بولا۔''چلو ٹھاکر چچا پھر جیتی ہوئی ٹیم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔''

''نہیں......نہیں۔'' کامنی نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کی۔''آپ اور بھابی بیٹھیں۔''

''ڈیڈی کو بیٹھنے دو گڑیا۔'' پرکاش نے کہا۔''ان دونوں کے ساتھ صحیح مزہ نہیں آئے گا۔''

''چھوڑیں ٹھاکر چچا کو۔'' میں تاش کی گڈی پکڑ کر شیتل کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔''اپنی جنگ ہم خود لڑیں گے۔'' تمام میری بات پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

پتے لگا کر میں نے مہارت سے بانٹے اور پہلی دفعہ میں ان کو بازی ہو گئی۔ پرکاش اور کامنی ایک دوسرے کو الزام دینے لگے۔ دونوں کا مؤقف تھا کہ دوسرے کی غلطی سے بازی ہوئی ہے۔

''چلو جس کی بھی غلطی تھی گیم تو برابر ہو گئی نا۔'' میں اطمینان سے بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن ہار جیت کا تو فیصلہ ہونا چاہیے نا؟'' پرکاش اسی انداز میں بولا۔

''ایک اور بازی کھیلتے ہیں۔''

''جیسے تمھاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

اس مرتبہ بھی پہلے ہاتھ پر ان کو بازی ہو گئی۔ ٹھاکر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''یہ تمھارے بس کی بات نہیں ہے پُتری!'' ٹھاکر کامنی کی جگہ بیٹھتا ہوا بولا۔''عمر پُتر کافی منجھا ہوا کھلاڑی لگتا ہے۔''

لیکن یہ ٹھاکر کی بھول تھی کہ وہ خود میدان میں اتر کر عمر کو ہرا لے گا۔ پہلی بازی ہارتے ہی اس نے پتے پھینک دیئے۔

''تیری گیم ہماری بدھی میں نہیں آ رہی پُتر۔'' ٹھاکر کھلے دل سے بولا۔

''جان بھیا مجھے بھی اس طرح کھیلنا سکھا دو نا۔'' للیتا میری بغل میں گھستی ہوئی بولی۔''تاکہ میں بھی پرکاش بھیا سے اپنی شکست کے بدلے لے سکوں روزانہ مجھے ہراتا رہتا ہے۔'' میں نے کن انکھیوں سے شیتل کے جانب دیکھا، وہ للیتا کے اس طرح میرے ساتھ مل کر بیٹھنے پر بڑے کڑے تیوروں سے اسے گھورنے لگی تھی۔ لیکن میں جان بوجھ کر اس سے انجان بن کر للیتا سے بولا۔

''چھوڑو اس گیم کی چالوں کو میں تمھیں جادو کی گیمیں سکھاتا ہوں۔''

''واقعی؟'' وہ حیرانی سے بولی۔''آپ کو جادو کی گیمیں آتی ہیں۔''

''ایسی ویسی۔'' میں نے مصنوعی فخریہ لہجے میں کہا۔

''میں بھی سیکھوں گی۔'' کامنی بھی بھاگ کر میرے پاس آ بیٹھی اور میں تاش کی گڈی پکڑ کر انھیں شعبدہ بازیاں دکھانے لگا۔ شیتل بڑے غصے سے مجھے گھور رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ان دونوں کو کچا ہی چبا جاتی۔

میں دل ہی دل میں اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ للیتا کچھ زیادہ ہی پُر جوش ہو رہی تھی۔ کسی نوجوان لڑکی کا مرد سے اٹھکیلیاں کرنا بلاشبہ ہمارے معاشرے میں معیوب ہے مگر انڈین معاشرے میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں شیتل جیسی عقل وخرد سے بیگانہ کر دینے والے حسن کی مالک لڑکی بھی مجھے کوئی خاص متاثر نہیں کر سکتی تھی، کجا للیتا جیسی عام شکل وصورت کی لڑکی جس کی خوبی صرف اتنی تھی کہ وہ جوان تھی۔

شیتل زیادہ دیر للیتا کی پیش قدمی کو برداشت نہ کر سکی اور للیتا سے بولی۔

"للیتا چھوڑو تاش کو...... چلو میرے ساتھ مجھے اپنے کپڑے دکھاؤ تاکہ میں ان میں سے اپنے لیے ایک دو جوڑے پسند کر لوں۔ کل ہم نے جانا ہے میرے پاس صرف یہی کپڑے ہیں جو میں نے پہنے ہوئے ہیں۔" شیتل کی مکاری دیکھ کر میرا دل چاہا کہ قہقہہ لگا کر ہنس دوں لیکن مجبوراً مجھے اپنی ہنسی دبانی پڑی اور میں زیر لب مسکرا کر نیچے دیکھنے لگا۔

"چلتے ہیں دیدی!" للیتا نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ "ابھی تک تو شام ہونے میں بھی کافی دیر ہے اور آپ نے تو صبح جانا ہے۔"

"بُری بات بیٹا۔" ٹھاکر نے للیتا کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی چلو اور اپنی بہن کو کپڑے دکھاؤ واپس آ کر عمر پتر سے جو کچھ سیکھنا ہو سیکھ لینا عمر بھی تو صبح تک ادھر ہی ہے۔" اور للیتا بادل نخواستہ اٹھ کر شیتل کے ساتھ چل دی۔

"تم بھی چلو گڑیا۔" میں نے تاش کی گڈی اکٹھی کر کے کامنی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی نہیں بھیا۔" وہ لاڈ سے بولی۔ "للیتا دیدی چلی گئی ہے اس کی غیر موجودی مجھے دو تین گیمیں سکھا دو نا؟"

"نہیں۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "للیتا کو پتا چل گیا تو وہ میری جان کو آ جائے گی اور پھر اسے بھی جب تک وہ گیمیں سکھا نہیں دوں گا وہ میری جان نہیں چھوڑے گی۔ جبکہ میرا ارادہ اب آرام کرنے کا ہے۔"

"کامنی اٹھو۔ بھائی کو آرام کرنے دو"۔ ٹھاکر کا انداز سرزنش کرنے والا تھا۔

"پتا جی آپ بھی نا بس......" کامنی منہ بسورتی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

"ٹھیک ہے پتر آپ آرام کریں۔" ٹھاکر اپنی جگہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ سرلا دیوی بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ "سفر کافی لمبا ہے اور دوران سفر آپ کو آرام کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"مہربانی ٹھاکر چچا۔" میں نے کہا۔ اور وہ دونوں بھی رخصت ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی شیتل کمرے میں داخل ہوئی۔ ہاتھ میں موجود کپڑوں کا بنڈل الماری میں پھینک کر وہ سیدھی میری طرف بڑھی اور میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر افسردگی سے بولی۔

"جان کیا حقیقتاً آپ کو للیتا مجھ سے زیادہ پسند آئی ہے۔ حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے۔"

''شیتل تمہارا دماغ تو اپنی جگہ پر ہے۔'' میں ہلکی ناراضی سے بولا۔ ''میں نے کب کہا ہے کہ للیتا مجھے پسند ہے۔''

''تو پھر یہ سب کیا تھا؟''

''کیا؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''یہی للیتا کا آپ کی بغل میں گھسنا، بازو پر چٹکیاں کاٹنا اور دوسری ناروا حرکات کا ارتکاب کرنا، جواباً آپ کا اس کی حوصلہ افزائی کرنا۔''

''جب عقل بانٹی جارہی تھی نا تو تم اپنے حصے کی صورت لے کر دوبارہ اسی لائن میں کھڑی ہو گئیں تھیں اس لیے صورت تو خوب اچھی حاصل کر لی لیکن عقل کے حصول میں ناکام رہیں۔''

''پھوکٹ میں نہ ٹرخاؤ، میری بات کا جواب دو۔'' میری بات سن کر اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا لیکن اس کے بات کرنے کا انداز یوں تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہو۔

''میں اپنے ہر فعل میں خود مختار ہوں۔'' میرا لہجہ اچھا خاصا خشک تھا۔ اس کے چہرے پر چھلکنے والی خوشی ماند پڑ گئی اور وہ میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''سوری مسٹر عمر جان...... شما چاہتی ہوں کہ میری بات سے آپ کو تکلیف پہنچی۔''

اور میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ گو اس کا افسردہ لہجہ سن کر مجھے دلی دکھ پہنچا تھا لیکن میرا مقصد اسے اپنی ذات سے متنفر کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے غلط قسم کی امیدیں باندھے۔

مجھے کروٹ باندھے ایک دو لمحے گذرے تھے کہ میری سماعت میں اس کی سسکیاں گونجیں میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ مجھے اپنی جگہ پر بیٹھی نظر آئی دونوں ہاتھ گود میں رکھے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''اے شیتل کیا ہوا؟'' میں اسے کندھوں سے پکڑ کر بولا۔ ''خیر تو ہے۔ کیا گھر یاد آ رہا ہے۔'' مجھے اس رونے کا سبب معلوم تھا مگر میں اس موضوع کو چھیڑنے سے ڈرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنسو دکھ کے اظہار کا سب سے آسان اور مکمل ذریعہ ہیں۔ لمبی چوڑی بات چیت اور فصیح و بلیغ جملے بھی ان دو قطروں کے مقابلے میں ہیچ نظر آتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں تو ان کو بطور ہتھیار استعمال کرتی ہیں۔ یہ ان کا ایسا ہتھیار ہیں جن کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑتا۔

میں اپنے رویے پر پہلے بھی نادم تھا لیکن اسے روتے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ واقعی بہت بڑی زیادتی کر بیٹھا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے نفی میں سر ہلایا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

''یار ایک تو تم چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو رونا شروع کر دیتی ہو نا؟'' میرا لہجہ خوشگوار تھا۔ ''میں تو یونہی تمھیں چھیڑ رہا تھا۔ کہاں للیتا اور کہاں تم...... تمھارا اور اس کا بھلا کیا مقابلا؟''

''جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میرے علاوہ ہر لڑکی کے ساتھ آپ ہنس کھیل سکتے ہیں۔ ایک میں

جنموں جلی ہی آپ کو ناپسند ہوں۔ میں......‘‘اس سے پہلے کہ اس کے الزامات کی فہرست لمبی ہوتی میں نے اسے اپنی جانب کھینچا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ہاتھ سے اس کے بال بکھراتے ہوئے کہا۔’’مجھے ڈر لگتا ہے تمھارے جان لیوا حسن سے۔اس لیے تجھ سے پرے پرے رہتا ہوں۔‘‘

میری بات سن کر پہلے تو اس نے بے یقینی مجھے دیکھا مگر پھر میری آنکھوں میں سچائی کے رنگ دیکھ کر سرشاری سے آنکھیں موند لیں اور سر میرے کندھے سے ٹکا دیا۔ میں نے اس سے غلط نہیں کہا تھا، اس کا کیف آگیں قرب پتھر کو بھی پگھلا سکتا تھا۔کئی لمحے اس طرح خاموشی سے گزر گئے۔وہ آنکھیں موندے رنگین تصوروں میں گم تھی۔

’’اب جاؤ نا؟‘‘میں اس کی زلفیں بکھیرتے ہوئے بولا۔

’’کاش......وقت یہیں ٹھہر جائے۔‘‘اس کی حسرت بھری آواز گونجی۔

’’شیتل پگلی، وقت کبھی نہیں گزرتا۔ہم گزر جاتے ہیں اور چلتے چلتے جب ایک دن پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وقت تو وہیں رکا ہوا ہے ہم باقی نہیں رہے۔‘‘

’’جان......اگر آپ واپس نہ جائیں......میں بھی نہیں جاتی۔ٹھاکر کے اوپر آپ کے کافی احسانات ہیں وہ ضرور ہمارے لیے کوئی ٹھکانہ مہیا کر دے گا۔نہیں تو میرے اپنے اکاؤنٹ میں اڑھائی تین لاکھ روپے پڑے ہوں گے جو نئی زندگی شروع کرنے کے لیے ہمارے لیے کافی ہوں گے۔دو تین مہینوں تک آپ کی تلاش کی سرگرمیاں ماند پڑ جائیں گی اس عرصے میں ہم یہیں ٹھاکر کے ہاں چھپ کر رہ سکتے ہیں۔مم......میں ساری زندگی داسی بن کر آپ کی سیوا کروں گی۔‘‘

’’شیتل تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو۔ میں اپنے پورے خاندان کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔تمھارا صرف باپ ہے۔جبکہ میرے بہن بھائی، ماں باپ، بیوی، بیٹا کس کس رشتے کو بھلاؤں گا اور ابھی تو ان پر سخت وقت بھی آیا ہوا ہے۔نہ جانے وہاں کے حالات کیا ہوں گے اور......اور دیکھو محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے۔ایک مفکر کا قول ہے کہ اس سے پیار مت کرو جس کو تم چاہتے ہو بلکہ اس سے پیار کرو جو تم سے پیار کرتا ہو اور تمھیں کئی ایسے خوب صورت دولت منداور چاہنے والے لڑکے مل جائیں گے کہ جانو تمھیں یاد بھی نہیں آئے گا۔‘‘

’’اس قول پر آپ خود کیوں نہیں عمل کر لیتے۔‘‘

’’کاش میں اس قول پر عمل کرنے کی پوزیشن میں ہوتا۔‘‘

’’جان پلیز مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔مم......میں......۔‘‘

’’شیتل میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ حالات اگر ٹھیک ہو گئے تو تجھے ملنے کے لیے ضرور انڈیا آؤں گا۔‘‘

اس نے ابھی تک اپنا سر میرے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔سر اٹھا کر اپنی غلافی آنکھیں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ

دھیرے سے بولی۔

یہ جدائیوں کے رستے بڑی دور تک گئے ہیں

جو گیا ہے پھر نہ آیا میری بات مان جاؤ

''مجھے مجبور مت کرو۔'' میرے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''اسی وجہ سے میں تجھے بمبئی تک ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ تم حتی الوسع مجھے روکنے کی کوشش کرو گی۔کل رات تو میں نکل بھی گیا ہوتا مگر میری بدقسمتی کہ......'' میں پھیکی ہنسی ہنس دیا۔

''مجھے پتا ہے؟'' اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔

''کیا؟''

''یہی کہ میں تمھیں پسند نہیں ہوں اور جس وقت بھی تجھے موقع ملا مجھے ضرور چھوڑ جاؤ گے۔''

''اچھا چھوڑو اس موضوع کو اور جاؤ۔ میں تھک گیا ہوں۔''

''نہیں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''مجھے نیند آرہی ہے اور میں اسی جگہ سوؤں گی۔''

میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود بھی تکیے کو دوہرا کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ نیند مجھے یوں بھی نہیں آرہی تھی۔ بس مختلف قسم کے خیالوں میں کھویا رہا۔ شیتل سچ مچ میری گود میں سر رکھے سو گئی تھی۔ نیند میں اس کا حسن اور بھی اجاگر ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے پُرکشش چہرے سے نظریں چرائیں اور آنکھیں موند لیں۔

تقریباً شام ہونے کو تھی جب دروازے سے باہر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور جلدی سے شیتل کا سر اپنی گود سے اٹھا کر تکیے پر رکھ دیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ'' میں باآواز بلند بولا۔ دروازہ کھول کر ٹھاکر کا ایک ملازم اندر داخل ہوا اور ادب سے بولا۔

''تھانیدار صاحب آئے ہیں مہاراج......اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔''

اور وہ ''جی مہاراج'' کہہ کر چلا گیا۔

اسی وقت شیتل بھی اٹھ بیٹھی۔ ''کون تھا جان۔'' وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔

''ٹھاکر چچا کا ملازم تھا۔ تھانیدار کی آمد کی اطلاع دینے آیا تھا۔'' میں نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر انگلیوں سے اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو...... میں بھی چلوں گی۔'' میں نے کمرے سے نکلنے کے لیے قدم بڑھائے تو اس نے پیچھے سے آواز دی۔

''ہاتھ منہ تو دھو لو۔'' کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

تھانیدار اکبر خان ہاتھ میں نے چائے کا کپ پکڑے ٹھاکر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔

''آؤ عمر بھائی۔'' مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔اس کے لہجے میں سے چھلکتی خوشی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

''سنائیں انسپکٹر صاحب کیا رہا؟'' میں مستفسر ہوا۔

''اللہ کا شکر ہے عمر بھائی چھاپہ کامیاب رہا......ایک بندہ تو زندہ پکڑا گیا ہے جس کو آپ کمرے میں بند کر کے آئے تھے۔باقی لاشیں بھی کوئی خاص خراب نہیں ہوئی تھیں۔سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ جنگلی جانور خون کی بو پر وہاں نہیں پہنچے تھے۔لاشوں کے علاوہ وہاں سے بھاری مقدار میں منشیات بھی برآمد ہوئی ہے جو عمارت کے تہہ خانے میں چھپائی گئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کے کیریئر میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو گیا ہے۔''

''میرے کیریئر میں؟'' وہ حیرانی سے بولا۔''مگر کیسے؟''

''آپ اس چھاپے اور رگھو گروپ کی اموات کو پولیس کا کارنامہ شو نہیں کراؤ گے؟''

''کیا بات کرتے ہو عمر بھائی۔'' وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔''آپ مجھے ایسا خیال کرتے ہیں ٹھاکر کی حویلی میں آپ کا کارنامہ مجھے مجبوراً پولیس کے نام اس لیے کرنا پڑا کہ آپ کو چھپانا مقصود تھا۔اس میں بھی ایک حوالدار کو میں نے سامنے رکھا ہے کہ میری غیر موجودی میں ایک تھانیدار نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے اور رگھو دادا کا کیس تو یوں بھی پولیس اپنے کھاتے میں نہیں ڈال سکتی کہ لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے ان کی موت کے ٹائم کا پتا با آسانی لگ جائے گا۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا بدلنا کون سا مشکل ہے۔''

''بہت مشکل ہے، اگر بندہ راشی نہ ہو تو۔''

''تو پھر رگھو دادا کا نام سن کر آپ نے اتنی بے چینی کیوں دکھائی تھی۔''

''وہ بے چینی اس کارنامے کو اپنے نام منسوب کرنے کی نہیں تھی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔''بلکہ وہ ایک دھرتی کے ناسور کی لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی بے چینی تھی۔''

اس کی بات سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔انسپکٹر اکبر خان واقعی اعلیٰ کردار کا مالک تھا۔ایسے بندے پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا تھا۔انڈیا حکومت کے ساتھ اس کی وفاداری ہر شبے سے بالاتر تھی۔میری مدد کا وعدہ بھی اس نے صرف انسانی ہمدردی کی بنا پر اور مجھے بے قصور سمجھتے ہوئے کیا تھا۔میرے اندازے واقعی اس کے بارے غلط ثابت ہوئے تھے۔

''ایک اور بات۔'' مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اکبر خان بولا اور مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر گویا ہوا۔''رگھو دادا کی موت تمھارے ساتھ لڑتے ہوئے ہوئی ہے اور اس کی لاشیں دیکھ کر بھی یہی پتا چلتا ہے کہ یہ جانو کمانڈو کا کام ہے خصوصاً اس کی ٹوٹی ہوئی گردن اور پوسٹ

مارٹم رپورٹ میں یہ بات واضح ہو جائے گی۔اس کے بعد تمھاری تلاش میں سرگرداں ایجنسیوں نے اسی علاقے کا رخ کرنا ہے۔''

''اس وقت تک ہم انشاء اللہ یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ۔''انسپکٹر نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔''اور سیٹھ ہری چرن داس کی بیٹی کا کیا کرو گے؟''

''وہ اس کے ساتھ ہی بمبئی تک جائے گی۔'' کمرے میں داخل ہوتی ہوئی شیتل نے انسپکٹر کا فقرہ سن کر برجستہ کہا اور ہم تینوں بے ساختہ مسکرا پڑے۔اس نے قریب آ کر تمام کو نمسکار کیا اور کرسی لے کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

''آپ اگر یہیں سے اپنے باپ کے پاس چلی جائیں تو میرا خیال ہے آپ کے لیے بہت بہتر ہو گا۔''انسپکٹر خلوص سے اس کو مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

''یہ پٹی غالباً آپ کو جان نے پڑھائی ہے۔''

''کون سی پٹی؟''انسپکٹر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہی شیتل سے اس جگہ جان چھڑانے کی۔''وہ اطمینان سے بولی۔

''نہیں بہن!''انسپکٹر سنجیدہ لہجے میں بولا۔''عمر جان نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی ہے۔''

''اگر نہیں کی۔'' وہ میری جانب گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔''تو بڑی حیرانی کی بات ہے ورنہ اس کی اچھا یہی ہے۔''اس کی بات سن کر ٹھاکر ہنس پڑا جبکہ انسپکٹر حیرانی سے بولا۔

''وہ کیوں؟''

''وہ آپ اسی سے پوچھیں۔''

''کیوں عمر بھائی۔''انسپکٹر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔''بھلا اتنے خوب صورت ہمسفر سے کوئی جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔''

''ہمسفر نہیں......مسافر بولو انسپکٹر صاحب۔''میں اس کی مذاق میں کہی گئی بات کا جواب سنجیدہ لہجے میں دیتا ہوا بولا۔''ایسا مسافر جس کی منزل جدا ہو۔''

''جھوٹ۔''شیتل جذباتی لہجے میں بولی۔''میری تو منزل بھی یہ خود ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس ڈائیلاگ بازی کو۔''ٹھاکر نے کہا جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔''بھوجن تیار ہو گیا ہو گا پہلے پیٹ پوجا کر لیں۔''

''آپ چلیں میں شام کی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔''انسپکٹر اکبر خان بولا۔

''ہاں ٹھاکر چچا......نماز تو میں نے بھی پڑھنی ہے۔''

''ٹھیک ہے پُتر۔'' ٹھاکر اٹھتا ہوا بولا۔ ''ہم کھانے کے کمرے میں تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔''

اکبر خان وضو میں تھا اس لیے کمرے کے کونے میں چادر بچھا کر نماز میں مشغول ہو گیا اور میں وضو کرنے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

کھانا کھا کر انسپکٹر ہمیں صبح سویرے تیار ہونے کا مژدہ سنا کر رخصت ہو گیا۔ جبکہ ہم دونوں کافی دیر تک ٹھاکر فیملی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہے اور رات گئے ہی کمرے میں واپس لوٹے۔

''یہ آپ نے ٹھاکر چچا کو بتایا ہے۔'' کمرے میں دو چارپائیوں کو دیکھ کر شیتل مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

''نہیں لیکن اس کو اپنے بارے سب کچھ بتلا چکا ہوں۔'' میں نے حقیقت بتلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہے کم از کم اس طرح تمھیں چارپائی تو نصیب ہو جائے گی۔ ورنہ مجھ سے تو تم ایسے بدک رہے ہو جیسے مجھے چھوت کی بیماری ہو۔'' میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر ٹھاکر کی مہیا کردہ شلوار قمیص اٹھائی اور ساتھ والے کمرے میں لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ واپس آ کر میں نے کمرے کی لائیٹ بجھائی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

شیتل گردن تک کمبل اوڑھے کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ صورت کی طرح اس کی آواز بھی دلکش تھی۔ اس کی مترنم آواز نے میرے لیے لوری کا کام کیا اور میں نیند کی گہری وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

+ + +

صبح سویرے انسپکٹر اکبر خان کی آمد سے پہلے ہم دونوں تیار ہو چکے تھے اور اس کے پہنچتے ہی ہم رام پورہ سے روانہ ہو گئے۔ ٹھاکر اور اس کے پورے خاندان نے ہمیں بہت محبت سے رخصت کیا تھا۔ ٹھاکر نے زبردستی دس ہزار کے بقدر رقم میری جیب میں ڈال دی تھی جبکہ سرلا دیوی نے سچے موتیوں کا ایک ہار شیتل کے گلے میں ڈالا تھا۔ دن کا کھانا ٹھاکر نے تیار کروا کر گاڑی میں رکھوا دیا تھا۔ جو ہم نے چار بجے کے قریب اجمیر شہر سے گزر کر اس کے مضافات میں کھایا اور اوپر سے تھرماس میں رکھی نیم گرم چائے پی کر دوبارہ عازم سفر ہوئے۔

رات کا کھانا ہم نے سڑک کے کنارے موجود ایک غیر معروف چھپر ہوٹل میں کھایا۔ گرم تندوری روٹیوں کے ساتھ چنے کی تڑکا لگی دال۔ میں گنجائش سے بھی زیادہ کھا گیا تھا۔ گرم دودھ پتی پی کر ہم ایک مرتبہ پھر سفر کے لیے تازہ دم ہو گئے۔ بل کی ادائی انسپکٹر اکبر خان نے کی تھی، لیکن سب سے آخر آتے وقت میں نے بوڑھے سے بیرے کو ایک ہزار کی رقم بطور ٹپ پیش کی اور اسے ہکا بکا چھوڑ کر کار کے پاس آ گیا۔ انسپکٹر نے ایک مرتبہ پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ صبح سے وہی ڈرائیونگ کرتا آ رہا تھا۔

''تھانیدار صاحب اب آپ پچھلی نشست پر لیٹ کر آرام کریں اگر آپ کی مدد کی ضرورت پڑی تو ہم آپ کو اٹھا دیں گے۔'' میری بات پہ اکبر خان خاموشی سے پچھلی نشست پر منتقل ہو گیا اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ شیتل بھی میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

سردی کافی شدید تھی لیکن گاڑی میں لگے ہیٹر نے ماحول کو خوشگوار حد تک گرم کر رکھا تھا۔ احمد آباد تک ہم بغیر کسی حادثے کے پہنچ

گئے تھے۔ایک دو جگہ پولیس والوں نے چیکنگ کے لیے روکا تھا مگر انسپکٹر اکبر خان کے سروس شناختی کارڈ نے کوئی پرابلم پیدا نہ ہونے دی۔

احمد آباد سے نکلے ہمیں تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ انسپکٹر اکبر خان کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے۔وہ غریب صبح سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا ذرا سا ایزی ہوتے ہی نیند میں ڈوب گیا۔

''تم تو انسپکٹر صاحب کے ساتھ ہی واپس لوٹو گی نا؟'' کار میں چھائی خاموشی کو میں نے دھیمی آواز میں توڑا۔

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔''میں اس وقت تک بمبئی میں رہوں گی جب تک آپ پاکستان نہیں چلے جاتے۔''

''بیوقوف بمبئی میں میرا واسطہ غنڈوں، موالیوں سے پڑے گا اور تیرا ساتھ سوائے میری پرابلمز بڑھانے کے اور کوئی فائدہ نہیں دے گا۔''

''غلط!'' اس نے زور و شور سے میری بات کی نفی کی۔''میں پرابلمز پیدا نہیں بلکہ حل کروں گی۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ ایک تو آپ بمبئی سے ناواقف ہیں اور میں آپ کے لیے ایک قابل اعتماد گائیڈ کے فرائض سرانجام دوں گی دوسرے وہاں پر ہماری اپنی ذاتی رہائش گاہ موجود ہے جو آپ کے لیے بہترین چھپنے کا ٹھکانہ ثابت ہوگی۔'' شیتل نے اپنی بات کی وضاحت کی۔اس کی بات سن کر میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔بات اس نے واقعی بڑے پتے کی تھی۔

''ٹھیک ہے......مگر ایک وعدہ کرو۔''

''کیا؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''جب میں اپنے کام کے سلسلے میں اپنے مطلب کے بندوں کو ڈھونڈنے نکلوں تو تم میرے ساتھ چلنے کی ضد نہیں کرو گی۔''

''منظور......لیکن مجھ سے چھپنے کی کوشش تم بھی نہ کرنا ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ میں اخبار میں تلاش گمشدگی کا اشتہار دے دوں گی کہ ایک عدد کمانڈو غائب ہے جس کا حلیہ کچھ اس طرح سے ہے اور مشن وغیرہ یہ ہے۔اطلاع دینے والے کے لیے اتنا انعام۔''

''وہ تم سے پہلے بھی بہت شائع ہو چکے ہیں۔'' میں اطمینان سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے آپ مجھے چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر چکے ہیں۔''

''بہت پہلے۔'' میں جواباً بولا۔

''کتنے اطمینان سے کہہ رہے ہو بہت پہلے۔'' وہ میرے بازو پر گھونسہ مارتے ہوئے بولی۔

''شیتل ایک شعر سناؤں۔'' میں اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''سناؤ۔'' وہ میرے کندھے پر سر ٹیکتے ہوئے بولی۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

''سچ؟'' وہ خوشگوار حیرانی سے بولی۔

''سو فیصد سچ۔'' میں افسردہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن تم اگر خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچو تو تمھیں میری مجبوری کا پتا چلے گا۔ اپنے بارے میں تمھیں تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ دشمنی کی وہ آگ جو ہمارے اور چودھری خاندان کے درمیان بھڑکی ہوئی ہے وہ پتا نہیں کتنے خرمنوں کو جلا کر سرد ہو گی۔ تمھیں اپنے ساتھ پاکستان لے جانے کا مطلب ہے اس جلتی آگ میں تمھیں بھی گھسیٹنا...... جس کا متحمل میں نہیں ہو سکتا۔ یہاں پر تجھے ایک سے ایک اچھے رشتے مل جائیں گے۔ پاکستان پہنچ کر کم از کم ایک اطمینان مجھے حاصل رہے گا کہ مجھے چاہنے والی ایک ہستی ایسی ہے جو امن میں ہے اور میرے لیے دعا گو ہے۔''

''جان...... مجھے تیرے ساتھ نرگ میں رہنا تنہا سورگ میں رہنے سے زیادہ عزیز ہے۔''

''بہر حال تم کچھ بھی کہو میں تمھیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ البتہ اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو میں تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔''

''یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں اب اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

اس کی بات سن کر میں نے چپ سادھ لی اس موضوع پر اس سے بحث کرنا میرے لیے ناممکن تھا وہ اپنی ساری کشتیاں جلانے کو تیار تھی جبکہ میں حالات کے گھن چکر میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ میرے سوچنے سمجھنے کے صلاحیتیں اس معاملے میں بالکل مفقود ہو چکی تھیں۔ میری بہتری اسی بات میں پنہاں تھی کہ میں یہ موضوع نہ چھیڑتا...... اس کے برعکس شیتل کا پسندیدہ موضوع یہی تھا۔

میری چپ کو بھانپ کر اس نے بھی خاموش رہنے میں عافیت سمجھی اور سیٹ سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح کے قریب ہم نے سورت کو کراس کر کے سڑک کے کنارے موجود ایک چھوٹی سی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد انسپکٹر صاحب ایک ہوٹل سے تھرماس چائے کا اور اس کے ساتھ پانچ چھ پراٹھے لے آیا۔ صبح کا ناشتا ہم نے کار کے اندر ہی تناول کیا اور اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ ایک مرتبہ پھر انسپکٹر اکبر خان نے سنبھال لی تھی۔

''انسپکٹر صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''کتنا راستہ رہ گیا ہے۔''

''بس اب تو چند گھنٹوں کی بات ہے۔'' وہ جواباً بولا۔ ''بہر حال آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔''

''کس بارے میں؟'' میں مستفسر ہوا۔

''یہی کہ شیتل تمھارے ساتھ رہے گی یا واپس جائے گی۔'' انسپکٹر اکبر خان نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''شیتل میرے ساتھ رہے گی۔'' میں اطمینان سے بولا۔''اس کی موجودی میں میری کافی پرابلمز حاصل ہو جائیں گی۔'' میری بات سن کر شیتل کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میرے یا انسپکٹر کے سمجھانے سے اس نے نہیں سمجھنا الٹا میرے بارے الٹی سیدھی بدگمانیاں دل میں پال لینی ہیں اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں اسے اپنے پاس رکھتا میرے لیے اپنے دل میں وہ محبت کے جو گہرے جذبات رکھتی تھی ان کے ناطے اس کا اتنا حق تو بنتا تھا کہ انڈیا کے اندر اپنے آخری ایام اس کے ساتھ گزاروں۔

''اگر آپ نہ بھی چاہیں تب بھی میں نے آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔'' وہ شوخی سے بولی۔''بہر حال حوصلہ افزائی کے لیے دھنیواد۔'' انسپکٹر اس کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ویسے آپ کی خوش قسمتی میں کوئی کلام نہیں عمر بھائی۔'' انسپکٹر اکبر خان حسرت بھرے لہجے میں بولا۔''ہماری تو حسرت ہی رہی شیتل جیسی کسی لڑکی کے حصول کی۔''

''اگر آپ خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچیں تو مجھ سے بڑا بد قسمت آپ کو اور کوئی نہیں دکھائی دے گا۔''

''وہ کیسے؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''وہ ایسے کہ آپ تصور کریں اس شخص کے بارے جس کے حوالے ایک بہت بڑا خزانہ کرنے کے بعد اسے یہ مژدہ بھی سنا دیا گیا ہو کہ اس کی زندگی کا صرف ایک دن باقی ہے۔''

میری بات سن کر اکبر خان نے چپ سادھ لی لیکن شیتل خاموش نہ رہ سکی۔

''اس کو یوں کہیں تو زیادہ مناسب رہے گا کہ وہ شخص بذات خود خودکشی پر آمادہ ہے۔''

''لازمی بات ہے اتنا بڑا خزانہ پا کر اسے شادی مرگ تو ہونا ہے۔'' میں برجستہ بولا اور کار کا اندرونی ماحول اکبر خان کے قہقہے سے گونج اٹھا۔

دوپہر ڈھلے ہماری کار بمبئی کے مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔ آبادی کے لحاظ سے بمبئی انڈیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی انڈیا میں وہی اہمیت ہے جو اہمیت کراچی کو پاکستان میں حاصل ہے۔ مزید دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم شیتل کی رہنمائی میں ساحل سمندر کے نزدیک ایک چھوٹے سے بنگلے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

اطلاعی گھنٹی پر ایک بوڑھے سے شخص نے چھوٹا گیٹ کھول باہر جھانکا اور شیتل کو پہچان کر مؤدبانہ انداز میں نمسکار کرنے کے بعد پورا گیٹ کھول دیا۔ میں نے اور اکبر خان نے نیچے اترنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

گاڑی پورچ میں روک کر ہم دونوں باہر آ گئے۔ اکبر خان بولا۔

''عمر بھائی مجھے اجازت دو، میں نے ابھی واپس جانا ہے۔''

''دماغ تو ٹھیک ہے۔'' شیتل جلدی سے بولی۔''اتنا طویل سفر دوبارہ کیسے طے کرو گے۔ آج رات آرام کر لو کل چلے جانا۔''

''مشکل ہے شیتل بہن۔'' اکبر خان نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''شانتی نگر میں میں بہت سے کام ادھورے چھوڑ آیا ہوں۔ اپنے یہاں پر آنے کی اطلاع میں نے کسی کو بھی نہیں دی ہے۔ اب جتنی جلدی بھی میں واپس چلا جاؤں اتنا بہتر ہے...... اور جہاں تک تعلق ہے ڈرائیونگ کرنے کا اب واپسی میں نے کسی بس سروس کے ذریعے جانا ہے اپنی کار میں ایک جاننے والے کے پاس چھوڑ جاوں گا جو بعد میں میرے پاس بھجوا دے گا۔''

''لیکن کھانا تو کھا کر جاؤ نا۔'' شیتل اس کو روکنے پر مصر ہوئی۔

''نہیں ٹائم نہیں ہے۔'' وہ مجھے گلے ملتا ہوا بولا۔ ''یار زندہ صحبت باقی۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو حکم کرو۔''

''اکبر بھائی اللہ آپ کو خوش رکھے اور عزت دے۔'' میں ممونیت سے بولا۔ ''میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں تیرے احسان کا بدلہ چکا سکوں گا البتہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی میری مدد کی ضرورت پڑے میں انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔''

اکبر خان نے شیتل کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''بس میری بہن کا خیال رکھنا۔'' اور پھر کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔

''چلو اندر چلو۔'' شیتل مجھے صحن میں گم صم کھڑے دیکھ کر دھیرے سے بولی اور میں سر ہلاتا اس کے ساتھ چل پڑا۔ بمبئی میں پتا نہیں کیسے کیسے ہنگامے میرے منتظر تھے۔

+ + +

میں باتھ روم میں نیم گرم پانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شیتل کی اپنے باپ سے فون پر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ بڑے زور و شور سے اپنی رہائی کی فرضی کہانی سنا رہی تھی۔

میں جب نہا کر باہر نکلا تو اس وقت تک وہ اپنی بات ختم کر چکی تھی اور صوفے پر بڑے انداز سے بیٹھی کچھ گنگنا رہی تھی۔

''کس سے گپ شپ ہو رہی تھی؟'' میں جانتے بوجھتے مستفسر ہوا۔

''پتا جی تھے۔'' وہ جواباً بولی۔ ''میری جدائی میں سخت پریشان تھے میں نے سوچا ان کی پریشانی دور کر دوں۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہنا کیا تھا۔ مجھے واپس بلا رہے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے میں ان کے پاس پہنچ جاؤں یہ نہ ہو کوئی دوسرا دشمن مجھ پر وار کر جائے۔''

''تو نے کیا جواب دیا۔''

''میں نے کہا کہ جس محسن کی وجہ سے میری رہائی ممکن ہوئی ہے میں اس کے گاؤں میں چند دن گزار کر واپس آ جاؤں گی اور یوں بھی گاؤں میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔''

''پھر؟''

''پھر کیا......ڈھیر ساری نصیحتیں کرنے کے بعد جلد سے جلد واپس آنے کی تاکید کی اور بس؟''

''اس کا مطلب ہے آپ کے والد آپ سے محبت کرتے ہیں؟''

''ایسی ویسی۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''اپنی دولت کے بعد وہ سب سے زیادہ مجھے ہی چاہتے ہیں۔'' اور میں اس کے انداز پر بے ساختہ مسکرا پڑا۔

''ویسے آپ کی یہ گھسی پٹی کہانی سن کر انھوں نے کیسے یقین کر لیا۔''

''میرے پتا جی میں ایک خوبی ہے کہ وہ آم کھانے سے غرض رکھتے ہیں پیڑ گننے سے نہیں جب ان کی بیٹی خیریت سے ان کے پاس واپس آ رہی ہے تو ان کی بلا سے کہ درمیان میں جو کہانی بھی ہے۔''

''اچھا ابھی یہ کہانیاں ہی سناتی رہو گی کہ کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی سہی۔''

''اوہ سوری۔'' وہ شرمندگی سے اپنے ملازم کو آواز دیتے ہوئے بولی۔ ''دھرمندر چاچا''۔ اور وہی بوڑھا جس نے دروازہ کھولا تھا آن موجود ہوا۔

''جی بی بی جی۔'' وہ مودبانہ انداز میں بولا۔

''اس طرح کرو کہ نزدیکی ہوٹل سے دو بندوں کا کھانا لے آؤ اور پیسے......'' کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ پیسوں کے نام پر اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

''ہاں پیسے یہ لو چاچا۔'' میں نے جلدی سے ایک بڑا نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ پیسے لے کر دھرمندر سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

''سوری جان۔'' شیتل شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

''اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔'' میں سنجیدگی سے بولا۔ ''ہر بیٹی کا آئیڈیل اس کا باپ ہوتا ہے اور وہ اسی کے نقش قدم پر چلتی ہے۔'' میں نے اس کے باپ کی کنجوسی پر چوٹ کی۔

''بس باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔'' وہ تپتے ہوئے بولی۔ ''اچھی طرح جانتے ہوئے کہ چیک بک یا رقم میرے پاس نہیں ہے پھر طعنے دینے کا مطلب؟''

''ہوتے تو تُو نے کون سے خرچ کرنے تھے۔''

''جانو کے بچے باز آ جاؤ۔'' وہ گھونسہ تانتے ہوئے میرے جانب بڑھی۔

''سوری......سوری۔'' میں جلدی سے کان پکڑتے ہوئے بولا۔ ''سچی بات غلطی سے منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔''

اور میری بات سن کر اس کے چہرے پر شرمندہ سی ہنسی چھا گئی۔ ہنستے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے سے پڑ جاتے تھے اور سفید موتی کی طرح چمکتے دانت مخالف کو مبہوت کر دیتے تھے۔ وہ بے شک وشبہ سامنے والے کے حواسوں پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میں بھی گنگ سا ہو گیا تھا۔

اس نے میری کیفیت بھانپ لی اور جواباً اس کے چہرے پر جو قوسِ قزح کے رنگ لہرائے میں ان کی تاب نہ لا سکا اور جلدی سے نظریں جھکا کر فرش کو گھورنے لگا۔

''جان۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے قدموں میں بیٹھ کر اپنی ٹھوڑی میرے گھٹنے پر لکاتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے نظریں کیوں چرا رہے ہو۔ میں تیری اپنی ملکیت ہوں۔ تیری داسی ہوں۔ میرا تن من سب کچھ تیرا ہے۔ پھر یوں اپنے اوپر جبر کرنے کا فائدہ۔''

اس کی کھلی ڈلی باتوں سن کر میں جیسے کانپ سا گیا، پتا نہیں میری محبت کو اس نے اپنے دل کا روگ کیوں بنا لیا تھا۔ اگر وہ میری جسمانی قربت حاصل کر لیتی تب بھی میں رکنے والا تو نہیں تھا۔ پھر نا معلوم اپنے آپ کو یوں سستے پن سے میرے حوالے کر دینے سے اس کا کیا مقصد تھا۔ میں بھی کوئی سنسار تیاگ دینے والا سادھو یا کوئی بہت بڑا ولی اللہ نہیں تھا، بلکہ ان معاملات میں عام مردوں جیسا ایک مرد تھا جسے کوئی بھی جوان لڑکی وقتی طور پر بھٹکا سکتی تھی جبکہ وہ تو شیتل تھی جو زاہد صد سالہ کو بھی اپنا زہد توڑنے پر مجبور کر دیتی، لیکن نا معلوم اس کے بارے کون سا ایسا جذبہ میرے اندر پرورش پا چکا تھا کہ میں اسے پاکیزہ دیکھنا چاہتا تھا اور وہ تو تھی بھی ایسی کہ چھونے سے بھی میلی ہو جائے۔

میری طرف سے چھائی خاموشی کو اس نے توڑنے کی کوشش نہ کی اور چپ چاپ میرے گھٹنے سے سر ٹیک کر بیٹھی رہی یہاں تک کہ کافی دیر گزر گئی۔ ہماری محویت کو ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ نے توڑ دیا اور شیتل ''شاید دھرمندر آ گیا ہے۔'' کہتے ہوئے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ واقعی دھرمندر تھا۔ دروازے کو ہلکے سے کھٹکھٹاتے ہوئے وہ اندر آیا اور مستفسر ہوا۔ ''بی بی جی کھانا یہیں پر کھائیں گی یا......''

''اس ٹیبل پر لگا دو۔''، شیتل نے قطع کلامی کرتے ہوئے اپنے سامنے دھری ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

کھانا ہم دونوں نے خاموشی سے کھایا۔ کھانے کے بعد دھرمندر کے ہاتھ کی بنی ہوئی گرما گرم چائے پی کر ہم دونوں تازہ دم ہو گئے۔

''کیا خیال ہے آؤٹنگ کے لیے چلیں۔'' اس نے کہا۔

میں جواباً بولا۔ ''لڑکی، تمھارا کوئی پرزہ ٹو ڈھیلا نہیں ہے...... میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں اتنی آسانی سے بمبئی میں نہیں گھوم سکتا۔ تم نے البتہ جانا ہے تو چلی جاؤ۔ میں رات گئے ہی نکلوں گا۔ کیونکہ میں نے جن لوگوں سے ملاقاتیں کرنی ہیں ان کے دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔

وہ شرارتی لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کیا کسی کوٹھے پر جانے کا ارادہ ہے؟......راتیں تو طوائفوں کی جاگتی اور دن سوتے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔ میری مراد جرائم پیشہ لوگوں سے ہے اور تیری اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ تمام جرائم پیشہ افراد ظلمت کی

پیداوار ہوتے ہیں اور اندھیرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی آپ تو سنجیدہ ہو گئے۔"

"اچھا اس مذاق وغیرہ کو چھوڑو اور مجھے سونے کا کمرہ دکھاؤ تا کہ میں تھوڑی دیر آرام کرلوں رات کو شاید مجھے سونے کا موقع نہ ملے۔"

"ہاں آؤ میرے ساتھ۔" وہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ کافی پُرتعیش خواب گاہ تھی۔ دیواروں کو ہلکا آسمانی رنگ دیا گیا تھا اور اسی کلر کے پردے کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ لٹکائے گئے تھے۔ کمرے کے وسط میں پڑا ایک جہازی سائز کا ڈبل بیڈ جو چوکور کی بجائے گول تھا۔ اس پر آسمانی رنگ کی پھول دار چادر اور اسی کلر کا ایک خوب صورت گرم کمبل تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔

"واہ......" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اس کا مطلب ہے سیٹھ انکل اتنے بھی کنجوس نہیں ہیں۔"

"یہ خواب گاہ انھوں نے نہیں میں نے سجائی ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "اور اس کی وجہ سے ڈیڈی کی ڈانٹ بھی کھائی ہے۔"

"بہرحال بہت خوب صورت ہے۔ واقعی تمھارا انتخاب لاجواب ہے۔" میں تعریفی لہجے میں بولا۔

"ہاں میرا انتخاب لاجواب ہی ہوتا ہے۔" وہ میری جانب دیکھتے ہوئے ذومعنی لہجے میں بولی۔

اور میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر بیڈ پر بیٹھ کر اپنے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو میں ذرا بمبئی گھوم آؤں۔ کافی دنوں بعد چکر لگا ہے۔" میرے سر ہلانے پر وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتی خواب گاہ سے نکل گئی۔

نرم و ملائم بیڈ پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ راستے میں گاڑی کے اندر میں خاطر خواہ آرام نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی سفر نام ہی تکلیف اور خواری کا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں گہری نیند سو گیا تھا۔

میری آنکھ شیتل کے جگانے پر کھلی۔ اس کے ریشمی ہاتھوں کا لمس مجھے بہت اچھا لگا۔ سعدیہ بھی مجھے اسی طرح جگاتی تھی کہ اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرتی۔ شاید تمام محبت کرنے والی عورتوں کا اپنے مردوں کو جگانے کا یہی طریقہ کار ہو۔

"آ گئی ہو۔" میں نے آنکھیں کھولتے ہی پوچھا۔ "تھوڑی دیر سونے نہیں دے سکتی تھیں کیا؟"

"رات کے دس بجنے والے ہیں جناب۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "اگر نہ جگاتی تو بعد میں مہاراج نے موڈ بنا لینا تھا کہ جگایا کیوں نہیں۔ میں نے کام جانا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے...... زیادہ تقریر جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں سلیپر اپنے پاؤں میں ڈال کر باتھ روم کا رخ کرتا ہوا بولا۔

"ایک تو تم عورتوں کی زبان کو آرام نہیں آتا۔"

اور وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگئی۔ شاید اتنی محبت سے جگانے کے جواب میں اسے مجھ سے اس قسم کے رویے کی توقع نہیں تھی۔

حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ ابھی تک اسی جگہ بیٹھی تھی۔

''کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو یہ کیا بت بنی بیٹھی ہو؟'' میں مزاحیہ لہجے میں بولا۔

''کھانا تیار ہے مسٹر عمر جان۔''

''تو پھر چلیں مسز......''

''عمر جان۔'' وہ کھلکھلا کر میرا فقرہ پورا کرتی ہوئی بولی۔

''نہیں جی مس ہری چرن داس صاحبہ، مجھ غریب کی اتنی قسمت کہاں کہ کسی سیٹھ زادی کو اپنا سکوں۔''

''اچھا کھانے کے لیے چلو۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے دوپہر کو بھی بس واجبی سا کھایا تھا۔'' وہ مجھے کھانے والے کمرے کی طرف دھکیلتی ہوئی بولی۔

ڈائننگ ٹیبل کھانے کے مختلف لوازمات سے بھری پڑی تھی۔ وہ کسی محبت کرنے والی بیوی کی طرح مختلف ڈشیں اٹھا اٹھا کر میرے سامنے رکھتی چلی گئی جن کو چکھنے سے ہی میرا پیٹ بھر گیا۔

''اچھا اٹھو میں آپ کو سامان دکھاؤں۔ جو میں ابھی شاپنگ کر کے لائی ہوں۔'' کھانے سے فارغ ہو کر اس نے کہا۔

''تیرے پاس تو رقم نہیں تھی۔ پھر شاپنگ کے لیے کہاں سے ڈھونڈ لی۔''

''میں سیٹھ ہری چرن داس کی بیٹی ہوں'' وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ''پیسے کا حصول میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے بتاتی چلوں کہ ابھی میں نے ابو کے ایک دوست، جس کو میں انکل کہتی ہوں سے پچاس ہزار روپیہ ادھار لے کر آئی ہوں۔

''ہاں یہ تو آپ نے بجا فرمایا۔'' میں ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''کہ سیٹھوں کو پیسے کیا کمی۔'' اور وہ مسکرا دی۔

اس نے زیادہ تر میرے لیے شاپنگ کی تھی۔ تین تھری پیس سوٹ، بوٹوں کے دو تین جوڑے سپورٹس شرٹس، جینز کی پتلونیں۔ ایک چمڑے کی سیاہ رنگ کی جیکٹ۔ شیو کا سامان اور پتا نہیں کیا کیا اٹھا لائی تھی۔

''یہ کیا؟'' میں اس سارے سامان کو حیرانی سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''میڈم میرا یہاں پر ساری عمر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ مزید ایک یا دو دن رہوں گا۔''

''مجھے پتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''لیکن آپ اس سامان کو اپنے ساتھ تو لے جا سکتے ہیں نا؟''

میرے جی میں آیا کہ اسے کہوں کہ میں خود کو سنبھالوں گا یا اس سامان کو مگر پھر اس کی آزردگی کے خیال سے خاموش رہا۔

''اپنے لیے کیا لائی ہو؟''

''میرے لیے پہلے ہی اس کوٹھی میں کافی سامان بھرا پڑا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے ابھی تم آرام کرلو میں ذرا باہر کا چکر لگا آؤں۔''

''کس ٹائم تک واپس آجاؤ گے۔'' وہ مستفسر ہوئی۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہرحال تم میرا انتظار نہ کرنا۔''

''آپ کا انتظار تو میں اپنی آخری سانس تک کروں گی'' وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔

''میری مراد آج رات سے تھی۔''

''اگر میں آپ کو اپنی گاڑی میں مطلوبہ جگہ تک چھوڑ آؤں؟''

''شکریہ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔'' کہہ کر میں نے کالی جینز اور سرخ سپورٹس شرٹ اٹھا کر باتھ روم کا رخ کیا۔ لباس تبدیل کر کے میں نے چمڑے کی کالی جیکٹ پہنی اور شیتل کو بائے کہہ کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ فرلانگ بھر پیدل مارچ کے بعد ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔

''کتھے جاڑاں اے بابو'' (کدھر جانا ہے بابو) سکھ ڈرائیور میرے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی بولا۔

''کسی اچھے اور بڑے جوا خانے تک لے جاؤ۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔''تو سیدھا کہیں نا، جگو دادا کے اڈے تک لے جاؤ۔''

''گڈ، سمجھدار ہو۔'' میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی دائیں بائیں کے مناظر کو غور سے دیکھنے لگا تا کہ واپس آنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ ٹیکسی تقریباً پون گھنٹا چلتی رہی اور اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے سکھ ڈرائیور کی زبان چلتی رہی، لیکن میں سارے راستے اسے ہوں ہاں کرے کے ٹرخاتا رہا۔ جب ٹیکسی ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے رک گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہی جگو دادا کا جوا خانہ تھا۔ عمارت کی پیشانی پر مون لائٹ ہوٹل لکھا ہوا جگمگا رہا تھا۔ کرایہ ادا کر کے میں پارکنگ لاٹ سے نکلا جس میں مختلف قسم کی قیمتی گاڑیاں پارک تھیں۔ میں سیدھا عمارت کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر کھڑا ایک معزز لباس میں غیر معزز شخص ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

عمارت کا ہال لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ مختلف لوگوں کی آپس میں بات چیت کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ ڈنر کر رہے تھے میں نے ایک بیرے کو روک کر جوا خانے کا راستا پوچھا اور پھر اس کے بتائے ہوئے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ جوا خانہ عمارت کے تہہ خانے میں بنایا گیا تھا اس کے لیے مجھے سیڑھیاں اتر کر نیچے جانا پڑا۔ جوا خانے کے دروازے پر ایک کریہہ الشکل غنڈہ براجمان تھا جس کے چہرے پر زخموں کے لاتعداد نشان مجھے نظر آئے، لیکن اس نے بھی مجھ سے کوئی تعرض نہ کیا اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جس میں جوئے کی مشینیں بھی لگی ہوئی تھیں مگر زیادہ تر لوگ تاش سے قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ مختصر لباس میں خوش شکل لڑکیاں مختلف مشروبات کھیلنے والوں کو سرو کر رہی تھیں۔ اس ماحول میں جو مشروب کثرت سے پیا جاتا ہے اس سے

قارئین بھی بخوبی واقف ہوں گے۔ہال کی دیواروں کے ساتھ مخصوص لباس میں ملبوس افراد کھڑے تھے جو لامحالہ کسی بھی قسم کا ہنگامہ یا جھگڑا نہ ہونے دینے کے لیے کھڑے کیے گئے تھے۔

میں نے کاؤنٹر پر بیس ہزار کے ٹوکن لیے جو کاؤنٹر مین نے لاپرواہی سے میرے آگے ڈال دیئے۔اس کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ بیس ہزار کی رقم اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

میرا ارادہ اس وقت جوا کھیل کر دولت کمانے کا نہیں تھا کیونکہ ضرورت پڑنے پر رقم کا حصول میرے لیے اتنا بڑا مسئلہ ثابت نہ ہوتا۔میرا مقصد اس وقت کسی طریقے سے جگو دادا سے ملاقات کر کے اس کو جانچنا تھا کہ آیا وہ میرے کام آسکتا تھا یا نہیں۔

ٹوکن لے کر میں جیسے ہی پیچھے مڑا اسی وقت دو معزز قسم کے آدمی ہال میں داخل ہوئے میں اس وقت ہال کے ایک کونے میں پڑی خالی ٹیبل کے پاس نشست جما چکا تھا۔خوش قسمتی سے اس وقت وہی ایک ٹیبل خالی پڑی تھی میرا اندازہ تھا کہ ان دونوں نے اسی ٹیبل کا رخ کرنا تھا، کیونکہ باقی میزیں اس وقت تقریباً فل ہو چکی تھیں یا گنجائش تھی تو کسی ایک بندے کی۔

میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا اور وہ دونوں ٹوکن لے کر سیدھا میری ٹیبل کی طرف بڑھے۔

ان میں سے ایک مستفسر ہوا۔''ہینڈسم نوجوان ہم ادھر بیٹھ سکتے ہیں؟''

''پلیز سر۔''میں احتراماً ہلکے سے اٹھ کر بولا۔

وہ دونوں ''تھینک یو'' کہتے ہوئے بیٹھ گئے۔

''میرا خیال ہے ایک بندے کی گنجائش ہے۔''ایک درمیانی قامت اور چھریرے بدن کا ادھیڑ عمر شخص کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔جس کے جواب میں ہم نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔اس آدمی کو میں نے کاؤنٹر کے ساتھ پڑے سٹول پر بیٹھ کر شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا وہ غالباً جوا خانے کا اپنا آدمی تھا۔ایسے آدمی ماہر شاطر ہوتے ہیں اور پتا بازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ان کا کام صرف امیر کبیر اسامیوں کے ساتھ کھیلنا ہوتا ہے۔جیتے ہوئے پیسوں میں ان کا اپنا کمیشن مقرر ہوتا ہے۔اس وقت بھی وہ موٹی اسامیوں کو دیکھ کر ادھر آیا تھا۔ہم چاروں کے بیٹھتے ہی ایک خوب صورت سی لڑکی ٹرے میں تاش کی ایک نئی گڈی لے کر آئی اور ہمارے سامنے رکھ دی۔

''شروع کرو نوجوان۔''وہی آدمی جس نے مجھے ہینڈسم نوجوان کہہ کر بیٹھنے کی اجازت مانگی تھی مجھ سے مخاطب ہوا۔میں نے ڈبی کو کھول کر پتے نکالے اور مہارت سے پھینٹ کر گڈی ٹیبل کے درمیان میں رکھ دی۔

نو وارد نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر چند پتے اٹھا کر کاٹ لگا دی،لیکن میں نے بے پرواہی سے بقیہ پتے اٹھا کر تین تین پتے سب کو دے دیئے پہلے ہاتھ میرا ارادہ کسی قسم کی ہیرا پھیری کا نہیں تھا،لیکن اتفاق سے میرے پاس پتے اچھے آئے اور باقی نے بھی اس بازی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی اور ایک ایک دو دو چالوں کے بعد سب نے ہاتھ کھینچ لیے۔

مجموعی طور پر اس بازی میں مَیں نے دو ہزار روپے جیتے۔اگلی بازی میں مَیں نے جان بوجھ کر دونوں معزز اشخاص میں سے ایک

کو اچھے پتے دے دیئے اور اس ہاتھ میں ایک دو بلائیڈ چالوں کے بعد میں نے پتے اٹھا کر دیکھے اور منہ بناتے ہوئے پتے سائیڈ پر رکھ کر مزید چالوں سے ہاتھ کھینچ لیا۔

باقی تینوں شروع رہے۔ شار پر کی کوشش تھی کہ اس ہاتھ کامیابی حاصل کر کے تاش اپنے ہاتھ میں کر لے مگر اس کی بدقسمتی کہ معزز افراد میں ایک جس کو میں اچھے پتے دے چکا تھا میدان میں ڈٹا رہا اور آخر فتح اسی کے حصے میں آئی۔

اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ چھا گئے اور یہ خوشی صرف بازی جیتنے کی خوشی تھی ایسے لوگ پیسے کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔

''واہ بھئی راجندر صاحب آج تو ابتداء سے ہی لکشمی دیوی آپ پر مہربان ہونے لگ گئی۔''

''منہوترا جی آپ تو پھر جانتے ہی ہیں نا کہ لکشمی دیوی اپنی عاشق ہے۔'' راجندر فخریہ لہجے میں بولا اور اس کے ساتھ ہی تاش کے پتے پھینٹ کر ٹیبل کے درمیان رکھ دیئے اس مرتبہ بھی وہی جیتا تھا، مزید ایک دو ہاتھ کھیلنے کے بعد تاش میرے ہاتھ میں آ گئی کلب کا شار پر ہنوز کوئی بازی نہ جیت سکا تھا۔ اس مرتبہ پتوں کے میرے ہاتھ میں آتے ہی میں نے اپنا کام شروع کر دیا اور میرے سامنے نوٹوں کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

''تیری شکل کی طرح تیری قسمت بھی خوب صورت ہے جوان!'' راجندر بولا۔

''بس سیٹھ صاحب کسی دن لکشمی دیوی مہربان ہو رہی جاتی ہے۔'' میں انکساری سے بولا۔

جوا خانے کا شار پر میرے جیتنے پر تلملانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، لیکن میرے کھیلنے کا انداز ایسا تھا کہ میری پتا بازی نہیں پکڑی جا رہی تھی۔ عموماً شار پر تاش پھینٹتے وقت چند مخصوص پتے لگاتے ہیں اس کے برعکس میں باون کے باون پتوں کو اپنی یادداشت میں رکھتا اور ہر بندے کے حوالے اپنی مرضی کے پتے کرتا تھا۔

تقریباً 50,40 ہزار جیتنے کے بعد میں ایک گیم جان بوجھ کر ہار گیا تا کہ کسی کو میری پتا بازی میں شک نہ ہو سکے اور اس دفعہ میں نے شار پر کو جیتنے کا موقع دیا تھا۔ اس بات میں بھی میرا مفاد پنہاں تھا۔

تاش کے پتے ہاتھ آتے ہی شار پر نے بڑی مہارت سے پتے پھینٹے اور بانٹ دیئے میں اس کے ہاتھوں کی حرکات کو غور سے دیکھتا رہا۔

ایک دو دو چالیں سب نے بلائینڈ چلیں اور پھر جو جو اپنے پتے اٹھا کر دیکھتا گیا اس کے منہ پر رونق آتی گئی۔ خود میرے حوالے اس نے تین بیگمیں کیں تھیں۔ ''اس کا مطلب ہے پہلے ہاتھ میں موصوف اپنا تمام نقصان پورا کرنے کے چکر میں ہے۔'' میں نے دل میں سوچا اور زیر لب مسکرا کر پتے سائیڈ پر کر لیے اور ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کے بیٹھ گیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ میں اس بازی دستبردار ہو گیا ہوں۔

دونوں سیٹھ بڑے زور و شور سے چالیں چلنے میں مصروف تھے۔ پھر نہ جانے سیٹھ راجندر کو کیا ہوا کہ اس نے پتے شو کروا دیئے اور یہ دیکھ کر اس کا منہ لٹک گیا کہ اس کے تین بادشاہوں کے جواب میں شار پر نے تین اِکے اس کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

اگلی بازی میں مَیں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔اس لیے میں شار پر کے ہاتھوں کی حرکت کو خوب غور سے دیکھتا رہا۔جیسے ہی اس نے تاش چھینٹ کر ٹیبل کے درمیان رکھی میں نے صرف اوپر والا پتا اٹھا کر کاٹ لگا دی۔اس نے بڑی طنزیہ نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر تاش بانٹنے لگا۔

اس مرتبہ میرے ہاتھ دو دو ملے اور ایک نائیلا آیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ باقیوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ چھ سات چالوں کے بعد ہی دونوں سیٹھوں نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے،لیکن ہم دونوں میدان میں ڈٹے رہے۔میرے آگے پڑا ٹوکنوں کا ڈھیر زیادہ تر ٹیبل کے درمیان منتقل ہو چکا تھا۔اس نے بھی مزید ٹوکن طلب کر لیے۔ہم دونوں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔جب میں نے دیکھا کہ ٹیبل کے درمیان پڑا ہوا ڈھیر کافی بڑھ گیا ہے۔تو میں نے ''شو'' کا نعرہ لگا دیا اور یہ دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا جب اس نے تین اِکے میرے سامنے رکھ دیئے۔ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا گیا۔یہ کیسے ہو سکتا تھا اس نے جو پتے لگائے تھے اور میں نے جو کاٹ لگائی تھی اس کے مطابق اس کے پاس تین اِکے آ ہی نہیں سکتے تھے۔......کوئی چکر ضرور تھا۔میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور ایک جھما کے کے ساتھ میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

''کیوں مسٹر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟'' شار پر طنزیہ لہجے میں بولا۔''کیا شو کرانے کی ادائی کے بارے سوچ میں پڑ گئے ہو۔''

''بتاتا ہوں۔''میں نے ہاتھ بڑھا کر تاش کی گڈی پکڑتے ہوئے کہا اور جلدی جلدی پتے سیدھے کرنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔'' وہ گھبرا کر اٹھنے لگا مگر اس وقت تک میں گڈی سے اپنے مطلوبہ پتے نکال چکا تھا۔چاروں اِکے ٹیبل پر سیدھے پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

''ارے بھئی یہ کیا؟'' سیٹھ راجندران پتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے حیران سے بولا۔تاش کی گڈی میں سات اِکے کب سے آنے لگے۔

''یہ تو بھائی کو پتا ہوگا۔''میں نے شار پر کی طرف اشارہ کیا۔جو رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد گنگ سا ہو گیا تھا۔دیوار کے ساتھ کھڑے محافظوں کو بھی گڑبڑ کا احساس ہو گیا اور ان میں سے دو تیر کی طرح ہماری ٹیبل کی طرف بڑھے۔

''کیا ہوا؟'' ان میں سے ایک مستفسر ہوا۔

''مہاراج شار پنگ کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔''میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

''وہ کیسے؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''وہ ایسے۔''میں نے سات اِکے اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔

''اچھا۔'' وہ حیرانی سے بولا۔''چلو بھئی جگو دادا کے آفس۔دھوکا بازوں کی تو وہ اچھی خاطر تواضع کرتے ہیں اور بھائی صاحب آپ کو بھی زحمت کرنی پڑے گی۔'' وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا اور ساتھ ہی ان دونوں نے شار پر کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

اس کے کھڑے ہوتے ہی اس کی گود میں رکھے تین پتے پیچھے گر گئے جو اٹھا کر میں نے سامنے رکھ دیئے، وہ دو دکیوں اور ایک چوکی پر مشتمل تھے۔اس تاش کے ہمرنگ تین اِکے اس نے پہلے سے اپنے پاس چھپائے تھے جو موقع ملتے ہی اس نے اپنے سامنے رکھ دیئے تھے۔

''سیٹھ صاحب......آپ اپنے ٹوکن واپس لے لیں۔'' میں نے درمیان میں پڑے ٹوکنوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے دونوں سیٹھوں سے کہا۔

''یہ ہماری طرف سے آپ کا انعام ہوا۔'' راجندر خوشدلی سے بولا۔اور میں نے شکریہ کہہ کر تمام ٹوکن ایک شاپر میں ڈال لیے۔

''مسٹر۔'' سیٹھ راجندر ان محافظوں میں ایک سے بولا۔'' ہماری طرف سے جگو کو بتا دینا کہ یہ جوان حق پر ہے۔''اس کا اشارہ میری طرف تھا۔''ہم فی الحال واپس جا رہے ہیں اور جوان اگر جگو کوئی زیادتی کرے تو مجھے مل لینا یہ میرا کارڈ ہے۔''اس نے ایک وزٹنگ کارڈ نکال کر میرے حوالے کیا اور دونوں جوا خانے سے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

''چلیں سر۔'' محافظ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''چلو۔'' میں شاپر اپنے ہاتھ میں سنبھال کر ان کے ساتھ ہو لیا۔کاؤنٹر کے پیچھے ایک دروازے سے ہوتے ہم ایک کشادہ گیلری میں داخل ہوئے جس کا اختتام لکڑی کے ایک منقش دروازے پر ہوا۔جس کے دائیں بائیں دو غنڈے جوا خانے کے محافظوں کی مخصوص وردی میں ملبوس کھڑے تھے۔ہمیں دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا چند لمحوں بعد باہر آ کر وہ میرے ساتھ آئے محافظوں سے بولا۔

''باس نے کہا ہے کہ صرف اس کو بھیج دو اور باقی واپس چلے جاؤ۔''اس کا اشارہ میری جانب تھا۔دونوں محافظ شار پر سمیت اُلٹے قدموں واپس مڑ گئے اور یہ تو مجھے پہلے سے ہی پتا تھا کہ وہ شار پر جوا خانے کا اپنا بندہ تھا۔بہر حال میں محافظ کے اشارے پر جگو دادا کے آفس میں گھس گیا۔

وہ ایک وسیع کمرہ تھا۔لکڑی کی بڑی سی ٹیبل کے پیچھے گینڈا نما شخص ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا وہ سر سے گنجا تھا اس کے چہرے پر موجود لاتعداد زخموں کے نشان اس کے ماضی کی عکاسی کر رہے تھے۔کمرے کی دائیں اور سامنے والی دیوار پر بڑی سکرینوں والے ٹیلی ویژن آویزاں تھے جن پر جوا خانے کے ہال کے مختلف مناظر دکھائی دے رہے تھے۔

''اس کا مطلب ہے بغیر بتائے جگو اس سارے معاملے سے واقف تھا۔'' میرے دماغ میں ٹیلی ویژن سکرینوں کو دیکھتے ہی یہ خیال گونجا۔

''بیٹھو جوان۔'' جگو دادا نے ٹیبل کے سامنے پڑے صوفہ سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔میں ''شکریہ'' کہہ کر صوفے پر ٹک گیا۔

''کیا نام ہے تمھارا۔''

''جان۔'' میں مختصراً بولا۔

''تو مسٹر جان بات یہ ہے کہ تم اچھی طرح جان گئے ہو گے کہ جوگندر ہمارے جوئے خانے کا اپنا بندہ ہے۔اس لیے اسے میں نے واپس بھجوادیا ہےاور تمھیں بھی بلوانے کا مقصد اتنا ہے کہ مجھے تمھاری گیم کافی پسند آئی ہےاور میں چاہوں گا کہ اس کے بعد تم میرے لیے کھیلو۔جیتی ہوئی رقم سے 40 فیصد تمھارے ہوں گے اور ہارنے کی صورت میں تم بری الذمہ قرار پاؤ گے۔اس کے ساتھ تمھاری رکھشا کی ذمہ داری بھی میری ہوگی۔''

''آفر کافی اچھی ہے۔'' میں دھیمے لہجے میں بولا۔''مگر افسوس کہ یہ میری منزل نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے۔تم میری آفر مسترد کر رہے ہو۔'' اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔''لیکن یاد رکھنا یہ جرأت تمھیں مہنگی پڑے گی۔''

''مہنگی۔'' میں استہزائی انداز میں ہنسا۔''جگو دادا میں ادھر تمھاری دھمکیاں سننے نہیں آیا اپنے کسی مقصد سے آیا ہوں۔''

''کون سا مقصد؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''ایک بندے کو غیر قانونی طور پر انڈیا سے باہر بھجوانا ہے۔'' میں نے اپنے مقصد کی وضاحت کی۔

''سوری مسٹر جان...... یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔''

''جگو دادا، آپ جیسی شخصیت ان فیلڈوں سے مبرا ہوتی ہے۔'' میں نے اسے مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن میں ایسا کام کیوں کرنے لگا۔''

''معاوضہ لے کر اگر آپ قتل کروا سکتے ہیں تو اس کام میں کیا مضائقہ ہے۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

میری بات سن کر وہ ایک مرتبہ تو سیدھا ہو کر بیٹھا اور پھر کھردرے لہجے میں بولا۔

''جوان تم بہت بڑی بات کر رہے ہو اور میرا خیال ہے اس کا ثبوت تم پیش نہیں کر سکو گے اور سنی سنائی باتیں حقیقت نہیں ہوتیں۔''

''جگو دادا میں نے بر سبیل تذکرہ ایک بات کر دی ہے۔میرا مقصد آپ کو مجرم ثابت کرنا نہیں ہے۔''

''بہر حال چھوڑو اس موضوع کو۔'' جگو نے کہا۔شاید وہ خود اس موضوع سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔''تم معاوضے کی بات کرو۔''

''وہ آپ نے مانگنا ہے۔'' میں جواباً بولا۔

''مطلوبہ شخص کس سے چھپ کر نکلنا چاہتا ہے۔پولیس یا کوئی ذاتی دشمنی؟''

''دونوں سے۔''

''ذاتی دشمن کا نام جان سکتا ہوں۔'' وہ مستفسر ہوا۔

''سیٹھ رابندر ناتھ۔'' میں آہستہ سے بولا۔

''کیا؟'' وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔''جوان تمھارا دماغ جگہ پر ہے۔''

''بالکل۔'' میں اطمینان سے بولا۔

وہ چند لمحے کڑے تیوروں سے میری جانب دیکھتا رہا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''سوری جوان...... رابندر ناتھ سے ٹکر لینا میرے بس سے باہر ہے۔کیونکہ میں اپنی طبعی عمر تک جینا پسند کرتا ہوں۔''

''جگو دادا آپ کی شخصیت کے ساتھ یہ الفاظ میل نہیں کھاتے۔''

''تم جو بھی سمجھو۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔''میں سیٹھ رابندر ناتھ کے خلاف کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔''

''تم سیٹھ رابندر ناتھ سے میری دشمنی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''بالک تم بہت کم عمر ہو کر بہت بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔سیٹھ رابندر ناتھ کو کہنا کہ اگر جگو دادا کو جانچنا بھی تھا تو کسی بااثر شخصیت کو بھیجتا۔کسی کالج کے لونڈے کو میں کیونکر رابندر ناتھ کا دشمن سمجھ سکتا ہوں اور یہ بھی جان لو کہ تاش کی گیم اور زندگی کے کھیل میں بہت زیادہ فرق ہے انسان کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔''

مجھے پتا چل گیا کہ جگو دادا مجھے رابندر ناتھ کا بھیجا ہوا کوئی بندہ سمجھ رہا ہے جو اسے آزمانے کے لیے آیا تھا۔میں نے اسے اپنی پہچان کرانے میں قباحت نہ سمجھی یوں بھی اس ملک سے نکلنے کے لیے مجھے اپنی شناخت ظاہر کرنی پڑتی۔

''جگو دادا......میرا نام عمر جان کمانڈو ہے۔اور رابندر ناتھ سے میری دشمنی کی وجہ ہے شیش ناگ جو اپنے بھائی کوبرے کی موت کا بدلہ مجھ سے لینا چاہتا ہے۔''

''تم عمر جان ہو؟ ہاں واقعی تم وہی ہو۔میں بھی کہوں تم کیوں جانے پہچانے سے لگ رہے ہو۔کلین شیو کروا کے تمھاری شکل کافی بدل گئی ہے۔ان بیوقوفوں کو تمھاری کلین شیو کی تصویر بھی جاری کرنی چاہیے تھی۔ابھی تو اگر تم سر گنجا کرا لو تو بالکل ہی نہ پہچانے جاؤ۔بہر حال عمر جان صاحب اب بھی میں اپنی بات پر قائم ہوں۔رابندر ناتھ سے ٹکر لینا میرے بس سے باہر ہے۔البتہ ایک نصیحت تمھیں کرتا چلوں کہ یوں ہر کسی کے سامنے اپنی شناخت ظاہر نہ کرو۔تمھاری جانکاری دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا اعلان اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' میں رکھائی سے بولا۔''ویسے مجھے آپ سے مل کر بہت مایوسی ہوئی ہے جس طرح نام سنا تھا اس طرح آپ نظر نہیں آ رہے ہو۔بہر حال شکریہ۔'' میں صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

''جانو صاحب بیٹھو۔'' جگو دادا بے تکلفی سے بولا۔'' کچھ چائے پانی تو ہو جائے اور اتنی جلدی مایوس نہ ہوں۔میں تمھارے مسئلے پر غور کروں گا شاید کوئی حل سوجھ جائے۔''

اس کی امید افزا بات سن کر میں ایک دفعہ پھر بیٹھ گیا۔شاید میری مسلسل تعریفوں نے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا۔

''جگو دادا آپ مجھے چوری چھپے ہی انڈیا سے باہر نکالیں گے نا......تو جس طرح آپ پولیس کو بے خبر رکھیں گے اس طرح رابندر ناتھ کو بھی تو اندھیرے میں رکھ سکتے ہیں۔''

''اس کو اندھیرے میں رکھنا بہت مشکل ہے جوان۔'' وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے بولا۔

''دیکھو جگو دادا، اگر اس کو پتا چل گیا تو آپ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں کہ آپ میری اور اس کی دشمنی سے ناواقف تھے۔''
مجھے ایک دفعہ پھر امید کی کرن نظر آئی اور میں نے زوروشور سے دلائل دینے شروع کر دیئے۔

''نہیں۔'' وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شیش ناگ انڈر گراونڈ حلقوں میں یہ اعلان کر چکا ہے کہ جانو کمانڈو کو انڈیا سے باہر نکالنے والا رابندر ناتھ کا دشمن تصور کیا جائے گا اور شیش ناگ کے منہ میں رابندر ناتھ کی ہی زبان ہے وہ شیش ناگ کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہے۔ یوں بھی خبیث حقیقی اولاد سے محروم ہے۔ ایک لے پالک بیٹی اور دوسرا شیش ناگ ہے جن کو وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے میرے مسئلے پر غور کرنے سے آپ کی مراد فقط مجھ کو ٹالنا ہے۔'' میں صوفے ٹیک لگائے ہوئے مایوسی سے بولا۔

''جانو! جرائم کی دنیا میں طاقت کا قانون رائج ہے عرف عام میں کیا کہتے ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہر کمزور کو طاقتور کی ہاں میں ہاں بھی ملانی پڑتی ہے اور اپنے مفادات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں تجھے انڈیا سے باہر نکلنے میں ضرور مدد دوں گا کیونکہ رابندر ناتھ کی وجہ سے میں اپنا کاروبار ٹھپ نہیں سکتا۔ البتہ سامنے میں خود نہیں آؤں گا باقی میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں تمھیں ہنڈرڈ پرسنٹ حفاظت سے تیرے ملک پہنچوا دوں گا کیونکہ اس میں بیس پچیس پرسنٹ ناکامی کے بھی چانس ہیں۔ ویسے بھی جرائم کی دنیا میں کسی بھی کام کی گارنٹی سو فیصد نہیں دی جا سکتی۔''

''شکریہ جگو دادا!'' میں ممنونیت سے بولا۔ ''ابھی اگر معاوضہ بھی طے ہو جاتا۔''

''ضرور...... یہ تو اس کاروبار کا پہلا اصول ہے۔'' اس نے ریوالونگ چیئر کو اپنی پشت کی طرف موجود دیوار کے جانب گھماتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کام کے سلسلے میں پندرہ لاکھ روپے لوں گا۔ دس لاکھ پہلے اور پانچ کام ہو جانے کے بعد۔''

''جگو دادا...... دس لاکھ دوں گا۔ پانچ کام سے پہلے اور پانچ کام کے بعد۔'' میں نے جواباً کہا اس نے ریوالونگ چیئر کو ایک مرتبہ پھر گھما کر سیدھا کیا اور ایک دو لمحے میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ سوچا اور پھر باآواز بلند بولا۔ ''ڈن۔'' جواباً میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''ابھی کیا چلے گا ٹھنڈا یا گرم؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''صرف چائے۔ کھانا میں کھا کے آیا ہوں۔''

اس نے گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا اور چائے لانے کا کہا۔

''ویسے اس جگہ چائے کچھ معیوب سی لگتی ہے۔'' ملازم کے جانے کے بعد جگو دادا مسکراتا ہوا بولا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جانو صاحب آپ کو دیکھ کر یقین نہیں آتا آپ خالی ہاتھوں کو برے کے ساتھ لڑ کر اسے ہلاک کر چکے ہیں۔''

''اس بارے میں خود بھی حیران ہوں۔'' میں انکساری سے بولا۔ ''بس کمبخت کی موت آئی تھی ورنہ لڑا کا تو وہ بہت اچھا تھا۔''

''یہ تو خیر آپ کی منکسر المزاجی ہے ورنہ عینی شاہد دلیر سنگھ نے اس لڑائی کا احوال تفصیل سے اخبار والوں کے سامنے بیان کیا ہے۔اس کے مطابق کوبرا اتفاقی طور پر ہلاک نہیں ہوا بلکہ عمر جان کمانڈو بجا طور پر کوبرے سے اچھا فائیٹر تھا۔تفصیل بتلاتے ہوئے اس نے کہا کہ ابتدا میں کوبرے نے جارحانہ انداز اپنایا مگر اس کے بعد کوبرے کی فائیٹ زیادہ تر دفاعی رہی۔جانو آخر تک کوبرے پر حاوی رہا اور لڑائی کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔''

''اصل میں بہت سے ایسے واقعات بھی مجھ سے منسوب کیے جا رہے ہیں جن سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں۔اسی طرح دلیر سنگھ نے بھی میرے ساتھ گزرے ہوئے روز شب خوب مرچ مصالہ لگا کر اخبار والوں کے سامنے بیان کیے ہیں۔ورنہ اگر حقیقت دیکھی جائے تو اس کے بالکل برعکس ہوگی۔''

''جانو صاحب تیری یہی باتیں تیرے کردار کی عکاسی کرتی ہیں۔تم جتنا بھی خود کو چھپاؤ تیرے اندر جو صلاحیتیں ہیں وہ خود بخود سامنے آئیں گی۔مشہور کہاوت تو تو نے سنی ہوگی کہ ''شیر کبھی یہ نہیں کہتا کہ وہ شیر ہے وہ عمل سے دکھاتا ہے کہ وہ شیر ہے۔''

''جگو دادا آپ بھی اخبارات میں میرے متعلق الٹی سیدھی خبریں پڑھ کے متاثر ہو گئے۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔متاثر تو میں تم سے ملنے کے بعد ہوا ہوں اور صرف تمھاری شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں نے رابندر ناتھ سے مخالفت کا خطرہ مول لینے کی کوشش کی ہے۔''

''دھنیواد جگو صاحب۔'' میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا بولا۔اس وقت ملازم بھی چائے لے کر آ گیا۔چائے پی کر میں نے جگو دادا سے رخصت چاہی۔

''جانو صاحب اب مجھے ملنے کے لیے خود نہ آنا، بلکہ یہ میرا فون نمبر ہے اس پر رابطہ کرنا اور اپنا نام آکاش بتانا۔''

''ٹھیک ہے جگو صاحب۔'' میں اس سے فون نمبر والا کاغذ کا ٹکڑا لے کر جیب میں ڈالتا ہوا بولا اور ٹوکنوں کا شاپر اٹھا کر اس کے دفتر سے نکل آیا۔ہال میں جوا اسی زور و شور سے شروع تھا۔میں نے کاؤنٹر پر جا کر ٹوکن جمع کرائے تو اس نے مجھے دو تین بڑے نوٹوں کی گڈیاں تھما دیں۔مجموعی طور پر وہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب رقم تھی۔رقم کوٹ کی اندرونی جیبوں میں منتقل کر کے میں جوا خانے سے باہر نکل آیا۔ہوٹل کے ہال کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔

میں جیسے ہی ہوٹل سے باہر نکلا اچانک دو افراد جو مجھ سے آگے چل رہے تھے تیزی کے ساتھ میرے دائیں بائیں ہو گئے۔دونوں نے ہاتھوں میں پستول پکڑے ہوئے تھے جو انھوں نے میرے دونوں پہلوؤں میں گھسیڑ دیے۔

''اسی طرح آرام سے چلتے رہو۔ورنہ جسم میں روشندان بنا دوں گا۔'' ان میں سے ایک غرا کر بولا۔میں ذہنی طور پر اس قسم کے کسی حادثے کے لیے تیار نہیں تھا۔یہ کون ہو سکتے تھے کیا جگو دادا کے آدمی یا پھر چور اُچکے۔میرا ذہن کسی ایک خیال پر منطبق نہ ہو سکا۔وہ

مجھے لیے پارکنگ ایریا کی سائیڈ سے گزرتے ہوئے ایک ویران گلی میں داخل ہوئے۔ میرے ساتھ لگ کر چلتے ہوئے انھیں بہر حال اتنی دیر گزر چکی تھی کہ وہ لاشعوری طور پر مجھ سے غافل ہو گئے تھے۔ ان کے گمان کے مطابق میں مزاحمت کی کوشش نہ کرتے ہوئے خود کو ان کے حوالے کر چکا تھا۔ ان کا ارادہ لازماً ویران گلی میں تھوڑا سا آگے جا کر مجھے لوٹنے کا تھا۔ انھوں نے غالباً مجھے کاؤنٹر سے رقم وصول کرتے دیکھا تھا جس کے بعد ان کی نیت خراب ہوئی تھی۔

ویران گلی میں گھستے ہی میں نے ایکشن میں آنے کا فیصلہ کیا اور ایک جھٹکے سے پیچھے ہو کر میں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے پستولوں والے ہاتھ پر ہتھوڑے کے انداز میں مارے۔ دونوں کے منہ سے بے ساختہ ''اف'' کی آوازیں نکلیں تھیں اور ان کے پستول ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گلی کے پختہ فرش پر گر پڑے۔ وہ دونوں جلدی سے پستول اٹھانے کے لیے جھکے۔ مگر ایک کی ٹھوڑی میں اپنا گھٹنا مارتے ہوئے دوسرے کی گدی پر میں نے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا اور دونوں ''اوغ'' کی آواز کے ساتھ نیچے ڈھیر ہو گئے۔

میں دائیں بائیں دیکھ کر ان کی تلاشی لینے کے لیے جھکا مگر اسی وقت گلی کے سرے سے چند آدمیوں کے دوڑنے کی آواز آئی اور اس سے پہلے کہ میں اس آواز کا سبب جان کر کوئی حرکت کرتا۔ وہ دوڑتے ہوئے میرے سر پہنچ گئے تھے۔ وہ تمام کے تمام مسلح تھے اور ان کے جسموں پر موجود لباس سے آسانی سے پتا چل رہا تھا کہ وہ جگو دادا کے آدمی تھے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں سر۔'' میں انھیں دیکھ کر جیسے ہی سیدھا ہوا۔ ان میں سے ایک مؤدبانہ لہجے میں بولا اور میں ان کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ دشمن نہیں تھے۔

''ہاں......لیکن آپ لوگ؟''

''سر ہمیں جگو دادا نے بھیجا ہے۔ اس نے اپنے آفس میں موجود سکرین پر ان دونوں کو آپ کے دائیں بائیں دیکھ لیا تھا۔ یہ دونوں بمبئی کے مشہور اچکے ہیں انھیں پہچانتے ہی انھوں نے مجھے چار آدمیوں کے ساتھ آپ کے پیچھے بھیجا تاکہ ان سے آپ خلاصی کرا سکیں، لیکن میرا خیال ہے آپ کو ہماری مدد کی بالکل ہی ضرورت نہیں تھی۔'' آخری فقرہ اس نے مسکرا کر ادا کیا تھا۔

اس کی بات سن کر میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

''میری طرف سے جگو دادا کا شکریہ ادا کر دینا۔'' میں نے کہا۔ ''اور ان نمونوں کو بھی سنبھال لو میں چلا۔''

''اگر سر ہم آپ......''

''نو تھینکس۔'' میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چلا جاؤں گا۔''

اور وہ سر ہلاتے ہوئے ان پر جھک گئے جبکہ میں گلی سے نکل کر روڈ پر آ گیا۔ روڈ پر نکلتے ہی میری نظر سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی پر پڑی۔ میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا اور شیتل کے مکان کے سامنے موجود ایک مشہور بلڈنگ کا نام بتا کر بیٹھ گیا۔ ٹریفک کم ہونے کی وجہ سے ٹیکسی نے مجھے پچیس منٹ میں وہاں پہنچا دیا۔ کرایہ ادا کر کے میں شیتل کے مکان کے جانب چل پڑا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے

جب میں نے گیٹ پر جا کے دستک دی۔ دوسری تیسری دستک پر دھرمندر بابا نے اٹھ کر دروازہ کھولا، میں اس سے معذرت کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''شما چاہتا ہوں چچا۔ آپ کی نیند خراب کر دی۔''

''کوئی بات نہیں پتر۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا اور میں اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ سردی اپنے عروج پر تھی میں نے خواب گاہ میں جھانکا شیتل گردن تک کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے الماری کھول کر ہلکا پھلکا لباس نکال کر پہنا اور خواب گاہ سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے میرا ارادہ تھا کہ دھرمندر چاچا سے اوڑھنے کے لیے کوئی کمبل وغیرہ لے کر ڈرائنگ روم کے کشادہ صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں دروازے تک پہنچتا مجھے شیتل کی آواز سنائی دی۔

''اب کہاں چل دیے؟''

''تم جاگ رہی تھیں۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''میں ساتھ والے کمرے میں سونے جا رہا تھا۔''

''ادھر ہی سو جاؤ۔ میں تو ویسے ہی اٹھنے والی تھی۔'' وہ کمبل سے باہر ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے کمبل سے باہر نکلتے ہی میرے نگاہیں خود بخود جھک گئیں کمبخت نے شب خوابی کا نہایت ہی مہین لباس پہنا ہوا تھا۔

+ + +

جگو دادا سے ہونے والی بات چیت کافی امید افزا رہی تھی۔ اب مسئلہ 10 لاکھ روپوں کے پورا کرنے کا تھا۔ بمبئی میں بڑے بڑے جوا خانے موجود تھے لیکن 10 لاکھ پیدا کرتے کرتے چند دن تو لگ ہی جانے تھے۔ جگو دادا کے جوا خانے سے جیتی ہوئی رقم اور میرے اپنے پاس موجود رقم مل ملا کر ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے بقدر بن رہی تھی اس کا مطلب تھا میں ابھی تک اپنے ٹارگٹ سے ساڑھے آٹھ لاکھ کی دوری پر تھا۔ ایک مرتبہ میرے جی میں آیا کہ شیتل سے یہ پیسے مانگ لوں مگر پھر مجھے یاد آیا کہ اس کے کہنے کے مطابق تو اس کے اکاونٹ میں اڑھائی تین لاکھ روپے پڑے تھے وہ اگر تمام پیسے بھی میرے حوالے کر دیتی تب بھی میں اپنے مطلوبہ رقم کے ٹارگٹ سے دور ہی رہتا۔

میرے جی میں آیا کہ کسی سیٹھ کے گھر ڈاکہ ڈالوں مگر بعد میں مجھے اس خیال کو بھی مسترد کرنا پڑا کہ اس طرح کسی بے گناہ کے قتل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

گو جوا کھیلنا بھی بہت بڑا گناہ تھا مگر اس میں کسی بے گناہ کی ذات ملوث نہیں ہوتی تھی میں اس ادھیڑ بن میں مگن تھا کہ مجھے شیتل کی آواز سنائی دی۔

''سو گئے کیا۔'' وہ میرے ساتھ بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

''ہاں، تم جاؤ تاکہ میں سو سکوں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی سوناوغیرہ نہیں ہے......شرافت سے اٹھ کرتیار ہوجاؤ ہوجاؤ آج لنچ باہر کریں گے۔''

''شیتل پاگل ہوئی ہے کیا۔اگرکسی نے پہچان لیا تو۔''

''رات کوکسی نے نہیں پہچانا تو دن کوبھی کوئی نہیں پہچانے گا یوں بھی بمبئی میں تیری تلاش شروع نہیں ہوئی......ڈھونڈنے والے ابھی تک دہلی اوراس کے مضافات میں خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔''

''پھر بھی شیتل۔رات کے ٹائم پرکم روشنی اور چہرے پر مفلر لپیٹنے کی وجہ سے میری پہچان مشکل ہوجاتی ہے۔دن کوتو بندہ بہت دور سے نظر آتا ہے۔دوسرے رات کو میں جن جگہوں پر جاتا ہوں وہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جواخبار وغیرہ کم ہی دیکھتے ہیں جبکہ دن کے ٹائم پر زیادہ تر جولوگ ملتے ہیں وہ عموماً اخبار بینی کے رسیا ہوتے ہیں۔اور......''

''میں تیری منطق سے بالکل متفق نہیں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔''بس تم تیار ہوجاؤ ایک دون کی بات ہے پھر تو......'' وہ گلوگیر ہونے لگی۔

''اچھابابا......ابھی نہانے تو دونا۔''اوروہ ہنستے ہوئی اٹھ بیٹھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں شیتل کی چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر باہر جارہے تھے۔

''میراخیال ہے ساحل سمندر کی طرف چلتے ہیں۔''اس نے اپنی گاڑی کارخ جنوب کی سمت موڑتے ہوئے کہا۔جواباً میں نے فقط سرہلانے پر اکتفا کیا۔شیتل بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔کالی قمیص اور سفید شلوار میں وہ کسی اور ہی جہان کی مخلوق نظر آرہی تھی۔ساحل سمندر پر پہنچ کراس نے گاڑی ایک جدید طرز کے خوب صورت سے ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں موڑ دی۔چاق چوبند بیرہ ہمارے بیٹھتے ہی مینوکارڈ لے کرآن موجود ہوا۔

''صاحب سے آرڈر لو۔''شیتل بیرے سے مخاطب ہوئی جواس کے سامنے جھک کرمینوکارڈ رکھ دیا تھا۔

''نہیں بیگم صاحبہ خود آرڈر دے دو۔''اورمیرے بیگم صاحبہ کہنے پر شیتل کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔اس نے مینو کارڈ لے کردوتین ڈشوں کا بتایااورمیری جانب متوجہ ہوگئی۔

''کتنااچھالگتاتمھارے منہ سے بیگم صاحبہ سننا۔''

''جس کی بیگم بنوگی نا......وہ اس سے بھی زیادہ اچھے انداز میں پکارے گا۔مثلاً منے کی ماں۔''

''بکومت۔''وہ قطع کلامی کرتے ہوئے خفگی سے بولی۔''تمھارے علاوہ میں نے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔''

''کیوں......مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جوکسی اور مرد میں نہیں ہوسکتے۔تم اپنے اردگرد نگاہ تو دوڑاؤ شاید مجھ سے بھی کئی گنازیادہ ہینڈسم،خوب صورت اورقدآور جوان تجھے اپنے ہم مذہب مل جائیں۔جوتیری محبت کاجواب تجھ سے بڑھ کرچاہت سے دیں۔''

''کیوں بائیس سال کی زندگی میں نے آنکھیں بند کر کے گزاری ہے کیا؟'' وہ جھلاتے ہوئے بولی۔''اس معاشرے اور ملک میں رہی ہوں۔اگر تیرے جیسا کوئی ہوتا تو نظر نہ آجاتا۔''

''اچھا بیرا آرہا ہے۔فی الحال خاموش رہو۔'' میں نے بیرے کو کھانے والے برتنوں سمیت آتے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''کیوں خاموش رہوں...... ڈرتی ہوں کسی سے۔'' اس کا انداز بالکل نک چڑھی بیوی کا سا تھا۔ بیرا بھی کھانے برتن میبل پر سجاتے ہوئے زیرلب مسکرادیا تھا۔میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کھانا واقعی بہت لذیذ بنا ہوا تھا۔کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور پھر بل پے کر کے باہر نکل آئے۔ہوٹل کے دروازے سے نکلتے وقت سامنے سے آتا ہوا ایک شخص اچانک ٹھٹک کر رکا،میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی کہ شاید اس نے مجھے پہچان لیا ہے مگر پھر اسے اپنی جیبیں ٹٹولتے دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔اس سے شاید گاڑی کی چابی یا بٹوہ کہیں گم ہوا تھا۔

''اب کہاں چلیں۔'' شیتل نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر پوچھا۔

''جہاں سرکار کا جی چاہے۔'' میں مؤدبانہ لہجے میں بولا۔میرے انداز پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر مسکرا پڑی۔وہاں سے ہم سیدھے سمندر کے نسبتاً ویران ساحل پر پہنچ گئے۔

''یہ کہاں لے آئی ہو۔'' میں گاڑی سے نیچے اترتا ہوا بولا۔

''اپنے خوابوں کی جنت میں۔'' وہ جیسے کھلی آنکھوں خواب دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرا جی چاہتا ہے کہ سنسار کے اس گوشے میں چلی جاؤں جہاں کوئی نہ ہو صرف میرا اور تمھارا ساتھ ہو۔''

''اگر میں کہوں کہ تم پاگل ہو تو......'' میں نے اس کی تقلید میں اپنے جوتے اور جرابیں اُتار کر ننگے پیر ٹھنڈی ریت پر چلتے ہوئے کہا۔

ایک ہمی کو پاگل کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

اس نے ہلکے سے ردوبدل کے ساتھ شعر پڑھ کر میری بات کا جواب دیا۔

''میں الزام نہیں دے رہا...... حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

''جان...... یہ سبھی محبت کرنے والوں کو لوگ پاگل کیوں سمجھتے ہیں؟''

''لوگ تو انھیں پاگل نہیں سمجھتے۔'' میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تو پھر؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''وہ اصل میں ہوتے ہی پاگل ہیں لوگوں کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''جان کے بچے باز آجاؤ۔'' وہ مکہ تانتے ہوئے بولی۔

''دو فیکٹریوں کے مالک سیٹھ کی اکلوتی بیٹی۔ ایک ایسے شخص کی محبت میں مبتلا ہو جائے جو اس کے ملک کی نظر میں مجرم ہے۔ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ جبکہ اس شخص میں صرف اتنی خوبی ہے کہ وہ قد میں لمبا ہے۔ حالانکہ اس سے بہتر تھا کہ تم کس زرافے سے محبت کر لیتیں۔''

''تم باز نہیں آؤ گے۔'' وہ مجھے پکڑنے کے لیے میری طرف دوڑی اور میں الٹے قدموں پیچھے بھاگا اچانک مجھے اس سمت سے کہ جس طرف سے ہم آئے تھے تین گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

''کیا ہوا...... جان۔'' مجھے حیرانی سے گاڑیوں کی سمت دیکھتے دیکھ کر وہ پریشانی سے بولی۔

''تین گاڑیاں ہماری طرف آ رہی ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟'' وہ بے فکری سے بولی۔ ''ہوں گے کوئی پکنک منانے والے۔'' مگر میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر گاڑیوں کی سمت دیکھتا رہا۔

''کم آن جان۔'' وہ میرے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔''

اس وقت تینوں گاڑیاں ہماری کار کے ساتھ آ کر رک گئیں اور پھر ان سے تیرہ چودہ افراد نیچے اترے۔ سب سے آگے ایک لمبے قد اور سڈول جسم کا نوجوان تھا۔ جس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ جبکہ اس کے پیچھے چلنے والے تمام افراد نے مختلف ہتھیار پکڑے ہوئے تھے۔

مجھے شبہ ہوا کہ وہ کوئی اچکوں کا گروہ تھا جو اکیلے جوڑے کو دیکھ کر لوٹنے آ رہے تھے۔ اس طرح کی وارداتیں بمبئی میں معمول کی بات ہے۔ لیکن سب سے آگے چلنے والے نوجوان کا انداز بالکل معمولی نہیں تھا۔ اس کے چلنے کے انداز سے لگتا تھا گویا اپنے ہمراہ وہ طوفان لے کر بڑھ رہا ہو۔ ان ہتھیار برداروں کو دیکھ کر شیتل بھی خاموش ہو گئی تھی۔ جگو دادا کے جوا خانے سے جیتی ہوئی رقم میں گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔ مجھے اس وقت صرف شیتل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں اتنے ہتھیار برداروں کا مقابلہ کرنا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوتا۔ اپنا پستول میں نے جیب سے نکالنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اتنے ہتھیاروں کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

وہ تمام ہمارے قریب آتے ہی پھیل گئے اور ہمارے گرد دائرہ بنا لیا گویا انھوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کا لیڈر غالباً وہی نوجوان تھا جو سب سے آگے چل رہا تھا۔ لمبی زلفیں جو اس کے شانوں تک پھیلی ہوئی تھیں، بھوری آنکھیں، پتلے ہونٹ، لمبی گردن، مجموعی طور پر اسے خوب صورت کہا جا سکتا تھا مگر ایک خاص قسم کی بے رحمی کا تاثر اس کے چہرے سے چھلکتا تھا جس بنا پر اسے پسندیدہ شخصیت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے آ کر رک گیا۔ اس کا قد تقریباً میرے برابر ہی تھا۔ چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکنے کے بعد وہ گویا ہوا۔

''عمر جان کمانڈو...... بہت اچھا پیس چنا ہے انڈیا سے۔'' اس کی بات سن کر گویا میرے سر پر بم پھٹ پڑا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا، لیکن میرے لیے اجنبی تھا۔

''آپ کا تعارف۔'' میں اپنے حواسوں پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''میرا نام۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر زہریلے لہجے میں بولا ''داس کو شیش ناگ کہتے ہیں'' یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا، لیکن میں نے اپنے چہرے سے ایسا کچھ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ اس لیے میں نے حیرانی کے انداز میں صرف اس کا نام دہرایا۔

''شیش ناگ؟''

''ہاں۔'' وہ گویا پھٹتے ہوئے بولا۔ ''کوبرے کا بھائی۔ اب کچھ یاد آیا۔''

''کوبرا؟'' میں نے جیسے کچھ یاد کرنے کی اداکاری کی۔ ''سوری دوست اس نام کے کسی شخص سے میں واقف نہیں ہوں۔''

''کمانڈوز کی یادداشت اتنی تو کمزور نہیں ہوتی۔''

''میرا تعلق کمانڈوز کی اس قبیل سے نہیں ہے۔'' میں لاپرواہی سے بولا۔ ''میں صرف اہم شخصیات کو یاد رکھتا ہوں، اس طرح اگر ہرایرے غیرے کو یاد رکھتا پھروں تو پھر تو گیا کام سے۔''

''تم صرف اپنی موت کو اذیت ناک بنا رہے ہو۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''مسٹر سانپ! بات یہ ہے کہ اتنا بڑا گروپ اگر کسی کنواری لڑکی کے ساتھ بھی ہوتا؟ تو وہ اس سے بھی بڑی بڑی بڑھکیں مارے گی۔''

''فکر مت کرو میں خالی ہاتھ میں تمھیں موقع دوں گا۔''

''تو چلو...... آجاؤ...... یہ گز ہے اور یہ میدان۔''

''نہیں کمانڈو نہیں۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تیری موت کو بھارتی جنتا کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دینا چاہتا ہوں۔ تیری تلاش میں بہت راتوں سے جاگ رہا تھا۔ میری نیند مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ اتنی آسانی سے تجھے کیسے مار دوں۔''

''مسٹر سنپولیے...... بات یہ ہے کہ تیری میری کوئی دشمنی نہیں بالکل اسی طرح جس طرح تیرے بھائی سے میری کوئی دشمنی نہ تھی۔ اس نے خود مجھے چیلنج کیا تھا اور جوا ہار گیا اس میں میری کوئی خطا بتا دو کہ تم مجھ سے انتقام لینے کے لیے اتنے بے قرار ہو۔ دوسرے میں تجھے بدلہ لینے سے منع نہیں کرتا صرف اتنی درخواست کر رہا ہوں کہ جو کچھ ہونا ہے ابھی ہو جائے میرے مرنے کی صورت میں یہ بات خود بخود سب کو معلوم ہو جائے گی کہ سانپوں کے خاندان نے اپنا بدلہ لے لیا ورنہ اس کے برعکس تمھیں یہ معاہدہ کرنا ہوگا کہ تیرے یہ چچے مجھے جانے دیں گے۔''

''میں تم سے بھی زیادہ بے چین ہوں مسٹر بھگوڑے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا ''لیکن افسوس انڈیا میں تیری سپر مینی کے بڑے چرچے ہو رہے ہیں، میں تیری موت کو بھی اسی طرح یادگار رہنا چاہتا ہوں۔ ادھر اگر میں تجھے خالی ہاتھ مار دوں تب بھی کسی نے یقین نہیں کرنا سب کہیں گے کہ یہ میرے گروپ کا کام ہے۔ اس لیے یہ کڑوا گھونٹ تجھے بھرنا پڑے گا۔ ویسے بھی یہ چند لمحوں کا کام ہوگا مر کر تو تو

لوگوں کے طعنے سہنے سے رہا۔‘‘

ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آیا کہ اس پر اسی جگہ حملہ کردوں بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔مگر دائیں بائیں ہتھیار برداروں کو دیکھ کر میں اس ارادے سے باز رہا۔

’’ایک بات تو بتاؤ؟‘‘

’’پوچھو۔‘‘وہ اطمینان سے بولا۔

’’یہاں میری موجودی کا تمھیں کیسے پتا چلا ہے؟‘‘میں مستفسر ہوا۔

’’بمبئی میں ایک پتا بھی سیٹھ رابندر ناتھ کی مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔تم تو ایک جیتی جاگتی چھ فٹ کی لاش ہو۔‘‘

’’مگر......‘‘میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اچانک میری نظر اس کی پشت کی طرف کھڑے شخص پر پڑی،میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔وہ وہی ذات شریف تھا۔جو ہمیں ہوٹل سے نکلتے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا تھا اور پھر میرے متوجہ ہونے پر اپنی جیبوں کی تلاشی لینے لگ گیا تھا۔

’’ٹھیک ہے شیش ناگ مجھے جگہ اور دن بتادو میں پہنچ جاؤں گا۔‘‘

’’دو دن ہمیں اگر اپنی میزبانی کا موقع دے دو تو کیسا رہے گا؟‘‘

’’ٹھیک ہے لیکن شیتل ہمارے ساتھ نہیں جائے گی۔‘‘

’’اس بلبل کا نام شیتل ہے،گویا شکل کی طرح نام بھی پیارا ہے۔‘‘وہ چٹخارا لیتے ہوئے بولا۔’’بہرحال یہ ہماری طرف سے آزاد ہے۔یہ واپس جاسکتی ہے۔‘‘

’’بالکل نہیں۔‘‘وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے بولی۔’’میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔‘‘

’’شیتل پاگل مت بنو۔‘‘میں نے اسے جھڑکا۔’’میں ان شاءاللہ بہت جلد تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔‘‘

’’کمانڈو۔‘‘شیش ناگ کا لہجہ استہزائی تھا۔’’اس پر تُو نے ایسا منتر نہیں پھونکا کہ یہ واپس جاسکے۔اب ڈائیلاگ بازی چھوڑو اور چلو۔‘‘یہ کہہ کر اس نے اپنے بندوں کو اشارہ کیا اور تمام ہمیں گھیر کر گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔شیتل کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر شیتل کو بٹھا کر شیش ناگ نے مجھے اس کے ساتھ آگے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

’’اگلی کار کے پیچھے پیچھے چلتی رہو۔‘‘وہ شیتل سے بولا اور اس نے خاموشی سے اپنے آگے چلنے والی گاڑی کے پیچھے اپنی کار لگا دی۔یونہی آگے پیچھے چلتے ہم پندرہ بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک بہت بڑی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئے۔باوردی ملازم نے دروازہ کھولا اور ہم اندر گھس گئے۔ملازم نے باقاعدہ شیش ناگ کو سیلوٹ کیا تھا۔گاڑیاں بڑے سے گیراج میں پارک کر کے ہم تمام باہر نکل آئے۔شیش ناگ نے آگے بڑھ کر ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی۔اس وقت اس کے بھائی کو برے کا بریٹا میری جیب میں ہی تھا۔

''یہ میرے بھائی سے چھینا تھا نا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا جواباً میں نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔ پستول جیب میں ڈال کر وہ شیتل سے مخاطب ہوا۔

''بے بی اگر تیرے پاس کوئی کھلونا ہے تو وہ بھی جمع کرا دو۔ ذرا سی غلط حرکت بھی تیرا انجام بہت بھیانک بنا دے گی۔''

''اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔'' شیتل کی بجائے میں نے جواب دیا۔

''اوکے چلو۔'' اس نے ہمیں گیراج سے باہر دھکیلا۔ ہم گیراج سے باہر نکلے تو اسی وقت اندرونی عمارت سے تھری پیس میں ملبوس ایک پتلا سا شخص خوب صورت سی لڑکی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ لڑکی نے سکرٹ کے اوپر فقط ہلکا سا بلاؤزر پہنا ہوا تھا اس ناکافی لباس میں اس کا گورا بدن دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہا تھا۔ میرے ساتھ موجود تمام افراد نے انھیں دیکھتے ہی سر جھکا لیا تھا صرف شیش ناگ سیدھا کھڑا اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''ہاں بوائے کیا رہا۔'' عجیب وحشتناک آواز تھی کہ سن کر مخالف کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

''ڈیڈ میں کوبرے کے قاتل کو لے آیا ہوں۔'' شیش ناگ نے جواب دیا۔

''اس کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ادھر ہی فیصلہ کر کے آتے۔'' وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں مجھے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''نہیں ڈیڈ۔'' شیش ناگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس کی موت کو یادگار بنانا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران سے مستفسر ہوا۔

''بلڈی ہال۔'' وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''سالانہ...... فائیٹر کنگ کے چناؤ کے لیے مقابلے سنڈے نائیٹ سے شروع ہو رہے ہیں۔ اس میں اوپننگ فائیٹ ہماری ہو گی۔''

''مگر؟'' رابندر ناتھ نے کچھ کہنا چاہا، لیکن شیش ناگ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

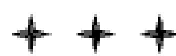
''کوئی اگر مگر نہیں ڈیڈ...... میں ان تمام لوگوں کا منہ بند کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میرے بڑے بھائی کے پیچھے باتیں کی ہیں۔''

''چلو جیسے تمھاری مرضی۔'' رابندر ناتھ رضامند ہوتا ہوا بولا۔ ''اب اس کو رکھو گے کہاں؟''

''ادھر ہی تہہ خانے میں۔'' شیش ناگ بولا اور رابندر ناتھ سر ہلاتا گیٹ کی طرف مڑ گیا۔ وہ قتالہ عالم بھی مجھے گہری نظروں سے دیکھتی اس کے پیچھے چل دی وہ غالباً اس کی داشتہ یا لے پالک بیٹی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں عمارت کے کشادہ تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

''اب کیا ہو گا جان۔'' شیتل دروازے کے باہر سے بند ہوتے ہی مجھ سے لپٹتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''جو کچھ ہو گا پرسوں تیری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔'' میں ہنس کر بولا اور وہ حیرانی سے میرے چہرے کو تکنے لگی۔



میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا! وہاں لوہے کے فریم والی دو چارپائیاں پڑی تھیں، جن کی بنائی پلاسٹک کی نوار سے کی گئی تھی۔ دونوں چارپائیاں بستر کی چادر اور تکیے وغیرہ سے محروم تھیں۔ داخلی دروازے پر ایک ٹیوب لائیٹ روشن تھی۔ اس کے علاوہ کمرہ ہر قسم کے سازوسامان سے عاری تھا۔ میں نے چارپائی کو ہلا جلا کر دیکھا اور اپنے اندازے کے مطابق اسے فرش میں گڑا ہوا پایا۔

''اس کا مطلب ہے یہ پہلے بھی اپنے قیدیوں کو ادھر رکھتے رہے ہیں؟'' میں خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''رکھتے رہے ہوں یا نہ رکھتے رہے ہوں اس بات کا ہمارے اوپر کیا اثر پڑے گا۔'' شیتل جو میرے ساتھ کھڑی میری حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھی میری بڑبڑاہٹ سن کر بولی۔

''بہت فرق پڑے گا۔''

''وہ کیسے؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''وہ ایسے کہ بالفرض اگر ہم پہلی مرتبہ ادھر بند کیے جا رہے ہوتے تو قید خانے کے انتظامات مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے بھاگ نکلنے کے چانس زیادہ ہوتے۔ چونکہ یہ پہلے بھی قیدیوں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے اس لیے ادھر تمام ممکنہ خامیوں کا وقتاً فوقتاً سد باب ہوتا رہا ہوں گا۔''

''اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔'' شیتل نے میری بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ''کہ نئے نگران زیادہ چوکنے ہوں اور جن کا ہمیشہ کا یہ کام ہو وہ عموماً روزانہ کا کام ہونے کی وجہ سے تھوڑا لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔''

''ہر جگہ پر یہ کلیہ منطبق نہیں ہوتا محترمہ،...... سنتری قیدیوں کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چاق چوبند ہوتے ہیں یا لاپرواہی اختیار کرتے ہیں۔''

''ویسے کیا آپ کا ارادہ یہاں سے فرار ہونے کا ہے؟''

''نہیں۔'' میں چارپائی پر لیٹتا ہوا بولا۔ ''ادھر سے فرار ہونا فی الحال ناممکن نظر آ رہا ہے۔''

''تو پھر اتنے جائزے لینے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''یہ تو ویسے ہی ہم کمانڈوز کی عادت ہوتی ہے۔'' اس کے انداز کو دیکھ کر میں ہنستے ہوئے بولا۔

''بہت فضول عادت ہے۔''

''فضول تو خیر نہیں ہے، اگر آج ممکن نہیں تو کل تو فرار ہونا، ممکن ہو سکتا ہے اور جائزہ لے کر ہی میں کوئی منصوبہ بنا سکتا ہوں۔''

''جان تمھیں پریشانی نہیں ہے کہ پرسوں تم نے زندگی اور موت کی جنگ لڑنی ہے۔'' وہ دوسری چارپائی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔

''یہ جنگ تو میں جب سے انڈیا میں وارد ہوا ہوں مجھے لڑنی پڑ رہی ہے۔'' میں بے پرواہی سے بولا۔

''پھر بھی۔'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''یہ شیش ناگ مجھے کافی خطرناک بندہ دکھائی دے رہا ہے۔''

''وہ بندہ کدھر ہے۔'' میں مسکرا کر بولا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔اس وقت دروازے پر کھٹکا ہوا اور دروازہ کھول کر ایک ہتھیار بردار اندر داخل ہوا۔اس کے پیچھے مجھے چند اور بندے بھی نظر آئے مگر انھوں نے اندر آنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

''آپ نے کھانا کھانا ہے؟'' اندر داخل ہونے والا میری چارپائی سے چند قدم دور رک کر سپاٹ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''نہیں شکریہ......البتہ سیٹھ رابندر ناتھ سے میں نے ملنا ہے۔''

''آپ کا پیغام اس تک پہنچ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ الٹے قدموں لوٹ گیا۔

''سیٹھ رابندر ناتھ کے ساتھ تیرا کیا کام ہے؟'' ان کے کمرے سے نکلتے ہی شیتل مستفسر ہوئی۔

''ملاقات ہوگئی تو تُو نے بھی میرے ساتھ ہونا ہے اسی وقت سن لینا۔''

''ابھی بتاتے ہوئے تیرا بل آجائے گا؟'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ابھی میں نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا ہے اس لیے فی الحال مجھے سوچنے دو۔'' میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''اپنے ارادے سے مجھے بھی آگاہ کرو شاید میں کوئی بہتر مشورہ دے سکوں۔''

تیرے جیسی ناقص العقل عورت سے بہتر مشورے کی امید رکھنا فضول ہے۔''

''تُو تو بڑا بقراط ہے نا؟'' وہ منہ پھلاتے ہوئے بولی اور ناراضگی سے رخ پھیر کر لیٹ گئی۔

میں بھی زیرِ لب مسکرا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔میں نے جان بوجھ کر اسے غصہ دلایا تھا، کہ کچھ دیر سکون کر لوں ورنہ اس نے میرا دماغ چاٹتے رہنا تھا۔

+ + +

رات کا کھانا لانے والوں نے مجھے سیٹھ رابندر ناتھ سے ملاقات کی نوید سنائی ہم نے جلدی جلدی کھانا زہر مار کیا اور مسلح افراد کی زیرِ نگرانی مختلف راہداریوں سے گھومتے اعلیٰ درجے کے قیمتی سامان سے مزین ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ڈرائنگ روم کی سجاوٹ مکینوں کی امارت اور اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کر رہی تھی دیواروں کے ساتھ مختلف قسم کی قیمتی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ایک بڑی پورٹریٹ میں سیٹھ راجکماروں کے سے لباس میں تخت پر بیٹھا کسی ریاست کا راجہ معلوم ہو رہا تھا۔

ہمیں وہاں پہنچانے والے ہتھیار بردار چاروں دیواروں کے ساتھ پھیل کر کھڑے ہو گئے۔

سیٹھ جلد ہی اس خوب صورت حسینہ کے ساتھ نمودار ہوا جس کے ساتھ اسے ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔آج بھی اس کے لباس کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ اپنی جیکٹ تن ڈھانپنے کے لیے اس کے حوالے کر دوں اتنی سردی میں اس کے لباس کو دیکھ کر اس کے گرمی کے لباس کا اندازہ لگانا میری سوچ ماورا تھا۔

شیش ناگ ان دونوں سے ایک قدم پیچھے تھا۔وہ تینوں ہمارے سامنے ایک صوفے پر براجمان ہو گئے۔سیٹھ رابندر ناتھ درمیان

میں شیش ناگ اور لڑکی دائیں بائیں۔

''عمر جان۔'' سیٹھ رابندر ناتھ چند لمحوں خاموشی سے مجھے گھورنے کے بعد گھمبیر آواز میں بولا۔

''تُو نے ہم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ہم نے تیری یہ خواہش پوری کر دی بولو کیا بات ہے۔''

اس کے بولنے سے مجھے اس کی متکبرانہ فطرت کا اندازہ ہو گیا اور میں حتی الوسع اپنے اندرونی ابال پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''سیٹھ صاحب آپ بمبئی، بلکہ بھارت کے بے تاج بادشاہ ہیں اور میں ایک عام سا فوجی...... بھارت آمد کے بعد میرے کسی فعل سے بھی آپ کے کسی مفاد کو ادنیٰ سی ٹھیس بھی نہیں پہنچی، میں بیشک نادانستگی میں بھارت سرکار کا مجرم بن گیا ہوں لیکن اس جرم پر مجھے اپنے پاس قید کرنے کی کم از کم آپ جیسی اصولی شخصیت کو کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔اور جہاں تک تعلق ہے شیش ناگ کے بھائی کو برے کا اس کے ساتھ میں اپنے دفاع کی جنگ لڑا ہوں۔جس کا حق ہر انسان بلکہ جانور تک کو حاصل ہے۔اگر میں اس کی رہائش گاہ پر حملہ کرتا تو پھر بے شک میں قصوروار تھا اس کے بعد بھی اگر شیش ناگ کے دل میں میرے ساتھ مقابلے کی کوئی حسرت ہے تو اسی کوٹھی کے پلاٹ میں پوری کر لے۔اس طرح پنڈال میں میرا تماشہ بنانا اور میرے دو تین دن ضائع کرنا آپ لوگوں کو شوبھا نہیں دیتا۔''

''ہوں......'' کہہ کر سیٹھ رابندر ناتھ نے سوالیہ نظروں سے شیش ناگ کی طرف دیکھا۔جس سے مجھے محسوس ہوا کہ میری باتیں اس کے جی کو لگی ہیں۔

''ڈیڈی میں نہیں مانتا کہ اس نے خالی ہاتھوں کو برے کو شکست دی تھی۔اس نے لازمی اس کے ساتھ کوئی دھوکا کیا تھا۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دلیر سنگھ نامی شخص نے کو برے پر قابو پانے میں اس کی مدد کی ہو۔اس بات کا سب سے بڑا ثبوت میرے بھائی کے سر پر لگی ہوئی چوٹ ہے جو پشت کی جانب سے لگائی گئی ہے اور صاف ظاہر ہے اس کی لاعلمی میں ہی لگائی گئی ہوگی اور رہ گیا دلیر سنگھ کا بیان تو وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے عمر جان کو بہت اچھا لڑکا ظاہر کر رہا ہے۔دوسرے کنگ فائٹر کے چناؤ کے لیے افتتاحی فائیٹ میرے اور اس کے درمیان ہوگی اس بات کا اعلان زیر زمین حلقوں میں ہو چکا ہے ابھی یہاں پر اس سے مقابلے کا مطلب ہے کہ ہم نے اسے بے بس کر کے ہلاک کر دیا ہے اور یہ طعنے میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

اس کے پُر اعتماد انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے مقابلے میں ہر صورت اسے ہی کامیابی ہوگی اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے کمزور سمجھ رہا تھا اور میرے استاد صوبیدار مراد صاحب کے قول کے مطابق یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔وہ کہتے تھے کہ ''دشمن کو کبھی بھی اپنے سے کمزور نہ سمجھو اور اپنے مقابل کی ہر ممکن کارروائی کے لیے تیار رہو۔'' جبکہ یہاں پر شیش ناگ صاحب مجھے بالکل تر نوالہ سمجھے بیٹھے تھے میں نے بھی اس کی یہ غلط فہمی برقرار رکھی۔

رابندر ناتھ نے شیش ناگ کی بات سن کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو اب بتاؤ۔اس کے انداز میں یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ میری اور شیش ناگ کی لڑائی سے اس کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور یہ صرف شیش ناگ کی ضد تھی جیسے اس نے طوعاً وکرہاً قبول کیا تھا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سیٹھ صاحب یہ صورتِ حال رنگ میں بھی پیش آسکتی ہے میں رنگ میں اترتے ہی اپنے آپ کو کمزور ثابت کرنے کے لیے جان بوجھ کر گر جاؤں گا اور دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ اسے اعصابی کمزوری کی دوائی کھلائی گئی ہے۔''

میری بات سن کر شیش ناگ کے چہرے پر ایک ناگ سا آ کر گزر گیا تھا لیکن بظاہر اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''وہ تو خیر بڑے بڑے شیش رنگ کا نام سن کر غش کھا جاتے ہیں، لیکن تیری اس جسارت کا مطلب ہوگا کہ تُو نے اپنے لیے ایک اذیت ناک موت منتخب کر لی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تیری آنکھوں کے سامنے تیری اس بلبل کا جو حشر میرے بندوں کے ہاتھوں ہوگا اسے دیکھ کر تیرے ہاتھ صرف پچھتاوا رہ جائے گا جبکہ لڑائی کے رنگ میں تُو عزت کی موت مرے گا یا شاید ہو سکتا ہے صرف شدید زخمی ہونے کے بعد بچ بھی جاؤ اور تیری محبوبہ بھی باعزت اپنے گھر پہنچا دی جائے گی۔''

مجھے پتا تھا کہ شیش ناگ کے خلاف رنگ میں اترنا میرا مقدر بن چکا تھا اور اس سے پہلو تہی ناممکن تھی لیکن میرے انکار میں بھی ایک مقصد پوشیدہ تھا اور میں اسی مقصد پر آتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے سیٹھ صاحب میں کوبرے کے بھائی کے ساتھ رنگ میں دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے لیے میری دو شرائط ہیں۔''

''کیا؟'' وہ دونوں بیک زبان مستفسر ہوئے۔ وہ لڑکی جو میرے اندازے کے مطابق رابندر ناتھ کی لے پالک بیٹی تھی نے گہری دلچسپی سے میرے اوپر نظریں گاڑ رکھیں تھیں اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب قسم جنسی بھوک نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز کو شیتل نے بھی محسوس کر لیا تھا اور بے خیالی میں وہ میرے بالکل قریب ہو گئی تھی جیسے مجھے اس کی نظروں سے بچانا چاہتی ہو۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن اس کے انداز میں بازاری پن تھا اور دوسری شیتل کی موجودی میں بھی اس کا حسن گہنایا ہوا لگ رہا تھا۔ میں اس کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے بولا۔

''میری پہلی شرط یہ ہے کہ شیتل کو ابھی اپنے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' میری دوسری شرط کے پیش کرنے سے پہلے شیتل میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میں تیرے ساتھ رہوں گی تُو نے خود وعدہ کیا تھا۔''

''مگر......''

''اگر مگر نہیں۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی اور میں نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''اچھا اب دوسری شرط بتلاؤ۔'' سیٹھ راجندر ناتھ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو سمجھو ہم نے قبول کر لی، تیری اپنی ساتھی نہیں جانا چاہتی۔''

''دوسری یہ کہ اگر میں شیش ناگ سے مقابلہ جیت گیا تو آپ مجھے بحفاظت پاکستان پہنچانے کے ذمہ دار ہوں گے۔''

''منظور۔'' شیش ناگ رابندر ناتھ کے بولنے سے پہلے بولا۔

”مجھے تمھاری نہیں سیٹھ صاحب کی منظوری درکار ہے۔تم تو اس وقت اپنی کسی شرط کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوگے۔اگر میں جیت گیا تو۔“

”ہم ابھی یہ شرط منظور کر کے بعد میں مکر بھی تو سکتے ہیں۔“سیٹھ رابندر ناتھ نے کہا۔

”آپ کا کہا میرے لیے کس دستاویز سے کم نہیں سیٹھ صاحب۔“میں اسے مکھن لگاتے ہوئے بولا۔”آپ جیسی شخصیت کبھی بھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“وہ متکبرانہ انداز میں بولا۔”ٹھیک ہے ہمیں تمھاری یہ شرط منظور ہے......اور کچھ؟“

”کچھ نہیں۔“میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اسے تہہ خانے کی بجائے انیکسی میں شفٹ کردو۔“وہ شیش ناگ سے مخاطب ہو کر بولا۔”مجھے امید ہے کہ یہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

”ٹھیک ہے ڈیڈ۔“شیش ناگ کا انداز کس فرمانبردار بیٹے کا سا تھا۔

”بے بی تُو نے میرے ساتھ پارٹی میں چلنا ہے یا آرام کرو گی۔“وہ اس حسینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔اس کے انداز سے مجھے اپنے اندازے کی تصدیق ہوگئی کہ وہ اس کی لے پالک بیٹی ہی تھی۔

”نہیں ڈیڈ آج میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔“وہ بڑے انداز سے بولی اور سیٹھ سر ہلاتے ہوا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔

”چلو۔“سیٹھ کے رخصت ہوتے ہی شیش ناگ مجھ سے مخاطب ہوا۔اس کے چہرے پر اپنے لیے نفرت کے آثار مجھے واضح نظر آرہے تھے۔میں اور شیتل خاموشی سے کھڑے ہوگئے۔جبکہ بے بی اسی طرح صوفے پر بیٹھی رہی البتہ اس کی شوخ نظریں میرے چہرے اور باقی جسم پر سرگرداں رہیں۔

شیش ناگ اور ہتھیار برداروں کی نگرانی میں ہم انیکسی میں پہنچے،وہاں ایک پُرتعیش خواب گاہ میں ہمیں بند کردیا گیا۔یہ مہربانی سیٹھ نے نامعلوم کس لیے کی تھی۔شاید اپنی تعریف کے صلے میں یا پھر قربانی کے بکرے کی طرح مرنے سے پہلے تھوڑا آرام پہنچانے کی غرض سے۔

”یہ کیا۔“دروازہ باہر سے بند ہوتے ہی شیتل برس پڑی۔”میں نے سوچا شاید تم صلح صفائی کوشش کروگے اور معذرت وغیرہ کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کروگے تم الٹا مقابلے کے لیے راہ ہموار کرآئے ہو۔“

”یہ تمھاری بھول ہے شیتل۔“میں سنجیدہ لہجے میں بولا۔”میں گنڈہ پور ہوں اگر شیش ناگ آج دوپہر مجھے صرف چیلنج کر کے واپس آجاتا تو خدا کی قسم میں اس کے ساتھ مقابلے کے لیے اس کے منتخب کردہ مقام پر ضرور پہنچتا۔الا یہ کہ کوئی حادثہ میری راہ میں رکاوٹ بن جاتا کیونکہ ہم گنڈہ پور دوستی اور رشتہ داری تو بھول سکتے ہیں دشمنی نہیں بھلا سکتے۔“

''جان تجھے کچھ ہوگیا تو میرا کیا بنے گا۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''تم پاگل ہو...... میں زندہ رہوں یا مرجاؤں ہر دو صورت میں نے تم سے جدا ہونا ہے۔''

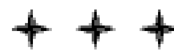
''بھول ہے تمھاری۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''تم زندہ رہو یا...... نہ رہو ہر دو صورت میرے ساتھ رہو گے۔''

''مر کر کیسے؟'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہندو عورت اپنے مرد کے ساتھ ستی ہو جایا کرتی ہے۔''

''میں تمھارا مرد کب سے ہوگیا؟''

''اس کے لیے مجھے تمھاری اجازت کی ضرورت نہیں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ہم رات گئے تک گپ شپ کرتے رہے اور اس کے بعد لائیٹ بجھا کر سونے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ ہلکے نیلے رنگ کی روشنی میں خواب گاہ کا ماحول بڑا رومان پرور ہو گیا تھا۔ میں شیتل سے مخالف سمت میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔



صبح ناشتا لانے والوں کی زبانی مجھے سیٹھ کا پیغام ملا کہ مقابلہ رات کو دس بجے شروع ہونا ہے۔ رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے دن میں نے سونے میں گزارا، اس دوران شیتل بالکل مشرقی بیوی کے انداز میں میری ٹانگیں دابتی رہی۔ میرے کئی دفعہ منع کرنے کے باوجود جب وہ باز نہ آئی تو میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہندو ناری کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اپنے پتی کو دیوتا کی طرح مانتی ہے بالکل مسلمان عورتوں کی طرح کہ جیسے ان کا خاوند ان کا مجازی خدا ہوتا ہے۔

سونے جاگنے کی کیفیت میں میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ لڑائی کا رنگ میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا، ٹریننگ سنٹر میں ٹریننگ کے بعد میں نے اور میرے دوست امجد نے باکسنگ میں کافی وقت گزارا تھا اور اس کے بعد کمانڈو سروس میں مختلف مقابلوں کے دوران میرا اس رنگ سے واسطہ رہا تھا البتہ اتنا فرق بہر حال اس لڑائی میں ضرور تھا کہ وہ ہار جیت کی جنگ ہوتی تھی اور یہ زندگی اور موت کا معرکہ تھا، لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میرے اندر گنڈہ پوری خون دوڑ رہا تھا اور گنڈہ پوروں کے لیے زندگی اور موت کی جنگ بھی روزمرہ کے کاموں کی طرح ایک عام کام ہے۔

میری ذہنی رَو بہتے بہتے مجھے سنٹر میں ہونے والی باکسنگ کے فائنل مقابلے کی طرف لے گئی۔

''شاباش جانو۔'' امجد کی جوشیلی آواز برسوں بعد بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ ''یہ آخری راؤنڈ ہے۔ پہلے والے دونوں راؤنڈز پوائنٹوں کے لحاظ سے تُو ہارا ہوا ہے۔ اس کے چہرے کو نشانہ نہ بناؤ، پیٹ میں مکہ وہ نہیں کھا رہا ہے۔ تُو کھبا ہے اور اس کو پتا ہے کہ کھبے با کسر کو پیٹ کا ٹارگٹ دینا اور ناک آؤٹ ہونا ایک برابر ہے۔ اس کی چن (ٹھوڑی) پر رائیٹ کاؤنٹر مارو...... آنکھیں کھلی رکھو، تیرے پاس پورے تین منٹ ہیں اور یہ فائیٹ کو انجام تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔''

راؤنڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجتے ہی امجد میرا بوسہ لے کر رِنگ سے نکل گیا۔ مخالف میری طرح ہی قد آور تھا۔ مقابلہ آخری چند سیکنڈوں تک بھی پہلے راؤنڈز کی طرح برقرار رہا لیکن آخری چند سیکنڈز میں مخالف کھلاڑی نے میری چن خالی دیکھ اپنا رائیٹ مکہ کاؤنٹر پنچ (دائروی مکہ) مارنے کے لیے گھمایا اور اس دوران وہ اپنے پیٹ کے دفاع سے ایک سیکنڈ کے لیے غافل ہو گیا تھا۔ میں نے تھوڑا سا جھک کر اس کا کاؤنٹر پنچ ہیڈ گارڈ پر سہارا اور اپنا بایاں مکہ بجلی کی سی سرعت سے اس کی پسلیوں کے نیچے پوری قوت سے دے مارا ''ڈھب'' کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے ایک تیز کراہ خارج ہوئی اور وہ رِنگ کے سنٹر میں لیٹ گیا۔ وہ ناک آؤٹ ہو گیا تھا کیونکہ دس تک گنتی ہونے کے بعد بھی وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔

''جیو جانو۔'' مجھے اپنے یار کا پُر جوش نعرہ سنائی دیا۔ آج میں شدت سے اس یار کی کمی محسوس کر رہا تھا۔

''امجد ابھی تک اس پوسٹ پر موجود ہوگا۔'' میرے ذہن میں ایک امکانی سوچ ابھری جب تک راستے نہ کھل جاتے اس کا چھٹی جانا مشکل تھا اور وہاں راستے کہیں فروری کے اخیر میں کھلتے تھے۔

امجد کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے گھر والوں کا سہارا لیا۔ سعدیہ اور عدنان مجھے بہت شدت سے یاد آ رہے تھے۔

''جلدی واپس آنا۔'' میرے کانوں میں سعدیہ کی شیریں آواز گونجی۔ ''اگر چھٹی نہ ملے تو نائیٹ پاس لے کر آ جانا۔''

''ابو کدل دا (کدھر جا) رہا ہے امی۔'' عدنان کی توتلی آواز میری سماعتوں میں آج بھی زندہ تھی۔

''کہیں نہیں بیٹا۔'' وہ اسے اٹھا کر چھاتی سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''بس نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔'' مجھے محسوس ہوا کہ میری پلکیں بھیگنے لگی ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا اور شیتل سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''ٹائم کیا ہوا ہے شیتل۔''

''پانچ بجنے والے ہیں۔'' وہ اپنی آنکھوں میں گہری سرخی لیے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ یہ سرخی اس بات کی غماز تھی کہ وہ کل رات سے مسلسل جاگ رہی تھی۔

''پریشان کیوں ہو؟۔'' میں نے پوچھا۔ ''اور اپنی آنکھوں کو دیکھو تھوڑی نیند ہی کر لیتیں۔''

''جان...... تم شیش ناگ سے صلح نہیں کر سکتے...... معذرت کرنے سے تیری شان میں کون سی کمی آ جائے گی۔'' میری بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے اپنی راگنی الاپی۔

''مس شیتل۔ اس سے بہتر ہے میں خودکشی کر لوں...... تم عورتیں ہمیشہ بزدلی سکھاتی ہو اس لیے ہمارے گنڈہ پوروں میں لڑائی جھگڑے کے بارے عورتوں سے بالکل مشورہ نہیں لیا جاتا۔'' یہ کہہ کر میں اس کا جواب سنے بغیر باتھ روم کی سمت بڑھ گیا۔ اچھی طرح نیم گرم پانی سے نہا کر میں نے سارے دن کی کسلمندی کو دور کیا۔ جب کمرے میں داخل ہوا تو شیتل مجھے گھٹنوں میں سر دیئے گہری سوچ میں غرق نظر آئی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیوں پھیرتا ہوا بولا۔

''پگلی! موت کا ایک دن معین ہے۔ تیری گہری سوچیں اسے ٹال نہیں سکتیں۔ جو رات قبر میں آنی ہے وہ آ کر رہے گی۔ پھر یوں

پریشان ہونے کا فائدہ۔''

''تو کیا کروں خوشی سے ناچنا شروع کر دوں۔ رونا یا ہنسنا انسان کے اپنے بس میں تو نہیں ہوتا نا؟'' میں نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا سر اٹھایا۔ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھیں ایک لمحے کے لیے پانی سے لبریز نظر آئیں اور پھر چھلک پڑیں اور وہ مقناطیس کی طرح میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کا سر ہلاتے ہوئے میں نے ہولے سے کہا۔

''چندا! کیا اپنے جانو کو تو نے اتنا موم کا پتلا سمجھ رکھا ہے کہ شیش ناگ اس پر آسانی سے قابو پالے گا۔ تم بس میرے لیے دعا کرتی رہنا۔ باقی دیکھتی جاؤ کہ کیا ہوتا ہے۔''

''جان! اگر تیرے بجائے میں شیش ناگ سے بات کر لوں۔'' اس کی سوئی اس صلح پر اٹکی ہوئی تھی۔

''اگر دوبارہ اس طرح کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔

''وہ تو اب بھی کوئی نہیں ہے۔''

''آخر ہو کیا گیا ہے تمھیں۔'' میں چڑ کر بولا۔

''مجھ سے تیری جدائی برداشت نہیں ہوگی...... نہیں ہوگی۔'' اس کے آنسو میری قمیص بھگونے لگے۔ اس کو دلاسہ دینے کی بجائے میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا نہ تو وہ میری کوئی بات سن رہی تھی اور نہ ہی کچھ سمجھنے کے لیے تیار تھی۔ وہ میرے لیے اتنے مسائل پیدا کرے گی اگر میں اس بات سے واقف ہوتا تو بمبئی پہنچنے کے بعد چوری چھپے اس سے رخصت ہو گیا ہوتا۔

تھوڑی دیر آنسو بہانے کے بعد وہ خاموشی سے مجھ سے علیحدہ ہوئی اور باتھ روم کے جانب بڑھ گئی اور تھوڑی دیر بعد شاور لے کر واپس آ گئی۔

''کھانے کا کہوں......'' وہ نارمل لہجے میں بولی۔

''ہاں اپنے لیے کہہ دو...... میں صرف چائے پینا پسند کروں گا۔''

''مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔'' کہہ کر اس نے انٹر کام اٹھایا اور چائے کا بتانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی چائے آ گئی اس کے ساتھ ہلکے پھلکے کھانے کے لوازمات بھی تھے۔

''تم ساتھ چلنا پسند کروں گی؟'' چائے پی کر میں اس سے مستفسر ہوا۔ اس نے کچھ بولے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟''

''میری مرضی۔'' وہ چند لمحے سوچ کر بولی۔

''تمھیں چلنا پڑے گا...... تمھاری موجودی سے مجھے تقویت ملے گی۔ تیرے علاوہ یہاں کون ہے میرا؟''

''کاش پوری دنیا میں میرے علاوہ تیرا کوئی نہ ہوتا۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں مجھے بد دعا دی۔

''کبھی اچھے الفاظ منہ سے نہیں نکالنے۔'' میں تپ کر بولا۔

''اچھائی برائی کی تمیز میرے پاس نہیں رہی۔'' وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولی۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔'' میں اس موضوع سے جان چھڑاتے ہوئے بولا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ ڈھٹائی سے ہانکتے رہے گی۔

''میری فائیٹ دیکھنے چلو گی یا نہیں؟''

''اگر تیری یہی اِچھا ہے تو ضرور چلوں گی۔''

''شیتل تجھے اپنے پتا جی کی یاد نہیں آتی؟'' میں اس کا ذہن بٹانے کی غرض سے بولا۔ کیونکہ اس پر قنوطیت طاری تھی اور اس کی وجہ سے میرا موڈ بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔

''کیوں نہیں آتی۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''اس کے علاوہ میرا دنیا میں ہے کون؟''

''اور وہ سہیلی جس سے ملنے کے لیے جاتے وقت میں نے تجھے اغوا کیا تھا۔'' میں آہستہ آہستہ اسے اپنے ڈھب پر لاتے ہوئے بولا۔

''ہاں......رانی......وہ تو میری بہت پیاری سہیلی ہے۔'' جلد ہی وہ اپنے قنوطی پن کو بھلا کر اپنی سہیلی رانی اور دوسری سہیلیوں کے واقعات بڑے جوش و خروش سے سنا رہی تھی۔ اس طرح کی گپ شپ میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اچانک دروازہ کھلا اور کلاشنکوفوں سے مسلح پانچ چھ افراد اندر داخل ہوئے۔

''چلیں مسٹر نو بجنے والے ہیں اور دس بجے مقابلہ شروع ہوگا۔'' ان کا سرغنہ سپاٹ لہجے میں مخاطب ہوا۔

''ہاں چلو۔'' میں اطمینان سے اٹھتا ہوا بولا۔ شیتل کے منہ پر چھائی رونق بے رونقی میں بدل گئی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا جس کا مطلب تھا کہ وہ ہر مصیبت میں میرے ساتھ تھی۔ اس کے انداز سے مجھے بہت زیادہ تقویت پہنچی ہم ان کی نگرانی میں چلتے ہوئے گیراج میں پہنچے وہاں ایک ویگن نما گاڑی کھڑی تھی وہ ہمیں لے کر اس گاڑی کے پچھلے حصے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ دروازے کا آٹو میٹک تالا خود بخود لاک ہو گیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ گاڑی کا پچھلا حصہ چاروں طرف سے مکمل بند تھا اور وہاں سے باہر کا نظارہ کرنا ناممکن تھا۔ آدھے گھنٹے کا راستا بالکل خاموشی سے طے ہوا۔ شیتل میرے دائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر آہستہ آہستہ سہلاتی رہی جیسے میری ڈھارس بندھا رہی ہو حالانکہ اس کا اپنا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ گاڑی جیسے ہی رکی باہر سے دروازہ کھولا گیا ہم باہر نکلے تو ایک بڑا سا گیراج نظر آیا جس میں چند قیمتی کاریں بھی کھڑی تھیں۔ باہر نکلتے ہی میری نظر سب سے پہلے جگو دادا پر پڑی اس کے ساتھ اس سے ملتی جلتی ایک دوسری شخصیت بھی موجود تھی وہ بھی لازماً کوئی دادا وغیرہ تھا۔ جگو دادا مجھ سے شناسائی ظاہر کیے بغیر پُرتپاک انداز میں ملا۔ اس کے ساتھ کھڑے دوسرے فرد کے انداز میں بھی مجھے گرم جوشی نظر آئی۔

''آپ لوگ اب فارغ ہو۔'' جگو دادا میرا ہاتھ تھام کر گیراج کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے لانے والے مسلح افراد کے لیڈر سے بولا اور وہ سر ہلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دروازہ کھولتے ہی مجھے دروازے سے متصل سیڑھیاں نیچے اترتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ اتنی چوڑی سیڑھیاں تھیں کہ میں اور جگو دادا آسانی سے شانہ بشانہ چلتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ ہمارے پیچھے شیتل اور جگو دادا کے ساتھ موجود دوسرا فرد خاموشی سے چلا آ رہا تھا۔

سیڑھیاں ختم ہوتے ہی ایک چوڑی راہداری آ گئی جس کے دونوں جانب کمرے بنے نظر آ رہے تھے۔ جگو دادا مجھے لے کر انھی میں سے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک درمیانہ سا کمرہ تھا جو ڈریسنگ روم کے ساتھ ساتھ دفتر کے کام بھی آتا تھا۔

''بیٹھیں۔'' جگو دادا کمرے میں موجود صوفہ سیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا اور ہم دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔

''عمر جان صاحب۔'' جگو دادا نے تمہید باندھی۔ ''میرا نام جگن ناتھ ہے اور یہ میرا بزنس پارٹنر سیٹھ پریم چند ہے۔ آپ کی دلچسپ شخصیت سے ہم کافی حد تک واقف ہیں کیونکہ اخبارات میں آپ کے متعلق کافی کچھ چھپ چکا ہے تو سب سے پہلے میں آپ کو اپنے دفتر میں خوش آمدید کہتے ہوئے کچھ ٹھنڈے یا گرم کا پوچھوں گا۔''

''نہیں شکریہ......ہم کھا پی کر آ رہے ہیں۔''

''اوکے۔'' اس نے اصرار نہیں کیا اور بولا۔ ''ابھی میں آپ کو اس لڑائی کے اصول و ضوابط اور دوسری تفصیلات مختصراً بتلاتا ہوں۔ مجھے آپ اپنا بکنگ منیجر یا سیکرٹری سمجھیں کیونکہ اس سٹیڈیم میں ہونے والے ٹورنامنٹ کے اندر شرکت کرنے والے ہر لڑاکے کا سیکرٹری یا بکنگ منیجر ضرور ہوتا ہے۔ یہ مقابلے سراسر غیر قانونی ہوتے ہیں اور حکومت کی لاعلمی میں لڑے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ فائیٹنگ ہال میں سرکاری ملازمین کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ لڑنے والے مختلف لڑاکوں کے ہارنے جیتنے پر بڑی تعداد میں شرائط لگتی ہیں۔ ان شرائط کے لیے ریس کورس کی طرح انتظامیہ کی طرف سے بھی ٹکٹ ملتے ہیں اور مختلف افراد آپس میں بھی یہ شرط بدتے رہتے ہیں۔ ہر فائیٹ کا صرف ایک ہی راؤنڈ ہوتا ہے جس کے لیے ٹائم کی کوئی حد مقرر نہیں۔ کسی بھی کھلاڑی کے بیہوش ہونے۔ مر جانے یا لڑائی سے دستبرداری کے اعلان کے ساتھ فائیٹ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ہر کھلاڑی خالی ہاتھ لڑتے ہوئے اپنے تمام فنون بروئے کار لا سکتا ہے آپ اس کو مختصراً فری سٹائل کہہ سکتے ہیں۔ البتہ کسی بھی قسم کا ہتھیار لڑائی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ہر فائیٹ کے اختتام پر جیتنے والے کھلاڑی کو ایک مناسب رقم انعام میں ملتی ہے۔ ٹورنامنٹ جیتنے والے خوش نصیب کو ایک بہت بڑی رقم اور کنگ فائیٹر کا تاج پہنایا جاتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔ ''آپ کے اور شیش ناگ کے درمیان ہونے والی فائیٹ کنگ فائیٹر کے انتخاب سے متعلق نہیں ہے کیونکہ شیش ناگ ایک دفعہ یہ ٹائیٹل جیت چکا ہے اور اصول کے مطابق وہ دوبارہ ان مقابلوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اسی طرح آپ کو بھی ان مقابلوں سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ آپ دونوں کی لڑائی سے اس سال ہونے والے مقابلوں کا افتتاح کیا جا رہا ہے اور ایسا صرف سیٹھ رابندر ناتھ کے حکم سے نہیں ہوا بلکہ زیر زمین تمام حلقوں کی تائید اسے حاصل ہے۔ بہت سارے وہ لوگ جن کے لیے آپ ایک افسانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اس لڑائی کو دیکھنے کے لیے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور تو اور ''را'' کے چند بڑے افسروں نے بھی اس لڑائی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور اب تماش بینوں کی طرح ہال میں موجود ہیں۔ یہ اطلاع بھی آپ کے لیے

دلچسپی یا فخر کا باعث ہوگی کہ تم دونوں پر لگنے والی شرائط کا تناسب ففٹی ففٹی ہے۔ گویا تمھاری منفی شہرت کے باوجود انڈیا میں تمھارے چاہنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ تو تھیں وہ اہم اور ضروری باتیں جن کے بارے آپ کو واقفیت دلانا ضروری تھا۔ اب اگر آپ کے ذہن میں کسی قسم کا سوال ہو تو آپ پوچھ سکتے ہیں؟‘‘

’’نو تھینکس۔‘‘ میں مختصراً بولا۔

’’اگر کوئی سوال نہیں تو آپ ڈریس تبدیل کر لیں کیونکہ پونے دس ہو چکے ہیں اور دس بجے آپ کو ہال میں ہونا چاہیے۔‘‘ جگو دادا نے دفتر کے اندر موجود ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ’’وہ ڈریسنگ روم ہے آپ اپنی پسند کا لباس زیب تن کر سکتے ہیں البتہ پاؤں میں کوئی چیز نہیں ڈالنی۔‘‘ اور میں سر ہلاتا ہوا ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مختلف قسم کے لباس ہینگرز میں دیواروں کے ساتھ لٹکائے گئے تھے۔ کسی بھی گیم کے لیے لباس کے انتخاب کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور اس طرح کی جسمانی لڑائی کے لیے ہمیشہ ایسے لباس کی ضرورت پڑتی ہے جس میں لڑنے والا اپنے ہاتھ پاؤں کو آسانی کے ساتھ حرکت دے سکے۔ ہمارے انسٹرکٹر صوبیدار مراد صاحب لباس کے انتخاب پر بہت زور دیتے تھے۔

میں نے اپنے لیے ایک کالے رنگ کا ہلکا پھلکا چست پاجامہ اور اسی رنگ کی بغیر بازوؤں والی بنیان کا انتخاب کیا۔ میں بمشکل ہی پاجامہ پہن سکا تھا کہ شیتل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

’’بندے کو ایسی جگہ پر جاتے ہوئے دستک لازماً دینی چاہیے۔‘‘

’’ہاں......لیکن اس وقت جب اندر کوئی غیر ہو۔‘‘ وہ بے پرواہی سے بولی۔

’’اچھا اب تشریف آوری کا مقصد بھی بتا دو۔‘‘ میں بنیان پہنتا ہوا بولا۔ مجھے پتا تھا کہ اس سے بحث کرنا دیوار سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔

’’جان۔‘‘ وہ میرے بازو کو پکڑتے ہوئے پُر جوش انداز میں بولی۔ ’’وہ جگن ناتھ بتا رہا ہے کہ کوئی بھی فریق جب لڑائی سے دستبرداری کا اعلان کرے تو انتظامیہ مقابلے کو فوراً ختم کر دیتی ہے۔ تم بھی تھوڑی دیر لڑ کر دستبردار ہو جانا۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں یونہی کروں گا۔‘‘ میں اس سے فوراً متفق گیا۔ ’’کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اس کو سمجھانے کی کوشش بے سود تھی۔ ’’اور اب چلو ٹائم کم ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں اسے ساتھ لیے ڈریسنگ روم سے نکل آیا۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’عمر جان صاحب چلیں۔‘‘ جگو دادا میری باڈی کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا۔ مستفسر ہوا

’’بالکل، میں تیار ہوں۔‘‘ میں اطمینان سے بولا۔

’’سیٹھ صاحب آپ بے بی کو دوسرے راستے سے لے جا کر اس کی نشست پر بٹھا دیں میں عمر جان کے ساتھ جا رہا ہوں۔‘‘

’’میری بات یاد رکھنا جان۔‘‘ شیتل اس کے ساتھ جاتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی اور میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس پگلی کو

اتنی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ مقابلے سے دستبرداری کا اعلان کرنے کا مطلب تھا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دینا۔

ان کے باہر نکلتے ہی جگو دادا۔ ”ایک سکینڈ میں آیا۔“ کہہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا اور پھر وہاں سے ایک ریشمی گاؤن جو کہ گہرے نیلے کلر میں تھا لا کر مجھے اوڑھا دیا اور بولا۔ ”اب چلو۔“ میں دل ہی دل میں اپنے رب کو یاد کرتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا۔ کمرے سے نکل کر ہم راہداری میں پہنچے تھوڑا سا آگے جا کر راہداری بائیں جانب کو مڑ گئی۔ سامنے ہی لکڑی کا ایک مضبوط منقش دروازہ لگا ہوا نظر آیا۔ جس کے باہر دو باوردی دربان کھڑے ہوئے تھے ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے سیڑھیاں اوپر جاتی نظر آئیں سیڑھیوں کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا جس کو کھولتے ہی میری سماعتوں میں تیز شور کی آواز گونجی اور ایک بہت بڑا وسیع وعریض ہال جس کے درمیان میں ایک باکسنگ کے رنگ کی طرح کا سٹیج بنا ہوا تھا۔ میری نظروں کے سامنے آگیا۔ ہال کے اندر بہت زیادہ تیز روشنی کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی کسی منچلے کی آواز گونجی۔ ”وہ آیا کمانڈو۔“ اس کے ساتھ ہی پورا ہال سیٹیوں اور مختلف قسم کے نعروں سے گونج اٹھا۔ تمام لوگوں کی نگاہیں یوں بھی داخلی دروازے کی سمت گڑی ہوئی تھیں اس لیے میں اندر داخل ہوتے ہی انھیں نظر آ گیا تھا میں لوگوں کے نعروں اور سیٹیوں کی پرواہ کیے بغیر اطمینان سے چلتا ہوا رنگ تک پہنچا۔ وہ عام باکسنگ رنگ کے مقابلے میں چوڑائی اور لمبائی میں وسیع تھا۔

مجھے ہال کے دائیں کونے سے ”خونی......خونی“ کی آوازیں کورس کی صورت میں سنائی دینے لگیں۔ اس کے برعکس بائیں طرف سے ”کمانڈو کی جے“ کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔

میں نے تمام آوازوں کو نظر انداز کر کے ہال میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی جلد ہی مجھے رنگ سے نزدیک پڑی ہوئی خصوصی نشستوں پر شیتل بیٹھی نظر آ گئی وہ زیرلب کچھ پڑھ رہی تھی اور وہ بے شک وشبہ میری سلامتی کی دعائیں تھیں۔ شیش ناگ پر مجھے اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہوگئی تھی کہ ایک پُرخلوص ہستی کی دعائیں مجھے میسر تھیں اس کے برعکس شیش ناگ کے لیے صرف اس پر پیسے لگانے والے ہی جیتنے کی دعا مانگ سکتے تھے اور خوش قسمتی سے ہم دونوں کے اوپر شرط لگانے والوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ یوں بھی شرط لگانے والوں کی دعائیں صرف اپنی رقم کی سلامتی کے لیے ہوتی ہیں۔

سیٹھ رابندر اور اس کی بیٹی بھی مجھے شیتل سے قریب بیٹھے نظر آئے۔ ہال کے اندر لگے ہوئے ایک جہازی سائز گھڑیال پر مجھے نوبج کر اٹھاون منٹ کا ٹائم چمکتا نظر آیا۔ اسی وقت داخلی دروازے سے شیش ناگ سرخ رنگ کے پاجامے اور اسی رنگ کی بنیان میں نمودار ہوتا دکھائی دیا۔

”شیش ناگ......شیش ناگ......“ کے نعرے ایک کورس کی صورت میں بلند ہوئے اور وہ فخریہ انداز میں ہاتھ ہلاتے رنگ کے اندر آ موجود ہوا۔ اس کے بدن میں مجھے برقی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت، تمسخر اور غیض وغضب کے شعلے نکل رہے تھے۔

میں نے اپنے تاثرات نارمل رکھے تھے، اس وقت میرا انسٹرکٹر صوبیدار مراد صاحب رنگ میں میرے ساتھ آ گیا تھا۔ اس کی

مشفق آواز میری سماعتوں میں گونجی۔

''ماحول کا اثر کبھی بھی قبول نہ کرنا۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں اعتماد ایک ایسی طاقت ہے جس کی مدد سے تم حالات سے ٹکر لینے کے قابل ہو سکو گے۔ یاد رکھنا لڑائی کی ٹریننگ حاصل کرنا اور داؤ پیچ سیکھنا نہایت آسان ہے...... یہاں تک کہ لڑکیاں بھی اس میں مہارت حاصل کر لیتی ہیں، لیکن زندگی کے عملی میدان میں ان کو بروئے کار لانا...... کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ بہت سارے اچھے فائیٹر عام لڑاکوں سے مار کھا جاتے ہیں اور اس کی وجہ...... صرف اور صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے نفسیاتی طور پر ہارے ہوتے ہیں۔ میری بات کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اپنے مقابل کو کمزور سمجھو، بلکہ...... اسے اچھا سمجھتے ہوئے شکست سے دوچار کرو اپنا سٹمنا برقرار رکھو۔ فضول اچھل کود اور شومنٹ (دکھاوا) سے پرہیز کرو۔ اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھو اور فریق مخالف کو غصہ دلانے کی کوشش کرو۔ وہ غیض و غضب میں مبتلا ہو کر ہی وہ بنیادی غلطی یا غلطیاں کرے گا جو تمھیں جیتنے کے مواقع فراہم کریں گی۔''

دس بجتے ہی ہال کے اندر کمپیئر کی آواز گونجی اور سارے ہال میں یکلخت خاموشی چھا گئی۔

''ناظرین...... جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس دفعہ کنگ فائیٹر کے چناؤ کے مقابلوں کے لیے عام روٹین سے ہٹ کر ایک افتتاحی فائیٹ رکھی گئی ہے۔ جس میں حصہ لینے والے دونوں فریقین سے ایک کا تعلق ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کی کمانڈو فورس سے ہے۔ موصوف پچھلے کئی دن سے بھارتی ایجنسیوں اور پولیس وغیرہ کے لیے دردسر بنے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی سرکاری اہلکاران کے ہاتھوں زخمی یا ہلاک ہو چکے ہیں۔ بھارتی سرکار کی طرف سے اس کے بارے اطلاع دینے والے کو ایک لاکھ انعام دینے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس شیر کو رنگ میں لانے کا سہرا ممبئی کے بے تاج بادشاہ جناب سیٹھ رابندر ناتھ کے سر ہے۔ میرے بائیں جانب کے کونے میں بلیو گاؤن پہنے ہوئے آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں جناب عمر جان کمانڈوووو۔'' نعروں اور سیٹیوں کے شور میں کمپیئر کی آواز ایک مرتبہ پھر گونجی۔ ''اور میرے دائیں کارنر میں آپ جانی پہچانی شخصیت جو تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کا ہر دلعزیز فائیٹر شیش ناگ......'' ایک مرتبہ پھر سیٹیوں، نعروں اور تالیوں کا طوفان برپا ہو گیا۔

کمپیئر کی بات ختم ہوتے ہی سفید شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس ایک ریفری رنگ کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اس نے فائل میری طرف بڑھائی تو مجھے اس میں دو فارم پڑے نظر آئے جن کو اعتراف نامہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان میں انگریزی زبان میں لکھا ہوا تھا کہ لڑائی کے اندر ہونے والے ہر قسم کے نقصان کا ذمہ دار خود فائیٹر تھا۔ اس طرح یہ لڑائی غیر قانونی ہوتے ہوئے بھی کچھ قانونی سی بن گئی تھی۔ میں نے نام کے لیے چھوڑی گئی خالی جگہ میں اپنا نام لکھا اور دستخط کر کے وہ فائل ریفری کو پکڑا دی۔ شیش ناگ سے بھی سائن لے کر ریفری نے وہ فائل رنگ سے باہر ایک متعلقہ شخص کو تھمائی اور لباس چیک کرنے کے لیے میری جانب بڑھا۔ میں نے گاؤن اتار کر رنگ کے نیچے کھڑے جگو دادا کے جانب پھینکا۔ ریفری نے میری سرسری تلاشی کہ کہیں میں نے کوئی ہتھیار نہ چھپایا ہو بعد میں یہی کارروائی کی اس نے شیش ناگ کے ساتھ بھی کی اور جج کو اوکے کا سگنل دے کر اس نے ہم دونوں کو رنگ کے سنٹر میں بلایا اور ایک

دوسری باتیں کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹا، ویسے بھی ایسے مقابلوں میں ریفری کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے اس کے پیچھے ہٹتے ہی جج نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا اور "ٹن" کی آواز کے ساتھ ہی وہ جاں گسل اور اعصاب شکن انتظار اختتام کو پہنچا۔ میں اور شیش ناگ دو ازلی دشمنوں کی طرح آمنے سامنے تھے۔ شیش ناگ کے ہونٹوں پر حقارت سے پُرتمسخرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے اور اس کے بعد جیسے بجلی کوندتی ہے اس طرح شیش ناگ کی دائیں کک میرے چہرے کے جانب بڑھی۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنا دفاع کیا، لیکن کک کے خطا جانے سے شیش ناگ کی موومنٹ میں کوئی فرق نہ آیا اور دائیں ٹانگ زمین پر لگتے ہی وہ پھرکی طرح اسی ٹانگ پر گھوما اور اس کی بائیں پاؤں کی ایڑی پوری قوت سے میری چھاتی کی جانب بڑھی۔ میں نے دونوں کلائیوں کا کراس بنا کر اس کا یہ وار بھی ناکام بنایا مگر اس کے ساتھ ہی اس کی دائیں کک میرے پیٹ میں لگی اور میں اچھل کر رسوں پر جا گرا۔ اس کے حملوں میں بہت شدت اور تیزی تھی۔ میرے پیٹ میں اینٹھن شروع ہوگئی تھی۔

رسوں نے مجھے واپس رنگ کی طرف اچھالا مگر میں نے بائیں ہاتھ سے ایک رسے کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسی وجہ سے شیش ناگ کی اگلی کک سے بچ گیا جو اس نے اپنے اندازے سے میرے رسوں سے ٹکرا کر واپس گرنے کی جگہ گھمائی تھی۔

اس نے پوری قوت سے ٹانگ گھمائی تھی اور ٹارگٹ کے اپنی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا سا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میری بائیں کک ہتھوڑے کی طرح اس کی چھاتی سے ٹکرائی اور وہ اچھل کر رنگ کے سنٹر میں جا گرا۔ مگر اس نے اٹھنے میں دیر نہ لگائی اور سپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کوبرے نے بھی شروع میں تیری طرح بہت اچھل کود کی تھی۔" میں اسے غصہ دلانے کی غرض سے بولا مگر اس کے تاثرات میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا۔ اس نے میرے گرد ایک دائرے میں گھوم کر چکر لگایا اور پھر اچانک ہی میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس کا دایاں گھٹنا خطرناک انداز میں میری چھاتی کی جانب بڑھا میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے گھٹنے کو تھام کر اس کے وار کو سہارا اور اگلے ہی لمحے میرا لیفٹ پنچ پوری قوت سے اس کے چہرے سے ٹکرایا جس نے اسے خون تھوکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اچانک ہی اچھلنے کا تاثر دے کر اسے نیچے جھکنے پر مجبور کیا اور اس سے پہلے کہ وہ میری چال سمجھتا میری کک ٹھیک اسی جگہ پر لگی جس جگہ میں نے پنچ مارا تھا۔ اس مرتبہ وہ کولہوں کے بل پر نیچے جا گرا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے میں اس پر ٹھوکروں کی بارش برسا چکا تھا۔ لڑائی کے بنیادی اصول "مضروب مقام کو نشانہ بناؤ" کے مطابق میری کوشش تھی کہ اس کے چہرے کو نشانہ بناؤں۔ ایک دو ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ مچھلی کی طرح تڑپتا ہوا میری ٹھوکروں کی زد سے نکلا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کوبرے کا بھی میری ٹھوکروں سے بچنے کا بالکل یہی انداز تھا۔" میں اسے غصہ دلایا اور اس مرتبہ میں اس کے چہرے پر غیض و غضب کے تاثرات دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اچانک میری جانب دوڑا میں نے سوچا شاید غصے کی شدت میں وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے اور ابھی مجھ سے گتھم گتھا ہونا چاہتا ہے مگر مجھ سے دو قدم دور اس نے یکدم چھلانگ لگائی اور اس کے سر کی شدید ٹکر میری پسلیوں پر لگی۔

میں اچھل کر پشت کے بل نیچے جا گرا مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ مگر اس جگہ لیٹے رہنے کا مطلب اپنی موت تھا۔ میں جلدی سے کروٹیں بدل کر اس جگہ سے دور ہٹا، لیکن یہ میری بھول تھی کہ میں اس کی رینج سے باہر ہو گیا تھا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کی کک نے ایک مرتبہ پھر مجھے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ مجھے تین چار ٹھوکریں رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے مسلسل ٹھوکریں برساتے پاؤں کو پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ وہ دھڑام سے میرے اوپر گرا۔ مگر اگلے ہی لمحے میں نے اسے دونوں پاؤں پر رکھ کر رسوں کی جانب اچھال دیا۔ اس کے رسوں سے ٹکرا کر واپس آنے تک میں نے فرش سے اٹھ کر اس کی جانب چھلانگ لگا دی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا دفاع کر پاتا میرے سر کی ٹکر اس کی پسلیوں میں لگی اور وہ دوبارہ رسوں پر جا پڑا۔ مگر اس مرتبہ اپنے دونوں بازو رسوں میں اڑا کر اس نے اپنے آپ کو واپس آنے سے روکا۔ اس کے ہونٹوں پر موجود تمسخرانہ مسکراہٹ اور چہرے پر موجود حقارت کے تاثرات کی جگہ ایک ٹھوس سنجیدگی نے لے لی تھی۔

''اگر تم مخالف کھلاڑی کو اپنی اہمیت جتلانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو یہ تمھاری آدھی فتح ہے، اب وہ تم سے مرعوب ہو کر لڑے گا اور آزادی سے حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔'' میرے ذہن میں اپنے کوچ صوبیدار مراد کی آواز گونجی۔

شیش ناگ رسوں سے ہاتھ نکال پینترے بدلتا ہوا میری جانب بڑھا، مجھ سے دو قدم دور رک کر اس نے اچھل کر مجھ پر چھلانگ لگائی ادھر سے یہی حرکت مجھ سے بھی سرزد ہو چکی تھی۔ ہم دونوں ہوا میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور نیچے گرتے ہی وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر پل پڑے۔ دونوں کی کوشش تھی کہ مخالف کی اینٹ کے جواب میں پتھر پھینکے۔ لڑتے لڑتے ہم دونوں کا سانس چڑھ گیا تھا۔ جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا مگر ہم میں سے کوئی شکست ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہماری لڑائی برسوں سے جاری ہے۔ میری طرح شیش ناگ کا سٹیمنا بھی بلا کا تھا کہ مجھے اس کی حرکات میں سستی نظر نہیں آئی تھی۔ تماشائی شروع شروع میں ہم دونوں کو ہر اچھے وار پر داد دیتے رہے لیکن لڑائی میں جوں جوں شدت آتی گئی تماشائیوں میں بھی خاموشی چھاتی گئی۔

میری کوشش تھی کہ کسی طریقے سے شیش ناگ کی گردن میرے بائیں بازو کی گرفت میں آ جائے مگر شروع سے ہی شیش ناگ نے میری یہ کوشش ناکام بنائے رکھی تھی۔ ابھی اس بات سے میں ناواقف تھا کہ آیا وہ میرے اس داؤ سے واقف ہے یا نہیں۔ اسی طرح شروع ہی سے مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس کا سب سے خطرناک داؤ بائیں جانب کی پسلیوں کے نیچے اپنا گھٹنا رسید کرنا ہے۔ ایک دفعہ اس کا اچٹتا ہوا وار مجھے لگ بھی گیا تھا اور میں بمشکل خود کو بے ہوش ہونے سے بچا سکا تھا، لیکن اس کے بعد میں نے اسے اس قسم کا موقع نہیں دیا۔

لیکن کہتے ہیں نا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ شیش ناگ نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھمایا اور رسوں کی بجائے کونے میں لگے ہوئے ستون کی جانب دھکیل دیا میں پشت کے بل پوری قوت سے ستون سے ٹکرایا اور ایک لمحے کے لیے سن سا ہو گیا۔ شیش ناگ ہوا میں اچھلا اور اس کا دایاں گھٹنا خطرناک انداز میں میری پسلیوں کی جانب بڑھا۔ اگر وہ اپنے اس وار میں کامیاب ہو جاتا تو یہ فائیٹ جیت چکا تھا مگر میں نے اپنے کوچ مراد صاحب کی ہدایت کے مطابق کہ ''آخیر تک ہار نہ مانو...... حرکت میں برکت ہے...... تمھارا شدید تھکن اور

تکلیف کی حالت میں اپنے کسی عضو کو حرکت دینا تمھاری جان بچا جائے گا۔'' اس کے باوجود کہ میرا اس جگہ سے دائیں بائیں ہٹنا ناممکن تھا میں نے یکدم اپنی بائیں ٹانگ سیدھی کر دی شیش ناگ کا گھٹنا میرے پاؤں کے تلوے سے ٹکرایا اور میری پوری ٹانگ کے ساتھ میرا جسم بھی جھنجنا اٹھا۔شیش ناگ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کولہوں کے بل نیچے جا گرا۔موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں اپنی تکلیف کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھا۔شیش ناگ کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی وہ اچھل کر کھڑا ہوا چونکہ اس کے سیدھا ہو کر وار کرتے کرتے میں اسے چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا اس لیے نیچے سے اٹھتے ہی اس نے رکوع کے انداز میں جھکے جھکے ہی میرے پیٹ میں ٹکر مارنے کی کوشش کی اور یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول بن گئی، میں بجلی کی سی سرعت سے اپنے بائیں پاؤں کے پنجے پر اس طرح گھوما کہ میری پشت شیش ناگ کی طرف ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آگے کی طرف بڑھی گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں آگئی۔اس نے تڑپ کر سیدھا ہونا چاہا مگر اب اس کی پھرتیاں، تیزیاں اور طاقت کام آنے والی نہیں تھی وہ نادانستگی میں اپنی گردن موت کے پھندے میں پھنسا چکا تھا۔اس پھندے سے اسے موت یا میری مرضی چھڑا سکتی تھی۔میں نے اس کی گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور وہ یکدم ڈھیلا پڑ گیا۔مجھے پتا تھا کہ اب وہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے سے قاصر تھا۔میں نے ہال میں نگاہ دوڑائی ہزاروں کی تعداد میں بیٹھے تماشائیوں کی نظریں ہم پر لگی ہوئی تھیں۔ہال کے اندر اتنی گہری خاموشی چھا گئی تھی کہ مجھے اپنی سانسوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔میری نگاہوں کے سامنے شیتل کا چہرہ آیا۔ابھی تک اس کے ہونٹ مجھے ہلتے نظر آ رہے تھے۔شیتل سے پیچھے دو تین کرسیاں چھوڑ کر مجھے نیلم بیٹھی نظر آئی۔جو انڈین آرمی کی کیپٹن تھی اور اسی کی نوازش کی وجہ سے مجھے ان کی قید سے فرار ہونے کا موقع ملا تھا۔سب سے پھرتے ہوئے میری نظریں سیٹھ رابندر ناتھ پر آ کر رک گئیں۔اس کا چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں ایک باپ کی التجائیں رقص کرتی نظر آئیں کہ میرے بیٹے کی جان بخشی کر دو۔شیش ناگ بلاشبہ اس کالے پالک بیٹا تھا، لیکن وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا اس کا انداز مجھے اس کی آنکھوں میں اٹھتے ہوئے اضطراب سے ہو رہا تھا۔شیش ناگ کو مار کر رابندر ناتھ سے اچھی توقعات کی امید فضول تھی۔جبکہ اسے زندہ چھوڑ کر میں اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکتا تھا۔

میں نے اپنے بائیں بازو کو مخصوص جھٹکا دیا اور شیش ناگ بیہوش ہو کر میرے بازو میں جھول گیا میں نے اسے پلٹ کر پشت کے بل رنگ کے فرش پر پھینک دیا۔اس کے پیٹ کی اوپر نیچے کی حرکت سے اس کے زندہ ہونے کا پتا چل رہا تھا۔اس کے باپ کی خاموشی التجاؤں نے اسے مرنے سے بچا لیا تھا، لیکن نہیں میں کچھ غلط بول گیا ہوں میرے ربّ کے نزدیک ابھی تک اس کے زندگی کے دن باقی تھے اس لیے وہ بچ گیا تھا۔

ہال میں ابھی تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔شیش ناگ کے نیچے گرتے ہی ریفری نے گنتی شروع کر دی مگر دس تک پہنچتے تک بھی اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش نہ ہوئی۔یہ ریفری نے دس تک گنا تھا اگر وہ ہزار تک بھی گنتا تب بھی شیش ناگ کا اٹھنا محال تھا۔میرے اندازے کے مطابق اسے دو تین گھنٹوں کے بعد ہی ہوش آنا تھا۔یکلخت ہال کے اندر چھائی خاموشی کو میگا فون پر ابھرنے والی آواز نے توڑا۔

''اس سٹیڈیم کو چاروں طرف سے پولیس اور خفیہ ایجنسیوں نے گھیر لیا ہے براہِ مہربانی کوئی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہ

کرے۔ ہمارا کام صرف عمر جان کو حراست میں لینا ہے۔ باقی کسی سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور عمر جان سے بھی میری درخواست ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے بھارت سرکار اس مرتبہ اس کے کیس پر از سر نو غور کرے گی اور امید ہے کہ اس کی سزا میں تخفیف کرتے ہوئے اسے پاکستان سرکار کے حوالے کر دے۔'' میں اس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی گرفتاری دینے پر مجبور تھا۔

''شاید رابندر ناتھ میری رہائی کی کوشش کرے۔'' میرے ذہن میں ایک امکانی سوچ ابھری۔ ہال کی پچھلی نشستوں سے دو تین بندے مجھے رنگ کی طرف آتے دکھائی دیئے مگر ابھی تک وہ دور تھے کہ اچانک پورے سٹیڈیم میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرا لازماً مجھے فرار کرانے ہمیں مدد دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ مگر میں جاتا بھی تو کہاں جاتا۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ مجھے اپنے بازو پر ایک نرم و گرم ہاتھ کا لمس محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی سرگوشی سنائی دی۔

''خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔ میں رابندر ناتھ کی بیٹی ہوں اور اس کے حکم سے تجھے محفوظ مقام تک پہنچانے آئی ہوں۔'' وہ اگر اپنا تعارف نہ کراتی تب بھی میں نے اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ ہال میں یکدم بھگدڑ مچ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سرکاری اہلکاروں کے للکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر ہزاروں کی تعداد میں موجود تماشائیوں کو سنبھالنا ان چند بندوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اچانک سٹیڈیم سے باہر مشین گن کے فائر کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔

''اس کا مطلب ہے سٹیڈیم کو واقعی چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔'' ایک سوچ میرے اندر ابھری اس وقت تک وہ حسینہ مجھے اندھیرے میں رنگ سے باہر لے آئی تھی شاید وہ اس ہال کے چپے چپے سے واقف تھی اس لیے اندھیرے میں بھی میری رہنمائی کر رہی تھی۔

رنگ سے نیچے اترنے والی سیڑھیوں کے ساتھ مجھے بٹھا کر اس نے کوئی کارروائی کی اور اگلے ہی لمحے مجھے رنگ کے نیچے کھینچ لیا۔ وہاں پر گھپ اندھیرا تھا مگر وہ میری رہنمائی کرتی ہوئی ایک سوراخ کے پاس لائی جہاں سے تنگ سی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔

''نیچے اتر جاؤ۔'' وہ آہستہ سے بولی اور میں جلدی جلدی ان لوہے کی سیڑھیوں پر اترتا چلا گیا۔ وہ شاید سوراخ کا منہ بند کرنے رک گئی تھی۔ جیسے ہی میرے پاؤں زمین پر لگے اچانک وہاں پر روشنی ہو گئی۔ یقیناً راستا بند کرتے ہی اس نے لائیٹ بھی جلا دی تھی۔ ٹیوب لائیٹ کی سفید روشنی میں مجھے پتلی سی سرنگ نظر آئی۔ رابندر کی بیٹی جس کا نام مجھے بعد میں پریٹی معلوم ہوا، سیڑھیوں سے اترتے ہی مجھ سے آگے ہوتے ہوئے بولی، میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ سرنگ کی اونچائی بمشکل میرے قد کے برابر تھی اس لیے مجھے سر جھکا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ پریٹی نے حسب عادت اپنا پسندیدہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا جس سے اس کے بدن کے نشیب و فراز چھپنے کے بجائے اجاگر ہوتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اس طرح لہرا کر چل رہی تھی گویا وہ نشے میں ہو۔

''میری ساتھی کہاں ہے۔'' تحفظ کا احساس ہوتے ہی مجھے شیتل کی یاد آئی۔

''وہ ڈیڈی کے ساتھ آ جائیں گی ان کی فکر نہ کرو۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔

جلد ہی ہم ایک موڑ کے قریب پہنچے۔ وہاں سے سرنگ چوڑی ہو گئی تھی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

فرلانگ بھر چلنے کے بعد مجھے اوپر جاتی سیڑھیاں نظر آئیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں لکڑی کی ایک میز اور چند کرسیاں پڑیں تھیں۔ اس کمرے سے نکلتے ہی میں نے اپنے آپ کو ایک کوٹھی میں پایا۔ وہ چھوٹا سا کمرہ ملازمین کے لیے بنے ہوئے کوارٹر کے ساتھ تھا۔ کوٹھی کا چھوٹا سا لان عبور کر کے ہم اندر داخل ہوئے۔ ڈرائینگ روم میں مجھے دو ادھیڑ عمر کے مرد اور عورت نظر آئے جو شکل سے میاں بیوی دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے دونوں نے ہاتھ باندھ کر بیک زبان ''نمستے بی بی جی کہا۔''

''مہیش جی گاڑی نکالو ابھی یہاں سے چلنا ہے۔'' اور مہیش ''جی بی بی جی'' کہہ کر ڈرائینگ روم سے باہر کے جانب بڑھ گیا جبکہ اس کی بیوی ہم سے چائے پانی کا پوچھنے لگی۔

''نہیں پاربتی فی الحال ٹائم نہیں ہے۔'' اسے کہتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''چلو مسٹر جان'' اور میں سر ہلاتا اس کے پیچھے چل پڑا۔

مہیش گاڑی کے پچھلے دونوں دروازے کھولے ہمارے انتظار میں گیٹ کے سامنے کھڑا تھا ہمارے بیٹھتے ہی اس نے پریتی کی سائیڈ والا دروازہ ادب سے بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ چوکیدار نے پہلے سے ہی گیٹ کھول رکھا تھا۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ہم سیٹھ رابندر ناتھ کی کوٹھی میں تھے۔

''آپ اپنے کمرے میں پہنچیں میں چینج کر کے آتی ہوں۔ ڈیڈی تو شاید لیٹ پہنچیں اور آپ کی وہ...... بھی ان کے ساتھ ہی ہو گی۔'' پریتی معنی خیز لہجے میں بولی۔ اور میں اسے کوئی جواب دیئے بغیر اثبات میں سر ہلاتا ہوا انیکسی کی جانب بڑھ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سیدھا باتھ روم کی طرف بڑھا اور ہلکے گرم پانی کے فوارے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ پانی کے جسم پر پڑتے ہی جسم پر موجود خراشوں اور زخموں میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ اچھی طرح نہانے کے بعد میں نے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ پہنا اور اوپری لباس رہنے دیا کہ میرا ارادہ ہلکی پھلکی خراشوں اور زخموں پر کوئی ٹنکچر وغیرہ لگانے کا تھا۔

باتھ روم سے نکلتے ہی میری نگاہ پریتی پر پڑی جو نہایت مختصر لباس زیب تن کیے بیڈ پر براجمان تھی۔

''مس اگر بدن پر لگانے کے لیے کوئی ٹنکچر وغیرہ مل جاتا۔''

''میرا نام پریتی ہے۔'' وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''اور آپ کے کمرے میں میرے آنے کا مقصد بھی آپ کی مرہم پٹی کرنا ہے۔ وہ دیکھو میں فرسٹ ایڈ بکس ساتھ لائی ہوں۔'' اس نے میری توجہ میز پر پڑے سیاہ رنگ کے چھوٹے سے بکس کی طرف مبذول کی۔

''شکریہ مس پریتی۔'' میں میڈیکل بکس کی طرف بڑھا۔

''کیا کر رہے ہو۔'' مجھے بکس کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ''بیٹھو یہ خدمت مجھے سرانجام دینے دو۔''

''شکریہ مس پریتی! میں......''

''شکریہ وغیرہ کو اپنے پاس رکھو۔'' وہ میرے ہاتھ سے بکس پکڑ کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''تم آرام سے بیٹھو۔'' میں تکرار کیے بغیر بیٹھ گیا۔

''آپ تو بہت خطرناک لڑاکے ہیں۔'' وہ میرے زخموں پر روئی سے دوائی لگاتے ہوئے بولی۔ ''بھیا جیسے فائیٹر کو آپ نے بے بس کر دیا۔''

''بس داؤ چلنے کی بات ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا داؤ چل جاتا اور اس کی جگہ میں بے ہوش پڑا ہوتا۔''

''بڑا پن ہے کہ آپ اس طرح سمجھتے ہیں۔''

''سیٹھ صاحب کس وقت تک پہنچ جائیں گے۔'' میں نے موضوع بدلا۔

وہ مسکرائی۔ ''یوں کہو نا کہ شیتل کب آئے گی؟''

''یہی سمجھ لو۔''

وہ تپ کر بولی۔ ''کیوں؟...... میں کسی سے کم ہوں کیا؟''

''اس میں کمی بیشی کی کیا بات ہے۔'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔ ''وہ میری ساتھی ہے اس کا انتظار کرنا میری ضرورت ہے۔''

''بے وقوف ہیں آپ۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''روسٹ کی موجودگی میں دال کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے شیتل کو دال کہتے ہوئے خود کو روسٹ سے تشبیہہ دی تھی اور یہ اس کا نہیں ہر لڑکی کا کمپلیکس ہوتا ہے کہ وہ حسینۂ عالم ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ خوب صورت تھی، مگر شیتل کی موجودگی میں شاید ہی کوئی اسے دیکھنا گوارہ کرتا۔ میں نے اس کے ساتھ اس موضوع پر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اس کا بازاری انداز اس بات کا غماز تھا کہ شرم وحیا اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔ ویسے بھی وہ سیٹھ رابندر ناتھ کی لے پالک بیٹی تھی اور اس کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی مول لینا ''آ بیل مجھے مار'' والی بات ہوتی۔

میرا ذہن اس سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب میں سرگرداں ہوگیا۔ کیونکہ اس کے انداز ہی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے حسن کے جلوے دکھائے بغیر نہیں جائے گی۔ میں اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ اچانک گیٹ کی طرف سے ہارن کی آواز آئی۔

''اوہ......شاید ڈیڈی واپس آ گئے ہیں۔ مگر اتنی جلدی۔'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔ میں نے بھی دل ہی دل میں اس سے جان چھوٹنے پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

''کیوں ادھر کا کیا کام تھا ان کا؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''ادھر کئی کام ہیں۔ بھیا کو ہسپتال پہنچانا اور سٹیڈیم میں آپ کے فرار ہونے کے بعد کی افراتفری کا سدباب کرنا۔ اس طرح پولیس اور را وغیرہ کے سامنے اپنا دامن صاف رکھنا تاکہ وہ آپ کے فرار میں ڈیڈی کا ہاتھ نہ سمجھیں۔'' یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور شیتل تیر کی طرح اندر آئی، مگر پریتی کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ میں نے زیرِ لب شکر ادا کیا کہ اس کے اندر داخل

ہوتے وقت پریتی فرسٹ ایڈ باکس میں دوائیں واپس ڈال کر بکس بند کر رہی تھی۔

"اچھا میں چلتی ہوں مسٹر جان۔" پریتی نے بکس کو ٹیبل پر چھوڑا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔اس نے ایک سرسری نظر بھی شیتل پر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جو اسے کڑی نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔

"یہ ڈائن یہاں کیوں آئی تھی؟" اس کے نکلتے ہی شیتل نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا "اور یہ تم کس حالت میں بیٹھے ہو؟"

"اس کا گھر ہے بھئی۔" میں مسکرایا۔ "جہاں دل چاہے گا، جائے گی اور میں غلطی سے اپنے زخموں پر ٹنکچر لگوا رہا تھا جو قمیض پہن کر لگانا ممکن نہیں تھا۔"

"تھوڑی دیر صبر نہیں ہو سکتا تھا تم سے...... میں آ جاتی تو مرہم پٹی کر دیتی۔"

"تم کوئی ڈاکٹر ہو؟"

"نہیں ڈاکٹر تو خیر تم ہو۔" وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ "میں تو تمھاری مریض ہوں" اس کے انداز پر میں بے ساختہ مسکرا پڑا۔

"زخموں میں تکلیف تو ہو رہی ہو گی ہے نا؟" وہ بڑے پیار سے میرے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "ظالم نے مارا بھی تو بے دردی سے ہے۔" اس کے ہاتھوں کے لمس اور پریتی کے ہاتھوں کے لمس میں مجھے زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا۔شیتل کے ہاتھوں میں جیسے درد کش مرہم لگا ہوا تھا کہ میرے زخموں کی تکلیف جاتی رہی۔

"یہی بات ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی بہن بھی کہہ رہی تھی کہ میں نے اس کے بھائی کو بہت بے دردی سے پیٹا ہے۔"

"اچھا کیا ہے......وہ تھا ہی اس قابل، تمھیں اسے جان سے مار دینا چاہئے تھا۔" اسی وقت کمرے میں ایک شخص داخل ہو کر بولا۔

"آپ کو سیٹھ صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔اور وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔میں نے سلیپنگ سوٹ کی ہلکی پھلکی قمیص پہنی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"اس لباس میں چلو گے کیا؟" شیتل مستفسر ہوئی۔

"تو اور کیا۔میرا سوٹ تو وہیں پر رہ گیا ہے۔"

"اچھا میں بھی چلتی ہوں تمھارے ساتھ۔" وہ کھڑی ہو گئی۔تھوڑی دیر بعد ہم سیٹھ رابندر ناتھ کے پاس موجود تھے۔وہ کمرے میں اکیلا تھا یہاں تک کہ پریتی بھی اس کے پاس موجود نہیں تھی۔

"بیٹھو مسٹر عمر جان!" وہ نرم لہجے میں بولا۔

اور میں "شکریہ" کہتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سب سے پہلے تو میں تمھارا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ تم نے شیش ناگ کو زندہ چھوڑ دیا۔بلاشبہ مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت

تھی وہ حقیقتاً خود کو میرا بیٹا ثابت کر چکا ہے۔ دوسرا، وعدے کے مطابق میں تمھیں بہ خیریت پاکستان بھجوانے کا ذمہ دار ہوں۔ اب یہ تمھاری مرضی ہے کہ تم۔ ہوائی، بحری یا زمینی جس طرح سفر کرنا پسند کرو، اس کے ساتھ۔'' اس نے اپنے سامنے پڑے بیگ کو کھولا جس میں مجھے نوٹوں کی چند گڈیاں نظر آئیں اور میری طرف گھماتے ہوئے بولا۔''اس میں سے کچھ رقم تو وہ ہے جو فائیٹ جیتنے کے سلسلے میں انتظامیہ کی طرف سے تمھیں ملی ہے اور کچھ میں اپنی چاہت سے دے رہا ہوں۔ تمھاری سہولت کے لیے میں یہ ڈالروں کی صورت تمھیں ادا کر رہا ہوں تا کہ پاکستان جا کر تم اسے اپنے ملک کی کرنسی میں تبدیل کر سکو۔'' اور میں نے بغیر کسی ردوقدح کے رقم قبول کر لی۔

''اب بتاؤ کہ تم کس راستے سے سفر کرنا پسند کرو گے؟'' جب رقم کا بیگ وصول کر کے میں نے اپنے پہلو میں رکھا تو سیٹھ رابندر ناتھ مستفسر ہوا۔

''ہوائی راستے سے۔'' پاکستان جلدی پہنچنے کے خیال سے میں نے بغیر سوچ ہوائی سفر کا نام لیا۔

''ٹھیک ہے میں ابھی فوٹو گرافر کو بلاتا ہوں اور اس کے ساتھ میک اپ کرنے والے کو بھی تا کہ تمھارا حلیہ تبدیل کر کے پاسپورٹ بنایا جائے۔''

میں نے کہا۔''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''

اس نے انٹر کام اٹھا کر فوٹو گرافر وغیرہ بلانے سے متعلق احکامات صادر کے لیے اور پھر میرے ساتھ گپ شپ کرنا شروع کر دیا۔

''کیا اپنی دوست کو یہیں چھوڑ جاؤ گے؟'' وہ باتوں باتوں میں شیتل کی طرف اشارہ کر کے مستفسر ہوا۔

''ہاں۔'' میں مختصراً بولا۔

''اگر یہ پسند کرے تو میں اس کو بہت اچھی جاب مہیا کر سکتا ہوں۔'' وہ اشتیاق سے بولا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔''یہ خود دو فیکٹریوں کی مالک ہے...... اسے جاب کی کیا ضرورت ہے۔''

''کیا؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی......'' میں اطمینان سے بولا۔''یہ سیٹھ ہری چرن داس کی بیٹی ہے۔''

''وہ...... دہلی والے ہری چرن داس؟''

''بالکل۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''سوری بے بی۔'' رابندر ناتھ ہلکی سی خفت سے بولا۔''دراصل میں آپ کو پہچانتا نہیں ہوں نا؟...... اس لیے۔''

''اٹس او کے انکل۔'' شیتل جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی سپاٹ لہجے میں بولی۔ تھوڑی دیر بعد ہی سیٹھ کا ملازم دو افراد کے ساتھ ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا جبکہ دوسرا ڈھلتی عمر کا کمزور سا آدمی تھا۔ نوجوان کے گلے میں لٹکتا کیمرا دیکھ

کر مجھے پتا چل گیا کہ وہ فوٹو گرافر ہے۔ دونوں نے ادب سے جھک کر سیٹھ رابندر ناتھ کو نمسکار کیا اور پھر اس کے حکم پر ادھیڑ عمر آدمی اپنے ہاتھ میں موجود اٹیچی کھول کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے پہلے تو ایک مخصوص محلول میرے بالوں پر لگایا۔ پھر آنکھوں میں ڈراپر سے کسی دوائی کے چند قطرے ٹپکائے جس کی وجہ سے میری آنکھوں میں ہلکی سی سوزش بھی ہونے لگی تھی اس کے بعد وہ اپنے بریف کیس سے مختلف چیزیں نکال کر میرے چہرے کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔ کام ختم کر کے جب اس نے آئینہ میرے سامنے کیا تو میں حقیقتاً اچھل پڑا آئینے کے اندر مجھے گھنی مونچھوں والا گہرے سانولے رنگ کا ایک بندہ دکھائی دیا۔

''بھئی واہ...... مان گئے۔'' میرے منہ سے بے ساختہ اس کے لیے تعریف نکلی۔ جواباً اس نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

''یہ کب تک برقرار رہ سکے گا؟''

''مونچھیں وغیرہ تو آپ خود بھی تھوڑی سی کوشش کر کے اتار اور لگا سکتے ہیں اور چہرے اور بالوں کی رنگت اس وقت تک نہیں اترے گی جب تک آپ انھیں اسپرٹ سے دھو نہیں لیتے۔'' وہ میری بات کا جواب دیتا ہوا بولا۔

اس کے بعد سیٹھ کے حکم سے اس کا ایک ملازم شیشم ناگ کا ایک سوٹ اٹھا لایا کیونکہ ہم دونوں کی جسامت تقریباً برابر تھی۔ باتھ روم میں جا کر میں نے سوٹ پہنا اور پھر فوٹو گرافر نے مختلف زاویوں سے میری چند تصاویر لیں۔ تصاویر لینے کے بعد فوٹو گرافر اور میک اپ مین رخصت ہو گئے لیکن جانے سے پہلے بوڑھا میک اپ مین ایک چھوٹی سی بوتل میں رنگت بدلنے والا محلول میرے حوالے کرنا نہ بھولا جس کی بدولت میں اپنے ہاتھوں کا رنگ بدل سکتا تھا۔ تا کہ ہاتھوں کی اجلی رنگت سے کوئی میرے میک اپ کو نہ بھانپ لے۔

''سیٹھ صاحب کب تک پاسپورٹ وغیرہ بن جائے گا۔'' ان کے جاتے ہی میں نے سیٹھ سے پوچھا۔

''پاسپورٹ اور تمھارے موجودہ حلیے کے شناختی کاغذات صبح تک تیار ہو جائیں گے۔ تم دوپہر 12 بجے تک تیار ہو جانا کیونکہ ایک بجے کی فلائیٹ سے تمھیں عمان کے لیے فلائی کرنا ہے۔ وہاں سے تمھیں پاکستان کے لیے آسانی سے فلائیٹ مل جائے گی۔ اگر کوئی الجھن پیش آئے تو وہاں پر موجود میرے نمائندے سے بات کر لینا وہ تمھاری ہر الجھن کو حل کر دے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک وزٹنگ کارڈ میری سمت بڑھا دیا جو اس کے نمائندے کا تھا۔

''شکریہ سیٹھ صاحب۔'' میں نے کارڈ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ''اب آپ ہمیں اجازت دیں صبح ان شاء اللہ میں گیارہ بجے آپ کے حضور پہنچ جاؤں گا۔''

''او کے گڈ بائی۔'' وہ کھڑے ہو کر مجھ سے بغلگیر ہوتا ہوا بولا۔ جبکہ شیتل کے سر پر اس نے ہاتھ پھیرنے پر اکتفا کیا تھا۔ شیتل کی گاڑی ابھی تک کوٹھی کے گیراج میں جوں کی توں کھڑی تھی۔ پونے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم شیتل کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ اتنی رات گئے بھی شیتل کا بوڑھا ملازم پہلی کال بیل پر ہی دوڑا چلا آیا۔

وہ رات میری زندگی کی عجیب رات تھی پاکستان واپسی کی خوشی کے ساتھ ساتھ شیتل سے بچھڑنے کا دکھ بھی میرے اندر ہلکورے

لے رہا تھا۔ شیتل رابندر ناتھ کی کوٹھی میں ہی میرے جانے کا سن کر گم صم سی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے لے کر ابھی تک اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تمھیں۔'' جب میری ہر بات کے جواب میں اس کی گفتگو''ہاں، ہوں'' سے آگے نہ بڑھی تو میں زچ ہو کر بولا۔'' میں نے پہلے دن سے ہی تجھے اپنی مجبوریوں کے بارے بتلا دیا تھا پھر اس طرح موڈ بنانے کا فائدہ؟''

''میں نے موڈ تو نہیں بنایا......اور موڈ بنا بھی لوں تو آپ کو کیا فرق پڑے گا۔''

''کیوں نہیں پڑے گا فرق......اور یہ بھی تو سوچو کہ میں نے بھی تو تم سے جدائی کا دکھ جھیلنا ہے۔''

اس نے اپنا نیچے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی خوب صورت جھیل جیسی آنکھوں میں مجھے ویرانی ہی ویرانی نظر آئی۔ چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد وہ آہستہ سے بولی۔

''سنو......تم عزم والے ہو۔

بلا کا ضبط رکھتے ہو۔

تمھیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔

مگر......سوچو،

جسے تم چھوڑے جاتے ہو۔

اُسے تو ٹھیک سے شاید۔

بچھڑنا بھی نہیں آتا۔

آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ رو دی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹایا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''شیتل میرا تم سے وعدہ ہے کہ جیسے ہی میرے گھر کے حالات سدھرے دشمنی کی آگ ٹھنڈی پڑی میں تیرے پاس آجاؤں گا یا تمھیں اپنے پاس بلا لوں گا''

''ضروری تو نہیں کہ تمھارے گھر میں حالات اتنے ہی خراب ہوں جتنے تم تصور کیے بیٹھے ہو۔'' اسے چونکہ میں اپنے تمام حالات تفصیل سے بتلا چکا تھا اس لیے ایک امید کے سہارے وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''اللہ کرے یوں ہی ہو۔'' میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔''اور اگر ایسا ہوا تو میں جاتے ہی تمھیں فون کر دوں گا۔ تمھارے گھر اور تمھاری سہیلی کے گھر کا فون نمبر مجھے ازبر ہو چکا ہے۔ میرے گھر میں البتہ فون موجود نہیں ہے اور اپنے گھر کا پتا میں پہلے سے تیرے حوالے کر چکا ہوں۔''

''مم......میں ساری زندگی تیری کال کا انتظار کروں گی۔''

''اگر میں تمھیں کال کرنے کے لیے زندہ رہا تو......''

وہ میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔''میں پہلے تھوڑی پریشان ہوں جو تم مزید پریشان کر رہے ہو۔''

وہ رات ہم دونوں نے جاگتے ہوئے گزاری، صبح بھی شیتل نے مجھے سونے کے لیے نہ چھوڑا۔ گیارہ بجے ہم شیتل کے مکان سے نکلے اور سیٹھ رابندر ناتھ کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ سیٹھ رابندر ناتھ پُرتپاک انداز میں ہم سے ملا۔

''مسٹر عمر جان۔''سیٹھ ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''آپ چائے لینا پسند کریں گے یا کافی۔''

''نو تھینکس سر!......ہم ناشتا کر کے آئے ہیں۔''

''او کے پھر آپ لوگوں کو میری طرف سے گڈ بائی......اب ایر پورٹ تک آپ کے ساتھ مسٹر جوگندر جائے گا۔''اس نے ڈرائینگ روم میں موجود ایک پختہ عمر کے آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔''اسی کے پاس آپ کا غذات بھی ہیں۔ میرے لائق اور کوئی کام ہو تو بتاؤ۔''

''بہت بہت دھنے واد سیٹھ صاحب۔''میں نے اس سے الوداعی معانقہ کرتے ہوئے کہا۔''آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

جوگندر کے پاس اپنی گاڑی تھی جبکہ میں اور شیتل وہاں سے شیتل کی کار میں روانہ ہوئے۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہم ایر پورٹ میں داخل ہوئے اور ٹھیک ایک بجے میرا جہاز عمان کے لیے فلائی کر گیا۔ لاؤنج میں کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیتل نے مجھے الوداع کہا تھا اور جب تک میں اسے نظر آتا رہا وہ ہاتھ ہلاتی رہی۔ اس سے بچھڑتے وقت میرا دل بھی عجیب قسم کی اداسی سے بھر گیا تھا۔ وہ واقعی ایک عجیب و غریب لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ میں جہاز کی سیٹ سے ٹیک لگا کر اس کے ساتھ گزارے دنوں کی یادوں میں کھو گیا نا معلوم زندگی دوبارہ اس سے ملاقات کا موقع دیتی بھی تھی کہ نہیں۔ بہر حال یہ یقینی بات تھی کہ اس نے ہمیشہ میری یادوں میں زندہ رہنا تھا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے بھلانے کے قابل نہیں تھی۔

عمان پہنچ کر امیگریشن کے عملے کو کاغذات چیک کرانے تک میرے دل میں یہ خوف جاگزیں رہا کہ کہیں وہ میرے نقلی کاغذات کو پہچان نہ لیں لیکن اللہ کے فضل سے عملے نے میرے کاغذات بڑی آسانی سے او کے کر دیئے۔ سیٹھ رابندر ناتھ نے واقعی لاجواب قسم کے کاغذات تیار کرائے تھے اور ان میں کوئی ایسی سقم نہیں رہنے دی تھی جس کی وجہ سے میں مشکل میں پھنستا۔

وہاں پر اگلے دن مجھے آسانی سے پاکستان کے لیے فلائیٹ مل گئی اور میں بہت ساری حسرتیں، آرزوئیں اور اندیشے دل میں بسائے پاکستان روانہ ہو گیا۔

+ + +

کراچی ایر پورٹ پر اترتے ہی میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ انڈیا کے اندر گزرے ہوئے شب و روز مجھے بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ اگر چہ اس عرصے کے اندر کچھ خوشگوار لمحات بھی بیتے تھے مگر وہ صرف شیتل سے وابستہ تھے۔

کراچی ائیر پورٹ سے نکلتے ہوئے مجھے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔عمان میں مَیں نے بھارتی کرنسی کے بدلے ریال حاصل کر لیے تھے۔اور کراچی میں سب سے پہلے انھی ریالوں کے بدلے پاکستانی کرنسی حاصل کر لی۔

ایک دکان سے سپرٹ خرید کر میں حمام میں جا گھسا تاکہ اپنا حلیہ تبدیل کر سکوں۔رش کی وجہ سے کوئی بھی میرے بدلے ہوئے حلیے کی جانب متوجہ نہ ہو سکا تھا۔وہاں سے فارغ ہوتے ہی میں ایک شاپنگ پلازہ میں گھس گیا تاکہ اپنے لیے کپڑے خرید سکوں کیونکہ میرا تعلق جس علاقے سے تھا وہاں پر سوٹ پہننا نہ صرف معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ اس قسم کا لباس پہننے والا ایک تماشا بن جاتا۔ماضی قریب تک تو ہمارے علاقے میں ننگے سر پھرنا بھی ایک جرم گردانا جاتا تھا۔آج کل البتہ اِکا دُکا نوجوان بغیر پگڑی اور ٹوپی کے نظر آجاتے تھے مگران کو بھی بڑے بوڑھے نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور لگے ہاتھوں نصیحتیں کرنے سے نہیں چوکتے۔

اپنے لیے دو ریڈی میڈ شلوار قمیض سوٹ لینے کے ساتھ ساتھ میں نے سعدیہ اور عدنان کے لیے بھی کئی سوٹ لے لیے۔شاپنگ پلازہ کے اندر ہی کپڑے بدل کر میں باہر نکلا اور ٹیکسی پکڑ کر بس اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔کراچی کے راستے میرے لیے بالکل انجان تھے کیونکہ اس سے پہلے میں نے کراچی نہیں دیکھا تھا،لیکن اس اجنبیت میں بھی ایک اپنا پن تھا۔تحفظ کا احساس اور پاکستان کا شہری ہونے کے فخر کی وجہ سے میرا ذہن ہر قسم کے ڈر اور خوف سے آزاد تھا۔ٹیکسی ڈرائیور کا تعلق صوبہ پنجاب کے مشہور شہر فیصل آباد سے تھا۔غلام حسین نام کا یہ ڈرائیور کافی باتونی تھا۔اس کے فیصل آبادی لہجے کی پنجابی سے میں محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔یہ شاید چند ہفتے پردیس کی ٹھوکریں کھانے کا نتیجہ تھا کہ کراچی کی ہر چیز بھلی بھلی سی لگ رہی تھی۔

بس اڈے میں جا کر سب سے پہلے میں نے اپنے علاقے میں جانے والی بس کا ٹکٹ خریدا جس نے میرے علاقے سے گزرتے ہوئے پشاور جانا تھا۔ٹکٹ پر بس کی روانگی کا ٹائم رات کے دس بجے لکھا ہوا تھا۔دس بجے تک کا وقت میں نے اڈے کے اندر گھوم پھر کر گزارا۔

ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ میں اپنے دوست امجد کے گھر کا چکر لگا آؤں۔کیونکہ کراچی آکر بھی اس کے والدین سے ملاقات نہ کرنا بڑی زیادتی کی بات تھی حالانکہ اس کے گھر کا پتا مجھے زبانی یاد تھا اور اس کے گھر والوں سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود وہ مجھے اور میں ان سے اچھی طرح واقف تھا،لیکن آخر میں ان سب سوچوں کے باوجود اپنے گھر کی غیر یقینی صورتِ حال کے باعث میں اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنا سکا کہ یہ نہ ہو امجد کے گھر والے مجھے روکنے کی کوشش کریں اور رکنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔بس کی سیٹیں کافی آرام دہ تھیں لیکن میں سونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔گھر والوں کی خیریت کے بارے اندیشے پاکستان پہنچ کر کم ہونے کی بجائے بڑھ گئے تھے۔میں خود کو لاکھ تسلیاں دیتا لیکن چچا فاضل کا لکھا ہوا مختصر خط میری آنکھوں کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آن کھڑا ہوتا اور اس سوالیہ نشان کے آگے ہلاکت اور تباہی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

چودھری انور گو خالص گنڈہ پور نہیں تھا،لیکن گنڈہ پوروں کے معاشرے کے اندر ہی اس کی پیدائش ہوئی تھی اور گنڈہ پوروں کی

تمام جاہلانہ رسومات اور خونخواری اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔اس کے برعکس گنڈہ پوروں کی اچھی قدریں چودھری خاندان کو ہضم نا ہوسکیں تھیں۔وہ کمینی خصلتیں رکھنے والا دشمن تھا۔سیانوں کے کہنے کے مطابق ایسے شخص کی نہ دوستی اچھی ہوتی ہے اور نا دشمنی۔جبکہ میرا خاندان دانستہ یا نادانستہ طور پر اس سے دشمنی کی ابتدا کر بیٹھا تھا۔

اس سے قطع نظر کہ میرا خاندان ہر لحاظ سے چودھری خاندان کے ہم پلہ تھا بلکہ عددی لحاظ سے تو ہمیں ان پر واضح برتری حاصل تھی یعنی اس کے دو بیٹوں کے مقابل ہم چار بھائی تھے،لیکن اس کمینے دشمن سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ کب کون سی چال چل جائے۔ایسے لوگوں نے اپنے لیے وہی گھسی پٹی کہاوت از بر کر رکھی ہوتی ہے کہ"جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔"حالانکہ یہ فقرہ کمزور کردار کے مالک کسی بزدل شخص کا گھڑا ہوا ہے۔جو نہ جانے کس طرح زبان زد عام ہو گیا ورنہ دشمنی اور محبت ہمیشہ اصول رکھتی ہے۔خاص کر گنڈہ پور قوم تو ان اصولوں کو کسی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھتی ہے اور پُرکھوں کے وہ قصے جن میں کسی اصول کی خاطر کسی شخص نے اپنا نقصان کیا ہو بڑے فخر اور عقیدت سے سنائے جاتے ہیں۔

میرے ہی گاؤں کے ایک نامی گرامی بدمعاش کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی دشمن کی بیٹی کو گھر سے بھگا لے گیا تھا۔ جس میں لڑکی کی مرضی بھی شامل تھی۔اپنے بھائی کی اس حرکت پر بجائے خوش ہونے کے کہ اس نے دشمن کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑا اور دشمن کے گھر پہنچ کر کہا کہ"میرے بھائی سے غلطی ہوئی ہے اور ازالے میں میں اپنی بہن لے آیا ہوں تمھارے خاندان میں جس نے اس سے نکاح کرنا ہے کر لے۔"

لیکن چودھری پارٹی سے کسی اچھائی کی امید رکھنا آگ سے ٹھنڈک کی بھیک مانگنے کے مترادف تھا۔وہ صرف ڈنڈے کی زبان سمجھنے والا خاندان تھا۔برتر کے لیے لومڑی کی طرح چالاک اور اونٹ کی طرح کینہ رکھنے والا جبکہ کمزور کے لیے شیر۔

مجھے یقین تھا کہ آمنے سامنے کی لڑائی میں میرے بھائیوں نے چودھری خاندان کو کسی خاطر میں بھی نہیں لانا تھا۔البتہ وہ دھوکے سے کوئی وار کر جاتے تو دوسری بات تھی اور اس صورت میں بھی امید واثق تھی کہ اینٹ کا جواب انھیں پتھر سے ہی ملتا،لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے بعد بھی میرے دل کو قرار نہیں آرہا تھا اور میری چھٹی حس کسی نامعلوم حادثے کا سگنل دے رہی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔

بس فراٹے بھرتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور اس سے زیادہ تیزی سے میرے خیالات سوچ کی لہروں پر دوڑ رہے تھے۔ہم رات کا کھانا کھا کر کراچی سے نکلے تھے اس لیے رات کو بس بغیر رکے چلتی رہی۔

ڈرائیور نے صبح ناشتے کے لیے آدھے گھنٹے کا سٹاپ کیا۔تمام لوگ بس سے اتر کر اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہوٹل میں پھیل گئے۔سردیوں کی طویل رات جاگتے ہوئے گزار کر میں سخت بھوک محسوس کر رہا تھا۔اس لیے میں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔دوبارہ گاڑی کے چلنے کے ساتھ ہی مجھے اونگھ آنے لگی اور تھوڑی دیر بعد ہی میں سو گیا۔نیند کی حالت میں بھی میں الٹے سیدھے خواب دیکھتا رہا۔میری آنکھ لوگوں کی باتوں کے شور سے کھلی۔بس رکی ہوئی تھی اور لوگ اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر باہر کا رخ کر رہے تھے میں نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی دن

کے دس بج رہے تھے۔بس کسی ویران سی جگہ پر کھڑی تھی لوگوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ بس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔اور پھر بس کی خرابی دور ہوتے ہوئے کافی دیر ہوگئی۔ پہلے تو کنڈیکٹر لفٹ لے کر قریبی شہر تک پہنچا اور پھر وہاں سے مکینک کو مع اس کے سازو سامان کے لے آیا، لیکن خرابی کوئی پیچیدہ قسم کی تھی کہ مکینک بمشکل چند گھنٹوں میں ٹھیک کر پایا۔وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے سورج غروب ہونے لگا تھا۔تمام لوگ بھوک سے بے حال تھے صبح ناشتے کے بعد شام تک سردیوں کا دن بغیر کھائے پیئے گزارنا بڑا مشکل کام ہے۔حالانکہ گرمیوں کے مقابلے سردیوں کا دن کافی مختصر ہوتا ہے۔گھنٹا بھر سفر کے بعد ہم ایک ہوٹل کے قریب پہنچے۔یہ کوئی غیر معروف سا ہوٹل تھا بس کے رکتے ہی تمام لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ہوٹل کے برآمدے میں بچھی چارپائیوں کی طرف بھاگے۔اتنے زیادہ گاہکوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو ہوٹل کا مالک بوکھلا گیا تھا۔اس کے پاس موجود دو کم عمر لڑکے جو ویٹر کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے بھاگ بھاگ کر سواریوں کو کھانا سرو کرنے لگے۔مینو میں صرف سبزی دال تھی لیکن اس بھوک میں وہ ترکاری بھی چکن کڑاہی سے لذیذ محسوس ہوئی۔کھانے اور چائے میں ہمارا مزید ایک گھنٹا ضائع ہوا لیکن اس کے بعد گاڑی صبح تک بغیر رکے چلتی رہی۔

میں اپنے شہر میں دن کے دس بجے پہنچا۔سب سے پہلے بینک میں جا کر میں نے اپنے پاس موجود رقم اکاؤنٹ میں جمع کرائی اور پھر بس اڈے جا کر اپنے گاؤں کی طرف جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔جتنی دیر بس رکی رہی میری نظریں بس کے اندر کسی شناسا چہرے کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔مگر مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہ آیا جس سے میں گھر یا گاؤں کی خیریت پوچھ سکتا۔

ایک گھنٹے کے مختصر سفر کے بعد میں پہلوان ہوٹل کے قریب جا اترا، میرا گاؤں اس جگہ سے چند کلومیٹر دور تھا۔میں نے تانگے وغیرہ کا انتظار کرنے کی بجائے پیدل سفر کو ترجیح دی تھی۔سفری بیگ کو کندھے سے لٹکا کر میں جانے پہچانے راستے پر گامزن ہوگیا۔مجھے پتا تھا کہ پہلوان ہوٹل پر میرے گاؤں کے کافی فارغ البال اور لوفر لفنگے بیٹھے ہوں گے مگر میں اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے اتنا بے چین تھا کہ وہاں پر رک کر گھر کی خیر خیریت کے بارے پوچھنا مجھے وقت کا زیاں لگا۔

میری آنکھوں کے سامنے تمام گھر والوں کے ہنستے مسکراتے چہرے فلم کی طرح چل رہے تھے اور پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد میں نے ان کے بیچ میں ہونا تھا۔میرے دل میں رہ رہ کر یہ سوچ بھی ابھر رہی تھی کہ کہیں میرے بھائیوں میں سے کوئی قتل نہ ہو چکا ہو یا اس کے برعکس مخالفین میں سے کسی کو مار کر حوالات میں بند نہ ہوگیا ہو اور اس طرح کے کسی بھی حادثے کی صورت میں امی نے تو رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کر دینا تھا۔کیونکہ ابو جان جتنے حوصلے والے تھے۔امی جان اتنی ہی نرم دل اور چھوٹے چھوٹے حادثوں سے گھبرا جانے والی تھی۔

بہرحال میں ذہنی طور پر ہر قسم کی انہونی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا آرہا تھا۔میں جیسے ہی اپنی گلی میں مڑا میری کیفیات عجیب سی ہوگئیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔جیسے میں صدیوں گھر والوں سے بچھڑا رہا ہوں۔نامعلوم احساس کے زیر اثر میں سر جھکائے تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔شاید میں اس طرح لاشعوری طور پر گلی کی طوالت کو کم کرنا چاہ رہا تھا اور پھر میرے قدم ٹھیک میرے گھر کے بڑے دروازے کے سامنے جا کر رک گئے۔گھر کا بیرونی دروازہ لکڑی کا تھا اور اس پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔بغیر دیکھے مجھے اپنے گھر کے دروازے کی ایک ایک

کیل یاد تھی۔ میری جھکی نظریں جیسے ہی اٹھیں مجھے جھٹکا سا لگا شاید میں غلط دروازے کے سامنے آ کر رک گیا تھا مگر دائیں بائیں دیکھنے پر بھی وہ میرے گھر کا دروازہ ہی ثابت ہوا۔ بلکہ دروازے کی بجائے اگر میں اسے دروازے کا جلا ہوا ڈھانچہ کہوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ میں بھاگ کر اندر داخل ہوا وہ گھر کی بجائے کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ سفیدی لیے ہوئے دیواریں کالی سیاہ نظر آ رہی تھیں۔ کمروں کے دروازے جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔

''اللہ کرے میرے گھر والے بچ گئے ہوں۔'' میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

کندھے کے ساتھ لٹکتے بیگ کو صحن میں پھینک کر بے قراری سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومنے لگا۔ مگر چند آوارہ کتوں کے علاوہ مجھے کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔

''اس کا مطلب ہے دشمنوں نے واقعی کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔'' میرے ذہن میں ایک تلخ سوچ ابھری۔ ''بہرحال گھر کا کیا ہے اور بن جائے گا۔ بندے سلامت رہیں۔'' میں خود کو تسلی دینے لگا۔

تمام کمرے اور بیٹھک کا جائزہ لینے کے بعد میں باہر نکلنے کی ارادہ سے بڑھا تاکہ پڑوسیوں سے گھر والوں کا اتا پتا معلوم کروں۔ اپنے ذہن میں میں تسلی کے وہ الفاظ سوچ رہا تھا جو میں نے امی جان اور سعدیہ سے کہنے تھے۔ مجھے علم تھا سعدیہ اپنے خوابوں کا گھر مسمار ہوتے دیکھ کر بہت روئی ہو گی۔ میں نے سوچا......

''بہرحال کوئی بات نہیں میں اس کو پہلے سے بھی اچھا گھر بنا دوں گا۔'' اب تو یوں بھی انڈیا سے کافی بڑی رقم ساتھ لے کر آیا تھا جو میں نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی تھی۔

میرے گھر سے نکلنے سے پہلے چند پولیس والے دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے رائفلیں یوں تانی ہوئی تھیں جیسے کسی خطرناک مجرم کو پکڑنے جا رہے ہوں۔

''خبردار...... ہاتھ اوپر۔'' مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک چلایا۔ بازو پر لگی رینک والی پٹی اس کو حوالدار ظاہر کر رہی تھی۔ میں ہاتھ اٹھانے کی بجائے انھیں حیرانی سے تکتے ہوئے بولا۔

''خیر تو ہے بھائی صاحب، میں کوئی مجرم نہیں بلکہ اس گھر کا مالک ہوں۔''

''مجرم کے مامے ہاتھ اوپر کرو۔'' وہ غصے سے چلایا۔

''حوالدار صاحب۔ آپ کا مطلوبہ مجرم بھاگ جائے گا اور آپ غیر متعلق شخص سے الجھے رہیں گے۔''

''غیر متعلقہ شخص کے بچے...... کیا تیرا نام عمر جان نہیں ہے؟''

''ہے...... تو؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''اس تو کا جواب تجھے تھانے چل کر دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے میں گھر والوں سے مل کر تھانے پہنچ جاؤں گا۔''

''گھر والوں سے ملنے کے لیے چند دنوں انتظار کرو۔ پھانسی ہوتے ہی تُو خود بخود ان کے پاس پہنچ جائے گا۔''

''اس کا بکواس کا مطلب؟'' میں جھنجھلا کر بولا۔

''اوئے...... میرا خیال ہے تمھیں میری بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔'' حوالدار نے رائفل کاک کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی بک بک بند کرو اور ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' وہ کوئی انڈیا پولیس تو تھی نہیں کہ میں اس سے لڑ جھگڑ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا اور پاکستان میں رہتے ہوئے پولیس والوں سے ٹکرانا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے پکڑ کر تھانے لے جا رہے تھے۔ میں نے مجبوراً اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لیے۔

حوالدار نے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور اس نے آ کر میری تلاشی لی۔ مگر اس کے اناڑی پن کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ پولیس کے سپاہی کی بجائے کوئی مزدور ہو۔

مجھے جانتا تھا کہ تھانے جاتے ہی جلد یا بدیر ان کو اپنی غلطی کا پتا چل جائے گا کہ وہ غیر متعلق شخص کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔ مگر ایک چیز مجھے الجھن میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ حوالدار نے میرا صحیح نام لے کر پکارا تھا اور یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ان کا مطلوبہ شخص بھی میرا ہم نام ہو۔

بہر حال میں نے سر جھٹک کر اپنی کوفت دور کی اور چپ چاپ ہتھکڑی لگوالی۔

''ویسے حوالدار صاحب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کس جرم میں آپ لوگ گرفتار کر کے لے جا رہے ہو؟''

''اپنے جرموں کی فہرست تُو نے بتانی ہے پتر۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''پوچھنا تو ہم نے ہے۔''

میں نے اس سے سر کھپانا مناسب نہ سمجھا کہ وہ ہر بات کا الٹا مطلب لے رہا تھا اور چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑا۔ تین چار پولیس والے مجھے گلی میں کھڑے نظر آئے۔ گویا انھوں نے میرے فرار ہونے کے امکان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی کچھ نفری ریزرو میں رکھ چھوڑی تھی۔

گلی میں تھوڑا سا آگے ان کی جیپ کھڑی تھی۔ مجھے جیپ میں بٹھا کر وہ چل پڑے اکا دکا شنا سا چہرے گلی میں نظر آئے۔

''شاید یہ میرے ابو یا چچا تک میری گرفتاری کی اطلاع پہنچا دیں۔'' میرے دل میں امید کی کرن جاگی اور میں مطمئن ہو گیا۔ جیپ رحمٰن خیل سے نکل کر پہلوان ہوٹل کی سمت مڑی اور پھر پختہ روڈ پر چڑھ کر تھانے کی طرف چل پڑی۔ تھانہ وہاں سے قریباً دو میل دور تھا۔ تھانے کے احاطے میں جیپ روک کر وہ تمام پھرتی سے نیچے اترے اور مجھے گھیر کر اندرونی عمارت کی طرف بڑھے۔ ان کے انداز سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ بہت خطرناک قسم کے مجرم کو گرفتار کر کے لا رہے ہوں۔

''السلام علیکم سر۔'' تھانیدار کے آفس میں داخل ہوتے ہی حوالدار نے سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''سر مجرم عمر جان حاضر ہے۔''

موٹی توند کے تھانیدار نے خشونت بھری نظریں اٹھا کر میری جانب گھورا ''ہوں'' کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔''

''تھانیدار صاحب یہ کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے پکڑ لائے ہیں۔ اگر آپ اسی طرح مجھے مجرم سمجھ کر دیر کرتے رہے تو اصل مجرم دور نکل جائے گا۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر ان کی غلط فہمی دور کرنی چاہی۔

''فیکے اس کو حوالات میں بند کردو۔'' تھانیدار سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔

''یس سر۔'' حوالدار زور سے پاؤں مار کر سیلوٹ کیا۔

''چلو اوئے۔'' اس مرتبہ اس کا مخاطب میں تھا اور میں بے بسی سے سر ہلا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ یہ بے چارگی کی انتہا تھی کہ میں گھر پہنچ کر بھی گھر والوں سے مل نہیں پایا تھا۔ مجھے پولیس والوں پر سخت غصہ آرہا تھا مگر ان کے ساتھ ہاتھا پائی کر کے اپنے آپ کو بے گناہ سے مجرم نہیں بنا سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ تھوڑی دیر تک ابو جان یا چچا جان نے آکر مجھے لے جانا تھا۔ ایک ہلکا سا خوف البتہ میرے ذہن میں فوج سے بھگوڑا ہونے کے متعلق تھا کہ کہیں اس کو بنیاد بنا کر پولیس والے مجھے حوالات میں بند نہ رکھیں یا واپس میری یونٹ بھجوا دیں۔ کیونکہ بھگوڑا ہونے کے بعد لامحالہ میری یونٹ نے متعلقہ تھانے کو مطلع کیا ہوگا اور میں اس وقت بدقسمتی سے اپنے متعلقہ تھانے کے حوالات میں ہی بند تھا۔ پولیس والے مجھے حوالات میں بند کر کے چلے گئے اور میں پریشانی کے عالم میں حوالات کے اندر چکر کاٹنے لگا۔ مجھے بے چینی سے ابو جان یا چچا جان کی آمد کا انتظار تھا مگر کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی میری امید بر نہ آئی۔

''شاید ان تک اطلاع نہ پہنچی ہو۔'' میں نے فکرمندی سے سوچا۔

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' ایک مثبت سوچ میرے دماغ میں ابھری۔ ''اتنے شناساؤں نے مجھے پولیس والوں کے ساتھ تھانے کی طرف آتے دیکھا ہے کسی نہ کسی کو تو یہ اطلاع میرے گھر والوں تک پہنچا دینی چاہیے تھی۔''

انھی سوچوں میں گھرا اضطراب سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک حوالات کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے اس سمت نظر دوڑائی تو حیرت و خوشی سے اچھل پڑا۔ میرا کلاس فیلو ننذر گل دروازے پر کھڑا پریشانی اور افسوس کی حالت میں مجھے دیکھ رہا تھا اس پر نظر پڑتے ہی میں تیر کی طرح دروازے کی طرف بڑھا۔

''شکر دے چہ تہ راغلے'' (شکر ہے تم آگئے ہو) کافی عرصے بعد میں نے پشتو بولی تھی یوں بھی پشتو اور سرائیکی دونوں زبانیں گنڈہ پوروں کی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی متضاد ہونے کی باوجود گنڈہ پور دونوں زبانوں پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی بول چال میں دونوں زبانیں استعمال میں لاتے ہیں۔

میری گرمی جوشی اور تیزی کی کوننذر گل کسی خاطر میں نہ لایا تھا اور اسی طرح دکھ بھری نظروں سے میری جانب دیکھتا رہا۔

''ولے سہ چل دے؟ (کیوں کیا بات ہے) تم اس طرح کیوں حیرانی سے میری جانب گھور رہے ہو۔''

''عمری! تمھیں پتا نہیں تھا اپنے گھر اور گاؤں کے حالات کا۔'' وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ ''تمھیں اس طرح دن دیہاڑے

رحمٰن خیل نہیں آنا چاہیے تھا۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں؟ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔‘‘ میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔’’اگر تمھاری مراد چودھری خاندان سے دشمنی کی شروعات سے ہے تو ان کے ڈر سے میں اپنے گاؤں یا گھر والوں کو تو نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘

’’کون سے گھر والے...... دوست!‘‘ نذر گل کے لہجے میں دنیا جہاں کا کرب سمٹ آیا۔’’گھر والوں کے نام پر آپ کا سُسر چچا فاضل ہی بچا ہے اور وہ بھی ابھی تک سول ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ باقی سارے تو......‘‘

’’کیا بکواس کر رہے ہو۔‘‘ میں حوالات کے دروازے کی سلاخوں کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخا، میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا تھا۔ نذر گل کی بات مجھے ایک گھٹیا مذاق کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔’’تت...... تم تمھیں جرأت کیسے ہوئی اس طرح ایسا گھٹیا مذاق کرنے کی۔‘‘

’’یہ حقیقت ہے میرے دوست......‘‘ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔’’اور یہ بھی حقیقت ہے کہ چودھری انور کے بیٹے، چودھری اکبر نے تمھارے خلاف اتنے کیس درج کرائے ہیں کہ تُو پولیس کے مطلوبہ افراد کی لسٹ میں سرِ فہرست ہے۔ اس کے علاوہ چودھری خاندان نے تجھے پھانسی کے تختے پر چڑھانے کے لیے پولیس کے کئی سر کردہ افراد کو خریدا ہوا ہے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے۔ ان کا مقصد تمھارے خاندان کو جڑ سے ختم کرنا ہے اور بدقسمتی اپنے خاندان میں زندہ بچ جانے والے واحد تم ہی تھے جو چودھری خاندان سے بدلہ لے سکتے تھے تمھارے چچا تو اگر زندہ بچ گئے تب بھی جسمانی لحاظ سے کسی انتقامی کارروائی میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوں گے۔‘‘

نذر گل کی باتیں سن کر میرے بدن سے گویا جان نکل گئی تھی۔ مجھے چکر سا آیا اور میں حوالات کے دروازے کی سلاخوں کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ گیا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے، لیکن اس طرح چشم زدن میں خاندان کے خاندان کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا اور اس خاندان کے بچ جانے والے شخص کے لیے اس بات کو برداشت کرنا بڑا دل گردے کا کام ہے اور میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس حقیقت کو برداشت کرتا۔ میں اسی حالت میں دروازے کے سامنے بیٹھ کر گم صم ہو گیا۔ اس کے بعد نذر گل مجھے کون کون سی تفصیلات بتلاتا رہا اس کو سمجھنے سے میرا ذہن قاصر تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تو پیاروں کی صورتیں گھوم رہی تھیں۔ کانوں میں سعدیہ کی پیار بھری سرگوشیاں اور عدنان کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔

’’کیا میں اپنے پیاروں کو کبھی بھی نہیں دیکھ پاؤں گا؟ کبھی بھی ان کی آواز نہیں سن پاؤں گا؟‘‘ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب بہت تلخ لیکن مبنی بر حقیقت تھا۔

امی جان کی ممتا بھری گود جس میں سر رکھ کر میں لیٹا کرتا تھا، مجھ سے چھن گئی تھی، ابو جان کی شفقت بھری ڈانٹ اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ بھائیوں سے پیار بھرے جھگڑے میرے لیے خواب ہو گئے تھے۔ سعدیہ کی محبت مجھ سے روٹھ چکی تھی۔ مستقبل کے راستے میں مجھے سوائے اذیتوں، مصیبتوں اور تکالیف کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا دکھ درد سمجھنے والے اور گرتے کو سہارا دینے والے مجھ سے بہت دور جا چکے تھے۔ گھنٹا بھر پہلے جو میں خود کو نہایت طاقتور اور مضبوط سمجھ رہا تھا۔ اب اس پرندے کی طرح بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگا جو شکاری کے

جال میں پھنس گیا ہو یا اس جانور کی مانند جو قصائی کے آگے باندھ کر ڈال دیا گیا ہو۔

نامعلوم کتنی دیر اسی طرح سوچوں میں گم حوالات کے دروازے پر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اچانک میرے پہلو میں کسی نے ٹھوکر لگائی اور میں فرش پر گر گیا۔

''کھڑے ہو جاؤ...... ہیجڑے۔'' ایک کرخت آواز میری سماعتوں میں گونجی۔ ''پہلے ہیرو بن کر وارداتیں کرتے ہو اور پکڑے جانے پر عورتوں کی طرح رونا شروع کر دیتے ہو۔'' اور میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے علم ہی نہ ہو سکا کہ کس وقت پولیس والے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے۔ البتہ ان کا ٹھڈا کھا کر میں اپنے ماحول میں واپس آ گیا۔ پولیس والے میری آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو میری بزدلی پر محمول کر رہے تھے ان کے نزدیک میرے رونے کی وجہ یہ تھی کہ میں ان کی حراست میں آ گیا تھا۔ اس جانکاہ حادثے کے بارے سن کر میں اس قابل نہیں رہا تھا کہ ان کی تردید کر سکتا۔

''تُو نے سنا نہیں...... کھڑے ہو جاؤ۔'' میرے پہلو میں ایک اور زوردار ٹھوکر لگا کر پولیس والا غرایا۔

میں زمین پر دونوں ہاتھ ٹیک کر بمشکل کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے نچوڑ کر میری رگوں سے خون نکال لیا ہو۔

''چلو آگے۔'' ایک نے مجھے بازو سے پکڑ کر حوالات کے باہر دھکیلا اور میں ایک مرتبہ پھر لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے دوبارہ ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی مگر پیٹھ پر لگنے والی ٹھوکر نے مجھے خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد دو تین ٹھوکریں میرے پہلو میں لگیں، لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ مجھے تکلیف بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''کھڑا کرو اس بے غیرت کو۔'' وہ غالباً ان کا سینئر تھا کہ اس کی غراہٹ سنتے ہی دو بندوں نے مجھے دائیں بائیں سے پکڑ کر جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔

''لے چلو اسے آپریشن روم میں۔ تھانیدار صاحب بے دردی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ دونوں تقریباً مجھے گھسیٹتے ہوئے آپریشن روم کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ''آپریشن روم سے مراد کوئی اذیت رسانی کا کمرہ ہو گا۔'' میرے ذہن میں سوچ ابھری جس کی تصدیق مبینہ آپریشن روم میں داخل ہوتے ہی ہو گئی۔

اس اذیت روم میں لے جاتے ہی سب سے پہلے انھوں نے مجھے لباس کی قید سے آزاد کیا اور پھر لکڑی کی بڑی سی میز پر اوندھے منہ لٹا کر وہ تشدد شروع کر دیا جو بیان سے باہر ہے۔ اس معاملے میں مجھے انڈیا کا عقوبت خانہ اپنے والوں سے بہت ہیچ نظر آیا۔ حیران کن بات یہ تھی بغیر کچھ پوچھے انھوں نے مجھے زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔

پیٹھ اور کولہوں پر چمڑے کے لتر برسانے کے بعد انھوں نے مجھے بجلی کا کرنٹ لگانا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں انھوں نے پہلے سے میز پر لگے ہوئے کنڈوں سے جکڑ دیئے تھے۔ اس اذیت رسانی کے مرحلے میں مَیں کئی دفعہ بے ہوش ہوا نامعلوم وہ کس بات کا بدلہ لے رہے تھے۔ کافی دیر مجھے تختۂ مشق بنانے کے بعد انھوں نے مجھے میز سے کھول کر چھت سے لگے ہوئے کنڈوں کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ ایک

بھرا ہوا پانی کا ٹب سر کے نیچے رکھ کر انھوں نے میری ٹانگوں کی بندشیں اتنی ڈھیلی کیں جس سے میرا سر ٹب کے پانی میں ڈوب گیا اور پھر بے ہوش ہونے سے پہلے انھوں میری ٹانگوں کے ساتھ بندھی رسی کو ٹائیٹ کیا تو میرا سر پانی سے باہر آ گیا۔ کافی دیر تک یہ کھیل جاری رہا یہاں تک کہ میری ناک اور منہ کے راستے کافی پانی میرے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس دوران میں دو تین دفعہ بے ہوش بھی ہوا۔ تیسری دفعہ مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو سیدھا کھڑا ہوا پایا میرے ہاتھ چھت کے ساتھ لگے ہوئے کنڈوں کے ساتھ مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے۔

''ہاں بھئی......بھگوڑے صاحب کیا حال ہے۔'' موٹی توند والا تھانیدار میرے پیٹ میں دستی چھڑی چبھوتا ہوا بولا۔

''تھانیدار صاحب، آپ مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں۔'' غم و غصے کی شدت سے مجھے اپنی آواز خود بھی بیگانی سی لگی۔

''بدلہ کس بات کا بھئی......یہ تو ہمارے کرم فرما کی خواہش تھی۔''

''کرم فرما؟'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''جی فوجی صاحب۔'' دروازے کی سمت سے ایک گرجدار آواز آئی۔ سفید لٹھے کی شلوار قمیض اور اس کے اوپر سیاہ واسکٹ پہنے چودھری اکبر مجھے دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔''ہم ہیں ان کے کرم فرما......یاد ہے ٹُو نے کیا کہا تھا مجھے کہ جو کچھ کر سکتا ہوں کر لوں۔ ابھی کچھ تو میں نے کر لیا ہے اور کچھ کرنا رہتا ہے۔''

''چودھری ٹُو نے بہت برا کیا ہے...... بہت ہی برا۔'' میری آواز میں عجیب سی دیوانگی جھلک رہی تھی۔ ''یہ مردوں والا کام نہیں ہے۔ اگر تیرے اندر تھوڑی سی بھی مردانگی ہوتی تو کبھی بھی یہ ظلم نہ کرتا تیرا معاملہ میرے ساتھ تھا نہ کہ میرے گھر والوں کے ساتھ۔''

''ہنہ مردانگی۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔''میری نظر میں مردانگی یہی ہے کہ دشمن کی نسلوں تک کو فنا کر دو۔''

''اب تیری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے یہیں پہ ہلاک کرا دو۔ ورنہ اگر میں بچ گیا تو......''

مگر میری بات مکمل ہونے سے پہلے تھانیدار نے نمک حلالی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے چہرے پر زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

''میرے سامنے چودھری صاحب سے منہ ماری کر رہا ہے۔'' تھپڑ مار کر وہ اپنی کریہہ آواز میں غرایا۔

''نہیں نہیں تھانیدار صاحب اسے بولنے دو۔ یہ غریب اپنی موت کو آسان بنانے کے چکر میں ہے۔ مگر اسے پتا نہیں کہ اس نے کس شیر کو للکارا تھا۔''

''شیر اور ٹُو'' میں نے نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔''اگر تیرے اندر ذرا بھی غیرت ہے تو میرے ہاتھ کھول دو۔ تمھاری مردانگی کا بھرم ان سب کے سامنے نہ کھول دوں تو کہنا۔''

''سن لیا تھانیدار صاحب۔'' وہ میرے بجائے تھانیدار سے مخاطب ہو کر بولا۔''اس کا مطلب ہے آپ لوگوں نے اس کی مہمان نوازی صحیح طریقے سے نہیں کی ہے۔''

''چودھری صاحب ابھی تو شروعات ہے۔'' تھانیدار خوشامدانہ لہجے میں بولا۔''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔''

''تھانیدار صاحب آپ سرکار کے ملازم ہیں یا چودھری اکبر کے؟''

''چودھری صاحب ہی ہماری سرکار ہیں۔'' وہ اسی طرح خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

''لعنت ہے ایسی تھانیداری پر۔'' میں نفرت بھرے لہجے میں بولا۔'' کہ تم چند ٹکوں کی خاطر ایک بے گناہ پر اتنے ظلم ڈھا رہے ہو۔''

''کون بے گناہ۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔'' قانون اندھا ہوتا ہے فوجی صاحب۔ تمھارے خلاف تین کیس درج کرائے جا چکے ہیں اور ان کی تحقیقات کرنا ہمارا فرض ہے۔ تم گناہ گار ہو یا بے گناہ اس کا فیصلہ کرنا تو عدالت کا کام ہے۔ ہمارا کام ہے تفتیش کرنا اور ملزم سے باز پُرس کرنا، وہی ہم کر رہے ہیں۔''

''مگر ابھی تک آپ لوگوں نے صرف مجھے ٹارچر ہی کیا ہے باز پُرس تو کچھ نہیں کی۔ جبکہ آپ کا کام ہے پہلے ملزم سے باز پُرس کرنا اور اس کے بعد جسمانی طور پر ٹارچر کرنا۔ اگر وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے تو؟''

''ہا......ہا......ہا۔'' تھانیدار نے اپنی مکروہ آواز میں قہقہہ لگایا۔'' اب تم ہمیں تفتیش کے طریقے سکھاؤ گے۔''

''تھانیدار صاحب یہ ہر ملزم کا حق ہے کہ اسے اس جرم کے بارے بتایا جائے جس کی پاداش میں وہ حراست میں لیا گیا ہو۔''

''وہ بھی بتا دیں گے سرکار جلدی کس بات کی ہے۔'' تھانیدار مزاحیہ لہجے میں بولا۔

''آپ لوگ گپ شپ کریں میں صبح آؤں گا۔'' چودھری اکبر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔''اس وقت تک آپ اسے بھی لائن پر لے آئیں۔ کم از کم اس کی بولتی ہی بند ہو جائے اس نے تو ہمارا احتساب شروع کر دیا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں چودھری صاحب۔'' تھانیدار نے اسے تسلی دی۔''اس کی بولتی تو میں اس طرح بند کروں گا کہ دنیا دیکھے گی'' اور چودھری اکبر سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد پولیس والوں نے صبح تک مجھ پر جو ظلم ڈھائے اور جس قسم کی اذیتیں پہنچائیں اگر وہ لکھی جائیں تو کئی صفحے بھر جائیں گے۔ میں نے پولیس والوں کے ظلم اور بے رحمی کے قصے سنے تھے مگر ان سے واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ اس تشدد کے دوران میں کئی مرتبہ بے ہوش ہوا۔ کئی مرتبہ میری چیخیں بلند ہوئیں، لیکن وہ اس سے لاتعلق اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ سلسلہ کہیں صبح اذانوں کے وقت ختم ہوا۔

عقوبت خانے سے نکال کر انھوں نے مجھے حوالات میں لا پھینکا میرا تمام بدن پھوڑے کی مانند درد کر رہا تھا۔ بھوک پیاس اور نیند کی کمی نے مجھے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ میں کافی دیر اسی طرح غنودگی کی حالت میں پڑا رہا، نہ جانے وہ دن کا کون سا پہر تھا کہ میرے کانوں میں نندر گل کی آواز آئی۔

''عمر جان......عمر جان......عمری، عمری۔''

میں بمشکل سیدھا ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ لو پانی پی لو۔'' اس نے دروازے کی سلاخوں سے ہاتھ اندر کرتے ہوئے میری جانب پانی کا گلاس بڑھایا۔ جسے بے صبری سے جھپٹ کر میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر کے اس کی جانب واپس بڑھا دیا۔

''مہربانی نذر بھائی۔'' میں ممنونیت سے بولا۔

''مجھے بہت افسوس ہے عمر جان کہ میں اس سے زیادہ تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔'' وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ سب بھی میں تھانیدار کی لاعلمی میں کر رہا ہوں۔'' اس مرتبہ اس نے اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز میری طرف بڑھائی۔

میں نے کھول کر دیکھا تو وہ تندوری روٹیاں تھیں۔ جس کے ساتھ دال کا سالن تھا۔ اتنے بڑے حادثے کے بارے میں علم ہونے کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ مجھے بھوک اور پیاس بالکل محسوس نہ ہوتی۔ مگر زندگی بہت پیاری چیز ہے۔ جان بچانے کی جبلت اور انتقام لینے کی خواہش نے میرے اندر بھوک و پیاس کے احساس کو اجاگر کر دیا تھا۔ میں نے نذر گل کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے چند لقموں میں ان روٹیوں کو ختم کر دیا۔

''کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتلاؤ۔'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا مگر اس کے انداز میں واضح طور پر بے چارگی نظر آئی، جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ صرف کہنے کی حد تک مجھ سے میری ضرورت پوچھ رہا تھا۔ اس کو پورا کرنا اس کے بس سے باہر تھا اور جتنا کچھ وہ میرے لیے کر سکتا تھا اس نے کر لیا تھا۔ میں نے بھی اس کو امتحان میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''ویسے ایک بات تو بتلاؤ۔'' میرا سر نفی میں ہلتا دیکھ کر وہ اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''پوچھو۔''

''فوج سے بھاگنے کے بعد تم اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے دوست کبھی وقت ملا تو بتلاؤں گا، ابھی تو تم مجھے گاؤں کے حالات سے آگاہ کرو۔ کیونکہ مجھے بالکل علم نہیں ہے کہ میرے پیچھے گاؤں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔''

''کل سب کچھ تو تمھیں بتا دیا تھا۔'' وہ حیرانی سے بولا۔

''ہنہ کل...... کل مجھے ہوش کہاں تھا۔''

''مکمل تفصیل تو خیر مجھے بھی نہیں معلوم البتہ سنی سنائی باتیں آپ کو بتلا دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے جو کچھ بتلایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ جرگے نے فیصلہ ہمارے حق میں دیا تھا۔ جسے چودھری انور نے بحالت مجبوری تسلیم کر لیا تھا۔ جرگے نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ جب بھی چودھریوں کے مویشیوں نے ہماری فصل کو کوئی نقصان پہنچایا چودھری انور اس نقصان کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

جرگے کے اس فیصلے پر جہاں میرے بھائیوں کو ازحد خوشی ہوئی تھی اسی نسبت سے چودھری خاندان غم و غصے میں ڈوب گیا تھا اور پھر یہ غصہ انھوں نے ایک دن محمد جان بھائی کی پٹائی کر کے نکالا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ چودھریوں کی ایک گائے ہمارے کھیت میں گھسی جسے

ڈنڈا مار کر بھائی محمد جان نے کھیت سے نکال باہر کیا۔ اکبر اور اعظم (چودھری انور کے بیٹے) اس بات کو بنیاد بنا کر محمد جان سے لڑ گئے کہ اسے (محمد جان) کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ ان کی گائے کو مارے کیونکہ فصل کو ہونے والے نقصان کے وہ ذمہ دار تھے۔ شومئی قسمت کہ محمد جان بھائی وہاں پر اکیلا تھا اور وہ دونوں بھائی بمعہ اپنے گرگوں کے موجود تھے۔

محمد جان بھائی جب گرتا پڑتا زخمی حالت میں گھر پہنچا تو ابو جان اور چچا فاضل گھر میں موجود نہیں تھے اگر وہ موجود ہوتے تو شاید اس مسئلے کا کوئی بہتر حل نکال لیتے۔ البتہ بھائی حاکم جان اور احمد جان دونوں گھر پر موجود تھے۔ دونوں نے محمد جان کی حالت دیکھتے ہی ہتھیار نکالے اور وقوعہ کی جانب دوڑ پڑے۔ مخالف بھی آگے سے تیار تھے۔ میرے بھائیوں کو دور سے دیکھتے ہی انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ میرے بھائیوں نے بھی کھیتوں کی منڈیر کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دونوں پارٹیاں چونکہ آڑ میں تھیں اس لیے کسی قسم کے جانی نقصان سے محفوظ رہیں۔ گنڈہ پوروں کے اندر چونکہ اس طرح کی فائرنگ روزمرہ کا معمول ہے اس لیے لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ یہ فائرنگ شاید اس طرح مزید کچھ دیر جاری رہ کر کسی بھی پارٹی کی پسپائی یا ایمونیشن ختم ہونے کی صورت میں بغیر کسی جانی نقصان کے ختم ہو جاتی مگر بد قسمتی سے چودھری انور جو اس فائرنگ کو رکوانے کے لیے آ رہا تھا، کسی اندھی گولی کا شکار ہو گیا۔ گولی اس کو سر میں لگی تھی اس لیے اس کے بچنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ چودھری کے گرتے ہی دونوں طرف فائرنگ بند ہو گئی۔

چودھری انور کے مرنے کے بعد چودھری اکبر بڑا ہونے کے ناطے خود بخود گھر کا سربراہ بن گیا تھا اس نے اپنے باپ کے قتل کی رپورٹ درج کرانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

میرے بھائی بھی اس واقعہ کے بعد سنبھل گئے تھے انھیں پتا تھا کہ چودھری خاندان لازماً اپنے قتل کا بدلہ لینے کی کوشش کرے گا اس لیے وہ ہمیشہ اکٹھے گھر سے نکلتے تھے۔ چودھری انور کو مرے ہوئے بمشکل ڈیڑھ دو مہینے ہوئے تھے کہ ایک رات ہماری حویلی میں آگ بھڑک اٹھی اس سے پہلے کہ لوگ اس سے باخبر ہو کر آگ بجھانے کی تدبیر کرتے آگ اتنی پھیل گئی تھی کہ لوگوں کے لیے اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

لوگوں کی بے خبری کی وجہ بھی یہ تھی کہ ایک تو رات گئے یہ کارروائی ہوئی تھی اور دوسرے سردیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے لوگ منہ سر لپیٹے کمروں میں گھسے ہوئے تھے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میرے گھر والوں نے نہ تو کوئی چیخ و پکار مچائی تھی اور نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ یہ تو جب آگ کے شعلے خوب بلند ہوئے اور تپش اور دھواں پڑوسیوں کے گھروں تک پہنچا تو وہ جاگے اور ہلا گلا کر کے پورے گاؤں کو اکٹھا کر لیا۔ مگر ان کی آگ بجھانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور میرے گھر والوں میں سے سوائے چچا فاضل کے اور کوئی بھی نہ بچایا جا سکا۔ اس کے زندہ بچ جانے کی وجہ بھی یہ تھی کہ وہ ڈیوڑھی میں سویا ہوا تھا۔ البتہ ڈیوڑھی کی چھت کے شہتیر کے اس کی ٹانگوں پر گرنے کی وجہ سے اس کی دونوں ٹانگیں دو تین جگہ سے ٹوٹ گئیں تھیں اور وہ تا حال سول ہسپتال میں داخل تھا اور جسمانی طور پر معذور ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی مفلوج ہو گیا تھا۔ اسی طرح میری اکلوتی بہن جمیلہ بھی صدمے کی شدت میں اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ یہ بات یہیں تک رہتی تو میں شاید کبھی بھی حوالات میں بند نہ ہوتا۔ مگر ایک رات چودھری اکبر کی حویلی میں گھس کر کسی نے اس کے چھوٹے بھائی اعظم کو گولی مار کر

ہلاک کردیا اور عینی شاہدین کے مطابق یہ کام میں نے کیا تھا اس کے بعد کسی نے اس کے کھیتوں کو آگ لگا دی اس کا الزام بھی میرے سر لگا۔ چند دن بعد اس کا (اکبر کا) ماموں اور اکبر کا دوست اس کی بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ میں اکبر پر حملہ کرنے کی غرض سے ان کی بیٹھک میں داخل ہوا اور اسے بچانے کی کوشش میں وہ دونوں ہلاک ہو گئے اور اکبر کے نوکروں کے بروقت پہنچنے پر میں وہاں سے بھاگ گیا۔ تینوں کیس مختلف تواریخ میں میرے خلاف درج تھے اور انھی کی پاداش میں میں تھانے میں بند تھا۔ نذر گل سے یہ باتیں سنتے ہی مجھے اپنے بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔

چودھری اکبر نے بلاشبہ مجھ سے بہت بھیانک انتقام لیا تھا، لیکن اس سارے سیٹ اپ میں اعظم کی موت کہیں فٹ نہیں بیٹھتی تھی شاید وہ چودھری اکبر کے کسی دوسرے دشمن کی کارستانی تھی۔ اسی طرح اس کے ماموں اور دوست کا قتل بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہو سکتا تھا۔ جو شاید خود تو اکبر کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا لیکن اس کے کام کو چودھری اکبر نے میرے خلاف استعمال کر لیا تھا، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ چودھری اکبر نے جس طرح میرے گھر والوں کو ہلاک کیا یا کرایا تھا اسی طرح وہ مجھے بھی بے خبری میں مروا سکتا تھا اسے اتنا لمبا سیٹ اپ ترتیب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے اس بات پر زیادہ سر کھپانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ کیونکہ یہ بات بعد میں خود بخود کھل کر سامنے آنے والی تھی۔ نذر گل یہ تمام باتیں بتا کر چلا گیا تھا میں البتہ مختلف قسم کی سوچوں میں گھرا کافی دیر تک گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔

نذر گل کے کہنے کے مطابق پولیس نے پہلوان ہوٹل اور میرے گاؤں کے مختلف راستوں پر میری تلاش میں مخبر چھوڑ رکھے تھے اور اس دن میرے بس سے اترتے ہی مجھے پہچان لیا گیا تھا۔

گیارہ بارہ بجے کے قریب چودھری اکبر ایک مرتبہ پھر تھانے پہنچ گیا تھا اور اس کے پہنچتے ہی ایک بار پھر مجھے ٹارچ سیل میں پہنچا دیا گیا۔

''کیا حال ہے فوجی صاحب۔'' چودھری اکبر مجھے دیکھتے ہی طنزیہ لہجے میں چہکا۔ مگر میں نے اسے جواب دینے کی بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔

''بھئی واہ طاہر صاحب۔'' وہ تھانیدار کو داد دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو واقعی اس کی بولتی بند کر دی۔''

جواباً تھانیدار قہقہہ لگا کر بولا۔ ''چودھری صاحب اس سے کئی بڑے پھنے خان اور ٹیڑھے خان میں سیدھے کر چکا ہوں یہ غریب تو کسی شمار میں نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تھانیدار صاحب آج اس کے جرائم کا اقرار نامہ لے کر اسے عدالت میں پیش کر دو۔''

''فکر نہ کرو چودھری صاحب یہ کیا......اس کے تو بڑے بھی قبر سے اٹھ کر اپنے کیے کا اقرار کریں گے۔''

''یہ تو ہے۔'' چودھری اکبر ہنس کر بولا۔ ''بہرحال چلو آفس میں بیٹھتے ہیں اس کے لیے یہ کافی ہیں۔'' وہ سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا اور وہ دونوں عقوبت خانے سے نکلتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر مجھے انھی اذیتوں سے گزارا جانے لگا

جن سے میں پہلے بھی گزر چکا تھا۔ یہ اذیتیں ابھی میرے مقدر میں لکھی جا چکی تھیں اوران سے چھٹکارا پانا اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں وہاں سے فرار ہو جاؤں یا پھر مر جاؤں اور میں اول الذکر صورت پر عمل کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔

+ + +

اگلے دن انسپکٹر طاہر نے مجھے عدالت میں پیش کر کے میرا ایک ہفتے کا جسمانی ریمانڈ لے لیا۔ راستے میں اس نے میری فرار کی کوششوں کی مدِنظر رکھتے ہوئے سیکیورٹی کا انتظام بہت سخت رکھا تھا۔ اتنی سخت نگرانی میں مَیں فرار کے بارے سوچ تو سکتا تھا لیکن اس پر عمل کرنا مشکل تھا۔

اس ہفتے کے دوران تھانیدار کی کوشش رہی کہ مجھ سے ان ناکردہ جرموں کا اقرار کرا لے جن کی بابت نذر گل مجھے پہلے سے مطلع کر چکا تھا۔ گو میں وقتی طور پر ان جرائم کا اقرار کر کے عدالت کے سامنے اپنے اس اقراری بیان سے مکر بھی سکتا تھا۔ مگر گندہ پوری خون نے مجھے اس قسم کی کمزوری دکھانے کا موقع نہ دیا۔

نذر گل کی مہربانی سے میری اپنے بہنوئی اسلم جو کہ میرا ماموں زاد بھی تھا سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے سمجھانے اور تسلی دینے پر میں نے اپنی جنگ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک صبر آزما اور مشکل فیصلہ تھا مگر اسلم کے بار بار سمجھانے اور التجائیں کرنے پر میں نے اپنے فرار کا فیصلہ فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ اسلم کے کہنے کے مطابق چودھری اکبر خود ہی اپنے بھائی کا قاتل تھا اور اسی نے اپنے ماموں اور دوست کو بھی ہلاک کیا تھا۔ اپنے بھائی کو جائیداد کے لیے اور باقی دونوں شاید اس کے بھائی کے قتل میں اس کے شریک تھے اس لیے اس نے گواہوں کا بھی قلع قمع کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ مجھے عدالت ان تمام کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا دے اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہا تھا کہ مجھے پھانسی ہونے کی صورت میں وہ خود بخود بے گناہ ٹھہرتا اور میری موت یوں بھی اس کا مطمع نظر تھی۔ اسلم کی مدد سے میں نے اپنے لیے ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں مگر اس سے پہلے کہ مجھے دوبارہ عدالت میں پیش کیا جاتا میری یونٹ والے مجھے لینے کے لیے پہنچ گئے۔ میں حوالات میں سر جھکائے مختلف قسم کی سوچوں میں مشغول تھا کہ نذر گل کی آواز سنائی دی۔

''عمری۔ کچھ فوجی تجھے لینے آئے ہیں۔''

''کیا؟'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''ان کو کیسے پتا چلا کہ میں حوالات میں ہوں۔''

''تمھارے گرفتار ہوتے ہی تمھاری یونٹ کو اس بارے سگنل دے دیا گیا تھا۔''

''کتنے آدمی ہیں۔'' میں مستفسر ہوا۔

''پانچ۔'' الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ بہت سارے قدموں کی آواز مجھے اس کمرے کی طرف آتی سنائی دی۔

میں نے یونٹ میں بہت کم وقت گزارا تھا اس لیے ان میں سے چار بندے میرے لیے بالکل اجنبی تھے البتہ پانچویں بندے کو

دیکھ کر میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے تھا۔ ہمیشہ ہنسنے مسکرانے والا امجد اس وقت نہایت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

انسپکٹر طاہر ان کے ساتھ تھا......ایک سپاہی نے حوالات کا دروازہ کھولا سب سے پہلے نائب صوبیدار کا رینک لگائے ہوئے شخص نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''نائب صوبیدار صبر عباس۔''

''سر میں آپ کو ویلکم کہنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہوں، لیکن پھر بھی......آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''میں پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''مجھے آپ کے گھر والوں کے بارے سن کر افسوس ہوا۔''یہ کہہ کر اس نے ایک طرف ہو کر اپنے ساتھ آنے والوں کو میرے قریب پہنچنے کا رستا دیا۔امجد سب سے آخر میں مجھے ملا۔دیر تک اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچے رکھنے کے بعد وہ گلوگیر آواز میں بولا۔''جانو......ہم بدلہ لیں گے۔مگر وقت آنے پر۔''

امجد سے ملاقات میرے لیے بہت زیادہ تقویت کا باعث بنی تھی۔

''صوبیدار صاحب ہمارا قیدی کب تک واپس کر دیا جائے گا؟''انسپکٹر طاہر نائب صوبیدار صبر عباس سے مستفسر ہوا۔اس کے منحوس چہرے پر مجھے پھٹکار برستی نظر آئی۔

''کچھ یقینی نہیں کہہ سکتا۔''سانولی رنگت ہلکے گھنگریالے بال پُرکشش چہرے اور سمارٹ باڈی والا نائب صوبیدار دھیمے لہجے میں بولا۔''اس کا انحصار ہمارے کمانڈنگ آفیسر پر ہے کہ وہ اس کو کتنا عرصہ اپنے پاس رکھتا ہے۔''

ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں فوجیوں کی نگرانی میں تھانے سے باہر نکل آیا۔

باہر ایک فوجی جیپ موجود تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک فوجی ڈرائیور پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔وہ شاید انھوں نے جیپ کی نگرانی کے لیے چھوڑا تھا۔

''آپ گلگت سے اسی جیپ میں آئے ہیں؟''میں امجد سے مستفسر ہوا۔

''گلگت نہیں''دومیل''کہو۔''وہ ہمارے بٹالین ہیڈ کوارٹر کا نام لیتا ہوا بولا۔

''چھٹی کاٹ لی ہے یا۔''

''کدھر یار......ابھی پچھلے ہفتے بمشکل راستے کھلے ہیں۔بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچنے پر آپ کی گرفتاری کے بارے معلوم ہوا۔آپ کے علاقے کا کوئی بندہ بھی یونٹ میں موجود نہیں تھا اس لیے رہبر کے طور پر میں ان کے ساتھ آ گیا ہوں۔یوں بھی چھٹی جانے سے پہلے میں نے آپ کے......سوری آپ سے ملنے کے لیے آنا تھا۔''وہ میرے گھر والوں کا ذکر کرتے کرتے رہ گیا تھا، واقعی مرنے والوں کو بھلانا مشکل ہو جاتا ہے۔

''بہر حال تم سناؤ......اتنا عرصہ کہاں غائب رہے۔''

''میں......''میں سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولا۔''میں انڈیا کی سرحد پار کر گیا تھا اور ابھی بمشکل ہفتہ ہوا ہے کہ واپس پہنچا ہوں۔''

''انڈیا کی سرحد؟'' وہ حیرانی سے بولا۔''وہ کیسے؟''

''بس یار میری قسمت میں گھر والوں سے ملنا نہیں لکھا ہوا تھا۔انڈیا کی حدود میں داخل ہونا ایک بہانہ بن گیا۔''

''پھر بھی اتنے ہفتے؟'' وہ مستفسر رہا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے یار...... پھر کبھی سہی۔''

''ابھی کیوں نہیں۔ہم نے بٹالین ہیڈ کوارٹر تک اسی جیپ میں سفر کرنا ہے اور اتنا لمبا سفر کیسے کٹے گا۔''

''عمر جان ہم آپ کے فرار کے محرکات سے تو امجد کی زبانی واقف ہو چکے ہیں البتہ اس کے بعد کیا ہوا اس کے بارے جاننے کے لیے ہم بے چین ہیں اگر محسوس نہ کرو تو یہ کہانی سننا ہم بھی پسند کریں گے۔'' نائب صوبیدار صبر عباس پُر اشتیاق لہجے میں بولا۔

ان کا اصرار دیکھتے ہوئے میں نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر دھیرے دھیرے ٹاپ تھری پر خط ملنے کے بعد کے واقعات دہرانے شروع کر دیے۔اس وقت میں شیش ناگ کے ساتھ ہونے والی لڑائی کی تفصیلات کے بارے بتلا رہا تھا جس وقت ڈرائیور نے گاڑی ایک ہوٹل کے صحن میں موڑی۔

''میرا خیال ہے سر کھانا کھا لیتے ہیں۔'' گاڑی روک کر ڈرائیور نائب صوبیدار صبر عباس سے مستفسر ہوا۔

''بالکل بالکل۔'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔''دن کا کھانا بھی رہ گیا ہے۔عمر جان باقی کہانی بعد میں۔''

ہم سب ہوٹل کے صحن میں پڑی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ہوٹل کا مالک ہمیں دیکھ کر خود ہی آرڈر لینے بھاگا ہوا پہنچا اور اس کی وجہ صرف خاکی وردی کی تعظیم تھی۔یہ وہ دور تھا جب عوام فوج کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔آج بے شک حالات نے عوام اور آرمی کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب آرمی نفرت کی اس خلیج کو پاٹ کر پھر عوام کی نظر میں اتنی ہی معتبر قابل احترام اور پیاری ہو جائے گی جتنی 65 یا 1971ء کی جنگ کے وقت یا 2000ء سے پہلے پہلے تھی۔کھانے کے دوران خاموشی چھائی رہی۔امجد نے ایک دو نوالے لے کر کھانا چھوڑ دیا تھا اور اس کی وجہ لازماً وہ دکھ تھا جو اسے میرے خاندان والوں کے مرنے پر ہوا تھا۔

میں نے کافی دنوں سے کوئی ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا تھا،اسی وجہ سے میں اپنے آپ کو جسمانی طور پر بھی کمزور سا پا رہا تھا۔گو میرے لیے بھی اپنے گھر والوں کے بچھڑنے کا دکھ کوئی پرانا نہیں تھا۔ہفتہ بھر پہلے ہی میں اس بات سے مطلع ہوا تھا لیکن حیران کن طور پر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔

کھانا کھا کر ہم دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔

''چل بھئی...... عمر جان۔'' نائب صوبیدار صبر عباس جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی بولا۔''ہم تمھاری باقی ماندہ کہانی سننے کے لیے بے چین ہیں۔'' اور میں نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں پہ ختم کیا تھا اور اس کے بعد کہانی کے اختتام تک جیپ میں صرف میری آواز گونجتی رہی۔

اس وقت ہماری جیپ ایبٹ آباد میں داخل ہورہی تھی جب میں نے اپنی کہانی ختم کی۔ وہ رات ہم نے ایف ایف سنٹر میں بسر کی اور اگلے دن صبح سویرے دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ راستے میں زیادہ تر میں اور امجد محو گفتگو رہے۔

اس اگلی صبح جگلوٹ میں طلوع ہوئی، لیکن ہم وہاں صرف ناشتا کرنے کے لیے رکے اور پھر استور کی طرف روانہ ہوگئے جہاں ہماری یونٹ کا ریئر ہیڈ کوارٹر تھا۔ ایک دن استور میں گزار کر ہم بٹالین ہیڈ کوارٹر روانہ ہوگئے۔ وہاں سے بٹالین ہیڈ کوارٹر ایک دن کے فاصلے پر تھا بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے اگلے ہی دن مجھے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیش کردیا گیا تھا۔

''عمر جان!'' میرے دفتر میں داخل ہوتے ہی ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کمانڈنگ آفیسر افضل محمود خان صاحب گویا ہوا۔ ''مجھے آپ کے گھر والوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ یہ آپ کی نظر میں شاید آپ کے کسی دشمن کی کارروائی ہو۔ بہر حال اس سلسلے میں اگر میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو آپ بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔''

''شکریہ سر۔ اگر میں نے کوئی ضرورت محسوس کی تو سب سے پہلے آپ کو ہی زحمت دوں گا۔''

''یہ تو تھی پرائیویٹ گفتگو اب آتے ہیں سرکاری بات کی جانب۔ تم نے فارورڈ پوسٹ سے بھگوڑا ہو کر جو بیوقوفی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دینی مشکل ہے۔ ایک کمانڈو سے مجھے اس کام کی توقع نہیں تھی۔ کمانڈر نے مجھے تمھارا کورٹ مارشل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن میں اپنے اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے اتنا کرسکتا ہوں کہ تمھیں تمھاری موجودہ سروس کے حقوق دے کر گھر بھیج دوں اور یہ سب بھی میں تمھاری گھریلو پریشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کررہا ہوں اور جہاں تک تعلق ہے تمھارے قتل کے مقدمات اس سلسلے میں میں آپ کی مالی مدد کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتا۔'' اس نے ایک لمحے خاموش ہو کر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر کہا ''تمھیں کچھ کہنا ہے۔''

''جی سر...... صرف اتنا کہ جن حالات نے مجھے ٹاپ تھری سے بھگوڑا ہونے پر مجبور کیا۔ وہ حالات آپ کے سامنے ہیں میرے تمام گھر والے گھر کے اندر محبوس کر کے جلا دیئے گئے۔''

''ٹھیک...... مگر یہ واقعہ تمھارے بھگوڑا ہونے کے بعد پیش آیا۔''

''سر اپنے کمینے دشمنوں سے میں پہلے واقف تھا اور ان سے مجھے توقع بھی یہی تھی۔ مگر افسوس کہ میں ٹائم پر گھر نہ پہنچ سکا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا...... اور ''کچھ کیا تم نوکری پر بحال ہونا چاہتے ہو؟''

''نو سر...... یہ تو ویسے ہی میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ کو اپنے حالات سے مطلع کردوں۔ میں بھگوڑا ہونے میں حق بجانب تھا اگر اس وقت میں وائرلیس پر آپ کو اپنے مسئلے سے آگاہ کرتا تو آپ میرے لیے کبھی بھی دس جوانوں کو داؤ پر نہ لگاتے۔ راستے بند تھے اور میری پوسٹ پر ہیلی کا اترنا ناممکن تھا۔ اس طرح آپ مجھے اکیلا جانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر میرے لیے آخری صورت یہی بچتی تھی جو کہ میں نے کیا۔''

''یہ بھی مان لیا جوان۔'' وہ اپنے ہاتھ میں موجود پین کو پین ہولڈر میں رکھتا ہوا بولا۔ ''مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم بے گناہ ہو، تمھاری

ساری کہانی گزشتہ رات نائب صوبیدار صبر عباس میرے گوش گزار کر چکا ہے، لیکن افسوس کہ عدالت ثبوت مانگتی ہے۔ اگر ایک کرنل کی گواہی تمھاری جان چھڑا سکتی تو میں ضرور بالضرور عدالت کے رُوبرو حاضر ہو کر تمھارے حق میں گواہی دیتا۔"

"تھینک یو سر۔" میں ممنونیت سے بولا۔ "میرے لیے آپ کی اتنی حوصلہ افزائی کافی ہے۔"

"اٹس او کے۔" وہ ایک مرتبہ پھر پین ہاتھ میں پکڑ کر میرے ڈاکومینٹس پر جھکتا ہوا بولا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں جا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ کھڑے عہدے دار نے مجھے ہوشیار (ہوشیار، فوج میں سینئر کو تعظیم دینے کی ایک اصطلاح ہے) کرایا اور پیچھے پھر کرا کے باہر جانے کا حکم دیا۔

"اور آخری بات۔" اس سے پہلے کہ میں دفتر سے باہر نکلتا۔ کرنل صاحب کی پاٹ دار آواز گونجی اور میں بے اختیار رک کر اس کی جانب مڑا۔

"اگر وہ کہانی سچ ہے جو تم نے صبر عباس صاحب کو سنائی ہے تو پھر کوشش کر کے اس لڑکی سے وہ سارے اخبار منگوالو جن کے اندر تمھارے بارے اشتہارات چھپتے رہے ہیں۔" (لڑکی سے کرنل صاحب کی مراد شیتل تھی۔)

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کرنل صاحب حقیقتاً دور کی کوڑی لایا تھا۔ وہ اخبارات میری بے گناہی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

"بہت بہت شکریہ سر۔" میں نے ایک مرتبہ دوبارہ کرنل صاحب کو سیلیوٹ کیا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔ تین دن بٹالین ہیڈکوارٹر میں گزار کر چوتھے دن ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ بھی امجد ساتھ تھا۔ چھٹی کا سٹرٹیفکیٹ امجد نے وہیں سے لے لیا تھا۔

راولپنڈی پہنچ کر میں نے صبر عباس صاحب سے کہا۔ "سر اگر اجازت ہو تو ایک فون کر لوں؟"

"کرلو۔" وہ دھیمی آواز میں بولا اور پھر ڈرائیور سے کہا۔ "جیسے ہی کوئی PCO نظر آتا ہے گاڑی روک لینا۔"

"اس کے لیے شہر کے اندر جانا پڑے گا سر۔" ڈرائیور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"کوئی بات نہیں چلے جاؤ۔" اور ڈرائیور نے گاڑی پنڈی شہر کے اندرونی جانب موڑ دی اور ایک بڑے سے PCO کے قریب پہنچ کر اس نے گاڑی کو روک دیا۔

امجد اور صبر عباس صاحب میرے ساتھ PCO کے اندر کی جانب بڑھ گئے جبکہ باقی تمام گاڑی میں بیٹھے رہے۔ میں نے شیتل کے گھر کا نمبر PCO والے کو بتا کر کہا۔ "یہ دہلی کا نمبر ہے، کوڈ وغیرہ خود ہی لگاتے رہو۔"

"انڈیا والا دہلی۔" وہ مستفسر ہوا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جیسے ہی ٹون جانے لگی اس نے ریسور مجھے پکڑا دیا۔ تھوڑی دیر گھنٹی بجتے رہنے کے بعد کسی نے فون اٹھایا۔ "ہیلو" ایک عورت کی آواز فون سے ابھری۔

"جی شیتل سے بات کرنی تھی۔" میں جلدی سے بولا۔

"بی بی جی تو دفتر میں ہوں گی آپ وہیں فون کر لیں۔"

''دفتر کا نمبر؟'' میں نے PCO والے کا رائٹنگ پیڈ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے دفتر کا نمبر دہرا کر فون بند کر دیا۔

''بھائی یہ نمبر ملا دیں۔'' میں پیڈ اس کی طرف واپس بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ بھی دہلی کا ہی ہے نا؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''جی۔'' میں مختصراً بولا اور وہ ایک مرتبہ پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''یہ لیں...... گھنٹی جا رہی ہے۔'' اس نے ریسور میری جانب بڑھایا۔

''داس سٹیل ملز......''

''مس مجھے شیتل ہری چرن داس سے بات کرنی ہے۔'' ریسور سے ابھرتی نسوانی آواز فون آپریٹر کی تھی اس کا تعارفی خطبہ پورا ہونے سے پہلے میں نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''جی سر...... بات کریں۔'' اس کے لہجے میں میرے قطع کلامی کے باعث ہلکی سی ناراض تھی ہلکی سی ٹون بجنے کے بعد ریسور میں شیتل کی مسحور کن آواز گونجی، گو میں پہلی مرتبہ فون پر اس کی آواز سن رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اسے پہچاننے میں دقت محسوس نہ ہوئی۔

''شیتل سپیکنگ۔''

''شیتل میں عمر جان بات کر رہا ہوں۔''

''جان...... تم...... کیسے ہو۔'' وہ پُر جوش لہجے میں چلائی۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ سنائیں۔''

''میں کیا سناؤں...... بمبئی سے واپسی پر پتا جی نے ریگولرلی آفس میں بٹھانا شروع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ کیا پتا کب بلاوا آ جائے میرے بعد تم نے ہی تو سب کچھ سنبھالنا ہے۔''

''یہ تو وہ ٹھیک کہتے ہیں...... بہر حال تم میرا ایک کام کرو۔''

''وہ تو میں کر لوں گی۔ پر تم اپنی سناؤ۔ انکل آنٹی کیسے ہیں...... عدنان تو آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوگا...... ویدی کیسی ہیں؟''

''شیتل سارے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' میں گلوگیر آواز میں بولا۔ ''مجھے بھی قتل کے کئی جھوٹے مقدمات کا سامنا ہے۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے مجھے وہ اخبارات پارسل کر دو جن کے اندر میری بابت کچھ چھپا ہو۔ تا کہ میں اپنے مقدمے کی پیروی کر سکوں۔''

''چھوڑ کر چلے گئے؟ میں سمجھی نہیں۔''

''حویلی کو آگ لگنے کی وجہ سے تمام۔'' میں کوشش کے باوجود اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا، لیکن اس نامکمل فقرے سے بھی شیتل کو میری بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

''اوہ......نو۔''شیتل کے ہونٹوں سے فقط اتنا ہی نکلا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

مجھے پتا تھا کہ ہر حساس آدمی کے لیے یہ خبر شاک کا باعث بن سکتی تھی اور شیتل بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

''مجھے پتا ہے آپ کو یہ سب سن کر دکھ پہنچا ہے۔ میں بھی گاؤں میں داخل ہوتے ہی گرفتار ہو گیا تھا اس لیے پہلے آپ کو مطلع نہ کر سکا......بہر حال جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب جانے والوں کے لیے جتنے دکھ اور غم کا اظہار کیا جائے وہ واپس آنے والے نہیں۔''

''مم......مجھے......ریئلی یہ سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔''وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔''کیا میں آ جاؤں......اگر عدالت میں میری ضرورت......''

''نو......نو شیتل۔ تم بس اس پتے پر وہ تمام اخبارات پارسل کر دو جن میں میرے بارے کچھ چھپا ہو۔''یہ کہہ کر میں نے اسے امجد کے گھر کا پتا نوٹ کرا دیا۔

''میں آج ہی یہ سب کچھ کر لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی کام ہو۔ یا رقم وغیرہ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ سکتے ہو۔''

''تھینک یو......شیتل۔ اگر ضرورت پڑی تو سب سے پہلے تمھیں ہی بتاؤں گا۔''

''یہ ایڈریس غالباً آپ کے اسی دوست کا جس کا ذکر آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کیا تھا۔''

''ہاں......یہ اسی کا ہے۔''میں مختصراً بولا۔

''او کے جان......فون کرتے رہنا......یا آپ کا کوئی رابطہ نمبر ہو تو مجھے لکھوا دو میں فون کر لیا کروں گی۔''

''نہیں میرے پاس اس طرح کی کوئی سہولت موجود نہیں ہے۔ میں انشاءاللہ خود ہی رابطہ کر لیا کروں گا۔ ابھی خدا حافظ۔''میں نے الوداعی کلمات کہے اور فون بند کر دیا۔

امجد نے میرے بتائے بغیر ایک بڑا نوٹ نکال کر PCO والے کی طرف بڑھا دیا۔

فون کے چارجز کاٹ کر اس نے بقایا ریز گاری امجد کی طرف بڑھائی اور ہم PCO سے باہر نکل آئے۔ وہ رات ہم نے پنڈی میں ہی ایک آرمی کی یونٹ میں گزاری اور صبح سویرے رحمٰن خیل کی طرف چل پڑے۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے ہم رحمٰن خیل تھانے پہنچ گئے۔ پولیس کے حوالے کرنے کے بعد باقی تمام تو رخصت ہو گئے اور البتہ امجد وہیں ٹکا رہا۔

نذر گل کو بھیج کر میں نے ماموں زاد اسلم کو وہیں بلوا لیا۔ پولیس والے امجد کی وجہ سے خاموش رہے۔

امجد کو دو ماہ کی چھٹی ملی تھی۔ اس کے ساتھ طے ہوا کہ وہ رات اسلم بھائی کے پاس گزار کر صبح گھر چلا جائے گا اور جونہی شیتل کا بھیجا ہوا پارسل اسے ملے گا وہ واپس آ جائے گا۔

مستقبل کی منصوبہ بندی کے بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ وہ رات تھانے میں امن سے ہی گزری۔ اگلے دن انسپکٹر طاہر ایک

مرتبہ پھر مجھے عدالت پیشی کے لیے لے گیا۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے مجھے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ جس کو میں نے سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ اس کے بعد میرے وکیل نے میری درخواست ضمانت دائر کر دی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی۔ اس لیے میرا وکیل میری ضمانت کروانے میں ناکام رہا تھا۔ جج نے باقاعدہ کارروائی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

عدالت کے برآمدے میں میرے وکیل عبدالکریم خان ایڈوکیٹ نے میرے ساتھ الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''عمر جان صاحب پریشان نہیں ہونا اگلی پیشی پر انشاء اللہ آپ کی ضمانت کرانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ صرف دو ہفتے کی تو بات ہے۔ ویسے بھی میں نے آپ کا کیس اچھی طرح سٹڈی کر لیا ہے...... اللہ خیر کرے گا۔'' اپنے وکیل کے لہجے سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ مجھے طفل تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ورنہ استغاثہ کا کیس خاصا مضبوط تھا۔ بہرحال میں نے بھی اس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور سر ہلا کر پولیس والے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ مجھے شیتل کے پارسل کا انتظار تھا مجھے یقین تھا کہ وہ اخبارات میری بیگناہی ثابت کرنے کے لیے مین رول ادا کریں گے۔ اس سلسلے میں مَیں نے ابھی تک اپنے وکیل کو بھی اعتماد میں نہیں لیا تھا۔

اس کے بعد امجد کے انتظار میں دن گننے لگا۔ پولیس والوں کا رویہ میرے ساتھ اسی طرح نفرت انگیز تھا اور اس میں سارا ہاتھ چودھری اکبر کا تھا۔ وہ بھی وقتاً فوقتاً مجھے چڑانے کے لیے تھانے آ دھمکتا تھا۔ اس کے طعنوں اور طنزیہ باتوں کا جواب میں عموماً خاموش رہ کر ہی دیتا تھا۔ میری خاموشی کو بزدلی پر محمول کرتے ہوئے اکثر وہ سودے بازی پر بھی اتر آتا تھا۔ کہتا تھا۔

''اگر تمام جائیداد اور زمین میرے نام لکھنے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری جان ان سلاخوں سے چھڑا سکتا ہوں۔ تم کسی دوسرے ملک فرار ہو کر باقی ماندہ زندگی آرام سے گزار سکتے ہو۔''

اس کی یہ باتیں مجھے سلگانے اور جلانے کے لیے کافی تھیں، لیکن میں سنی اَن سنی کر کے اپنی توجہ دائیں بائیں مبذول کرنے کی کوشش کرتا اور وہ قہقہے لگاتے رخصت ہو جاتا۔

امجد کو گھر گئے نواں دن تھا۔ چھ دن بعد میرے کیس کی باقاعدہ سماعت تھی میں دوپہر کے ٹائم اسلم بھائی کا گھر سے لایا ہوا آلو گوشت کھانے میں مشغول تھا کہ حوالات کے باہر تیز تیز قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور کھل اٹھا، امجد کا وجیہہ چہرہ میرے سامنے تھا۔

''اسلام علیکم؟...... جانو کیسے ہو؟''

''وعلیکم السلام!...... اپنی سناؤ۔ انکل آنٹی کیسے ہیں۔''

''سب ٹھیک ٹھاک ہیں یار...... شیتل کا بھیجا ہوا پارسل پہنچ گیا ہے۔ تو نے تو بڑی تباہی پھیلائی ہے انڈیا میں...... اس کا مطلب ہے تجھ میں ٹھیک ٹھاک جاسوس بننے کے جراثیم موجود ہیں۔ دہشت گرد تو تُو پہلے سے تھا۔''

''میں اپنی کہانی تفصیل سے تجھے سنا چکا ہوں اور اس عرصے کے دوران مجھ سے جو قتل ہوئے ہیں وہ بھی نادانستگی یا مجبوری کی حالت میں ہوئے ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے انڈیا کے اخبارات کا ان کا تو حال وہی ہے جو تم روزانہ انڈیا کی خبروں میں سنتے ہو جھوٹ اور

پروپیگنڈا۔ ہر اخبار نے بڑھ چڑھ کر میرے کارنامے بیان کیے ہیں تا کہ کوئی دوسرا اخبار اس سے سبقت نہ لے جائے۔''

''بہر حال اب میرے لیے کیا حکم ہے کمانڈو صاحب۔'' وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ میرے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے اس شوخ و شنگ ہر دم قہقہے لگانے والے نوجوان کو بجھا سا دیا تھا، لیکن مجھے امید تھی کہ جلد ہی اپنی جون میں واپس آ کر وہ پھر وہی پرانے والا امجد بن جائے گا جس کے قہقہے مجھے زندگی کی نوید سناتے تھے۔

''اخبارات کا بنڈل کہاں رکھ چھوڑا ہے۔''

''وہ اسلم بھائی کے حوالے کر دیئے ہیں۔''

''اچھا پھر اس طرح ہے کہ ابھی جا کر آرام کرو۔ کل صبح وکیل سے مل کر یہ اخبارات وغیرہ اسے دکھا دینا، خاص کر 5 دسمبر، 7 دسمبر اور 22 دسمبر کی تاریخیں یاد رکھنا کیونکہ مجھ پر لگنے والے الزام انھی تاریخوں کے ہیں۔''

''چلا جاؤں گا یار۔'' وہ حوالات کے آگے پلتھی مار کر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''کچھ گپ شپ تو کر لیں۔''

''گپ شپ کے لیے کس نے چھوڑنا ہے۔'' میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

''فکر نہ کرو...... تھانیدار کہیں گیا ہوا ہے اور تھانے میں حاضر سینئر کو میں ہڈی ڈال آیا ہوں۔''

''چلو پھر صحیح ہے۔'' میں بھی حوالات کے اندر اسی والی پوزیشن بناتا ہوا بولا۔ ہم اس وقت تک محو گفتگو رہے جب تک ایک سپاہی نے آ کر تھانیدار کے واپس پہنچنے کی اطلاع نہ دی۔

''او کے پھر میں چلتا ہوں۔'' امجد کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''صبح انشاء اللہ ملاقات ہو گی''۔ اور میں نے فقط سر ہلانے پر اکتفا تھا۔

+ + +

اگلے دن امجد وکیل کو ساتھ لے کر ہی پہنچا۔ رسمی گفتگو سے فارغ ہوتے ہی وکیل عبدالکریم خان ایڈووکیٹ پُر جوش لہجے میں بولا۔

''مسٹر عمر جان...... مبارک ہو اس دستاویزی ثبوت کی روشنی میں تمھاری بے گناہی کو کسی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے مجھے پہلے ان اخبارات کے متعلق کیوں نہیں بتایا۔''

''دراصل یہ اس وقت تک ہمارے پاس موجود ہی نہیں تھے۔ کل ہی امجد لے کر آیا ہے، اسی لیے آپ کو بلوایا ہے۔''

''اب اگر ہم تھوڑا سا ورک آؤٹ کریں تو قتل کے اصل مجرم کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔'' عبدالکریم مجھے خوشخبری سناتا ہوا بولا۔

''وہ کیسے؟''...... امجد مستفسر ہوا۔

''مجھے ایک بندہ چاہئے ہو گا۔ جو چند آؤٹ ڈور سرگرمیاں سرانجام دے سکے۔''

''غلام حاضر ہے۔'' امجد جلدی سے بولا۔

''گڈ۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''عمر جان صاحب اب میں اجازت چاہوں گا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس دفعہ ہم پیشی پر مکمل

تیاری سے پیش ہوں اور امجد صاحب۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔'' وہ دونوں مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد اگلی پیشی تک امجد صبح مجھ سے سرسری طور پر ملنے کے لیے آتا اور پھر سارا دن وکیل عبدالکریم خان کے ساتھ مشغول رہتا۔

اس پیشی پر سب سے پہلے استغاثہ کے گواہوں کے بیان ہوئے۔ استغاثہ کی جانب سے کل 15 گواہ پیش ہوئے تھے جن میں آٹھ گواہ تو اعظم اس کے ماموں اور اکبر کے دوست کے قتل کے مشترکہ گواہ تھے۔ پانچ وہ تھے جنھوں نے مجھے فصل کو آگ لگاتے دیکھا تھا، صرف دو گواہ ایسے تھے جو وقوعہ کے وقت قریب ہی موجود تھے البتہ انھوں نے میری شکل نہیں دیکھی تھی۔

سب سے پہلے گواہی دینے کے لیے چودھری اکبر کا منشی وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوا۔ سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے چودھری اعظم کی موت کا نقشہ بڑے دردناک انداز میں کھینچا اور قاتل کے طور پر بڑے وثوق سے میری شناخت کی۔

وکیل استغاثہ کٹہرے کے پاس پہنچا اور بڑے ہموار لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ نواز صاحب آپ کو یقین ہے کہ چودھری اعظم صاحب کا قتل ملزم ہی نے کیا ہے۔''

وہ اعتماد سے بولا۔ ''یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی اس شخص نے کئی افراد کی موجودگی میں یہ گھناؤنا کام کیا ہے میرے علاوہ اور کئی افراد بھی ادھر موقع پر موجود تھے۔''

میں خاموش کھڑا اپنے خلاف ہونے والی یہ زہر بیانی سن رہا تھا۔ یوں بھی عدالتی کارروائی کے دوران میں سب سے زیادہ کسمپرسی کی حالت میں بے چارہ ملزم ہوتا ہے۔ گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح وہ تحمل اور صبر سے سنتا ہے کسی بھی موقع پر اسے بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

وکیل استغاثہ نے مزید دو چار غیر اہم اور غیر متعلقہ سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

اپنی باری میں میرا وکیل بڑے پُراعتماد انداز میں گواہ کے قریب پہنچا۔

''شاہ نواز صاحب کیا میں آپ کو شاہ صاحب کہہ کر پکار سکتا ہوں۔'' عبدالکریم اپنی جرح کا آغاز کرتا ہوا بولا۔

''جی۔'' وہ مختصراً بولا۔

''تو شاہ صاحب آپ ایک مرتبہ دوبارہ میرے مؤکل کو غور سے دیکھ کر بتائیں کہ آیا چودھری اعظم صاحب کے اوپر گولی چلاتے ہوئے اسے آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''جی وکیل صاحب۔'' اس کا جواب پہلے کی طرح مختصر تھا۔

''اس وقت اس نے کس قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ میرا مطلب رنگ اور ڈیزائن سے ہے۔''

میرے وکیل نے اپنی جرح آگے بڑھائی۔

''سفید شلوار قمیض میں تھا۔'' وہ ایک لمحے کچھ سوچ کر بولا۔

''چودھری اعظم صاحب کے اوپر اس نے کس ہتھیار سے فائر کیا تھا۔'' وکیل صفائی بہت عام سے لہجے میں بڑے خاص سوالات پوچھ رہا تھا۔اس مرتبہ منشی گڑبڑا گیا۔

''ر......رے......رائفل تھی جناب۔''

''ساخت آپ بتا سکتے ہیں۔''

منشی کا جواب نفی میں تھا۔اس کے بعد ایک دو مزید سوالات پوچھ کر وکیل صفائی عبدالکریم صاحب نے اپنی جرح ختم کر دی۔اس دن عدالتی کارروائی گواہوں کے بیانات اور ان کے اوپر جرح پر مشتمل رہی۔مجموعی طور پر وکیل صفائی نے گواہوں کے اس بیان کے تضاد کو اجاگر کیا جو انھوں نے میرے ہتھیار کے بارے میں دیا تھا۔ابھی تک وکیل صفائی نے شیتل کے بھیجے ہوئے اخبار عدالت کے سامنے پیش نہیں کیے تھے۔اس پیشی پر بھی میری ضمانت نہ ہو سکی۔عدالت نے آئندہ پیشی کے لیے ایک ہفتے بعد کا ٹائم دیا اور یہ سب بھی عبدالکریم نے اپنے تعلقات کی بدولت کرایا تھا۔عبدالکریم کی کوشش تھی کہ میری رہائی کے ساتھ ساتھ اکبر کے گرد بھی گھیرا تنگ کیا جائے۔امجد نے وہ ہفتہ بھی رحمٰن خیل میں گزارنا پسند کیا تھا۔

''میں نے دو ماہ چھٹی اسی لیے تو لی تھی۔'' مجھ سے گھر واپس جانے کا سن کر وہ مجھے مطمئن کراتے ہوئے بولا تھا۔

+ + +

منظر اسی عدالت کے کمرے کا تھا۔وکیل صفائی نے جج سے اجازت لے کر ڈرامائی انداز میں میری کہانی شروع کی مختصراً جامع انداز میں میری کہانی عدالت کے سامنے بیان کرتے ہوئے وہ میرے انڈیا سے واپس آنے کی تاریخ تک پہنچا جو کہ 10 جنوری تھی۔

اس دوران استغاثہ کا وکیل بڑے طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا،لیکن اس وقت اس کی طنزیہ مسکراہٹ کافور ہو گئی جب ثبوت کے طور پر عبدالکریم نے انڈیا سے آئے ہوئے چیدہ چیدہ اخبارات جج کے سامنے رکھے اور بولا۔

''جج صاحب۔'' شاید آپ کو اور معزز سامعین کو میری سنائی ہوئی کہانی فقط ایک دلچسپ قصہ لگے آپ ان اخبارات کو ملاحظہ کریں جو میرے مؤکل کی بیگناہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔میں نے عدالت کے قیمتی وقت کا خیال رکھتے ہوئے صرف ان تاریخوں کے اخبار معزز عدالت کو پیش کیے ہیں جن تاریخوں میں مدعی کے لواحقین قتل ہوئے ہیں،اگر عدالت چاہے تو فدوی اپنے مؤکل کی صفائی میں اس کے علاوہ بھی درجنوں اخبارات ان مخصوص تاریخوں کے علاوہ ان کی نزدیکی تاریخوں کے پیش کر سکتا ہے۔''

اس دن جج نے میری شخصی ضمانت قبول کرتے ہوئے کیس کا فیصلہ اگلی پیشی تک مؤخر کر دیا اور اس کے ساتھ بقایا اخبارات دیکھنے میں بھی دلچسپی ظاہر کی۔

کمرہ عدالت سے باہر نکلتے ہی فرطِ مسرت سے امجد اور اسلم میرے ساتھ لپٹ گئے تھے۔

''عمر جان صاحب آئندہ پیشی پر آپ باعزت بری ہو جائیں گے۔ان شاءاللہ!'' وکیل صفائی میری پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا۔

''ان شاء اللہ''اسلم اور امجد بیک زبان بولے۔

وکیل صاحب تو ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا اور ہم تینوں رحمٰن خیل کی جانب چل پڑے۔اس مقصد کے لیے ہم نے بس کا انتظار کرنے کی بجائے ٹیکسی ہائر کی تھی۔

''آپ کیا خیال ہے چودھری اکبر کے اس کیس میں پھنسنے کے چانس موجود ہیں۔''اسلم امجد سے مستفسر ہوا۔

''جانو کے کیس کا فیصلہ ہونے دو اکبر کے کیس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔''امجد عجیب سے لہجے میں بولا۔''اس کا بہت سا ادھار چکانا ہے۔''

اسلم بھائی کے گھر کے سامنے اتر کر ہم نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔امجد تو مردانے میں چلا گیا جبکہ میں اسلم کے ساتھ گھر میں گھس گیا۔مجھے دیکھتے ہی ممانی جان روتے ہوئے آگے بڑھیں اور مجھ سے لپٹ گئیں۔حوالات کے اندر میرے منع کرنے کی وجہ سے اسلم انھیں مجھ سے ملانے کے لیے نہیں لایا تھا۔ماموں جان عرصہ ہوا فوت ہو گئے تھے۔اس کی دو بیٹیوں کی شادی حاکم بھائی اور احمد بھائی سے ہوئی تھی اور دونوں بدنصیب اس دن جل کر فوت ہو گئی تھیں اسلم اکیلا ہی اس کی اولاد میں سے بچا تھا۔میری بہن جمیلہ اس حادثے کے بعد بالکل گم صم ہو گئی تھی۔اس وقت بھی وہ چارپائی پر لیٹی خلا میں گھور رہی تھی۔

''بیٹی دیکھو تو سہی کون آیا ہے۔''ممانی جب رونے دھونے سے فارغ ہوئیں تو جمیلہ کو میری طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔مگر جمیلہ کے انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

جمیلہ کو دیکھ کر میرے زخم ایک مرتبہ پھر ہرے ہو گئے تھے۔میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روکا۔اس مقصد کے لیے میں نے اکرم کا سہارا لیا جو میرا اکلوتا بھانجا تھا اور اس وقت اس کی عمر بمشکل پانچ سال تھی۔

میں ممانی جان کے پاس بمشکل تھوڑی دیر ہی بیٹھ پایا تھا کہ گھبرا کر امجد کے پاس چلا آیا بلاشبہ جانے والوں کو بھلانا ناممکن تھا۔قدم قدم پر ان کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ان کے بارے خیالات اور انھی کی سوچیں شاید ہی کبھی مجھے چین سے بیٹھنے دیتیں۔

امجد بیٹھک کی چارپائی پر اپنے خیالات میں گم صم لیٹا ہوا تھا۔میرے پہنچنے کا بھی اس نے کوئی نوٹس نہ لیا اور اسی انداز میں لیٹا رہا۔میں نے بھی ایک خالی چارپائی سنبھالی اور چودھری اکبر کو عبرت ناک سزا دینے کے بارے میں سوچنے لگا۔مگر افسوس کہ میری سوچیں اور میرے خیالات اس کے بارے جتنے بھی نفرت انگیز ہوتے۔میں اس سے اس طرح کا بدلہ نہیں لے سکتا تھا۔جیسا اس نے میرے ساتھ کیا تھا۔

''امجد کل چچا فاضل کے پاس چلیں گے۔''کافی دیر انتقام کے طریقے سوچنے کے بعد میں امجد سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیا......''وہ حیرانی سے مستفسر ہوا۔''وہ کہاں ہیں۔''

''آپ کو بتایا نہیں کسی نے کہ وہ اس حادثے میں بچ جانے والے واحد شخص تھے اور ابھی زخمی حالت میں ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔''

''نہیں یار۔'' امجد کے لہجے میں مجھے خوشی کی جھلک دکھائی دی۔ ''پرائیویٹ ہسپتال میں ہیں۔''

''ہاں...... پہلے تو سرکاری ہسپتال میں تھے۔ میں نے اسلم کو کہہ کر پرائیویٹ ہسپتال میں منتقل کرا دیا تھا۔''

''آپ چچا جان سے ملے ہیں؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''مجھے کہاں موقع ملا ہے۔'' میں افسردہ لہجے میں بولا۔

''چچا جان بچے کس طرح ہیں۔''

''وہ اس دن خوش قسمتی سے ڈیوڑھی میں سوئے تھے اس لیے بچ گئے۔''

''ویسے یار عجیب بات ہے کہ آپ کے بھائیوں میں سے کسی نے بھی آگ کے خلاف مزاحمت نہیں کی۔''

''جب موت کا وقت قریب آجائے نا تو پھر وہ کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑتی۔''

''پھر بھی یار...... جوان آدمی اور اتنے آرام سے موت کو گلے لگا لینا۔''

''اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔'' میں نذر گل اور اسلم کی بتائی ہوئی کہانی کو یاد کرتا ہوا بولا۔ ''اسلم اور نذر گل نے مجھے جو کہانی سنائی تھی اس میں درمیانی واسطے منقطع تھے۔ یہ بات کل انشاء اللہ چچا افضال سے مل کر پوچھیں گے۔''

''چچا افضال سے اسلم کی کوئی بات نہیں ہوئی اس سلسلے میں۔''

''اسلم کہہ رہا تھا کہ چچا اس سلسلے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔''

+ + +

صبح سویرے ناشتا کرتے ہی ہم تینوں شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ چچا افضال کے پاس پہنچے تو وہ ابھی تک دواؤں کے زیر اثر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی داہنی ٹانگ گھٹنے سے تھوڑا اوپر ٹوٹ گئی تھی اور اس پر ابھی تک پلستر چڑھا ہوا تھا۔ جبکہ بائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے سے کاٹ دی گئی تھی۔ ہم ہسپتال کے برآمدے میں پڑے بنچوں پر بیٹھ کر چچا جان کے جاگنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی نرس نے ہمیں چچا افضال کے جاگنے کی اطلاع دی اور ہم اندر کی طرف بڑھ گئے۔ چچا نامعلوم کمرے کی چھت میں کیا تلاش کر رہے تھے کہ ان کی نظریں مسلسل اس طرف سرگرداں تھیں۔

''چچا جان۔'' میں نے ان کے بیڈ کے قریب پہنچ کر آہستہ سے پکارا انھوں نے تڑپ کر اپنی نگاہوں کا زاویہ بدلا اور مجھے دیکھتے ہی لیٹے لیٹے انھوں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ میں بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔

''بیٹے کیسا ہے تُو؟'' ان کا لہجہ حیران کن طور پر پرسکون تھا۔ مگر میں کوشش کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکا۔ میرے حلق میں عجیب سی تلخی گھل گئی تھی۔

''ارے جوان ہو کر روتا ہے۔'' چچا افضال میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔

''میں روتو نہیں رہا۔'' میں نے نفی میں سرہلایا، مگر کوشش کے باوجود میں اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پاسکا تھا۔

''بیٹا ہر بندے کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ وہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے مرسکتا ہے نہ ایک سیکنڈ بعد۔ ان سب کا ٹائم مقرر تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ سب ایک ہی ٹائم اس ظالم جہاں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ البتہ ہم دونوں بدقسمت ہیں کہ ابھی باقی ماندہ زندگی ان کے غم کو گلے سے لگا کر جینا پڑے گا۔''

''چچا میں ان کی موت کے ذمہ داروں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کروں گا۔''

''ہاں بیٹا یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہماری ثقافت کی، رواج کی، علاقے کی اور ہماری قوم کی...... چودھری اکبر اگر زیادہ عرصہ دھرتی پر چلتا پھرتا نظر آیا تو لوگ تمھارا جینا دوبھر کردیں گے۔''

''مجھے صرف اپنے کیس کے فیصلے کا انتظار ہے۔'' میں پُرعزم لہجے میں بولا۔

''السلام علیکم انکل۔'' میں جیسے ہی چچا سے مل کر اٹھا امجد چچا تھامتے ہوئے بولا۔

''جیتے رہو امجد بیٹا۔'' چچا نے امجد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ہم تینوں چچا افضال کی چارپائی کے گرد بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں امجد نے اس دن کے حادثے کا ذکر چھیڑ دیا۔

''بیٹا اس دن مجھے عجیب طرح کی نیند آئی تھی بالکل ایسے جیسے میں نے بے ہوشی کی دوائی لی ہو اور مجھے شک ہے باقیوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ اس کا صریح مطلب یہی ہے کہ کسی نے ہمارے کھانے میں بے ہوشی کی دوائی شامل کی تھی اور ایسا کیا کس نے تھا۔ اس کے بارے میں لاعلم ہوں۔ امید واثق یہی ہے کہ اس کے لیے چودھری نے کسی چالباز عورت کو استعمال کیا ہوگا۔'' چچا افضال کی بات سن کر ہمارے ذہن سے ایک بڑی پھانس نکل گئی تھی۔ ہم رات گئے ہی ہسپتال سے واپس لوٹے۔ چچا نے بھی مجھے مقدمے کے فیصلے تک صبر کرنے کی تاکید کی تھی۔

+ + +

آخری پیشی میں چودھری اکبر غیر حاضر تھا اور اس کی وجہ گزشتہ پیشی پر میرے وکیل کے پیش کردہ وہ دلائل تھے جو مجھے بغیر کسی شبے کے بے گناہ ثابت کر رہے تھے۔ عدالت نے رسمی کارروائی کے بعد میری باعزت رہائی کا اعلان کردیا اور اس کے ساتھ جھوٹی گواہی دینے والوں اور چودھری اکبر سے باز پُرس کا حکم دے کر عدالت کی کارروائی برخاست کردی۔

ہم وہاں سے سیدھے چچا افضال کے پاس یہ خوشخبری سنانے پہنچے تھے۔ وہ بھی یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا۔

''اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟'' واپسی پہ امجد مستفسر ہوا۔

''ارادہ کیا ہونا ہے۔ اگر پولیس ساتھ دیتی تو چودھری اکبر کو اپنے بھائی کے قتل میں بھی رگیدا جاسکتا تھا۔''

''آپ اپنے گھر والوں کے قتل کی ایف آئی آر تو کٹوائیں نا...... باقی سارے قتل وہ موذی خود مان لے گا۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سرہلایا۔ ''وہ میرا اور اس کا اپنا حساب کتاب ہے اور میں خود ہی چکاؤں گا۔''

''میں بھی تیرے ساتھ ہوں یار۔'' امجد جوش سے بولا اور ہم اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

''اس واردات کے لیے ضروری ہے کہ اس کے قتل کے وقت آپ کی موقع سے غیر حاضری کا ثبوت موجود ہو۔''

''وقت آنے دو، وہ بھی ہو جائے گا۔''

اور امجد خلوص سے بولا۔ ''انشاءاللہ''۔

صبح امجد کے اصرار پر ہم دونوں زمینوں پر چلے گئے۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ گندم اور چنے کی فصل بڑی اچھی اور گھنی نظر آ رہی تھی۔

''یار یہ آپ کے بھائیوں نے ہی کاشت کی تھی ناں؟'' امجد مستفسر ہوا۔

''اور کون ہو سکتا ہے؟''

''کتنی عجیب بات ہے۔'' اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''فصل کاشت کرتے وقت انھیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ فصل پکنے سے پہلے ہی وہ چلے جائیں گے۔''

'ہاں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور چنے کے خوب صورت پودے کے اوپر والے حصے کو توڑنے کے لیے جھکا۔ یوں بھی چنے کے سرسبز پودے کی کونپلوں کو ہمارے لوگ بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ ان کی لذیذ چٹنی بھی بنتی ہے، لیکن اس وقت جھکنا میری جان بچا گیا۔ ''شوں'' کی آواز کے ساتھ گولی اوپر سے گزر گئی۔ سیدھا کھڑے ہونے کی صورت میں گولی نے میری چھاتی میں لگنا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی بے وقوفی نہیں کی اور اسی جگہ لیٹ گیا۔ امجد نے بھی لیٹنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

نیچے لیٹ کر ہم نے اندازہ لگایا، گولی بائیں ہاتھ موجود درختوں کے جھنڈ سے چلائی گئی تھی۔

''ماجے صاحب......اب کیا کریں ہتھیار کے نام پر ہمارے پاس غلیل بھی نہیں ہے ہم دونوں منصوبے بناتے رہے اور چودھری اکبر وار کر گزارا۔''

''مجھے کیوں کوس رہے ہو، انڈیا کے اخبارات تیرے کارناموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی کوئی تیر چلا لو۔''

''وہ بھی چلا لیں گے اگر فائر کرنے والا نزدیک آ جائے۔''

''نزدیک آ جائے کہ اس نے ہم سے حجامت کروانی ہے۔''

اس کی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس مشکل وقت میں اس کی شوخی لوٹ آئی تھی۔

''اچھا چھوڑو اس بکواس کو اور اس جگہ سے کھسکنے کی کوشش کرو یہاں پر ہم بالکل محفوظ نہیں ہیں۔ اگر ہم دائیں ہاتھ موجود منڈیر کے پیچھے ہو جائیں تو اس جگہ سے دور نکل سکتے ہیں۔'' یہ الفاظ میرے منہ میں تھے کہ فضا میں تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی کلاشنکوف سے چلائے گئے برسٹ کی گولیاں ہمارے دائیں طرف موجود منڈیر سے ٹکرائی تھیں گولیاں چلانے والے نے یہ گولیاں اگر درخت کے اوپر چڑھ کر چلائی

ہوتیں تو ہمارا بچنا مشکل تھا۔ ڈھائی تین سو میٹر کے فاصلے سے کلاشنکوف کی گولی کے خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خصوصاً ہمارے گنڈے پور تو یوں بھی نشانے باز تھے کہ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ ہتھیار سنبھال لیتے ہیں۔

''یہ گدھا اگر درخت پر چڑھ کر ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کرتا تو کامیاب ہو گیا ہوتا۔'' امجد نے وہی بات کی جو میں نے سوچی تھی۔

''اب اس کی بیوقوفی کو چھوڑو اور کھسکنے کی کرو۔'' یہ کہتے ہی میں نے منڈیر کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ امجد بھی میرے ساتھ تھا۔ منڈیر کی جڑ میں پہنچ کر میں نے ''ایک، دو، تین'' کہا اور ہم دونوں نے مینڈک کے انداز میں لمبی چھلانگ لگائی اور منڈیر کے سرے پر پہنچ گئے۔ اگلی چھلانگ میں ہم دونوں فرنٹ رول کرتے ہوئے منڈیر کراس کر گئے تھے۔ ہمارے اس ایکشن کے دوران کلاشنکوف پھر گرجی مگر ہم کسی بھی قسم کے نقصان سے بچ گئے۔

''اب جھک کر اس سمت نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ اس بڑے کھیت کے ختم ہوتے ہی بڑا برساتی نالہ ہے، وہاں پر ہمارے چھپنے کی بہت سی جگہیں ہیں۔''

یہ کہتے ہی میں نے جھکے جھکے انداز میں اس جانب پیش قدمی کی۔ امجد نے میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ گندم کا کھیت تھا اور کافی گھنا تھا۔ اگر ہم اس میں لیٹ جاتے تو ہمیں ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ یہی بات جب دوڑتے دوڑتے امجد نے کہی تو میں اسے جھڑکتے ہوئے بولا۔

''بیوقوف، ہم گھیر لئے جائیں گے اور چوہے کی موت مریں گے۔''

''چوہے کے ساتھ رہ کر تو بندہ چوہے کی موت ہی مرے گا نا۔'' وہ بھلا کہاں خاموش رہنے والا تھا...... لیکن میں نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

کھیت کی منڈیر سے ہم بیس، پچیس گز ہی دور تھے کہ کلاشنکوفیں ایک مرتبہ پھر گرجیں۔ اس دفعہ دو گنوں سے فائر کیا گیا تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ پھر لیٹنا پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر ہمیں پچھلے کھیت کی منڈیر پر دو آدمی کھڑے نظر آئے۔

''یہ تو صرف دو نظر آ رہے ہیں؟'' امجد مستفسر ہوا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتے کہ یہی دو ہیں یا دائیں بائیں چھپے ہوئے کچھ اور بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے باقیوں نے ان کے پیچھے پیچھے آنا ہو۔ بہرحال جو بھی ہے اتنا ان کو واضح پتا ہے کہ ہم غیر مسلح ہیں۔''

''یہ تو سامنے کی بات ہے مسٹر تجزیہ نگار...... جب ہم جوابی فائر نہیں کریں گے تو دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو جائے گی۔''

ان کو منڈیر سے اتر کر اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ہم دونوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور پھر یکدم اٹھ کر زگ زیگ کے انداز میں بھاگے۔ مخالفین نے ایک مرتبہ پھر ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر حرکتی ٹارگٹ کو نشانہ بنانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یوں بھی ہم ٹیڑھے میڑھے انداز میں بھاگ رہے تھے۔ ہمارا اگلا قدم کہاں پڑے گا اس سے ہم خود بھی اچھی طرح واقف نہیں تھے تو مخالف کیا اندازہ لگاتے۔ منڈیر کی آدھی چڑھائی کراس کرتے ہی ہم دونوں نے پانی میں ڈائیو کرنے کے انداز میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کچی

زمین پر چھلانگ لگائی اور رول کرتے ہوئے نالے میں اترتے چلے گئے۔ جیسے ہی ہمارے جسموں کی موومنٹ رکی ہم دونوں اچھل کر کھڑے ہوئے اور سامنے چند قدم کے فاصلے پر موجود کھنگل (ہماری مقامی زبان میں ایک درخت کا نام ہے جس کے اوپر کانٹے نہیں ہوتے، عام جسامت میں یہ کیکر کے مشابہہ ہے۔اس کی لکڑی جلانے چھتوں وغیرہ کے اوپر ڈالنے، اور کھیتی باڑی کے اوزار بنانے کے کام آتی ہے) کی گھنی جھاڑیوں میں گھس گئے۔تھوڑا سا آگے جا کر ہم دونوں رک گئے اور اپنا سانس ہموار کرنے لگے۔

''میرا خیال ہے یہی جگہ ان کا انتظار کرنے کے لیے مناسب ہے۔''امجد گویا میرا ذہن پڑھتے ہوئے بولا اور ہم دونوں ایک گھنی جھاڑی کے اندر گھس کر بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں ان کی دھیمی دھیمی باتوں کی گونج سنائی دینے لگی۔وہ دونوں پشتو میں بات چیت کر رہے تھے۔

''منشی صیب مشکل دہ چہ اوس منگ تہ ملاؤشی۔''(منشی صاحب مشکل ہے کہ اب وہ ہمیں مل جائیں۔)

''چرتہ ہم نہ شی تلے۔''(کہیں بھی نہیں جا سکتے) مجھے منشی شاہنواز کی منحوس آواز سنائی دی۔''نالے کی دونوں سائیڈوں پر ہمارے بندے ان کی تاک میں بیٹھے ہیں، مجھے پتا تھا کہ وہ اس راستے سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہمارے جانب بڑھ رہے تھے۔اچانک کلاشنکوف کی تڑتڑاہٹ فضا میں گونجی ایک لمحے کے لیے تو ہم دونوں نے سوچا کہ ہم دیکھ لیے گئے مگر پھر ان کی بات سن کر مجھے اطمنان سا ہو گیا۔

منشی کے ساتھی نے پوچھا۔''ولے!......سہ چل اوشو؟''(کیوں کیا ہو گیا)

''کچھ نہیں۔یونہی ان کو ڈرانے کے لیے فائر کیا ہے تاکہ راستے میں رکنے کی حماقت نہ کریں۔''

وہ بیوقوف عام مقامی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں چونکہ غیر مسلح تھے اس لیے لازماً بھاگنے کی کوشش کریں گے۔وہ تیز قدموں سے چلتے ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔ہمارے غیر مسلح ہونے کی وجہ سے وہ تھوڑے بے پرواہ بھی تھے۔

''یہ نہ ہو وہ دوسری سمت نکل گئے ہوں۔''منشی کے ساتھی نے تشویش ظاہر کی۔اس وقت تک وہ اس جھاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے جس میں ہم چھپے ہوئے تھے۔

''ناممکن۔''منشی نے نفی میں سر ہلایا۔''عمر جان اسی علاقے کا بندہ ہے اور اسے پتا ہے کہ دوسری جانب چھپنے کے لیے کوئی خاص جگہ میسر نہیں ہے۔فرار کے لیے یہی سمت ہر لحاظ سے موزوں ہے۔اگر اس کی جگہ میں بھی ہوتا تو یہی راستا اختیار کرتا۔''یہ کہہ کر منشی نے ہمارے سامنے والی جھاڑی میں ایک ہلکا سا برسٹ فائر کر دیا۔ہم دونوں لاشعوری طور پر سکڑ گئے کہ کہیں اگلا برسٹ اس طرف نہ فائر کر دے مگر خیریت گزری اور وہ ہمارے چھپنے کی جگہ سے چند گز دور گزرتے چلے گئے۔ہم دونوں ان کے آگے گزرتے ہی بجلی کی سی سرعت سے جھاڑی سے نکلے اور ان پر جا پڑے۔ہمارے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر انھوں نے پیچھے مڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ مکمل مڑنے بھی نہ پائے تھے کہ ہم دونوں کے سر کی ٹکریں ان کے پہلوؤں سے ٹکرائیں۔وہ گالیاں دیتے ہوئے زمین چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔اس سے پہلے کہ وہ

کھڑے ہوتے ہم دونوں کے پاؤں کی ٹھوکریں ان کی گنوں کولگیں اور دونوں کے ہاتھ سے گنیں چھوٹ کر دور جا گریں۔

ہتھیار ہاتھ سے نکلنے کے بعد وہ ہمارے لیے بے ضرر کینچوے کی حیثیت رکھتے تھے۔اس بات سے وہ آگاہ نہیں تھے اسی لیے زمین سے اٹھ کر انھوں ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور انھیں پتا بھی نہ چلا کہ وہ کیسے اُڑتے ہوئے دور جا گرے تھے۔

''منشی ہتھیار ہاتھ میں لے کر زنانی بھی شیر ہوتی ہے۔'' میرا لہجہ غضب سے پر تھا۔''مردانگی کا پتا خالی ہاتھوں سے چلتا ہے۔''

وہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے لیکن اس مرتبہ انھوں نے ہماری سمت بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں جسمانی لحاظ سے ہم سے بہت کمزور تھے۔

''عم......عمر جان تم بچ نہیں سکتے۔'' منشی نے مجھے دھمکی دی۔''نالے میں چاروں طرف ہمارے ساتھی بکھرے ہوئے ہیں اور وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والے ہوں گے۔''

''چلو پھر تم چھٹی کرو۔'' میں نے امجد کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے جھپٹ کر ان کو پکڑ لیا۔

''منشی میرا دل تو چاہتا ہے تجھے تڑپا کر ماروں۔ مگر افسوس میرے پاس ٹائم نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن بے دردی سے مروڑ دی۔ یہی کام امجد دوسرے کے ساتھ کر چکا تھا۔ ان کی تلاشی لینے پر تھوڑی نقدی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ جو ہم نے ان کی جیبوں میں رہنے دی۔ دوسرے بندے کی جیب میں البتہ امجد کو کمانی دار چاقو ملا تھا جو اس نے جیب میں ڈال لیا۔ ان کو جھاڑیوں میں چھپا کر ہم نے نیچے پڑی ہوئی ان کی کلاشنکوفیں اٹھالیں۔ دونوں گنوں کے ساتھ 75,75 راؤنڈ کی بڑی گول میگزینیں لگی ہوئی تھیں۔

''اب کیا کریں؟'' امجد مستفسر ہوا۔

''اب؟'' میں وحشتناک لہجے میں بولا۔''اب شکاریوں کا شکار کریں گے۔''

+ + +

کلاشن کوفوں پر قابو پانے کے بعد ہمارے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ ہم دونوں جنگل کے اندر ہی اندر چلتے ہوئے وہاں سے ہٹتے چلے گئے۔ جنگل سے باہر نکلنے کی صورت میں ہمارے دور سے نظر آنے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح ہم علیحدہ ہونے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے کہ مبادا ایک دوسرے کی گولی کا نشانہ بن جائیں۔ وہاں پر ہم نے گوریلا جنگ لڑی تھی اور خوش قسمتی سے ہم دونوں گوریلے ہی تھے۔

حرکت کرتے وقت ہماری کوشش تھی کہ نہ تو ہمارے پاؤں کی آواز آئے اور نہ ہی ہمارے منہ سے کوئی سرگوشی نکلے۔ بغیر بولے ہمیں ایک دوسرے کی حرکات کا اندازہ تھا۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دشمن پہلے سے ہمارے لیے گھات لگائے ہوئے تھا۔ اس صورت میں ہماری تلاش میں پھرنے کی بجائے انھوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا تھا اور حرکت میں ہونے کی وجہ سے ہمیں ہی ان کی نظر میں آنا پڑتا۔

ایک بڑے درخت کے قریب پہنچ کر امجد نے میری کلائی کو پکڑ کر آہستہ سے دبایا اور خود گن کو سلنگ اَپ کر کے بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس درخت پر چڑھنے لگا۔ میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے درخت کے تنے کے ساتھ ہی پوزیشن لے لی۔

درخت کی بلندی انتہائی پہنچ تک جا کر امجد نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور پھر نیچے اتر کر اپنی ناکامی کا اظہار اس نے نفی میں سر ہلا کر کیا۔

ایک دفعہ تو میرے ذہن میں آیا کہ امجد سے کہوں کہ چلو فی الحال یہاں سے نکل چلتے ہیں مگر پھر یہ ارادہ ملتوی کرتے ہوئے میں نے کلاشن کوف کے سیفٹی لیور کو فائر کرنے کی پوزیشن پر لا کر امجد کی آنکھوں میں جھانکا۔ میرا مطلب سمجھتے ہوئے اس نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اپنے سامنے موجود جھاڑیوں میں دو ہلکے ہلکے برسٹ فائر کیے اور پھر ہم دونوں جھکے جھکے انداز میں دوڑتے ہوئے ایک جھاڑیوں کے جھنڈ میں گھس کر بیٹھ گئے۔ ہمیں امید تھی کہ ہماری گھات میں پڑے ہوئے دشمن تنگ آ کر خود ہماری تلاش میں نکلیں گے۔ اس صورت میں ان کو نشانہ بنانا ہمارے لیے آسان ہوگا۔ یوں بھی ان کے دو آدمی ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے۔ ان کی طرف سے بھی کسی سگنل وغیرہ کے نہ ملنے کی صورت میں ان کا ہمارے انتظار میں اپنی پوزیشنوں میں گھسے رہنا بے کار جاتا۔ منشی اور اس کے ساتھی کی فائرنگ اور پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد میری فائرنگ کی آواز نے لامحالہ ان کو اعصابی طور پر منتشر کر دیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہی ہم دونوں کو سامنے کی جانب چند آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی اور پھر اچانک قدموں کی آواز کے ساتھ ایک کھردری سی آواز سنائی دی۔

"شاہ نواز......اوے لاکا شاہ نواز۔" وہ پشتو میں شاہ نواز کو آوازیں دے رہے تھے جو ان کی آواز کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔

میں نے بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے اپنا رخ پیچھے کی جانب موڑ دیا کہ مبادا دشمنوں کا کوئی آدمی دوسرے جانب سے نہ آ رہا ہو۔ سامنے والوں کو میں نے امجد کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ یوں بھی امجد کا نشانہ مجھ سے بہتر تھا۔ بلکہ ٹریننگ کے دوران نشانہ بازی وہ واحد ایونٹ تھا جس میں امجد نے مجھ سے ہمیشہ سبقت لیے رکھی۔

دوسری جانب کوئی حرکت نظر نہ آنے کے باوجود میں نے اسی جانب نگرانی جاری رکھی۔

"دو ہیں، اور میں دونوں کو پار کر رہا ہوں۔" امجد آہستہ سے بڑبڑایا۔ میں نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور میری خاموشی کو رضامندی جانتے ہوئے اس نے بغیر کسی وقفہ کے دو سنگل راؤنڈ فائر کیے۔ میں نے ان کی چیخیں سن کر جان لیا تھا کہ امجد کا نشانہ ہمیشہ کی طرح کامیاب رہا تھا۔

ہم چند لمحے دم سادھے وہیں پڑے رہے اور پھر میں نے امجد کو وہیں پڑے رہنے کا اشارہ کر کے لاشوں کا رخ کیا۔ اس دوران امجد نے گردوپیش کی نگرانی جاری رکھی۔

امجد کی چلائی گئی گولیوں نے دونوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر دیے تھے۔ دونوں لاشیں امجد کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کیونکہ پہلے آدمی پر تو اس نے بلاشبہ شست لے کر گولی چلائی تھی لیکن دوسری گولی اس نے بغیر وقفہ کے فائر کی تھی اور اتنی جلدی شست بدلنا یقیناً کمال مہارت تھی۔ میں نے ان کی سرسری سی تلاشی لی۔ ایک کے نیفے میں اڑسا ہوا 30 بور پسٹل اور دوسرے کی جیب سے ایک بھری ہوئی میگزین نکال کر میں بجلی کی سی سرعت سے امجد کے پاس پہنچا۔ ان کے ہتھیار اٹھانا میں نہیں بھولا تھا۔

دونوں فالتو ہتھیار اسی جگہ چھپا کر ہم کرالنگ کرتے ہوئے وہاں سے نکلے۔ کیونکہ اسی جگہ بیٹھے رہنے کی صورت میں ہم ان کے

گھیرے میں آسکتے تھے۔ پچاس ساٹھ گز دور آ کر ہم نے ایک مرتبہ پھر پوزیشن سنبھال لی۔ اس مرتبہ ہم نے نسبتاً گہری جگہ پر اپنا مورچہ بنایا تھا۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ جلد ہی ایک اور جوڑی نظر آ گئی۔ شاید انھوں نے ہماری تلاش کے لیے تمام کو دو دو کی پارٹیوں میں منقسم کیا ہوا تھا کہ ہم سے ٹکرانے والی تیسری پارٹی بھی ہمیں دو آدمیوں پر ہی مشتمل نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں کی گنوں نے بیک وقت شعلہ اگلا اور دونوں چیختے ہوئے نیچے گر کر تڑپنے لگے۔ اسی وقت داہنی جانب سے ہم پر گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ہم نے جوابی فائرنگ کرنے کی بجائے خاموشی میں عافیت سمجھی کہ بغیر مقصد کے گولی ضائع کرنا کبھی بھی کمانڈوز کا خاصہ نہیں رہا۔ یوں بھی ہم جس جگہ چھپے تھے وہاں پر ہمیں نشانہ بنانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

چند لمحوں بعد ہی ہماری خاموشی کو محسوس کر کے مخالفین نے فائر کرنا بند کر دیا۔ شاید ان کو بھی اپنے ایمونیشن کے کم ہو جانے کا احساس ہو گیا تھا۔

”ماجے میرا خیال ہے یہاں سے باہر نکلتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہمیں آڑ میسر ہے تو دشمن بھی تو نظر نہیں آ رہا۔ یوں نہ ہو کسی اندھی گولی کا شکار ہو جائیں۔ ویسے بھی ہمیں ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ کھلی جگہ پر جا کر ہی کچھ اندازہ ہو گا۔“

امجد نے پوچھا۔ ”ان جھاڑیوں سے باہر کی زمین کیسی ہے؟“

”نالے سے باہر تو وہی کاشت شدہ علاقہ ہے جو تمھارا دیکھا بھالا ہے۔ البتہ نالے کے اندر اکا دکا درخت اور کٹی پھٹی زمین ہے۔“

”چلو پھر۔“ امجد جھاڑی سے باہر رینگ گیا۔

چاروں طرف بکھری ہوئی گھنی جھاڑیاں نظری آڑ مہیا کر رہی تھیں، ہمارے حرکت کرنے کے چند لمحے بعد ٹھیک اسی جگہ دو تین برسٹ اور فائر ہوئے جہاں ہم پہلے چھپے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ دشمن ہمارے اس جگہ سے کوچ کر جانے سے لاعلم تھے۔

گھنی جھاڑیاں بتدریج چھدری چھدری اور پھر بالکل کم ہو گئیں۔ اس دوران ہم دونوں نے کھڑے ہونے کی غلطی نہیں کی تھی اور یہی احتیاط ہماری جان بچا گئی کیونکہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے باہر ایک اکیلی گھنی جھاڑی کی آڑ لے کر جب ہم نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو نالے کے بائیں جانب کھیت کی منڈیر کے پیچھے ہمیں دو سر جھنڈ کے جانب نگران نظر آئے۔ ان کے باقی جسم نظر نہیں آ رہے تھے۔

امجد نے آہستہ سے کہا۔ ”دائیں طرف بھی کوئی نا کوئی ضرور ہو گا؟“

”شاید۔“

”اگر ہم چند گز مزید نالے کے بائیں سائیڈ کی طرف ہو جائیں تو کم از کم ان کی نظروں میں آنے سے بچ سکتے ہیں۔“

”اگر داہنی سائیڈ پر ان کی کوئی پارٹی بیٹھی ہوئی تو ہم آسانی سے ان کی نظر میں آ جائیں گے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”تو کیا یہیں پڑے رہیں؟“

”نہیں...... بلکہ نالے کے درمیان درمیان میں کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

''بیوقوف اس طرح ہمارے دونوں جانب سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہے'' ''کیوں ناں ان دونوں کو ختم کر دیں؟''

''جانو صاحب...... عقل استعمال کرو، اس صورت میں ہم چاروں اطراف سے گھیر لئے جائیں گے۔''

''تو پھر بائیں سمت ہی چلتے ہیں۔'' میں رینگ کر نالے کی بائیں سمت بڑھ گیا۔ امجد نے میرے ساتھ چلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب تک میں ان دونوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا امجد نے مجھے کور مہیا کئے رکھنا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ جھاڑی سے نکل کر میں چند گز ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ امجد کی کلاش کوف گرجی۔ یہ میرے لیے خطرے کا الارام تھا۔ میں نے یکدم لیٹے لیٹے اپنے سامنے کی جانب جست لگائی اور پھر تیزی سے لڑھکنیاں کھاتا ہوا ممکنہ فائری خطرے کی زد سے نکل گیا۔ دشمن کے جانب سے ٹھیک اسی جگہ فائر کیا گیا تھا جہاں پر میں پہلے موجود تھا۔ امجد کی طرف سے کیے گئے فائر سے صرف ایک بندہ ہی ہلاک ہو سکا تھا۔ امجد بالکل زمین سے چپک کر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں مسلسل بائیں سمت موجود بچ جانے والے شخص کے جانب سرگرداں تھیں جبکہ میں نے ایک گڑھے میں لیٹ کر داہنی طرف کی نگرانی شروع کر دی۔ میری نسبت امجد زیادہ خطرے میں تھا۔ امجد کو نشانہ بنانے کے لیے دشمن کو لازماً اپنا سر اوپر اٹھانا پڑتا اس صورت میں اس کے خود نشانہ بن جانے کا خطرہ موجود تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر وہ منڈیر کے پیچھے چھپا بغیر نشانہ لیے ہلکے ہلکے برسٹ فائر کر رہا تھا۔ میں نے مخالف سمت کی نگرانی جاری رکھی مگر اس سمت سے مجھے کسی قسم کی حرکت ہوتی دکھائی نہ دی۔

اور پھر امجد نے آہستہ آہستہ میری جانب رینگنا شروع کر دیا۔ یہ بہت رسک والا کام تھا مگر اس جگہ پڑے رہنے میں بھی اس کے لیے خطرہ موجود تھا۔

امجد ابھی تک میرے اور اپنی گذشتہ پوزیشن کے درمیان میں ہی تھا کہ جھاڑیوں کے اندرونی جانب سے چار بندے بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے سیفٹی لیور کو سنگل فائر کی پوزیشن سے برسٹ پر سیٹ کرتے ہوئے ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ کلاشن کوف سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ سے دو بندے تو چیختے ہوئے وہیں گر گئے جبکہ باقی دونوں جلدی سے جھاڑیوں کی آڑ لے کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن اس کے باوجود میں نے جھاڑیوں پر فائرنگ جاری رکھی تاکہ امجد ان کی فائرنگ کی زد سے نکل کر مجھ تک پہنچ جائے۔

امجد نے بھی خطرہ محسوس کرتے ہی اپنی رفتار تیز کر لی تھی لیکن اس نے اٹھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ جلد ہی وہ میرے پاس گڑھے میں آن موجود ہوا۔

''بال بال بچ گئے بھئی۔'' وہ پسینہ پونچھنے لگا۔

''ہاں یار۔ اللہ تعالیٰ کو ہماری زندگی منظور تھی۔''

''کتنے گرا لیے ہیں؟''

''چار تھے...... دو جھاڑیوں میں چھپ گئے ہیں اور باقی دو وہ پڑے ہیں۔'' میں نے جھاڑیوں کے درمیان کھلی جگہ پڑی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''دو یہ......اور ایک جو مجھ سے بچ گیا ہے یہ تو ہو گئے تین۔ان کے علاوہ نا معلوم کتنے خبیث ہیں۔''

''جتنے بھی ہوں۔آج ان شاء اللہ بچ کر نہیں جا سکتے۔''میں نے دانت پیسے۔

''یار چودھری اکبر نظر نہیں آیا؟''

''خبیث کہیں چھپا ہو گا۔''

''بہر حال ابھی تو ہم اس گڑھے میں پھنس گئے ہیں۔''

''ایسے کرو کہ یہاں سے اکا دکا فائر ان جھاڑیوں پر کرتے رہو میں اس طرف سے واپس جنگل کی طرف جا کر انھیں پیچھے سے گھیرتا ہوں۔''میں نے گڑھے سے جنگل کی طرف جاتی ہوئی ابھری منڈیر کی مانند زمین کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں تم یہاں سے انھیں دھوکے میں مبتلا رکھو میں چلتا ہوں۔''مگر میں اس وقت تک گڑھے سے نکل کر زمین پر لیٹ گیا تھا۔ مجبوراً امجد وہیں کھڑا رہا۔عام طور پر کرالنگ کرتے وقت ایسا کرنے والے کی چھاتی زمین سے اٹھی رہتی ہے مگر اس وقت زمین کی مناسبت سے مجھے بالکل زمین سے چپکنا پڑ گیا تھا اور کہنیوں اور گھٹنوں کی بجائے میں ہاتھ کی ہتھیلیوں اور پاؤں کے پنجوں سے کام لے رہا تھا۔وہ پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ مجھے بہت طویل محسوس ہوا مگر راستا کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ثابت قدمی اسے طے کر لیتی ہے۔میں بھی جلد ہی جھاڑیوں کی لائن تک جا پہنچا۔جھاڑیوں کی آڑ لے کر میں آہستگی سے اٹھ بیٹھا اور اپنا سانس درست کرنے لگا۔وہاں سے آگے میں بیٹھے بیٹھے سفر کر سکتا تھا۔میں آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ غیر ارادی طور پر میری نظر امجد کی سمت اٹھی اور یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہونے لگا کہ امجد کی پشت پر موجود کھڑی چڑھائی کے اوپر ایک بندہ دبے قدم امجد کی طرف بڑھ رہا تھا۔جس وقت میری نظر اس پر پڑی اس وقت وہ کنارے سے دو قدم دور تھا اور یہ دو قدم اٹھاتے ہی نیچے لیٹے امجد نے اس کی نظر میں آ جانا تھا۔ہتھیار اس نے پہلے سے فائر کرنے کی پوزیشن میں تانا ہوا تھا۔چشم زدن میں فیصلہ کرتے ہوئے۔میں نے سیفٹی لیور کو برسٹ کی پوزیشن پر سیٹ کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا کہ سنگل راؤنڈ فائر کرنے کی صورت میں بہر حال فائر کے خطا ہونے کا خطرہ موجود تھا۔مجھے اگر فائر کرنے میں چند سیکنڈ کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔گولیوں کی بوچھاڑ نے اسے سر کے بل نیچے گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔تڑتڑاہٹ کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو امجد بھی اچھل پڑا تھا مگر اس نے گڑھے سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔میری گولی کا شکار ہونے والا امجد کے سامنے ہی بمعہ اپنے ہتھیار کے گرا تھا۔

فائر کرتے ہی میں زمین پر لیٹ گیا اور میرا بروقت لیٹنا کام آ گیا کہ اسی وقت ''شوں شوں'' کی آواز سے گولیاں میرے اوپر سے گزریں۔میں ایک مرتبہ پھر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔دشمن مسلسل میری پہلی پوزیشن کو نشانہ بنائے ہوئے تھے۔تھوڑا سا آگے آ کر میں اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں دوڑتا ہوا اس جگہ سے دور ہٹتا چلا گیا۔مناسب فاصلے پر پہنچ کر میں نے اپنا رخ دشمن کے سمت کر کے محتاط انداز میں اس جانب بڑھنے لگا۔کلاشن کوف میرے ہاتھوں میں فائر کرنے کی پوزیشن میں تیار تھی اور میں ہلکی سی بے قاعدگی پر فائر کھولنے کے لیے تیار تھا۔

ایک مخصوص فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے رفتار بالکل آہستہ کر لی۔مزید چند قدم چلنے کے بعد میری سماعتوں میں ہلکی سی

آواز آئی اور میں تیزی سے زمین پر لیٹ گیا۔

''کرم شاہ اوس منگ گوشی پاتے شو......زہ چہ منڈا اوواؤ'' (کرم شاہ اب ہم اکیلے رہ گئے ہیں) چلو فی الحال بھاگ نکلتے ہیں۔''

''ٹھیک دا......خو خان صیب بہ خفاشی۔'' (ٹھیک ہے لیکن خان صاحب خفا ہو جائے گا۔) دوسرا بندہ جسے کرم شاہ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ پریشان لہجے میں بولا۔

''خان صاحب کی خفگی سے زندگی کہیں بہتر ہے۔'' اول الذکر نے جھلا کر کہا۔'' اور یہ دونوں خنزیر تو پتا نہیں جن ہیں یا بھوت کہ اچانک کسی جانب سے نکل کر ہمارے بندے کو ہلاک کرتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ بارہ بندوں میں ہم دو ہی باقی بچے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر مزید ان سے مقابلہ کیا تو شاید ہم بھی پار ہو جائیں۔''

اس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے حالات کا صحیح تجزیہ کیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ لیٹ ہو گیا تھا آخری بات اس کے منہ میں تھی کہ میں ان کے سر پر جا پہنچا اور اس سے پہلے کہ کرم شاہ اس سے متفق ہوتا میری کلاشن کوف سے نکلنے والی گولی نے اسے ہر قسم کے خدشات اور تفکرات سے آزاد کر دیا۔

''اگر تم اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو ہتھیار پھینک کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔'' اور کرم شاہ نے جلدی سے کلاش کوف پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے۔

''گڈ......'' اسے شاباش دیتے ہوئے میں نے امجد کو آواز دی۔ ''امجد آجاؤ بھئی صلح ہو گئی ہے۔'' اور چند لمحوں بعد ہی امجد میرے پاس پہنچ گیا۔

''کیا یہ آخری ہے؟''

''ہاں اگر خان صاحب نے ان کی تلاش میں مزید بندے نہ بھیجے تو......''

''اس کے ہاتھ باندھو، میں ذرا ہتھیار جمع کر لوں۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر اس سے گپ شپ کریں گے۔'' میں سر ہلاتے ہوئے کرم شاہ کی تلاشی لینے لگا جبکہ امجد ہتھیار اکٹھے کرنے لگا۔ تلاشی لے کر میں نے اس کی ہی پگڑی اتار کر اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت کے جانب باندھ دیئے امجد بھی جلد ہی ان کے ہتھیار اکٹھے کر کے میرے پاس پہنچ گیا تھا۔

امجد نے پوچھا۔'' اس سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ مل جائے گی؟''

''اس جگہ کو کیا ہے؟''

''پولیس نہ آجائے......کافی دیر سے فائرنگ ہو رہی ہے۔''

''ہنہ......پولیس۔'' ''پولیس شہروں میں کبھی ٹائم پر نہیں پہنچی، یہ تو ویسے بھی گنڈہ پوروں کا علاقہ ہے......پولیس کو جب تک کوئی مقامی باشندہ کسی لاش کے ملنے کی اطلاع نہ دے دے وہ یہاں نہیں آنے والی۔ فائرنگ تو یوں بھی یہاں آئے روز کا معمول ہے۔ البتہ ان

کے مذکورہ خان صاحب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”کچھ بھی ہو...... پولیس نہ سہی ان کا خان صیب سہی۔ یہ جگہ بہر حال پوچھ گچھ کے لیے موزوں نہیں ہے۔“

”اس جھنڈ سے مغربی جانب کوئی کلومیٹر بھر فاصلے پر نالے کے کنارے ایک ویران مکان ہے وہیں چلے جاتے ہیں۔“

”آ......اگر آپ میری جان بخشی کا وعدہ کریں تو میں یہیں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔“ کرم شاہ تھوک نگلتا ہوا بولا۔

”وہ تو ہو ہی جائے گی۔ فی الحال ہمارے ساتھ چلو کیونکہ اس جگہ ہم محفوظ نہیں ہیں۔“ اس نے اڑی کرنے کی کوشش کی مگر ہمارے تیور دیکھ کر سر جھکا کر ہمارے آگے چل پڑا۔ امجد نے تمام گنوں کو ایک چادر میں ڈال کر کندھے پر اٹھالیا۔ اپنی گن اس نے بنڈل میں باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ راستے میں توقع کے خلاف کرم شاہ نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم کھنڈر نما مکان میں پہنچ گئے۔ ٹوٹی پھوٹی چار دیواری اور بغیر دروازوں کے دو کمروں پر مشتمل اس ویران مکان کی چھتوں میں بھی بڑے بڑے شگاف تھے۔ امجد نے بنڈل اتار کر ایک طرف رکھا اپنی جیبیں ٹٹول کر اس نے خنجر نکالا اور اس کی دھار پر انگلی پھیر کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ خنجر اس نے غالباً کسی لاش کی جیب سے نکالا تھا۔ یہ سب کچھ وہ کرم شاہ کو خوفزدہ کرنے کے لیے کر رہا تھا مگر کرم شاہ پہلے سے ہی اتنا خوفزدہ تھا کہ امجد کی اس کوشش کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

”ہاں بھئی کرم شاہ!“ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”سب سے پہلے تو یہ بتلاؤ کہ تمھارا خان صیب کون ذات شریف ہے...... کیا تم لوگ چودھری اکبر کو خان صاحب کہہ کر یاد کر رہے تھے۔“

”ن......نہیں......خان صیب چودھری اکبر کا ہونے والا سُسر ہے۔“

”پورا نام بتاؤ؟“

”میر نیاز خان......کالی وال سے تعلق ہے۔“ کالی وال رحمٰن خیل سے 7 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

”اس کی مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“

”چودھری اکبر اور خان صیب نے معاہدہ کیا ہے کہ کسی بھی دشمن کے خلاف وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔“

”ہنہ............ہماری حویلی کو آگ لگانے میں میر نیاز خان کا بھی ہاتھ تھا؟“

”نہیں......“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”خان صیب کے ساتھ چودھری اکبر کے تعلقات اس واقعہ کے بعد بڑھے ہیں۔ اس سے پہلے بس دور پار کی پہچان تھی۔ اب چودھری اکبر اپنی بہن خان صیب کے بیٹے کے نکاح میں دے رہا ہے اور خود اس کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے۔“

”منگنی ہو چکی ہے؟“

”چودھری اکبر اور رضیہ بی بی کی منگنی تو ہو چکی ہے البتہ گل ریز خان (میر نیاز خان کا بیٹا) کی منگنی چند دنوں میں متوقع ہے۔“ اس گفتگو کے دوران امجد خاموشی سے ہماری گفتگو سنتا رہا اس نے بیچ میں مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''ہم دونوں پر حملہ کرنے والے تمام بندے میر نیاز خان کے تھے؟''

''ہاں......صرف منشی شاہ نواز چودھری اکبر کا آدمی تھا۔اس نے ہمیں آپ کی شناخت کرائی تھی کیونکہ ہم آپ کی شکل سے ناواقف تھے۔''

''تمھارا پروگرام ہمیں قتل کرنے کا تھا؟''

''نہیں۔''اس کا سرنفی میں ہلا۔''اگر ایسا ہوتا تو آپ کے گاؤں سے باہر نکلتے ہی ہم یہ کام کر گزرے ہوتے......ہمیں آپ کو زندہ پکڑنے کا حکم ملا تھا اسی وجہ سے ہم آپ کو گھیر کر ان درختوں کے جانب لے آئے تھے۔''

''تم لوگوں کا لیڈر کون تھا؟''

''منشی شاہ نواز......''

''ہمیں پکڑ کر تم لوگوں نے کہاں لے جانا تھا؟''

''کالی وال۔''

''قتل کرنا تو سمجھ میں آتا ہے۔زندہ لے جانے کا مقصد؟''امجد جو کافی دیر سے خاموش کھڑے تھا مستفسر ہوا۔

''اس بارے مجھے کچھ علم نہیں۔''اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''اب اس کے ساتھ کیا کریں؟''اس کی بات ختم ہوئی تو امجد نے مجھ سے پوچھا۔

''بب۔بھائی صیب میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''میرے بولنے سے پہلے وہ پشتو میں گڑگڑایا۔

''راتلل ٹائم کے درتہ ماشومان یاد نہ او۔''(آتے وقت تجھے بچے یاد نہیں تھے)میری بات سن کر اس نے شرمندہ انداز میں اپنے سر کو جھکا لیا تھا۔

''اچھا اس طرح کرو خان صیب کی حویلی کا اندرونی نقشہ ذرا تفصیل سے بتلا دو تا کہ تجھے چھوڑنے کے بارے غور کر سکیں۔''امجد نے پوچھا اور کرم شاہ فرفر میر نیاز خان کی حویلی کے اندرونی حصوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے لگا۔ہم پر حملہ کرنے والوں کے بارے اس نے بتایا کہ ان میں کرم شاہ منشی اور ہمارے ہاتھوں مرنے والے آخری بندے کے علاوہ تمام تر جرائم پیشہ افراد تھے اور کئی ایک کیسوں میں پولیس کو مطلوب تھے۔مجھے زندہ پکڑ کر میر نیاز خان کے حوالے کرنے کا معاوضہ انھوں نے پچاس ہزار روپے طلب کیا تھا۔جس میں پچیس ہزار روپے وہ وصول کر چکے تھے اور بقایا مجھے خان کے حوالے کرتے وقت لیتے۔

''ہم کیسے یقین کر لیں کہ تم نے سچ بیانی کی ہے؟''اس کی بات ختم ہوتے ہی میں مستفسر ہوا۔جس کے جواب میں وہ آہستہ سے بولا۔

''آپ کو یقین دلانے کے لیے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری نظر میں جو حقیقت تھی میں نے وہی بیان کی ہے آگے آپ کی مرضی۔''اتنا خوفزدہ ہونے کے باوجود اس کے دوٹوک انداز میں بات کرنے نے مجھے کافی متاثر کیا۔

”ٹھیک ہے کرم شاہ!......تم آزاد ہو۔ میں یوں بھی خواہ مخواہ کی قتل وغارت پسند نہیں کرتا۔ اِلّا یہ کہ مجھے اس کام پر مجبور کیا جائے۔ تمھارے ساتھیوں کے ساتھ بھی ہم دونوں دفاعی جنگ لڑے ہیں۔ باقی جہاں تک تعلق ہے تمھارے خان صیب کا۔ اسے ہماری طرف سے بتلا دینا کہ جلد ہی ملاقات ہوگی اور اب تم جا سکتے ہو۔“

اس نے تشکر بھرے انداز میں سلام کیا اور جلدی جلدی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی ہم دونوں نے ہتھیاروں کا بنڈل ویران مکان کے قریب ایک گڑھے میں رکھا اور اس گڑھے پر ٹہنیاں وغیرہ ڈال کر اوپر سے مٹی اور پتھروں سے ڈھانپ دیا۔ اپنے پاس ہم نے صرف ایک کلوز بٹ کی کلاشن کوف چھوڑی جو امجد نے اپنے کوٹ کے نیچے لٹکالی تھی۔ غنیمت میں ملنے والے دو پستولوں کو البتہ ہم نے اپنی جیبوں میں منتقل کر لیا۔ وہاں سے ہم سیدھے گھر پہنچے۔ اسلم بھائی بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

”سارا دن کہاں غائب رہے۔“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا اس کے لہجے کا اضطراب ہم سے چھپا نہ رہ سکا۔

”یہ لمبی کہانی ہے...... پہلے نہائیں گے، پھر کھانا کھائیں گے اور آخر میں قصہ سنائیں گے۔“ امجد کے لہجے اور انداز پر اسلم بھائی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے میں باتھ روم میں گرم پانی رکھ دیتا ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد ہم نہا دھو کے کھانے سے فارغ ہو کر چائے پیتے ہوئے اسلم کو اپنی کہانی سنا رہے تھے۔

”میر نیاز خان تو کالی وال کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔ سرکاری حلقوں میں بھی کافی اثر ورسوخ رکھتا ہے۔“ ہماری کہانی سننے کے بعد اسلم بھائی تشویش سے بولا ”اس کی جاگیرداری تو بس اس کے جرائم پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے ورنہ اس کی ساری آمدنی کا دارومدار سمگلنگ وغیرہ پر ہے۔“

میں نے پوچھا ”اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ اس کاروبار میں شریک ہے؟“

”بیٹا چھوڑو......بیٹی بھی شریک ہے۔“

”کیا؟“ ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”صحیح کہہ رہا ہوں بھائی جان...... وہ سولہ جماعت پاس ہے۔ اپنی گاڑی خود چلاتی ہے اور مردوں کی طرح پتلون پہنتی ہے۔ سر پر دوپٹہ نہیں اوڑھتی بال بھی مردوں کی طرح چھوٹے چھوٹے ہیں۔“

”اتنی تعلیم یافتہ ہو کر اس نے اکبر کے ساتھ شادی کرنا کس طرح پسند کر لیا۔“

”کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اسلم بھائی نے کندھے اچکائے۔ ”شاید چودھری اکبر کی زمین جائیداد پر ان کی نظر ہو یا پھر میر نیاز خان اپنی بیٹی اکبر خان کے نکاح میں اس کی واجبی تعلیم کو دیکھ کر دے رہا ہو تا کہ نفسیاتی طور پر اکبر خان دبا رہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ امجد اثبات میں سر ہلایا۔ ”ایسی آزاد خیال لڑکیاں یوں بھی کم تعلیم یافتہ خاوند پسند کرتی ہیں تا کہ ان کی آزادی میں

تحمل نہ ہو۔"

"اچھا چھوڑو اس بحث کو...... اسلم بھائی آپ میری بات ذرا غور سے سن لیں۔ چودھری اکبر اب کھل کر سامنے آ گیا ہے، میر نیاز خان بھی اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ آج ہمارے ہاتھوں انھیں جو زک اٹھانی پڑی اس کا بدلہ لینے کی کوشش وہ لازماً کریں گے۔ اس ضمن میں اگر ہم ان کے ہتھے نہ چڑھے تو اس کا بدلہ وہ آپ سے اور ممانی جان سے لیں گے شاید گھر کی عورتوں کو یرغمال بنا کر وہ ہمارے اوپر قابو پانے کی کوشش کریں۔ بلاشبہ گندہ پور قوم اپنی دشمنی میں عورتوں کو نہیں گھسیٹتی۔ مگر یہ کمینے دشمن ہیں۔ اس سے پہلے یہ جو کچھ کر چکے ہیں اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں اس لیے اب ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ آپ ممانی جان باجی اور اکرم خان کو چند دنوں کے لیے کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ آئیں اور خود بھی وہیں رہیں اس طرح کم از کم ہمیں اطمینان رہے گا اور ہم آزادی سے ان دونوں سور ماؤں کے خلاف لڑ سکیں گے۔"

"مگر بھائی جان......"

"اگر مگر نہیں......" میں نے قطع کلامی کی۔" آپ میری بات نہ مان کر صرف مسائل ہی پیدا کریں گے؟۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ یکدم میرے ساتھ متفق ہو گیا" کہاں چلے جائیں؟"

امجد اطمینان سے بولا۔" میرے گھر۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔" بالکل اسلم بھائی، امجد کا گھر آپ لوگوں کے لیے محفوظ رہے گا۔"

"میں امی جان اور جمیلہ کو ادھر چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔"

"اگر ہمیں تمھاری ضرورت پڑی تو تار دے کر آپ کو بلا لیں گے۔" امجد نے کہا اس کے بعد امجد اسے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھانے لگا۔

"امی جان کو آپ خود راضی کریں گے۔" امجد سے اس کے گھر کا ایڈریس سمجھ لینے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"چلو ابھی ممانی جان سے بات کر لیتے ہیں۔" میں اٹھتے ہوئے بولا۔ اسلم بھائی بھی میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

مجھے دیکھتے ہی ممانی جان بے ساختہ چارپائی سے اٹھ کر میری جانب بڑھیں اور میری بلائیں لینے لگی وہ جس وقت بھی مجھے دیکھتی تھی اس کے آنسو خود بخود بہنے لگ جاتے تھے۔

"بیٹا آج سارا دن کہاں غائب رہے ہو؟" وہ میری پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے بولیں۔

"کھیتوں کی طرف گئے تھے ماں جی۔"

"آج تو اس طرف سے بہت زیادہ فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

"وہ پولیس والے تھے ماں جی۔" میں نے صریحاً جھوٹ بولا۔" ڈاکوؤں کے ساتھ ان کا ٹاکرا ہو گیا تھا۔"

"خدا برباد کرے ان ڈاکوؤں کو......" وہ ڈاکوؤں کو کوسنے لگی۔

"ماں جی میں ایک کام کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔"

''سو کام بتلاؤ پتر۔''

''ماں جی آپ کو تو پتا ہے کہ جمیلہ میری اکلوتی بہن ہے اور اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے جتنی تکلیف ہوتی ہے...... یہ بتانے کی بات نہیں۔ میں نے اور اسلم بھائی نے مشورہ کیا ہے کہ باجی کو کراچی علاج کے لیے بھیجا جائے۔اس مقصد کے لیے آپ اور بھائی اسلم کو بھی اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔''

''کراچی بھیجنے کی کیا ضرورت ہے اپنے شہر میں علاج کرالیں گے نا۔''

''نہیں ماں جی۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔''یہاں پر باجی کی بیماری کے متعلق کوئی قابل ڈاکٹر موجود نہیں ہے۔کراچی میں تو ایک سے ایک اچھے ڈاکٹر پڑے ہیں،اس کے علاوہ امجد کا گھر بھی وہیں پر ہے۔آپ لوگوں کو رہائش کی تنگی بھی نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے پتر اگر آپ لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''خلاف توقع وہ بہت جلد راضی ہوگئی۔

''تو پھر صبح باجی اور اکرم خان کو تیار کر لینا۔''

''اتنی جلدی؟''اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں نا ماں جی......ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ پہلے بھی ہم لوگوں نے بہت دیر کر دی ہے مزید لیٹ کرنے سے باجی کی بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔''میں جھوٹ پہ جھوٹ گھڑ رہا تھا۔

''اگر یہ بات ہے تو ہم صبح سویرے تیار ہو جائیں گی پتر۔''میں نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے ان سے اجازت چاہی اور اسلم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھر سے نکل آیا۔

امجد رضائی اوڑھے سو گیا تھا۔

''اسلم بھائی۔ممانی جان کو راضی کرتے کرتے باجی کے علاج کی سبیل بھی نکل آئی ہے حالانکہ اس کے متعلق ہمیں پہلے سے سوچنا چاہئے تھا۔بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا صبح شہر تک میں اور امجد آپ لوگوں کے ساتھ جائیں گے وہاں سے بینک سے کچھ رقم نکال کر دوں گا جس سے آپ نے سچ مچ باجی کا علاج کرانا ہے۔اس مقصد کے لیے انکل (امجد کے ابو) آپ کی رہنمائی کریں گے اور اس کے علاوہ اگر پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے تو مجھے تار دے دینا میں انشاءاللہ رقم آپ کو بھجوا دوں گا۔''

''اتنی رقم تو میری پاس بھی ہوگی کہ اپنی شریکِ حیات کا علاج کرا سکوں۔''

''وہ میری بہن ہے اسلم بھائی!......اور بہنوں کے بھائیوں پر بہت زیادہ حقوق ہوتے ہیں۔اگر عدنان کے قاتلوں کو کیفر کردار تک نہ پہنچانا ہوتا تو میں خود آپ کے ساتھ چلتا مگر......''

''آپ تو خفا ہی ہوگئے......''اسلم نے قطع کلامی کی۔''میری بات کا یہ مقصد نہیں تھا۔''

''اچھا چھوڑو اس مقصد کو۔''میں نے موضوع بدلا۔''اب یوں کرو کہ مورچے میں چلے جاؤ۔اپنی کلاشن کوف بھی ساتھ لے جانا۔

آج رات بہت احتیاط سے گزارنے کی ضرورت ہے کیونکہ دشمن بہت تیزی دکھا رہا ہے۔میں چند گھنٹے آرام کر کے تیری بدلی کرلوں گا۔''

''نہیں آپ آرام کریں میں اکیلا ہی کافی ہوں۔''اور پھر میرا جواب سنے بغیر وہ بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

+ + +

اسلم بھائی کے حوالے میں نے پچاس ہزار کے بقدر رقم کی اور انھیں کراچی کی گاڑی میں بٹھا کر ہم واپس گاؤں آگئے۔اڈے سے رحمٰن خیل کی طرف جاتے وقت پولیس کی ایک دو گاڑیاں ہمیں جنگل کی سمت جاتی دکھائی دیں۔

''یہ ہے ہماری تیز رفتار پولیس۔''امجد طنزیہ لہجے میں بولا۔''انھیں اب خبر ملی ہے۔''

''دفع کرو انھیں۔تم یہ بتاؤ کہ تمھاری چھٹی کتنی باقی ہے۔''

''ہے کوئی اٹھارہ انیس دن۔''

''میرا تو مشورہ ہے کہ تم بھی گھر چلے جاؤ اور چھٹی کے بقیہ دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارو۔''

''صحیح کہا آپ نے......بس یہ چودھری اکبر والا باب بند ہو جائے پھر چلا جاؤں گا۔''

''چودھری اکبر۔''میں نے دانت پیسے۔''بس اب تو زندگی کا مقصد یہی رہ گیا ہے۔''

''تو آج ہو جائے؟''

''نہیں......آج نہیں دو تین دن اس کے گھر کی نگرانی کرنے پڑے گی،اس کے متعلق کچھ ضروری معلومات حاصل کر کے ہم اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔''

''یہ تو ہے......''اس نے ثبات میں سر ہلایا۔''لیکن معلومات حاصل کریں گے کیسے؟''

''اس بارے مشورہ کرتے ہیں۔''میں تالا کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔

''مشورہ کیا کرنا ہے......اس کے کسی نوکر کو پکڑ کر سب کچھ اگلوا لیتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے لیکن اس طرح ہمیں اس نوکر کو قابو کرنا پڑے گا جو حویلی کے اندر کام کرتا ہو اور ایسے نوکر کی گمشدگی اسے چوکنا کر دے گی۔''

''تو پھر یوں کرتے ہیں کہ اسے گھر سے باہر کہیں گھیرے میں لیتے ہیں۔''امجد نے اپنے مشورہ سے رجوع کیا۔

''پچھلے دنوں وہ اپنی زمینوں پر چکر لگانے کے لیے گیا تھا،اسلم بھائی کہہ رہا تھا کہ باڈی گارڈز کی پوری پلاٹون اس کے ساتھ تھی۔ایسی حالت میں اس کا گھیراؤ کرنا ہم دو بندوں کے لیے بہت مشکل ہے اسی طرح اسے دور مار رائفل کے ذریعے بھی نشانہ بنایا جا سکتا ہے مگر اسے ایسی آسان موت کے حوالے کرنے پر میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا ہوں۔''

''چلو پھر خود ہی اس مسئلے پر روشنی ڈالو......میرے ذہن میں جو کچھ تھا اسے تُو نے ریجیکٹ کر دیا ہے۔''

''ہمارے دیہاتوں میں بہت پہلے سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ جب مرد کسی لڑکی کو پسند کر کے پھنسانے کی کوشش کرتا تو اس مقصد

کے لیے وہ کسی چالاک بوڑھی کو استعمال کرتا جو اس کے حق میں لڑکی کو ہموار کرتی ہے۔ کیونکہ ویسے تو ہمارے علاقے کا رواج ایسا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط کی گنجائش بالکل موجود نہیں۔ میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے؟''

''واہ بھئی واہ......اس کا مطلب ہے جناب کو کافی تجربہ اس کام کا؟''

''کہاں یار تیری بھابی......'' میں بے ساختہ سعدیہ کا نام لینے لگا تھا کہ مجھے چپ لگ گئی۔ امجد بھی خاموش ہو رہا۔ میں نے چادر اٹھائی اور چارپائی پر لیٹ کر اوڑھ لی۔ سعدیہ کی یادیں اس طرح امڈی چلی آ رہی تھیں جیسے برسات میں بادل اکٹھے ہوتے ہیں۔ میری آنکھوں کے کونے نم ہونے لگے۔ میں نے کروٹ بدل کر چادر سر تک اوڑھ لی، آنسو روکنا بے شک مشکل ہے مگر انھیں لوگوں سے تو چھپایا جا سکتا ہے۔

''واپس کب آؤ گے۔'' وہ میری قمیض کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ اگر چھٹی نہ ملے تو نائیٹ پاس لے کر آ جانا۔'' وہ یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے مجھے آخری مرتبہ الوداع کرتے وقت کہے تھے اور یہی وہ الفاظ تھے جو ہر مرتبہ چھٹی ختم ہونے پر مجھے رخصت کرتے وقت وہ کہتی تھی اور جواباً میں اسے سینے سے لگا کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیتا اور کہتا......

''بس چند دن کی تو بات ہے۔ یوں گیا اور یوں آیا۔''

''ہنہ چند دن۔ پتا بھی ہے تیری جدائی میں گزرنے والا ہر دن مجھے صدیوں پر محیط لگتا ہے۔ تم نہ جانے اتنا عرصہ کیسے گزار لیتے ہو؟''

''جب مر جاؤں گا تو پھر کیا کرو گی؟''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ بڑے وثوق سے کہتی۔

''کیوں؟'' میں ہر دفعہ اس کا جواب جانتے ہوئے بھی مستفسر ہوتا۔

''کیونکہ میں اپنے رب سے ایک دعا ہمیشہ مانگتی رہتی ہوں، کہ اے میرے رب ہمیں اکٹھی موت دینا یا پھر مجھے اپنی جان کے مرنے کا دکھ نہ پہنچانا اور مجھے اس سے پہلے اٹھا لینا۔''

اور اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی تھی۔ اب مجھے اس کی جدائی کا دکھ سہنا تھا۔ بے شک وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے، مگر کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں کہ ٹھیک ہونے کے بعد بھی ان کا نشان باقی رہتا ہے۔ وہ بھی میرے جگر پر کچھ ایسے ہی زخم چھوڑ گئی تھی کہ جن کا مندمل ہونا بہت مشکل تھا۔

یہ صرف انتقام لینے کا جذبہ تھا کہ جس نے میرے ہوش و حواس قائم رکھے تھے ورنہ میرا حال بھی اپنی باجی جیسا ہوتا۔

ایک دفعہ طبی نسخوں کی کتاب میں پڑھا تھا کہ اگر کسی شخص کو لقوہ ہو جائے تو اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارنے سے بعض اوقات لقوہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور ایسا صرف اس مریض کے اندر پیدا ہونے والے غصے کی وجہ سے ہوتا ہے جو بے قصور تھپڑ کھا کر اس کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

میرے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے اثرات بھی شاید مجھے ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج کر دیتے مگر انتقام لینے کے جنون نے اب تک مجھے اپنے حواسوں میں قائم رکھا تھا۔ ہم دونوں کافی دیر چپ چاپ اپنے خیالوں میں گم صم لیٹے رہے۔ یہاں تک کہ مسجد سے شام کی

اذانیں سنائی دینے لگیں۔

''جانو صاحب کچھ کھانے پینے کے بارے میں سوچو۔'' بیٹھک میں چھائی خاموشی کو امجد کی آواز نے توڑا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ امجد کا بھی یہی حال ہوگا، مگر ماحول پہ چھائی اداسی ختم کرنے کے لیے اس نے میرا سوچیں موڑنے کی کوشش کی تھی۔

''صبح جانے سے پہلے ممانی جان نے ایک دن کے لیے کھانا تیار کر کے رکھ دیا تھا۔ چلو وہی گرم کرتے ہیں۔'' میں چارپائی سے اٹھ گیا۔

''میں بھی چلوں؟''

''ہاں...... ہاں اب کون سا پردہ نشین خواتین بیٹھی ہیں۔''

''چلو پھر۔'' باورچی خانے میں گھس کر ہم نے صبح کی بنی ہوئی روٹیاں اور سالن گرم کیا، اور ایک دوسرے کو دکھانے کے لیے ایک دو نوالے زہر مار کرنے کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے۔

''تو پھر تُو نے کیا سوچا ہے؟'' کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے امجد نے پوچھا۔''ایک دو عورتیں میری نظر میں ہیں۔ صبح ان سے ملاقات کریں گے۔''

''اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ عورت اکبر خان کی خیر خواہ نہ ہو یا کسی دوغلی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اسے خبر نہ کر دے۔ ایسی صورت میں ہم خود پھنس جائیں گے۔''

میں نے کہا۔''یہ رسک تو لینا پڑتا ہے۔ بہر حال کوشش یہی ہوگی کہ اسے زیادہ پیسوں کا لالچ دے کر غداری سے باز رکھا جائے۔'' اور امجد فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک ہم مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ امجد جمائی لے کر بولا۔

''چلو یار سوتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم ادھر ہی سو جاؤ۔ میں اوپر مورچے میں سوؤں گا۔'' (قارئین کی معلومات کے لیے بتلاتا چلوں کہ ہم گنڈہ پوروں میں یہ رواج ہے کہ مکان میں مورچہ ضرور بناتے ہیں اور اس مقصد کے لیے عموماً مکان کی چھت استعمال کرتے ہیں)

''دونوں اوپر ہی چلتے ہیں۔'' امجد اٹھ گیا۔

''نہیں اوپر صرف ایک بندے کے سونے کی جگہ ہے۔ اس لیے تم بیٹھک میں ہی ٹھیک ہو۔ یوں بھی دشمن کے حملہ کرنے کی صورت میں ہم دونوں میں سے ایک بندے کا نیچے ہونا ضروری ہے اسی طرح ہم ان کو منہ توڑ جواب دینے کے قابل ہوں گے۔'' یہ کہہ کر میں سیڑھی کے ذریعے چھت چڑھنے لگا جبکہ امجد بیٹھک میں گھس گیا۔

+ + +

وہ رات بھی خیریت سے گزری، صبح امجد کے مشورے پر ہم دونوں نے ناشتا کرنے کے لیے پہلوان ہوٹل کا رخ کیا۔ کلاشن کوف امجد نے کندھے سے لٹکا کر اوپر سے جیکٹ پہن لی جس نے کلوز بٹ کلاشن کوف کو بالکل چھپا دیا تھا۔

ہوٹل میں ڈرائیور اور مزدور حضرات کا کافی رش تھا۔ ہم دونوں نے بھی ایک چارپائی پر بیٹھ کر چائے اور حلوہ پوری کا آرڈر دے دیا۔ خوب ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد جب میں گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ امجد جو اخبار پڑھنے میں منہمک تھا بولا۔

''جانو صاحب!...... یہ دیکھو'' اس نے اخبار میری طرف بڑھایا۔ اخبار دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ لکھا تھا......

''پولیس کا ڈاکوؤں سے تصادم 9 ڈاکو ہلاک۔'' خبر کی تفصیلات میں اخبار نے لکھا تھا کہ ''ڈی آئی خان کے سرحدی گاؤں رحمٰن خیل میں شاہ نواز اور دلدار خان نامی دو آدمیوں نے رحمٰن خیل تھانے میں اطلاع دی کہ انھوں نے رحمٰن خیل کے ساتھ گزرنے والے برساتی نالے کے اندر موجود جھاڑیوں کے جھنڈ میں بہت سارے مسلح افراد کو دیکھا ہے جو وہاں پر نا معلوم منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ تھانیدار طاہر نے اس اطلاع پر بجلی کی سی تیزی سے عمل کیا اور تھانے میں موجود پولیس کی ناکافی نفری کے ساتھ مجرموں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا۔ پولیس کو دیکھتے ہی ڈاکو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ دو طرفہ فائرنگ میں تھانیدار اور پولیس کے 5 جوانوں نے ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے 9 ڈاکوؤں کو ہلاک کر دیا اس دوران افسوسناک واقعہ یہ ہوا کہ پولیس کو اطلاع دینے والے دونوں معزز شہری جو جنگل تک ڈاکوؤں کی نشاندھی کرنے کے لیے پولیس کے ساتھ گئے تھے ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ تمام ڈاکو اشتہاری اور اس سے پہلے کئی ایک کیسوں میں پولیس کو مطلوب تھے۔''

''بھئی واہ...... تھانیدار کی تو عید ہو گئی۔''

''اچھا ہوا...... ورنہ چودھری اکبر دوبارہ بھی تیرے خلاف کیس دائر کر سکتا تھا اور اس مرتبہ تو اس کی بات بھی برحق ہوتی۔''

''احمق ہے تُو...... کیونکہ ایک تو مرنے والے ڈاکو تھے جن سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے دوسرے چودھری اکبر کے پاس میری اس کارروائی کا کیا ثبوت ہے؟''

''بہرحال...... ہمارے لیے یہ بہت اچھا ہو گیا۔'' امجد جانے کے ارادے سے اٹھ گیا۔

ناشتے کا بل پے کر کے ہم واپس گھر کی طرف چل دیئے راستے میں گھر کی چابی امجد کے حوالے کر کے میں اپنے مطلوبہ مکان کی سمت بڑھ گیا۔

اس کا نام شمشاد خاتون تھا۔ گاؤں میں وہ صرف خاتون کے نام پر مشہور تھی۔ اس کے والدین بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے چچا کے ہاں پرورش پائی، جو دن رات اس سے گدھے کی طرح کام لیتا تھا اور اس کے بالغ ہوتے ہی چچا نے اسے گلفام گل کے ہاتھ دس ہزار روپے میں بیچ دیا۔ گلفام صرف نام کا گلفام تھا مگر بلوغت تک ظلم سہنے والی کے پیار کے بولوں سے ناآشنا کانوں نے جب گلفام جیسے بدصورت کے ہونٹوں سے محبت بھری سرگوشیاں سنیں تو وہ ہونٹ اسے دنیا کے سب سے پیارے ہونٹ لگے۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ شادی چند ماہ بعد گلفام کو بخار ہوا اور ہفتہ ڈیڑھ چارپائی پر گزار کر وہ اسے چھوڑ کر بہت دور چلا گیا۔

گلفام کا گھرانہ صرف گلفام اور اس کی ماں پر مشتمل تھا۔ خاتون کی شراکت سے وہ دو سے تین ہوئے تھے مگر گلفام کی موت نے

انھیں دوبارہ تین سے دو کر دیا۔ گلفام کی والدہ بھی اپنے بیٹے کے بعد بمشکل دو مہینے زندہ رہ کر چل بسی اور شمشاد خاتون دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ گلفام کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، گاؤں کے اندر گلفام کی کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی اس کی موت کے بعد خاتون نے وہ دکان بیچ کر کچھ عرصہ تو اس رقم سے گزارا کیا، لیکن کب تک آخر اس کو کام کیے گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ اس مقصد کے لیے اس نے گاؤں کے متمول گھروں میں جا کر ان کے لیے مختلف کام کے لیے اور پیٹ کے جہنم کا سدِ باب کیا۔ اسی دوران اتفاق سے اس نے پڑوسی کے بیٹے کے لیے ایک مناسب رشتہ ڈھونڈا اور پھر یہ کام مستقل کرنے لگی یوں بھی وہ دن کو فارغ ہوتی، تنہائی دور کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ وہ مختلف گھروں میں جا کر گھر کی عورتوں سے گپ شپ کرتی اور اس دوران مختلف لڑکیاں اور لڑکے بھی اس کی نظر سے گزرتے جو کسی رشتے کے متلاشی کی درخواست پر اس کے کام آتے۔ بھائی احمد جان اور میرے رشتے کے لیے بھی وہ امی جان کے پاس آئی تھی مگر ہمارے رشتے پہلے سے طے تھے اس وجہ سے امی جان خوب صورتی سے ٹال گئی تھیں۔ اس کے متعلق یہ معلومات اسی وقت مجھے اپنی بڑی بھابی جان سے معلوم ہوئی تھی۔

رات کو امجد کے ساتھ بیٹھ کر چودھری اکبر کے گھر جاسوسی کرنے کے لیے اسی شمشاد خاتون کا چناؤ ہوا تھا اور اس وقت میں دائیں بائیں غور سے دیکھتا اس کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ دن کے نو دس بجے کا ٹائم تھا۔ اس وقت زیادہ تر لوگ اپنے کھیتوں کی جانب نکلے ہوئے تھے اس لیے گلی سنسان پڑی تھی۔ میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور گلی کے دونوں جانب نگاہ دوڑائے رکھی میری کوشش تھی کہ خاتون کے پاس میری آمد خفیہ رہے ورنہ یہ بات چودھری اکبر تک پہنچ جاتی تو میرا پلان فوت ہو جاتا۔ اندرونی جانب قدموں کی چاپ ابھری اور پھر کنڈی گراتے ہوئے اس نے کواڑ کھول کر پوچھا۔

"جی؟"

وہ تیس پینتیس سال کی قبول صورت عورت تھی۔ گو ہمارے علاقے میں پردے کا بہت زیادہ رواج ہے مگر اس نے اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ کر رکھا تھا۔ اس کی طرف میری پشت تھی۔ میں پیچھے مڑا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا۔ مجھے دیکھتے وہ وحشت زدہ لہجے میں چلائی...... "تت...... تم" اور بغیر کچھ مزید کہے اندرونی جانب دوڑی۔ عجلت میں وہ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس کے ردِ عمل پر ایک لمحے کے لیے تو میں سن رہ گیا مگر پھر ایک خیال کے تحت میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی کمرے کے جانب جا رہی تھی۔ میں قلانچیں بھرتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا اس کے کمرے میں گھستے ساتھ میں بھی اندر داخل ہوا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ دیوار کے ساتھ لٹکی بارہ بور بندوق کے جانب بڑھی اور اسے اتار کر پیچھے مڑی، میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی طرف سے اتنے شدید ردِ عمل کا اظہار میرے لیے بلاشبہ اچنبھے کا باعث تھا۔ مگر اتنا مجھے پتا چل گیا تھا کہ بندوق اس نے میرے خلاف ہی اٹھائی تھی۔

اس کے بندوق سیدھا کرنے سے پہلے میں نے بندوق پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے بندوق چھین لی۔ میری ذرا سی سستی سے مجھے

ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔گنڈہ پور خواتین تو کلاشن کوف وغیرہ بھی آسانی سے چلا سکتی ہیں اس وقت تو اس نے یوں بھی بارہ بور پکڑی تھی جس میں نشانہ لینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی بس مطلوبہ سمت رائفل کی بیرل کو موڑ کر اگر ٹریگر دبا دیا جائے تو کوئی نہ کوئی چھرہ اپنا ہدف ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

رائفل ہاتھ سے نکلتے ہی اس کے چہرے پر چھائی وحشت خوف میں بدل گئی اور وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''تت...... تمھیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے میں اس میں قطعاً ملوث نہیں ہوں۔''

اس کی بات سنتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور چچا فاضل کی کہی ہوئی بات میرے دماغ میں گونجی۔''پتر اس دن مجھے بے ہوشی کی طرح نیند آئی تھی۔حالانکہ میری نیند بہت کچی ہے۔''

''گویا یہ ہے وہ آستین کا سانپ!''میرے ذہن میں سرعت سے یہ سوچ ابھری اور میں غضبناک لہجے میں دھاڑا۔

''کیوں...... چودھری جھوٹ بول رہا ہے کیا؟''چودھری اکبر کہنے سے میں نے دانستہ گریز کیا تھا کیونکہ نا معلوم اس کو کس نے اس کام کے لیے ابھارا تھا۔

''وہ کمینہ تو مکار ہے۔اپنے ماموں اور بھائی کو قتل کر کے اس کا الزام تمھارے سر تھوپ دیا۔''

''تمھارا اس بارے کیا خیال ہے۔''میں نے ذو معنی لہجے پوچھا۔

وہ روانی میں بولی۔''و...... وہ جھوٹ بول رہا ہے۔یہ کام کسی اور نے کیا ہے۔''

''کون سا کام؟''میں نے یکدم پوچھا۔

''یہی...... آپ کے گھر والوں کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملانے والا۔''

''مگر میں نے تو تم سے اس قسم کی کوئی گفتگو نہیں کی۔''جذبات کی شدت میں مجھے اپنے اوپر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا اور میں جس سلسلے میں اس کے گھر تک آیا تھا وہ مقصد میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

''مم...... میں نے س...... سس سوچا کہ......''وہ ہکلانے لگی۔

''کنجری۔''میرا بایاں تھپڑ پوری قوت سے اس کے چہرے پر لگا وہ اچھل کر نیچے جا گری۔ہمارے رسم و رواج میں عورت پر ہاتھ اٹھانا معیوب سمجھا جاتا ہے مگر اس وقت میرے دماغ پر سرخ چادر تن گئی تھی اور مجھے اپنے رسم و رواج بھول گئے تھے۔اس منحوس عورت نے درحقیقت بہت بڑا ظلم کیا تھا کہ احمد جان، محمد جان اور حاکم جان جیسے شیروں کو گیدڑوں کی خاطر بے بس کر دیا تھا۔اگر وہ ہوش میں ہوتے تو اکبر خان جیسے بزدل ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔سعدیہ جیسی گلفام اور عدنان جیسے معصوم جو پھولوں کی سیج کے لیے بنے ہوئے تھے انھیں بے رحم شعلوں کے حوالے کر دیا تھا۔

نیچے گرتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر چکرا کر گر پڑی۔میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑا اور جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔

''تُو نے بہت ظلم کیا...... بہت زیادہ۔'' اپنی آواز مجھے خود ہی اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

''مم......مم...... مجھے پپ پتا نہیں تھا کہ اس اس کک۔کا کیا مقصد تھا۔مم میں بب بے گناہ ہوں۔'' وہ منمنائی۔

میں نے اسے جھٹکا دے کر کمرے میں پڑی اکلوتی چارپائی پر پھینکا...... ''مجھے تمام تفصیلات بتلاؤ۔ہو سکتا ہے تیرے ناپاک خون سے ہاتھ رنگنے سے بچ جاؤں۔''

''چچ چودھری اک...... اکبر نے مجھے ایک شیشی دے کر کہا تھا کہ تمھارے گھر جا کر رات کے لیے پکنے والی ہانڈی میں یہ شیشی ڈال دوں۔جب میں نے اس کا مقصد پوچھا تو اس نے بتلایا کہ اس نے تمھارے گھر والوں کو بیہوش کر کے وہاں سے زمین کے کاغذات چرانے ہیں۔اب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنا ظلم کرے گا۔بس میں آپ کی امی جان سے ملنے گئی اور پھر پانی پینے کے بہانے کچن میں جا کر رات کو تیار ہونے والی ترکاری میں وہ شیشی الٹ دی اور......اور واپس آ گئی۔''

''اب مجھے دیکھ کر تم اندر رائفل اٹھانے کس لیے بھاگی تھی۔کیا تم مجھے بھی قتل کرنا چاہ رہی تھی۔''

''نن......نہیں میں تمھیں دیکھ کر بدحواس ہوگئی تھی اور اپنی جان بچانے کے لیے غیر ارادی طور پر اندر کی جانب دوڑ پڑی۔''

''جب میرے گھر کو آگ لگا دی گئی تو تم نے بعد میں پولیس کو اس سازش کے متعلق کیوں نہیں بتایا؟''

''پولیس...... مجھے اس کام پر راضی کرنے کے لیے چودھری اکبر نے پولیس کا ہی سہارا تو لیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''میں لہجے میں حیرانی در آئی۔

''جس وقت چودھری اکبر نے مجھے اس کام کے لیے بلایا تھا اس وقت تھانیدار طاہر خان بھی اس کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا۔اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پولیس بھی اکبر خان کی ہمراز اور ساتھی تھی۔''

''تم مجھ سے بھی تو مل سکتی تھی،خصوصاً اس وقت جب میں حوالات میں تھا یا جس وقت میں ضمانت پر گھر آیا ہوا تھا۔ابھی تو مجھے باعزت بری ہوئے بھی تین چار دن ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی تو نے مجھے یہ بات بتانے کی زحمت گوارہ نہ کی۔''

''میں کس منہ سے آپ کے پاس آتی۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔''یہی بتانے کے لیے کہ تمھارے خاندان کو قتل کرنے میں مَیں بھی ملوث ہوں۔بے شک یہ کام دھوکے میں رکھ کر مجھ سے لیا گیا تھا۔مگر ان ظالموں کے ساتھ میں بھی گناہگار تو ہو گئی تھی نا؟''

''تمھاری ان باتوں پر میں کیسے یقین کروں۔'' میرا دل اس کی باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا حالانکہ بظاہر اس نے ٹھوس دلائل دیئے تھے اور سوائے مجھ پر رائفل تاننے کے۔اس کی باتوں میں کوئی واضح جھول نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ٹھہرو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے چارپائی سے اٹھ کر قبلہ کی سمت کی دیوار میں بنے طاق کی جانب بڑھی جہاں قرآن مجید پڑا ہوا تھا۔جیسے ہی اس کی پشت میری جانب ہوئی میں نے سنگل نال والی بارہ بور بندوق کو کھول کر اس میں سے کارتوس نکال کر جیب میں ڈال لیا۔

اس نے غلاف میں لپٹے قرآن مجید کو بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا اور بولی......

''عمر جان...... مجھے اس کی قسم ہے۔''

''بس اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔''

اس نے تشکر بھرے انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے قرآن مجید کو بوسہ دے کر واپس طاق پر رکھ دیا۔ یوں بھی آج کے مسلم نے قرآن مجید کو فقط حلف اٹھانے کے لیے گھروں میں رکھا ہوا ہے ورنہ اس کی تعلیمات سے ہم اتنے ہی دور ہیں جتنے مشرک کعبے سے۔ میں نے رائفل چارپائی پر پھینکی اور واپس مڑنے سے پہلے بولا......

''خاتون غلطی تو تمھاری بہت بڑی ہے لیکن یہ کام تم سے نادگنی میں لیا گیا ہے۔ آئندہ کے لیے میری یہ بات یاد رکھنا کہ ایسے کمینے اور گھٹیا لوگوں کی بات پر یقین کر کے کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ جس پر تمھیں ہمیشہ پچھتانا پڑے۔'' یہ کہہ کر میں لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا اس کے گھر سے نکلتا چلا گیا گو میرے گھر والوں کی موت میں اس کا بڑا ہاتھ تھا مگر یہ سب کچھ اس سے دانستگی میں کرایا گیا تھا اس طرح مجرم ہوتے ہوئے بھی وہ اتنی گناہگار نہیں تھی کہ اسے موت کی سزا دی جاتی یوں بھی وہ عورت تھی اس کے برعکس ہونے کی صورت میں شاید وہ مجھ سے نہ بچ پاتی۔

میں اس کے گھر سے نکل کر چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''عمر جان۔'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی مجھے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کی جانب جانا پڑا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کے قریب پہنچ کر میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''اگر آپ مجھے چند منٹ دے سکیں تو ایک بات آپ کو بتانی ہے شاید آپ کے کام آسکے۔'' اس کے لہجے میں ندامت اور شرمندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ مجھے بھی گلی کے اندر رک کر اس کے ساتھ بات چیت کرنا معیوب سا لگا اور میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

''تشریف رکھیں۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اکلوتی چارپائی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''نہیں میں اسی طرح ٹھیک ہوں کہو کیا کہنا ہے؟۔''

وہ اصرار نہ کرتے ہوئے بولی۔ ''عمر جان مجھے نہایت معتبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ تمھارا اصل مجرم اکبر خان رحمٰن خیل سے فرار ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی تمام جائیداد اور زمینیں کالی وال کے خان میر نیاز خان کو بیچ دی ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ گنڈہ پور ہونے کے ناطے آپ نے لازماً اس سے اپنے گھر والوں کے قتل کا بدلہ لینا ہے اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو یہ بات بتلا دوں تاکہ اس کے فرار سے پہلے آپ نے جو کچھ کرنا ہے کر لیں۔''

''میرے ڈر سے بھاگ رہا ہے؟''

''تیرے ڈر کے ساتھ اسے قانون کا خوف بھی لاحق ہے کیونکہ اس کے بھانجے اور بہن نے آپ کے باعزت بری ہونے پر اس کے خلاف ماموں اور بھائی کے قتل کا مقدمہ درج کروا دیا ہے۔ وہ اپنی بہن کی شادی میر نیاز خان کے بیٹے سے کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر اس کی بہن اس رشتے پر راضی نہیں تھی۔ اس کی اپنی منگنی میر نیاز خان کی بیٹی سے ہوگئی ہے مگر ان حالات میں شاید وہ بھی ٹوٹ جائے...... انسپکٹر طاہر گو اس کا دوست اور ہمراز ہے مگر ایسے شخص کی دوستی صرف اسی وقت تک تھی جب تک کہ اسے چودھری سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ اس کی مثال بالکل اس قصائی کی سی ہے کہ جیسے ہی دودھ دینے والے جانور کا دودھ خشک ہوا اسے ذبح کر دو انھی وجوہات کی بدولت اس نے اپنی تمام زمین و جائیداد میر نیاز خان کے ہاتھ فروخت کر دی ہے اور خود کسی بھی وقت غائب ہو سکتا ہے۔''

''اس کی بہن اس کے خلاف ہوگئی ہے...... بڑی عجیب بات ہے۔''

''عجیب وغریب کوئی نہیں...... جو شخص جائیداد کے حصول کے لیے اپنے سگے بھائی کو قتل کر سکتا ہے اس کے لیے اپنی بہن کو راستے سے ہٹانا کون سا مشکل کام ہے اور یہی کچھ سوچ کر شہلا بی بی اس کے خلاف ہوئی ہے۔''

''اچھا ایک بات تو بتاؤ خاتون۔''

''پوچھو؟''

''کیا آپ چودھری اکبر کی حویلی کے متعلق معلومات مجھے مہیا کر سکتی ہیں۔''

''کیوں نہیں۔ میں نے اس حویلی کو کافی باریکی سے دیکھا ہوا ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی وہ اکبر خان کی حویلی کے بارے تفصیلات بتلانے لگی۔ محافظوں وغیرہ کی تعداد سے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا البتہ باقی ساری تفصیلات اس نے بڑی وضاحت سے میرے گوش گزار کر دیں۔

''شکریہ خاتون باجی۔'' اس کی بات ختم ہوتے ہی میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

''عمر جان...... مم مجھے معاف کر دینا بھائی!'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے مم مگر۔ بخدا ایسا نادانستگی میں ہوا...... مجھے ان سے اتنے ظلم کی توقع نہیں تھی۔''

''میں نے تمھیں معاف کر دیا ہے بہن۔''

''اللہ سوہنا آپ کو خوش رکھے...... آپ کو ہر قدم پر کامیابیاں ملیں۔ آپ......'' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے دعائیں دینے لگی اور جیسے ہی اس کی مناجات ختم ہوئیں میں اس سے اجازت لے کر اس کے گھر سے باہر آ گیا۔ میں تھوڑی دور ہی آیا ہوں گا کہ تڑتڑاہٹ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ فائرنگ کی سمت کا اندازہ کر کے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی کیونکہ یہ آواز اسلم بھائی کے گھر کی سمت سے آ رہی تھی۔ میں نے کوٹ کی اندرونی جیب کو تھپتھپا کر پسٹل کی موجودی کا یقین کیا اور گھر کے جانب دوڑ پڑا۔

+ + +

گھر کا وہاں سے فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ مجھے وہاں پہنچنے میں دیر لگتی...... میں چند منٹوں میں وہاں پہنچ گیا اپنی گلی میں گھستے وقت میں نے احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رفتار کم کر دی تھی مگر بیٹھک میں امجد کو آرام سے چار پائی پر لیٹے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ میری تیزی اور احتیاط فضول تھی۔

''بڑی دیر لگا دی۔'' مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔''ویسے کیا رہا؟''

''بس یار۔وہ کہتے ہیں نا آگ لینے گیا تھا اور پیغمبری مل گئی۔کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے مشن کامیاب رہا؟''

''توقع سے بھی زیادہ۔''

''کچھ پتا بھی چلے؟'' اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

''چچا فاضل کا اندازہ ٹھیک تھا میرے گھر والوں کے کھانے میں اس دن بے ہوشی کی دوا ملائی گئی تھی اور ایسا کرنے والی وہی خاتون نامی عورت تھی جس کے پاس میں گیا تھا۔مجھے دیکھتے ہی وہ بدک گئی۔اسے لگا شاید اس کے بارے مجھے پتا چل گیا ہے اور میں اس سے حساب لینے پہنچ گیا ہوں۔اور اسے اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے ہوئے میں نے اس سے تمام باتیں اگلوا لیں۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

جواباً میں نے خاتون سے سنی ساری باتیں اس کے سامنے دہرا دیں۔

''گڈ......اس کا مطلب ہے آج رات چودھری اکبر کے درشن ہوں گے؟''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کلاشن کوف ایک کافی رہے گی یا دوسری بھی نکال لائیں؟''

''دوسری گن لازماً لانی پڑے گی......کیونکہ پستول کے سہارے دشمن کے گھر گھسنا بیوقوفی ہے۔یوں بھی چودھری اکبر ڈرپوک قسم کا بندہ ہے اس نے لامحالہ اپنی حفاظت کے لیے کافی بندوں کو پہرے پر لگایا ہوگا۔''

''تو ابھی جا کر......ایک اور گن نکال لاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔''نہیں شام کو کھانا کھا کر نکلیں گے۔'' اور وہ با دل نخواستہ بیٹھ گیا۔اس کے بعد ہم چودھری اکبر کے گھر میں گھسنے کے منصوبے بنانے لگے۔

شام کو کھانا کھا کر ہم کلاشن کوفوں کے مدفن کی طرف بڑھ گئے۔مگر ہمارا وہاں پہنچنا بے فائدہ ہی رہا۔کوئی پہلے سے ہی وہ ہتھیار نکال کر لے گیا تھا۔

''یہ اچھی رہی۔'' امجد نے منہ بنایا۔

''کوئی بات نہیں یار...... چودھری کے ملازموں کی گنیں بھی تو اپنے لیے ہی ہیں۔'' مگر وہ جواباً خاموش ہی رہا۔

واپس پہنچ کر ہم رات گئے تک گپوں میں مصروف رہے۔اس دوران ہم نے پلان کا ازسرِ نو جائزہ لے لیا تھا۔رات کے ڈیڑھ بجے ہم گھر سے نکلے کلاشن کوف امجد کے پاس تھی جبکہ میں نے اپنے پاس دو پستول رکھ چھوڑے تھے۔گلیاں بالکل سنسان پڑی تھیں،موسم میں کافی تبدیلی آ چکی تھی اس لیے ہم دونوں نے ہلکے پھلکے لباس پہنے ہوئے تھے،مگر چہروں پر مفلر لپیٹنا ہم نہیں بھولے تھے۔

چودھری اکبر کے گھر تک ہم بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ گئے۔وہ حویلی ہمارے گھر سے بڑی تھی۔دو منزلہ پختہ حویلی جو دور سے ہی سے قلعہ نما نظر آتی،کیونکہ بیرونی دیواروں کی بلندی کسی بھی طرح 11,10فٹ سے کم نہ تھی۔حویلی کے گرد ایک چکر لگا کر ہم دونوں حویلی کے پچھواڑے رک گئے۔مین گیٹ کے باہر بھی ہمیں کوئی چوکیدار نظر نہیں آیا تھا۔حویلی کی دیوار سے پشت ٹکا کر امجد نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ہاتھ سامنے پکڑ لیے۔میں نے اپنا ایک پاؤں اس کے ہاتھوں پر اور دوسرا کندھے پر رکھتے ہوئے آسانی سے دیوار پر چڑھ گیا،دیوار کافی چوڑی تھی میں نے اوپر لیٹ کر امجد کی جانب اپنا ہاتھ لٹکایا جسے پکڑ کر امجد بھی اوپر آ گیا اور میرے ساتھ لیٹ کر حویلی کے وسیع صحن کا جائزہ لینے لگا۔

''خاتون نے کیا بتایا تھا؟......آیا چودھری اکبر نے کتے رکھے ہوئے ہیں یا نہیں؟''اس کی آواز سرگوشی کی مانند تھی۔

''اس بارے تو میں نے نہیں پوچھا تھا؟''

''بہت اچھا کیا۔''اس نے منہ بنایا۔''ایسی باتیں پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''سوری یار!......لیکن ادھر گھسنے کا منصوبہ بناتے وقت تمھیں بھی تو کتے یاد نہیں رہے تھے۔''

''یہ تیری صحبت کا اثر ہے......ورنہ اتنی ضروری بات مجھے کبھی بھی نہ بھولتی۔''

''اب کیا کریں؟''

''ابھی ایک خطرہ تو اس سے ہے۔''امجد نے حویلی کے پچھلے جانب دائیں کونے میں موجود مورچے کی جانب اشارہ کیا جو ٹاور نما تھا۔''نا معلوم اس میں کتنے افراد موجود ہوں گے۔دوسرا خطرہ کتوں کا ہے مگر امید ہے وہ نہیں ہیں اگر ہوتے تو لازماً اب تک انھیں ہماری موجودی محسوس ہو گئی ہوتی۔تیسرا خطرہ گیٹ پر موجود چوکیدار سے ہے اس کے علاوہ اگر چودھری اکبر نے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کیا ہوا تو حویلی کی دیواروں کے ساتھ چاروں طرف گھومنے والے پہرہ دار بھی موجود ہو سکتے ہیں اسی طرح چھت پر بھی کوئی نہ کوئی موجود ہو سکتا ہے،لیکن اتنی بات بہرحال کنفرم ہے کہ ابھی تک ہم کسی کی نظر میں نہیں آئے۔''

''تمھاری ساری بکواس میں مطلب کی بات کوئی نہیں۔کیونکہ ان ساری جزئیات پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے،اور یہ گمان کہ ابھی تک ہم ان کی نظر میں نہیں آئے،سراسر احمقانہ خیال ہے۔ہو سکتا وہ ہمیں دیکھ چکے ہوں اور صرف ہمارے دیوار سے نیچے اترنے کے منتظر ہوں۔''

’’ٹھیک ہے تم ادھر ہی رہو، مجھے کور مہیا کرنا میں نیچے جا رہا ہوں۔‘‘ امجد نے نیچے اترنے کے لیے پہلو بدلا۔

’’ایک منٹ۔‘‘ میں نے اسے روکا۔ ’’کلاشن کوف تمھارے پاس ہے میں پستول سے کس طرح تمھیں کور مہیا کروں گا؟‘‘

’’تو یہ لو...... کلاشن کوف تم رکھ لو۔‘‘ اس نے کلاشن کوف میری جانب بڑھائی۔

میں نے کہا۔ ’’نہیں، تمھارا نشانہ اچھا ہے۔‘‘ پھر اس کا جواب سنے بغیر دیوار سے نیچے لٹک گیا اور نہایت آہستگی سے پنجوں کے بل کودا۔ ہلکا سا دھماکہ ہوا میں دیوار کے کونے میں ہی دبک کر بیٹھ گیا۔ جب چند لمحوں تک کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تو میں دیوار کی جڑ میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ دائیں کونے میں موجود مورچے کی جانب بڑھنے لگا۔ پستول جیب سے میرے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا۔ چاند کی سات یا آٹھ تاریخ تھی اور ابتدائی تاریخوں کا چاند اس وقت تک ڈوب چکا تھا۔ حویلی کے سامنے کے حصے میں جلنے والا بلب اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ حویلی کی عقبی سمت روشنی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا اور یہ حفاظتی تدابیر سے ناواقفیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ چند لمحوں بعد ہی میں دائیں کونے میں موجود اس اکیلے کمرے تک پہنچ گیا جس کی چھت پر مورچہ بنایا گیا تھا۔ کمرے کے ساتھ چھت پر چڑھنے کے لیے کوئی سیڑھی موجود نہیں تھی میں نے دروازے کو دھکیلا تو اسے بند پایا۔ کنڈی کو ہاتھ لگانے سے اس کی کنڈی مجھے باہر سے بند نظر آئی۔ دروازہ کھول کر میں محتاط انداز میں اندر داخل ہوا اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر روشن کی۔ کونے میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی جس پر ایک میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں لوہے کی ایک سیڑھی نصیب تھی جس کے ذریعے چھت پر موجود مورچے تک پہنچا جا سکتا تھا سیڑھی کے ذریعے میں اوپر مورچے میں پہنچا، کنڈی کے باہر سے لگا ہونے کی وجہ سے میں نے زیادہ احتیاط سے کام لینا مناسب نہ سمجھا...... اندازے کے مطابق مجھے مورچہ خالی ملا تھا۔

میں سیڑھی کے ذریعے نیچے آیا اور تیز قدموں سے امجد کی جانب چل دیا۔ میرے اشارے پر وہ بھی دیوار سے لٹک کر پنجوں کے بل

پر کودا۔

’’مورچے میں کوئی موجود بھی تھا یا......‘‘

اور میرا سر نفی میں ہل گیا۔

’’ٹھیک ہے...... اب تم دائیں اور میں بائیں طرف سے چکر کاٹ کر گیٹ کی طرف چلتے ہیں۔ خطرے کی صورت میں بلی کی آواز نکالنا۔‘‘ اور میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دائیں طرف چل پڑا۔ اندھیرے میں تو میں بے فکری سے چلتا رہا مگر جیسے ہی اندھیرے سے نکل کر حویلی کے برآمدے میں لگے بلب کی ملگجی روشنی میں پہنچا، دیوار کی جڑ میں ہو گیا اور احتیاط سے گیٹ کے ساتھ بنی ہوئی کوٹھری نما کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ امجد اور میں تقریباً ایک ہی ٹائم گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کمرے کے قریب پہنچے۔ ہم نے ایک دوسرے کو ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کرتے ہوئے اوکے کا سگنل دیا۔ اس کے بعد امجد مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے کمرے کے دروازے کی

جانب بڑھا۔ دروازے کے کواڑوں کو آہستگی سے دھکیلتے ہوئے وہ احتیاط سے اندر گھس گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی مجھے ہلکا سا کھٹکا سائی

دیا اور اس کے بعد امجد نے دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا جبکہ اکلوتی چارپائی پر ایک شخص گردن تک چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ امجد کے چہرے پر نظر آنے والی بے پرواہی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ اسے بے ہوش کر چکا تھا۔ اس کی چارپائی کے سر کی جانب ایک کلاش کوف چارپائی کے پائے کے ساتھ کھڑی تھی پستول جیب میں ڈال کر میں نے وہ کلاشن کوف اٹھا لی۔ اس کے بعد کمرے کا سرسری سا جائزہ لے کر ہم دونوں باہر آ گئے دروازے کی کنڈی باہر سے لگاتے ہوئے امجد بولا۔ ”یار چودھری اکبر کو تو اپنی حفاظت کی کوئی فکر ہی نہیں ہے اس کا مطلب ہے وہ تمھیں کسی خاطر میں نہیں لاتا۔“

”آج اس کی یہی غلط فہمی دور کرنے کے لیے ہی ہم آئے ہیں۔ اگر بچ گیا اپنے بچوں کو بھی محتاط رہنے کی نصیحت کرے گا، لیکن ان شاءاللہ بچے گا نہیں۔“

”ان شاءاللہ۔“ اس نے بھی میری تائید کی اور ہم محتاط انداز میں حویلی کے اندرونی جانب بڑھ گئے۔ دو منزلہ حویلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ نچلی منزل کے تمام کمرے ہمیں باہر سے بند ملے، دروازوں پر بڑے بڑے تالے لٹک رہے تھے۔ جیسے ہی ہم دوسری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیوں کے قریب پہنچے میرے کانوں میں باتوں کی آواز آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے امجد کی جانب دیکھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اس کا مطلب تھا اس نے بھی وہ آوازیں سن لی تھیں۔ ہم دبے قدموں سیڑھیوں سے اوپر پہنچے، آواز سیڑھیوں کے ساتھ ملحقہ کمرے سے آ رہی تھی اور دروازے کی درزوں سے روشنی کی ہلکی سی لکیر بھی جھلک رہی تھی، نچلی منزل سے ہمیں یہ روشنی نظر نہیں آئی تھی۔ کمرے کے اندر ہونے والی باتوں کی آواز اب مجھے واضح سنائی دے رہی تھی، وہ شاید تاش کھیل رہے تھے کیونکہ ان کی گفتگو اسی سے متعلق تھی، وہ اپنی گذشتہ بازی پر تبصرہ کر رہے تھے۔

امجد نے کہا۔ ”میں دیکھ کر آتا ہوں کوئی اور بھی ہے اوپر۔“ اور میں نے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جلد ہی چکر لگا کر لوٹ آیا اور آتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سب اچھا کی رپورٹ دی۔

”اس کا مطلب ہے چودھری اسی کمرے کے اندر ہے۔“ میرے دماغ میں ایک سوچ ابھری اور میرے اندر جیسے کسی نے شرارے بھر دیئے۔ موذی دشمن کو اتنا قریب پا کر میرے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ میں نے امجد کو ہاتھ کے اشارے سے کمرے کے دروازے سے سائیڈ پر ہونے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دور لے جا کر میں اسے سرگوشی میں بولا۔ ’

’ماجے!...... چودھری اکبر کو زندہ پکڑنا ہے۔ چاہے اس کے لیے کتنا رسک کیوں نہ لینا پڑے۔“

”تم فکر مت کرو۔ وہ صرف تیرا نہیں میرا بھی مجرم ہے۔“ امجد کی آواز میں عجیب طرح کا غیض و غضب بھرا ہوا تھا۔ ہم دونوں دروازے کے سامنے پہنچے، اندر داخل ہونے کے دو طریقے تھے، پہلی صورت میں ہمیں رش کرتے ہوئے اندر گھسنا پڑتا اور اس کا فائدہ یہ تھا کہ ہم ان کے سنبھلنے سے پہلے ان کے سر پر جا پہنچتے مگر اس کا نقصان یہ تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہونے کی صورت میں وہ سنبھل جاتے اور ان پر

قابو پانا ہمارے لیے مشکل بن جاتا۔ دوسری صورت میں ہمیں دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہونا پڑتا۔ اس طرح گو وہ تمام دروازے کی طرف متوجہ ہو جاتے مگر انھیں چونکہ ہماری آمد کا گمان نہیں تھا اس لیے شاید وہ چوکنا نہ ہوتے۔

اس سے پہلے کہ میں دونوں طریقوں میں سے کوئی طریقہ استعمال کرتا امجد نے ایک تیسری راہ ڈھونڈی۔ اس نے آہستگی سے دروازے کو اندر کے جانب دھکیلا، دروازہ بے آواز کھلنے لگا اور اس سے معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ کافی بے احتیاط تھے۔ اور یہ بے احتیاطی انھیں راس آنے والی نہیں تھی۔

امجد نے آنکھ سے اشارہ کیا اور ہم ہتھیار سونت کر دروازے کو اپنے کندھے سے دھکیلتے اندر داخل ہو گئے۔

''خبردار اگر کسی نے حرکت کی۔'' اندر داخل ہوتے ہی امجد غرایا۔

کمرے کے اندر چار بندے فرش پر چٹائی بچھائے تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ ہتھیار ان کے قریب ہی دیوار کے سہارے کھڑے تھے جبکہ پانچواں بندہ چارپائی پر لیٹا پستول کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ تاش کھیلنے والے چاروں تو اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے مگر چارپائی پر لیٹے ہوئے شخص نے بجلی کی سی سرعت سے پستول والا ہاتھ سیدھا کرتے ہوئے امجد کے جانب فائر داغ دیا، گولی امجد کے بازو میں لگی، اس کا ہاتھ سیدھا ہوتے دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا اس لیے میں نے بھی کلاشن کوف کا ٹریگر دبا دیا۔ میری چلائی ہوئی دونوں گولیاں اس کے سر سے پار گزر گئی تھیں وہ مزید کوئی فائر کیے چارپائی پر تڑپنے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنی گن کا رخ زمین پر بیٹھے ہوئے افراد کی جانب کر دیا مگر انھوں نے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تمام کھڑے ہو جاؤ۔'' میں دھاڑا...... امجد کو میں نے نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ اس کی جانب متوجہ ہونے کی صورت میں وہ کوئی شرارت کر سکتے تھے۔ وہ چاروں اپنے ساتھی کا انجام دیکھ چکے تھے اس لیے بغیر چوں وچراں کیے کھڑے ہو گئے۔

''ہاتھ اوپر اٹھا لو اور دیوار کی جانب گھوم جاؤ۔''

وہ چاروں خوفزدہ نظروں سے میری جانب گھورتے ہوئے گھوم گئے۔ اس دوران امجد نے مشین گن زمین پر رکھ کر دائیں ہاتھ سے اپنا مضروب بازو تھام لیا تھا۔ گولی لگتے وقت ایک سسکی سی اس کے منہ سے برآمد ہوئی تھی اس کے بعد میں نے اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔

''یہ پستول لے کر انھیں کور کرو۔'' میں نے جیب سے پستول نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ ''تاکہ تمھارے بازو پر پٹی باندھ دوں۔'' اور امجد نے سر ہلاتے ہوئے پستول تھام لیا۔ میں نے چٹائی پر پڑی، کپڑے سے بنی ہوئی چادر جسے ہماری زبان میں دھوتی کہتے ہیں سے ایک لمبی پٹی پھاڑی اور امجد کے بازو پر لپیٹ دی۔ اور پھر دوسری پٹی پھاڑ کر گرہ لگائی اور اس کے سہارے امجد کے مضروب بازو کو اس کے گلے میں لٹکا دیا۔ اس دوران وہ ہونٹ بھینچے ان چاروں کی جانب متوجہ رہا۔ فارغ ہوتے ہی میں نے گن سنبھالی اور چاروں سے مخاطب ہوا۔

''اب سیدھے ہو جاؤ۔'' اور چاروں سیدھے ہو گئے۔

’’نہیں ہاتھ اوپر ہی رہیں۔‘‘ان کے ہاتھ نیچے آتے دیکھ کر میں تیزی سے بولا اور انھوں نے جلدی سے اپنے ہاتھ بلند کر لیے۔

’’چودھری اکبر کہاں ہے؟‘‘ میں مستفسر ہوا۔مگر وہ خاموش کھڑے خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں مجھے گھورتے رہے۔

’’دیکھو تمھارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔‘‘ میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی۔’’میرا اصل مجرم چودھری اکبر ہے، تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے بتا دو وہ کہاں ہے، ورنہ پوچھنے کے اور طریقے بھی مجھے آتے ہیں۔‘‘

’’ہمیں اس کے بارے سے کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔‘‘ان میں نسبتاً زیادہ عمر کا شخص آہستہ سے بولا۔

’’کیا تمھیں بتا کر نہیں گیا ہے؟‘‘

’’کس لئے بتاتا......ہم تو میر نیاز خان کے ملازم ہیں۔‘‘ وہی شخص دوبارہ بولا جبکہ باقی خاموشی کھڑے رہے۔

’’میر نیاز خان کے آدمی؟‘‘ میرے لہجے میں حیرانی تھی۔’’مگر یہ حویلی تو چودھری اکبر کی ہے؟‘‘

’’ہے نہیں تھی۔چودھری اکبر اپنی تمام زمین و جائیداد میر نیاز خان کے ہاتھ بیچ کر یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔‘‘

’’کہاں؟‘‘

’’ہم اس بات سے لاعلم ہیں......شاید میر نیاز خان کو پتا ہو؟‘‘

’’کتنے دن ہوئے ہیں اسے گئے ہوئے؟‘‘

’’کل رات کو نکلا تھا۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ میں نے امجد کی جانب دیکھا، ہمارے درمیان ہونے والی تمام گفتگو وہ تفصیل سے سن چکا تھا، اس کی سہولت کی خاطر میں نے تمام بات چیت اردو میں کی تھی۔

’’اب کیا کریں؟‘‘

’’کرنا کیا ہے چلتے ہیں؟‘‘ اس نے منہ بنایا، اتنی محنت کے بعد ناکامی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

’’ان کا کیا کریں؟‘‘ میں نے ان چاروں کی طرف اشارہ کیا۔

’’یہ بے گناہ ہیں، انھیں چھوڑ دو......ان کا ساتھی بھی اپنی غلطی سے مارا گیا ہے، ورنہ ہم نے انھیں کیا کہنا تھا۔‘‘

’’اگر یہ بات ہے تو چلو پھر۔‘‘

’’ان کے ہتھیاروں کو ناکارہ کر دو۔‘‘ امجد نے دیوار کے ساتھ کھڑی گنوں کی طرف اشارہ کیا اور میں سر ہلاتے ہوئے دیوار کے ساتھ کھڑی گنوں کی طرف بڑھ گیا۔ اگر ہم وہ گنیں وہاں سے اٹھا کر لے جاتے تو ہمیں کافی دقت ہوتی خواہ مخواہ ان گنوں کو کون سنبھالتا پھرتا۔ جبکہ ہمارے لیے دو مشین گنیں کافی تھیں اور دشمن کے لیے ہتھیار کو صحیح سالم چھوڑ دینے میں یہ قباحت تھی کہ اس نے بعد میں وہ اسلحہ ہمارے خلاف ہی استعمال کرنا تھا۔ میں نے ان مشین گنوں کے ریسور کو کھول کر گائیڈ راڈ سپرنگ اور بلٹ ہیڈ نکال کر باقی گنیں ادھر ہی رہنے دیں۔

ان پرزوں میں سے کسی ایک کی غیر موجودی میں بھی گن کی حیثیت لکڑی کے ڈنڈے کی سی تھی۔اس کے بعد نے چاروں کی سرسری سی تلاشی لی صرف ایک کے پاس چمڑے کے کور میں بند ایک لمبے پھل کا خنجر نکلا جو میں نے جیب میں ڈال لیا اور ان کو اسی کمرے میں محبوس کر کے ہم وہاں سے نکل آئے۔حویلی سے باہر نکلنے کے لیے ہم نے بڑے گیٹ کا استعمال کیا تھا۔

باہر نکلتے ہی میں نے پوچھا۔"ماجے گولی گوشت پھاڑتے ہوئے نکل گئی ہے یا اندر ہی ہے۔"اس وقت مجھے چودھری اکبر کے نکل جانے کے غم سے زیادہ امجد کی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔

"اندر ہی ہے۔"اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی تکلیف میں تھا اور جوں جوں ٹائم گزرتا جاتا تکلیف نے بڑھتے جانا تھا۔کیونکہ گولی کا زخم ہوتا ہی ایسا ہے گولی لگتے وقت بعض اوقات تو انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اسے گولی لگ چکی ہے،شروع میں درد بالکل معمولی ہوتا ہے مگر بعد میں ٹھنڈا ہوا کر زخم پھوڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم خراب ہوتا جاتا ہے۔اس کے ساتھ درد کی شدت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

"میرا خیال ہے صبح کا انتظار کرنے کی بجائے اسی وقت شہر کا رخ کیا جائے۔"

"یہاں سے پیدل شہر پہنچنا میرا خیال ہے کافی دقت طلب کام ہے۔"

"پیدل جانے کا کس نے کہا ہے۔"میں تیزی سے بولا۔

"اُڑنا تو ہم دونوں نہیں جانتے ......اور جناب کوئی مرسڈیز بھی نہیں رکھتا جس پر بیٹھ کر زن سے شہر پہنچ جائیں۔بسیں یوں بھی صبح سات آٹھ بجے کے بعد چلنا شروع ہوتی ہیں،تو چوتھا طریقہ پیدل چلنے والا ہی رہ گیا ناں؟"اس حالت میں بھی اس کی شوخی برقرار تھی۔

"یار تم پہلوان ہوٹل تک تو چلو اللہ تعالیٰ کوئی بندوبست کر ہی دے گا۔"میں پہلوان ہوٹل کی سمت مڑ گیا۔

"اگر تمھیں خوار ہونے کا زیادہ ہی شوق ہے تو چلو۔"خلاف عادت اس نے بحث نہیں کی تھی۔آدھ گھنٹے بعد ہم بس اڈے پر پہنچ گئے۔

"تم یہیں رکو۔"اسے روڈ کے کنارے روک کر میں ہوٹل کے اندرونی جانب بڑھ گیا۔ہوٹل سنسان پڑا تھا۔ہوٹل کی عمارت کے عقبی جانب مالک کا گھر تھا۔میرا ارادہ اس سے موٹر سائیکل مانگنے کا تھا۔وہ ایک ملنسار اور خوش اخلاق شخص تھا۔عموماً مجرم اور پولیس سے بھاگے ہوئے افراد بھی اس کے ہوٹل میں رات بسر کر لیتے تھے لیکن اس نے کبھی بھی ان کا راز فاش نہیں کیا تھا۔

دوسری دستک کے جواب میں ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔"جی بھائی؟"رات کے اس سمے بھی اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔

"مجھے کل شام تک کے لیے موٹر سائیکل مستعار چاہیے۔"میرے پاس تمہید باندھنے کا ٹائم نہیں تھا۔"میرا ساتھی زخمی ہے اور اسے شہر تک لے جانا ہے دیر ہونے کی صورت میں زخم بگڑنے کا اندیشہ ہے۔"

وہ مستفسر ہوا۔"آپ کا نام پتا جان سکتا ہوں؟"

"نام عمر جان اور تعلق رحمٰن خیل سے ہے۔"

''عمر جان......؟''

''جی عمر جان ولد ہاشم جان مرحوم، پچھلے دنوں ہی میرے گھر کو آگ لگی تھی جس میں......''

''اوہ......اچھا اچھا۔'' اس نے قطع کلامی کی۔ ''آپ غالباً فوجی ہیں۔''

''جی۔''

''اچھا ایک منٹ ٹھہرو میں موٹر سائیکل لے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑ گیا اور چند لمحوں بعد موٹر سائیکل کے ہمراہ لوٹا۔

''یہ لو پتر۔''

''ایک اور زحمت بھی دوں گا۔'' میں نے اپنے کندھے سے لٹکتی ہوئی دونوں کلاشن کوفیں اس کی سمت بڑھائیں۔ ''اگر یہ بھی اپنے پاس رکھ لیں......؟ موٹر سائیکل واپس کرتے وقت لے لوں گا۔''

''ہاں ہاں......کیوں نہیں۔'' کہہ کر اس نے دونوں گنیں پکڑ لیں۔ میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے چل پڑا۔ امجد بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ موٹر سائیکل اس کے قریب روک کر میں نے کہا۔

''بیٹھو۔''

اس نے بیٹھ کر پوچھا۔ ''یہ کہاں سے چرا لائے ہو۔''

''پہلوان چاچا سے مانگا ہے۔''

''ہوٹل کے مالک پہلوان کی بات کر رہے ہو تم؟''

''ہاں۔''

''اس سے کب واقفیت پیدا کر لی؟''

''واقفیت بات نہیں یار۔'' میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھائی۔ ''پہلوان ہے ہی بہت ملنسار اور لوگوں کے کام آنے والا۔ وہ تو مجھے جانتا ہی نہیں، میں نے یوں ہی ایک امید کے تحت اس سے درخواست کی اور اس نے بغیر ہچکچاہٹ کے موٹر سائیکل میرے حوالے کر دی۔''

''بڑی بات ہے یار، بغیر واقفیت کے اتنا تعاون؟''

''ہاں یار!......ایسے ہی لوگوں کے دم قدم سے تو دنیا قائم ہے۔'' جواباً امجد خاموش رہا۔ راستے میں نہر کے پل پر موٹر سائیکل روک کر میں نے کہا۔ ''میر نیاز خان کے بندوں کی کلاشن کوفوں سے نکالے ہوئے پرزے نہر میں پھینک دے''......اور امجد نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر نہر میں اچھال دیا۔ اور میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی، راستے میں اکا دکا ٹرکوں کے علاوہ ہمیں کوئی گاڑی نہ ملی، گو سردیاں اپنے اختتام پر تھیں لیکن اس ٹائم موٹر سائیکل پر ہمیں ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ گھنٹے بھر میں ہم شہر کے مضافات میں داخل ہو گئے۔

''جانو صاحب!......اس وقت تو کوئی ڈاکٹر ہمیں دستیاب نہیں ہوگا۔ بالفرض کوئی مل گیا تب بھی اس نے بغیر پولیس کی اجازت

کے میرا علاج نہیں کرنا' اس کے لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

''اللہ خیر کرے گا یار!......کوئی نہ کوئی ڈاکٹر تیرا علاج کرنے کے لیے تیار ہو ہی جائے گا۔''

''ان شاء اللہ'' کہہ کر اس نے سر میرے کندھے پر ٹکا دیا، مجھے پتا تھا کہ زخمی حالت میں موٹر سائیکل جیسی بے آرام سواری اس کی تکلیف بڑھا رہی تھی لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ مساجد سے اذان کی مقدس آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لاری اڈے سے ملحقہ ہوٹلوں پر صبح کے ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ راستے میں اس ہسپتال کو میں نے دانستہ نظر انداز کر دیا جس میں چچا فاضل زیر علاج تھا۔ کیونکہ اس کی انتظامیہ ہماری واقف کار تھی وہاں پر میں کسی قسم کی دھونس جما کر امجد کا علاج نہیں کرا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں بیسیوں پرائیویٹ ہسپتال موجود تھے اور آخر ایک موزوں دکھائی دینے والے ہسپتال کے گیٹ کی جانب میں نے موٹر سائیکل موڑ دی۔

''ڈاکٹر خوشید صاحب موجود ہوں گے؟'' میں نے ہسپتال کے باہر لٹکتے ہوئے ایڈورٹائزنگ بورڈ پر ڈاکٹر کا نام پڑھ کر چوکیدار سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب تو صبح دس بجے بعد ہی مل سکیں گے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''البتہ ڈاکٹر صاحب کی بھانجی ڈاکٹر شہلا بی بی ہسپتال میں ہی رات گزارتی ہیں، ایمرجنسی کی صورت میں وہی مریض چیک کرتی ہیں۔''

''شکریہ بھیا......ہم اسی سے مل لیتے ہیں۔'' میں موٹر سائیکل گیٹ کے ساتھ بنی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ چوکیدار نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ موٹر سائیکل لاک کر کے ہم ہسپتال کے اندرونی جانب بڑھ گئے ریسپشنسٹ ہمیں ٹیبل پر سر ٹیکے سویا ہوا نظر آیا۔ اسے نظر انداز کر کے ہم پتلی سی راہداری میں گھس گئے جس کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی جانب رہنمائی کا بورڈ لٹکا ہوا تھا۔ راہداری کا اختتام ڈاکٹر صاحب کے کمرے پر ہی ہوا۔ وہاں بھی ڈاکٹر خورشید کے نام کی تختی لٹکی ہوئی تھی۔ دروازے کے باہر ایک بینچ بھی پڑی تھی مگر کوئی چپڑاسی وغیرہ موجود نہیں تھا۔

میں نے آہستہ سے دستک دی مگر اندر خاموشی چھائی رہی۔ چند سیکنڈ انتظار کر کے میں نے دوبارہ دستک دی...... تیسری دستک پر کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ کھولنے والی 26,25 برس کی خوب صورت دوشیزہ تھی۔ ڈاکٹر جیسا ثقیل لفظ اس کے ساتھ بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ اس کے بجائے وہ یونیورسٹی کی طالبہ دکھائی دے رہی تھی۔ ہلکے آسمانی کلر کے شلوار سوٹ کے اوپر اس نے ڈاکٹروں کا عالمی سمبل یعنی سفید کوٹ پہنا ہوا تھا جس کی شکنیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ اسے پہنے ہوئے سو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند کا خمار لیے ہوئے تھیں میرے ذہن میں کسی شاعر کا شعر گونجا۔

اس کی آنکھوں میں سرخ دھاگے ہیں
رات کس کے نصیب جاگے ہیں

اس سے پہلے کہ اس کے باقی اعضاء کو دیکھ کر مزید اشعار کا نزول ہوتا وہ اپنی دلکش آواز میں مستفسر ہوئی۔ ”جی؟“

”ڈاکٹر صاحبہ!......ہم معذرت خواہ ہیں ایمرجنسی میں آپ کو زحمت دینی پڑ گئی۔“

”مگر آپ لوگ براہِ راست میرے پاس کیسے آ گئے؟“ اس کی آواز میں ہلکی سی ناگواری تھی۔ ”سلیم کہاں ہے؟“ سلیم سے شاید اس کی مراد استقبالیہ کلرک تھا۔

”وہ سویا ہوا تھا ہم نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

”یہ اس کی ڈیوٹی بنتی ہے۔ بہرحال اندر آ جاؤ۔“ وہ دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

وہ ایک شاندار آفس تھا۔ کونے میں صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا شاید ڈاکٹر اپنے مہمانوں وغیرہ کو وہیں بٹھا کر اٹینڈ کرتا تھا۔ صوفے کے اوپر پڑی ہوئی زنانہ شال اور ایک چھوٹا سا تکیہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ ڈاکٹر جس کا نام چوکیدار نے شہلا بی بی بتلایا تھا وہیں سوئی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر کی کرسی سنبھال کر اس نے سامنے پڑے بینچ کی طرف اشارہ کر کے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ کہہ کر ہم دونوں اکٹھے بیٹھ گئے۔

”ہاں کیا......اوہو یہ تو بہت زیادہ بلیڈنگ ہو رہی ہے۔“ مسئلہ پوچھتے پوچھتے اچانک اس کی نظر امجد کے بازو کی طرف اٹھ گئی اور کریم کلر کے کپڑوں پر لگا ہوا خون واضح نظر آ رہا تھا۔ پٹی خون سے تربتر ہو گئی تھی۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر امجد کی جانب بڑھی۔

”کیا ہوا اسے؟“

میں جواباً بولا۔ ”گولی لگی ہے۔“

”کیا۔“ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ”سوری بھائی۔ یہ پولیس کیس ہے۔“

”مِس پلیز۔“ میں ملتجی لہجے میں بولا۔ ”آپ تو پولیس سے واقف ہیں کہ شریف شہریوں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہوتا ہے۔“

”سوری مسٹر......یہ میرا در دِسر نہیں ہے......ویسے بھی شریف شہری ان گولیوں والے کھاتے میں نہیں پڑتے۔“

”آپ دیکھ رہی ہیں کہ میرا ساتھی کافی تکلیف میں ہے پولیس کے آتے آتے اس کا کام تو ہو جائے گا، پہلے ہی کافی خون بہہ چکا ہے۔“

”یہ بات آپ کو پہلے سوچنی چاہیے تھی۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ”اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحبہ میں منہ مانگا معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے اسے شرافت سے منانے کے لیے آخری کوشش کی۔

”مسٹر میرا خیال ہے تم بے عزت ہونا چاہتے ہو۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”آپ کو ایک مرتبہ کہہ دیا کہ اس کلینک میں پولیس کیس، پولیس کی مرضی کے بغیر ہینڈل نہیں کیا جاتا تو آپ کو سمجھ جانا چاہیے۔“

”آپ کو بھی سمجھنا چاہیے۔“ میں کھڑا ہو گیا۔

''کیا؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''یہی کہ آپ جوان ہیں اور شاید کنواری بھی ہوں۔ جبکہ میں اپنے ساتھی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اگر اسے کچھ ہو گیا تو آپ شاید کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہیں۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس کے خوب صورت رُخ پر چھائی بیزاری خوف سے میں بدل گئی تھی۔

''ت......تت......تم دھمکی دے رہے ہو۔'' وہ غیر محسوس انداز میں دروازے کی طرف کھسکنے لگی۔ میں نے جست لگا کر اس کی پیش قدمی کو روکا اور اس کے ملائم بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

''میں دھمکی نہیں دے رہا......اپنے کہے پر عمل کر کے بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اچانک امجد بینچ سے اٹھ کر ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''جانو گندے!......کیا کر رہے ہو۔ یہ ڈاکٹر ہے عوام کی خدمت گار، چھوڑو اسے۔'' اس نے میری چھاتی پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ ''اگر میں تین چار گھنٹوں میں نہیں مرا ہوں تو مزید تین چار گھنٹے بھی گزار لوں گا۔''

''مگر......'' میں نے ڈاکٹر کا بازو چھوڑ کر اسے کچھ کہنا چاہا۔

''چھوڑو، اگر مگر کو۔'' اس نے قطع کلامی کی۔ ''چلو باہر......اور سوری مس، اس گدھے کی طرف سے میں معافی کا خواستگار ہوں، ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔''

یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑ کر باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ اس کے ماتھے پر چمکتا ہوا پسینہ گرم ہاتھ اور لڑکھڑاتے قدم اس بات کے غماز تھے کہ وہ سخت تکلیف کے ساتھ ساتھ بخار میں بھی مبتلا تھا۔ میں نے بھی بادل نخواستہ اس کے ہمراہ قدم بڑھائے۔ پستول واپس جیب میں ڈال کر اپنا بازو امجد کی کمر میں اسے سہارا دینے کے لیے ڈال لیا امجد کی جھڑکی سن کر میں نے دانستہ ڈاکٹر شہلا کی جانب دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ ہم بمشکل دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ اس نے آواز دی۔

''سنئے۔'' میں نے رک کر اس کے جانب دیکھا۔ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

''اسے لے آؤ مم......میں دیکھ لیتی ہوں۔'' غیرت کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیتا ایک دفعہ وہ ہمیں دھتکار چکی تھی مگر مسئلہ امجد کا تھا اگر اس کی جگہ میں خود ہوتا تو شاید واپس نہ پلٹتا اپنوں کی تکلیف انسان کو اپنی ذات کی تکلیف سے زیادہ گھائل کر دیتی ہے۔ مجھ سے امجد کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی اس لیے میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، امجد میرے مزاج سے خوب واقف تھا مجھے رکتے دیکھ کر بولا۔ ''جانور رکنے کی کوئی ضرورت نہیں، شہر میں بیسیوں کلینک موجود ہیں، ہمیں اس کی ہمدردی کی بھیک نہیں چاہیے۔''

مجھے پتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ میری وجہ سے کہہ رہا تھا اور اپنی جھوٹی انا کی خاطر میں اسے خوار نہیں کر سکتا تھا۔

''نہیں ماجے......میں تیری فضول بات نہیں مان سکتا۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے کی جانب کھینچا اور وہ گویا بادل

نخواستہ میرے ساتھ واپس چل پڑا۔اس کی بات سن کر ڈاکٹر شہلا کے چہرے پر ندامت کے آثار ہویدا ہو گئے تھے اور اس عالم میں وہ پہلے سے بھی زیادہ دلکش لگنے لگی تھی۔

امجد کے بینچ پر بیٹھتے ہی وہ مستفسر ہوئی۔

''گولی بازو کے اندر ہے یا......؟''

''جی......بازو کے اندر ہی ہے۔''میں جواباً بولا جبکہ امجد ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھا رہا۔

''ہوں......اس کا مطلب ہے آپریشن کرنا پڑے گا......پلیز اسے اندر لے آؤ''اس نے دفتر سے ملحقہ ایک کمرے کا دروازہ کھولا جو شاید آپریشن روم تھا اور اندر جا کر میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی وہ واقعی ایک چھوٹا سا آپریشن تھیٹر تھا۔کمرے کے وسط میں بنے ہوئے اونچے سے بیڈ پر امجد کو لٹا کر میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ابھی آپ باہر تشریف لے جائیں اور دفتر میں بیٹھ کر میرا انتظار کریں۔''

''اگر میں آپ کا ہاتھ بٹا......''

''میں نرس کو بلا لیتی ہوں......شکریہ۔''وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی اور میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا آپریشن تھیٹر سے نکل آیا۔امجد کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی میری ذہنی رَو چودھری اکبر کے پیچھے بھٹکنے لگی، پولیس اور میرے بدلہ لینے کے خوف سے وہ علاقہ چھوڑ گیا تھا۔اس کی تلاش مجھے دنیا کا سب سے مشکل کام نظر آ رہا تھا، نا معلوم اس نے کس علاقے کو چھپنے کے لیے منتخب کیا تھا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پاکستان سے باہر ہی نکل گیا ہو۔دولت اس کے پاس کافی تھی وہ کسی بھی یورپی ملک میں جا کر آرام سے اپنی باقی ماندہ زندگی گزار سکتا تھا۔بھری دنیا میں ایک بندے کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے سے بھی مشکل تھا۔اس کے رشتہ داروں میں اس کی بہن یا ماموں وغیرہ ہی تھے جو میری طرح اس کے دشمن ہی تھے وہ بھی لازمی طور پر اس کے چھپنے کے مقام سے لاعلم ہوتے اس لیے ان سے ملاقات بے سود ہی ثابت ہوتی، لے دے کے ملک میر نیاز خان ہی بچتا تھا۔'

'شاید وہ اس کی چھپنے کی جگہ سے واقف ہو۔''میرے ذہن میں ایک سوچ آئی مگر میر نیاز خان سے یہ راز اگلوانا بہت مشکل تھا، یوں بھی چودھری اکبر کے ساتھ اس کے تعلقات بہت قریبی ہو گئے تھے گو وہ آپس میں داماد اور سسر کا رشتہ قائم کرنے میں تو ناکام رہے تھے مگر اس چیز نے ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا اور اس کا ثبوت وہ زمین و جائیداد تھی جو چودھری اکبر میر نیاز خان کے ہاتھ بیچ کر گیا تھا۔بہر حال میر نیاز خان کے ساتھ ٹکراؤ مجھے ناگزیر نظر آ رہا تھا۔امجد کی چھٹی بھی اختتام پذیر ہونے کو تھی ویسے بھی وہ وقتی طور پر ناکارہ ہو گیا تھا اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے دشمنوں کے خلاف لڑنے کے لیے اکیلا رہ گیا تھا مگر یہ چیز نہ تو مجھے مایوس کر سکتی تھی اور نہ ہی اکیلے پن سے گھبرا کر میں چودھری اکبر کا پیچھا چھوڑ سکتا تھا۔اس سے عبرت ناک انتقام لینا میری زندگی کا سب سے اہم مقصد تھا اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میں اپنی ساری زندگی داؤ پہ لگا سکتا تھا۔

میں کافی دیر اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا یہاں تک کہ آپریشن روم کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر شہلا برآمد ہوئی......

''مسٹر......آپ کے ساتھی کو روم نمبر 5 میں منتقل کر دیا ہے فی الحال وہ بے ہوش ہے چار پانچ گھنٹوں بعد میں ہوش میں آسکے گا آپ بیشک ویٹنگ روم میں بیٹھ کر اس کا انتظار کر لیں چاہے گھر چلے جائیں اور بعد میں واپس آجائیں یہ آپ کی مرضی ہے۔ویسے اب وہ خطرے سے باہر ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بازو کی ہڈی محفوظ رہ گئی گولی صرف گوشت کو ہی نقصان پہنچا سکی ہے۔البتہ ٹمپریچر اس کا کافی زیادہ تھا امید ہے تھوڑی دیر تک نارمل ہو جائے گا۔''

''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ......اور امید ہے میری گستاخی کو آپ نے نظر انداز کر دیا ہوگا۔مگر پھر بھی میں اپنے رویے کی معافی چاہوں گا۔''

''اٹس اوکے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔''میں جانتی ہوں کہ وہ صرف پریشانی کا ردِعمل تھا، میں نے بھی تو سختی سے انکار کر دیا تھا البتہ یہ اور بات ہے کہ وہ انکار میری مجبوری تھی۔''

''ویسے اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب وہ مجبوری کہاں گئی۔'' وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی پھر آہستہ سے بولی۔

''دراصل یہ میرے ماموں کا حکم ہے کہ اس طرح کا کوئی کیس ہینڈل نہیں کرنا۔اب بھی میں نے اس نرس کو تین چار دن کی رخصت پر بھیج دیا ہے جس نے آپریشن کے دوران مجھے اسسٹ کیا ہے کیونکہ ماموں کو میں نے تمھارے ساتھی کو گولی لگنے کی بات نہیں بتانی بلکہ اسے کہوں گی کہ موٹر سائیکل سے گرنے کی وجہ سے اس کے بازو میں ایک نوکیلا پتھر لگ گیا تھا اور یہی التجا میں آپ سے بھی کروں گی کہ اس طرح کی کوئی بھی بات ماموں جان کے سامنے نہیں کرنی۔''

میں اس کی ساری تقریر سن کر بولا۔''میرا سوال ہنوز تشنہ ہے۔''

''مجھے نہیں پتا میں نے اس طرح کیوں کیا۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔''شاید تمھارے ساتھی کے رویے نے مجھے اس کام پہ مائل کیا؟''

''کیا آپ کا ماموں امجد کے زخم کا معائنہ نہیں کرے گا؟''

''نہیں وہ صرف رپورٹ دیکھنے پر اکتفا کرے گا۔البتہ مجھے مریض کے متعلق کوئی مسئلہ درپیش ہو تو پھر وہ مریض کو تسلی سے چیک کرتا ہے۔''

''آخری بات......جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو بازو سے گولی نکالنے کے لیے تو ڈاکٹر صاحبان مریض کو مکمل بے ہوش نہیں کرتے جبکہ آپ کہہ رہی ہیں کہ امجد فی الحال، ہوش میں نہیں ہے۔''

''صحیح کہا آپ نے......مسٹر امجد کے بازو سے گولی نکالنے کے لیے بھی میں نے صرف اس کے بازو کو سن کیا تھا، لیکن اس کے بعد اسے سلانے کے لیے سکون آور انجیکشن لگایا ہے جس کے زیرِ اثر وہ 5,4 گھنٹے نیند لے لے گا۔''

"او کے!...... بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ...... فی الحال میں چلتا ہوں۔ آپ کی فیس بھی انشاء اللہ واپس آ کر ادا کروں گا کیونکہ آتے وقت میں عجلت میں پیسے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ "اگر آپ دوبارہ بھی پیسے نہ لائیں تو مجھے خوشی ہوگی کیونکہ مسٹر امجد کا علاج میں پیسوں کی خاطر نہیں کر رہی۔"

"پھر کس لیے کر رہی ہیں؟"

"انسانی ہمدردی کے تحت۔"

"باقی مریض کیا اس ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔"

"مریض تمام ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن تمام کو اسی طرح رعایت کرتے رہیں تو خود کہاں سے کھائیں گے۔"

"ہماری خصوصیت کی وجہ؟"

"آپ کا نام غالباً...... جانو ہے۔"

"نہیں...... میرا نام عمر جان ہے۔"

"تو عمر جان بھائی بات یہ ہے کہ آپ فیس دے دینا بس یا اور کچھ؟"

مجھے پتا چل گیا کہ وہ خفا ہوگئی ہے مگر میں نے جتانا مناسب نہ سمجھا اور "ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ" کہہ کر اس کے دفتر سے نکل آیا۔

ہسپتال سے باہر آ کر میں نے جیب میں پڑے ہوئے چند سو روپیوں سے موٹر سائیکل کی ٹینکی فل کرائی اور رحمٰن خیل کا رخ کیا، سب سے پہلے گھر میں جا کر میں نے کچھ رقم اور چیک بک اٹھائی اس کے بعد جیرے پہلوان کے ہوٹل میں جا کر موٹر سائیکل اس کے حوالے کر دی۔

"بہت بہت شکریہ پہلوان چاچا۔"

"آپ کو اپنا سامان نہیں چاہیے کیا؟" مجھے مڑتا دیکھ کر وہ مستفسر ہوا۔

"وہ میں بعد میں آ کر جاؤں گا۔"

"اچھا بات سنو......"۔ اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جی پہلوان چچا۔" اس کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے میں قریب ہوگیا۔

"رات رحمٰن خیل میں چودھری اکبر کی حویلی میں ایک بندہ قتل ہوگیا ہے جو کہ کالی وال کے ملک میر نیاز خان کا بندہ تھا۔ آپ رات کہاں تھے؟"

"اپنے چچا کے پاس ہسپتال میں۔"

''ٹھیک ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''بہرحال...... اپنا خیال رکھنا پُتر تُو بہت مظلوم ہے تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے اور بدلہ لینا تیرا حق بنتا ہے۔''

''مہربانی پہلوان چچا۔'' اس کا پُر خلوص انداز دیکھ کر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''اگر موٹر سائیکل چاہیے ہو تو لیتے جاؤ...... میرے پاس ایک دوسری بھی ہے۔''

''فی الحال تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔ ''اگر ضرورت ہوئی تو ضرور آپ کو زحمت دوں گا۔''

''ٹھیک ہے پُتر اللہ سوہنے دے حوالے۔''

وہاں سے بس پکڑ کر میں شہر پہنچا اور سب سے پہلے بینک میں جا کر وہاں سے کچھ رقم نکلوائی اور پھر چچا فاضل کو ملنے کے لیے چلا گیا۔ وہ اب پہلے سے کافی بہتر تھا۔ میری زبانی سارے حالات جان کر وہ چند لمحے تو خاموش رہا اس کے بعد خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے چودھری اکبر رُوپوش ہو گیا ہے...... کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں مل جائے گا۔ چھپ نہیں سکتا زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکے گا۔ ویسے یہ میر نیاز خان وہی ہے نا کالی وال کا ملک؟''

''جی......'' میں مختصراً بولا۔

''ہنہ......'' چچا فاضل نے ہنکارا ابھرا۔ ''چلو میں اس سے بات کروں گا، شاید وہ بتانے پر راضی ہو جائے۔''

''نہیں چچا۔'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''اس سے بات کرنے کے لیے آپ کو کالی وال جانا پڑے گا کیونکہ وہ تو یہاں آنے سے رہا اور کالی وال اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک آپ اپنے پاؤں پر نہیں کھڑے ہو جائے اور بالفرض وہاں پر چلے بھی جاتے ہیں تب بھی اس نے چودھری کا پتا نہیں بتانا کیونکہ ان دونوں کے آپس میں بہت گہرے تعلقات تھے۔ اس لیے آپ بے فکر رہیں۔ میں خود اس سے نبٹ لوں گا۔''

میری بات پہ چچا فاضل غیر متوقع طور پر خاموش رہا مزید کچھ دیر ان کے ساتھ گپ شپ کرنے کے بعد میں نے ان سے اجازت لی کیونکہ امجد کو دیکھنے بھی جانا تھا وہاں سے سیدھا میں امجد کے ہسپتال میں پہنچا وہ اس وقت تک ہوش میں آ گیا تھا اور کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھا گپ شپ میں مشغول تھا کہ ڈاکٹر شہلا اندر داخل ہوئی۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟'' امجد کے بیڈ کے نزدیک پہنچتے ہی وہ مستفسر ہوئی۔

''بہت بہتر ڈاکٹر صاحبہ۔'' امجد کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا۔

''گڈ!'' کہہ کر اس نے امجد کی کلائی تھام لی، نبض وغیرہ چیک کرنے کے بعد اس نے امجد کے سرہانے تپائی پر پڑی فائل پر کچھ ضروری مندرجات لکھے اور کہا۔

''مسٹر امجد آپ کو مزید دو دن ہمارا مہمان بن کے رہنا پڑے گا اس کے بعد آپ کو رخصت کریں گے۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں جلدی سے بولا۔

''اور عمر جان صاحب پلیز جاتے وقت اپنا ایڈریس نوٹ کراتے جانا اور فیس بھی یاد سے ادا کرنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

''ایڈریس کیا ڈاکٹر صاحبہ عمر جان سکنہ رحمٰن خیل لکھ دیں باقی تحصیل و ضلع تو ہمارا بھی وہی ہے جو آپ کا ہے اور فیس ادا کرنے کی پوزیشن میں فی الحال ہم نہیں ہیں۔''

میں اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''رحمٰن خیل؟'' اس کے چہرے پر حیرت انگیز تاثر ابھرا۔ ''آپ دونوں کا تعلق رحمٰن خیل سے ہے؟''

''یوں ہی سمجھیں۔'' میں اس کے چہرے پر چھائی حیرت کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ ''ویسے آپ کو حیرانی کیوں ہوئی؟''

''کیونکہ میرا تعلق بھی رحمٰن خیل سے ہے؟ میں چودھری انور مرحوم کی بیٹی ہوں۔''

''کیا؟'' اس مرتبہ حیران ہونے کی باری میری تھی میں بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

+ + +

امجد کے چہرے پر بھی اس کی بات سن کر عجیب سے تاثرات چھا گئے تھے۔

''خخ...... خیر...... تو ہے؟'' ہماری حیرانی کو دیکھتے ہوئے وہ بے ساختہ مستفسر ہوئی۔ مگر ہم خاموش ہی رہے۔ ایک دفعہ تو میرے اندر سخت ابال سا اٹھا۔

''سانپ کا بچہ سنپولیا ہی ہوتا ہے۔ اسی ناطے تیرے سامنے ڈاکٹر نہیں بلکہ ناگن کھڑی ہے۔ سر کچل دو اس کا...... اس کے بھائیوں نے بھی تو تیرے بھرے پُرے گھر کو قبرستان بنا دیا ہے۔ تم بھی بدلے کی ابتداء ان کی بہن کا گلا کاٹ کر شروع کر دو۔'' میرے ذہن میں گونجنے والی آواز میرے ہمزاد کی تھی۔ مگر پھر میرا ضمیر اپنے دلائل لیے آن وارد ہوا۔

''نہیں عمر جان یہ بے قصور ہے اور اس کا بھائی تو خود اس کی جان کے درپے ہے۔ یہ غریب صرف اس لیے زندہ نظر آ رہی ہے کہ یہ شہر میں رہائش پذیر تھی ورنہ جو شخص اپنے بھائی کہ جسے دنیا آدمی کا دایاں بازو کہتی ہے قتل کر سکتا ہے تو اس کے لیے بہن کو ٹھکانے لگانا کون سا مشکل کام تھا۔''

''آ...... آپ لوگ چپ کیوں ہو گئے؟'' وہ ہماری خاموشی سے پریشان سی ہو گئی تھی۔ مگر اس مرتبہ بھی ہم دونوں نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور اپنی سوچوں میں ہی ڈوبے رہے۔ وہ باری باری ہم دنوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مرتبہ پھر بولی۔

''میری کوئی بات بری لگ گئی کیا؟''

''نہیں مس ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس مرتبہ امجد نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ اگر محسوس نہ کریں تو ہمیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔'' اور وہ حیرانی اور خفگی کے ملے جلے تاثرات لیے کمرے سے نکل گئی اس کے جانے کے بعد بھی ہم کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ آخر کار

خاموش کو میں نے ہی توڑا۔

''یہ بے قصور ہے ماجے...... میرے گھر والوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔اس غریب کو تو شاید یہ بھی پتا نہ ہو کہ ہاشم جان کے گھر کو آگ لگانے والے اس کے بھائی ہیں، بلکہ یہ بے چاری تو خود اس ناگ کی ڈسی ہوئی ہے یہاں تک کہ وہ اس کے حصے کی جائیداد بھی بیچ کر نکل گیا ہے۔''

میری بات سن کر امجد کے چہرے پر خوشی کی چمک ابھری مگر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بالکل مختلف تھا۔

''نہیں جانو...... یہ اتنی آسانی سے معاف کیے جانے کی حقدار نہیں ہے۔میری بہنوں نے اس کے بھائیوں کا کیا بگاڑا تھا کہ انھوں نے انھیں زندہ جلا دیا۔اس کا سب بڑا قصور ہی یہ ہے کہ یہ چودھری انور کی بیٹی اور اکبر کی بہن ہے۔'' امجد کے لہجے میں چھپے غیض وغضب سے حقیقتاً یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی سگی بہنوں کو جلا دیا گیا ہو اور اس کے جذبات کی یہ شدت دیکھ کر مجھے اس کی دوستی پر فخر محسوس ہونے لگا۔

''امجد...... یہ غلط ہے میرے بھائی۔سچا گنڈہ پور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتا، اللہ کے بندے میں نے تو خاتون جیسی عورت کو معاف کر دیا ہے۔جو براہِ راست اس حادثے میں ملوث تھی یہ غریب تو شاید اصل واقعہ سے بھی لاعلم ہو؟''

''آپ کو حرکت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' امجد اپنی بات پر ڈٹا رہا۔''اس کا سر کچلنے کے لیے میں کافی ہوں۔ویسے بھی میں گنڈہ پور نہیں جدون ہوں۔''

''میں تمھیں ایسی حرکت کرنے کی اجازت بالکل نہیں دوں گا۔''

''مجھے تمھاری اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''بیوقوف وہ تیری محسن ہے۔''

''ہوا کرے۔اگر مجھے پہلے پتا چل گیا ہوتا تو میں ہرگز اس سے اپنا علاج نہ کراتا۔''

''آخر تم اسے مارنے پر مصر کیوں ہو؟'' اس کے اصرار سے زچ ہو کر میں مستفسر ہوا۔

''بھئی اسلام میں ہاتھ کے بدلے ہاتھ کان کے بدلے کان، اسی طرح بہن کے بدلے بہن۔اکبر نے میری بہنوں کو زندہ جلا دیا ہے میں بھی اس کی اکلوتی بہن کو زندہ جلانے کا حق رکھتا ہوں۔البتہ اس پر احسان کرتے ہوئے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ زندہ جلانے کی بجائے میں اسے آسان موت کے حوالے کروں۔'' امجد نے فلسفہ بگھارا۔

''ماجے صاحب! تُو نے اسلام کی بہت غلط تعبیر کی ہے۔'' میرا لہجہ طنزیہ تھا۔''اگر بہن کے بدلے بہن کی جان لینی ہے تو بدلہ تو پورا ہو گیا اس کلیے کے تحت تو مارنے والے کو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور اس سے بدلا لینے کا حق صرف مقتول کو ہی حاصل ہو گا کہ اس قاتل نے اس کی جان لی ہے اور ہم چودھری اکبر کی ماں اور بہن کو ہلاک کر کے آسانی سے اس فرض سے سبک دوش ہو سکتے ہیں۔کیا یہی چاہتے ہیں آپ، اگر یہی چاہتے ہیں تو بہت ہی غلط فیصلہ ہے تمھارا۔بیوقوف! اسلام کا حکم جان کے بدلے جان لینے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس جرم کا مرتکب

ہوا ہے اس کو جان سے مار دو اس سے خون بہا لے لو یا سب سے بہتر ہے کہ اسے معاف کر دو۔ مؤخرالذکر دونوں باتیں بہر حال میرے لیے ناممکن ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ میں بے گناہوں کا قتل عام شروع کر دوں۔" میں نے اس کے سامنے اپنا نقطۂ نظر وضاحت کی۔

"اس لیے میری جان ہم بدلہ لیں گے اور ان شاءاللہ ڈٹ کر لیں گے۔ چودھری اکبر کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا اب میری زندگی کا مقصد ہے۔"

"اور میری زندگی کا بھی۔" امجد نے کہا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس نے سر تکیے پر لٹکا دیا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر خوشی کی چمک لہرا رہی تھی۔

"ماجے!......آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو؟"

"جانو......ایک بہت بڑا بوجھ میرے سر سے ہٹ گیا ہے۔" اس کی آنکھیں بند تھیں مجھے لگا اس کی بند آنکھیں میں کوئی خواب لہرا رہا ہے۔

"میں سمجھا نہیں؟" میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

"یار زندگی میں پہلی بار کوئی کڑی مجھے پسند آئی ہے......لیکن اس کے بارے یہ جان کر کہ وہ دشمن کی بہن ہے، ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا اسی وجہ سے میں اسے سزا دینے کے بارے دلائل دے رہا تھا ورنہ اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے وہ سارے دلائل میں نے اپنے نفس کے خلاف دیئے تھے۔"

"ماجے صاحب!......تُو تو چھپا رستم نکلا یار......کہاں تیری ساس پیدا نہیں ہوئی تھی اور کہاں پلی پلائی دولھن پسند کر لی وہ بھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر، بڑی بات ہے بھئی۔" جواباً وہ خاموش ہی رہا۔ بند آنکھوں کے پیچھے شاید وہ ڈاکٹر شہلا کو اپنی دولھن کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے اسی خاموشی میں گذر گئے اس کے بعد یکدم اس نے آنکھیں کھولیں تو مجھے اس کی آنکھوں میں ویرانی سی نظر آئی۔ اتنی خوشی کے بعد ایسی غمی میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"کیوں بھئی کیا ہوا......ابھی چند لمحے پہلے تو تُو ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور اب ایسی کون سی پریشانی آ پڑی کہ تیری آنکھوں میں مجھے دکھ کی پرچھائیاں نظر آ رہی ہیں۔"

"جانو مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا......ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا کہ میں نے بادشاہ کی بیٹی سے شادی کرنی ہے۔ آدھی بات طے ہو چکی ہے اور آدھی رہتی ہے۔......وہ کیسے؟......دوست نے پوچھا تو کہنے لگا میں تو راضی ہوں ان کا پتا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ "ہم غریبوں کی بھی کیا محبت اور کیا پسند ہوتی ہے یار جسے پسند کریں جواباً اسے پسند نہیں آتے اگر آ جائیں تب بھی ہماری غربت آڑے آ جاتی ہے۔"

"تیری غربت تو بہر حال میں آڑے نہیں آنے دوں گا۔" میں نے پختہ لہجے میں کہا۔ "میری اتنی زمینیں کس کام آئیں گی البتہ ڈاکٹر

شہلا کے دل کا مجھے پتا نہیں ہے اس میں تیرے لیے کیا ہے پیار یا فقط ہمدردی۔ ویسے تجھے خود اس کے رویے سے کیا محسوس ہوا ہے۔''

جواباً وہ شعر پڑھ کر خاموش رہا۔

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

''کچھ کرلیں گے یار۔'' میں زیرلب مسکرایا۔''ابھی سے اتنے غمگین اشعار پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی اس نے میر نیاز خان کے بیٹے گل ریز خان سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے شاید تیرے لیے مان جائے۔''

''اوہ نہیں یار اتنا بھی غمگین نہیں ہوں۔'' وہ سنبھل گیا۔''بہرحال چھوڑو اس موضوع کو چودھری اکبر کے بارے کیا سوچا ہے وہ خبیث تو بھگوڑا ہو گیا ہے۔''

''تم اپنی سناؤ میرے خیال میں تمھاری چھٹی چند دن ہی باقی رہ گئی ہے۔کیا گھر کا چکر لگانے نہیں جاؤ گے۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ایک بات کہی تھی۔'' بجائے جواب دینے کے اس نے نئی راگنی چھیڑی۔

''کون سی؟'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''یہی کہ آپ کی کافی زمینیں ہیں۔''

''تو پھر؟'' میری حیرانی برقرار تھی۔

''تو پھر ملک جانو صاحب آپ مجھے اپنی زمینوں کا منشی مقرر کر دیں، میں نوکری کو خیرباد کہہ دیتا ہوں۔''

''منشی کیا ماجے تُو آدھی زمینیں اپنے نام کرالے مگر اس کے لیے نوکری چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''نوکری کرتے ہوئے بدلہ کیسے لوں گا؟''

''اس بات کی تم فکر مت کرو ان سے میں اکیلا نبٹ لوں گا۔''

''فکر کیوں نہ کروں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔''تم اکیلے ہی بدلہ لینے کا حق نہیں رکھتے۔ یاد ہے چچا نے کیا کہا تھا کہ اس کے چار نہیں پانچ بیٹے ہیں اور آج اس کی موت کا بدلہ لینے کا حق اکیلے تجھے کیسے مل گیا میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔ چاہے تُو کتنی ہی حیل وحجت کرلے میں نے تیری بات نہیں ماننی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔''مگر اس سے پہلے فوج سے ڈسچارج تو ہو جاؤ۔''

''اتنا ٹائم نہیں ہے بھئی...... آرمی سے ڈسچارج ہونے کا پراسس بہت لمبا ہے ویسے بھی مجھے واپس بلانے کے لیے میرے متعلقہ تھانے کو مطلع کیا جائے گا جو موجودہ پتے کے مطابق کراچی میں ہے یا سابقہ پتے کے مطابق مانسہرہ میں۔ تو ڈھونڈتے رہیں پولیس والے وہاں۔''

''انکل، آنٹی سے مشورہ تو کرلو؟''

''کوئی ضرورت نہیں۔ان کو یہیں سے خرچہ بھجوا دیا کروں گا۔ویسے بھی ملک جانو کا منشی ہوں کوئی ایرا غیرا نہیں۔''اس کے انداز پر میں بے ساختہ ہنس پڑا،اسی وقت دروازہ کھول کر ایک نرس اندر داخل ہوئی۔

''عمر جان صاحب کون ہے؟''اندر داخل ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

''میں......کیوں؟''

''ڈاکٹر صاحبہ بلا رہی ہیں آپ کو۔''کہہ کر وہ واپس مڑ گئی۔

''کہاں ہیں وہ؟''میں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

''اپنے دفتر میں ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔''اور نرس میری بات سن کر سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

''اچھا بھئی ماجے میں تو چلا بھابی کے پاس تم آرام کرو۔پتا نہیں کس مقصد کے لیے بلایا ہے۔''

''یہ بات اسے نہیں کہہ دینی۔''اس نے مجھے تنبیہہ کی۔''یہ نہ ہو ہم اگلے چند منٹوں میں ہسپتال سے باہر نظر آئیں۔''اور میں ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

دفتر کے باہر ایک ادھیڑ عمر باریش شخص سٹول پہ براجمان تھا،اس کی سوالیہ نظروں کو دیکھ کر میں نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے بلایا تھا۔''

''جی وہ آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔''اس نے اٹھ کر میرے لیے دروازہ کھولا۔

اور میں اسے ''شکریہ'' کہتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ڈاکٹر شہلا کافی بے چینی سے منتظر تھی مجھے دیکھتے ہی وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔

''میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی آئیے بیٹھیے۔''اس نے کرسی کے جانب اشارہ کیا۔

''فرمایئے۔''میں نے کرسی سنبھال لی۔

''عمر جان صاحب،سب سے پہلے تو میں معذرت کرنا چاہوں گی کہ مجھ سے ایک نہایت غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی ہے اور وہ ہے چھپ کر آپ دونوں کی باتیں سننے کی،اور اس حرکت کی وجہ آپ دونوں کی پُراسرار خاموشی تھی ابو جان کا نام سنتے ہی آپ کو چپ سی لگ گئی تھی اور اس بات نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا اور میری یہ حیرت آپ دونوں کی گفتگو سن کر رفع ہو گئی آپ کو شاید میری اس بدتہذیبی پر خفگی ہوئی ہو جس کے لیے میں پیشگی معذرت کر چکی ہوں۔اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کی شکر گزار بھی ہوں کہ میرے ایک ناکردہ جرم کو آپ نے وسیع ظرفی سے معاف کر دیا۔ورنہ جس شخص کے بھرے پُرے گھر کو آگ لگا دی جائے وہ انصاف و ناانصافی اور حق و ناحق نہیں دیکھتا۔پوری دنیا سے انتقام لینے کا خواہاں ہوتا ہے،اور میں تو حقیقتاً آپ کے کہنے کے مطابق اس واقعے سے لاعلم ہوں۔''وہ ایک لحہ سانس لینے کے لیے رکی اور پھر گویا ہوئی......

''اور جہاں تک تعلق ہے آپ کا اکبر سے بدلہ لینے کا جس کو بھائی کہتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے تو اس کام میں قانون

کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے آپ مجھے اپنے شانہ بشانہ پائیں گے کیونکہ اب میری نظر میں وہ بھائی نہیں بلکہ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ زمین و جائیداد کے لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی ہے کہ وہ اپنے خونی رشتوں کو بھی بھلا بیٹھا ہے۔شاید اس لالچ میں وہ مجھے اور امی جان کو بھی مارنے سے دریغ نہ کرے۔''

''فی الحال تو آپ دونوں کو اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں کیونکہ وہ اپنی تمام زمین جائیداد کالی وال کے ملک میر نیاز خان کے ہاتھ بیچ کر کسی نامعلوم جگہ پرُروپوش ہو گیا ہے اور میرے اندازے کے مطابق وہ آپ دونوں کا حصہ بھی میر نیاز خان کے ہاتھ فروخت کر گیا ہے۔''

''اتنے وثوق سے آپ یہ سب کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''گزشتہ شب اسے ٹھکانے لگانے کے لیے ہم آپ کی حویلی میں گھسے تھے۔مگر اس کی بجائے ہمارے ٹکراؤ میر نیاز خان کے آدمیوں سے ہو گیا۔انھی کی زبانی ہمیں پتا چلا ہے کہ اکبر پرسوں سے روپوش ہو چکا ہے اور آپ کی حویلی اور زمینیں اب میر نیاز خان کے تصرف میں ہیں۔''

''مگر وہ ہمارا حصہ کیسے فروخت کر سکتا ہے؟''

''یہ میرا اندازہ ہے۔''میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔''ہوسکتا ہے معاملہ اس کے برعکس ہو،لیکن یہ میں بتاتا چلوں کہ اگر ایسا ہو چکا ہے تو ملک میر نیاز سے اپنی زمینیں واپس لینے کے لیے آپ کو کافی محنت کرنی پڑے گی۔''

''ایسا ہے تو میں کل ہی ماموں کو بھیجتی ہوں کہ وہ رحمٰن خیل جا کر حالات کا جائزہ لے آئیں اگر ایسی ہی بات ہے جس طرح کہ آپ نے کہا ہے تو پھر لازماً ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی پڑے گی اس سے پہلے بھی ماموں جان اکبر کے خلاف اعظم بھائی اور چھوٹے ماموں کے قتل کا مقدمہ درج کرا چکے ہیں۔ایک مقدمہ اور سہی۔''

''او کے پھر مجھے اجازت دیں۔''میں اٹھتے ہوئے بولا۔

''افوہ......''اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔''میں بھی کتنی بیوقوف ہوں آپ سے چائے پانی کا ہی نہیں پوچھ سکی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحبہ......بعد میں کسی وقت سہی۔''

''نہیں آپ بیٹھیں۔''اس نے چپڑاسی کو اندر بلانے کے لیے بیل بجائی۔اس کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں بادل نخواستہ بیٹھ گیا۔

''جی بی بی۔''باریش چپڑاسی نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔

''عبدل چاچا دو کپ کافی تو لے آؤ......کیوں کافی ٹھیک ہے نا؟''وہ چپڑاسی سے کہہ کر مجھے مخاطب ہوئی اور میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا جواباً وہ بھی بے ساختہ مسکرا پڑی۔

''ویسے میں اتنی بیوقوف ہوں نہیں۔جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''میں نے کب آپ کو بیوقوف سمجھا ہے۔''میں زیر لب مسکرا دیا۔

''آپ کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا ہے۔''

''نہیں......نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بیوقوف آدمی ڈاکٹر کیسے بن سکتا ہے؟۔''میں نے اس کی بات کی تردید کی اس کے بعد کافی آنے تک ہم اس طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف رہے۔کافی پی کر میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابھی اجازت دوان شاءاللہ کل گپ شپ کریں گے۔''میں نے جانے کی اجازت چاہی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا مگر اس سے پہلے کہ میں باہر جانے کے لیے دروازہ کھولتا اس نے آواز دی۔

''عمر جان صاحب۔''

''جی۔''میں پیچھے مڑا۔

''وہ......''وہ نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔''اپنے دوست امجد سے کہہ دیجئے گا کہ وہ جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہے۔وہ تبسم وہ تکلم میری عادت نہیں ہے۔''یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ لہرانے لگے۔

''یہ اگر آپ اسے خود کہہ دیتیں۔''میں شرارتی لہجے میں بولا۔

''آپ کہہ دیجئے نا میری جانب سے۔''وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے بھابی۔''کہتا ہوا میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مجھے پتا تھا کہ میری بات سن کر اس نے شرم سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہو گا۔میں خوشی سے سرشار امجد کے کمرے کے جانب چل دیا وہ تکیئے پر سر رکھے گہری سوچوں میں غرق نظر آیا۔

''ماجے صاحب آپ زندہ ہیں یا روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔''اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر میں نے پوچھا۔

''اتنی جلدی تیری دلی خواہش پوری نہیں ہو سکتی بالک۔''وہ برجستہ بولا۔

''اگر یوں ہے تو جلدی سے مٹھائی کا بندوست کرو۔''

''کیوں؟''وہ حیرانی سے مستفسر ہوا۔''بچہ ہوا ہے میرا کہ مٹھائی کا بندوبست کروں۔''

''وہ بھی ہو جائے گا اگر تُو تیسری مخلوق سے نہ ہوا تو۔''میں ترکی بہ ترکی بولا۔

''میرا تو خیال ہے کہ آدمؑ کی ہستی واحد ہستی تھی جس کے وجود سے اللہ تعالیٰ نے دوسرا وجود پیدا کیا تھا اس کے علاوہ شاید دوسرا میں ہوں گا وہ بھی آپ کے بقول۔''

''بیوقوف میں تیری ہونے والی دولھن کا پیغام لایا ہوں۔نامہ بروں کے لیے عاشق کیا کچھ نہیں کر دیتے اور تُو مٹھائی کھلانے میں حیل وحجت کر رہا ہے۔''

''کک کون دولھن اور کیسا پیام۔''وہ ہکلایا۔

''اچھا اب وہ کون سی ہو گئی جبکہ تھوڑی دیر پہلے پسندیدہ کڑی تھی۔''

''مذاق مت اُڑاؤ یار کہاں ڈاکٹر شہلا اور کہاں غریب امجد۔''

''بہر حال میرا کام تھا اس کا پیغام پہنچانا اور اس نے کہلا بھیجا ہے کہ!

ذرا سا دھیان رکھ لینا میری پہلی محبت ہے

وفا کا مان رکھ لینا میری پہلی محبت ہے

''یار صحیح صحیح بتلاؤ تمھارے درمیان کیا بات چیت ہوئی ہے۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا اور میں نے من و عن ساری گفتگو اس کے سامنے دہرا دی۔ میری اختتامی باتوں سے اس کے چہرے پر ہزار والٹ کے بلب سے بھی زیادہ روشنی پھیل گئی تھی۔

''سچ مچ یہی باتیں ہوئی ہیں؟'' وہ خواب ناک لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ہاں سچ مچ یہی باتیں ہوئی ہیں میرے باپ۔'' میں چیخ کر بولا۔''اب کسی دوسرے موضوع پر بکو تیری سوئی تو بس ڈاکٹر پر ہی اٹک گئی ہے۔'' مگر یہ میری خام خیالی تھی کہ میری جھڑکی سن کر اس پر کوئی اثر پڑے گا۔ وہ اسی لئے اور اسی سُر میں شروع رہا۔ یہاں تک تنگ آ کر میں ہی وہاں سے بھاگ گیا۔ اگلے دو ہفتے میں نے شہر میں ہی گزارے دن کو میں زیادہ تر امجد کے پاس رہتا جبکہ رات چچا کے پاس گذارتا اس دوران میری شائلہ کے ماموں سے ملاقات بھی ہوئی وہ اچھے خاصے ہنس مکھ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ اس کے علاوہ امجد کے والد صاحب کو بھی میں نے ایک معقول رقم بذریعہ منی آرڈر بھجوا دی تھی کیونکہ امجد واپس نوکری پر جانے سے بالکل انکاری ہو گیا تھا، وہ سارا دن بیڈ پر پڑے شائلہ سے راز و نیاز میں مصروف رہتا شائلہ اس کا علاج بڑی محبت اور چاہت سے کر رہی تھی اس کا ماموں تو زیادہ تر زمینوں کے سلسلے میں مصروف رہتا۔ کالی وال کا ملک میر نیاز خان غیر متوقع طور پر ان کی زمینیں واپس کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور شائلہ کا ماموں چودھری انور علی کی جائیداد میں شائلہ اور اس کی ماں کا حصہ علیحدہ کروانے میں مشغول رہتا باقی جائیداد تو یوں بھی میر نیاز خان نے خرید لی تھی۔

دو ہفتوں کے بعد میں اور امجد واپس گاؤں پہنچے امجد کا زخم کافی حد تک مندمل ہو گیا تھا۔ گو ڈاکٹر شائلہ تو ابھی اس تک اسے ڈسچارج کرنے کے حق میں نہیں تھی مگر امجد کے اس وعدے پر کہ وہ اسے ہر دوسرے دن ملنے کے لیے آتا رہے گا وہ اسے ڈسچارج کرنے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس کا ماموں بھی ان دونوں کی محبت کے حال سے واقف تھا مگر جان بوجھ کر انجان بنا رہتا تھا۔

گاؤں واپس پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے تو ایک جاننے والے کو فصلوں کی کٹائی کا ٹھیکہ دے دیا کیونکہ گندم اور چنے کی فصلیں پک کر تیار ہو گئیں تھیں اور ان کی کٹائی شروع تھی۔

''جانو یار...... گھر کی از سر نو تعمیر کب شروع کروانی ہے؟'' ہم دونوں اسلم بھائی کی بیٹھک میں بیٹھے اپنے اپنے خیالات میں گم تھے کہ اچانک امجد مستفسر ہوا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔''پہلے چودھری اکبر کے سلسلے کو کسی ایک سائیڈ پر ہونے دو۔''

''تو پھر کیا خیال ہے؟...... میر نیاز خان سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔''

''تیرا بازو تو ٹھیک ہو جائے۔''

''بس ٹھیک ہے میرا بازو۔تین ہفتے تو ہونے کو ہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر زخم ابھی تک کچا ہے اور اس زخم کی وجہ سے تیری کارکردگی آدھے سے گھٹ جائے گی اور میر نیاز خان کے خلاف حرکت میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دونوں مکمل طور پر چاق چوبند اور فٹ ہوں۔''

''تم میری فکر مت کرو......اپنا ارادہ بتاؤ؟''

''میرا ارادہ تو یہ ہے کہ بطور منشی تم فصل کی کٹائی کی نگرانی کرتے ہوئے اپنی تنخواہ حلال کرو جبکہ میر نیاز خان سے نبٹنے کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔''

''یہ کام تم مجھ سے بہتر کر سکتے ہو......اس لیے یہ تیرے ذمہ اور میں میر نیاز خان کے خلاف میدان میں اترتا ہوں۔''

''چلو چھوڑو فی الحال اس کے خلاف معلومات حاصل کرتے ہیں، جب تک تمھارا بازو بھی مکمل فٹ ہو جائے گا۔کیونکہ میں اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''منظور ہے، مگر اس دن کرم شاہ نامی شخص سے اس کے متعلق تمام معلومات تو حاصل کر لی تھیں اب اور کیا رہ گیا ہے؟''

''وہ سب کچھ بھی مجھے یاد ہے مگر اس کے علاوہ بھی اگر کوئی مفید معلومات حاصل ہو جائیں تو کیا مضائقہ؟'' اور امجد نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد ہم میر نیاز کو گھیرنے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگے۔میں میر نیاز کی شکل وصورت سے ناواقف تھا اسی طرح اس نے بھی مجھے دیکھا ہوا نہیں تھا۔کالی وال کا رحمٰن خیل سے ٹوٹل فاصلہ 7 سے 8 کلومیٹر تھا۔رحمٰن خیل سے ایک کچا راستا نکلتا تھا جو تین کلومیٹر آگے جا کر اس پختہ سڑک سے مل جاتا تھا جو مین روڈ اور کالی وال کو آپس میں ملاتا تھا۔ہم دونوں نے طے کیا کہ اگلے دن میں کالی وال جا کر میر نیاز خان کی حویلی کا جائزہ لے کر آؤں گا اس کے ساتھ میں اس معلومات کی تصدیق بھی کر لوں گا جو کرم شاہ نامی شخص سے ہمیں حاصل ہوئی تھی۔امجد بڑی مشکل سے میرے اکیلے جانے پر راضی ہوا تھا۔

''یار میں تجھے ہی بھیجتا لیکن تم پشتو اور سرائیکی دونوں زبانوں سے نابلد ہو جبکہ اس علاقے میں صرف یہی دو زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

''ٹھیک ہے لیکن تم نے اکیلے اکیلے کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''وہ تو پہلے بھی کوئی نہیں تھا......بہرحال اطمینان رکھو میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''چلو پھر طے ہو گیا۔صبح آپ کالی وال جائیں گے اور میں چچا فاضل کو ملنے کے لیے شہر چلا جاؤں گا۔''

''بڑی یاد آ رہی ہے بھئی چچا کی۔'' میں طنزیہ لہجے میں بولا اور وہ شرمندہ ہنسی ہنس کر خاموش رہا۔

+ + +

میر نیاز خان کالی وال کی بارسوخ شخصیت تھی۔ مجھے پتا تھا کہ کالی وال میں اس کے خیر خواہ بکثرت ہوں گے۔اس کے متعلق معلومات کے حصول یا کسی اور کارروائی کے لیے مجھے بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے پتا چلے کہ میں اس کے خلاف سرگرم ہو چکا ہوں کیونکہ اس کی اور میری دشمنی کی بنیاد کوئی نہیں تھی، گو وہ ایک دفعہ میرے اوپر حملہ کرا چکا تھا اس کا اسے منہ توڑ جواب ملا تھا لیکن اس کے بعد اس کی طرف سے کسی بھی قسم کی کارروائی میرے خلاف نہ ہوئی جس کا یہی مطلب تھا کہ وہ اپنی توانائیاں بے فائدہ کاموں میں خرچ نہیں کرتا۔ میں بھی چودھری اکبر کے دھوکے میں اس کے آدمیوں پر حملہ کرنے کا مرتکب ہو چکا تھا مگر ایسا صرف غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا تھا۔اب مجھے کوئی ایسا طریقہ کار آزمانے کی ضرورت تھی جس کی بنا پر میر نیاز خان مجھے چودھری اکبر کے روپوشی کے مقام کے بارے معلومات بغیر کسی خون خرابے کے فراہم کر دیتا۔رات کا بیشتر حصہ اسی سوچ و بچار میں کٹا، دن چڑھے میں کالی وال روانہ ہو گیا، امجد صبح سویرے شہر چلا گیا تھا۔میں نے تانگہ لینے کی بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دی تھی۔کلوزبٹ کی مشین گن کندھے سے لٹکا کر اوپر میں نے ہلکی چادر اوڑھ لی تھی۔اگر میں چادر نہ اوڑھتا تب بھی کوئی خاص فرق نہ پڑتا کیونکہ ہمارے علاقے میں ہر دوسرا بندہ ہتھیار سے مسلح دکھائی دیتا ہے، لیکن ہتھیار کو چھپانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ ہتھیار ہم نے میر نیاز خان کے آدمیوں سے چھینا تھا جو میں نے جیرے پہلوان کے پاس رکھوایا ہوا تھا اور شہر سے واپس آنے کے بعد میں اس سے واپس لے آیا تھا۔کوئی بھی دشمن اس ہتھیار کو پہچان کر میرے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ویسے بھی ہمارے لوگ اپنے ہتھیار کو اپنے بچوں کی طرح پہچانتے ہیں۔

میں جلد ہی مین روڈ اور کالی وال کو ملانے والی پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔وہاں سے ایک موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لے کر میں کالی وال پہنچ گیا۔کالی وال آبادی کے لحاظ سے رحمٰن خیل سے دگنا تھا۔وہاں پر گھنٹا ڈیڑھ دائیں بائیں پھرنے کے بعد مجھے کام شروع کرنے کے لیے موزوں جگہ مل گئی۔وہ ایک چھپر ہوٹل تھا جس کے کونے میں زمین پر چٹائی بچھا کر دس بارہ آدمی دو تین ٹولیوں میں بٹے جوا کھیلنے میں مشغول تھے۔معاشرے میں نشئی اور جواری ایسا طبقہ ہوتا ہے جسے صرف اپنے نشے یا جوئے سے غرض ہوتی ہے اور ان سے اپنا مطلب نکالنا بہت آسان ہوتا ہے۔قارئین کو شاید سرِ عام جوا کھیلے جانے پر اچنبھا ہو مگر گندہ پور معاشرے کی بڑی خامیوں میں جوا اور نشہ سرفہرست ہیں اور جہاں تک تعلق ہے پولیس کا تو ان کا منہ بند رکھنے کے لیے ان کو ہڈی ڈال دی جاتی ہے اور ویسے بھی ہمارے علاقوں میں پولیس کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔میں بھی نسبتاً ایک چھوٹی نظر آنے والی ٹولی میں بیٹھ گیا۔بین الاقوامی سطح پر جوا کھیلنے کے لیے سب سے زیادہ فلش نامی گیم کھیلی جاتی ہے مگر ہمارے علاقے میں اس گیم کو اتنی ترجیح نہیں دی جاتی اور لوگ زیادہ تر رمی یا مانگ پتا کھیلتے ہیں۔بہت سے تاش کھیلنے والوں کے لیے مانگ پتا شاید نئی گیم ہو ان کی معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ یہ بہت سادہ کھیل ہے۔

اس میں شامل تمام افراد میں ایک شخص کوئی سا پتا بتاتا ہے اور تاش پھینٹنے والا تمام کے سامنے ترتیب وار ایک ایک پتا پھینکتا جاتا ہے جس شخص کے سامنے وہ پتا کھل جائے وہی جیتا ہوا تصور ہوتا ہے اور جب تک وہ مطلوبہ پتا کھل نہ جائے بانٹنے والا تمام افراد کے سامنے ترتیب وار پتے پھینکتا رہتا ہے۔

اس وقت بھی تمام لوگ اسی گیم سے جوا کھیل رہے تھے۔ یہ اور بات کہ فی بازی وہ پانچ دس روپے سے زیادہ نہیں بڑھ رہے تھے۔ میرا مقصد چونکہ صرف اپنے مطلب کے بندے کی تلاش تھی اور وہ شخص مجھے جلد ہی مل گیا۔ اپنی گھڑی اور چادر بھی جوئے میں ہار کر وہ نہایت پریشانی اور افسوس کی حالت میں وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے جگہ چھوڑتے ہی میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوا اس وقت تک میں بھی دس بارہ بازیاں ہار چکا تھا مگر میرا مطمع نظر چونکہ کچھ اور تھا اس لیے میں نے مطلق اس کی پروا نہیں کی تھی۔ کھیلنے والوں نے میرے اٹھ جانے کو میرے ہارنے کی وجہ سمجھا۔

میرا مطلوبہ شخص نہایت افسردگی کے عالم میں سر جھکائے اردگرد کے مناظر سے لاتعلق چل رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے اس کا تعاقب جاری رکھا، وہ شاید اپنی کسی ایسی ضرورت کے متعلق سوچ رہا تھا جس کے پورا ہونے کا دارومدار اس کے جیتنے پر تھا مگر وہ ہار گیا تھا اور ایسا صرف اس کے ساتھ نہیں ہوا تھا جوا ہے ہی ایسی لعنت کہ اس نے کبھی کسی کو خوشحالی نہیں دی۔ جیتنے کی امید پر انسان اپنے ہاتھ میں موجود پیسے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''جوا کسی کا نہ ہوا'' تو یہ مثل ہر جواری پر صادق آتی ہے۔ آج تک کوئی جواری یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے جوا کھیل کر اپنی اتنی زمین جائیداد بنائی ہے۔ ہمیشہ یہی سننے اور دیکھنے کو ملا ہے کہ یہ چیز جوئے میں ہار دی اور وہ چیز جوئے میں ہار دی اسی لیے دینِ فطرت یعنی اسلام نے جوئے کو حرام قرار دیا ہے۔ کچھ فلاسفہ کے نزدیک اسلام کی ساری اچھائیوں سے قطع نظر کر کے اگر صرف جوئے اور شراب کے حرام کرنے کے حکم کو ہی لیا جائے تب بھی اسلام مذاہب عالم پر فوقیت لے جائے۔

بازار سے نکل کر جیسے ہی وہ ایک گلی میں داخل ہوا میں رفتار تیز کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

''السلام علیکم۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا۔ سلام کا جواب گول کرتے ہوئے اس نے بے دلی سے میرے ہاتھ کو تھام لیا۔

''تاسوخو......'' (آپ تو......) وہ مجھے پہچانتا ہوا پشتو میں بولا اور جواباً میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پشتو میں ہی بولا۔

''بالکل میں وہی ہوں جو آپ کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔''

''خیر خودے؟'' (خیر تو ہے) وہ پریشانی کے عالم میں مستفسر ہوا۔ اسے شاید یہ فکر دامن گیر ہو گئی تھی کہ کہیں میں کسی مطالبے کے لیے اس کے پیچھے نہ آیا ہوں۔

''ہاں ہاں خیر ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''دراصل میں کالی وال میں اجنبی ہوں اور ایک خاص کام کے سلسلے میں ایک قابلِ اعتماد بندے کی ضرورت تھی اس کے لیے آپ مجھے موزوں دکھائی دیے ہو۔''

''خاص کام......اور موزوں۔'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''بہر حال بتاؤ۔''

''یہاں نہیں کہیں بیٹھ کر......''۔

''کھانا کھایا ہے؟'' اس کے اندر موجود گنڈہ پوروں کی ازلی مہمان نوازی کی رگ پھڑکی اور وہ مستفسر ہوا حالانکہ میرا اندازہ تھا کہ اس کے گھر میں کھانے کے لیے شاید ہی کچھ موجود ہوتا، لیکن میرا مقصد چونکہ اسے اعتماد میں لے کر اس سے کام نکلوانا تھا اس میں نے اثبات

میں سر ہلا دیا۔

''چلو پھر پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ وہیں پر کام کی بات چیت بھی ہو جائے گی۔''

''چلو۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ہم دونوں اس کے گھر کی سمت بڑھ گئے۔ دو تین موڑ مڑنے کے بعد ہم ایک گارے مٹی سے بنے کچے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ جس کی بغل میں ایک چھوٹی سی بیٹھک بھی موجود تھی۔ بیٹھک کا دروازہ کھول کر اس نے مجھے وہاں بٹھایا اور خود گھر میں گھس گیا۔ اسے گھر میں گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اندر سے چیخ و پکار کی آواز بلند ہوئی اور اس سے پہلے کہ مجھے اس شور وغل کی وجہ سمجھ آتی بیٹھک کا گھر کی طرف موجودہ دروازہ دھڑام سے کھلا اور چادر لپیٹے ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی وہی جواری گالیاں بکتا ہوا برآمد ہوا جس کے ساتھ میں یہاں پہنچا تھا۔

''بھائی جان آپ خفا......'' جوان عورت نے میرے سامنے پہنچ کر کچھ کہنا چاہا مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے جواری نے اس کو بازو سے پکڑ کر گھر کے جانب دھکا دیا۔

''دفع ہو جاؤ، بکواس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ دھاڑا

''کروں گی بکواس۔'' وہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی۔ ''گھر میں سوکھی روٹی بھی موجود نہیں ہے اور جناب کو مہمان نوازی کی پڑی ہے۔ اتنے مہمان نواز تھے تو کچھ کما کر لاتے تا کہ میں تجھے اور تیرے مہمان دونوں کو کھلاتی۔''

''تیری تو......'' وہ جواری گالیاں بکتا ہوا اسے مارنے کے لیے لپکا اور میں جو حیرانی سے اس ڈرامے کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا تڑپ کر آگے بڑھا اور اس مختصر وجود جواری کو تھام لیا۔

''آرام سے بھائی آرام سے اتنا گرم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ادھر بیٹھو۔'' میں اسے زبردستی چارپائی پر بٹھا دیا۔ ''مجھے ساری کہانی بتاؤ کیوں لڑ رہے ہو۔''

''میں بتاتی ہوں بھائی جان۔'' جواری کے کچھ بولنے سے پہلے وہ عورت جو غالباً جواری کی بیوی تھی چلائی۔ ''دوسرا دن ہے گھر میں چولھا نہیں جلا ہے صبح میں اپنے بھائی سے سو روپیہ مانگ کر لائی تھی اس کو وہ پیسے دیئے کہ سودا سلف خرید لائے اور یہ بجائے کوئی سامان لانے کے خالی ہاتھ گھر تشریف لے آیا ہے اور ابھی آپ کے کھانے کا بندوبست کرنے لیے میری بالیوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ میں اسے فروخت کرنے کے لیے بالیاں دے دیتی مگر مجھے پتا ہے اس نے ان سے حاصل ہونے والی رقم بھی جوئے میں اڑا دینی ہے کیونکہ اس سے پہلے یہ میرے کنگن جھمکا اور تھلی بیچ کر جوئے میں اڑا چکا ہے۔''

''تیرے فائدے کے لیے ہی کھیلتا ہوں۔ اگر جیت جاتا تو تجھے سارے زیور بنوا دیتا۔'' وہ جواریوں والی ازلی حماقت سے بولا۔

''جوا اور جیت۔ یہ دو متضاد الفاظ ہیں۔'' وہ حکمت بھرے لہجے میں بولی۔ ''ویسے بھی مجھے تیری جوئے میں جیتی ہوئی حرام کی رقم نہیں چاہیے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے بہن آپ جائیں اب یہ آپ سے بالیوں کا مطالبہ نہیں کرے گا۔" میں ان کے بیچ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔"اور تم اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"کک کہاں۔" وہ چونکتا ہوا بولا۔جبکہ عورت تشکرانہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتی ہوئی اپنے گھر میں گھس گئی۔

"چلو تو سہی۔" میں بیٹھک کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔وہ بھی بادل نخواستہ میرے ساتھ چل پڑا۔میں نے وہاں سے سیدھا بازار کا رخ کیا اور بازار پہنچ کر اس کے "نا.....نا" کرنے کے باوجود آٹے کی بوری، گھی کا ٹین، چینی کی بوری اور کھانے کا کافی سارا سامان خرید کر ایک ریڑھے میں ڈلوا کر اس کے گھر اٹھوا کر لے آیا۔میں اس سازوسامان کی بجائے رقم بھی اس کے حوالے کر سکتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ اس نے ساری رقم جوئے میں اڑا دینی تھی جبکہ اس طرح کم از کم مہینا ڈیڑھ اس کے گھر کا چولھا تو جل سکتا تھا۔اس کی بیوی سامان کو دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رویے پر نادم بھی نظر آ رہی تھی مگر میں نے اسے نظرانداز کر دیا مقولہ مشہور ہے کہ "کسی کی مدد کرتے وقت اس کے چہرے کی طرف مت دیکھو یہ نہ ہو اس کی شرمندہ آنکھیں تمھارے دل میں غرور کا بیج بو دیں۔"

گو میں نے ان کی مدد اپنی غرض سے کی تھی مگر انسان کا نفس اس کی مجبوری میں کی جانے والی نیکی کو بھی بڑھا چڑھا پیش کرتا ہے اور میں بھی ایک گنہگار انسان ہی تو تھا۔

سامان وغیرہ گھر میں رکھوا کر جب وہ جواری جس کا نام بعد میں منظور معلوم ہوا بیٹھک میں آیا تو سنجیدگی سے کہنے لگا۔"بھائی جان آپ نے غالباً کام بتانے سے پہلے معاوضہ چکا دیا ہے خدارا کوئی ایسا کام نہ بتانا جسے کرنا میرے بس سے باہر ہو۔"

"نہیں دوست ایسی کوئی بات نہیں۔تمھاری مدد میں نے اپنا کام کروانے کے لیے نہیں کی ہے۔وہ تو آپ کی بیوی کو بہن کہنے کے ناطے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنی بہن کی مدد کر دوں اور جہاں تک تعلق ہے کام کا تو چھوڑو وہ کام میں کسی اور سے لے لوں گا۔" مجھے چونکہ اس سے صرف معلومات درکار تھیں اس لیے میں اپنی حکمت عملی تبدیلی کرتا ہوا بولا ورنہ اس سے پہلے میرا ارادہ کچھ اور تھا۔

"آپ تو خفا ہی ہو گئے۔" وہ جلدی سے بولا۔"میری بات کا یہ مقصد نہیں تھا۔"

"نہیں نہیں خفا نہیں ہوں۔" میں خوش دلی سے مسکرا دیا۔

"اگر خفا نہیں ہو تو پھر بتاؤ کیا کام تھا؟"

"اچھا بتا دوں گا جلدی کس بات کی ہے..... پہلے آپ یہ بتائیں کہ، کالی وال کا ملک میر نیاز خان کیسا بندہ ہے۔"

"کیسے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے اگر میں اس سے ملنا چاہوں تو۔"

"تو یہ کون مشکل کام ہے۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔"میرا مطلب اس سے اکیلے ملاقات کرنے کا تھا، اس طرح

کہ کسی کو پتا نہ چلے۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“ وہ حیرانی سے بولا۔”اس کے اردگرد ہر وقت اس کے باڈی گارڈوں کا جتھا جمع رہتا ہے اور تو اور اس کی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ بھی دو تین تین باڈی گارڈ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔“

”کس لیے؟ کیا اس کو کسی کا خوف ہے؟“

”بڑے لوگوں کی دشمنیاں بھی بڑی ہوتی ہیں بھائی۔“

”میر نیاز خان کی کس سے دشمنی ہے؟“

”یہ تو خیر اس کو خود پتا ہوگا کہ کتنوں سے اس کی دشمنی ہے میں نے تو جو سنا ہے اس کے مطابق کوہاٹ کے دو خان اس کے مخالف ہیں جو دو بار اس پر قاتلانہ حملہ کرا چکے ہیں۔“

”دشمنی کی وجہ؟“

”کوئی کاروباری رقابت ہے...... ویسے بھی پتا نہیں کون کون سے غیر قانونی کاموں میں یہ اور اس کی اولاد ملوث ہے۔“

”ہونہہ۔“ کہہ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر میں کوہاٹ کے خانوں کو اپنے ساتھ ملا کر میر نیاز خان کے خلاف میدان میں اترتا تو یقیناً کامیابی میرے قدم چومتی مگر مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کسی قبیلے کے خان تھے آیا صرف نام کے خان تھے یا کوئی اور اہلیت بھی ان میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ مل کر کام کرنے پر تیار ہو جاتے۔ پھر ان کی تلاش بھی ایک علیحدہ دردِ سر تھی ایک شاعر کے بقول۔

دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید
اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

اس لیے میں نے ان کا خیال چھوڑ دیا ان کو تلاش کر کے اپنے ساتھ ملانا وقت کا ضیاع تھا ویسے بھی اصل مجرم اکبر خان تھا میر نیاز خان تو صرف اس کے ایڈریس سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے میرا ہدف بن گیا تھا۔

”میر نیاز خان کی بیٹی کا نام رضیہ ہے نا؟“ میں نے منظور سے پوچھا۔

”پتا نہیں بھائی جان...... ویسے ان کے ملازم اسے چھوٹی بی بی کہہ کر پکارتے ہیں۔“

”چلو پھر اپنا نام ہی بتا دو۔“ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”منظور۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”تو منظور بھائی آپ کی یہ چھوٹی بی بی کس وقت گھر سے نکلتی ہے؟“

”اس بارے بھی میں لاعلم ہوں...... البتہ کبھی کبھار صبح کے ٹائم پر اسے گاڑی میں پکے روڈ کی سمیت جاتے دیکھا ہے۔ اب یہ پتا

نہیں ہے کہ وہ روزانہ جاتی ہے یا نہیں۔"

"اس ٹائم وہ اکیلی ہوتی ہے کیا؟" میں مستفسر ہوا۔

"اکیلی کہاں جناب...... دوسری گاڑی میں دو تین مسٹنڈے اس کے پیچھے ہوتے ہیں۔"

"اس کے بیٹے کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

"وہ تو زیادہ تر گاؤں سے باہر ہی رہتا ہے۔کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے۔اس کے نام کا البتہ مجھے پتا ہے۔گل ریز خان کہتے ہیں اسے۔"

"اچھا...... پھر میر نیاز خان کی حویلی ہی مجھے دکھلا دو۔"

"کھانا تو کھالیں۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔"تیار ہو گیا ہوگا۔"

ٹھیک ہے لے آؤ کھانا۔" میں نے کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا گھر کے جانب بڑھ گیا۔تھوڑی دیر بعد ہی وہ چھابے میں آلو، مٹر اور روٹیاں لیے نمودار ہوا۔کھانا کھا کر ہم بیٹھک سے باہر آ گئے منظور کی عادات واطوار میں میرے لیے ایک عقیدت جیسی پیدا ہو گئی تھی۔اس لیے وہ میرے ساتھ چلنے کی بجائے تھوڑا سا پیچھے ہو کر چل رہا تھا۔اس کی بتائی ہوئی سمت چلتے ہوئے ہم جلد ہی ایک بڑی سی حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔وہ حویلی کی بجائے ایک قلعہ دکھائی دے رہی تھی بیرونی دیواروں کی بلندی کم وبیش 16,15 فٹ ہوگی۔ان دیواروں کے اوپر خاردار تار لگی ہوئی تھی حویلی کے چاروں کونوں میں ٹاور نما مورچے بنے ہوئے تھے۔حویلی کے مین گیٹ کے دونوں جانب بھی مورچے نظر آ رہے تھے، سیکورٹی کا اتنا سخت انتظام مجھے حیران کر گیا۔

"اتنی سخت سیکورٹی تو کس وزیر کی بھی نہ ہوگی۔" میں نے منظور سے مخاطب ہوا۔

"ملک صاحب بھی کسی وزیر سے کم نہیں ہیں۔" اس نے گویا مجھے سمجھایا۔"اور ویسے بھی وزیروں کی اتنی دشمنیاں کہاں ہوتی ہیں جتنی ملک صاحب کی ہیں۔"

"یہ تو تم نے ٹھیک کہا ہے۔" میں نے اس کی تصدیق کی۔

"ایک بات پوچھوں بھائی صاحب؟" وہ محتاط لہجے میں مستفسر ہوا۔

"پوچھو۔"

"کیا آپ بھی ملک صاحب کے دشمن ہیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"میں......" میں نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔"نہیں میرا صرف ایک کام اس کے پاس پھنسا ہوا ہے اس لیے میں اس سے اکیلے ملاقات کا متمنی ہوں۔اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

"تو آپ اس کے کسی ملازم کے ہاتھ اسے یہ پیغام پہنچا دیں کہ آپ اس سے اکیلے ملاقات کے خواہاں ہیں شاید وہ مان جائے۔"

ہم ملک میر نیاز کی حویلی کے گرد چکر لگا کر واپس آ رہے تھے جب منظور نے یہ تجویز پیش کی۔

''یہ بھی کر لوں گا مگر اس سے پہلے تم ایک چھوٹا سا کام کرو۔'' حویلی کے حفاظتی انتظامات دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک نیا آئیڈیا آیا پہلے منصوبے کو میں نے ترک کرنا مناسب سمجھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ کالی وال میں کسی بندے کو اپنا ہمنوا بنا کر اس کو میر نیاز خان کے روزمرہ کے معمولات کی نگرانی پر لگا دوں گا مگر اب اپنا ارادہ بدلتے ہوئے میں نے منظور کو میر نیاز کی بیٹی کی نگرانی پر مامور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا گو منظور سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں تھا مگر اسے غلط بیانی سے مطمئن کیا جا سکتا تھا۔

''آپ حکم کریں۔'' منظور جلدی سے بولا۔

''بیٹھک میں بیٹھ کر تفصیل سے بات کریں گے۔ یہاں پر راستے میں ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔'' اور منظور اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔

''اب بتاؤ کیا کام ہے؟'' ہم بیٹھک میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ وہ بے صبری سے مستفسر ہوا۔

''منظور میں ابھی تمھیں اپنا راز دینے والا ہوں خدارا اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا۔'' میں رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ کام تیرے بس سے باہر ہو تو بے شک انکار کر دینا۔''

''میں کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پر پورا اتروں۔'' اس کے لہجے میں خلوص تھا۔

''منظور بات یہ ہے کہ انسان کو اپنے دل پہ اختیار نہیں ہوتا۔''

''بالکل۔'' اس نے جلدی سے میری تائید کی۔ مگر میں اس کی تائید پر دھیان دیئے بغیر اپنی لے میں شروع رہا۔

''میں نے بھی جب پہلی مرتبہ رضیہ کو دیکھا تو اپنا دل ہار بیٹھا، گو وہ معاشی لحاظ سے مجھ سے برتر ہے مگر اتنا گیا گزرا میں بھی نہیں ہوں۔ اسے پسند کرنے کے بعد میرا ارادہ ہوا کہ اس کے باپ سے مل کر اس کا رشتہ مانگوں مگر آپ کے بقول اس سے تنہائی میں ملاقات کرنا چونکہ کافی مشکل ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے دماغ میں آئی ہے کہ جب تک رضیہ راضی نہ ہو اس کے باپ سے بات چیت فضول ہے اس لیے ضروری ہے کہ میں پہلے رضیہ کے دل میں جگہ بنا لوں اس کے بعد اس کے باپ کو راضی کرنا اتنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''رضیہ غالباً چھوٹی بی بی کا نام ہے؟''

''ہاں۔''

''مگر اس ضمن میں مَیں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟''

''تمھارا کام بہت آسان ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''تم نے دو تین دن حویلی کے دائیں بائیں گھوم کر رضیہ کے معمولات کا جائزہ لینا ہے۔ خاص کر اس کے حویلی سے باہر جانے کے اوقات اور اس کے ساتھ موجود کارندوں وغیرہ کی تعداد پر نظر رکھنی ہے اور جیسے ہی تجھے مصدقہ اطلاعات مل جائیں تو ٹو نے رحمٰن خیل میں آ کر مجھے مطلع کر دینا ہے، بلکہ نہیں آج غالباً سنیچر ہے میں بدھ کے دن آ کر تم سے ساری

تفصیلات معلوم کرلوں گا۔“

”یہ سب تو ٹھیک ہے۔“ کام کی نوعیت جان کر اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ ”مگر تم اپنے والدین کو یہ رشتہ لینے کیوں نہیں بھیجتے۔“

”والدین زندہ ہوتے تو میں اس طرح خوار ہو رہا ہوتا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز گلوگیر ہو گئی کہ میری اس بات میں کوئی جھوٹ شامل نہیں تھا۔

”معافی چاہتا ہوں مجھے پتا نہیں تھا۔“ وہ نادم لہجے میں بولا۔ ”بہر حال فکر نہ کریں میں انشاء اللہ بدھ تک آپ کے مطلب کی معلومات ضرور حاصل کرلوں گا اور اگر رضیہ بی بی نے ایک دفعہ تجھے نظر بھر کر دیکھ لیا تو تیری محبت سے انکار کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ تیرے جیسے خوب صورت جوان بہت کم میری نظر سے گزرے ہیں۔“

”بس یہ تو حسن نظر ہے آپ کا اور خدا رضیہ کو بھی ایسی نظر عطا کرے۔“

”آمین۔ وہ جلدی سے بولا۔ اس کے انداز پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”اچھا اب میں چلوں گا...... تم یہ رکھ لو تمھارا ایڈوانس ہے۔“ میں نے کھڑے ہو کر 500 کے بقدر رقم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”باقی رقم کام ہو جانے کے بعد دوں گا۔ اگر کام اچھا پایا گیا تو انعام بھی دوں گا اور اب یہ رقم جوئے میں نہیں اڑا دینی تمھارے بیوی بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔ جوا تجھے کبھی بھی خوشحال نہیں کرے گا۔“

”اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی آپ نے کافی سامان میرے لیے خریدا ہے مزید زیر بار نہ کریں۔“ اس نے رسمی انکار کیا، مگر میرے اصرار پر پیسے لے کر جیب میں ڈال لئے۔ اس سے الوداعی مصافحہ کر کے میں اس کی بیٹھک سے باہر آ گیا۔ وہ میرے ساتھ گاؤں سے باہر تک چلنے پر مصر ہوا مگر میں اسے یہ تکلف نہ برتنے کا کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ جوا کھیلنا ترک کر دے گا کیونکہ جوئے کی مثال بالکل نشے کی سی ہے جس شخص کو ایک دفعہ اس کی لت پڑ جائے وہ مشکل سے ہی اس سے جان چھڑا پاتا ہے، بڑے بڑے دولت منداس جوئے کے ہاتھوں دیوالیہ ہوئے ہیں۔ بہر حال میں نے اس مسئلے پر سوچنا ترک کر دیا کہ اس کے جوا کھیلنے یا نہ کھیلنے سے میری ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

+ + +

”تجھے یہ کس نے کہہ دیا کہ تُو یوسف ثانی ہے اور رضیہ تجھے دیکھتے ہی تجھ پر لٹو ہو جائے گی۔“ میری تجویز سنتے ہی امجد آپے سے باہر ہو گیا۔ ”ہر لڑکی کو تُو نے شیتل سمجھ رکھا ہے۔ اس بیوقوف نے بھی نا معلوم تجھ میں کیا خوبی دیکھی تھی بلکہ امید واثق ہے اب وہ بھی اپنی گذشتہ گذری پر پشیمان ہو گی۔“

”تو پھر میری جگہ پر آپ یہ کام کرلیں شہزادہ گلفام صاحب۔“

''لازمی بات ہے تیرا میرا کیا مقابلہ؟'' وہ فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بولا۔''ڈاکٹر شہلا جیسی پڑھی لکھی باشعور لڑکی بھی میں نے چند لمحوں میں پھنسالی تو یہ رضیہ کس کھیت کی مولی ہے۔''

''اچھا......شہلا بھابی کو تُو نے پھانسا ہے اور اب رضیہ کو پھنسانے کا پروگرام ہے۔ٹھیک ہے میں آج ہی ڈاکٹر صاحبہ کی طرف چلتا ہوں تاکہ اس کی یہ غلط فہمی تو ختم کردوں جو اسے تیرے بارے ہے۔''

وہ جلدی سے بولا'' بکواس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔میری بات کا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تو کیا مطلب تھا تیرا؟ ذرا وضاحت فرمادیں۔''

''میرا مطلب تو یہ تھا کہ میں رضیہ کو......رضیہ کو......''

''پھانس لوں۔'' میں نے اس کی بات مکمل کی۔''اور ڈاکٹر شہلا پہلے سے پھنسی ہوئی ہے اس طرح چڑیاں اور دو دو ہو جائیں گی۔ یہی بات میں شہلا صاحبہ کو بالکل اسی طرح سمجھادوں گا جس طرح غلط فہمی سے اسے تیری بناسپتی محبت کے بارے بتلایا تھا۔''

''تم شہلا سے یہ بات نہیں کروگے۔''

''کیوں نہیں کروں گا......اس بھولی بھالی ڈاکٹر کو میں نے ہی تیری محبت کی جھوٹی کہانی سنائی تھی اور میں ہی اسے اس غلط فہمی سے نکال سکتا ہوں۔''

''میرے باپ تم خود ہی گل چھرے اڑا لو رضیہ بی بی کے ساتھ۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔''میں باز آیا اس سے لیکن تُو نے اس کے بعد بھی شہلا سے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو تیرا سر پھاڑ دوں گا۔''

''اب آئے ہو نا لائن پر۔'' میں مسکرادیا۔ مجھے پتا تھا کہ امجد کی ساری تگ و دو کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر مشکل کارروائی میں بہ نفسِ نفیس شامل ہو۔رضیہ سے مل کر اکبر خان کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں اندیشہ تھا کہ پہچانے جانے کی صورت میں مَیں کسی بھی خطرے سے دو چار ہو جاؤں اور امجد اس خطرے کو اپنے گلے لگانے کا خواہاں تھا۔ مجھے اس کی بات میں کوئی تردد نہ ہوتا اگر اس کے بازو کا زخم ابھی تک کچا نہ ہوتا۔

''ویسے اس سے قطع نظر کہ تم مردانہ وجاہت کا شہکار ہو اور رضیہ جیسی آزاد خیال لڑکی اور نہ سہی وقتی فلرٹ کے لیے تمھاری طرف لازماً بڑھے گی۔ مگر مجھے خطرہ یہ ہے کہ تم پہچان نہ لیے جاؤ۔ کیونکہ میر نیاز خان کا کارندہ کرم شاہ تمھاری شکل سے واقف ہے،اور اکبر خان کی حویلی میں گھستے وقت گو ہم نے چہروں پر مفلر لپیٹے ہوئے تھے مگر ڈیل ڈول اور آواز سے ہمارا پہچان لیا جانا اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔''

''ماجے صاحب ہماری سانس کی نالی اور خوراک کی نالی کے درمیان ایک باریک سا پردہ حائل ہے،اگر کھانا کھاتے وقت خوراک کا ایک ذرہ بھی سانس کی نالی میں چلا جائے تو انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے اس لیے میری جان جب ہم ایک نوالہ روٹی کا کھاتے ہیں تو اس وقت بھی موت کے خطرے سے دو چار ہوتے ہیں۔تو کیا ہم روٹی کھانا چھوڑ دیں۔''

''فلسفہ بگھارنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے بریٹنڈ رسل صاحب......میری بات کا صاف اور آسان مطلب یہ ہے کہ میرا زخم

تقریباً ٹھیک ہو چکا ہے چند دن انتظار کر لیتے ہیں کہ مزید کمی بھی دور ہو جائے اس کے بعد ڈائریکٹ میر نیاز خان پر ہاتھ ڈالیں گے میں دیکھتا ہوں کہ سالا اکبر خان کا ایڈریس کیسے نہیں دیتا۔ باقی رہی تیری تجویز تو یہ وقت کا ضیاع ہے۔''

''آپ کا سالا وہ نہیں چودھری اکبر بننے جا رہا ہے۔ بہر حال میں بھی تیری اس تجویز سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ تُو نے میر نیاز خان کی حویلی نہیں دیکھی، قلعہ ہے پورا قلعہ۔ کرم شاہ غریب تو بس واجبی معلومات ہی ہمیں بتا سکا تھا۔ خود اپنی آنکھوں دیکھنے پر پتا چلتا ہے کہ اس حویلی پہ چھاپہ مارنا کتنا خطرناک ہے۔ حویلی کے چپے چپے پر محافظین بالکل اس طرح کھڑے ہیں کہ ایک مکھی بھی ان کی اجازت کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتی۔''

''تو کیا وہ ہمیشہ اندر ہی گھسا رہتا ہے۔ کبھی باہر نہیں نکلتا؟''

''نکلتا ہے مگر محافظوں کے جھرمٹ میں......اور ہم نے اسے قتل نہیں کرنا کہ دور سے گولی مار کر اپنا کام کر گزریں۔ ہم نے اس سے معلومات حاصل کرنی ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے زندہ گرفتار کریں جو کہ ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور ہے باقی اس کام میں بہت زیادہ خون بہنے کا اندیشہ ہے اور میں بے گناہوں کا خون بہانے کے حق میں نہیں ہوں اس کے برعکس اگر میری تجویز پر غور کرو تو اس میں اتنا خون نہیں بہانا پڑتا، زیادہ سے زیادہ رضیہ مجھے پہچان لے گی، خود کو اس کا سچا عاشق ظاہر کر کے میں اسے مطمئن کر سکتا ہوں۔ اس طرح کی آزاد خیال لڑکیاں یوں بھی ہر کسی کو اپنا عاشق تصور کرتی ہیں اور جو اپنے منہ سے یہ کہہ رہا ہو اس کی بات میں تو انھیں بالکل ہی شبہ نہیں ہوتا۔''

''تو پھر تم کب جا رہے ہو منظور سے دوبارہ معلومات لینے کے لیے۔'' وہ گویا مجھ سے متفق ہوتا ہوا بولا، یا شاید اس لایعنی بحث سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

میں جواباً بولا۔ ''بدھ کے دن کا بتلایا تھا اسے۔''

''چلو دیکھ لیتے ہیں فی الحال تو آرام کرو۔'' اس نے تکیہ سر کے نیچے درست کر کے کروٹ بدل لی اور میں نے بھی سر ہلاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

+ + +

منظور نے میری توقعات سے بھی بڑھ کر رضیہ کے معمولات پر نظر رکھی تھی۔ اس ضمن میں اس نے حویلی کے ایک ملازم سے بھی دوستی گانٹھ لی تھی جو منظور کی طرح جوئے کا رسیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق رضیہ ہفتے کے تین دن یعنی جمعہ، سوموار اور بدھ کو باقاعدگی سے شہر جاتی تھی اس دوران اپنی کار وہ خود ڈرائیو کرتی، جبکہ اس دوران ایک جیپ میں کبھی دو اور کبھی تین کارندے اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ ہفتے کے باقی دن وہ عموماً اپنی حویلی میں ہی گذارنا پسند کرتی، گھر کے اندر اس کا پسندیدہ مشغلہ وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھنے کا تھا۔ لباس میں وہ شلوار قمیض استعمال کرتی البتہ تقریبات وغیرہ میں کبھی کبھار پینٹ شرٹ بھی پہن لیتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی منظور نے رضیہ کے ذاتی معمولات کے بارے کافی ساری معلومات اکٹھی کی تھیں جو اس نے میرے گوش گذار کر دیں اور میں نے بھی ایک سچے عاشق کا کردار

ادا کرتے ہوئے اسے کافی انعام واکرام سے نوازا اور آئندہ ملتے رہنے کا وعدہ کر کے اس سے رخصت لے کر واپس آ گیا

(منظور سے حاصل شدہ معلومات میں رضیہ کے پسندیدہ کلر اور خوشبو سے لے کر پسندیدہ کھانے تک شامل تھے مگر چونکہ اس کا ذکر کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں اس لیے اس سے احتراز برتا جا رہا ہے) (مصنف)

امجد بے چینی سے میرا منتظر تھا، ساری تفصیلات سن کر وہ بولا۔

"جانو یار تم میں تو اچھی خاصی عاشق بننے کی صلاحتیں موجود ہیں۔ میں تو تمھیں ایویں ہی سمجھتا تھا۔"

"بکواس کی ضرورت نہیں صرف کام کی بات کرو۔" میں نے سے جھاڑا۔

"کام کی بات تو یہی ہے کہ پرسوں جمعہ ہے اور رضیہ بی بی بنفس نفیس شہر تشریف لے جائے گی تو کیوں نہ لمبے چکروں میں پڑنے کی بجائے اسے اغوا کریں اور اس کی رہائی کو اکبر خان کے ایڈریس بتانے سے مشروط کر دیں۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا واقعی اگر ایسا ہو جاتا تو مجھے محبت کا ڈھونگ رچانے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر اس بات کے نتائج پر غور کرنے سے میرا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"ماجے تیری بات ایک حد تک ٹھیک ہے مگر تُو نے رضیہ کے اغوا کے عواقب پر غور نہیں کیا۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران سے مستفسر ہوا۔

"رضیہ کے اغوا میں ایک دو قباحتیں ہیں۔"

"مثلاً؟" اس کی حیرانی برقرار تھی۔

"مثلاً یہ کہ ایک تو اس سے میر نیاز خان کی دشمنی مول لینا پڑے گی اور وہ کھل کر ہمارے خلاف میدان میں اتر آئے گا۔ وہ ایک با اثر اور طاقتور شخص ہے اس کی دشمنی فقط ہماری مشکلات میں اضافے کا باعث بنے گی۔ دوسرا بالفرض وہ ہمیں اکبر خان کا فرضی ایڈریس بتلا کر ٹر خا دیتا ہے تو ہمارے پاس اس کو پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں یعنی اگر وہ جھوٹ موٹ کہہ دے کہ وہ لندن چلا گیا ہے ہمیشہ کے لیے تو اس کی تصدیق ہم کیسے کریں گے۔ اس لیے میری جان ہمیں وہ حربہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بغیر میر نیاز خان سے دشمنی مول لیے وہ ہمیں ساری معلومات خلوص سے بتلا دے۔ گو ہمیں تھوڑا ٹائم لگ جائے گا مگر جو معلومات حاصل ہوں گی وہ حتمی ہوں گی اور ہم میر نیاز خان جیسے شخص کی فالتو دشمنی سے بچ جائیں گے ورنہ گنڈہ پوروں کی دشمنیاں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوا کرتیں اور یہ نہ ہو کہ پہلے والے دشمن کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک نئے دشمن کو گلے سے لگا بیٹھیں۔"

"میر نیاز خان پہلے کون سا ہمارا دوست ہے۔" امجد منہ بناتے ہوئے بولا۔

"پہلے کی بات کوئی اور ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "پہلے ایک مرتبہ اس نے مجھے اغوا کرانے کی کوشش کی تھی مگر اسے منہ کی کھانی پڑی اور اس کے بعد اس نے میرے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اس بارے اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے ورنہ

اپنے آدمیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے وہ لازماً ہمارے خلاف کوئی حرکت کرتا۔ اس کے علاوہ جہاں تک تعلق ہے اکبر خان کی حویلی میں قتل ہونے والے اس کے ملازم کا تو اس میں غلط فہمی کا گہرا عمل دخل ہے ہمارا مقصد اکبر خان کی ہلاکت تھی نہ کہ میر نیاز خان کے آدمیوں کے نقصان کی اور اگر سوچو تو تمھیں محسوس ہوگا کہ ہماری اس حرکت کے بعد بھی میر نیاز خان نے ہمارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا نہ قانونی اور نہ غیر قانونی۔"

"ویسے تجھ سے اتنے مصلحت آمیز رویے کی توقع نہیں تھی۔" امجد مایوسانہ لہجے میں بولا۔" آ نے دو سالے کو میدان میں دیکھ لیں گے کہ کتنے پانی میں ہے۔ ہم تو ویسے ہی ساری کشتیاں جلا چکے ہیں۔"

"امجد مجھے خواہ مخواہ کی خون ریزی اور قتل و غارت بالکل پسند نہیں۔"

"ایسی کی تیسی تیری امن پسندی اور رحم دلی کی۔" وہ تپ گیا۔" مجھ سے انتظار نہیں ہوتا کہ تیری عشق و محبت کی کہانی کی تکمیل تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں اور عشق و محبت بھی ایسا جس کے انجام کی ہمیں مطلق خبر نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ بگڑی ہوئی خان زادی پہلے ہی دن جناب کی وہ عزت افزائی کرے کہ بعد میں منہ چھپانے کی جگہ بھی نہ ملے۔"

"مگر......"

"چھوڑو اگر مگر کو یار۔" اس نے میری بات کاٹی۔" چودھری اکبر کو ٹھکانے لگانے کے راستے اگر میر نیاز خان جیسے سینکڑوں خان بھی آجائیں تو میں تمام کی لاشوں پر سے گذرتا ہوا چودھری اکبر تک پہنچوں گا۔ یوں بھی میر نیاز خان جیسے بے غیرت اتنے حساس نہیں ہونے کہ بیٹی کے اغوا کو کوئی بہت بڑا بہت مسئلہ بنالیں۔ اسے بھی معلوم ہے کہ اس کی آزاد خیال بیٹی کتنی پارسا ہوگی۔ دوسرے ہم رضیہ کو اپنے پاس بڑے احترام سے رکھیں گے۔ ایسے کہ اگر میر نیاز خان کے دل میں ہمارے لیے بدلے یا انتقام کا خیال آئے بھی سہی تو رضیہ اسے اس سے باز رکھ سکے۔"

اس کا مطلب ہے تُو نے تہیہ کرلیا ہے میر نیاز خان کو اپنا دشمن بنانے کا۔" میں کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

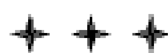
"نہیں میرے بھائی...... میں تیرے اور رضیہ کی محبت کے حق میں نہیں ہوں اور یہ ساری کوشش تم دونوں کو جدا کرنے کی ہے۔"

اس کے انداز پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"گویا تُو میرے ساتھ متفق ہوگیا ہے اور تیرے سر سے اس پری وش سے محبت کا بھوت ہوا ہوگیا ہے۔"

"کون سی محبت یار...... بات کا بتنگڑ نہ بنایا کرو اور اب اسے اغوا کرنے کے طریقہ کے بارے غور کرو۔"

اس کے بعد ہم کافی دیر تک رضیہ کو اغوا کرنے کی تجاویز پر غور کرتے رہے یہاں تک کہ ایک فیصلے پر متفق ہو کر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔



جمعے کے دن ٹھیک نو بجے میں کالی وال اور رحمٰن خیل کو ملانے والے کچے اور پکے راستے کے ملاپ پر کھڑا تھا، منظور کے کہنے کے مطابق رضیہ ٹھیک 9 بجے گھر سے نکلتی تھی۔ میں نے پکے راستے پر مین روڈ کی طرف چلنا شروع کر دیا، اس وقت میں بہترین قسم کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ یہ وہی قیمتی سوٹ تھا جو شیتل نے انڈیا سے آتے وقت مجھے تحفے میں دیا تھا۔ گو ہمارے علاقے میں اس قسم کا لباس پہننا نہایت برا تصور کیا جاتا ہے مگر اس وقت یہ میری مجبوری بن گئی تھی عام کپڑوں کی بہ نسبت رضیہ اس لباس میں مجھ سے زیادہ متاثر ہو سکتی تھی امجد پکے راستے سے 60,50 گز دور رہ کر میری نگرانی کرتا ہوا آرہا تھا۔ مجھے چلتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سفید رنگ کی ایک کار اور اس کے پیچھے کالے رنگ کی جیپ اپنی سمت بڑھتی نظر آئیں ان کو دیکھتے ہی میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ سفید کار میرے نزدیک پہنچی میں نے لفٹ مانگنے کا اشارہ کیا یعنی اپنا انگوٹھا کھڑا کر دیا۔ روڈ کے کنارے کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کی نظر پہلے سے مجھ پر جمی ہوئی تھی اور اس میں میرے تھری پیس سوٹ کے اندر ملبوس ہونے کا گہرا عمل دخل تھا۔ میرا اشارہ دیکھتے ہی اس نے بریک لگائی اور بڑی تیکھی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''جی۔''

''مس اگر مین روڈ تک لفٹ مل جائے؟'' میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔ اس وقت تک کار کے پیچھے آنے والی جیپ رک گئی اور اس میں سے دو کلاشن کوف بردار چھلانگ کر بڑی سرعت سے میرے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے۔ کچھ تو ان کی شکلیں کریہہ تھیں اور کچھ انھوں نے اپنے چہروں پر تاثرات ایسے سجائے ہوئے تھے کہ سامنے والا بندہ انھیں دیکھ کر ہی ڈر جائے۔ جسمانی لحاظ سے بھی وہ خاصے مضبوط دکھائی دے رہے تھے۔

''بیٹھو۔'' وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ اَن لاک کرتے ہوئے خوشدلی سے بولی اور میں

''تھینکس'' کہتے ہوئے اس کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ اس نے ہلکے گلابی کلر کا شلوار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بوائے کٹ بال دوپٹے سے بے نیاز نظر آرہے تھے جبکہ دوپٹہ گلے میں مفلر کی طرح پڑا ہوا تھا۔ سفید کھلتا ہوا رنگ ستواں ناک، بھوری آنکھیں، کچھ خوب صورتی، کچھ امارت کا اثر اور اوپر سے جوبن کی بہار نے اسے کافی پُرکشش اور جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔

میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی اس کے باڈی گارڈ بھی خاموشی سے واپس اپنی جیپ کے جانب مڑ گئے تھے۔ اس دوران امجد کھیتوں سے نکل کر پکے روڈ پر آگیا تھا اس کا رخ بھی مین روڈ کے جانب تھا، وہ سادہ شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ گلے میں پڑی مشین گن کو چھپانے کے لیے اس نے پتلی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی جسے ہماری زبان میں دھوتی کہتے ہیں۔

کار جیسے ہی امجد سے پانچ چھ گز کے فاصلے پر پہنچی میں بوکھلائے لہجے میں بولا۔

''اوہ مس ایک منٹ کار روکیں۔'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عجلت میں بریک لگائی اور کار بالکل امجد کے قریب جا کر رک گئی۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے ہاتھ بڑھا کر عقبی گیٹ اَن لاک کیا اور امجد بھی اسی رفتار سے پچھلی نشست پر منتقل ہو گیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' وہ جیسے چونکتے ہوئے بولی۔

''اگر زندگی عزیز ہے تو اسی طرح سیدھی آرام سے چلتی رہو۔'' میں نے جیب سے پستول نکال کر اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔اس کے باڈی گارڈوں کو کار کے یکدم رکنے اور پھر امجد کے اندر بیٹھنے پر شک سا گزرا تھا کہ وہ بھی جیب سے اتر کر کار کے قریب آپہنچے۔

''بی بی جی کیا......''

ان میں سے ایک تھوڑا جھک کر اپنی بی بی جی سے کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ اسے بی بی جی کی کنپٹی سے لگا ہوا سیاہ رنگ کا تیس بور پستول نظر آ گیا۔اس کا چہرہ غصے اور حیرانی سے مزید کریہہ ہو گیا۔

''اوئے خنزیر کا بچہ...... یہ کیا حرکت ہے۔'' اس کا لہجہ غیض وغضب سے پُر تھا۔''تمھیں یہ جرأت بہت مہنگی پڑے گی۔''

''انھیں کہو واپس اپنی جیپ میں چلے جائیں۔'' میں بجائے اسے کوئی جواب دینے کے رضیہ کی کنپٹی پر پستول کا دباؤ بڑھاتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔''اور اگر انھوں نے ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کی تو انھیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''تم جانتے نہیں تم نے کس پر پستول تانا ہوا ہے۔'' اس نے گویا مجھے آگاہ کیا۔''یہ میر نیاز خان کی بیٹی ہے اگر اسے یہ سب کچھ معلوم ہو گیا تو تمھیں زمین پر چھپنے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔''

''تم نے سنا نہیں گاڑی آگے بڑھاؤ۔'' میں باڈی گارڈ کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے رضیہ سے مخاطب ہوا۔

''وہ......وہ آگے کھڑا ہے۔'' رضیہ دوسرے گارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ جو کار کے بونٹ کے سامنے کلاشن کوف تانے آن کھڑا ہوا تھا۔

امجد نے کلاشن کوف کاک کرتے ہوئے عقبی کھڑکی سے اس کی منزل باہر نکالی اور دھاڑتے ہوئے بولا۔

''دونوں پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ......؟'' اس ورنہ کے اندر جو دھمکی پوشیدہ تھی اس سے وہ دونوں ناواقف نہیں تھے۔مگر پیچھے ہٹ جانے کی صورت میں بھی ان کے لیے موت ہی تھی کہ انھیں میر نیاز خان کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا۔اسی اثناء میں جیپ کا ڈرائیور بھی جیپ سے اتر کر ان کے قریب آپہنچا تھا۔

''میرا خیال ہے تمھیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' امجد غرایا اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں موجود کلاشن کوف کرخت آواز میں گرجی، گولیاں کھڑکی کے سامنے کھڑے شخص کی کھوپڑی سے چند انچ اوپر گزر گئیں وہ بے ساختہ چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ جو انسانی آواز سمجھنے سے انکاری لگتے تھے انھیں گولی کی زبان سمجھ میں آ گئی تھی۔

''گاڑی آگے بڑھاؤ۔'' رضیہ کے باڈی گارڈ کے کار کے سامنے سے ہٹتے ہی میں نے پستول سے اس کی کنپٹی کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا اور اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کار آہستہ سے آگے بڑھا دی۔ جبکہ اس کے باڈی گارڈ دوڑ کر اپنی جیپ کی طرف جانے لگے ان کا ارادہ لازمی طور پر ہمارا تعاقب کرنے کا تھا مگر ان کی یہ حسرت دل میں رہ گئی کیونکہ جیسے ہی وہ جیپ میں بیٹھے امجد نے پیچھے مڑ کر دو فائر ان کی طرف

داغے اور جیپ کے دونوں اگلے ٹائر دھماکے کی آواز کے ساتھ پھٹ گئے۔

''سپیڈ بڑھاؤ۔'' میں پستول اپنی جیب میں ڈالتا ہوا بولا۔ مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر اسی رفتار سے چلتی رہی۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس کے گرگوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر اس وقت کار ایک ہلکا سا ٹرن لے کر مڑ گئی اور روڈ کے کنارے کھڑے درختوں کی گھنی لائن نے انھیں میری نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا۔

''گاڑی روک دو۔'' میں رضیہ سے مخاطب ہو کر بولا اور اس نے خاموشی سے گاڑی روک دی میں پھرتی سے نیچے اترا اور پھر ڈرائیور کی سمت والے دروازے سے آ کر رضیہ سے بولا۔

''ساتھ والی سیٹ پر ہو جاؤ۔'' وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے خاموشی سے ساتھ والی سیٹ پہ کھسک گئی۔

''عبداللہ اس کا خیال رکھنا۔'' میں نے جان بوجھ کر امجد کو غلط نام سے پکارا۔ ''اور اگر یہ غلط حرکت کرنے کی کوشش کرے تو میری جانب سے کھلی چھوٹ ہے کہ اس کے سر میں روشندان بناتے ہو یا گردن میں۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں عبدالرحمٰن بھائی۔'' وہ بھی اسی لہجے میں چہکا اور میں گاڑی کی سپیڈ بڑھاتا چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی ہم مین روڈ پر نکل آئے۔ میں نے شہر کا رخ کرنے کی بجائے مخالف سمت میں کار موڑ دی۔ پکے روڈ پر چڑھتے ہی میں نے کار نارمل انداز میں چلانی شروع کر دی کیونکہ بہت زیادہ سپیڈ سے کسی کو بھی ہم پر شک ہو سکتا تھا۔ پہلوان ہوٹل اور پھر تھانے سے گزر کر میں نے کار کچے میں اتار لی۔ ادھر سے پہلے بھی ٹریکٹر ٹرالی وغیرہ کا راستا بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دور آگے جانے کے بعد میں نے کار اس کچے راستے سے کھیتوں کے اندر اتار دی چنے اور گندم کی فصلوں کی کٹائی ہو چکی تھی اور جا بجا کٹی ہوئی فصلیں ڈھیریوں کی شکل میں پڑی تھیں کار ہچکولے لیتی حرکت میں رہی۔ ہم تینوں خاموشی سے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے جلد ہی ہم اس بڑے خشک نالے کے قریب جا نکلے جو ہمارے جانے کی مخالف سمت رحمٰن خیل کے قریب سے گزرتا تھا۔

''آپ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔'' کار کے اندر چھائی خاموشی کو رضیہ نے توڑا۔ ''اگر آپ کا ارادہ ڈیڈ سے تاوان وصول کرنے کا ہے تو اس ساری تگ و دو کی کوئی ضرورت نہیں مجھے بتاؤ میں آپ کا مطالبہ پورا کئے دیتی ہوں۔''

''ہمارا مطالبہ تمھارا باپ ہی پورا کر سکتا ہے۔'' امجد جلدی سے بولا۔ ''تمھارے بس سے یہ باہر ہے۔''

''آپ کہہ کر تو دیکھیں۔ شاید آپ زیادہ جنجال میں پڑنے سے بچ جائیں۔''

''یہ نہ ہو ہمارا مطالبہ سن کر تم انکار کر دو۔'' امجد ذو معنی لہجے میں بولا۔

''میں رقم کے مطالبے کی بات کر رہی تھی۔'' وہ پیچھے کی طرف گردن موڑ کر امجد سے مخاطب ہو کر تیکھے لہجے میں بولی۔

''میری مراد بھی رقم ہی سے تھی۔'' امجد اسی لہجے میں بولا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں اس کے بیباک اور نڈر انداز کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لگتا ہی نہیں تھا وہ مغویہ لڑکی تھی کوئی بھی دیکھنے والا بلا شک و شبہ اسے ہمارا

کلاس فیلو سمجھ سکتا تھا۔ مجھے چند مہینے پہلے کہی ہوئی شیتل کی بات یاد آ گئی جس وقت ہم دونوں رگھو دادا کی قید میں تھے کہ ''اغوا ہو جانے والے مردوں کو صرف جان کا خوف ہوتا ہے جبکہ مغویہ عورت جان کے ساتھ ساتھ اپنی عزت کے خطرے سے بھی دوچار رہتی ہے۔''

مگر مجھے رضیہ کے انداز میں اس قسم کا کوئی خوف جھلکتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ بہت زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا تھی۔

''ویسے آپ لوگوں نے کمال کر دیا ہے...... میر نیاز خان کی بیٹی کو اغوا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔''

''ہاں ہم سے اس قسم کے کمالات سرزد ہوتے رہتے ہیں۔'' امجد شوخی سے بولا۔

''جناب کو ڈاکٹر نے منع کیا ہے بولنے سے۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... اصل میں موصوف کو حسد کی بیماری ہے جب بھی یہ کسی خوب صورتی لڑکی کو اپنے علاوہ کسی سے گھلتے ملتے دیکھتا ہے اس کے سینے پہ سانپ لوٹنے لگتے ہیں اور یہ اسی طرح خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔'' رضیہ اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی میرے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی تھی۔

''یہ ہم جا کس طرف رہے ہیں''۔ وہ کار سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔''اس طرف تو کوئی خاص آبادی بھی نہیں ہے۔''

''ہم جنگل میں منگل منانے جا رہے ہیں۔'' امجد مزاحیہ لہجے میں بولا اور وہ ایک پھر ہنس پڑی، مجھے لگا کہ جیسے وہ ہنسنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی۔

''مس رضیہ تمھیں ڈر نہیں لگ رہا کہ تم دو مردوں کے رحم و کرم پر ہو اور اس ویرانے میں تمھارا مددگار بھی کوئی نہیں ہے۔'' میرے ذہن میں مچلتا ہوا سوال ہونٹوں پر آ گیا۔

''ہونہہ!......ڈر کس بات کا، تم لوگوں کی غرض ڈیڈ سے رقم بٹورنا ہے اور ڈیڈ کے پاس کافی رقم ہے وہ تمھیں منہ مانگی رقم ادا کرنے پر قادر ہے۔ میں تو یقین مانو تم دونوں کی کمپنی کو انجوائے کر رہی ہوں کہ کم از کم ایک دو دن کی پکنک سہی۔ دوسرا مجھے اپنی بات کے سچ ہونے کی بھی خوشی ہے، میں نے ڈیڈ کو کہا تھا کہ ان ہڈ حرام باڈی گارڈز کا کوئی فائدہ نہیں یہ مجھے اغواء سے نہیں بچا سکتے مگر ڈیڈ نہ مانے۔ اب ان کی یہ غلط فہمی تو لازماً دور ہو جائے گی اور اس کے بعد میری بھی ان دم چھلوں سے جان چھوٹے گی۔''

امجد نے کہا۔''یہ نہ ہو تمھارے والد صاحب باڈی گارڈز کی تعداد میں اضافہ کر دیں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ جلدی سے بولی اور اس کے انداز پر ہم دونوں مسکرا پڑے۔ اس وقت تک ہم خشک برساتی نالے کے کنارے سے پچاس گز کے فاصلے پر موجود درختوں کے ایک بڑے سے جھنڈ جسے چھوٹا موٹا جنگل کہنا مناسب رہے گا میں داخل ہو گئے تھے جس کی وجہ سے راستا کافی دشوار گذار ہو گیا تھا اور مجھے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس جنگل میں مزید دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان کے قریب پہنچ گئے یہ جنگل تقریباً رحمٰن خیل کی حدود میں ہی پڑتا تھا۔ جنگل کے اندر دو کمروں کا بنا ہوا یہ مکان کافی پرانا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اس مکان کے بارے کافی کہانیاں مشہور تھیں۔ کچھ لوگ اسے پشاور کے ایک پٹھان

سے منسوب کرتے تھے جو اپنے علاقے سے ایک نوجوان لڑکی کو بھگا کر لے آیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں محبت کرتے تھے مگر دونوں کے خاندانوں کی پرانی دشمنی چلی آرہی تھی اور محبت کسی دشمنی ونفرت کو نہیں دیکھتی، انھیں پتا تھا کہ ان کے بڑے انھیں کبھی یکجا نہیں ہونے دیں گے اس لیے وہ پشاور سے بھاگ کر اس ویرانے میں آبسے، لیکن افسوس کہ جلد ہی لڑکی کے بھائی بھی ان کی سن گن لیتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور دونوں کو وہیں ہلاک کر کے واپس لوٹ گئے۔

کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ مکان ایک شکاری کا تھا جو کسی نامعلوم علاقے سے اپنی بیوی کے ساتھ وہاں آن بسا تھا اور دونوں میاں بیوی گرمیوں کی ایک رات بھوکے بھیڑیوں کا شکار ہو گئے تھے، جبکہ کچھ لوگ اسے ایک پہنچے ہوئے بزرگ اور اس کی ایک مریدنی سے منسوب کرتے تھے جو سنسار کو تیاگ کر اس چھوٹے سے مکان میں آن بسے تھے۔ بہر حال اصل حقیقت کچھ بھی تھی ہمارے بچپن میں لوگ اس مکان کو بھوت بنگلہ کہتے تھے اور آج تک وہ اسی نام سے مشہور تھا اور اس نسبت کی وجہ سے وہ صحیح سلامت کھڑا تھا ورنہ شاید لوگ اس کی اینٹیں بھی اکھیڑ کر گھر لے جاتے۔ اس کے صحیح سلامت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے مضبوط لوہے کے تھے اس لیے دیمک سے محفوظ تھے۔ اسی طرح اس کی چھت میں بھی لوہے کے پتلے پتلے مضبوط گارڈر استعمال ہوئے تھے۔ ہم نے رضیہ کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنانے کے بعد اسے اسی مکان میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اس مقصد کے لیے ہم گزشتہ کل اس کی صفائی کر گئے تھے اس طرح کھانے پینے کا مختصر سا سامان اور سونے کی ضرورت کے لیے فرش پر بچھانے کے لیے چٹائی وغیرہ بھی ہم نے یہاں پر رکھ چھوڑی تھی۔ اس وقت ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر وہاں پہنچے تھے ورنہ رحمٰن خیل سے اس کا فاصلہ ٹوٹل اڑھائی سے تین کلومیٹر بنتا تھا۔ اس لیے پیدل شخص بھی آرام سے گھنٹا پون گھنٹا میں رحمٰن خیل سے وہاں تک آسکتا تھا اس مکان کو پہلی نظر دیکھتے ہی عجیب سی ویرانی اور وحشت کا احساس پیدا ہوتا تھا، مگر اس کے برعکس رضیہ نے اسے دیکھتے ہی ''ہاؤ سویٹ'' کا نعرہ بلند کیا تھا۔

گاڑی ایک گھنی جھاڑی میں گھسیڑ کر ہم تینوں باہر آگئے۔ رضیہ کے انداز واطوار سے بالکل ہی یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ پکنک پر آئی ہو۔ گاڑی لاک کرنے کے بعد ہم مکان کی سمت بڑھ گئے۔ رضیہ ہم سے بھی ایک قدم آگے تھی۔ مکان کی چار دیواری بمشکل چھ ساڑھے چھ فٹ اونچی تھی۔ چھوٹے سے صحن کے ایک کونے میں دو بوسیدہ قبریں نظر آرہی تھیں جو اس کے مکینوں کی تھیں۔ نامعلوم وہ کون تھے سچے عاشق، شکاری یا اللہ والے۔ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ان دو کمروں کے علاوہ ایک مختصر سا برآمدہ بھی تھا۔ دونوں کمروں میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا جسے ہم دونوں نے صحن کے ایک کونے میں پھینک دیا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ بھی بنا ہوا تھا۔ دروازے کے کواڑ غالباً لکڑی کے تھے جو دیمک کی خوراک بن گئے تھے لوہے کی زنگ آلود چوکھٹ البتہ ابھی تک اسی طرح محفوظ تھی۔ دروازہ کھول کر ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے ایک ناگوار سی گھٹن کا احساس ہوا اور ایسا کمرے کا بہت عرصے تک بند پڑے رہنے کی وجہ سے تھا۔ امجد نے جیب سے اگربتی کا پیکٹ نکال کر جا بجا دیواروں میں اگربتیاں سلگا کر لگا دیں۔

''میرا خیال ہے ہم تھوڑی دیر باہر صحن میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' امجد زمین پر بچھی ایک چٹائی اٹھاتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''بالکل۔''میں اثبات میں سر ہلایا اور ہم تینوں باہر آ گئے۔

صحن کے اندر کیکر کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے چٹائی بچھا کر امجد رضیہ سے مخاطب ہوا۔''میڈم بیٹھنے سے پہلے تھوڑی سی زحمت کر لیں۔''

''کیا......؟''اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''اپنے پاس موجود پستول اگر آپ میرے حوالے کر دیں تو......''

''میرے پاس پستول کہاں سے آیا۔''اس کے چہرے پر چھائی خوشگوار مسکراہٹ کافور ہو گئی تھی۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں کہ پستول کہاں سے آیا۔بس آپ اتنا کریں کہ چپ چاپ اپنا لیڈیز پستول میرے حوالے کر کے ہمارے درمیان ہونے والے یقینی جھگڑے کو رکوا لیں۔''

''میں سمجھی نہیں کون سا جھگڑا۔''اس کی حیرانی برقرار تھی۔

''لازمی بات ہے تیری تلاشی لینے کے لیے ہم دونوں کے درمیان جھگڑا ناگزیر ہے کیونکہ ہم میں ہر ایک کی کوشش ہو گی کہ تیری تلاشی لینے والا وہ خود ہو اور آپ ہمیں اس زحمت سے بچا سکتی ہیں۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ آئی،جبکہ رضیہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور نامعلوم مقام سے ایک چپٹا سا پستول نکال کر امجد کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ ہوئی نا ایمانداری۔''وہ ہنستے ہوئے بولا۔''اب آپ تشریف رکھیں۔''

''ویسے تمھارے لیے شرم کا مقام ہے کہ ایک نہتی لڑکی کو دو مردوں نے اسلحہ کے زور پر قابو کیا ہوا ہے۔اگر تم میں تھوڑی سی بھی مردانگی موجود ہے تو دونوں میں سے ایک میرے ساتھ خالی ہاتھ مقابلہ کرے۔اگر جیت گئی تو مجھے رہا کر دینا ورنہ تمھاری ہر بات بلا چوں و چراں مان لوں گی۔''

''نہ بھئی نہ۔''امجد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔''ہم نے مرنا تھوڑی ہے۔''

''اتنی ہی جرأت تھی......بس کلاشن کوفوں کے سر پر بدمعاش بنے پھر رہے ہو۔''

''تم کون سا خالی ہاتھ ہو؟۔''امجد بھی لڑاکا عورتوں کے سے انداز میں ترکی بہ ترکی بولا۔

''میرے پاس فقط پستول تھا وہ تُو نے لے لیا ہے اس کے علاوہ میرے پاس کیا ہے؟''

''سن رہے ہو عبدالرحمان بھائی!......رضیہ بی بی کی باتی'......یہ خود کو نہتا سمجھتی ہے۔نظروں کے تیر اور اداؤں کی تلواریں اس کی نگاہ میں کچھ نہیں ہیں۔''

''ہونہہ......بزدل بندہ اسی طرح بہانے بناتا ہے۔''

"صحیح کہا۔" امجد نے اثبات میں سرہلایا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اس سے پہلے چٹائی کے ایک کونے پر ٹک کر بیٹھ گیا تھا، بادل نخواستہ رضیہ بھی دوسرے کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کا موڈ کافی خراب دکھائی دے رہا تھا اس سے پہلے وہ اس چھوٹے سے لیڈیز پستول کے بل بوتے پر میدتھی کہ اسے ہم پر قابو پانے کا کوئی موقع مل جائے اسی وجہ سے وہ ہماری تعریفوں کے پل بھی باندھ رہی تھی مگر پستول ہاتھ سے نکلتے ہی اس کی شوخی ہوا ہوگئی اور ہماری بہادری اسے سراسر بزدلی دکھائی دینے لگ گئی تھی۔ وہ ہمیں اپنے مقابلے پر بھی اکسا رہی تھی۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ وہ کراٹے وغیرہ سے واقف تھی، مگر ہم دونوں کے پاس ان چونچلوں کے لیے بالکل ٹائم نہیں تھا۔ کبھی موقع آتا تو شاید اسے اپنے چیلنج کا موزوں جواب مل جاتا ورنہ ہم کمزور و بزدل بھلے تھے۔

"عبداللہ بھائی میرا خیال ہے کمرے میں چلا جائے...... میرے خیال میں اب اندر کے حالات ٹھیک ہوں گے۔"

"چلو۔" امجد نے کہا اور ہم دونوں رضیہ کو ساتھ لیے کمرے میں گھس گئے اگربتی نے اندر کی گھٹن اور بو کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔

امجد نے پوچھا۔ "کھانا گرم کروں مس؟"

"شکریہ...... مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ روکھے لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے آپ ادھر آرام کریں ہم دوسرے کمرے میں ہیں۔" یہ کہہ کر امجد نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں دوسرے کمرے میں آ گئے۔ دونوں کمروں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا مگر اس کے باوجود رضیہ والے کمرے کا دروازہ ہم نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

"اب بتاؤ جانو صاحب کیا ارادہ ہے؟" امجد کلاشن کوف دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے چٹائی پر لمبا پڑ گیا۔

"ارادہ کیا یار تم اپنی چھوٹی بی بی کا خیال رکھو اور میں چلتا ہوں اس کالی وال کے خان صاحب کے پاس تاکہ اس سے بالمشافہ ملاقات کر سکوں۔"

"تیری اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تُو آج بھی اتنا ہی گدھا ہے جتنا کچھ عرصہ پہلے تھا۔"

"گدھے کو یوں بھی ہر بات میں گدھا پن نظر آتا ہے۔" میں جواباً بولا۔

"اگر دماغ میں بھوسے کے علاوہ بھی کچھ ہے اور تم اس پر زور دینے کی زحمت بھی کر لو تو تمھاری سمجھ میں یقیناً یہ بات آ جائے گی کہ میر نیاز خان نے سب سے پہلے تجھے حراست میں لے کر تیرے ساتھ وہ سلوک کرنا ہے جو انڈین آرمی اور پاکستانی پولیس والے نہیں کر سکے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی بیٹی کا اتہ پتا پوچھے گا۔"

"کیوں اسے یہ ڈر نہیں ہوگا کہ یہ سب کچھ بلکہ اس سے بھی کچھ مختلف سلوک اس کی بیٹی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔"

"یار کچھ عقل سے کام لو۔" وہ جھلا گیا۔ "اس کی بیٹی تیری قید میں ہے اور تُو خود اس کے حوالے ہو جاؤ اس طرح تیری برتری کیسے قائم رہے گی؟"

"تو پھر؟"

''کیا اتنے بڑے خان کے گھر فون نہیں ہوگا؟ پوچھو ذراباپ کی لاڈلی سے فون نمبر اور شہر جا کر پی سی او سے فون کرلو۔''

''بات تو تیری ٹھیک ہے۔ چلو اسی طرح کر لیتا ہوں۔'' مجھے اس سے متفق ہونا پڑا۔

''رضیہ بی بی...... اجی سنتی ہو۔'' امجد نے ہانک لگائی۔

''ہاں کیا ہے؟'' وہ درمیانی دروازے پر نمودار ہوتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔ ''کیوں گلا پھاڑ کر چلا رہے ہو۔''

''سس...... سس...... سوری۔'' امجد تھوک نگلتا ہوا کسی لاچار شخص کی طرح عاجزی سے بولا۔ ''وہ دراصل آپ سے ایک کام پڑ گیا تھا۔''

''تو بتاؤ نا؟'' وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی تھی۔ امجد کا انداز ہی ایسا تھا کہ مجھے بھی بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔

''قبلہ بزرگوار میر نیاز خان آف کالی وال المعروف ڈیڈی کا فون نمبر چاہیے تھا تا کہ مزدور اپنا پسینہ خشک ہونے سے قبل اپنی مزدوری طلب کرسکیں۔''

''ہمارے گھر میں دو فون لگے ہوئے ہیں اور ان کے نمبر یہ ہیں۔'' اس نے دونوں نمبر دہرا دیے جو میں نے اپنے پاس نوٹ کر لیے۔

''شکریہ مس!......'' میں نے کہا۔ ''میں شہر جا رہا ہوں...... اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو تا کہ لیتا آؤں۔''

''شکریہ۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر واپس مڑ گئی۔

''اچھا بھئی ماجے صاحب میں تو چلا۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''احتیاط سے جانا۔'' میں سر ہلاتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گیا مگر باہر نکلنے سے پہلے میں احتیاطاً دروازے سے سر نکال کر باہر کی سن گن لینی نہ بھولا اور یہ دیکھ کر میں اچھل پڑا کہ دو افراد کندھوں سے مشین گنیں لٹکائے بڑی بے فکری سے مکان کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

+ + +

ماجے دو افراد مکان میں داخل ہو گئے ہیں اور دونوں کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔''

''کیا۔'' وہ اچھل پڑا۔ ''کہیں یہ میر نیاز خان کے آدمی نہ ہوں؟''

''نہیں یہ اس کے آدمی نہیں ہو سکتے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہرحال تم ادھر ہی رہو میں ان سے نبٹ لیتا ہوں۔'' میں باہر کی جانب بڑھ گیا، جبکہ امجد اس انداز سے بیٹھ گیا کہ دونوں دروازوں پر یکساں نظر رکھ سکے۔

وہ دونوں ہم سے بے خبر تھے اگر میں پسٹل کے زور پر ان کے ہتھیار زبردستی رکھوا سکتا تھا، مگر اس صورت میں بات بگڑنے کا اندیشہ تھا وہ نامعلوم کون تھے دوست، دشمن یا پھر ان دونوں میں سے کوئی نہیں، لیکن اپنی سمت ہتھیار اٹھا دیکھ کر انھوں نے لازماً میرا دشمن بن جانا تھا اور اس کی وجہ ہمارے گنڈہ پوروں کی معاشرت ہے کہ کوئی بندہ اگر ہماری جانب ہتھیار تان لے وہ دشمن گردانا جاتا ہے اور اس سے بدلہ لینا فرض ہو جاتا ہے، جبکہ میں ان دونوں کو اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتا تھا۔

قارئین کو شاید اس بات پہ اچنبھا ہو مگر حقیقتاً ہمارے علاقے میں اس بات پر تین چار قتل ہو چکے ہیں۔ یہ تین چار قتل بھی ایسے ہیں جو میرے علم میں ہیں۔ ورنہ تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔ میں جیسے ہی دروازے سے باہر نکلا دونوں مجھے دیکھ کر بے اختیار ٹھٹک کر رک گئے۔

''داچہ شیئے دی'' (یہ کیا چیز ہے) ان میں سے ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر بولا اور اس کے ایسا کہنے کی وجہ میرا لباس تھا کیونکہ میں نے اس وقت تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔

''السلام علیکم'' ان کی بیہودگی کو نظر انداز کر کے میں نے ان کی طرف مصافحے کا ہاتھ بڑھایا۔

''وعلیکم السلام'' کہہ کر انھوں نے بے دلی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا مجھے دیکھ کر ان دونوں کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے تھے جیسے قیمتی سامان کی دکان کا تالا غلطی سے کھلا رہ جانے کی صورت میں چور کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ شکل سے ''فراری'' لگ رہے تھے۔ ''فراری'' ہمارے علاقے میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو قتل کر کے مقتول کے ورثا اور پولیس سے چھپتے پھر رہے ہوں۔ ایسے لوگ کسی کو بھی معاف کرنے کے قائل نہیں ہوتے اور جوان کے سامنے چڑھ جائے اسے نقدی اور قیمتی اشیاء کے وزن سے نجات دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کی صورت میرے لیے انجان تھی اگر وہ رحمٰن خیل سے تعلق رکھتے تو ان کی صورت میرے لیے لازماً جانی پہچانی ہوتی مگر وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔

''دلتہ سہ کے ہلکا؟'' (اے لڑکے یہاں کیا کر رہے ہو۔) نسبتاً بڑی عمر والا اپنی کلاشن کوف کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولا۔ اس کے پاس روسی ساخت کی کلاشنکوف تھی جس کی منرل بالکل قلم کی طرح تراشی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ لگی میگزین عام میگزینوں سے تھوڑی سی بڑی تھی ایسی میگزینوں میں 40 راؤنڈ آتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتا چلوں کہ کلاشن کوف کے ساتھ عموماً جو میگزین استعمال ہوتی ہے اس میں 30 راؤنڈ آتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ 40 اور 75 راؤنڈ والی میگزینیں بھی عام دستیاب ہیں۔ 75 راؤنڈ کی میگزین بناوٹ میں گول ہوتی ہے کیونکہ اگر اسے عام میگزین کی طرح سیدھا بنایا جائے تو شاید وہ کلاشن کوف سے ہی لمبی ہو جائے۔ 120 راؤنڈ کی گنجائش رکھنے والی میگزین کے متعلق بھی میں نے سنا تھا مگر کبھی نظر سے نہیں گزری۔

اس نے گن ہاتھ میں تو پکڑی تھی مگر اس کا رخ میری جانب کرنے سے احتراز برتا کہ بات ابھی تک تعارف کے مرحلے میں تھی۔

اسی وجہ سے اس نے بات بھی پشتو میں کی تھی شاید میرے پشتو نہ جاننے کی صورت میں وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے کی کوشش کرتا۔

''زہ دہ پولیس انسپکٹر یم او سہ ملزمان پسے دلتہ راغلے یما'' (میں پولیس تھانیدار ہوں اور کچھ ملزموں کے تعاقب میں یہاں آیا ہوا ہوں) میں اس کے دماغ میں رینگنے والے کیڑے کو جھاڑنے کی خاطر بولا۔

''یوازے؟'' (اکیلے) اس نے اپنی کلاشن کوف دوبارہ اپنے کندھے سے لٹکالی۔

''ملزمان پسے تھانیدار یوازے گرزی؟'' (مجرموں کے پیچھے تھانیدار اکیلا پھرتا ہے)

''تہ سو وردی نہ دی وا چلے'' (آپ نے وردی نہیں ڈالی ہے۔) اس کا ساتھی شکوک بھرے لہجے میں بولا۔

"میں خفیہ پولیس کا انسپکٹر ہوں......ویسے بھی وردی ڈالنے کی صورت میں مطلوبہ ملزم ہوشیار ہو جائیں گے۔اور......"

"زورا، دادروغ وائی" (بھائی یہ جھوٹ بول رہا ہے) میں اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ بند دروازے کے پیچھے سے رضیہ بول پڑی۔ ہم چونکہ بالکل دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر مصروفِ گفتگو تھے اس لیے ہماری باتیں رضیہ نے بغیر کسی دقت کے نہ صرف سن لیں تھیں بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کا سوچ کر اس پر عمل بھی کر گزری تھی۔"یہ پولیس کا آدمی نہیں ہے۔یہ خود ایک مجرم ہے۔"

"یہ کون ہے۔" بڑی عمر والا جلدی سے بولا اس کے ساتھ ہی دونوں کے ہاتھ اپنی گنوں کی طرف بڑھے مگر اس سے پہلے کہ وہ گنیں اپنے کندھوں سے اتار پاتے میں نے بجلی کی سی سرعت سے پسٹل نکال کر ان پر تان لیا، صورتِ حال بگڑ چکی تھی۔

"اگر زحمت نہ ہو تو اپنی کلاشن کوفیں نیچے پھینک کر ہاتھ اٹھا لیں۔" وہ شاید میرے زہر خند لہجے کی پروانہ کرتے مگر اسی وقت امجد کسی چھلاوے کی طرح اندر سے برآمد ہوا، باہر نکلتے ہوئے اس نے بڑی تیزی سے کلاشن کوف کا کاکنگ ہینڈل کھینچ کر چھوڑا تھا...... یہ مخالف کو ڈرانے کا ایک نفسیاتی طریقہ تھا اور فائر کرنے کا ایک واضح اعلان تھا۔ حالانکہ کسی پر ہتھیار تان لینے کا بھی یہی مطلب بنتا ہے مگر خالی ہتھیار تاننے میں اور کاکنگ ہینڈل کھینچ کر چھوڑنے میں بڑا فرق ہے۔امجد کی گن چونکہ پہلے سے کاک تھی اس لیے چیمبر میں موجود پہلے والا راؤنڈ گن سے نکل کر اڑتا ہوا دور جا گرا۔امجد کی حرکت سے وہ بے ساختہ دباؤ میں آگئے تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنی کلاشن کوفین سائیڈ پر پھینکتے ہوئے اپنے ہاتھ بلند کر لیے تھے۔

"تم دونوں اچھا نہیں کر رہے ہو۔"اس مرتبہ بھی نسبتاً بڑی عمر والا بولا۔

"اچھا برا بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے اپنا تعارف کراؤ۔" میں نے امجد کو زمین پر پڑی ان کی گنیں اٹھانے کا اشارہ کیا۔اس مرتبہ بھی امجد نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ دونوں گنیں سمیٹی تھیں جبکہ وہ دونوں خاموش کھڑے کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔

"میرا خیال ہے تمھیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی۔" میرے لہجے کی سختی برقرار رہی۔

"مشین گنیں واپس کرو ہم نے کہیں جانا ہے۔"اس مرتبہ دوسرا آدمی تیز لہجے میں بولا۔"نہ ہم تمھارے کام میں دخل انداز ہوئے ہیں اور نہ ہی تمھیں ایسا کرنے کا حق ہے۔"

"امجد اندر سے رسی لے آؤ۔" میں نے اس کی بات اَن سنی کر دی۔امجد جلدی سے کمرے میں گھس گیا اور وہ رسی جو ہم نے رضیہ کو باندھنے کے لیے رکھی تھی وہ لے آیا۔امجد سے رسی لے کر میں نے پستول جیب میں ڈالا اور ان کی مشکیں کسنے کے لیے ان کی طرف بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی امجد اور ان دونوں کے درمیان آیا وہ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے مجھ پر جھپٹ پڑے انھیں یقین تھا کہ امجد ان پر فائر نہیں کھول سکتا تھا، میرا اپنا دل ان کو ہلکا پھلکا جھاڑنے کا تھا اس لیے میں جان بوجھ کر امجد اور ان دونوں کے درمیان آیا تھا۔وہ جیسے ہی میرے قریب پہنچے میرا دایاں گھٹنا اور بایاں مکہ ایک ہی رفتار سے ایک کے پیٹ اور دوسرے کی ٹھوڑی کی طرف بڑھے دونوں چیختے ہوئے دور جا پڑے تھے، فٹ بال کھیلنے کے سے انداز میں دونوں کو چند ٹھوکریں رسید کرنے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر رسی اٹھائی اور ان کی طرف

بڑھ گیا، اس مرتبہ دونوں نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہ کی اور زمین پر پڑے کراہتے رہے۔

میں نے دونوں کے بازو پشت کی جانب ایک ہی رسی سے باندھ دیئے اس دوران امجد دلچسپی سے ہمارا تماشا دیکھتا رہا۔ یوں بھی ہماری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی اور امجد صرف تھوڑی بہت پشتو سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ بولنے سے کورا تھا۔

''اب کھڑے ہو جاؤ۔'' ان کے ہاتھ باندھنے کے بعد میں نے ہاتھ جھاڑتے۔

''اس بات کا بدلہ ہم ضرور لیں گے۔'' جوان آدھی کھسیانے انداز میں بولا۔

''اگر پسند کرو تو ابھی تمھارے ہاتھ کھول کر بدلہ لینے کا موقع فراہم کر سکتا ہوں۔'' میں نے انھیں پیشکش کی۔ وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے خاموش رہے۔

''اندر چلو۔'' میں نے انھیں کمرے کے جانب دھکیلا اور وہ سر جھکائے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ رضیہ کی جانب سے بھی مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

''عبدالرحمان بھائی ان کی تلاشی تو لے لینی تھی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی امجد چٹائی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔

''ان غریبوں کے پاس کیا ہو گا یار۔'' میں آگے بڑھ کر ان کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ تھوڑی سی نقدی اور شناختی کارڈز کے علاوہ ان کے پاس کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ شناختی کارڈز کے مطابق بڑی عمر والے کا نام فضل داد اور نوجوان کا نام خوشمیر خان تھا۔ نقدی ان کی جیب میں ڈال کر ان کے کارڈز میں نے اپنی جیب میں ڈال لیے۔

''اے لڑکے ہمیں چھوڑ دو خواہ مخواہ دشمنی بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' فضل داد ملتجی لہجے میں بولا اس کا پہلا طنطنہ غائب ہو چکا تھا۔

''میرا اپنا بھی یہی ارادہ تھا مگر تمھاری قسمت کہ تم ہمارے راز سے واقف ہو چکے ہو اس لیے میں تمھیں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔''

''مگر......''

''اگر مگر چھوڑو اور آرام سے بیٹھو۔'' میں نے اسے بات پوری نہ کرنے دی اور وہ ہونٹ بھینچ کر خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ خوشمیر خان نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

''عبداللہ میرے ساتھ آؤ۔'' امجد کلاشن کوف اٹھا کر میرے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

''ان کا خیال رکھنا یہ لازماً پولیس کو مطلوب ہوں گے، اپنے دوست نذر سے میں ان کی بابت بات کروں گا ان کو پولیس کے حوالے کرنے میں ہی ہماری بہتری ہے۔ کیونکہ انھیں قتل کرنے کو میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا جبکہ انھیں چھوڑ دینے میں ان کی طرف سے شرارت کا اندیشہ ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' امجد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے پھر میں کپڑے بدل لوں...... خواہ مخواہ اس لباس میں ٹارگٹ بننے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' اور امجد اثبات میں سر ہلا کر اندر

کے جانب بڑھ گیا۔تھری پیس سوٹ اُتار کر میں نے شلوار قمیص پہنی کوٹ کا سامان قمیص کی جیبوں میں منتقل کر کے میں نے سوٹ تہہ کر کے شاپر میں ڈالا اور پیدل رحمٰن خیل کے جانب چل پڑا۔واپسی کے لیے میں نے برساتی نالے کے درمیان سے گزرنے والا راستا پسند کیا تھا۔ گھنٹے پون گھنٹے بعد میں بغیر کسی خاص واقعے کے اسلم بھائی کے گھر پہنچ گیا۔سامان کا شاپر گھر میں چھوڑ کر میں تھانے کی طرف بڑھ گیا میرا ارادہ تھا کہ شہر جانے سے پہلے ان دوسورماؤں کے شناختی کارڈ نذر کو دکھا کر ان کے بارے کوئی مشورہ لیتا جاؤں، میرا اندازہ تھا کہ وہ لازماً پولیس کو مطلوب ہوں گے۔خوش قسمتی سے نذر مجھے تھانے سے باہر ہی مل گیا،میر نیاز خان کی بیٹی کے اغوا کی بات کو گول کرتے ہوئے میں نے اسے فضل داد اور خوشمیر خان کے شناختی کارڈز دکھائے تو وہ جوش سے بولا۔

’’ارے یہ تو شبیر شاہ کنڈی کے قاتل ہیں۔‘‘

’’شبیر شاہ......؟‘‘

’’اپنا ناظم یار۔‘‘اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔’’پچھلے سال ان دونوں نے ہی اسے جلسے میں تقریر کے دوران گولی کا نشانہ بنایا تھا اور پھر حسب سابق پولیس کی ناقص کارکردگی کے باعث بھاگ گئے تھے۔‘‘

’’ان کی ناظم سے کیا دشمنی تھی؟‘‘

’’دشمنی کسی اور کی تھی یہ تو فقط اس کے آلہ کار تھے......بہر حال تم چھوڑو یہ ایک لمبی کہانی ہے اگر ٹائم ہے تو بیٹھو تمھیں تفصیلاً سنا دیتا ہوں۔‘‘

’’نہیں شکریہ......بس ان دو آدمیوں کے متعلق معلوم کرنے آیا تھا کہ اگر یہ پولیس کو مطلوب ہیں تو میں انھیں تمھارے حوالے کر سکتا ہوں۔‘‘

’’کیوں نہیں یار......ابھی چلو۔شبیر شاہ کے بھائی کبیر شاہ کنڈی یعنی موجود ناظم نے تو ان دونوں کے سر کی قیمت بھی مقرر کی ہوئی ہے۔‘‘

’’کتنی؟‘‘میں نے پوچھا۔

’’دس ہزار‘‘۔

’’دس ہزار تمھیں مبارک ہوں،لیکن فی الحال انتظار کرو کل یا پرسوں میں انھیں تمھارے حوالے کر دوں گا۔‘‘

’’وہ کیوں؟‘‘

’’یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔بس تم دو دن انتظار کرو اور اس دوران تھانیدار کو ذہنی طور پر تیار کرو۔تاکہ پرسوں جب انھیں تمھارے حوالے کروں تو تمھارے پاس ان کی گرفتار ہونے کی کوئی کہانی موجود ہو؟

’’اس بارے فکر مت کرو......پولیس آم کھاتی ہے۔پیڑ نہیں گنتی۔‘‘

’’ٹھیک ہے......کل یا پرسوں ملاقات ہوگی۔‘‘میں نے اس سے رخصتی مصافحہ کیا اور وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس تھانے کی طرف چل پڑا جبکہ میں نے اپنا رخ پہلوان ہوٹل کی طرف کر دیا کہ وہیں سے شہر کی گاڑی ملنی تھی۔

+ + +

''میر نیاز خان سے بات کرنی تھی۔'' ریسیور سے ابھرنے والی بھاری آواز سن کر میں جلدی سے بولا۔

جواب ملا۔''میں میر نیاز خان ہی بات کر رہا ہوں...... اپنا تعارف کراؤ۔''

''میر نیاز خان میری بات تحمل سے سننی ہے اور سمجھنے کی کوشش کرنی ہے، تیری میری کوئی دشمنی نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں یہ صورت حال برقرار رہے۔''

''بھائی پہلے اپنا تعارف تو کراؤ اس کے بعد دشمنی دوستی کا تعین ہوگا۔'' وہ شستہ اردو میں بولا۔ عام گنڈہ پوروں کے برعکس وہ ٹھیک ٹھاک اردو بول رہا تھا۔

''میں عمر جان بات کر رہا ہوں۔''

''کون عمر جان؟''

''چودھری اکبر خان کا دشمن۔''

''تو بھئی تیرا، میرا کیا تعلق۔'' وہ محتاط ہو گیا۔

''تعلق تو ہے چند ہفتے پہلے تیرے آدمیوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جن کی لاشیں میں نے بطور گفٹ آپ کے لیے برساتی نالے میں چھوڑ دی تھیں۔''

''مسٹر عمر جان میرے آدمی اس قسم کی کسی کارروائی میں ملوث نہیں ہوئے اور نہ ہی میں تم سے واقف ہوں، اگر کوئی کام کی بات کرنی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''کام کی بات تو یہ ہے کہ تمھاری بیٹی میرے قبضے میں ہے اور فی الحال بالکل خیریت سے ہے۔''

''اچھا وہ تم ہو...... جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس کا مطلب ہے تیری کارروائیوں کو نظر انداز کر دینا میری غلطی تھی اور اس غلطی کے ازالے کے لیے مجھے میدان میں اترنا پڑے گا۔''

''خان صاحب...... تم میرا کیا بگاڑ لوگے؟ میرے تمام گھر والے تو پہلے سے زندہ جلا دیے گئے ہیں اور یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ تُو اس کارروائی میں شامل نہیں تھا۔ ورنہ اب تک تجھے بدلہ مل گیا ہوتا۔ اب بھی میں تیرے لیے اندھیرے کا تیر ثابت ہوں گا یہ نہ ہو تیری بیٹی کے بعد بیٹے کا نمبر آئے اور اس کے بعد تیرا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے چیلنج نہ کرو۔''

''ہاہاہا۔'' اس کا قہقہہ کافی بلند تھا۔''عمر جان تم ابھی بچے ہو، چوہدری اکبر جیسا تھرڈ کلاس بندہ تو تم سے سنبھالا نہیں گیا۔ چلے ہو میر نیاز خان سے ٹکر لینے...... اس طرح کرو اچھے بچوں کی طرح میری بیٹی کو واپس چھوڑ جاؤ میں تمھاری بھیانک غلطی کو معاف کر دوں گا اور آئندہ بھی خیال رکھنا کہ میں بار بار غلطیاں معاف کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس سے پہلے بھی تم غلطی سے میرے ایک بندے کی ہلاکت کا باعث بن چکے ہو، میری مراد اکبر کی حویلی میں ہلاک ہونے والے بندے سے ہے۔''

''ٹھیک ہے میں یہی کروں گا تم صرف چودھری اکبر کے چھپنے کی جگہ بتلا دو میں رضیہ بی بی کو باعزت طریقے سے آپ کے پاس بھجوا دیتا ہوں، لیکن یہ یاد رہے کہ میں پہلے چودھری کے پتے کی تصدیق کروں گا اس کے بعد تمھاری بیٹی تمھارے حوالے کروں گا۔''

''اس کا مطلب ہے میری بیٹی بھی تم نے اسی مقصد کے لیے اغوا کی ہے۔''

''نہیں۔''میں دانستہ جھوٹ بولا۔''تُو نے مجھے اغوا کرانے کی کوشش کی تھی یہ اس کا جواب ہے۔ تمھیں صرف اتنا باور کرانا تھا کہ عمر جان ہرا اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ چودھری اکبر کا پتا تو میرے خیال میں تم ویسے ہی بتا دیتے۔''

''تم کتنی اہلیت رکھتے ہو یہ میں وقت آنے پر تمھیں بتلا دوں گا۔ فی الحال تم رضیہ کو جلد از جلد واپس بھیجو کیونکہ میرا بیٹا اپنی بہن کی تلاش میں نکل چکا ہے اس کے ہتھے اگر تم چڑھ گئے تو تمھارے کسی نقصان کا میں جواب دہ نہیں ہوں گا۔''

''مجھے تمھاری ضمانت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں دریا میں گھستے وقت گیلا ہونے سے نہیں ڈرتا۔ تم صرف چودھری اکبر کا موجودہ ایڈریس بتلا دو۔''

''اس کے بارے مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ وہ میران شاہ کے کسی ملک کے پاس پناہ لیے ہوئے ہے۔ ملک کا نام غالباً ملک بہادر خان ہے۔''

''مجھے مکمل ایڈریس چاہیے۔''

''اس سے زیادہ مجھے معلوم ہوتا تو میں ضرور بتلا دیتا۔ کیونکہ اکبر جیسے بزدل لوگ دوستی کے قابل نہیں ہوتے۔''

''مگر کچھ عرصے پہلے تو آپ نے رضیہ کی منگنی اس کے ساتھ کر دی تھی اور اپنے بیٹے کے لیے تم اس کی بہن کے رشتے کے طلبگار تھے۔''میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس وقت میں اس کی بزدلی سے ناواقف تھا۔ جیسے ہی اس کی اصلیت ظاہر ہوئی مجھ سے پہلے ہی میری بیٹی نے اپنا رشتہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔''

اب اس کی بیٹی اس رشتے سے انکاری ہوئی تھی یا شہلا اس رشتے پر تیار نہیں تھی میری بلا سے مجھے تو آسانی سے اکبر خان کا کلیو مل گیا تھا اب اس کی بنیاد پر اس کی تلاش کے سفر کو آسانی سے آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ رضیہ کو اغوا کرنے کی بجائے اگر میں ڈائریکٹ میر نیاز خان سے اس بارے استفسار کرتا تو بھی شاید اسے اتنی بات بتانے میں تامل نہ ہوتا بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ رضیہ کو بہ خیریت واپس کر کے میں اپنی غلطی کا ازالہ کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے میر نیاز خان اس سے پہلے جو ہوا سو ہوا اب میں رضیہ بی بی کو باعزت طریقے سے واپس بھیجتے ہوئے اپنی غلطی کا ازالہ کر رہا ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ میں نے مردوں کی لڑائی میں عورت کو گھسیٹا امید ہے آپ بڑا ہونے کے ناطے مجھے معاف کر دیں گے، ویسے اتنا عرض کرتا جاؤں کہ تیری بیٹی کی شان خلاف میں نے کوئی بات بھی نہیں کی ہے اور ایک گنڈہ پور ہونے کے ناطے میں نے اسے بہن کی

طرح ہی سمجھا ہے۔"

"تھینک یو مسٹر عمر جان۔" وہ خوشدلی سے بولا۔ "یہ بات کر کے تُو نے میرا دل جیت لیا ہے۔ میں تیرے اس ظرف کو یاد رکھوں گا۔ گڈ بائی اینڈ خدا حافظ۔"

فون کال کا بل پے کر کے میں پی سی او سے باہر نکل آیا۔ میر نیاز خان سے ہونے والی بات چیت بہت کامیاب رہی تھی۔ اتنی جلد اپنے مقصد میں کامیابی کی مجھے بالکل امید نہیں تھی۔ پی سی او سے میں سیدھا چاچا فاضل کے پاس گیا اسے مختصراً اپنی کارگزاری سنا کر رحمٰن خیل واپس آ گیا۔ گاؤں سے نکلتے ہی میں چلنے سے زیادہ دوڑتے ہوئے جنگل والے مکان کے پاس پہنچا مغرب کا ٹائم ہو گیا تھا۔

مکان کے اندر صورتِ حال جوں کی توں نظر آ رہی تھی۔ فضل داد اور خوش میر خان دیوار سے ٹیک لگائے خاموشی سے بیٹھے تھے جبکہ رضیہ دوسرے کمرے میں تھی۔

"کیا رہا۔" امجد جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کلاشن کوف ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"کامیابی۔" میں خوشی سے چہکا۔ "اب واپس چلیں گے۔ رضیہ کو بھی واپس بھیجنا ہے۔"

"اور یہ؟" امجد کا اشارہ فضل داد اور اس کے ساتھی کی طرف تھا۔

"یہ یہیں رہیں گے ان کے ساتھ کل دیکھیں گے۔"

"اے لڑکے ہمیں چھوڑ دو اس میں تمھاری بہتری ہے۔" فضل داد نے ایک مرتبہ پھر مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

"بزرگو میری بہتری کے بارے سوچنے کی بجائے اپنے مستقبل کے بارے سوچو۔" یہ کہہ کر میں نے دونوں کمروں کو ملانے والے اندرونی دروازے سے اندر جھانک کر رضیہ کو آواز دی۔

"چلو بی بی تمھاری رہائی کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

اور رضیہ جمائیاں لیتی اندر سے برآمد ہوئی وہ شاید بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اس سچویشن میں بڑے بڑے بہادر مردوں کی نیند اُڑ جاتی ہے وہ عجیب نڈر اور بے پرواہ قسم کی لڑکی تھی اس حال میں بھی سو گئی تھی۔

"ابو جان سے بات ہو گئی ہے؟" باہر نکلتے ہی وہ مستفسر ہوئی۔

"ہاں۔" میں جواباً بولا۔ "اور اس نے بے چوں چرا ں میرا مطالبہ پورا کر دیا ہے اس لیے ابھی ہم تمھیں رہا کر رہے ہیں۔"

"اور وہ دونوں۔" رضیہ کا اشارہ قیدیوں کی طرف تھا۔

"وہ دونوں فی الحال ہمارے پاس رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "ان کے ساتھ ہمارا پرانا حساب کتاب رہتا ہے وہ چکا کر انھیں بھی چھوڑ دیں گے۔ ہم نے کون سا ان کا اچار ڈالنا ہے۔"

"مگر وہ دونوں تو تمھاری شکل سے بھی واقف نہیں ان کے ساتھ تمھارا کون سا حساب کتاب رہتا ہے۔"

''تم انھیں چھوڑ دو اور اپنی خیر مناؤ'' یہ کہہ کر میں نے امجد کو دوسرے کمرے کا دروازہ بھی بند کرنے کا اشارہ کیا اور رضیہ کو ساتھ لے کر جھنڈ میں چھپی کار کی جانب بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم پکے روڈ پر نکل آئے تھے۔ تھانے کے قریب کار رکوا کر ہم دونوں نیچے اتر گئے۔ امجد بولا۔

''مس رضیہ بہت بہت مہربانی آپ جا سکتی ہیں۔''

''چلی جاؤں۔'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''بالکل اس طرح چلی جائیں جس طرح آپ نے ایک دن بابل کا گھر چھوڑ کر جانا ہے۔'' امجد مزاحیہ لہجے میں بولا اور اس نے ہمیں حیرانی سے دیکھتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

''چل بھئی ماجے تھانے چل اس سے پہلے کہ میر نیاز خان ہمارے خلاف اپنی بیٹی کے اغوا کا پرچہ کرائے ہم خود گرفتاری پیش کر دیتے ہیں۔''

''بکواس کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔'' وہ میرے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ ''مجھے تمام کہانی تفصیل سے سناؤ۔''

''چلو ایک چھوٹا سا کام رہتا ہے اس کے بعد تمھیں تمام تفصیل بتلاتا ہوں۔'' میں تھانے میں داخل ہوتے ہوئے بولا اور وہ سر ہلا کر خاموش ہو رہا۔

تھانے میں نذرے سے مل کر میں نے اسے فضل داد اور خوش میر کے قید ہونے کی جگہ بتلائی اور واپسی کا قصد کیا۔

''یار کھانا تو میرے ساتھ کھا لیتے۔'' نذرے نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔

''کھانا پھر کبھی سہی۔'' میں نے کہا۔ ''تم بس یہ خیال رکھنا کہ ہمارا نام درمیان میں نہ آئے اس کے بجائے تم ہمیں اپنے مخبر ظاہر کرنا۔''

''میں ایسے ہی کروں گا'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم دونوں تھانے سے باہر نکل آئے۔

''اب ساری کہانی سناؤ۔'' تھانے کی عمارت سے باہر آتے ہی امجد مستفسر ہوا اور میں نے اسے ساری تفصیل بلا کم و کاست سنا دی۔

''ویسے یار!...... یہ میر نیاز خان مجھے بڑا کوآپریٹو بندہ نظر آ رہا ہے...... اس سے پہلے اس نے شہلا کی زمینیں بھی بڑی آسانی سے واپس کر دیں اور اب تیرے ساتھ بھی بڑی اصولی گفتگو کی ہے۔ اگر پہلے پتا ہوتا تو ہم اتنے لمبے بکھیڑے میں پڑنے کی بجائے براہ راست اس سے مل لیتے میرا تو خیال ہے اس طرح ہم اس ساری بکواس سے بچ جاتے۔''

''میرا اپنا یہی خیال ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''مگر ہمیں اس کے بارے معلوم ہوتا تو یہ قدم اٹھاتے نا...... بہر حال اب بھی اللہ کا شکر ہے کچھ نہیں بگڑا۔''

اس وقت تک ہم ٹہلنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے رحمٰن خیل کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ہم گلی میں گھسنے ہی والے تھے کہ اچانک سڑک کی طرف سے چند گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس رحمٰن خیل کی طرف بڑھتی نظر آئیں۔

''یہ کون ہو سکتے ہیں؟''

''پولیس والے نہ ہوں......شاید فضل داد اور خوش میر کو پکڑنے جا رہے ہوں۔''

''نہیں اس طرف، مطلوبہ مکان تک جانے کا کوئی راستا نہیں ہے یہ کوئی اور لوگ ہیں۔''

''دفع کرو، چلتے ہیں صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ ابھی تک کھانا بھی تیار کرنا ہے، پہلوان ہوٹل میں کھا لیتے تو اچھا تھا ناں۔''

''چلے جاتے ہیں یار!......گاڑیاں نزدیک پہنچنے والی ہیں دیکھ تو لیں یہ ہیں کون۔''

''کوئی بھی ہوں ہماری بلا سے۔'' امجد چڑ کر بولا۔ اس وقت تک ہم گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹوں کی روشنی میں نہا گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ گاڑیاں آگے گزر جائیں گی مگر اس کے برعکس تینوں گاڑیوں کا رخ ہماری جانب ہو گیا تھا۔

''امجد خطرہ ہے۔'' رضیہ کی سفید کار کو پہچانتے ہی میں نے نیفے میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ امجد نے بھی جلدی سے چادر کے نیچے چھپائی ہوئی کلاشن کوف ہاتھ میں پکڑ لی۔ تینوں گاڑیاں ہمارے گرد نصف دائرے میں کھڑی ہو گئیں ان کی ہیڈ لائیٹس آن رہنے دی گئیں۔

رضیہ کی کار کے پیچھے کھلی چھت کی جیپیں لگی ہوئی تھیں جن میں چار چار افراد سوار تھے جیپوں کو روک کر وہ آٹھوں افراد اپنے ہاتھوں میں موجود ہتھیار سنبھالے نیچے اتر آئے۔ جبکہ کار کی اندرونی لائیٹ کی روشنی میں مجھے رضیہ کے ساتھ ایک مرد بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا جب تک آٹھوں افراد ہمارے گرداگرد ایک دائرے کی صورت میں کھڑے نا ہو گئے رضیہ اور اس کا ساتھی کار میں بیٹھے رہے۔ جیسے ہی آٹھوں افراد ہمارے چاروں طرف کھڑے ہو گئے کار کا دروازہ کھول کر وہ دونوں نیچے اترے اور فلمی اسٹائل سے چلتے ہوئے ہماری جانب بڑھنے لگے۔

''ماجے میاں!......بے احتیاطی ہو گئی ہے۔''

وہ مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ''کوئی بات نہیں آئندہ خیال رکھنا۔''

''یہی دونوں تھے۔'' ہم سے چند گز دور رک کر اس جوان نے رضیہ سے پوچھا۔

''جی بھائی۔'' رضیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بھائی کہنے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ نوجوان گل ریز تھا۔

''مسٹر تم دونوں کو میری بہن سے معافی مانگنی پڑے گی۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے انگشتِ شہادت ہماری جانب اٹھائی۔

''مگر ہم سے تو کوئی ایسی غلطی نہیں ہوئی جس کی بدولت ہمیں معافی مانگنے کی ضرورت پڑے۔'' امجد کا لہجہ گو سنجیدہ تھا مگر انداز بالکل مزاحیہ تھا۔

اس سے پہلے کہ گل ریز مزید کچھ بولتا سڑک کے جانب سے ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی نظر آئی۔ آنے والی گاڑی کافی سپیڈ سے بڑھتی چلی آ رہی تھی تمام لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے اگلے چند منٹ میں وہ گاڑی دوسری گاڑیوں کے قریب آ کر رک گئی۔

''اوہ شٹ، ڈیڈ پہنچ گئے۔'' گل ریز رضیہ سے بولا۔ وہ جواباً خاموش رہی وہ میر نیاز خان تھا سفید کپڑوں پر کالی واسکٹ پہنے سر پر رکھی قراقلی ٹوپی کے ساتھ وہ بڑا پُر رعب نظر آ رہا تھا۔

”گلو تمھیں کہا تھا نا کہ اس سے صلح ہو چکی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”ڈیڈ میں نے بھی کہا تھا کہ اسے بی بی سے معافی مانگنی پڑے گی۔“

”بُری بات بیٹا! جب ایک دفعہ طے ہو چکا ہے تو پھر اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔“ اس کے انداز سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اپنے بیٹے کو لاڈ پیار سے وہ اتنا بگاڑ چکا تھا کہ اب خود بھی اسے بیٹے سے دبے لہجے میں بات کرنی پڑ رہی تھی۔

”ڈیڈ بات طے ہونے کی نہیں اصول کی ہونی چاہیے، ٹکے ٹکے کے لوگ گل ریز خان کی بہن کو اغوا کرنے لگ جائیں تو تف ہے ہماری زندگی پر......اب اسی صورت میں ان کی خلاصی ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں بے بی سے معافی مانگیں حالانکہ ارادہ تو میرا یہ تھا کہ انھیں اس وقت چھوڑوں گا جب یہ بے بی کے پاؤں کو ہاتھ لگائیں گے، لیکن اب آپ کی وجہ سے میں انھیں آسان شرط پر چھوڑے دیتا ہوں۔“

میر نیاز خان نے بے بسی سے ہماری جانب دیکھا۔

”آپ دونوں میں عمر جان کون ہے؟“ وہ دھیمی آواز میں مستفسر ہوا۔

”میں۔“ امجد اس وقت بڑی مشکل سے اپنے غصے کو کنٹرول کیے ہوئے تھا۔

”عمر جان آپ ہی اسے کچھ سمجھائیں۔ میری بات تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ میر نیاز خان مجھے مخاطب ہوا۔ مجھے اس کے انداز سے یوں لگا جیسے سمجھانے کے پردے میں وہ مجھے گل ریز کی بات ماننے کی دعوت دے رہا تھا۔

”سمجھا تو ہم دیں گے مگر ہمارے سمجھانے کا انداز کچھ اور ہے۔“ امجد جو بڑی مشکل سے اپنے غصے کو کنٹرول کیے ہوئے تھا زہر خند لہجے میں بولا۔

”وہی انداز تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ گل ریز خان کا لہجہ بھی غضب سے پُر تھا۔ ”لڑکیوں کو ہتھیار کے زور پر اغوا تو ہیجڑے بھی کر لیں گے۔ اگر مرد ہو تو اب میری بہن کو ہاتھ لگا کر دیکھو۔“

”مسٹر گل ریز!......ہتھیار کے زور پر تو تم کو در ہے ہو۔“ میں نے اس کے باڈی گارڈوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور جہاں تک تعلق تمھاری بہن کو ہاتھ لگانے کا ہے تو وہ تو ہم نے پہلے بھی نہیں لگایا۔ اس بات کی گواہی تیری اپنی بہن دے گی پوچھ لو اس سے یہیں یہ کھڑی ہے۔“

”اسی وجہ سے تو تم دونوں بھی زندہ نظر آ رہے ہو۔“ گل ریز کا لہجہ نخوت سے پُر تھا۔ ”ورنہ اب تک میں تم دونوں کی ٹانگیں توڑ چکا ہوتا۔“

”ارے آپ لوگ تو لڑنے لگ گئے ہو۔“ میر نیاز خان نے ہمیں آپس میں سمجھنے سمجھانے کے لیے چھوڑا تھا۔ ہمارے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔

”خان صاحب آپ اپنے بیٹے کو لگام دے کر رکھیں۔ لڑ ہم نہیں یہ رہا ہے۔“ امجد کے لہجے میں تلخی تھی۔

”اگر لڑ رہا ہوں تو اس کی اہلیت بھی رکھتا ہوں۔“ گل ریز اسی لہجے میں بولا۔ ”تم میں بھی اگر اتنی ہمت ہو تو ضرور میرا چیلنج قبول کرتے۔“

''کون سا؟''

''تم دونوں میں سے ایک آدمی بے بی سے خالی ہاتھ مقابلہ کرے۔اگر جیت گیا تو میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا اور جانے دوں گا ہارنے کی صورت میں تم دونوں کو بے بی سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگنی پڑے گی۔''

''بہن کی بجائے تم خود کیوں نہیں اترتے میدان میں۔'' میں نے اسے للکارا۔

''ہا......ہا......ہا......میں......میرے مقابلے کے لیے تم دونوں آجاؤ۔'' اس کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا تھا۔

''گل ریز خان......'' میں نے حتی الوسع اپنے لہجے کو نرم رکھا۔''جہاں تک معذرت کا تعلق ہے تو ہم تمھارے باپ سے معذرت کر چکے ہیں حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس سے پہلے تمھارے والد ہمیں اغوا کرانے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں، تمھاری بہن کو اغوا کرنا صرف اس بات کا باضابطہ جواب تھا۔باقی رہی تمھاری بے بی سے معافی مانگنے کی بات تو اس سے ہم نے کوئی ایسا غلط سلوک نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمیں اس سے معافی مانگنے کی ضرورت پڑے اس لیے تم بات بڑھانے کی کوشش نہ کرو کہ اسی میں تمھاری بہتری ہے۔''

''عمر جان صاحب...... مجھے تقریر نہیں اپنی بات کا دوٹوک جواب چاہیے۔''

میں نے امجد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس نے اپنی کلاشن کوف میری جانب بڑھا دی اور اس کا مطلب تھا وہ گل ریز سے مقابلے کے لیے تیار تھا مگر میں اسے اس قسم کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔اس سے قطع نظر کہ ہم دونوں قد و قامت اور باڈی کے لحاظ سے گل ریز پر بھاری تھے اور عام ہاتھا پائی میں جسمانی قوت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے مگر جس بل بوتے پر گل ریز اکڑ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ وہ جوڈو کراٹے سے واقف تھا اور ہمیں بھی اس نے عام گنڈہ پوروں کی طرح صرف گن فائیٹر ہی سمجھا ہوا تھا۔جبکہ ہم دونوں جوڈو کراٹے کے علاوہ کچھ ایسے فنون سے بھی واقف تھے جن کی شاید گل ریز کو ہوا بھی نہ لگی ہو لیکن میری امجد کو اجازت نہ دینے کی وجہ کچھ اور تھی امجد گو بہت اچھا فائٹر تھا مگر اس میں ایک بنیادی خامی موجود تھی جس پر قابو پانے میں وہ ابھی تک ناکام رہا تھا۔ایک اچھے فائٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ سخت جان ہو چوٹ برداشت کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔حملہ کرنے میں پہل پن اور تیزی کو برقرار رکھ سکے اور یہ چیزیں امجد میں بدرجہ اتم موجود تھیں آخری چیز جو ایک اچھے فائیٹر کو عام لڑاکوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے اپنے دفاع سے غافل نہ ہونا اور یہ چیز امجد میں مفقود تھی۔لڑائی کے شروع میں وہ اس بات کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر جوں جوں لڑائی میں طول اور تیزی آتی جاتی وہ اپنے دفاع سے غافل ہو جاتا تھا اس میں اس کی جوشیلی طبیعت کا بڑا عمل دخل تھا۔میرے ساتھ دوستانہ مقابلے میں بھی زیادہ تر یہی چیز اسے لے بیٹھتی تھی اور اب بھی مجھے یہی خوف لاحق ہوا تھا کہ اگر وہ اپنے دفاع سے ذرا سا بھی غافل ہوا اور اس کے زخمی بازو پر چوٹ لگ گئی تو شاید مقابلہ ہار جائے یا مقابلہ جیتنے کی صورت میں بھی اس کے بازو کو کوئی ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔

''نہیں ماجے۔'' میں نے کلاشن کوف پکڑنے کی بجائے اپنا پستول اس کی طرف بڑھایا۔''لڑائی میں تیرا زخمی بازو مزید زخمی ہو سکتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تیرا بازو جلد ٹھیک ہو جائے تاکہ ہم اپنے مشن پر جا سکیں اور تجھے تو پتا ہے اس طرح کے دس بندوں کے لیے بھی جانو

اکیلا کافی ہے۔"

اور امجد اس بات سے خوب واقف تھا، بالکل اسی طرح جس طرح مجھے پتا تھا کہ اس کا نشانہ مجھ سے بہتر تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے تکرار نہ کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پستول تھام لیا اس دوران گل ریز نے جو بڑی دلچسپ نظروں سے ہمیں گھور رہا تھا نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی حالانکہ ہمارے درمیان ہونے والے مکالمے کو اس نے بغور سنا تھا۔

"اچھا آپ نکلے ہیں بے بی کے مقابلے کے لیے۔" اس کا لہجہ استہزائی تھا۔

"عورتوں سے مقابلہ کرنا تمھارے جیسے مردوں کا کام ہے۔ ہم تو کسی مرد کی تلاش میں رہتے ہیں اگر مل جائے تو!"

"اچھا آ...... تو تُو میرے ساتھ مقابلے کے لیے آگے بڑھا ہے۔" گل ریز اسی انداز میں بولا "مگر میں نے تو تم دونوں کو اکٹھے دعوت دی تھی۔"

"میرے بعد میرا دوست آجائے گا۔ مجھے تو ہرا لو۔" میں نے فضول ڈائیلانگ بازی سے پرہیز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ تو سچ مچ لڑائی پر تیار ہو گئے۔" میر نیاز خان پریشان لہجے میں بولا مگر مجھے اس کی پریشانی مصنوعی سی لگی۔ شاید یہ میرا گمان ہو مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود بھی یہی چاہ رہا تھا۔ شاید وہ بھی ہمیں سبق سکھانے کے موڈ میں تھا مگر سیاسی انداز میں۔

"ڈیڈ پلیز آپ درمیان میں نہ آئیں۔" گل ریز ملتجی لہجے میں بولا اور میر نیاز خان سر ہلا کر خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ اس کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ اس کے بارے میرا اندازہ درست تھا اور وہ ایک اچھا سیاستدان ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔

گل ریز اس وقت جینز پہنے ہوئے تھا جس کے اوپر اس نے موسم کی مناسبت سے ٹی شرٹ ڈالی ہوئی تھی جبکہ میں شلوار قمیص میں ملبوس تھا، لڑائی بھڑائی کے لیے اس کا لباس موزوں تھا مگر میں نے اس بات کی مطلقاً پرواہ نہ کی کہ صرف لباس کے بل بوتے پر وہ لڑائی نہیں جیت سکتا تھا۔ گو خالی ہاتھ لڑائی کے اندر لباس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے مگر اس وقت جس وقت مقابلہ اُنیس بیس کا ہو۔ زندگی میں شیش ناگ واحد لڑاکا تھا جس سے میں متاثر ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لڑتے ہوئے آخر تک میں گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہا تھا کہ جانے مقابلہ کون جیتے۔ گل ریز تو اس کے مقابلے میں طفلِ مکتب دکھائی دے رہا تھا۔ مگر لڑائی کے بنیادی اصول کہ دشمن کو کبھی کمزور نہ سمجھو کے مصداق میں اس کے جانب سے ہر قسم کی کارروائی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

چار گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹوں نے اس جگہ کو خوب روشن کر رکھا تھا۔ میرے آگے بڑھتے ہی گل ریز اپنی بہن کو میر نیاز کے پاس جانے کا اشارہ کر کے کراٹے کے مختلف پوز بناتے ہوئے مجھے متاثر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اس سے مناسب فاصلے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "لڑائی ہمیشہ کسی قانون اور ضابطے کی تحت لڑی جاتی ہے مسٹر گل ریز...... اسی طرح لڑائی شروع کرنے اور ختم کرنے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اگر مہربانی کر کے ان سب کی تشریح کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"کسی بھی فریق کے بے ہوش ہو جانے یا ہار مان جانے کی صورت میں لڑائی ختم سمجھی جائے گی اور شروع ابھی کر لیتے ہیں تیار ہو جاؤ

ایک۔ دو...... تین۔" کہہ کر اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور اس کا داہنا پاؤں بڑی سرعت کے ساتھ میرے چہرے کی طرف بڑھا۔ اگر وہ اس سے دگنی رفتار سے بھی حملہ کرتا تب بھی اس کا پاؤں میرا چہرہ نہیں چھو سکتا تھا۔ میں نے ہلکی سی جھکائی دی اور سائیڈ پر ہو گیا وہ اپنی جھونک میں زمین پر گرا لیکن جلدی سے سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور کھڑا ہوتے ہی اپنے بائیں پاؤں پر پھرکی کی طرح گھوم کر اس نے دائیں پاؤں سے ایک مرتبہ پھر مجھے نشانہ بنانا چاہا اس مرتبہ بھی میں اسے ڈاج کر گیا مگر جوابی کارروائی سے میں نے جان بوجھ کر گریز کیا۔ اپنے دوسرے وار کو خطا جاتے دیکھ کر اس کے حملوں میں تیزی آ گئی میں نے اس کے خلاف جوابی کارروائی کی بجائے صرف دفاع پر اکتفا کیا۔ مجھے پتا تھا کہ جلد ہی اس نے تھک جانا تھا اور وہی ہوا پانچ چھ منٹ کی اچھل کود سے ہی اس کا منہ کھل گیا اور سانس دھونکنی کے مانند چلنے لگا۔

جیسے ہی اس نے رک اپنا سانس ہموار کرنا چاہا میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "بس اتنا ہی دم تھا مسٹر، اس سٹیمنے کے اوپر بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے اور تجھے یہ کس نے کہہ دیا تھا کہ تُو اچھا فائٹر ہے بیوقوف تم تو لڑائی کی ابجد سے بھی ناواقف ہو۔ حملہ کیسے کیا جاتا ہے یہ جانو سے سیکھو اور ابھی روکنا ہے میں حملہ کرنے لگا ہوں۔"

یہ کہتے ہی میں نے اوپر اچھل کر اسے جھانسہ دیا کہ جیسے میں اس پر چھلانگ لگانے والا ہوں اور میرے جھانسے میں آتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنی جگہ تبدیل کی اور جھکائی دیتے ہوئے اپنے دائیں جانب ہٹا۔ جبکہ میں نے ایک سٹیپ آگے بڑھتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچا اور اسی تیزی میں میری بائیں ٹانگ اس کے پیٹ کی طرف بڑھی میرے داؤ کو نہ سمجھتے ہوئے اس نے میرے پاؤں کی ضرب کو برداشت کرنے کے لیے اپنے پیٹ کے سامنے اپنی دونوں کہنیوں کا کراس بنایا مگر میرا پاؤں بجائے اس کے پیٹ میں لگنے کے زمین پر لگا اور اگلے ہی لمحے اس پاؤں پر پھرکی کی طرح گھومتے ہوئے میرا دایاں پاؤں بجلی کی سی سرعت سے اس کی ٹھوڑی کی طرف بڑھا۔ جسے روکنے کے لیے اس کے پاس کوئی آپشن موجود نہیں تھا۔

ایک بلند کراہ کے ساتھ وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گرا اور وہیں پڑا رہا۔

"میر نیاز خان، اس کو سنبھالو...... اب اسے اچھی طرح سمجھ آ گئی ہے۔" مگر میرے یہ سب کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے نیچے گرتے ہی میر نیاز اور اس کی بیٹی اس کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ ہمارے چاروں طرف کھڑے ان کے محافظین نے اضطراراً اپنی کلاش کوفیں میری جانب سیدھی کر دیں۔ امجد بھی یکدم چوکنا ہو گیا تھا۔

"بھیا" کہتے ہوئے رضیہ اس کے قریب پہنچی جبکہ میر نیاز اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچا اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"تم وحشی، جنگلی۔" اپنے بھائی کے زندہ ہونے کا اطمنان کرتے ہی رضیہ بھری ہوئی شیرنی کے مانند میرے جانب بڑھی ایک تو اس کے حملے میں بڑی تیزی تھی دوسرے میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گی، میں نے بمشکل اپنے ہاتھوں کا کراس بنا کر اس کی فلائنگ کک کو روکا اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ حملہ کرتی میں دھاڑا۔

''میر نیازا سے سنبھالو۔''

''نہیں گڑیا نہیں''۔ وہ گل ریز کا سر زمین پر رکھ کر رضیہ کے جانب دوڑا اور حملے کے لیے پینترا بدلتی رضیہ کو بازو سے تھام لیا۔

''تم سارے الو کے پٹھے تماشے دیکھنے کے لیے کھڑے ہو۔'' رضیہ کو قابو کرتے ہی وہ غضبناک آواز میں چیخا۔ ''گلو کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔'' اس کی بات سنتے ہی چاروں اطراف میں مجسموں کی طرح کھڑے محافظوں میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ اکٹھے گل ریز کی طرف دوڑے۔ ان لمحوں میں اگر امجد چاہتا تو کلاشن کوف کے ایک برسٹ سے ہی تمام کو زندگی کی قید سے آزاد کر سکتا تھا مگر میری طرح وہ بھی خواہ مخواہ کے خون خرابے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ حتی الوسع ہم دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی بندہ ہم سے ضائع نا ہو جائے۔

''چلو گڑیا...... ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میر نیاز نے ایک مرتبہ پھر اس ظرف کا مظاہرہ کیا جو اس سے پہلے وہ کرتا آ رہا تھا۔

''گلو نے خود انھیں چیلنج کیا تھا اور گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔'' یہ کہہ کر میر نیاز خان اپنے ہاتھوں میں مچلتی رضیہ کو کار کی جانب کھینچ کر لے گیا۔ کار میں بیٹھتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''او کے عمر جان...... سی یو اگین (See You Again) اور اگر ہو سکے تو بچوں کی غلطی معاف کر دینا۔''

''اٹس او کے سر۔'' میں جواباً بولا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے اپنی کار یورس کی اور موڑ کاٹ کر واپس چل پڑا اس کے پیچھے باقی تینوں گاڑیاں بھی چل پڑیں۔

''چلو ماجے، پہلوان ہوٹل کی طرف ہی چلتے ہیں کہ کچھ پیٹ پوجا ہی کر لیں۔ شاید اب ہم سے کھانا تیار نہ ہو سکے۔''

''ہاں جی اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ''رناں والیاں دے پکن پراٹھے تے چھڑیاں دی اگ نا بلے''

امجد افسردہ لہجے میں بولا۔ اس کے انداز پر میں بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

+ + +

''اب کیا ارادہ ہے جانو؟'' رات گئے جب اپنے بستروں پر پہنچے تو امجد مستفسر ہوا۔

''اب سونے کا ارادہ ہے۔''

''سونے کے بچے۔ میں آئندہ کے لائحہ عمل کی بابت پوچھ رہا ہوں۔''

''وہ تو ظاہر ہے چودھری اکبر کو تلاش کر کے کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ اب اس کے بارے ہلکا سا کلیو مل گیا ہے اسی کو بنیاد بنا کر اس کی تلاش کا سلسلہ شروع کریں گے اس سے پہلے ایک چھوٹا سا کام نمٹا لیں۔''

''وہ کون سا؟''

''تمھیں میں نے شمشاد خاتون سے ہونے والی گفتگو سنائی تھی نا؟''

''جی۔''

''یاد ہے اس نے کہا تھا کہ جس وقت چودھری نے اسے میرے گھر والوں کے کھانے میں بیہوشی کی دوائی ملانے کے لیے دی تھی تو اس وقت تھانیدار اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔''

''تو پھر؟''

''اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ بھی اس سازش میں ملوث تھا۔ اس نے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مجھے ٹارچر کیا کوئی بات نہیں، اس نے کھل کر چودھری اکبر کا ساتھ دیا، نیور مائنڈ۔ مگر اس نے میرے گھر والوں کے خلاف جو چودھری اکبر کا ساتھ دیا اس کو میں معاف نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہے مگر پہلے تمھیں اس سے بدلہ لینا یاد نہیں تھا؟''

''یاد تھا......مگر چودھری اس سے زیادہ ضروری تھا۔ ویسے بھی سرکاری ملازم ہونے کے ناطے وہ کہاں چھپ سکتا تھا۔ اب جبکہ چودھری اکبر کا سراغ تقریباً مل گیا ہے تو میں چاہتا ہوں اس کی تلاش میں جانے سے پہلے اس کا حساب چکتا کر دیں۔''

''تو آج ہی چلے چلتے ہیں۔''

''آج نہیں کل ان شاء اللہ چلیں گے۔'' اور امجد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلے دن ہم کافی دیر سے اٹھے نہا دھو کر ہم ایک دوسرے کو ناشتا بنانے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے......

''میں تو مہمان ہوں بھئی۔'' امجد نے صاف انکار کیا۔ ''اور مہمان کا کام صرف کھانا ہوتا ہے۔ ناشتا، کھانا تیار کرنا میزبان کا کام ہوتا ہے۔''

''مسٹر تُو میرا منشی ہے۔ ایک تھرڈ کلاس منشی کے لیے ملک صاحب کس طرح ناشتا تیار کر سکتا ہے اب تیری مہمانی ویسے بھی کافی دن ہوئے ختم ہو چکی ہے اس لیے شرافت سے اٹھو اور اپنے خان کے لیے ناشتا تیار کرو، خود اگر نہیں کھانا چاہتے تو بے شک نہ کھاؤ۔''

امجد نے جواباً کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''یہ کون ہے۔''

''ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے چارپائی سے اٹھ کر اپنی جیب میں پستول کی موجودی کا یقین کرتے ہوئے کہا۔

دستک گھر کے دروازے پر ہوئی تھی۔ مگر گھر اور بیٹھک کے دروازے ساتھ ساتھ تھے اس لیے میں نے آگے بڑھ کر بیٹھک کا دروازہ کھولا تو بمشکل اپنے آپ کو اچھلنے سے باز رکھ سکا دروازے پر میز نیاز خان کی بیٹی رضیہ کھڑی تھی۔

''تم؟'' میں حقیقتاً حیران رہ گیا تھا۔

''کیوں......میرا یہاں آنا منع ہے؟'' وہ خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''آپ کو کون کم بخت منع کر سکتا ہے۔'' میں حیرت کے پہلے جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔

''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے۔''

''آئیں آئیں بسر و چشم۔'' میں پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ لوگ جائیں میں یہاں بالکل محفوظ ہوں۔''اس نے اپنے باڈی گارڈوں کو کہا۔

''مگر چھوٹی بی بی......''ان میں ایک نے کچھ کہنے کی کوشش کی......وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''اگر مگر چھوڑو......جاؤ۔اگر ڈیڈی پوچھیں تو بتا دینا کہ عمر جان صاحب نے بتایا تھا کہ وہ خود مجھے واپس چھوڑ جائیں گے۔''اور اس کے ساتھ آنے والے تینوں محافظ اپنے چہروں پر بے بسی کے تاثرات سجائے واپس مڑ گئے۔

''سوری عمر جان صاحب آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔دراصل انھیں واپس بھیجنے کے لیے میں نے یہ بہانہ کیا ہے، واپسی میں بے شک میں اکیلی چلی جاؤں گی۔''اپنے محافظوں کے واپس جاتے ہی معذرت کرنے لگی۔

''نہیں مس ایسی کوئی بات نہیں۔''اور وہ مسکرا دی، مسکراتے وقت اس کے گالوں میں بھی شیتل کی طرح گڑھے پڑ جاتے تھے، مگر خوب صورتی میں یہ شیتل کے عشر عشیر بھی نہیں تھی۔اُس کی طرح حسین لڑکی میری نظروں سے اس کے بعد نہیں گزری، ویسے رضیہ بھی خوب صورت تھی اچھے عمدہ لباس اور میک اپ کے مہنگے ساز وسامان کے استعمال نے اس کی خوب صورتی کو مزید بھی اجاگر کر رکھا تھا۔

امجد بھی اس کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''ارے جانو صاحب یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔''

''عبداللہ بھائی جانو نہیں عبدالرحمٰن کہو۔عبدالرحمان۔''رضیہ تیزی سے بولی اور ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''مس پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام امجد ہے اور دوسرے یہ جو بھائی کا سابقہ لاحقہ ہے نا اس کو صرف گل ریز کے لیے ریزرو رکھو۔تین بہنیں پہلے سے موجود ہیں چوتھی کا متحمل میں نہیں ہو سکتا۔''

''میں امجد بھائی ہی بولوں گی امجد بھائی۔''وہ اسے چڑانے لگی۔''کیوں جانو صاحب؟''

''بالکل۔''میں نے اس کی تائید کی۔''میں خود انھیں امجد بھائی کہتا ہوں اور تو اور ٹریننگ کے دوران یہ دوسرے لڑکوں کو کہا کرتا تھا کہ مجھے امجد بھائی کہا کرو، بھائی کا لفظ اچھا لگتا ہے۔''

''دھت تیرے کی۔''امجد اپنے سر پر ہاتھ مارا۔''اپنے ہی جب مخالف ہو جائیں تو غیروں کا کیا بھروسہ۔''

رضیہ مسکرائی۔''مجھے بھی یہ بطور بھائی بہت اچھا لگا ہے۔''

''ہاں شادی سے پہلے سب لڑکیاں اپنے ہونے والے دولہا کو بھائی کہہ کر ہی پکارتی ہیں۔''

''یہ آپ لوگوں کا رواج ہوگا۔''رضیہ نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا۔''ہمارے ہاں تو ایک دفعہ جسے بھائی کہہ دیا اسے ساری زندگی بھائی ہی سمجھا جاتا ہے۔''یہ کہہ کر وہ تکیہ گود میں لے کر بڑے آرام سے چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

''اچھا یہ بحث تو ہوتی رہے گی۔آپ پہلے یہ بتائیں چائے پئیں گی یا ٹھنڈا؟''میں نے ان کی بے معنی بحث کو روکا۔

''نہیں تھینکس میں ناشتا کر کے آ رہی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ہم غریبوں کی چائے کے لیے بھی تھوڑی سی گنجائش پیدا کرلیں۔'' امجد نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھیا۔آپ کی بات تو نہیں ٹھکرائی جاسکتی نا۔''

''جانو کو بھی تو بھائی کہیں نا...... یا اکیلا میں ہی گنہگار رہوں۔'' امجد شکایتی لہجے میں بولا۔

''نہیں یہ جانو صاحب ہی ٹھیک ہیں۔ بلکہ جان ہی فٹ رہے گا۔کیوں صحیح کہہ رہی ہوں نا جان'' اس نے شوخ نظروں سے مجھے گھورا۔اس کا لہجہ اور انداز دیکھتے ہوئے میں بے ساختہ سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔میری سوچوں میں بے ساختہ شیتل در آئی وہ پگلی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی اور میرے لیے ساری دنیا کو ٹھکرانے پر تیار ہوگئی تھی۔

''اب تو شاید اس کی شادی بھی ہوگئی ہو۔'' میرے ذہن میں ایک امکانی سوچ ابھری۔

''کن خیالوں میں کھو گئے ہو بھئی...... مس رضیہ کہہ رہی ہیں کہ مجھے بھائی اور آپ کو بھائی جان کہیں گی...... سمجھے۔''

''میں نے صرف جان کہا ہے۔'' رضیہ نے جلدی سے اس کی تردید کی۔

''چھوڑو یار اس بحث کو اور چائے بنا کر لے آؤ۔'' میں نے امجد سے کہا اور وہ سمجھ گیا کہ مجھے رضیہ کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

''ہاں بھئی اب منشی غریب نے تو چائے ہی بنا بنا کر پلانی ہے نا۔تنخواہ جو حلال کرنی ہوئی۔''

''کیوں گھر میں کوئی عورت موجود نہیں ہے کیا؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''موجود ہے مگر ہماری مہمان ہے مس رضیہ میر نیاز خان...... اور اس سے ہم چائے بنوانے سے تو رہے۔''

اس کی بات پر رضیہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔''تم بھی بڑی شئے ہو امجد بھائی۔''

''یا اللہ پھر وہی بھائی۔'' امجد مصنوعی بیزاری ظاہر کرتا ہوا چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''مس رضیہ اگر مائنڈ نہ کریں تو میں تشریف آوری کا مقصد جان سکتا ہوں؟'' امجد کے جاتے ہی میں نرم لہجے میں مستفسر ہوا۔

''جانو صاحب ایک تو میں معذرت کے لیے حاضر ہوئی تھی کہ کل رات میں غصے میں آپ کے ساتھ گستاخی کر بیٹھی اور نامناسب الفاظ سے پکارنے کے ساتھ ساتھ آپ پر حملہ کرنے کی جرأت بھی کر بیٹھی۔یہ آپ کا بڑا پن تھا کہ آپ نے جوابی کارروائی سے گریز کیا۔میں ریئلی بہت شرمندہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں مس رضیہ وہ ایک وقتی اشتعال تھا جس سے مغلوب ہو کر آپ نے یہ قدم اٹھایا مجھے بالکل محسوس نہیں ہوا۔''

''تھینک یو عمر جان صاحب۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔شاید بات بات پر مسکرانا اس کی عادت تھی یا اسے اس کے مسکرانے کی تباہ کاری کے بارے کسی نے بتا دیا تھا اور وہ جان بوجھ کر مخالف کو احساسِ محرومی میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتی۔

''دوسرا میرے یہاں آنے کا مقصد آپ کو دعوت پہ بلانا تھا، آج ہم نے حویلی میں ایک چھوٹا سا جشن منانے کا اہتمام کیا ہے آپ کی شرکت ہمارے لیے باعثِ فخر ہوگی۔اس کے علاوہ ڈیڈی بھی آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں انھوں نے کچھ خاص امور پر آپ سے گفتگو

کرنی ہے۔"

"مجھ سے کس سلسلے میں گفتگو کرنی ہے؟"

"یہ آپ انہی سے پوچھ لینا۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔"اور یہ جشن وغیرہ کس سلسلے میں منایا جارہا ہے۔کہیں آپ کی منگنی وغیرہ کا چکر تو نہیں چل رہا۔"

"منگنی کا اعلان بھی ہوسکتا ہے اگر ایک بندہ مان جائے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔"ویسے جشن تو مقدمہ جیتنے کی خوشی میں منایا جارہا ہے۔"

"کون سا مقدمہ؟" میں نے اس کے معنی خیز لہجے میں ایک بندے کے مان جانے کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوہاٹ کے دوخانوں کے ساتھ ہمارا زمینوں کا جھگڑا چل رہا تھا وہ مقدمہ ہم جیت گئے ہیں۔اسی سلسلے میں ایک چھوٹی سے پارٹی ارینج کی ہے اور مہمان بھی ہیں لیکن ڈیڈی نے آپ دونوں کے لیے مجھے خصوصی طور پر بھیجا ہے۔"

"کن دو کے لیے آپ خصوصی طور پر آئی ہیں۔" امجد چائے کے برتنوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔"میں اپنے علاوہ اور کسی کا نام آپ کے ساتھ نہیں سن سکتا۔"

"عمر جان کا نام بھی نہیں سن سکتے۔" وہ حسب عادت مسکرائی۔

"یہ تو میرا دشمن نمبرون ہے......بہر حال چھوڑیں اسے چائے لیں تاکہ آپ کو میری خوبیوں کا اندازہ ہو اور آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرسکیں۔"

"کون سا فیصلہ؟" اس نے ٹرے سے کپ اٹھایا۔

"یہی......جو آپ نے مجھے بھائی جیسے قاتلانہ نام سے پکارنا شروع کردیا ہے۔"

"بھائی قاتلانہ نام ہے؟"

"تو اور کیا......پیار، محبت، عشق کا قاتل ہی تو ہے۔" اس کے انداز پر ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

"فنٹاسٹک بھائی۔بہت اچھی چائے بناتے ہیں آپ تو۔" وہ چائے کی چسکی لے کر تعریفی لہجے میں بولی۔امجد چونکہ چینی دودھ وغیرہ پہلے سے ہی مکس کر کے لے آیا تھا اس لیے ہم سب اپنے اپنے کپ پکڑ کر چائے پینے میں لگے تھے۔ویسے بھی یہ امرأ کے چونچلے ہیں اور ہم نے اپنے آپ کو کبھی بھی اس طبقے میں شمار نہیں کیا تھا۔

"کھانا اس سے بھی اچھا بناتا ہوں، خدا کی قسم عیش کروگی عیش۔" امجد نے ایک مرتبہ پھر شگوفہ چھوڑا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے وہ یقیناً زیادہ خوب صورت لگتی تھی۔

"اچھا چھوڑیں بھیا اس مذاق وغیرہ کو۔میں دراصل آپ دونوں کو کھانے کی دعوت دینے آئی تھی اور آپ لوگوں نے لازماً آنا ہے

انکار میں نہیں سنوں گی۔شام کو گھر میں ہی رہنا آپ لوگوں کو لینے کے لیے گاڑی پہنچ جائے گی۔“

”مگر آج رات تو......“ امجد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں کیا ہے آج رات کو۔“ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

”ہم پہلے سے کہیں پہ مدعو تھے۔“ امجد نے بہانہ بنایا۔

”مجھے کچھ پتا نہیں بس آپ نے آنا ہے۔“

”مگر ایک شرط پر۔“ امجد میری طرف سے رضامندی کا اشارہ پا کر بولا۔

”کون سی؟“

”مجھے امجد کہہ کر بلاؤ گی یا کم از کم ماجو ہی کہہ لیا کرو۔اس کے علاوہ کوئی نہیں۔“

”اور اگر میں جانی کہہ کر پکاروں پھر؟“ وہ شرارتی لہجے میں بولی۔

”آپ کے منہ میں گھی شکر۔“ امجد بے ساختہ بولا اور ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”اور ہاں ایک دلچسپ بات سناؤں۔“ وہ اچانک اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔”میرا خیال ہے کل آپ لوگوں نے وہ دونوں بندے پولیس کے حوالے کر دیے تھے؟“

”ہاں......مگر اس میں دلچسپی کی بات کون سی پیدا ہو گئی۔“ امجد نے منہ بنایا۔

”اللہ کے بندے اخبار پڑھ کر دیکھو، انسپکٹر طاہر نے بڑے سخت مقابلے کے بعد انھیں گرفتار کیا ہے وہ شبیر شاہ نامی ناظم کے قاتل تھے اور پولیس کو حد درجہ مطلوب تھے۔“

”کل رات کو پکڑا ہے صبح اخبار میں بھی آ گیا ہے؟“ میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

”جی......ایسی خبریں اخبار والوں تک بغیر کسی تاخیر کے پہنچائی جاتی ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔”بہر حال ہم نے اپنے سر سے بلا اتارنی تھی سو اتار دی۔باقی پولیس والے جانیں اور ان کا کام۔“

”اچھا اب میں چلوں گی۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔”تو پھر شام کو آنا طے ہو گیا نا۔“

”ہم بھی چلتے ہیں آپ کو چھوڑنے کے لیے۔“ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔

”نہیں آپ تکلیف نہ کریں میں چلی جاؤں گی۔“ وہ رسمی تکلف سے بولی۔

”کوئی بات نہیں آپ ہماری مہمان ہیں۔“ امجد خلوص سے بولا۔

”شکریہ امجد ب ب سوری زبان پر چڑھ گیا ہے۔“ وہ بھائی کہتے کہتے رک گئی۔

''کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ اتر جائے گا۔'' امجد اطمینان سے بولا اور ہم سب ایک مرتبہ پھر ہنس پڑے۔

+ + +

شام کو سات بجے کے قریب رضیہ خود گاڑی لے کر ہمیں لینے پہنچ گئی۔ ہم دونوں نے طے کیا تھا کہ پارٹی کے ختم ہونے کے بعد انسپکٹر طاہر کی سرکوبی کے لیے اس کے کوارٹر کی طرف جائیں گے۔ دن کو رضیہ کو اس کے گھر چھوڑ کر ہم دونوں نے واپسی پر اس کے کوارٹر کی قراولی (دیکھ بھال) کر لی تھی۔ پارٹی اٹینڈ کرنے کے لیے میرا دل تو کسی خصوصی تیاری کا نہیں تھا، مگر امجد کے اصرار پر میں نے تھری پیس سوٹ پہن لیا تھا۔ میرے پاس چونکہ شیتل کے دیئے ہوئے تین چار سوٹ پڑے تھے۔ اس لیے ان میں سے ایک سوٹ میں نے امجد کے حوالے بھی کر دیا تھا۔ ہم دونوں کے قد وقامت میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا اس لیے وہ سوٹ امجد کو بھی بالکل فٹ ہی آیا تھا۔

''شکریہ کہ آپ لوگوں نے ہماری پارٹی کو رونق بخشنے کے لیے اتنا اہتمام کیا۔'' رضیہ نے ہمیں ستائشی نظروں سے گھورا۔

''یہ اہتمام صرف آپ کے لیے ہے۔ پارٹی وارٹی ہم نہیں جانتے ہیں۔'' امجد نے جواب دیا

''آپ دونوں میرے لیے تیار ہوئے ہیں؟''

''نہیں صرف امجد...... میں نے یہ اہتمام پارٹی کے لیے کیا ہے۔'' میرا لہجہ کافی خشک تھا۔

''چلیں۔'' میری بات سن کر وہ واپس مڑتے ہوئے مایوس لہجے میں بولی۔

''میں نے تو سوچا تھا صرف شیتل ہی بیوقوف تھی۔'' امجد آہستہ سے بڑبڑایا۔

''جتنی بھی ہوں گی شہلا سے کم ہی ہوں گی۔'' میں اسی کے انداز میں بولا۔

''ہونہہ!...... شہلا سے کم، وہ ڈاکٹر ہے جانو صاحب۔''

''مجھے کچھ کہا ہے۔'' کار کا دروازہ کھولتی رضیہ ہم سے مستفسر ہوئی۔

''نہیں ہماری آپس کی بات تھی۔'' میں پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوا بولا۔ امجد بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''اپنی کیا رضیہ جی!...... تمھاری تعریف کر رہا تھا کہ ان کپڑوں میں آپ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی ہیں۔''

''ہماری ایسی قسمت کہاں؟'' وہ کار آگے بڑھاتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ اس کی کار کے پیچھے اس کے محافظوں کی جیب بھی چل پڑی تھی۔

''اس کے موڈ پر نہ جائیں...... یہ پہلے پہل اس طرح بے نیازی دکھا کر لڑکیوں کو پھانستا ہے۔''

''لڑکیوں کو...... کیا مطلب؟ اس کے تعلقات کسی اور لڑکی سے بھی ہیں کیا؟''

''کئی لڑکیوں سے ہیں...... کئی لڑکیوں سے۔'' امجد جلدی سے بولا اور رضیہ بیک مرر میں تیکھی نگاہ سے میری جانب دیکھنے لگی مگر ناکافی روشنی کی وجہ سے وہ میرے تاثرات دیکھنے میں ناکام رہی تھی۔ میں ان کو باتیں کرتے چھوڑ کر آنکھیں بند کر کے سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

رضیہ کی نگاہیں اور رضیہ کا اندازِ گفتگو مجھے جو پیغام سنانا چاہ رہا تھا وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ مگر رضیہ جیسی لڑکی میری منزل نہیں ہو سکتی تھی سعدیہ کے بعد اگر میں کسی سے متاثر ہوا تھا تو وہ شیتل تھی، لیکن شیتل کا بھی میری زندگی میں آنا ناممکن لگتا تھا۔

''شاید اب تک اس نے شادی بھی کر لی ہو؟'' میرے ذہن میں سوچ کی ایک لہر اٹھی میرے لیے وہ کب تک انتظار کر سکتی تھی۔ انتظار بھی ایسا جو لاحاصل تھا۔ بہر حال میں نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے پیچھا چھڑایا۔ رضیہ، شیتل یا کوئی بھی ہوتی میری زندگی میں چودھری کی موت کے بعد ہی آ سکتی تھی۔

اس وقت گاڑی ان کی حویلی کے گیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ چوکیدار نے گاڑی پہچانتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ پوری حویلی رنگ برنگی روشنیوں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ حویلی کے وسیع صحن میں خوب صورت سا سٹیج بنایا گیا تھا۔ کار روک کر وہ نیچے اتری اور ہمیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے حویلی کے اندرونی جانب بڑھ گئی حالانکہ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے ایک علیحدہ نشست گاہ بنائی گئی تھی۔

وہ اس وقت جدید تراش خراش کی شلوار قمیص میں ملبوس تھی جس میں بدن کے نشیب و فراز چھپنے کی بجائے اجاگر ہو رہے تھے۔ میں نے اس کے چیخ چیخ کر اپنی طرف متوجہ کرتے نشیب و فراز سے نگاہیں چرا کر امجد کے جانب دیکھا، وہ بھی اس وقت اسی تگ و دو میں مصروف نظر آیا ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور بے ساختہ ہمارے ہونٹوں پر ہنسی دوڑ گئی۔

''لباس کو چھوڑو۔ کم بخت کے چلنے کا انداز ہی ایسا ہے کہ برقع میں بھی اپنی طرف متوجہ کر دے گا۔'' امجد آہستہ سے بولا اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کیا ہوا؟'' میری ہنسی سن کر وہ پیچھے دیکھنے لگی۔

''کچھ نہیں......'' امجد نے کہا اور وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ جدید انداز میں سجا ہوا ڈرائینگ روم عبور کر کے وہ ہمیں درمیانے سائز کے کمرے میں لے آئی جس کی دیواروں کے ساتھ مختلف انواع کی کتابوں کے خوب صورت شیلف رکھے ہوئے تھے کمرے کے درمیان میں ایک قیمتی صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا جو مطالعہ کرتے وقت بیٹھنے کے کام آتا تھا۔ میر نیاز خان اس وقت اسی صوفے پر بیٹھا مصروف مطالعہ نظر آیا۔

ہمیں دیکھتے ہی اس نے کتاب بند کر کے اپنے سامنے موجود ٹیبل پر رکھی اور ''خوش آمدید ویلکم، پخیر راغلے'' کہتا ہوا بازو پھیلائے اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں سے فرداً فرداً معانقہ کر کے اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''پلیز تشریف رکھیں اور گڑیا تم جا سکتی ہو۔''

رضیہ منہ بناتے ہوئے واپس مڑ گئی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی ہماری گفتگو سننے کی متمنی تھی مگر اپنے والد کے کہنے پر بادل نخواستہ اسے واپس جانا پڑا۔

''سب سے پہلے تو میں کل والے واقعے پر معذرت کرنا چاہوں گا۔'' رضیہ کے کمرے سے نکلتے ہی بیٹھتا ہوا بولا۔ ''آج کل کے بچے ضد میں آ کر عموماً والدین کے لیے لاینحل مسائل کا باعث بنتے ہیں، بہر حال وہ مسئلہ آپ دونوں کی سمجھداری کی وجہ سے خوش اسلوبی سے

طے ہو گیا۔ میرا خیال ہے آپ لوگوں نے بھی اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنالیا ہو گا۔"

"نہیں جناب ایسی کوئی بات نہیں۔ رات گئی بات گئی...... اور ویسے بھی آپ ہمارے بزرگوں کی عمر کے ہیں آپ ہم سے معذرت نہ کریں۔ آپ کو اپنے بچوں کی غلطی کا احساس ہے اتنا ہی ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔" امجد حیرت انگیز شرافت سے بولا۔

"تھینک یو مسٹر امجد...... دوسرا آپ دونوں نے میری آج کی چھوٹی سی تقریب میں آنے کی زحمت کی اس کے لیے بھی میں دونوں کا مشکور ہوں۔" جواباً ہم دونوں سر ہلا کر رہ گئے۔

"مسٹر عمر جان یہ تو تھیں رسمی باتیں، اب آتے ہیں اصل گفتگو کی طرف...... آپ کے اور میرے درمیان چند غلط فہمیوں کے باعث حالات بگڑتے بگڑتے رہ گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم نادانستگی میں ایک دوسرے کے دشمن نہیں بن گئے ورنہ دونوں اطراف ناقابل تلافی نقصان ہونے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایک دوسرے کا جانی دشمن ہونے سے بچالیا، علاوہ ازیں آپ کے گھر والوں کے ساتھ چودھری اکبر نے بہت ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کیا ہے اور ایسا کام چودھری جیسا گھٹیا اور بزدل شخص ہی کر سکتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں اس کے ساتھ رشتہ بھی جوڑنے والا تھا یہاں تک کہ گڑیا کے ساتھ اس کی منگنی بھی کر دی تھی مگر بعد میں اس کے متعلق تفصیلات جان کر میں اس کام سے باز آ گیا۔" وہ ایک لمحہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔ "مجھے دراصل اس علاقے میں ایک بزنس پارٹنر کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے لیے میں نے چودھری اکبر سے بھی تعلقات بڑھائے تھے مگر وہ میرے کام کا نہ نکلا۔ اب اس کم عمری میں بھی آپ کی سمجھ بوجھ دیکھتے ہوئے میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ کاروبار میں شمولیت اختیار کرلیں۔ جہاں تک تعلق ہے چودھری اکبر سے بدلہ لینے کا تو وہ میں اپنے ذمہ لے لیتا ہوں۔"

"ملک صاحب۔" میں کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "اس اعتماد اور بھروسے کا شکریہ، لیکن اس ساری گفتگو کے دوران آپ ایک کام کی بات یاد نہ رکھ سکے اور وہ یہ کہ میں گنڈہ پور ہوں۔ آپ بھی گنڈہ پور ہیں اور گنڈہ پوروں کی اچھی بری تمام قدروں سے واقف ہوں گے۔ چودھری اکبر میرا دشمن ہے اس سے بدلہ لینے کی اجازت میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں دے سکتا۔ باقی رہی آپ کی کاروبار کے متعلق آفر تو اس کے بارے میں سوچوں گا مگر...... چودھری کی موت کے بعد...... میں معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کی اتنی شاندار آفر کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ بہر حال میری طرف سے کھلا انکار بھی مت سمجھو اپنے ضروری کام جو کہ چودھری کی عبرت ناک موت ہے سے فارغ ہو کر میں ضرور آپ کو کوئی مناسب جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں گا۔"

"کوئی بات نہیں مسٹر عمر جان۔" اس نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔ "میری بات کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ آپ ابھی ہاں کر دیں گھر جا کر سوچیں اپنے دوست امجد سے مشورہ کریں...... بہر حال اب اٹھیں اور چلیں تا کہ باقی مہمانوں کو بھی کمپنی دے سکیں اور کچھ ٹھنڈا گرم بھی پی لیں۔"

ہم دونوں اس کے ساتھ لائبریری سے باہر آ گئے۔ رضیہ ڈرائینگ روم میں ہماری منتظر تھی ہمیں دیکھتے ہی وہ چیل کی طرح جھپٹی۔

''ڈیڈ میں انھیں اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں۔''

''اگر تھوڑی دیر میرے ساتھ رہیں تو......؟''

''اتنی دیر سے تو آپ کے ساتھ ہیں۔'' اس نے منہ بنایا۔

''ٹھیک ہے بھئی......اب آپ نوجوانوں نے ہم بوڑھوں کو کہاں خاطر میں لانا ہے۔''

''تھینک یو ڈیڈی۔'' وہ خوشی سے چہکی اور میر نیاز سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

''آئیں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔'' باپ کے جاتے ہی وہ ہم سے مخاطب ہوئی اور ہم اس کے ساتھ بلکہ پیچھے پیچھے چل پڑے۔ حویلی دکھا کر شاید وہ اپنی امارت سے متاثر کرنا چاہ رہی تھی بہر حال ہم نے بھی اسے مایوس نہیں کیا اور خوشدلی سے اس کے ساتھ گھومتے رہے۔ تمام حویلی گھمانے کے بعد وہ ہمیں اپنے وسیع اور پُرتعیش بیڈروم میں لے آئی۔

''بیٹھیں۔'' اس نے اپنے جہازی سائز بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیسا لگا میرا چھوٹا سا گھر۔''

امجد نے کہا۔ ''گھر تو بہت اچھا ہے مگر ایک چیز کی کمی ہے۔''

''کس چیز کی؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''کھانے پینے کی اشیاء کی......صبح سے بھوکے پیاسے آپ کی دعوت کے منتظر تھے۔ آپ نے بھی شاید حویلی دکھانے کی دعوت دی تھی۔''

''اوہ......سوری۔'' وہ نادم ہوگئی۔ ''مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ چلیں شاید باہر کھانا شروع بھی ہو چکا ہو۔'' اور ہم اندرونی حویلی سے باہر نکل آئے۔ تمام لوگ اس وقت کھانے کی پُرتکلف سجی ہوئی ٹیبلوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ کھانے کے دوران رضیہ مسلسل میرے ساتھ چمٹی رہی اور کھانے کی مختلف ڈشیں اٹھا اٹھا کر میرے آگے دھرتی رہی۔ گل ریز بھی ایک دو دفعہ نظر آیا مگر نگاہیں چرا کر سائیڈ پر نکل گیا۔ کھانے کے بعد ناچ گانے کا بھی پروگرام تھا۔ مہمان سٹیج کے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ کچھ چہل قدمی کرنے لگے۔

''مس رضیہ اب اگر ہمیں اجازت دیں۔''

''کس بات کی۔'' اس نے مجھے گھورا۔

''واپسی کی۔''

''کوئی واپسی نہیں ہوگی۔ آج تم نے میرے ساتھ ہی رہنا ہے......اور ہاں اگر پینے پلانے کا شوق رکھتے ہو تو اس کا بھی بندوبست ہے۔ اس کے علاوہ ناچنے گانے والیاں بھی آئی ہوئی ہیں پروگرام کے خاتمے پر اپنی پسند کے ساتھ بقیہ رات گزار سکتے ہو۔''

''شٹ اپ مس رضیہ۔'' اس کی گھٹیا گفتگو سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔ ''تم نے ہمیں اتنا سستا سمجھ رکھا ہے۔ چلو امجد چلتے ہیں۔'' میں نے امجد کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں میر نیاز خان سے اجازت لیے بغیر بیرونی گیٹ کی طرف چل پڑے۔ میری جھڑک سن کر وہ ہکا بکا اپنی جگہ

ساکن ہوگئی تھی۔ ہم اس وقت باقی لوگوں سے سائیڈ پر تھے اس لیے کوئی ہماری تلخ گفتگو نہیں سن سکا تھا۔ گیٹ پر کھڑے محافظوں نے ہم سے کوئی تعرض نہ کیا۔

''بس اب غصہ تھوک دو'' ہم جیسے ہی گیٹ سے نکلے امجد مسکرا کر بولا۔''اس غریب نے اپنی ہائی سوسائٹی سے متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں ویسے ہی ان لوگوں سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا خواہ مخواہ گلے پڑ رہی تھی۔ اور اس کا باپ بھی اپنے ناجائز کاروبار میں ہماری شراکت کا متمنی ہے۔ دماغ خراب ہوا ہے سالے کا۔''

''سالے کا نہیں...... سسر کا بولو'' امجد نے قہقہہ لگایا اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ ہم حویلی سے نکل کر تھوڑی دور ہی آئے ہوں گے کہ اچانک حویلی سے ایک کار نکل کر آندھی وطوفان کی طرح ہماری طرف بڑھی ہمارے قریب آتے ہی کار رک گئی اس سے برآمد ہونے والا چہرہ رضیہ کا تھا۔

وہ بجھے چہرے کے ساتھ ہمارے قریب آ کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی......

''سوری جان...... مم...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہی تھی۔''

''آئندہ ایسا گھٹیا مذاق کم از کم میرے ساتھ نہیں کرنا۔''

''میری توبہ''۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔''امجد صاحب آپ بھی میری سفارش کریں نا۔''

''کوئی بات نہیں مس رضیہ جانو خفا نہیں ہے بس وقتی اشتعال ہے کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کل تک ٹھیک ہو جائے گا'' اس نے سر جھٹکا۔''کل تک پتا نہیں ہے مجھ پہ کیا گزرے گی۔''

''یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہئے تھا'' میری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح خفا ہو کر ہماری جان چھوڑے مگر یہ میری خام خیالی تھی کہ وہ واپس چلی جائے گی۔

''تو بابا سوری کر تو دیا ہے اور کیا پاؤں پڑ جاؤں، یہ لو یوں بھی کر لیتی ہوں'' وہ نیچے کی طرف جھکی مگر میں جلدی سے پیچھے ہو گیا......

''کیا کر رہی ہو بیوقوف؟''

''وہی جو آپ چاہتے ہیں'' وہ افسردگی سے بولی۔

''اچھا آئندہ خیال رکھنا......اور اب ہمیں جانے دو پھر کہیں ملاقات ہو گی'' میں اس سے جان چھڑانی چاہی۔

''شکر ہے خدا کا آپ راضی ہو گئے'' وہ کھل اٹھی۔''چلو بیٹھو گاڑی میں میں آپ کو چھوڑ آتی ہوں۔''

''شکریہ ہم چلے جائیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ ابھی تک ناراض ہیں۔''

''چلو بیٹھو یار۔اس نے ایسے جان نہیں چھوڑنی۔''میں کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''یہ تو آپ نے بالکل صحیح کہا۔''وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

راستے میں بھی اس کی زبان نان سٹاپ چلتی رہی یہاں تک کہ ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔اس نے ہمیں ''خدا حافظ'' کہتے ہوئے گاڑی واپسی کے لیے موڑی۔

''باڈی گارڈ ساتھ نہیں ہیں احتیاط سے جانا۔''امجد نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے اپنی کار آگے بڑھا دی۔

''اب کیا ارادہ ہے؟''

''لباس بدل کر چلتے ہیں......کوارٹر کے باہر ہی اس کمینے کا انتظار کریں گے۔''

اور امجد ''ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہم کپڑے بدل کر منہ پر مفلر لپیٹے انسپکٹر طاہر کے کوارٹر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے،اس کا کوارٹر تھانے کے قریب ہی تھا۔وہ شادی شدہ تھا اور اپنے بیوی بچے اس نے شہر کے اندر ایک شاندار کوٹھی میں رکھے ہوئے تھے۔وہ ہمیشہ جمعہ کے دن پچھلے ٹائم گھر جاتا،ہفتہ اتوار گھر میں گزار کر وہ سوموار کی صبح واپس آجاتا تھا۔البتہ اس دوران،کوئی خاص مسئلہ درپیش ہو جاتا تو تھانے والے اس کے پیچھے فون کر دیتے تھے جس کی بنا پر وہ فی الفور واپس پہنچ جاتا تھا۔ہفتے کے باقی ایام وہ اپنے کوارٹر ہی میں گزارتا تھا۔رشوت خور ہونے کے علاوہ وہ شراب نوش اور دوسرے بہت سے غلط کاموں میں بھی ملوث تھا۔اس کے متعلق یہ ساری معلومات مجھے نذر گل سے معلوم ہوئی تھیں جو اس کے کوارٹر تک جاتے ہوئے میں نے امجد کے گوش گزار کر دی تھیں۔

وہ نام کا کوارٹر تھا،اسے اچھا بھلا مکان کہا جا سکتا تھا۔وہ آسانی سے بیوی بچوں کو ساتھ رکھ سکتا تھا،مگر اس طرح شاید اس کی بہت سی عیاشیوں پر پابندی لگ جاتی اس لیے اس نے انھیں بچوں کی اچھی تربیت کا جھانسہ دے کر شہر رکھ چھوڑا تھا۔

کوارٹر کے بیرونی دروازے کے باہر پولیس کا ایک سپاہی کرسی پر بیٹھا بڑی بے دلی سے ڈیوٹی دے رہا تھا۔

''یار اس مصیبت کا بھی کچھ کرنا پڑے گا۔''امجد کا اشارہ سنتری کی طرف تھا۔

''اس کو بیٹھا رہنے دو ہم نے کون سا سامنے سے کوارٹر میں داخل ہونا ہے؟......اور ویسے بھی جتنی مستعدی سے یہ ڈیوٹی دے رہا ہے اس کے لیے کوئی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔''

ہم دونوں چکر کاٹ کر کوارٹر کے پیچھے پہنچے،بیرونی دیواروں کی بلندی سات فٹ کے قریب تھی جس کو پھلانگنا ہمارے لیے چنداں دشوار نہیں تھا۔

دیوار پھلانگ کر ہم اندر داخل ہوئے اور چند منٹوں میں پورا کوارٹر گھوم گئے مگر کوارٹر میں ہمیں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔کوارٹر چار

چھوٹے کمروں، کچن اور باتھ روم پر مشتمل تھا۔ کمروں کے سامنے ایک برآمدہ بھی بنایا گیا تھا۔ برآمدے کے ساتھ لگی بانس کی بنی ہوئی سیڑھی دیکھ کر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے جانب دیکھا، دونوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا اور ہم نے بغیر بات چیت کیے وہ سیڑھی اٹھائی اور کمروں کے پچھواڑے وہ سیڑھی لگا کر کوارٹر کی چھت پر چڑھ گئے۔ وہاں سے علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر ڈیوٹی پر موجود سپاہی آڑ میں ہونے کی وجہ سے ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ ہم دونوں اوندھے منہ چھت پر لیٹ کر اس کے آنے کی سمت چشم براہ ہو گئے۔ سیڑھی ہم نے پچھواڑے ہی رہنے دی تھی کیونکہ اتنی چھوٹی سی بات تھانیدار کے ذہن میں شک پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

”وہ کمینہ رات گزارنے کے لیے ادھر ہی نہ رہ جائے۔“ امجد نے تشویش ظاہر کی۔ ”وہ الو کی پٹھی رضیہ جس چیز کی دعوت ہمیں دے رہی تھی، وہی آفر اس بے غیرت کے لیے بھی تو ہوگی“۔ میں بغیر بحث کیے اس کی بات سے متفق ہو گیا۔ اگر تھانیدار نہ آتا تو ہماری محنت یونہی اکارت جاتی۔ مگر شاید تھانیدار کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں کہ اسی وقت مجھے تھانے کے جانب سے اس مکان تک بنے ہوئے ٹریک پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائیٹس نظر آئیں وہ گاڑی لامحالہ تھانیدار کی ہی تھی۔ امجد نے بھی گاڑی پر شست جمائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

+ + +

گاڑی ابھی تک کچھ فاصلے پر تھی کہ گیٹ پر بیٹھے سنتری نے دروازہ کھول دیا اور تھانیدار اپنی کار اندر لے آیا۔ وہ گہرے سرخ رنگ کی سوزکی کار تھی جو بلاشبہ اس نے اپنی حرام کی کمائی سے خریدی تھی۔ ایک تھانیدار کی اتنی حیثیت کہاں ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے کار خرید سکے بلکہ صرف تنخواہ پر گزارہ کرنے والا تھانیدار تو بمشکل ہی اپنے بچوں کو دو وقت کی روکھی سوکھی کھلا سکتا ہے۔ کجا کار اور بنگلے کا مالک ہونا، بہر حال یہ پاکستان ہے اور یہاں تو ٹریفک کانسٹیبل بھی گاڑیوں بنگلوں کے مالک ہیں وہ تو پھر بھی تھانیدار تھا۔

کار روک کر وہ باہر نکلا اور کار کا دروازہ جھٹکے سے بند کرتے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے کے جانب بڑھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے تحاشا پیئے ہوئے ہے۔

سنتری کے گیٹ بند کرتے ہی ہم کھسکتے ہوئے سیڑھی کے پاس پہنچے اور احتیاط سے نیچے اتر آئے۔ وہاں سے دبے قدم چلتے ہوئے ہم کوارٹر کے سامنے آ گئے مگر تمام کمروں میں چھائے ہوئے اندھیرے سے مجھے پتا نہ چل سکا کہ وہ کس کمرے میں ہوگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے امجد کے جانب دیکھا۔

”جس کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا، اسی میں ہوگا۔“ امجد نے میرے کان میں سرگوشی کی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی سامنے کی بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

صحن میں جلتے بلب کی وجہ سے برآمدے میں ملگجی سی روشنی چھائی ہوئی تھی اور اس روشنی میں دائیں طرف سے دوسرے کمرے کا ایک پٹ ہمیں کھلا نظر آ رہا تھا۔

''تم یہیں ٹھہرو میں اسے لے آتا ہوں۔'' چونکہ ہم نے طے کیا تھا کہ اسے ساتھ لے کر جائیں گے اس لیے میں امجد سے وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر دبے قدموں اندر کے جانب بڑھا۔ پستول جیب سے نکال کر میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

کمرے کے اندر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا میں بند پٹ کو چھیڑے بغیر اندر داخل ہوا اور اندر داخل ہو کر اپنی آنکھوں کو اندھیرے کا عادی کرنے لگا۔ کمرے میں دائیں جانب مجھے اس کی بوجھل سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز اس بات کا مظہر تھی کہ وہ سو گیا تھا، میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر جلائی تو وہ مجھے چارپائی پر اوندھا پڑا نظر آیا، کمرے میں اچھی خاصی گرمی تھی مگر وہ پنکھا چلائے بغیر لیٹا ہوا تھا اور ایسا شاید اس وجہ سے تھا کہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے اسے پنکھا چلانے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اس مرتبہ میں بے دھڑک اس کی جانب بڑھا، پستول جیب میں ڈال کر میں نے ٹارچ منہ میں پکڑی دونوں ہاتھوں سے اس کا سر پکڑ کر اس کی کنپٹیوں پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا اور اس کی نیند کو بے ہوشی میں بدل دیا۔ اب کم از کم وہ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا تک ہوش میں نہیں آسکتا تھا۔ اسے کندھے پہ اٹھا کر میں کمرے سے باہر آگیا۔ امجد چوکنے انداز میں برآمدے کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

وہاں سے ہم دونوں کوارٹر کے پچھواڑے میں آئے۔ امجد کلاشن کوف کندھے سے لٹکا کر دیوار پر چڑھ گیا اور اپنی ٹانگیں دیوار کے دائیں بائیں لٹکا کر مضبوطی سے بیٹھ گیا، اس کے بیٹھتے ہی میں دیوار کے قریب ہوا، اس نے تھانیدار کے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر کھینچا، نیچے سے اسے میں نے دھکیلا اور تھانیدار کو ہم نے اوندھے منہ دیوار پر لٹا دیا۔

پھر میں دیوار پھلانگ کر باہر نکلا اور تھانیدار کو کاندھے پر لاد کر چل پڑا، تھانیدار کے کوارٹر کے نزدیک کوئی مکان نہیں تھا، ویسے بھی یہ کوارٹر تقریباً تھانے کی حدود میں ہی آرہا تھا، البتہ اس کوارٹر سے ڈیڑھ، دو سو گز پیچھے چند مکانات بنے ہوئے تھے ہم دونوں ان مکانات کو بائی پاس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے، سو دو سو قدم چلنے کے بعد اس دو من کی بوری کو امجد نے سنبھال لیا، امجد کا بازو اب بھی مکمل ٹھیک نہیں ہوا تھا لیکن جس طریقے سے ہم اسے اٹھا رہے تھے اس اٹھانے میں سارا وزن کندھوں پر پڑتا ہے۔

اسے اٹھا کر چند قدم چلتے ہی امجد بولا۔ ''جانو میاں!...... غلطی ہوگئی ہے، کسی سواری کا بندوبست کر کے آنا تھا۔''

''بڑی جلدی خیال آیا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ یہ ہڈ حرام اتنا وزنی ہوگا۔'' اس کی سانسیں چڑھ گئی تھیں۔

''دو من کی تو صرف اس کی توند ہے۔ دیکھتے نہیں کیسے الٹی دیگ کی طرح اٹھی ہوئی ہے۔''

''ہاں عورت ہوتی تو نویں مہینے کی حمل والی لگتی۔'' اس کی بات سن کر میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

ہم باری باری اسے اٹھا کر ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے۔ گھنٹے، پون گھنٹے بعد برساتی نالے میں پہنچ گئے۔ ایک قدرتی گہرے کھڈے کے پاس ہم نے اسے زمین پر پھینک دیا۔

''اس کے ہاتھ باندھ دو۔'' میں نے امجد سے کہا اور اس نے سر ہلا کر اس کی پینٹ سے بیلٹ نکال کر اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیئے۔

''اب اسے ہوش میں لانا ہے۔''

''یہ کون سا مشکل ہے...... یہ لو۔'' امجد نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی چند تھپڑوں میں ہی اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''کک...... کون...... کک...... کیا ہے؟'' اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔ ایک نشہ اور دوسرا بے ہوشی نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''انسپکٹر طاہر ہوش میں آؤ۔ تمھارا آخری وقت آ گیا ہے۔'' امجد اسے ایک اور زوردار تھپڑ سے نوازتے ہوئے بولا۔

''تت تم کون ہو۔ کک کیوں مار رہے ہو مجھے؟'' وہ لڑکھڑاتی زبان میں مستفسر ہوا اس دفعہ میرے پاؤں کی ٹھوکر پوری قوت سے اس کے ماتھے پر لگی اور اس کا سر بڑی زور سے کچی زمین سے ٹکرایا۔

''تھانیدار...... میں عمر جان ہوں...... پہچانا۔'' میرے لہجے میں کوٹ کوٹ کر وحشت بھری ہوئی تھی۔ زوردار چوٹ کھاتے ہی اس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

''مسٹر عمر جان!...... تت تم ایک سرکاری اہلکار پر ہاتھ اٹھانے کے مرتکب ہو رہے ہو۔''

''یہ ہاتھ نہیں لات ہے۔'' میں اسے ایک اور ٹھوکر رسید کی۔

''تم اچھا نہیں کر رہے؟''

''تم نے اچھا کیا تھا؟''

''وہ میری مجبوری تھی۔ پولیس ہر ملزم سے اسی طرح تفتیش کرتی ہے۔ تمھاری ضمانت ہونے کے بعد تجھے کچھ کہا ہو تو بتاؤ۔''

''بے غیرت انسان، یہ مجھے ٹارچر کرنے کا صلہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ ''یہ میرے گھر والوں کو زندہ جلانے کا بدلہ ہے۔''

''مم...... مگر انھیں میں نے تو نہیں جلایا تھا۔'' وہ تھوک نگلتا ہوا بولا۔

''تیرے کرم فرما چودھری اکبر کا کام تھا، لیکن تُو اس کے ساتھ شامل تھا۔ یاد کر تُو نے اور چودھری نے ہی شمشاد خاتون کو بلا کر اس کام پر راضی کیا تھا تا کہ میرے گھر والوں کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملائے۔''

''وہ...... وہ، جھوٹ بولتی ہے۔''

''جھوٹ تم بول رہے ہو۔'' اس مرتبہ امجد کا بھرپور مکہ اس کے جبڑے پر لگا اور وہ ''ہائے'' کی آواز کے ساتھ ایک مرتبہ پھر زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔

''اٹھو...... اٹھ کر بیٹھو۔'' میں نے اسے لمبا لیٹتے دیکھ کر اس کے پہلو میں ٹھوکر رسید کی، مگر ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے اس سے اٹھ

کر نہ بیٹھا گیا۔ امجد نے گریبان سے پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔

وہ خون تھوک کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”عمر جان، مم مجھے پتا نہیں تھا کہ اکبر خان ایسا کام کرے گا۔“

”مگر جب اس نے ایسا کام کر دیا پھر تُو نے اس کے خلاف کون سا ایکشن لیا؟“

”مم...... مجھے معاف کر دو عمر جان۔ مم...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ اس مرتبہ وہ کوئی دلیل دینے کی بجائے گڑگڑایا۔

”یہ بات تجھے نہیں چھڑا سکتی طاہر خان، خود تُو نے بھی دوسروں کے چھوٹے بچوں پر رحم نہیں کھایا۔ میں اگر چاہوں بھی تو تجھے معاف نہیں کر سکتا، میرے ماں باپ، بیوی بچے بھائی۔ سب کے سب چودھری اکبر اور تیرے ظلم کی نذر ہو گئے۔“ غم و غصے کی شدت سے پھٹ سے مجھ سے بولا نہ گیا۔ ”تم لوگوں کو ننھے عدنان پر بھی رحم نہیں آیا۔ گڑیا سی فوزیہ، سلمیٰ اور بدر کو بھی تم لوگوں نے نہ بخشا، ظالم انسان تیرے مظالم کی فہرست بہت لمبی ہے۔ میں بھی بدلے میں تیرے بیوی بچوں کو آگ میں جلا سکتا تھا تا کہ تجھے پتا چلتا کہ دکھ کیا ہوتا ہے مگر افسوس میں ظلم نہیں کر سکتا وہ بے قصور ہیں البتہ تجھے عبرت ناک انجام سے دوچار کر سکتا ہوں اور ایسا ضرور کروں گا۔“

”مم...... مجھے معاف کر دے عمر جان۔ مم مجھ سے خون بہا لے لے۔ میں......“ وہ مسلسل گڑگڑانے لگا مگر اس کی ڈائیلاگ بازی پر کان دھرے بغیر میں امجد سے مخاطب ہوا۔

”امجد اس کی جیبوں کی تلاشی لو اگر کوئی شناختی چیز ملے تو نکال لو۔“

”امجد نے اس کی تلاشی لے کر اس کی جیبیں خالی کر دیں، یہاں تک کہ اس کی گھڑی بھی اتار لی۔

”ایک گولی دائیں اور دوسری بائیں گھٹنے میں۔“ میں نے کہا اور اگلے لمحے کلاشن کوف دو مرتبہ گرجی، تھانیدار چیختے ہوئے اپنی جگہ پر تڑپنے لگا۔

”اسے گڑھے میں دھکیل دو۔“ اس کی چیخوں کا میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اس وقت میری نظروں میں اپنے پیاروں کی شکلیں گھوم رہی تھیں۔ امجد نے اسے ٹھوکر لگا کر گڑھے میں دھکیل دیا۔

”اب اسے زندہ دفنانا ہے۔“ میرے لہجے میں وحشت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”نن...... نہیں...... خدا کے لیے۔ عمر جان رحم کرو۔“ طاہر خان چیخنا بھول گیا تھا۔

”عمر جان صرف ایک بار، معاف کر دو ایک بار، میرے باپ کی توبہ اگر تم مجھے دوبارہ غلط کام کرتے دیکھو۔“

”یہ میرے بس سے باہر ہے طاہر خان...... معافی مانگنی ہے تو میرے باپ سے مانگو۔ اگر وہ معاف کر دے تو میں بھی چھوڑ دوں گا، کیونکہ اس سے پوچھے بغیر میں کوئی کام نہیں کرتا، بڑوں سے تو پوچھنا چاہیے نا۔ میں تو ویسے ہی اس سے بہت ڈرتا ہوں۔ حالانکہ وہ مجھے مارتا نہیں ہے نہ ہی ڈانٹتا ہے پھر بھی ڈرتا ہوں۔“ ابو جان کو یاد کر کے میرے حلق میں عجیب سی تلخی گھل گئی اور آنکھوں سے پانی کا سیلاب بہنے لگا۔

”امی جان بھی کہتی ہیں کہ کسی سے نہ لڑوں، جھگڑوں اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے تب بھی خاموش رہوں معاف کرنا سیکھوں مگر اب وہ بھی چپ ہے

طاہر خان! مجھے روکنے ٹوکنے والے سارے چلے گئے اب میں بے مہار ہو گیا ہوں۔ اب کوئی مرے کوئی جیئے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا......کوئی فرق نہیں پڑتا۔‘‘

’’جانو بہت ہو چکا۔ آؤ اپنا کام کریں۔‘‘ امجد نے مجھے بازو سے پکڑ کر آہستہ سے کہا اور میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم نے گڑھے کے دائیں بائیں پڑے مٹی کے ڈھیلے، پتھر اور خشک مٹی سے گڑھے کو بھرنا شروع کر دیا۔ تھانیدار کبھی رونے لگتا، کبھی چیخنے لگتا اور کبھی گڑگڑا کر معافی مانگنے لگتا، مگر اس کے بعد ہم خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ جلد ہی وہ مٹی اور ڈھیلوں کے ڈھیر میں چھپ گیا۔ اس کا تڑپنا مچلنا بیکار گیا۔ گھنٹے ڈیڑھ کی مشقت کے بعد ہم نے وہ گڑھا بالکل پاٹ دیا۔ اس دوران اس کا خون گرنے والی جگہ کو بھی ہم نے بوٹوں اور نوکیلے پتھروں سے کھرچ کھرچ کر صاف کر دیا تھا۔

رات کا اندھیرا ختم ہو کر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بدل گیا تھا جب ہم اس کام سے فارغ ہوئے گڑھے کے اوپر اور دائیں بائیں ہم نے خشک ٹہنیاں اس انداز میں بکھیر دیں تھیں کہ غور سے دیکھنے پر بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہاں پر کوئی دفن ہے، ویسے بھی وہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر تھی۔

کام ختم کر کے ہم بغیر آپس میں کچھ بولے واپس چل پڑے اور سورج نکلتے نکلتے واپس گھر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے تھانیدار کا سامان بمعہ نقدی کے میں نے لیٹرین کے گڑھے میں پھینک دیا۔ (چونکہ ہمارے دیہاتوں میں پانی کی نکاسی کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا، اس لیے ہمارے علاقے میں چار پانچ فٹ چوڑا اور تیس پینتیس فٹ گہرا کھڈا کھود کر اسے سیمنٹ کی ایک سلیب رکھ کر ڈھانپ دیتے ہیں اور اس سلیب میں بطور کموڈ پانچ چھ انچ لمبا چوڑا سوراخ بنا ہوتا ہے۔ جسے ہم بطور ٹائیلٹ استعمال کرتے ہیں) اس کے بعد نہا کر ہم دونوں سو گئے۔

میری آنکھ گیارہ بجے کے قریب کھلی، امجد ابھی تک سویا ہوا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے ناشتا تیار کیا۔ اس وقت تک امجد جاگ گیا تھا۔ دو دو پراٹھے انڈوں کے آملیٹ کے ساتھ معدے میں اتارنے کے بعد ہم ملک پیک سے تیار کی ہوئی چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

’’اب کیا ارادہ ہے ملک صاحب۔‘‘ امجد چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

’’منشی جی اب چلیں گے شہر اور چچا فاضل سے مل کر اسے تمام تفصیل بتا کر مشورہ لیں گے۔‘‘

’’ہاں اس بہانے میں اپنا بازو بھی ڈاکٹر شہلا کو دکھلا دوں گا۔‘‘ امجد جلدی سے بولا، اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

’’چلو اسی طرح کر لیں گے۔ اب اٹھو تاکہ چلیں۔‘‘

+ + +

’’سب سے پہلے تو تم اس طرح کرو کہ کراچی جا کر جمیلہ بٹی اور اسلم کو واپس لے آؤ۔‘‘

ساری کہانی سن کر چچا فاضل نے مشورہ دیا۔ ’’اس کے بعد لازمی بات ہے تم دونوں کو بنفس نفیس میران شاہ جا کر چودھری کی تلاش کا آغاز کرنا پڑے گا۔ تمھیں وہاں کتنا عرصہ گزارنا پڑے گا یہ تمھاری اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔‘‘

’’باجی وہیں ٹھیک ہیں نا۔ امجد کے گھر۔ وہاں ان کا علاج بھی تو ہو رہا ہے۔‘‘

''نہیں۔'' چچا فاضل انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''اس کا علاج یہاں پر بھی ہو سکتا ہے اور اب میں نے بھی تمھارے کراچی سے واپس آتے ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہونا ہے۔ میرا باقی علاج گھر پر ہی ہوتا رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب بھی مجھے یہی مشورہ دے رہے تھے۔اس کے علاوہ ادھر کسی بندے کو زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی رہنا پڑے گا اور یہ کام اسلم ہی اچھے طریقے سے کر سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے کل صبح ہم کراچی روانہ ہوں گے......ان شاء اللہ۔''

''ان شاء اللہ۔'' چچا اور امجد بھی بیک زبان بولے۔

''ویسے چچا آپ نے میران شاہ دیکھا ہوا ہے؟''امجد مستفسر ہوا۔

''بہت اچھی طرح پتر!'' چچا کا لہجہ شفقت بھرا تھا۔

''کیسا علاقہ ہے ؟ وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟...... مجھے تو بس اتنا پتا ہے بنوں کے ساتھ واقع ہے اور پٹھانوں کا علاقہ ہے۔اس کے علاوہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔''

''تو یہ تھوڑا ہے کیا؟'' چچا فاضل ہنستے۔''باقی معلومات وہاں جا کر حاصل کر لینا۔''

''پھر بھی کچھ پتا تو چلے؟''

''میران شاہ بنوں سے تقریباً 65 سے 70 کلو میٹر دور مغرب کی سمت شمالی وزیرستان میں واقع ہے۔اس علاقے میں جرگہ سسٹم رائج ہے، آپس کے جھگڑے اور مختلف قسم کے مسائل میں علاقے کے سرکردہ افراد کا جرگہ ہی عدالت کا کام کرتا ہے۔ ہماری زبان میں اس علاقے کو علاقہ غیر کہتے ہیں۔ اگر آپ اس روڈ پر سفر کریں تو بنوں سے قریباً 15 سے 20 کلو میٹر کے فاصلے پر بکا خیل آتا ہے اور یہیں سے علاقہ غیر کی حدود شروع ہو کر افغانستان کی سرحد تک چلی جاتی ہے۔ان علاقوں میں مسعود، بھٹنی، وزیر وغیرہ کے قبائل آباد ہیں۔ علاقے کی زیادہ تر آبادی ناخواندہ ہے بس اکا دکا پڑھے لکھے نظر آتے ہیں۔ مذہبی تعلیم کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا۔ ہر قسم کا نشہ اور اسلحہ اس علاقے میں کھلے عام دستیاب ہوتا ہے۔ اسلحے کے لیے بھی کسی قسم کے لائسنس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔تم دونوں فوجی ہو اور شاید یہ بات تمھارے لیے حیرانی کا باعث ہو کہ اس علاقے میں 12.7 ایم ایم، 40 ایم ایم یعنی راکٹ لانچر اور چھوٹی مارٹریں تک دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ پردے کا رواج، مہمان نوازی اور نماز کی پابندی اس علاقے کی اچھی قدریں ہیں۔ باقی چھوٹی چھوٹی باتوں پر قبائل کے قبائل ایک دوسرے کے خلاف میدان میں اتر آتے ہیں اور کئی کئی دن تک ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، اس علاقے میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ہتھیار روسی ساخت کی بنی ہوئی رائفل AK47 ہے جسے عرفِ عام میں کلاش کوف اور مشین گن کہا جاتا ہے۔ جبکہ فوج نے اس کو ایس ایم جی کا نام دیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایٹ ایم ایم، سیون ایم ایم، بارہ بور بندوق، تیس بور، بتیس بور پستول، ریوالور، وغیرہ بھی آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں اور تو اور HE-36 طرز کے ہینڈ گرینیڈ بھی مل جاتے ہیں۔'' چچا فاضل چونکہ خود آرمی سے حوالدار ریٹائر ہوا تھا اس لیے اسلحے کے بارے ان کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ اس کے علاوہ وزیرستان میں بھی ان کا کئی مرتبہ جانا ہوا تھا، اس لیے وہ

اس علاقے سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس وقت وہ بڑی تفصیل سے اس علاقے کے متعلق ضروری معلومات ہمیں مہیا کر رہے تھے۔

وہ ایک لمحہ سانس لینے کے لیے رکے اور پھر دوبارہ گویا ہوئے۔

''حکومت کے ساتھ ان علاقوں کا رابطہ بس پولیٹیکل ایجنٹ کی وساطت سے ہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت ان کے کسی کام میں دخیل نہیں ہوتی۔ البتہ سڑک بنانے اور بجلی کی ترسیل کے لیے کھمبے لگانے کا کام حکومت کی صوابدید پر ہے؟ میں آپ کو اپنے ایک دوست کا ایڈریس دوں گا جو میران شاہ میں رہتا ہے۔ شاید وہ آپ لوگوں کی کچھ مدد کر سکے۔''

''آپ تو اس علاقے کے متعلق کافی وسیع معلومات رکھتے ہیں چچا جان۔'' امجد تعریفی لہجے میں بولا۔

''ہاں پتر کافی مرتبہ اس علاقے میں جانا ہوا ہے نا اس لیے۔''

اس کے بعد ہم کافی دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ شام کے سائے گہرے ہونے لگے، اسی وقت ایک نرس کمرے میں آ کر چچا جان کو دوائی دے رہی تھی جب امجد نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''جانو!...... میں چلتا ہوں یار اب وہ آ گئی ہوگی، کافی دن ہو گئے ہیں اسے دیکھے ہوئے۔''

''تو روکا کس نے ہے۔'' میں نے اسے جھڑکا۔

اس نے چچا جان سے اجازت لی اور باہر نکل گیا جبکہ میں وہیں بیٹھا رہا۔ چچا جان سے ابو جان کی حیات میں بھی ہم تمام بھائی بہت زیادہ مانوس تھے اب تو ویسے بھی ان کے علاوہ میرا کوئی نہیں بچا تھا جس کی آغوش میں مَیں پناہ لیتا۔ ایک بہن تھی وہ بھی ذہنی طور پر ٹھیک نہیں تھی۔

''چچا آپ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کی بات کر رہے تھے...... لیکن میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔''

''تُو تو ہے ہی پگلا!'' وہ شفقت سے مسکرائے۔ ''مجھے یہاں بالکل آرام نہیں ہے۔ رحمٰن خیل کی آب و ہوا میرے لیے تریاق کا کام کرے گی دیکھنا کتنی جلدی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہوں۔ یہاں پر ڈاکٹروں نے وہیل چیئر پر بٹھا دینا ہے جسے دیکھ کر انسان میں ویسے ہی دم نہیں رہتا۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں...... مصنوعی پاؤں سے بندہ آسانی سے چل سکتا ہے؟'' میں ان کی گھٹنے سے نیچے کٹی ہوئی ٹانگ دیکھنے لگا۔

''یہ تو جس وقت زخم مندمل ہوگا اور ڈاکٹر اس کے ساتھ مصنوعی ٹانگ فٹ کریں گے تب پتا چلے گا، فی الحال تو ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ میں آسانی سے چل پھر سکوں گا، شروع کے دنوں میں بیساکھی کے سہارے اور بعد میں ان شاء اللہ دونوں ٹانگوں پر۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے بھی دعائیہ انداز میں کہا۔

+ + +

اگلے دن نو دس بجے کے قریب ہم دونوں کراچی روانہ ہو گئے۔ ہمارا ارادہ وہاں ایک دو دن گزار کر واپس آنے کا تھا۔ راستے میں بغیر کسی حادثے کے ہم کراچی پہنچ گئے۔

اسلم بھائی، ممانی، جمیلہ اور امجد کے گھر والے ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، جمیلہ کی حالت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ پہلے وہ ہر وقت گم صم سی حالت میں بیٹھی رہتی تھی مگر اب کبھی کبھار ہی اسے یہ دورہ پڑتا تھا۔ خوش قسمتی سے جس وقت ہم وہاں پہنچے۔ وہ اس وقت ٹھیک حالت میں بیٹھی تھی اور مجھے دیکھتے ہی......

''عمر میرا ویر'' کہہ کر روتے ہوئے مجھے لپٹ گئی، میں بھی کوشش کے باوجود اپنے آنسو کنٹرول نہ کر سکا تھا۔

ممانی جان اور امجد کی امی بھی ہمیں دیکھ کر رونے لگ گئیں تھیں، سچ کہتے ہیں کہ......

''جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن ان کی یادیں پیچھے والوں کے لیے سوہانِ روح بنی رہتی ہیں اور ہر خوشی وغمی کے موقع پر اپنی کمی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔''

''عمر امی چلی گئیں، ابو جان بھی چلے گئے، لالہ حاکم بھی چلا گیا۔ سب چلے گئے۔ سب ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ کبھی نہ آنے کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روٹھ گئے ہم سے۔ ہائے میری پیاری امی......تم کہاں جا چھپی ہو۔'' اس نے بَین کرنے کے انداز میں امی ابو کو آوازیں دینی شروع کر دیں اور پھر یکدم بے ہوش ہو کر میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر اندر کمرے میں لے جا کے بستر پر لٹا دیا۔ مجھے پتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ کر وہ نارمل ہو جائے گی۔

ہم سارے صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ امجد جو جمیلہ کے پردہ دار ہونے کی وجہ سے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا وہ بھی اندر سے نکل کر ہمارے ساتھ آ بیٹھا۔ امجد کے گھر والے سنٹرل کراچی میں چھ مرلے کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھے مکان گو چھوٹا تھا مگر گھر والوں کے دل وسیع تھے۔ امجد کے امی ابو بہت سادہ دل اور محبت کرنے والے تھے، امجد سے چھوٹی تین بہنیں تھیں سب سے چھوٹی کا نام فاطمہ تھا جس کی عمر تقریباً دس سال تھی اور وہ چوتھی میں پڑھتی تھی اس سے بڑی زیتون تھی جو بارہ سال کی تھی اور پانچویں میں پڑھتی تھی سب سے بڑی زینب تھی جو سترہ اٹھارہ سال کی تھی اور میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد آج کل گرلز کالج میں فسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ امجد کے والد کی کریانے کی دکان تھی، امجد کی تنخواہ اور دکان کی آمدن سے ان کی گزر بسر اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔

مختصراً حال احوال پوچھنے کے بعد امجد کے والد نے بتایا۔

''بیٹے تیرے لیے تو آرمی کی چٹھی آئی تھی کہ تُم چھٹی ختم ہونے کے بعد اپنی یونٹ میں حاضر نہیں ہوئے ہو۔''

''ہاں ابو جی......میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''میں نے جانو کی زمینیں ٹھیکے پر لے لی ہیں۔'' اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔ ''ویسے بھی فوج کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ گھر کا گزارہ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر پہلے فوج سے استعفا تو دے دیتے۔ دو تین دفعہ پولیس والے تیری تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ انھی کی زبانی

مجھے تیری غیر حاضری کے بارے معلوم ہوا ہے۔''

''فوج میں استعفا وغیرہ نہیں ہوتا، ویسے آپ کہتے ہیں تو ڈسچارج کی درخواست بھجوا دوں گا۔'' مگر یہ بھی اس کی غلط بیانی تھی فوج میں جب تک بندہ خود حاضر نہ ہو اس کی درخواست کو نہ تو کوئی اہمیت دی جاتی ہے اور نہ ہی اس پر عمل ہوتا ہے۔ بلکہ فوج میں اس کا کوئی تصور ہی نہیں ہے کہ بندہ گھر رہتے ہوئے ڈسچارج کی درخواست بھیجے۔ بہر حال یہ امجد کا اپنا معاملہ تھا جب وہ نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا تو مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی اور جہاں تک تعلق تھا اس کے روزگار کا تو اس کے لیے میں نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی آدھی زمینیں اس کے نام کر دوں گا۔ اگر وہ میرے لیے اتنی قربانیاں دے سکتا تھا تو میں بھی اتنا کم ظرف نہیں تھا۔

''بس بیٹے جو بھی کرنا ہے جلد از جلد کر لو یہ نہ ہو پولیس والے تمھیں پکڑ کر لے جائیں۔''

جواباً امجد نے سعادت سے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''اب ختم بھی کرو تمھاری تو نصیحتیں ختم نہیں ہوتیں۔'' امجد کی امی بولیں اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر بولیں۔ ''بیٹا آپ دونوں نے کھانا کھانا ہے۔''

''نہیں امی ہم راستے میں کھا چکے ہیں......بس آپ اچھی سی چائے پلا دیں۔''

''ابھی لائی پتر۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

دن کا بقیہ حصہ ہم اسی جگہ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ رات کا کھانا بھی وہیں صحن میں چٹائی بچھا کر کھایا گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد جمیلہ کی حالت نارمل رہی۔ رات گئے جب تمام لوگ اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تو ہم دونوں اپنی چارپائیوں پر آ گئے۔ امجد کے گھر میں تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس کے امی ابو دوسرے میں اسلم، جمیلہ اور ان کا بیٹا اکرم خان اور تیسرے کمرے میں امجد کی بہنوں اور ممانی جان کا بستر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے صحن میں بستر لگانا پسند کیا۔

''یار ماجے ایک مشورہ ہے۔''

''فرماؤ۔''

''یار اگر آپ لوگ بھی اپنا یہ ڈربا بیچ کر رحمٰن خیل چلے چلو تو کتنا مزہ آئے گا۔''

''مشکل ہے کہ ابو جان یہ بات مان جائیں۔''

''دیکھو یہاں پر ان کا کوئی خاص کاروبار تو ہے نہیں، اس لیے میری مانو تو اپنے امی ابو کو راضی کر لو ہماری حویلی کافی وسیع ہے اور اگر اپنا نیا گھر بنانا چاہو تو ہماری حویلی کے ساتھ تین کنال زمین ویسے ہی پڑی ہے اس پر اپنا مکان تعمیر کر لینا اور دوسرے زمینوں کا انتظام انصرام بھی شاید اسلم بھائی سے اکیلے نہ سنبھالا جائے اس کی اپنی اراضی تقریباً ہمارے برابر ہی ہے انکل کی موجودی میں اس کی ڈھارس بندھی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے یار مجھے پتا ہے کہ ابو جان کی رحمٰن خیل میں موجودی ہمارے لیے بڑی سود مند ہو گی مگر یہ سب کچھ ابو جان کو کون سمجھائے؟''

''یہ تیری ذمہ داری ہے۔ اگر تُو انکل کو راضی نہ کر سکا تو پھر خود رحمٰن خیل میں زمینوں کی دیکھو بھال کے لیے تیار رہو۔''

''کل دیکھ لیں گے ابھی دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کروٹ بدل لی جو اس بات کا اعلان تھا کہ وہ میری مزید بکواس سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

+ + +

اگلے دن جب ہماری آنکھ کھلی تو امجد کے والد صاحب دکان پر چلے گئے تھے، روزمرہ کی ضروریات سے فارغ ہو کر ہم دونوں بھی اس کے پیچھے دکان پر پہنچ گئے۔ سلام دعا کے بعد ہم دکان میں پڑی لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گئے یہاں تک کہ وہ دکان میں موجود دو تین گاہکوں کو نمٹا کر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں بیٹے...... سناؤ کیسے آنا ہوا؟''

''بس انکل امجد آپ کی دکان کی بڑی تعریف کر رہا تھا میں نے کہا چلو گے ہاتھوں اسے دیکھ ہی لیں۔''

''یہ تو ہے ہی پگلا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔''ورنہ اس دکان میں کیا رکھا ہے۔''

''تو کوئی اور کاروبار شروع کر لو۔'' میں آہستہ آہستہ اپنے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے بولا کیونکہ دکان کی طرف آتے وقت امجد نے بات شروع کرنے کی ذمہ داری میرے سر ڈال دی تھی۔

''کاروبار تو بہت ہیں پتر مگر اس کے لیے سرمایہ اور طاقت چاہئے۔''

''طاقت سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں مستفسر ہوا۔

''طاقت سے مراد ہے...... جوان خون۔ اب میرے جیسے بڈھے کے پاس اگر سرمایہ ہو بھی سہی تب بھی وہ کسی بڑے کاروبار میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ اس دکان کو تھوڑی سی وسعت دے لوں۔ باقی کسی بڑے کاروبار میں ہاتھ ڈالنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔''

''تو امجد کو اپنے ساتھ شامل کر لو۔ آپ کا تجربہ، امجد کی طاقت اور میرا سرمایہ، اللہ اللہ خیر صلا۔''

''یوں ہو جائے تو کیا کہنے...... مگر اس سے کون منوائے گا۔'' اس کا اشارہ امجد کی جانب تھا۔

''ابو جان میں راضی ہوں مگر ایک شرط پر۔''

''وہ کون سی؟''

''کاروبار یہاں نہیں کسی اور شہر میں شروع کریں گے۔''

''کراچی سے زیادہ موزوں کون سی جگہ ہے کاروبار کے لیے؟''

''بات موزوں یا نا موزوں ہونے کی نہیں ہے ابو جان۔'' امجد گرم لوہے پر چوٹ لگاتا ہوا بولا۔ ''آپ میری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجھے شہر بالکل اچھا نہیں لگتا، میں تو چاہتا ہوں گاؤں کی کھلی فضا ہو لہلہاتے کھیت ہوں۔ سرسبز نظارے ہوں، چہچہاتے پرندے ہوں۔ یہ دھواں اگلتی فیکٹریاں، ٹریفک کا شور، تنگ گلیاں سردیوں میں دھوپ گرمیوں میں تازہ ہوا کا فقدان یہ سب مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

''مگر بیٹا اس میں کراچی کی کیا خصوصیت...... ہر شہر کی یہی حالت ہے۔''

''تو کیا ضروری ہے ہم شہر میں ہی کاروبار کریں۔ کسی دیہات میں بھی تو یہ کام ہو سکتا ہے۔''

''مثلاً'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''مثلاً یہی کہ جانو کا گاؤں رحمٰن خیل کسی بھی کاروبار کے لیے، بہت موزوں ہے، لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے شہر جانے پر مجبور ہیں۔ اگر ان کو شہر والی سہولت گاؤں میں مہیا کی جائیں تو میرا نہیں خیال کہ وہ شہر جانے پر مصر ہوں۔''

''ہوں'' کہہ کر سرفراز انکل نے گہری سانس لی (امجد کے ابو کا نام سرفراز اور امی کا نام خدیجہ تھا) اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''پتر جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو چاہتی ہے کہ بوڑھے والدین کو اپنی مرضی سے چلائے۔ جو اولاد بدتمیز اور نافرمان ہو وہ والدین کو کھلم کھلا حکم دیتی ہے جبکہ فرمانبردار بچے گھما پھرا کر اور لفظوں کا کھیل کھیلتے ہوئے والدین کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتے ہیں، طریقہ بیشک دونوں کا علیحدہ علیحدہ ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے...... بہر حال تُو اپنی مرضی کا مالک ہے مکان کا سودا کر لو، دکان ویسے ہی کرائے کی ہے چلے چلتے ہیں تمھارے ساتھ...... تُو شاید ہمارے بغیر گزارہ کر لے، مگر ہم سے تو تیری جدائی کا صدمہ نہیں اٹھایا جائے گا ناں۔''

سرفراز انکل کی بات سن کر ہم دونوں پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ ان کا تجزیہ بلا شک و شبہ صحیح تھا، اسی وقت ایک گاہک دکان میں داخل ہوا اور اس کے بہانے ہمیں چند لمحے سوچنے کا موقع مل گیا گاہک کے دکان سے نکلتے ہی امجد بولا۔

''ابو جان آپ میری بات کو کسی اور جانب لے گئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ہمارا ارادہ آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کا ہے۔ مگر بخدا یہ اپنا حکم چلانے کے لیے نہیں ہے۔ آپ ہماری خاطر اپنا وطن چھوڑ کر کراچی آ بسے ہمیں پال پوس کر بڑا کیا اور اب ہم اس قابل ہیں کہ آپ کو آرام سے بٹھا کر کھلا سکیں مگر آپ کراچی میں ہوں اور میں آپ سے اور امی سے سیکڑوں میل دور کسی کاروبار میں مصروف ہوں تو کیا آپ کا دل مانتا ہے کہ میں تسلی سے کام کر سکوں گا؟ اس سے پہلے چلو میں نوکری کے تقاضے نبھاتے ہوئے آپ سے دور رہنے پر مجبور تھا مگر اب ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے اور جہاں تک تعلق ہے کراچی میں کاربار شروع کرنے کا تو اگر آپ حکم دیتے ہیں تو میں جانو کے ساتھ کیا ہوا زمینوں کا ٹھیکہ منسوخ کر کے آپ کے پاس آ جاتا ہوں باقی جانو جانے اور اس کا کام۔''

''جیتے رہو بیٹا...... اللہ تمھیں اور تمھارے دوست کو سکھی رکھے...... میں تمھارے ساتھ متفق ہوں جیسا تیرا جی چاہے اسی طرح کرو

اور یوں بھی کراچی میں ہمارے کون سے رشتہ دار پڑے ہیں کہ ان سے بچھڑنے کا دکھ ہوگا۔ میں نے تو برسبیل تذکرہ ایک بات کی تھی ورنہ والدین ہمیشہ اولاد کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔''

''تھینک یو ابو جان۔'' امجد خوشی سے چہکا۔''ہم ابھی مکان کے لیے گاہک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔'' اور سرفراز انکل نے سر ہلا کر ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

ہمارا ارادہ کراچی میں ایک دو دن رہنے کا تھا مگر امجد کے گھر والوں کو ساتھ لے جانے کے انتظامات کرنے اور ان کے گھر وغیرہ کو بیچنے میں ہفتہ بھر لگ گیا۔ آخری دن گھر کا ضروری سامان ہم نے ایک ٹرک میں ڈال کر اسے رحمٰن خیل میں اپنے گھر کے ایڈریس پر روانہ کر دیا اور خود اسی دن ایک بس سروس کے ذریعے رحمٰن خیل کے جانب روانہ ہو گئے۔

اگلے دن قریباً عصر کے ٹائم ہم اپنے شہر جا اترے وہاں سے دو ٹیکسیاں ہائر کرا کر ہم ڈیڑھ گھنٹے میں رحمٰن خیل پہنچ گئے تھے۔

اسلم بھائی کا گھر امجد کے گھر کے مقابلے میں کئی گنا بڑا تھا۔ امجد کا خاندان آسانی سے اس میں سما گیا تھا۔

اگلے دن ہم چچا فاضل کو لینے کے لیے شہر پہنچ گئے۔ ہسپتال والوں نے ہمارے ساتھ یہ مہربانی کی کہ چچا کو ڈراپ کرنے کے لیے ہمیں ایمبولینس مہیا کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب نے پہلی دفعہ 15 دن بعد اور پھر اس کے بعد ہر مہینے میں ایک مرتبہ چیک اپ کرانے کا حکم دیا۔ چچا فاضل کے گھر داخل ہوتے ہی جمیلہ بے ساختہ ان کی چارپائی پر گر کر لپٹ گئی اور اس دردناک انداز میں روئی کہ چچا فاضل اور ہم سب کو اشکبار کر دیا۔ بڑی مشکل سے ممانی جان اور اسلم نے اسے سمجھا بجھا کر خاموش کرایا۔

+ + +

''جانو صاحب!......اب میران شاہ جانے کی تیاری کرو۔'' رات گئے جب چچا فاضل دوا کے زیر اثر سو گئے تو امجد بولا۔

چچا فاضل کو پوچھنے کے لیے چونکہ لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا اس لیے اسے ہم نے اپنے ساتھ بیٹھک میں ہی رکھا ہوا تھا۔

''ہاں یار......الحمدللہ گھر اور گھر والوں کو سنبھالنے کے لیے کافی ذمہ دار اکٹھے ہو گئے ہیں اب ایک دو روز میں پروگرام بناتے ہیں جانے کا۔''

''کل ہی کیوں نا چلیں؟۔''

''کل کا دن ٹھہر جاتے ہیں تا کہ جانے کی تیاری کر لیں، پرسوں ان شاء اللہ چلیں گے۔'' ''ویسے تیرا بازو اب کیسا ہے؟''

''بازو تو الحمدللہ اب ٹھیک ٹھاک ہے۔ زخم بھی تقریباً مندمل ہونے والا ہے اور اگر خراب بھی ہوا تو کل ہی کل تو ٹھیک نہیں ہو جائے گا نا؟ اس لیے کل ہی چلتے ہیں۔''

''ماجے صاحب......ابھی تک چچا فاضل سے اجازت لینی ہے، راستے کے بارے میں بھی اس سے رہنمائی حاصل کرنی ہے۔ ہتھیار یہیں سے لے جائیں یا وہاں جا کر خریدیں گے۔ وہ مہمان نواز لوگ ہیں اور چودھری اکبر لازمی بات ہے کسی کی پناہ میں ہو گا اس کے

بارے چچا کے ساتھ بیٹھ کر تفصیل سے لائحہ عمل طے کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ پیسے اپنے ساتھ کتنے لے جائیں گے اس کے علاوہ بھی کافی کام ہیں کرنے کے اس لیے کل جانا تو بالکل مشکل ہے پرسوں کوشش کریں گے کہ نکل جائیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب...... ہم تو خادم ہیں جیسے آپ کی مرضی۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر بک کی بالکل ضرورت نہیں جب میں ضروری سمجھوں گا اس وقت جائیں گے۔''

''ایسی کی تیسی تیرے حکم کی...... پرسوں تم نہ جانا میں اکیلے بھی جاسکتا ہوں۔''

''مگر میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے خاموش رہا۔

اگلے دن صبح کی اذانوں کے ساتھ ہی چچا فاضل نے آواز دے کر ہمیں جگا دیا۔

''عمر، امجد...... اٹھ جاؤ بچو نماز کا ٹائم ہے۔'' اور ہم بادل نخواستہ اٹھ کر وضو کر کے نماز کے لیے چل دیئے ابو کی حیات میں جب میں چھٹی آتا تھا تو پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھنی پڑتی۔ اب تو بہت عرصے بعد مجھے مسجد جانے کا موقع ملا تھا۔ سرفراز انکل ہم سے پہلے مسجد پہنچے ہوئے تھے۔ نماز پڑھ کر ہم تینوں مسجد سے نکل کر سیدھے کھیتوں کی جانب چل پڑے سرفراز انکل کو تمام زمینیں سرسری طور پر دکھاتے دکھاتے ہم کہیں دوپہر کے قریب واپس آئے چچا فاضل کے ساتھ بیٹھک میں گاؤں کے تین چار بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے فرداً فرداً ہاتھ ملا کر ہم بھی ایک سائیڈ پر بیٹھ گئے۔

''پتر تیرے نام رجسٹری آئی ہوئی ہے۔'' چچا فاضل نے ہلکے زرد رنگ کا لفافہ اپنے تکیے کے نیچے سے نکال کر میرے جانب بڑھایا۔

''یہ کب آئی ہے؟'' میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''ابھی چند منٹ پہلے ہی ڈاکیہ دے کر گیا ہے۔'' چچا یہ کہہ مہمانوں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہو گیا، جبکہ میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر کے دیکھنا شروع کر دیا۔ لفافے کے پیچھے شیتل کا نام اور واپسی پتا انگلش میں لکھا ہوا تھا۔

''یہ تو وہی محترمہ نہیں ہے۔'' امجد جو میرے ساتھ سر جوڑے لفافے کو بغور دیکھ رہا تھا شیتل کا نام پڑھتے ہی مستفسر ہوا۔ ''جو انڈیا میں تیرے پلے پڑی تھی۔''

''وہی ہے...... مگر تم اپنا تھوبڑا ذرا ادھر کرو تاکہ میں اسے کھول کر پڑھ سکوں۔ ویسے بھی کسی کا خط پڑھنا نہایت غیر اخلاقی فعل ہے۔''

''بعد میں تم نے اس خط کی تفصیلات سنا سنا کر میرے کانوں کا بیڑا غرق کر دینا ہے تو کیوں نا ابھی سے خود ہی پڑھ لوں۔''

میں نے خط کھولا تو اس میں شیتل نے سلام و دعا کے بعد اپنے والد کی موت کے بارے لکھا تھا اور اس کے بعد مجھ سے کئی گلے شکوے کر کے مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے بقول اب میری طرح وہ بھی تنہا رہ گئی تھی اور اکیلے دو فیکٹریوں کو سنبھالنا اس کے بس سے باہر تھا اس لیے میں اس کے پاس جا کر اس کی مدد کروں۔ آخر میں اس نے مجھے وہ وعدے وعید یاد دلائے تھے جو میں اس کے ساتھ کر کے آیا تھا۔

''یار چلے جاؤ غریب تجھے کتنا یاد کر رہی ہے، دو فیکٹریوں کی مالک اکیلی سیٹھ زادی۔''

''جاؤں گا مگر چودھری کے انجام کے بعد۔''

''پتر کس کا خط ہے۔'' تعزیت کرنے والے جب بیٹھک سے نکلے تو چچا فاضل مستفسر ہوا۔

''چچا ایک دوست کا تھا اس کا والد فوت ہو گیا ہے اسی کے متعلق اطلاع بھجوائی ہے۔''

''تو پھر تعزیت کے لیے چلے جاؤ۔''

''تعزیت کے لیے کیسے جا سکتا ہوں، اس کا تعلق انڈیا سے ہے۔''

''پھر خط ہی لکھ دو۔''

''یہ تو کر ہی لیں گے۔'' میں اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ ''پہلے ہماری میران شاہ سے متعلق رہنمائی کریں اور دوسرے اس بات کا چچا سرفراز اور گھر کی عورتوں کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہمارے میران شاہ جانے کا مقصد کیا ہے۔'' چچا سرفراز چونکہ اس وقت گھر کے اندر گیا ہوا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اس کی غیر موجودی میں اپنے مطلب کی بات کر لیں۔

''کیوں سرفراز بھائی کو کیوں پتا نہ چلے؟'' چچا مستفسر ہوا۔

''وہ دراصل امجد اس کی لاعلمی میں جا رہا ہے نا...... یہ نہ ہو وہ دل میں تنگی محسوس کرے۔''

''تو تم اکیلے چلے جاؤ۔ اگر امجد پتر کو والدین اجازت نہیں دیتے تُو کیا تو نے زبردستی کرنی ہے۔''

''نہیں چچا میں نے ضرور جانا ہے چاہے ابو جان ناراض ہو جائیں۔ اس کی لاعلمی میں جانے میں یہ فائدہ تھا کہ کم از کم وہ ناراض نہ ہوتے اور میں ان کا دل دکھانے کا سبب نہ بنتا؟''

''مگر پتر......'' چچا فاضل نے اسے سمجھانے کے لیے منہ کھولا مگر امجد قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''چچا اگر مگر کوئی نہیں۔ میں نے چودھری اکبر سے بدلہ لینے کے لیے فوج کی نوکری چھوڑ دی ہے اور اب آپ مجھے ابو جان کی ناراضی کی وجہ سے روکنا چاہ رہے ہیں۔''

''اگر میں نہ بتاؤں تو پھر انھیں پتا نہیں چلے گا؟''

امجد جلدی سے بولا۔ ''بالکل نہیں چلے گا۔''

''چلو میں بھی انھیں نہیں بتاتا'' چچا فاضل مسکراتے۔ ''بس یا اور کچھ۔''

''شکریہ چچا۔'' ہم دونوں بیک زبان بولے۔ ''اب میران شاہ کے متعلق کچھ بتائیں۔''

''اس دن بتلا تو دیا تھا کافی تفصیل سے۔''

''نہیں اس وقت ہم کچھ اور پوچھنا چاہ رہے تھے۔'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''پوچھو؟''

''سب سے پہلے تو آپ یہ بتلائیں کہ ہتھیار اپنے ساتھ لے جائیں یا ادھر سے خریدیں؟''

''یہ تو ایسی بات ہے کہ بندہ دریا میں نہانے جائے اور پانی کی بالٹی گھر سے بھر کر لے جائے۔ اللہ کے بندے ادھر دنیا جہان کا اسلحہ دستیاب ہے۔ بس جیب میں پیسے ہونے چاہئیں۔''

''اپنے ساتھ پیسے کتنے لے جائیں؟''

''25,20 ہزار روپے کافی ہیں اگر اور ضرورت پڑی تو میران شاہ کے مین بازار میں جو ہوٹل ہے اس کے مالک سے، میرا نام بتا کر لے لینا۔ ہوٹل کا نام تو مجھے بھولا ہوا ہے البتہ مالک کا نام شاہ گل خان ہے۔ سب لوگ اسے شاہ جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ میرا گہرا دوست ہے۔ جب بھی میں میران شاہ جاؤں اسی کے پاس ٹھہرتا ہوں۔''

''چودھری اکبر کے بارے پتا چلا ہے کہ وہ میران شاہ کے ملک بہادر خان نامی شخص کے پاس پناہ لئے ہوئے ہے۔ کہیں چودھری کے خلاف کارروائی کرنے پر وہ چودھری کو سپورٹ تو نہیں کرے گا۔''

''اگر کوئی تیرے مہمان کو قتل کرنے کی کوشش کرے تو کیا تُو چپ کا بیٹھا رہے گا؟''

چچا نے مجھے اپنی روایات یاد دلائیں۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں ملک بہادر خان کی لاعلمی میں چودھری کے خلاف قدم اٹھانا پڑے گا۔''

''بالکل......اس کے خلاف کرنے کی صورت میں تم بہادر خان کو ختم کر کے ہی چودھری اکبر کے قریب جا سکتے ہو۔ دوسرا یہ بات بھی مدِنظر رکھنی ہے کہ ضروری نہیں کہ چودھری ابھی تک میران شاہ میں ہی ٹکا ہوا ہو۔ ہوسکتا ہے وہ میران شاہ سے آگے افغانستان کی سرحد کے قریب جا پہنچا ہو یا شاید باڈر ہی کراس کر چکا ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہے یہ سب وہیں جا کر معلوم ہو گا اور شاہ گل سے رہنمائی لیتے رہنا۔ وہ سمجھدار اور تعاون کرنے والا شخص ہے۔''

امجد جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ مستفسر ہوا۔''اس کے علاوہ اور کوئی ایسی باتیں جن کا خیال رکھنا آپ ہمارے لیے ضروری خیال کرتے ہوں؟''

''اور یہ کہ خواہ مخواہ کسی کے کام میں داخل اندازی نہیں کرنی۔ تمھیں وہاں عجیب و غریب لوگ اور الٹ پلٹ ماحول ملے گا۔ اس ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرنی ہے۔ اس علاقے میں تقریباً ہر دوسرا بندہ چرس کا رسیا ہے یہ نہ ہو آپ وہاں مصلح بن جائیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہتھیار سونت کر میدان میں اتر آنا ان لوگوں کی ثقافت ہے۔ حتی الوسع کوشش کرنا کہ اپنے کام سے کام رکھنا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں جا کر چند روز حالات کا جائزہ لینا اور اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنا۔ چودھری کے متعلق معلومات کے حصول میں بہت زیادہ رازداری اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہو سکے تو اپنے مقصد کو چھپانے کے لیے خود کو تاجر ظاہر کرنا۔ اسلحے، چرس یا

افیون کا خریدار بننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

''اگر بندہ پشتو نہ جانتا ہو تو......؟''

''تو کیا......؟ وہاں پر تمھیں کافی لوگ پنجابی بولنے والے ملیں گے۔ خصوصاً افغان بارڈر کراس کرنے والے کافی مجاہدین کا تعلق پنجاب سے ہوتا ہے۔'' (قارئین کی اطلاع کے لیے لکھتا چلوں کہ اس وقت تک ہم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ مجاہدین کو دہشت گردوں کا درجہ دے سکیں۔ دوسرے اس وقت جو مجاہد تھے وہ حقیقتاً مجاہد ہی تھے۔ اب تو مجاہدین کا بھیس بدل کر کافی شرپسند اور غیر ملکی ایجنسیاں بھی شمالی جنوبی وزیرستان میں پاک فوج کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ بہر حال یہ ایک طویل اور الجھا ہوا موضوع ہے۔ اگر اس پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں تو شاید کئی قسطیں اسی کی نذر ہو جائیں۔)

یہ باتیں ابھی تک چچا فاضل کے ہونٹوں پر تھیں کہ نذر گل دروازہ کھٹکھٹا کر بیٹھک میں داخل ہوا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' ہم اس کے سلام کا جواب دے کر اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تمام سے مصافحہ کر کے وہ چچا فاضل کی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔

''چاچا فاضل کیسی ہے طبیعت۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ بہت بہتر ہے بیٹا...... تم سناؤ ماں باپ کیسے ہیں اور تیری نوکری کیسی جا رہی ہے؟''

''ماں باپ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ البتہ نوکری کا آج کل بڑا رولا بنا ہوا ہے۔''

''کیسا رولا؟'' چچا نے حیرانی سے پوچھا۔ میں بھی ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، امجد البتہ لاتعلق بیٹھا تھا کیونکہ نذر گل اور چچا کے مابین ساری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی اور وہ پشتو نہیں جانتا تھا۔

''چاچا دو ہفتے ہونے کو ہیں کہ انسپکٹر طاہر کو کوئی گھر سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کی تلاش میں پولیس مختلف جگہوں پر چھاپے مار چکی ہے مگر وہ ہنوز لاپتا ہے۔ مجرموں نے ابھی تک نہ تو اس کے ورثاء سے کسی تاوان کے حصول کے لیے رابطہ کیا ہے اور نہ ہی پولیس سے اپنا مطالبہ منوانے کے لیے کسی رابطے کی ضرورت سمجھی ہے۔ ہم تو دن رات چکروں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اب بھی بمشکل گھنٹے ڈیڑھ کی چھٹی ملی ہے اور یہاں سے سیدھا میں نے واپس تھانے جانا ہے۔''

''کیا بات کر رہے ہو۔'' چچا فاضل مصنوعی حیرت سے بولا۔ ''تھانیدار کے ساتھ کسی کی کیا دشمنی ہے کہ اسے اغوا کرے گا۔''

''کیا کہہ سکتے ہیں چاچا...... یہ تو کوئی سامنے آئے گا تو پتا چلے گا نا، فی الحال تو ہر طرف خاموشی ہے۔ سب سے آخر میں انسپکٹر صاحب نے شبیر شاہ کنڈی کے قاتلوں کو گرفتار کیا تھا۔'' نذر ہماری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور اس سے اگلے دن خود اغوا ہو گیا۔''

''ہو سکتا ہے وہ خود کسی کے ساتھ گیا ہو۔'' چچا نے امکان ظاہر کیا۔

''اگر ایسا ہوتا پھر تو اسے واپس آجانا چاہے تھا۔''

میں نے پوچھا۔''اچھا یہ بتاؤ جس لباس میں اسے آخری مرتبہ دیکھا گیا۔کیا وہ گھر میں موجود ہے؟''

''کواٹر پر موجود سنتری کے مطابق وہ کالے رنگ کے سوٹ میں تھا اور اس رنگ کے دو تین سوٹ تھے۔ہمیں تو اس کی الماری میں اس طرح کے تین سوٹ ملے ہیں۔''

''اس کی شب خوابی کا لباس تو ایک ہی ہوگا آیا وہ گھر میں موجود تھا یا نہیں۔''

''موجود تھا۔''وہ مختصراً بولا۔

''اس کے علاوہ خاص بات آج کل گرمی کا موسم ہے اس نے سوتے وقت پنکھا چلایا ہوگا۔اغوا ہونے کی صورت میں لازمی طور صبح سب سے پہلے اس کے کمرے میں داخل ہونے والے کو اس کا پنکھا چلتا ہوا ملنا چاہیے کیونکہ اغوا کرنے والے کبھی بھی پنکھا بند نہ کرتے۔گھر کا مالک اگر اپنی مرضی سے کہیں جا رہا ہو تو لازمی طور پر وہ پنکھا آف کرتا ہے۔''

''اس بارے مجھے معلوم نہیں ہے کہ آیا پنکھا بند تھا یا چل رہا تھا۔''وہ صاف گوئی سے بولا۔

''اغوا ہونے کی صورت میں افراتفری اور ہاتھا پائی کی علامات بھی کمرے میں نظر آنی چاہئیں۔''میں نے ایک اور امکان ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''جو بندے سب سے پہلے اس کے کمرے میں گئے تھے ان کے مطابق تو انھیں کسی قسم کی افراتفری یا ہاتھا پائی کے نشان نظر نہیں آئے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ اپنی مرضی سے کہیں گیا ہے۔''

''مگر اسے دروازے پر موجود سنتری سے چھپ کر جانے کی کون سی مجبوری تھی۔''

''بہر حال ہم نے بھی مفروضے بیان کیے ہیں۔''میں نے کندھے اچکائے۔''ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''یار آخر مجھے بھی تو پتا چلے آپ لوگ کس بحث میں الجھے ہوئے ہو۔''امجد جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا مستفسر ہوا۔

''جواباً میں نے اسے ساری گفتگو کا لب لباب سنا دیا۔

''آپ لوگ فضول اس بحث میں الجھے ہوئے ہو...... ہماری بلا سے وہ اغوا ہوا ہے یا خود کہیں گیا ہے۔''

چچا فاضل امجد کی بات سن کر ہنس پڑا۔جبکہ نذر گل بھی زیر لب مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا......

''امجد بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔بہر حال میں اب اجازت چاہوں گا۔''

''بیٹے چائے تو پی لیتے۔''چچا فاضل جلدی بولا۔''باتوں کی دھن میں چائے کا بھی نہیں پوچھ سکے ہیں۔''

''چائے پھر کبھی سہی چاچا...... ویسے بھی یہ اپنا گھر ہے۔فی الحال میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔''

''جیسے تیری مرضی پُتر۔'' چچا سے مصافحہ کر کے جب اس نے ہماری جانب ہاتھ بڑھایا تو میں اس کے ساتھ اٹھتا ہوا بولا۔ ''چلو میں تمھیں تھوڑی دور چھوڑ کر آتا ہوں۔''

''میں چلا جاؤں گا، آپ بیٹھیں۔''

مگر میں سنی ان سنی کرتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ امجد البتہ چچا کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔ بیٹھک سے باہر آتے ہی میں اس سے بولا۔

''تیرے اوپر تو کوئی بات نہیں آئی نا کیونکہ فضل داد اور خوش میر کی مخبری تُو نے ہی کی تھی۔''

''وہ بات میرے اور تھانیدار کے درمیان راز تھی۔'' نذر گل نے مجھے تسلی دی۔ ''اس نے کبیر شاہ کنڈی کے انعام والے دس ہزار اپنے پلے سے مجھے ادا کیے تھے۔''

''کیوں؟''

''مجرموں کو پکڑنے کا کارنامہ اپنے نام سے کیش کرانا تھا نا؟''

''اچھا تو یہ بات تھی...... بہر حال اس معاملے میں ہمارا نام نہیں آنا چاہیے۔''

''تُو فکر نہ کر یار...... میں اتنا بھی کچا نہیں ہوں۔''

تھوڑی دور تک اسے چھوڑ کر میں واپس مڑ آیا۔ واپسی پر میں ابھی اپنی بیٹھک کے دروازے سے دور تھا کہ مجھے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ پیچھے دیکھنے پر رضیہ کی سفید کار نظر آئی میں رک گیا۔ میرے قریب گاڑی روک کر وہ جلدی سے باہر نکلی۔

''اتنے عرصے کہاں غائب تھے۔'' وہ بے تابی سے مستفسر ہوئی۔ اس کی بے تکلفی دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ مگر میں حیرانی چھپا گیا۔

''چچا کے پاس شہر گیا ہوا تھا۔''

''تو بتا کر تو جاتے...... پتا نہیں کتنے چکر لگا چکی ہوں تمھاری گلی کے۔''

''کیوں؟''

''تم سے ملنا تھا نا؟''

''اتنا بھی کیا ضروری تھا ملنا؟''

''لگ رہا ہے آپ ابھی تک مجھ سے خفا ہیں؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں بس۔'' میں روکھے لہجے میں بولا۔ ''میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔''

''پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔''

''پہلے میرے ساتھ واسطہ کب پڑا ہے تمھارا۔''

''اچھا اب چائے کا بھی پوچھو گے یا اسی طرح انسلٹ کرتے رہو گے۔'' وہ اچانک پینترا بدلتے ہوئے بولی۔ وہ ابھی تک اس

غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ شاید میں اس سے جشن کی رات ہونے والی گفتگو سے ناراض تھا۔

''انسلٹ میں کیوں کرنے لگا آپ کی۔ میں نے تو صرف آپ کی باتوں کے جواب دیئے ہیں اور آئیں آپ کو چائے کیا کھانا کھلا دیتے ہیں۔''

میں اسے ساتھ لے کر بیٹھک کی بجائے گھر گھس آیا۔ کار اس نے وہیں لاک کر دی تھی۔ اسے گھر کی عورتوں کے حوالے کر کے میں چپکے سے بیٹھک کی طرف کھسک گیا۔ وہاں چچا فاضل اور امجد میران شاہ کے موضوع پر مصروفِ گفتگو تھے۔

''یار وہ مصیبت پھر آ گئی ہے۔'' میں ان کی باتوں میں مخل ہوا۔

''کون سی مصیبت؟'' امجد مستفسر ہوا۔ جبکہ چچا بھی سوالیہ نظروں سے میرے جانب دیکھنے لگا تھا۔

''مس رضیہ میر نیاز خان۔''

''کدھر ہے؟''

''گھر میں عورتوں کے پاس بٹھا آیا ہوں۔''

میر نیاز خان کی بیٹی کے بارے چونکہ ہم تفصیل سے چچا کو بتا چکے تھے اس لیے اس کا نام سن کر اس نے مزید سوال کرنے سے گریز کیا تھا۔

''اچھا کیا ہے۔'' امجد چچا فاضل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''انکل آپ میران شاہ سے آگے علاقے کے بارے بتلا رہے تھے۔''

''ہاں تو بیٹا میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ میران شاہ سے آگے بائی روڈ سفر کریں تو راستے میں پہلے بویا آتا ہے اس کے بعد ایک بڑا گاؤں ہے دیگان اس کو کراس کرتے ہی خو کمر آ جاتا ہے۔''

''چچا یہ تو آپ صرف روڈ کے اوپر واقع علاقوں کی تفصیلات بتلا رہے ہیں...... روڈ سے ہٹ کر بھی تو گاؤں ہوں گے۔''

''پہلے روڈ والے تو سن لو۔'' چچا ہنستے۔ ''اس کے بعد دائیں بائیں والے بھی بتلا دوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' امجد جلدی سے بولا۔

''تو میں کہہ رہا تھا کہ اس کے بعد خو کمر آ جاتا ہے یہاں سے روڈ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک روڈ بہرہ مند غرلامئی اور وچہ بی بی کی طرف چلی جاتی جبکہ دوسری منظر خیل، دتہ خیل، بابا زیارت اور ماما زیارت کی طرف مڑ جاتی ہے۔'' چچا فاضل تفصیل سے اس علاقے کا حدود اربع واضح کر رہا تھا۔ ہم دونوں توجہ سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ مگر ابھی تک چچا فاضل کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ رضیہ بیٹھک میں داخل ہوئی۔

''واہ جی!...... یہ خوب رہی۔ مجھے اُدھر عورتوں میں بٹھا کر خود ادھر گپوں میں مشغول ہو گئے ہو۔ السلام علیکم انکل جی کیسے ہیں آپ۔'' مجھے یہ کہتے ہی وہ چچا فاضل کی طرف مڑی سلام کہہ کر اس کے نزدیک اپنا سر جھکا دیا۔ چچا نے ''جیتی رہو بیٹی۔'' کہہ کر اس کے سر پر

ہاتھ پھیرا اور وہ مڑ کر بے تکلفی سے میرے نزدیک چارپائی پر آ بیٹھی۔

میں نے کہا۔"ہمارے ہاں عورت۔عورتوں کے ساتھ ہی بٹھائی جاتی ہے۔"

"بس بس......اپنی بدتہذیبی کو رواجوں میں نہ چھپاؤ۔"اس نے مجھے جھڑکا۔

"بیٹی عمر ٹھیک کہہ رہا ہے۔"چچا دھیمی آواز میں بولا۔

"مگر چچا میں تو آپ کی صحت کا پوچھنے کے لیے آئی تھی۔"وہ پٹڑی بدلتے ہوئے معصومیت سے بولی۔

"جم جم آؤ بیٹی......مگر یہ تو تیرے والد صاحب یا بھائی کا کام بنتا ہے نا۔کل کلاں کو کسی عورت کی بیماری پُرسی کے لیے اگر آپ کے والد صاحب خود تشریف لے آئیں تو کیا یہ مناسب ہوگا۔کم از کم مریض کے گھر والے اس سے متفق نہیں ہوں گے۔"

"مگر بھیجتی تو اپنے انکل کو پوچھنے آسکتی ہے نا۔"وہ کہاں اتنی جلدی ہار ماننے والی تھی۔

"ہاں مگر بھائی کو بھی زحمت کر لینی چاہئے۔"امجد جو کافی دیر سے چچا کی وجہ سے خاموش بیٹھا تھا اس پہ چوٹ کرتے ہوئے بولا۔

"تم خاموش رہو......یہ میرا اور انکل کا معاملہ ہے۔"

"آج آپ کے دم چھلے نظر نہیں آ رہے؟"امجد کہاں خاموش رہنے والا تھا۔

"میں چوری نکل کر آئی ہوں ان سے۔"

"ویسے چوری کرنا کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔"اور امجد کی بات سن کر وہ اسے گھورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا انکل میں اب چلوں گی۔"

"جیتی رہو بیٹی۔"چچا نے اسے دعا دی۔

"عمر اگر مجھے تھوڑی دور تک چھوڑ آؤ تو؟"وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے چچا فاضل کی طرف دیکھا۔

"چلے جاؤ بیٹے......ویسے بھی اس کا اکیلا گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔"

میں اٹھ کر امجد سے بولا۔"چلو ماجے اسے چھوڑ آتے ہیں۔"

"مہربانی۔"وہ روکھے لہجے میں بولا۔"آپ جائیں میں نے انکل سے کچھ معلومات لینی ہے۔"امجد کا انکار سن کر رضیہ کھل اٹھی تھی۔جبکہ میں خون کے گھونٹ پیتا طوہاً و کرہاً اس کے ساتھ چل پڑا۔امجد نے اس کا تختۂ مشق بننے کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اس نے کار میں بیٹھتے ہی کار کو آگے بڑھایا، چونکہ گلی میں کار پیچھے نہیں موڑی جاسکتی تھی اس لیے وہ سیدھے چلتی گئی اور دوسری گلی سے موڑ کر ہم گاؤں سے باہر جانے والے رستے پر چڑھ گئے۔

"خاموش کیوں ہو۔ابھی تک خفا ہو کیا؟"کار میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"نہیں خفگی کی کیا بات ہے۔ ویسے ہی میرا مزاج کچھ اس طرح کا ہے۔"

"صرف میرے لیے ہے نا۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "امجد سے تو بڑی کھل کر گپیں ہانکتے ہو۔"

"امجد اور تیرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" میں بغیر لگی لپٹی رکھتے ہوئے بولا۔

"لازمی بات ہے وہ مرد ہے اور میں عورت بلکہ لڑکی تو فرق تو ہوگا نا۔" اس کے ساتھ بحث کرنا مجھے فضول سا لگا۔ وہ خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بوگس مذاق کو میں خاموشی سے پی گیا، لیکن وہ کب خاموش رہنے والی تھی۔ میری خاموشی بھانپتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر بولی۔

"ویسے تم ہو بڑے ظالم اور کٹھور...... اور اس کے ساتھ ساتھ تھوڑے سے بیوقوف بھی۔"

"عجیب عورت ہو تم۔" اس مرتبہ میں ہلکے سے غصے سے بولا۔ "تجھے بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ ظالم کٹھور اور بیوقوف جیسے الفاظ تم ایک غیر مرد کے لیے اتنی آسانی سے استعمال کر رہی ہو۔"

"تم غیر کب ہو...... تمھیں تو میں نے اسی وقت اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جب پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"

"کیونکہ میں تو تیرے والد کا مزارع ہوں نا۔ جو تیری مرضی سے سرِ مُو حرکت نہیں کر سکوں گا۔"

"ہاہاہا۔" میری اتنی کڑوی کسیلی بات پر بھی وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ عجیب ڈھیٹ لڑکی تھی۔

"عمر جان صاحب!...... مجھے پتا ہے تم کیوں شعلہ پا ہو رہے ہو۔ اس کی وجہ میں تیرے گھر میں دیکھ کے آئی ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں حیرانی سے بولا۔

"اب اتنے بھولے بھی نہ بنو۔ چلو وقتی فلرٹ سے تو میں منع نہیں کرتی۔ تم جوان ہو اور جوان خون نذرانہ مانگتا ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں نذرانے میں بندہ اپنی پوری زندگی تباہ کر دے، اپنی زندگی کا فیصلہ تم کم از کم دماغ کی آنکھوں سے کرنا۔"

"یہ کیا بکواس شروع کی ہوئی ہے تُو نے...... صاف لفظوں میں کہو کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"صاف الفاظ تو یہ ہیں کہ تم زینب کے لیے مجھے نظر انداز کر رہے ہو اور مجھے تو اس میں سوائے اس کے کوئی خوبی نظر نہیں آ رہی کہ وہ ایک تازہ کھلا ہوا پھول ہے اور ایسے پھول کو توڑ کر چند دن سونگھنے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔"

اس کا مطلب سمجھتے ہی میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ وہ ایک گھٹیا سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی گھٹیا عورت تھی۔ میرا ہاتھ گھوما اور "چٹاخ" کی آواز کے ساتھ میرا غصے اور نفرت سے بھرا ہوا تھپڑ اس کے گال پر ثبت ہو گیا۔

"تم ذلیل عورت...... میری بہن کے متعلق ایسے ریمارکس دے رہی ہو۔ وہ امجد سے پہلے میری بہن ہے۔"

"تت...... تم...... تمھاری یہ جرأت۔" کا روک کر وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولی۔

"جرأت تو میں اس سے بھی بہت بڑی کر سکتا ہوں مگر تیرے گندے خون سے ہاتھ رنگ کر بھی میرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔" میں کارکا

دروازہ کھول کر نیچے اترا اور تپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تُو عورت ہے۔ ورنہ اب تک شاید تُو یہ بات سننے کے لیے زندہ نہ ہوتی۔“

وہ جواباً بغیر کچھ بولے پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری جانب گھورتی رہی۔

میں واپس جانے کے لیے مڑا مگر پھر کچھ سوچ کر پلٹا اور ایک مرتبہ پھر زہریلے لہجے میں بولا۔

”تیرے جیسی طوائف سے بہتر ہے بندہ کنوارہ مرجائے اور یاد رکھنا اس دن اور اسی جگہ کو اپنے لیے جو دلھن لاؤں گا۔ وہ دولت، سیرت اور صورت ہر لحاظ سے تم سے کئی گنا بہتر نہ ہوئی تو میں یہ علاقہ چھوڑ دوں گا۔ یہ ایک گنڈہ پور کا وعدہ ہے۔ تیرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر میں ایک جھٹکے سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس چل پڑا۔

مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورت کو میں کیوں گھر لے کر گیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ امجد ساتھ نہیں آیا تھا ورنہ میں ساری عمر اس نگاہیں نہ ملا پاتا، مگر شاید وہ امجد کی موجودی میں یہ بات نہ کرتی۔ بہر حال کچھ بھی تھا۔ اب اس گھٹیا عورت سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ جہاں تک تعلق تھا میر نیاز خان کا تو وہ گرم جگہ پر پاؤں نہیں رکھتا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ رضیہ کو کسی بھی قسم کا غلط قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دے گا۔ رضیہ کو چیلنج کرتے وقت میرے لاشعور میں شیتل کا تصور موجود تھا، کہنے کو تو میں اسے کہہ آیا تھا مگر یہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آیا شیتل میرا انتظار بھی کر پاتی ہے یا کسی اور کو پسند کر کے پیا گھر سدھارتی ہے۔ میں اس کو جتنا پیارا سہی اس کی دسترس سے تو دور تھا نا۔ ویسے بھی میرے وعدے وعید کے درمیان چودھری اکبر کے انتقام کی گہری اور چوڑی خندق حائل تھی۔ اس کے علاوہ مذہب کا فرق، تہذیبوں کا اختلاف، زمینی فاصلہ اور معاشی ناہمواری جیسی کئی رکاوٹیں بھی اس بات کا بین ثبوت تھیں کہ ہمارا ملاپ مشکل تھا۔

شیتل کے لیے میرے دل میں کتنی گنجائش تھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے کبھی اس سے تعلق استوار کرنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس وقت بھی میرا موڈ اس موضوع پہ سوچنے کے حق میں نہیں تھا لیکن اس کے باوجود میں بیٹھک کی بجائے گھر میں جا کر شیتل کے خط کا جواب لکھنے لگا۔ ٹیلی فون پر بات کرنے میں یہ قباحت تھی کہ مجھے اس کے ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا جس کے جوابات فی الحال میرے پاس نہیں تھے۔

اس کے والد کی ناگہانی موت کی تعزیت کے بعد میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے ایسے حالات میں بھی مجھے یاد رکھا تھا۔ اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر میں نے اتنے عرصے تک رابطہ نہ کر سکنے کا جواز پیش کیا تھا۔ آخر میں آنے والے حالات کی تصویر کھینچتے ہوئے میں نے انڈیا جانے سے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر وہی مشورہ دیا تھا جو اسے اس سے پہلے کئی مرتبہ دے چکا تھا کہ وہ اپنے کسی ہم مذہب کو اپنا لے۔ خط کو لفافے میں بند کر کے میں نے جیب میں رکھا اور بیٹھک میں جا کر چچا فاضل اور امجد کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔

+ + +

اگلے روز ہم دن چڑھے تمام گھر والوں سے ملاقات کر کے نکل آئے۔ ہمارے اصل مشن کے متعلق صرف اسلم بھائی اور چچا فاضل کو پتا

تھا۔رحمٰن خیل سے ہم سیدھے شہر پہنچے، بینک سے تیس ہزار کی رقم نکلوا کر آدھی امجد کے حوالے کرتے ہوئے آدھی میں نے اپنی جیب میں رکھ چھوڑی تھی۔

''یہاں سے ڈائریکٹ میران شاہ کی گاڑی مل جائے گی۔'' بینک سے نکلتے ہوئے امجد مستفسر ہوا۔

''ہاں......لیکن ہم پہلے بنوں جائیں گے اور پھر وہاں سے میران شاہ کی گاڑی پکڑیں گے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں چاہتا ہوں بنوں میں رات گزار کر آگے چلیں۔''

''چھوڑو بنوں میں رات گزارنے کو...... بلکہ اب آرام وغیرہ کا خیال دل سے نکال دو اب آرام انشاءاللہ واپسی پر ہی کریں گے۔''

جواباً میں خاموش رہا جو اس سے متفق ہونے کا اظہار تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم فلائنگ کوچ میں بیٹھے میران شاہ کے جانب رواں دواں تھے اور دونوں آنے والے جان گسل وقت کے اندیشوں میں گھرے مختلف قسم کی سوچوں میں گم تھے۔

+ + +

اڑھائی تین گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد ہم بنوں پہنچ گئے تھے۔راستے میں خلافِ توقع امجد خاموش رہا۔بنوں اڈے میں ڈرائیور نے پندرہ بیس منٹ سٹاپ کیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ایک ایک کپ چائے کا اپنے معدے میں انڈیل لیا۔

''بنوں کی کون سی چیز مشہور ہے؟'' ہوٹل والے لڑکے کو چائے کے پیسے دیتے ہوئے امجد مستفسر ہوا۔

''نسوار اور سرخ مرچ مصالحہ۔''

''نسوار؟'' امجد کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''جی......نسوار......اگر شک ہے تو کھا کر دیکھ لو۔''

''مہربانی......آپ خود ہی شوق فرمائیں۔''

''الحمدللہ مجھے تو ابھی تک یہ لت نہیں پڑی۔البتہ اتنا پتا ہے کہ جو ایک دفعہ اس کا عادی ہو جائے وہ پھر عمر بھر اس سے جان نہیں چھڑا پاتا۔'' یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر تھے کہ ڈرائیور نے ہارن بجایا اور دائیں بائیں بکھرے مسافر کوچ میں بیٹھ گئے۔بنوں سے آگے کے علاقے کے بارے میں میری واقفیت چچا فاضل سے سنی ہوئی معلومات تک محدود تھی۔

''میرے خیال میں اس علاقے کے حجام کے گھر میں تو فاقے ہی رہتے ہوں گے۔'' کوچ کے آگے بڑھتے ہی امجد میرے کان میں آہستہ سے بولا۔اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر ہنسی دوڑ گئی۔اس نے یہ بات مسافروں کے عورتوں کی مانند لمبے لمبے سر کے بالوں کو دیکھ کر کی تھی۔اس بارے میں چچا فاضل ہمیں تفصیل سے بتلا چکا تھا مگر بتلائی ہوئی اور دیکھی ہوئی بات میں بڑا فرق ہوتا ہے، بلکہ عموماً مشاہدہ سنی ہوئی بات سے کافی مختلف ہوتا ہے۔

راستے میں ہم چچا فاضل کی دی ہوئی معلومات کی روشنی میں اردگرد کے علاقے پر بحث کرتے رہے۔
میران شاہ تک روڈ پختہ تھا اور چاروں اطراف دیکھنے پر صرف پہاڑ ہی پہاڑ دکھائی دے رہے تھے اس میں خشک اور سرسبز ہر دو قسم کے پہاڑ شامل تھے۔
مزید دو گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم میران شاہ پہنچ گئے تھے۔ گاڑی سے اتر کر میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ چچا فاضل کے واقف کار شاہ گل خان کے ہوٹل کے متعلق ایک شخص سے مستفسر ہوا۔
''شاہ گل خان......؟''
''جی......لوگ انھیں شاہ جی کہہ کر پکارتے ہیں۔'' میں نے جلدی سے لقمہ دیا۔ اس دوران امجد خاموش کھڑا رہا کیونکہ ساری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی۔
''اچھا شاہ جی۔'' میری بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یوں کہو نا۔ آپ اس طرح کریں کہ......'' یہ کہہ کر اس نے مختصراً ہمیں شاہ جی کے ہوٹل کی لوکیشن بتلا دی جو اڈے سے نزدیک ہی تھا۔ اللہ کا شکر ادا کر کے ہم ہوٹل کی سمت بڑھ گئے۔
''یار یہ تو کوئی عجیب قسم کی پشتو بولتے ہیں۔'' میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے امجد بولا۔ ''آپ کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔''
''آئی ہے مگر اتنی نہیں، بلکہ چند دن کے بعد تو یہ الجھن بھی ختم ہو جائے گی۔''
''یار غلطی ہو گئی ہے کلاشن کوف ساتھ لانی چاہیے تھی۔'' امجد دائیں بائیں گزرنے والے ہتھیار بند افراد کو دیکھ کر افسوس میں سر ہلایا۔ ''یہاں تو بچوں تک نے ہتھیار کندھے سے لٹکائے ہوئے ہیں۔''
''ہاں یار...... چچا فاضل نے بتایا تو تھا کہ یہ ان لوگوں کی ثقافت ہے، روٹی کے بغیر رہنا تو شاید یہ لوگ برداشت کر لیں۔ ہتھیار کے بغیر نہیں۔''
''گرمی دیکھو اور ان کی پگڑیاں دیکھو۔''
''انھوں نے تیرے ننگے سر پر اعتراض کیا ہے جو تُو ان کی پگڑیوں پر معترض ہے۔'' میں نے اسے جھڑکا اور وہ ہنس کر بولا۔
''دیکھو نا یار کچھ نوجوانوں نے فقط ٹوپی سر پر رکھی ہوئی ہے۔ تو سب کو اسی طرح کرنا چاہیے اتنی لمبی لمبی زلفیں اوپر سے پگڑی اور پھر گرمی دیکھو۔''
اس وقت تک ہم مطلوبہ ہوٹل تک پہنچ گئے تھے۔ اس لیے میں جواب میں خاموش رہا۔ ہوٹل عجیب طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ کرسیوں، ٹیبلوں اور چارپائیوں کی بجائے مٹی گارے سے بڑے بڑے تھڑوں کے مانند جگہیں بنائی گئی تھیں جن پر کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائیاں اور ان کے اوپر سبز رنگ کی پلاسٹک شیٹیں بچھائی گئی تھیں، گاہک جوتے اتار کر بڑی بے تکلفی سے ان پر براجمان تھے۔ لکڑی کا ایک شوکیس اور اس کے پیچھے چارپائی ڈال کر استقبالیہ کاؤنٹر کی شکل ترتیب دی گئی تھی۔ چارپائی پر سرخ گھنی داڑھی والا ایک شخص تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا

تھا، داڑھی کا رنگ لازماً مہندی کا مرہونِ منت تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کہ وہ شاہ گل عرف شاہ جی تھا۔ کیونکہ اس کا حلیہ چچا فاضل نے ہمیں بڑی تفصیل سے بتلایا تھا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' ایک گاہک کو بقایا پیسے واپس کرتے ہوئے اس نے خوشدلی سے میرے سلام کا جواب دیا۔

''ہم نے شاہ گل خان سے ملنا تھا۔''

''تو ملیں نا؟'' وہ مسکرایا۔ ''غریب کو ہی شاہ گل خان کہتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

''ہم ڈیرہ اسماعیل خان سے آئے ہیں۔ فاضل جان رحمٰن خیل والے نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''فاضل جان......'' اس نے کھڑے ہو کر معانقے کے لیے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ ''وہ تو میرا جگر ہے جگر۔''

مجھے اپنے بازوؤں میں خوب بھینچ کر اس نے امجد کے ساتھ بھی یہی سلوک دہرایا۔

''بیٹھو۔'' اس نے چارپائی کے جانب اشارہ کیا۔ ''اور سناؤ فاضل کیسا ہے اور آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟''

''سگا چچا ہے میرا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ ہاشم جان کے بیٹے ہیں۔'' وہ غالباً ہماری فیملی سے متعلق کافی معلومات رکھتا تھا اس لیے بے دھڑک اس نے میرے ابو جان مرحوم کا نام لیا۔

''جی۔'' میں مختصراً بولا۔

''اور یہ۔'' اس نے امجد کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرا دوست ہے۔''

''ہوں۔'' کہہ کر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور لڑکے کو آواز دی جو گاہگوں کو ان کی مطلوبہ چیزیں سرو کر رہا تھا۔ ''او لڑکے لسی کا جگ لے آؤ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''آیا شاہ جی۔'' لڑکے نے کہا اور شاہ جی دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

''بس یہی سامان ہے آپ کے پاس۔'' وہ ہمارے مختصر بیگوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''باقی سامان اڈے میں چھوڑ آئے ہو۔''

''جی نہیں......بس یہی سامان ہے۔''

''فاضل خود کیوں نہیں آیا؟''

''چچا......؟'' میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ ''وہ فی الحال آ نہیں سکتے تھے۔''

”آپ بھی رحمٰن خیل سے تعلق رکھتے ہیں۔“اس مرتبہ اس کا مخاطب امجد تھا۔جواباً امجد نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔میں جلدی سے بولا۔

”یہ پشتو بولنا نہیں جانتا۔“

”چلو ہم تو اردو جانتا ہے نا؟“شاہ جی مسکراتے ہوئے بولا۔اسی وقت لڑکا لسی کا جگ لے آیا۔سٹیل کے گلاسوں میں اس نے ہمیں ٹھنڈی میٹھی لسی پیش کی۔دو دو گلاس لسی پی کر ہماری تھکن دور ہو گئی تھی۔

”اچھا پہلے گھر چلتے ہیں۔آپ لوگ نہا کر فریش ہو جائیں اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔“شاہ جی نے چارپائی سے اٹھ کر ہمارے سفری بیگ اٹھا لیے۔

”چچا پلیز یہ ہم خود اٹھا لیں گے۔“ہم نے اس سے بیگ لینے کی کوشش کی۔مگر اس نے جھڑک دیا......۔

”آرام سے چلو۔یہ نا ہو میں تم دونوں کو بھی کندھوں پر اٹھا لوں۔“

یہ بات چونکہ اس نے پشتو میں کہی تھی اس لیے امجد صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا تھا اور ابھی تک اس کے ہاتھ سے بیگ لینے پر مصر تھا۔

”ہلک (اے لڑکے) میں کہتا ہوں۔ہم تم کو بھی اٹھا لے گا۔“وہ امجد سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔

”ٹھیک ہے بیگ مجھے دے دو۔میں خود ہی آپ کے کندھوں پر بیٹھ جاؤں گا۔“امجد نے مسکرا کر کہا۔مگر شاہ جی انکار میں سر ہلا کر مسکرایا اور آگے بڑھ گیا مجبوراً ہم بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔

بازار سے نکل کر ہم گلیوں میں داخل ہو گئے۔زیادہ تر مکانات کچے بلاکوں کے بنائے ہوئے تھے۔اکا دکا پختہ اینٹوں سے بنے ہوئے گھر بھی نظر آ رہے تھے۔شاہ جی ہمیں لے کر ایک بڑے پختہ مکان کے سامنے پہنچا اور پھر اس سے ملحقہ بیٹھک کا دروازہ کھول کر ہمیں اندر بلا لیا۔بیٹھک بذات خود ایک چھوٹا سا مکان نظر آ رہی تھی کہ اس میں ایک چھوٹا سا صحن اور باتھ روم وغیرہ بنا ہوا تھا۔

”آپ لوگ نہا لیں میں گھر سے ہو آؤں۔“شاہ گل بیٹھک اور گھر کو ملانے والے دروازے سے اندر گھس گیا۔مجھے پتا تھا کہ وہ کھانے کا بندوبست کرنے گیا ہے۔عصر کا ٹائم ہو رہا تھا اور یہ ٹائم نہ دن کے کھانے کا تھا اور نہ ہی رات کے مگر اس علاقے میں مہمان سے کھانے کے متعلق پوچھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا اور کھانا لا کر مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔البتہ مہمان خود بااصرار میزبان کو منع کر دے کہ وہ اس وقت کھانے کا تکلف نہ کرے تو یہ الگ بات ہے۔

مگر میں نے ایسی کوشش نہیں کی کیونکہ راستے میں ہم کھانا نہیں کھا سکے تھے اور اس وقت اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

باتھ روم کے اندر پانی کا بھرا ہوا ڈرم ایک بالٹی اور مگہ بھی موجود تھا۔جب تک ہم نے نہا کر کپڑے بدلے شاہ گل خان پرتکلف کھانے کے ساتھ حاضر ہو گیا۔کھانا لے کر آنے والا اس کا بیٹا تھا کیونکہ اس کا چہرہ بالکل شاہ گل کے مشابہہ تھا۔کھانا کھا کر ہم آرام کے لیے لیٹ گئے۔میرا ارادہ تھا کہ رات کو شاہ گل خان سے تفصیلی بات کروں گا۔

+ + +

رات کو عشاء کی نماز کے بعد میں تفصیل سے شاہ گل کو اکبر خان سے اپنی دشمنی کی وجوہات اور اپنے گھر والوں کے ساتھ گزرے حادثے کی تفصیلات سنا چکا تھا۔

’’بیٹے یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا...... میں فاضل کے پاس جاؤں گا تعزیت کے لیے، بہرحال بطور میزبان مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن آپ کے ساتھ گزرے حادثے کی وجہ سے یہ پوچھنا میری مجبوری بن گئی ہے کہ آپ کی میرے پاس آمد کس سلسلے میں ہوئی ہے۔ مختصراً یہ کہ میرے لائق کیا حکم ہے۔‘‘

’’ہم چودھری اکبر کے تعاقب میں یہاں پہنچے ہیں۔اس کے بارے میں ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ میران شاہ کے کسی بہادر خان نامی شخص کی پناہ لیے ہوئے ہے۔آپ اس کا ایڈریس ہمیں معلوم کر دیں۔باقی ہمارا اپنا کام ہے۔‘‘

’’میں بہادر خان نام کے دو ملکوں کو جانتا ہوں۔ایک یہیں کا رہائشی ہے اور اس کے ساتھ میری کافی گپ شپ بھی ہے دوسرا دگن کا ملک ہے، دگن میران شاہ سے چند کلومیٹر دور ہے اور وہ حاجی بہادر کافی اثر رسوخ رکھتا ہے۔اس کے علاوہ کوئی ملک حاجی بہادر میرے علم میں نہیں ہے۔بہرحال صبح میں چودھری اکبر کے متعلق آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل کر لوں گا۔اگر وہ اس علاقے میں آیا ہوا ہے تو میں ان شاء اللہ اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔اور کوئی خدمت؟‘‘

’’ہتھیار بھی چاہییں...... کہاں سے خریدیں؟‘‘

’’ان کا بندوبست بھی ہو جائے گا...... اور کچھ؟‘‘

’’اور یہ کہ ہمارے نام صیغہ راز میں رہیں یہ نہ ہو چودھری کو ہمارے بارے سن گن ملے اور وہ ایک مرتبہ پھر غائب ہو جائے۔‘‘

’’اگر ایک دفعہ مل گیا پھر تو ان شاء اللہ غائب نہیں ہو سکے گا۔‘‘

’’ان شاء اللہ۔‘‘

’’خوچے تم تنگ تو نہیں ہوتا ہمارا باتوں سے۔‘‘ شاہ گل، خاموش بیٹھے امجد سے مخاطب ہوا۔

’’نہیں خان چچا مجھے تھوڑی بہت سمجھ آ جاتی ہے، باقی باتیں بعد میں جانو سے پوچھ لیتا ہوں اس کو اسی لیے تو ساتھ لایا ہوں۔ورنہ اکیلا نہ آ جاتا۔‘‘ اس کی بات سن کر میں تو ہنس پڑا، جبکہ شاہ گل نے حیرانی سے پوچھا۔

’’اکیلا آنے کا کیا مطلب؟‘‘

’’ویسے ہی مذاق کر رہا ہے چچا۔‘‘

’’اچھا اچھا ایسا بولو نا گپ باز ہے۔‘‘ شاہ گل اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

’’ویسے خاں چچا۔‘‘ میں اسے امجد کے دیئے گئے نام سے پکارا۔’’اگر بالفرض چودھری دگن کے حاجی بہادر کے پاس ہمیں مل جاتا ہے تو کیا وہ اسے آسانی سے ہمارے حوالے کرنے پر راضی ہو جائے گا۔‘‘

''ناممکن......''اس نے انکار میں سر ہلایا۔''ملک کسی قیمت پر اسے تمھارے حوالے نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ کیا اگر چودھری نے میری پناہ بھی لی ہوتی تو میں اسے تمھارے حوالے نہ کرتا، یہ ہماری روایات کے خلاف ہے۔''

''لیکن خان چچا چودھری سے بدلہ کس طرح لوں گا۔ یہ نہ ہو کہ اسے ہلاک کر کے خواہ مخواہ ملک بہادر کی دشمنی مول لے لوں۔''

''بھئی چودھری ہمیشہ تو اس کا مہمان نہیں رہے گا نا؟ بلکہ ہو سکتا ہے چودھری اب تک اس کے پاس سے چلا بھی گیا ہو۔ ساری زندگی کون کسی کے در پر پڑے رہنے کو گوارہ کر سکتا ہے اور جہاں تک چودھری کا تعلق ہے، وہ تو تمھارے بقول اچھا خاصہ زمیندار ہے، اس نے تو شاید چند دن بعد ہی اپنے لیے ٹھکانے کا بندوبست کر لیا ہو۔ یوں بھی اسے علاقہ غیر میں کس چیز کا خوف ہو سکتا ہے۔ پولیس کا ادھر کوئی عمل دخل نہیں اور آپ لوگ تو اس کے علم کے مطابق اس کے اس علاقے میں روپوشی سے لاعلم ہو۔'' شاہ گل نے حالات کا امید افزا تجزیہ کیا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں رہنے کی بجائے کسی ایسی جگہ چلا گیا ہو جس کی بابت حاجی بہادر بھی لاعلم ہو۔''

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' خان چچا نے انکار میں سر ہلایا۔''اگر یہاں آنے کے بعد اس نے حاجی بہادر کا ادنیٰ سا بھی سہارا لیا ہے تو وہ کبھی بھی اسے لاعلم نہیں رکھے گا۔''

''اللہ کرے ایسے ہی ہو۔''

''ایسے ہی ہو گا۔ ان شاء اللہ......اب آپ لوگ آرام کرو۔ صبح میں شاہ زمان (شاہ زمان اس کے بڑے بیٹے کا نام تھا) کو دگن بھیجوں گا سیانا لڑکا ہے وہ لازماً چودھری کو ڈھونڈ نکالے گا بشرط چودھری وہاں پہ ہوا۔''

اس کے جانے کے بعد امجد کافی دیر میرا سر کھاتا رہا اور جب تک اس نے خان چچا سے ہونے والی ساری گفتگو حرف بحرف نہ سن لی میری جان نہ چھوڑی۔ سب کچھ سن لینے کے بعد اس نے موجودہ حالات کے متعلق ایک دو الٹے سیدھے تبصرے کیے اور کروٹ بدل کر سو گیا، لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ماضی، حال اور مستقبل کے گورکھ دھندے میں مَیں عجیب انداز میں پھنسا ہوا تھا۔ میرا جسم حال میں تھا تو دل ماضی میں اور دماغ مستقبل کے گھور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ میرے پیارے ماضی میں رہ گئے تھے ان سے ملنے کی نہ تو امید تھی اور نہ ہی امکان مگر وہ بھلائے نہیں بھولتے تھے۔ مستقبل میں میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش سب سے بڑا مقصد اور سب سے بڑی خوشی چودھری اکبر کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا تھا۔ شاید اس کے بعد میں خود بھی زندہ نہ رہ پاتا۔ جمیلہ باجی اور چچا فاضل کے علاوہ میرا کوئی اپنا نہیں بچا تھا۔ امجد نے میرے لیے بہت زیادہ قربانیاں دی تھیں اور حقیقی معنوں میں میرے سگے بھائیوں کے مانند ثابت ہوا تھا۔ مگر اس کی محبتوں میں مجھے حاکم جان، محمد جان اور احمد جان بھول نہیں سکتے تھے۔ سعدیہ کا نعم البدل ملنا بڑا مشکل تھا۔ شیتل ایک ایسی لڑکی تھی جو شاید اس خلا کو تھوڑا بہت پُر کر سکتی مگر میری جانب سے مسلسل بے اعتنائی شاید اسے بھی کوئی دوسرا ساتھی ڈھونڈنے پر مجبور کر دیتی بلکہ ہو سکتا تھا اب تک اس نے ڈھونڈ بھی لیا ہو۔ میرے ذہن میں شیتل سے سنی ہوئی نظم گونجی......

تمھیں بھی تو خبر ہوگی کہ

دریا پاس بہتے ہوں تو پانی اچھا لگتا ہے

کناروں سے جڑی مٹی سے پوچھو روگ چاہت کے

کہ اس پانی کی چاہت میں

کناروں سے اکھڑ کر

اجنبی دیسوں میں جانا کتنا مشکل ہے

کنارہ پھر نہیں ملتا

تمھیں بس اتنا کہنا ہے

یہاں جو بھی بچھڑ جائے

دوبارہ پھر نہیں ملتا

''ٹھیک کہتی تھی وہ بچھڑنے والے دوبارہ نہیں ملتے۔'' میرے دماغ میں تلخ سوچ گونجی۔ نمکین قطرے میری آنکھوں سے نکل کر کانوں کو بھگوتے ہوئے تکیے میں جذب ہونے لگے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں نے زیر لب بد دعا نما دعا مانگی اور اپنی سوچوں کے دھارے کو ماضی سے ہٹا کر چودھری اکبر کے خلاف محاذ آرائی کے طریقے ترتیب دینے پر مائل کرنے لگا۔ یہ وہ واحد موضوع تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے دوسرے غم ذہن سے محو ہو جاتے تھے۔ یہ تدبیر کامیاب رہی اور یہ کچھ سوچتے سوچتے نیند کی مہربان دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

+ + +

اگلے روز ہم دن چڑھے اٹھے روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد خان چچا ہمیں ایک اسلحہ ڈیلر کے پاس لے گیا۔ اپنے بیٹے شاہ زمان کو وہ صبح سویرے دگن روانہ کر چکا تھا۔

اسلحہ ڈیلر شاہ جی کا گہرا دوست تھا اس کے کہنے پر وہ ہمیں دکان کی بجائے اپنے گھر سے ملحقہ سٹور میں لے آیا جہاں اعلیٰ قسم کا دیسی و بدیسی اسلحہ موجود تھا۔

''ادھر تو راکٹ لانچر بھی پڑے ہیں۔'' سٹور کے اندر گھستے ہی امجد کی حیران ہو گیا۔

''یہاں پہ آپ کو 12.7 ایم ایم اور اے جی ایس سیون ٹین بھی مل سکتی ہے۔'' دوکاندار نے کہا اور ہم سر ہلا کر رہ گئے تھے۔

وہ ہتھیار ہمارے کسی کام کے نہیں تھے۔ راکٹ لانچر گو اپنی کارکردگی کی نسبت وزن میں بہت ہلکا ہوتا ہے یعنی صرف 6 کلو کے بقدر اس کا وزن ہوتا ہے مگر اس کے ایک گولے کا وزن اڑھائی کلو کے قریب ہوتا ہے اس طرح ایک صحت مند شخص صرف تین سے چار گولے ہی اپنے ساتھ آسانی سے لے جا سکتا ہے اور ان گولوں سے کسی بھی چھوٹے موٹے مکان کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن ہم جس قسم کی جنگ کی تیاری میں تھے اس میں یہ کہیں پہ بھی فٹ نہیں بیٹھتا تھا اور جہاں تک تعلق تھا 12.7 ایم ایم کا تو اس کا تو وزن بھی اتنا زیادہ ہوتا ہے اس کو فقط اٹھانے کے لیے تین سے چار آدمی چاہئیں۔ اس طرح آٹومیٹک گرینیڈ لانچر یعنی AGS-17 بھی ہمارے کسی کام کی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں سٹور میں ایسے کئی کارآمد ہتھیار دکھائی دیے جو پسند تو بہت آئے مگر ہماری لڑائی کے لیے سود مند نہیں تھے۔ ان میں بارہ بور بندوقیں، سنائپر رائفلیں (دور مار رائفلیں) جن کے ساتھ ٹیلی سکوپ بھی فٹ تھیں اور مختلف بور کے پستول شامل تھے۔ ہمارے مطلب کی رائفل صرف AK-47 اسالٹ رائفل تھی جسے عرف عام میں کلاشن کوف کہتے ہیں۔ ہم دونوں نے کلوز بٹ کی دو کلاشن کوفیں پسند کیں جن کی بیرلیں قلم کی طرح تراشی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے لکڑی کے دستے کا بریٹا پستول بھی پسند آیا مگر دکاندار نے بتایا کہ وہ درہ آدم خیل کا تیار کردہ تھا اور نقل برطابق اصل تھا اس کی بجائے اس نے جرمنی کا بنا ہوا گیرا گٹ مارک تھرٹین ایم ایم میرے سامنے رکھا جو وزن میں بریٹا سے ہلکا تھا اور رینج بھی کافی زیادہ تھی۔ میگزین میں چھ راؤنڈ آتے تھے جو کہ عام پستولوں سے کافی موٹے تھے۔ دکاندار کی پسند پر میں نے وہی لے لیا۔

"پیسے کتنے ہوئے؟" کلاشن کوف کے اندر سلنگ ڈال کر کندھے سے لٹکاتے ہوئے میں مستفسر ہوا۔

دکاندار نے کہا۔ "پیسوں کی ادائی شاہ جی نے کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

خان چچا نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ "مطلب یہ کہ یہ امارا طرف سے تم لوگوں کا تحفہ ہے۔"

"مگر خان چچا اتنے قیمتی تحفے؟"

کوئی قیمت نہیں اے۔ بس اب چلو۔"

ہم دکاندار سے رخصتی مصافحہ کر کے اس کے ساتھ چل پڑے۔ اس وقت کلاشن کوف تقریباً 7 ہزار کی مل جاتی تھی جبکہ آج کل 45 ہزار سے لے کر 65 اور 75 ہزار تک اس کی قیمت ہے اور اس کی قیمت میں اتنا اضافہ پرویز مشرف کے دور حکومت میں ہوا ہے۔ وہاں سے ہم سیدھے خان چچا کی بیٹھک میں پہنچے۔

"آپ لوگ گپ شپ کریں میں حاجی بہادر سے ہو آوں۔" حاجی بہادر سے اس کی مراد میرانشاہ والا حاجی بہادر تھا کیونکہ دگن والے حاجی بہادر کے پاس وہ اپنے بیٹے کو بھیج چکا تھا۔

"اب کیا ارادہ ہے جانو صاحب۔" شاہ جی کے بیٹھک سے نکلتے ہی امجد نے پوچھا۔

''فی الحال تو انتظار ہے شاہ زمان اور خان چچا کی رپورٹوں کا۔اس کے بعد ہی کچھ سوچیں گے۔''

''بالفرض دونوں ملک، چودھری سے لاعلم ہوئے تب کیا کریں گے؟''

''تب میرن شاہ اور اس کے مضافاتی علاقے میں کسی اور حاجی بہادر کو تلاش کریں گے کیونکہ میر نیاز کے کہنے کے مطابق وہ کسی حاجی بہادر کا ہی مہمان بن کر آیا ہے۔ اگر اس طرح ناکامی ہوئی تو واپس جا کر میر نیاز خان سے دو دو ہاتھ کریں گے اور اس مرتبہ اسے ساتھ ہی لے کر آئیں گے چاہے اس کے لیے ہمیں کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔''

''اس وقت بھی تو میں نے یہی کہا تھا کہ مگر تمھیں امن پسند بننے کا شوق چرایا ہوا تھا۔''

''امن پسند میں اب بھی ہوں۔''

''گوتم بدھ صاحب امن سے کام نہیں چلتا......اور دوغلی حرکتوں سے بھی پرہیز کرو۔ غضب خدا کا ایک چھوڑ دو دو ہتھیار اپنے ساتھ رکھتے ہوئے امن پسندی کے دعوے۔ ہنہ......''

''ماجے صاحب میں نے عرض کیا ہے میں خواہ مخواہ کی قتل و غارت ناپسند کرتا ہوں۔ سمجھے۔''

''یہ بھی جھوٹ ہے......ورنہ ایک ہندو لڑکی کے لیے تُو اتنی لاشیں نہ گراتا انڈیا میں...... تجھے کیا تھا۔ ہندو لڑکی ہے اور ہندوؤں ہی نے پکڑی ہوئی ہے۔'' وہ مجھے غصہ دلاتا ہوا بولا۔ مجھے پتا چل گیا کہ اس کے پاس کام کی کوئی بات ہے نہیں اس لیے سوال گندم اور جواب چنا کے مصداق وہ بات کو کہیں سے کہیں لے گیا تھا۔

''چلو شہلا بی بی کو جب کوئی مسلمان چھیڑے تو تم بھی خاموش رہنا۔''

''ارے واہ، میں نے کب کہا ہے کہ میں امن پسند ہوں۔ ویسے بھی شہلا اور شیتل کا کیا جوڑ۔''

''بات تو تیری صحیح ہے...... شیتل اور شہلا کا واقعی کوئی جوڑ نہیں۔ شہلا اگر اپنی موجودہ شکل سے سوگنا بھی زیادہ خوب صورت ہو جائے تب بھی شیتل سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔''

''ہاہاہا......ارے بس بھی کرو...... اگر اتنی اچھی ہوتی تو یوں انڈیا میں نہ چھوڑ آتے، اپنے ساتھ ہی لے آتے۔''

''میں شادی شدہ تھا'' اس کے مذاق کے جواب میں مَیں سنجیدہ ہو گیا۔ ''سعدیہ زندہ تھی اس وقت کیا اس پر سوکن لے آتا۔''

''سوری یار'' سعدیہ کے ذکر پر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔''

''مجھے پتا ہے......لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شیتل کی طرح حسین لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔''

''اس کا مطلب ہے چودھری کے انجام کے بعد جناب ایک دفعہ پھر انڈیا جانے کا سوچ رہے ہیں۔''

''نہیں یار۔'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی لڑکی جو امیر کبیر ہوتے ہوئے حسن کی دولت سے بھی مالا مال ہو، اس کے چاہنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں ہوں گے اور میری بناسپتی محبت کا خمار کسی لمحے بھی اس کے دل سے اتر سکتا ہے میری جگہ اسے کئی

خوب صورت دولت منداور پڑھے لڑکے مل سکتے ہیں، دوسرے یوں نہ بھی ہوا تب بھی وہ ہندو ہے اور میں مسلمان...... مسلمان ایک کافرہ سے کیسے شادی کر سکتا ہے؟''

''ان لاکھوں میں اسے جانو جیسا کہاں ملے گا...... اور جہاں تک تعلق ہے مذہب کا تو وہ بدل بھی سکتا ہے۔ ہندو کے مسلمان ہونے میں چند سیکنڈ بھی نہیں لگتے اگر میرے رب کریم کا کرم ساتھ ہو تو؟''

''اچھا چھوڑو یار اس لایعنی موضوع کو۔تم یہ پستول دیکھو کیسا ہے۔''میں نے گیراگٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''شکل سے تو اچھا دکھ رہا ہے۔ وزن میں بھی ہلکا ہے البتہ اس کی کارکردگی تو فائر کرنے کے بعد ہی پتا چلے گی۔ ویسے اس کی کتنی گولیاں ساتھ لی ہیں۔''

''چھ میگزین میں ہیں اور چوبیس سپیئر ہیں۔''

''فائر کر کے چیک کر لیتے ہیں۔''امجد نے مشورہ دیا اور ہم دونوں بیٹھک کو باہر سے کنڈی لگا کر چل پڑے۔ ہمارا رخ پہاڑی کے دامن کی طرف تھا۔گلیوں اور گھروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ یوں تو میران شاہ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے مگر مغربی جانب کی پہاڑی شاہ گل خان کے گھر کے نزدیک تھی اس لیے ہم نے اسی طرف کا رخ کیا تھا۔

چھوٹی جسامت کے پتھروں کو نشانہ بنا کر ہم نے کلاشن کوفوں کی درستی کا یقین کیا۔اس کے بعد ہم دونوں نے پستول سے تین تین راؤنڈ فائر کیے وہ بلاشبہ ایک اعلیٰ کوالٹی کا پستول تھا اور میرے اندازے کے مطابق کلاشنکوف سے کئی گنا قیمتی بھی تھا، لیکن چونکہ میں اس کی اصل قیمت سے لاعلم ہوں اس لیے یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے۔ امجد نے اس سے قریباً سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر پڑے چھوٹے سے پتھر کو باآسانی نشانہ بنا لیا تھا اور یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ وہ کافی فاصلے تک مار کرنے والا پستول تھا کیونکہ عموماً پستول کی کارگر رینج 75 گز ہوتی ہے۔

(قارئین کی دلچسپی کی خاطر لکھتا چلوں کہ ہر ہتھیار کی کارگر رینج اور مکمل رینج میں بڑا فرق ہوتا ہے مثلاً پاک آرمی میں استعمال ہونے والی جی تھری کی کارگر رینج 300 میٹر ہے جبکہ مکمل رینج 4000 میٹر یعنی چار کلومیٹر بنتی ہے اور کارگر رینج کا فوجی عرف میں مطلب بھی یہی بنتا ہے کہ وہ فاصلہ جہاں تک ایک فائرر کسی بھی انسانی جسم کو نشانہ بنا سکے۔''راوی'')

''اب واپس چلتے ہیں۔ہتھیاروں کی بھی صفائی کرنی ہے اور ہو سکتا ہے خان چچا بھی واپس پہنچ گیا ہو۔''امجد نے پستول میری طرف بڑھایا اور ہم دونوں واپس چل پڑے خان چچا بڑی بے صبری سے ہمارا منتظر تھا اس کا بیٹا شاہ زمان بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

''کہاں گئے تھے آپ لوگ؟''خان چچا ہمیں دیکھتے ہی پوچھا۔

''خان چچا...... ان ہتھیاروں کی کارکردگی چیک کر رہے تھے۔''

''اچھا تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ آپ لوگوں نے کی تھی۔''اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''شاہ زمان آپ لوگوں کے لیے اچھی خبر لایا ہے۔''

''کیا چودھری اکبر کا پتا چل گیا ہے؟'' میرے لہجے میں بے صبری تھی۔

''نہیں۔'' شاہ جی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''لیکن اتنا پتا چل گیا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے حاجی بہادر کے پاس آیا تھا اور تقریباً ڈیڑھ دو ہفتے اس کا مہمان بنا رہا۔ اس کے ساتھ اپنے چند دوست بھی تھے، اور وہاں سے وہ آگے کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گیا ہے۔ جس کے متعلق صرف ملک حاجی بہادر یا پھر اس کے دست راست طوفان خان کو معلوم ہے۔ طوفان خان کا اصل نام کچھ اور ہے مگر اس کی طبیعت میں جو تند خوئی، تیزی اور غضبناکی پائی جاتی ہے اس نسبت سے تمام علاقے میں وہ طوفان خان کے نام سے مشہور ہے۔ حاجی بہادر کے باقی ملازمین سے شاہ زمان نے کافی سن گن لی ہے مگر وہ صرف اتنا ہی بتلا سکے ہیں کہ چودھری اکبر دگن سے آگے کی طرف گیا ہے۔ کس جگہ......؟ اس بات سے وہ لاعلم ہیں۔''

''آپ کا اندازہ کیا کہتا ہے؟''

''کیا کہہ سکتا ہوں...... دگن سے آگے وزیرستان کا کافی وسیع علاقہ موجود ہے۔ وہ کسی جگہ کو بھی اپنے لیے پسند کر سکتا ہے ہو سکتا ہے وہ نارائن، بہرہ، دتہ خیل، غرلامئی، خشک پہاڑی، جنگل خیل وغیرہ کہیں بھی جا سکتا ہے افغانستان کی سرحد بھی نزدیک ہے گو وہاں خانہ جنگی ہے لیکن اگر اسے تمھاری جانب سے زیادہ خطرہ لاحق ہوا تو وہ وہاں جانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔''

''تو اسے ڈھونڈنے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟''

''جس طرح شاہ زمان کہہ رہا تھا کہ اس کے بارے صرف طوفان خان اور حاجی بہادر کو ہی پتا ہے تو لازمی بات ہے ان دونوں کو ہی گھیرنا پڑے گا اور ان دونوں میں موزوں، آدمی طوفان خان ہے کیونکہ عام لوگوں میں اس کے بارے میں بڑی نفرت پائی جاتی ہے اور اس کی دشمنیاں بھی کافی زیادہ ہیں۔ اس لیے اگر اس سے چودھری سے متعلقہ معلومات اگلوا کر ہم جہنم رسید کر دیں تو ہم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔''

شاہ جی نے اس سے معلومات اگلوانے کے لیے ہم کا صیغہ استعمال کیا تھا گویا وہ خود بھی شانہ بشانہ ہمارے ساتھ یہ جنگ لڑنے کے لیے تیار تھا، لیکن ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم اپنی آگ میں کسی دوسرے کو نہیں گھسیٹ سکتے تھے۔ اگر سوچا جائے تو مجھے امجد کو بھی ساتھ نہیں لانا چاہیے تھا مگر اس کا خلوص اور انتقام لینے کی ضد دیکھتے ہوئے مجھے مجبور ہونا پڑا۔ گو شاہ جی کا خلوص بھی ہر قسم کے شبے سے بالاتر تھا مگر میرا ضمیر یہ بات گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اسے اس عمر میں جلتی آگ میں گھسیٹوں۔

''طوفان خان کے ساتھ باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔''

''وہ حاجی بہادر کا باڈی گارڈ ہے۔'' اس مرتبہ شاہ جی کا بیٹا شاہ زمان بولا۔ ''اور خود کو بڑی توپ شئے سمجھتا ہے۔ جسمانی طور پر بھی وہ کافی گرانڈیل اور مضبوط ہے، آپ دونوں تو اس کے ساتھ بچے نظر آؤ گے۔''

''بندوق کی گولی نہ طاقت دیکھتی ہے اور نہ ہی قد۔''

''بالکل۔'' شاہ جی میری تائید کی۔

”خان چچا، اس طرح کرتے ہیں کہ کل میں اور امجد دگن جائیں گے اور شاہ زمان ہماری رہنمائی کے لیے جائے گا، وہاں یہ ہمیں حاجی بہادر کی حویلی دکھا کر واپس آجائے گا۔ اس کے بعد ہم جانیں اور ہمارا کام۔“

”میں خود تمھارے ساتھ جاؤں گا کیونکہ تم دونوں علاقے اور اس کے طور طریقوں سے ناواقف ہو، میں تمھیں اکیلے کیسے بھیج سکتا ہوں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے چچا، ہم گنڈہ پوروں اور آپ کی معاشرت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، دوسرے آپ کے ساتھ جانے میں یہ قباحت ہے کہ ہم نے اپنا کام ختم کر کے چلے جانا ہے جبکہ آپ نے ہمیشہ یہیں پہ رہنا ہے۔ خدانخواستہ یہ نہ ہو کہ ہماری وجہ سے آپ کسی کے یا کوئی آپ کا دشمن بن جائے اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ اس علاقے کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں اور آپ کی وجہ سے ہم فوراً نظروں میں آجائیں گے اس طرح ہمارا کام آسان ہونے کی بجائے مزید دشوار ہو جائے گا۔“ میری مکمل کوشش تھی کہ میرا کوئی تکا اپنی جگہ پر لگے اور وہ ہمارے ساتھ جانے سے باز رہے۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر آپ لوگ شاہ زمان کو اپنے ساتھ رکھو، یہ اس علاقے سے گہری واقفیت رکھتا ہے اور آپ کے بڑے کام آسکتا ہے۔“

”اس کو تو ہم ویسے ہی ساتھ لے جا رہے ہیں اور جب تک اس کی ضرورت رہے گی اسے واپس نہیں کریں گے۔“ میں نے بات کو گول مول کیا۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا بولا گویا اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو اور لامحالہ وہ بوجھ مہمان نوازی کی روایات کو برقرار رکھنے کا تھا۔

+ + +

دگن میران شاہ کے قریب ہی واقع تھا۔ فلائنگ کوچ کے اندر سفر کرتے ہوئے ہم پندرہ، بیس منٹ میں ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ شاہ زمان کو میں نے کوچ میں بیٹھنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ اسے ہمارے ساتھ چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس وہ نارمل رفتار سے چلتا رہے، ہم بھی اس کے تعاقب میں چلتے رہیں گے تاکہ کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کا کام فقط اتنا تھا کہ وہ ملک حاجی بہادر کی حویلی تک ہماری رہنمائی کرتا۔

شاہ زمان کے پیچھے چلتے ہوئے راستے میں کسی شخص نے بھی ہمیں دیکھ کر حیرانی کا اظہار نہ کیا۔ وجہ اس کے علاوہ کوئی نہیں تھی کہ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں مختلف علاقوں سے کافی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ان میں افغانستان میں جہاد کرنے والے مجاہدین سے لے کر، مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مجرمین تک شامل ہوتے ہیں۔ کوئی قتل کر کے پولیس یا مقتول کے ورثاء سے چھپنے کے لیے یہاں پہ آیا ہوا ہوتا ہے تو کوئی چرس، افیون وغیرہ کی سمگلنگ کے لیے اسی طرح اسلحہ خریدنے کے لیے یا بغیر نمبر کی گاڑیاں اور موٹر سائیکل وغیرہ کے بھی کافی خریدار دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھنے والے ہمیں بھی انھی میں سے کوئی ایک سمجھ رہے تھے۔

ہم خاموشی سے شاہ زمان کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ روڈ سے اتر کر وہ گلیوں میں داخل ہوا اور پھر مختلف موڑ مڑتا ہوا شہر کی مغربی جانب باہر نکل آیا۔ اس سمت میں ایک بڑا سا برساتی نالہ پڑتا تھا جس کے سنٹر میں پانی بہہ رہا تھا اور یہ پانی لامحالہ برف کا تھا بقول چچا فاضل وزیرستان کی سرحدیں افغانستان سے ملی ہوئی ہیں اس لیے یہاں پر بھی کچھ علاقوں میں برف باری ہوتی ہے اور میران شاہ سے آگے کے موسم اور ہمارے پنجاب و سرحد کے موسم میں کافی فرق ہے خصوصاً گرمیوں میں اس علاقے کا موسم کافی خوشگوار ہوتا ہے۔ جبکہ سردی کی شدت میں معمولاتِ زندگی متاثر ہوتے ہیں۔

برساتی نالے کی چوڑائی خاصی زیادہ تھی مگر اس کے اندر بہنے والا پانی مقدار میں اتنا زیادہ نہیں تھا کہ پیدل چلنے والوں کے لیے رکاوٹ بنتا۔ شاہ زمان نے نالہ کراس کرنے کی بجائے اس کے کنارے کھڑے ہو کر نالے کی مخالف سمت بنے ہوئے مکانوں میں سے ایک بڑے مکان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ”وہ رہی حاجی بہادر کی حویلی۔“ ہم اس کے قریب ہی جا کر رک گئے تھے۔ اس لیے اس نے اپنی آواز بلند نہیں ہونے دی تھی۔

حویلی نالے سے کافی اونچائی پر واقع تھی شمالی جانب سے ایک ٹریک نما راستا حویلی کے داخلی دروازے تک جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس حویلی تک پہنچنے کا کوئی راستا موجود نہیں تھا۔ دفاعی لحاظ سے وہ حویلی بہت مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔

”ٹھیک ہے شاہ زمان...... ! اب آپ یوں کریں، میران شاہ واپس چلے جائیں۔ ہم چند دن یہاں پر رہ کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس دن طوفان خان پر ہاتھ ڈالیں گے اس سے ایک روز پہلے آپ کو یا خان چچا کو میران شاہ سے بلالیں گے۔“

”مگر......“

”اگر مگر چھوڑو شاہ زمان...... فی الحال تمھاری موجودی ہماری مشکلات میں اضافے کا باعث بنے گی، جب اس پر ہاتھ ڈالیں گے تو تجھے بلالیں گے ناں۔“

”ابو جان خفا ہوئیں گے۔“

”نہیں ہوتے...... کہہ دینا کہ ہم مجبور تھے...... ورنہ مددگار کس کو نہیں چاہییں۔“

”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ اسے مجبوراً راضی ہونا پڑا۔

اس سے الوداعی معانقہ کر کے اسے رخصت کیا اور نالے سے اتر گئے۔ نالا کافی وسیع تھا مگر پانی صرف اس کے درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی کی صورت بہہ رہا تھا۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے پورا نالا پتھروں سے اٹا پڑا تھا۔ جوتے اتار کر ہم نے شلواریں اوپر اٹھائیں اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نالا کراس کر لیا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا مگر پانی کی سطح ہمارے گھٹنوں سے ایک بالشت کے بقدر بلند تھی۔

”کافی ٹھنڈا پانی ہے۔“ امجد اپنی جرابوں سے اپنے پاؤں کی انگلیاں صاف کرتے ہوئے بولا۔

”پگھلی ہوئی برف ہے۔ ٹھنڈا تو اس نے ہونا ہے۔“

”اچھا، اب لائحہ عمل کیا طے کرنا ہے، راستے میں چھوٹے موٹے ہوٹل تو نظر آئے تھے مگران میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جس میں رات گزارنے کا بندوبست کیا گیا ہو۔“

”رات گزارنے کے لیے یہ چادریں جو ساتھ لائے ہیں۔“ میں نے کپڑے کے تھیلے کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں کپڑوں کا ایک فالتو جوڑااور ایک گرم چادر ڈالی ہوئی تھی۔ اپنے بیگ ہم نے خان چچا کے کہنے پر اسی کے پاس چھوڑ آئے تھے اور اس علاقے کے لوگوں کی طرح کپڑے کے تھیلے ساتھ لے کر آ گئے تھے۔

”ویسے اس حویلی کو تو دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے سر کرنے کے لیے ہمیں انفنٹری کی پوری بٹالین چاہیے ہوگی؟“

”تو ہم نے اسے کون سا سر کرنا ہے، ہمارا معاملہ طوفان خان کے ساتھ ہے اور ہم نے اسے کسی اکیلی جگہ پر گھیرنا ہے۔“

”جیسے خان چچا نے اس کی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے، لگتا ہے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات اگلوانا بہت مشکل ہوگا؟“

”انسان جتنا بھی سخت جان ہو۔ ہوتا گوشت پوست کا ہی پیکر ہے اور اس کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اب یہ طوفان خان پر منحصر ہے کہ وہ ہمیں اس حد کو کراس کرنے پر مجبور کرتا ہے یا...... آرام سے سب کچھ بتلا دیتا ہے۔“

”اچھا وہ تو بعد کی بات ہے۔ اب جو مسئلہ درپیش ہے کہ ہم طوفان خان کو پہچانتے ہی نہیں ہیں اور شاہ زمان کو بھی ہم نے واپس بھیج دیا ہے۔“

”یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔“ میں بوٹ پہن کر اٹھ گیا۔ ”فی الحال دور دور سے ملک کی حویلی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان پہاڑیوں کو بھی چیک کرتے ہیں کہ آیا ان میں شب باشی کے لیے کوئی جگہ مل جائے گی یا مسجد استعمال کرنی پڑے گی۔“

”چلو۔“ اس نے کہا اور ہم دونوں چہل قدمی کے انداز میں چل پڑے۔ حویلی سے نکلنے والا ٹریک نالے میں اتر کر ختم ہو جاتا تھا۔ حویلی کی پچھلی سمت سیدھی کھڑی چڑھائی تھی اور اس سمت سے اگر کوئی بھی حویلی تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو اپنی موت کو ہی دعوت دیتا۔ ٹریک حویلی کی شمالی سمت میں بنا ہوا تھا اس کے علاوہ جنوبی سمت سے کوشش کی جاتی تو حویلی تک پہنچا جا سکتا تھا مگر راستا کافی دشوار تھا۔ حویلی کے قریب کوئی دوسرا مکان نہیں تھا اور یہ بات حویلی کے دفاع کے حق میں جاتی تھی۔ البتہ حویلی سے پانچ چھ سو گز دور اکا دکا مکانات بنے دکھائی دے رہے تھے۔

”ویسے یار عجیب قسم کا طرز تعمیر ہے ان کا بھی۔“ امجد اطراف کے مکانوں کو بغور دیکھتا ہوا بولا۔ ”کچے بلاکوں سے دو منزلہ مکان بنائے ہوئے ہیں اور پھر مورچہ تو تقریباً ہر گھر کی چھت یا سامنے کی دیوار پر موجود ہے گویا ہر گھر ایک دفاعی قلعہ ہے...... اور کچھ لوگوں نے تو اتنی اونچائی پر مکان بنائے ہوئے ہیں کہ پتا نہیں وہاں تک انھوں نے میٹریل کی ترسیل کیسے کی ہوگی اور نہ جانے روزمرہ آمدورفت میں انھیں کتنی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔“

”ہر شخص کو اپنا گھر اور علاقہ جنت لگتا ہے کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔“

کوئی بہشت کا پوچھے تو کہہ سکوں ہنس کر
کہ وہ بھی خوب جگہ ہے ہمارے گھر کی طرح

ہم دونوں حویلی کے ٹریک پر محوسفر تھے ہمارا ارادہ تھا کہ اسی ٹریک کے ساتھ چلتے چلتے حویلی کو ایک نظر قریب سے دیکھتے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ موجود گھر کی طرف نکل جائیں جو حویلی سے چند سو گز دوری پر واقع تھا۔

ہم اس ٹریک سے کچھ فاصلے پر تھے کہ ہمیں حویلی سے ایک سرخ رنگ کی ڈبل کیبن ٹیوٹا نکلتی دکھائی دی۔"

"ماجے اس گاڑی والے پر نظر رکھنی ہے اگر کار آمد لگا تو ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"مگر یار بغیر کسی پلاننگ کے، کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔" میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ جواباً امجد خاموش ہی رہا۔

سلنگ اپ کلاشن کوف کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ گاڑی بالکل نئی تھی اور اس میں بیٹھی ہوئی شخصیت بھی لازماً اہم ہوتی تھی کہ عام ملازمین کے استعمال میں ایسی گاڑیاں نہیں دی جاتیں۔

ہم دونوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز رکھی تھی تا کہ جب گاڑی ٹریک پر موجود ایل شکل کے موڑ تک پہنچے تو ہم بھی وہاں پہنچ چکے ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے کی وجہ سے ہم اس میں موجود افراد کا جائزہ آسانی سے لے سکتے تھے، لیکن ہمارا انداز ایسا تھا جیسے کسی کام کی وجہ سے جلدی میں جا رہے ہوں اور پھر گاڑی میں بیٹھی ہوئی شخصیت پر نظر پڑتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں، اس کے جثے کو دیکھتے ہوئے میں نے بغیر کسی تردد کے اسے بطور طوفان خان پہچان لیا تھا۔ وہ گاڑی میں اکیلا تھا۔ مگر اس کے وجود سے اگلی نشست پُر لگ رہی تھی۔

"وہی ہے۔" امجد کی سرگوشی میرے کان میں گونجی اس نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔

گاڑی بمشکل وہ موڑ کاٹ کے سیدھی ہوئی تھی کہ ہم قریب پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کی سپیڈ بڑھاتا میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"سہ چل دے؟" (کیا بات ہے) وہ بریک لگاتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ شاید اسے میرا اس طرح ہاتھ دے کر روکنا ناگوار گزرا تھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی کافی ڈراؤنا تھا لمبے لمبے گھنگریالے بال چند دن کی بڑھی ہوئی شیو، سرخ آنکھیں، دائیں گال پر چاقو یا خنجر کے زخم کا ایک گہرا نشان جو ٹھوڑی تک جا کر چھوٹی چھوٹی داڑھی میں چھپ گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر گرجدار آواز جو اس کی قامت کے مطابق تھی۔

مگر ہم ایسے حلیوں سے ڈرنے والے ہوتے تو شاید اسے روکنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔

"طوفان خان سے ملنا تھا۔" میں کھڑکی کے قریب کر بولا۔ اس دوران امجد غیر محسوس انداز میں کھسکتا ہوا فرنٹ سیٹ کے دوسرے

دروازے تک پہنچ گیا تھا۔اس کی کلاشن کوف ساتھ والی نشست پر پڑی تھی۔اس نے وہ اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح دن دیہاڑے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ویسے بھی اپنے تئیں وہ دگن کا طاقتور شخص تھا۔

”میں طوفان خان ہی ہوں۔“اس کی بات ختم ہوتے ہی بجلی کے کوندے کی مانند کلاشن کوف میرے کندھے سے اتر کر ہاتھوں میں منتقل ہوئی اوراس کی قلم کی طرح ترشی ہوئی بیرل طوفان خان کی کنپٹی کے ساتھ پیوست ہوگئی۔

”اگر ذراسی بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ تیری زندگی کی آخری حرکت ہوگی۔“میرے لہجے میں پہاڑوں کی سی مضبوطی تھی۔اس کی آنکھوں میں حیرت کا شدید تاثر اجاگر ہوکر معدوم ہوگیا۔

”کیا چاہئے۔“اس کا لہجہ خوف سے عاری تھا۔

”وہ ہم بعد میں بتائیں گے۔پہلے تم مخالف سمت کا دروازہ اَن لاک کرو۔“اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرے دروازے کو اَن لاک کر دیا۔امجد نے اندر گھس کر اس کی گن کو قبضے میں کیا اور پھر پچھلی نشست کا دروازہ اَن لاک کر کے طوفان خان کی گن سمیت پیچھے منتقل ہوگیا۔ پیچھے بیٹھتے ہی اس کی گن کی بیرل طوفان خان کی کنپٹی سے آن لگی۔میں نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر ارد گرد کا سرسری سا جائزہ لیا اور پھر گھوم کر دوسری طرف کے دروازے سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ساری کارروائی کمانڈو تربیت کی مرہونِ منت تھی، ہماری ٹیکٹکس کے انسٹرکٹر میجر غوری کہا کرتے تھے کہ”ایک کمانڈو کو اپنے مشن پر جاتے ہوئے راستے میں کوئی ایسا ہدف مل جائے جو اسے اپنے مشن سے زیادہ اہم معلوم ہوتو اسے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور میسر ہدف سے پہلے نمٹنا چاہئے۔“اس بارے وہ اپنے استاد کی حقیقی زندگی کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ 1965ء کی جنگ میں وہ سیکشن کے ساتھ دشمن کے پڑاؤ پر چھاپہ مارنے جارہا تھا اوراس مقصد کے لیے وہ اپنے جوانوں کے ساتھ دشمن کے پڑاؤ کے پیچھے پہنچ گیا تھا کہ اسے دشمن کے دو سپاہیوں کی گفتگو سے پتا چلا کہ وہاں نزدیک ہی دشمن کی گن پوزیشن تھی اور بجائے پڑاؤ پر چھاپہ مارنے کے اس نے گن پوزیشن کو تباہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا حالانکہ بظاہر نظر ایک بے جان گن کبھی بھی انسان سے قیمتی نہیں ہوسکتی مگر جنگ کے میدان میں یہ معیار بدل جایا کرتے ہیں اور ایک آرٹلری کی گن سپاہ سے کئی گنا قیمتی ہوجایا کرتی ہے اور پھر وہ کوئی ایک گن نہیں تھی کیونکہ آرٹلری کی گن کبھی اکیلی دفاع میں نہیں لگتی۔گنوں اور اس کے ساتھ گولہ بارود کو تباہ کر کے جب وہ واپس پہنچے تو بٹالین کمانڈر نے اس کے فیصلے کی خوب تعریف وتحسین کی تھی۔

بہر حال وہ تو مجاہدین تھے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت ان کے ساتھ تھی۔کہاں ہم دنیادار اور کہاں وہ ملک وقوم اور اسلام کے محافظ، یوں ہی طوفان خان کے اتنا سہل اور غیر یقینی انداز میں قابو آجانے پر ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہوگیا تھا جو غیر ارادتاً قارئین کی خدمت میں پیش کردیا۔

”چلو آگے بڑھو......“میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی بولا۔”اور میرے خیال میں یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ ذراسی غلط حرکت تیری زندگی کو مختصر کرسکتی ہے۔“

اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھادی۔

"یہاں سے دائیں موڑلو اور نالے میں سیدھے چلنا شروع کردو۔" اس نے میرے کہنے کے مطابق گاڑی موڑی اور نارمل رفتار سے چلتا رہا۔اس پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ میں گردوپیش کا بھی بغور جائزہ لے رہا تھا، مجھے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں ہم بغیر کسی کی مداخلت کے اس سے پوچھ گچھ کر سکتے اور وزیرستان جیسے علاقے میں ایسی جگہ کا ملنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔امجد البتہ ہر چیز سے بے نیاز صرف اس پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

جلد ہی مجھے ایسی جگہ نظر آگئی جو پہاڑی کے اندر کی طرف دبی ہوئی تھی،فوجی زبان میں ایسی جگہ کوری انٹرنٹ کہتے ہیں۔

"یہاں سے بھی دائیں موڑلو۔" گاڑی نالے کی تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر نسبتاً ہموار زمین پر روانہ ہوگئی۔اس کو بالکل ہموار کہنا تو غلط ہوگا کہ پہاڑی کی جڑ کی طرف زمین غیر محسوس انداز میں اٹھتی جاتی ہے مگر یہ چڑھائی اتنی سخت نہیں تھی کہ گاڑی کی رفتار میں کوئی رکاوٹ آتی البتہ راستے میں جابجا بکھرے بڑے بڑے پتھر یقیناً رکاوٹ تھے۔جن سے بچنے کے لیے گاڑی کے اسٹیرنگ کو بار بار کاٹنا پڑتا۔وہ نالہ نما جگہ کافی اندر تک چلی گئی تھی۔

ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اسے گاڑی روکنے کا حکم دیا اور گاڑی رکتے ہی نیچے اتر کر گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔وہ جگہ خاصی مناسب تھی دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا اور ہمیں صرف پہاڑی کی بلندی سے دیکھنا ہی ممکن تھا۔

"طوفان خان گاڑی بند کر کے نیچے آجاؤ۔" اس مرتبہ بھی اس نے بے چوں وچراں میرے حکم پر عمل کیا تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھالو۔" میں نے اگلا حکم سنایا،اس نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔امجد بھی اس کی کلاشن کوف گاڑی میں چھوڑ کر باہر نکل آیا تھا۔

میں نے کلاشن کوف اس پر تانی۔"طوفان خان تیرا آخری وقت آگیا ہے اگر کلمہ پڑھنا ہے تو پڑھ لو میں گولی چلانے لگا ہوں۔"

"آخری خواہش پوچھ لو۔" امجد نے کلمے کے الفاظ سے میری بات کا مفہوم اخذ کر کے لقمہ دیا۔

"صحیح کہا۔" میں اس کی تائید کی اور پشتو میں بولا۔"طوفان خان اپنی آخری خواہش بتا سکتے ہو؟"

یہ سارا ڈراما اسے نفسیاتی طور پر ڈرانے کے لیے کر رہا تھا ورنہ چودھری کا پتا پوچھے بغیر میں اسے کیسے قتل کر سکتا تھا۔البتہ اس سے پوچھ گچھ کا کوئی واضح طریقہ یا ترکیب میرے ذہن میں نہیں آرہی تھی، لے دے کے ایک تشدد کا راستا بچتا تھا مگر طوفان خان جس کیٹگری سے تعلق رکھتا تھا ایسے شخص سے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات اگلوانا ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔

"صرف میرا جرم بتلادو؟"

اس کی بات سن کر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی......

"طوفان خان...... ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ہمارا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے اور ہم کرائے کے قاتل ہیں ہمارے ایک دوست نے پچھلے دنوں ہمیں ڈیرہ سے ناراین بلایا تھا اور اس نے تمھارے قتل کا معاوضہ دیا ہے۔"

''اس کا نام بتا کر آپ لوگ بے شک اپنا کام کر سکتے ہوئے۔''

''چودھری اکبر......اس کا اصل وطن تو ڈیرہ اسماعیل خان ہے، آج کل اس نے کسی دشمنی کی وجہ سے نارائن میں گھر بنایا ہوا ہے۔''

''مگر اسے تو ہم نے جنگل خیل میں چھوڑا تھا۔'' طوفان خان حیرانی سے بولا۔''اور اس کی میرے ساتھ کیا دشمنی ہے۔'' میں نے تو فقط اتنی بات کہی تھی کہ دشمنوں کے ڈر سے اپنے علاقے کو چھوڑ دینا بزدلی کی علامت ہے۔''

''شاید یہی بات ہو......بہر حال تم اب چھٹی کرو۔'' میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر ٹریگر پریس کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔اس کے بے گناہ قتل پر میرا ضمیر مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

''امجد اسے گولی مار دو۔'' آخر مجبور ہو کر میں نے اپنی گن جھکاتے ہوئے امجد سے کہا۔

''یہ ثواب کا کام تم خود ہی انجام دو۔'' وہ روکھے لہجے میں بولا۔

''بیوقوف اسے زندہ چھوڑ دینا باعث نقصان ہے۔'' میں نے دبے لہجے میں اسے جھڑکا۔

''تو میں نے کب کہا ہے چھوڑ دو۔''

میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ایک مرتبہ پھر گن سونتی اور آنکھیں بند کرتے ہوئے ٹریگر کو دبانے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ بھی میں پہلے کی طرح ناکام رہا۔

''امجد اس کی تلاشی لو۔'' اس مرتبہ میں نے زوردار لہجے میں امجد سے کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا اس کی طرف بڑھ گیا۔امجد کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ اسے میری بات سمجھ آ گئی ہے۔

طوفان خان ایک طاقتور شخص تھا۔اس سے پہلے ہم نے اسے لڑ مر کر نکلنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔مگر اب میں نے جان بوجھ کر امجد کو اس کے قریب بھیجا تا کہ وہ فرار کی کوشش کرے اور کم از کم اس طرح اسے نشانہ بنانے کا موقع ملے۔مگر اس وقت میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس نے بڑے آرام سے تلاشی دے دی اس کی جیب سے چمڑے کے کور میں بند ایک خنجر تھوڑی سی نقدی اور نسوار کی پڑیا نکلی تھی۔امجد نے بڑی لاپرواہی سے اس کی تلاشی لی تھی اور اسے کچھ کرنے کا مکمل موقع فراہم کیا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''بس یہی کچھ ملا ہے۔'' امجد اس کی جیب سے نکلنے والا سامان میری جانب بڑھایا۔

''اپنے پاس ہی رکھو۔'' کہہ کر میں طوفان خان کو گھورنے لگا جو بڑے اطمینان سے ہاتھ بلند کیے کھڑا تھا۔وہ ہمارے لیے سانپ کے منہ میں چھچھوندر ثابت ہوا تھا۔اسے مارنے کے لیے ہمارا ضمیر راضی نہیں ہو رہا تھا اور زندہ چھوڑ دینے کی مخالفت ہمارا دماغ ٹھوس دلائل سے کر رہا تھا۔چند لمحے سوچنے کے بعد ایک رسکی فیصلے پر پہنچتے ہوئے میں نے اسے کہا۔

''طوفان خان......اگر ہم تمھیں زندہ چھوڑ دیں تو کیا یہ عہد دے سکتے ہو کہ اس سارے واقعہ کو بھلا دو گے اور کسی کے سامنے بھی اس کا ذکر نہیں کرو گے،اس کے ساتھ چودھری اکبر کے خلاف بھی کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔''

''ایک شرط پر!'' اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا، یوں جیسے مذاکرات کی میز پر بیٹھا ہو۔

''وہ کیا۔'' میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

''مجھے حقیقت بتلا دیں۔ آپ کی کہانی سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ آپ پیشہ ور قاتل نہیں لگ رہے۔''

''تمھارے اندازے میں ہم کیا ہیں۔''

''چودھری اکبر کے دشمن۔'' وہ بلا جھجک بولا، واقعی اس کا اندازہ غضب کا تھا۔

''اچھا بھائی ہاتھ نیچے کرو......آؤ ادھر سائے میں تجھے اصل حقیقت بتلاتے ہیں......اور امجد اسے اس کا سامان واپس کر دو۔'' طوفان خان سے پشتو میں کہہ کر میں نے امجد سے کہا۔

طوفان خان نے ہاتھ نیچے کرتے ہوئے امجد سے اپنا سامان واپس لے کر جیب میں ڈالا اور پھر ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لئے میرے ساتھ بڑی سی چٹان کے سائے میں آ بیٹھا۔ امجد بھی ہمارے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''طوفان خان تمھارا اندازہ درست ہے......ہم واقعی چودھری کے دشمن ہیں۔ وہ ہم سے چھپ کر بھاگا ہوا ہے۔ اس کے متعلق صرف اتنی اطلاع ملی تھی کہ وہ میران شاہ میں کسی حاجی بہادر کی پناہ میں ہے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ وہ یہاں سے بھی آگے چلا گیا ہے اور اس کے متعلق صرف حاجی بہادر یا طوفان خان کو پتا ہے۔ حاجی بہادر کو اغوا کرنے میں چونکہ زیادہ محنت کرنی پڑتی اس لیے ہم نے تمھیں اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر خوش قسمتی سے تو اسی وقت ہمارے سامنے چڑھ گیا گو ہم تمھیں شکل سے نہیں پہچانتے تھے لیکن تیرا حلیہ کسی نے بڑی تفصیل سے بتلا دیا تھا، باقی کی تفصیل تمھیں معلوم ہے۔''

''اکبر کا پتا تو آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ جنگل خیل میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے یہ بات ہنوز تشنہ ہے کہ آپ لوگوں نے قاعدے کے مطابق مجھے گولی کیوں نہیں ماردی۔''

''طوفان خان! کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''مجھے گناہگار کرنے کے لیے ہی آپ نے اپنے ساتھی کو میری تلاشی لینے کے لیے بھیجا تھا نا؟'' وہ مسکرایا، میں بھی ہنس پڑا۔ وہ حقیقتاً کافی سمجھداری کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔

''تُو نے بھی تو قسم کھائی تھی ہمارے خلاف کوئی غلط حرکت نہ کرنے کی۔''

''آپ کا نام؟''

''عمر جان......''

''تو عمر جان بھائی بات یہ ہے کہ آپ دونوں کا پُر اعتماد انداز اور خوف سے خالی چہرے اس بات کے غماز ہیں کہ آپ دونوں پر قابو پانا میرے بس سے باہر تھا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میری ساری زندگی اسی کام میں گزری ہے۔میں بندے کی چال دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔''

''چلو چھوڑو اس فضول بحث کو......تو نے ہم سے سچ بات پوچھی تھی وہ ہم نے بتلادی،اب ہمارے ساتھ مردوں والا وعدہ کرو کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے اور اکبر خان کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کرو گے۔''

''آپ دونوں مطمئن رہو۔طوفان گردن کٹا سکتا ہے اپنی بات سے نہیں پھر سکتا اور جہاں تک تعلق ہے چودھری کا تو اس نے میرے ساتھ کون سی دشمنی کی ہے کہ میں اس کے خلاف کوئی ایکشن لوں گا۔''

''آخری بات یہ کہ تمھارے ساتھ کیے گئے معاہدے میں تو شامل نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر مہربانی کر سکتے ہو تو ہمیں جنگل خیل کا راستا بتا دو اور یہ بھی واضح کرو کہ آیا چودھری اکبر نے وہاں ٹھہرنے کا پکا ارادہ کیا تھا یا وہ وہاں سے بھی آگے کہیں جا سکتا ہے۔''

''دگن سے دتہ خیل تک آپ لوگوں کو ویگن مل جائے گی وہاں سے آگے بابا زیارت اور ماما زیارت تک مقامی ٹو یوٹا مل جاتی ہیں۔ ماما زیارت اور شیرانی کے درمیان قریباً شمال مغرب کی سمت پہاڑیوں میں ایک طویل راستا بنا ہوا ہے جو جنگل خیل تک جاتا ہے۔جنگل خیل کسی ایک گاؤں کا نام نہیں بلکہ وہاں بیسیوں چھوٹے بڑے دیہات ہیں ان تمام کو جنگل خیل کہتے ہیں۔باقی رہا اکبر خان کی یقینی موجودی کا تو اس کا بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔یہاں سے جاتے وقت اس کا پکا ارادہ یہی تھا کہ اس نے اگلے چند سال وہیں گزارنے تھے۔چند بندے بھی ہم نے اس کے ہمراہ بھیجے تھے جو اسے جنگل خیل کے پہلے گاؤں کے قریب چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔اب واللہ علم وہ وہیں ہے یا کسی اور سمت کوچ کر گیا ہے۔''اس کی بات ختم ہوتے ہی میں اٹھتے ہوئے بولا۔

''بہت بہت مہربانی طوفان خان۔ہماری وجہ سے آپ کو جو تکلیف اٹھانی پڑی اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں،اب آپ کو اجازت ہے آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

''مگر میری طرف سے آپ کو اجازت نہیں ہے۔''وہ کھڑے ہو کر مسکرایا۔''ایک دن کی خدمت کا موقع دیئے بغیر آپ لوگ نہیں جا سکتے۔''

''طوفان خان ہم ضرور آپ کے پاس ٹھہرتے لیکن افسوس ہمارا ٹائم بہت قیمتی ہے اور ہم آج ہی آگے جانے کی کوشش کریں گے۔''

''یہاں سے اگر آپ پبلک ٹرانسپورٹ میں گئے تو آج صرف دتہ خیل تک جاسکیں گے۔اس سے آگے کی آپ کو گاڑی کل ملے گی تو اتنا خوار ہونے کی بجائے اگر رات مجھے میزبانی کا موقع دے دو اور صبح میں خود آپ کو شیرانی تک چھوڑ آؤں، بلکہ جنگل خیل کا راستا بھی دکھا آؤں تو کیسا رہے گا؟''

میں نے امجد کو اس کا مطمع نظر بتا کر رائے لی۔

''جیسے آپ بہتر سمجھیں۔''وہ بولا۔

''یعنی طوفان خان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونا ضروری ہوگیا۔''

''یہ ہوانا خوشخبری کی بات۔''طوفان خان نے نعرہ لگایا اور ہم دونوں مسکرا پڑے۔

وہی ڈبل کیبن ٹویوٹا جس میں تھوڑی دیر پہلے ہم غاصب کی صورت بیٹھے تھے۔اس وقت معزز مہمانوں کے انداز میں براجمان ملک بہادر کے گھر کی طرف رواں دواں تھے۔

''عمر جان صیب!...... بھائی کا نام تم نے نہیں بتایا؟''

''میرا نام امجد ہے۔''میرے بولنے سے پہلے امجد نے جواب دیا۔

''آپ بھی ڈیرہ کا ہے؟''

''نہیں......میرا تعلق مانسہرہ سے ہے۔''

''تو تم لوگوں کا یارانہ کیسے بنا۔''وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہا تھا۔

''ہم دونوں فوج میں اکٹھے رہے ہیں۔''امجد نے جواب دیا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔اس کے بعد ملک بہادر کی حویلی تک وہ اسی طرح امجد سے انٹرویو لیتا رہا۔

اللہ تعالیٰ کی شان بھی عجیب ہے وہی حویلی جس کے دفاعی نظام کو دیکھتے ہوئے ہم اس میں گھسنے کا پروگرام بھی نہیں بنا سکتے تھے اس وقت ایک معزز مہمان کی طرح اس کے دروازے ہمارے لیے کھل گئے تھے۔

حاجی بہادر سے ہمارا تعارف طوفان خان نے اپنے بہت زیادہ قریبی دوستوں کے طور پر کرایا تھا۔حویلی کا دفاعی نظام ہمیں حویلی کے اندر آکر پہلے سے بھی زیادہ مضبوط لگنے لگا تھا۔

رات کو طوفان خان نے ہمارے لیے پُر تکلف دعوت کا بندوبست کیا تھا، ہمارے لیے سب سے زیادہ حیران کن کھانا حویلی کے وسیع صحن میں آگ کے الاؤ پر سالم روسٹ ہونے والے دنبوں کا تھا۔کھانا ان کی روایت کے مطابق زمین پر دستر خوان بچھا کر کھایا گیا۔کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔قہوہ پی کر ہم صحن میں بچھی چارپائیوں پر آبیٹھے۔چند افراد جیب سے سگریٹ نکال کر اس میں چرس بھرنے لگے۔

''اگر آپ لوگ چرس،افیون یا کسی اور نشے کا شوق رکھتے ہو تو ہر چیز ادھر دستیاب ہو جاتی ہے۔''طوفان خان نے ہم سے پوچھا۔

''شکریہ......ہم ان نعمتوں سے دور ہیں۔''

اور طوفان خان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔اسی وقت ایک شخص رباب لیے نمودار ہوا اس کے ہمراہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں مٹی کا گھڑا تھا ،دونوں دستر خوان کے لیے بچھائی گئی دری کے اوپر بیٹھ گئے اور پھر رباب کے تاروں سے جادو بھری آواز سُر کی شکل میں نکلی۔گھڑا بجانے والے نے بھی رباب کے سُر کے ساتھ اپنے گھڑے کی تھاپ کو ملا لیا۔رات گئے تک وہ پشتو کی مختلف غزلیں اور گیت گا کر ہمیں محظوظ کرتے رہے۔یہاں تک کہ ہم نے طوفان خان سے سونے کی اجازت طلب کی جس کے ساتھ ہی وہ محفل اختتام کو پہنچی۔ویسے بھی مجھے گانے سننے کا

بالکل شوق نہیں تھا لیکن میزبان کی دل آزاری کے خوف سے میں خاموش رہا، البتہ وقت میں نے ضائع نہیں ہونے دیا تھا اور دبی زبان میں طوفان خان سے جنگل خیل کے متعلق مختلف قیمتی سوالات پوچھتا رہا تھا۔

سونے کے لیے بھی حویلی کے صحن کو ہی استعمال کیا گیا تھا۔ پُر تکلف غذا اور پھر سارے دن کی تھکن کی وجہ سے ہم چار پائی پر لیٹتے ہی پُر سکون نیند میں ڈوب گئے تھے۔

+ + +

''آپ لوگ پسند کرو تو کچھ راستے تک میں آپ لوگوں کے ساتھ جا سکتا ہوں۔'' جنگل خیل کے راستے کی نشاندہی کرتے ہوئے طوفان خان نے پیشکش کی۔ وہ پگڈنڈی نما راستا ایک اونچی پہاڑی کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ دگن سے مسلسل تین گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم وہاں تک پہنچے تھے۔

''بہت شکریہ طوفان خان۔ آگے ان شاء اللہ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔ آپ صرف اتنی رہنمائی کر دیں کہ اس کے علاوہ بھی جنگل خیل تک جانے کا کوئی راستا ہے۔ میرا مطلب ایسے راستے سے ہے جس پر بندہ گاڑی میں بیٹھ کر جا سکے۔''

''گاڑی کا راستا تو موجود ہے...... لیکن وہ راستا بہت زیادہ طویل ہے، 4 سے 5 دن لگ جاتے ہیں کیونکہ اس کے لیے بندے کو پہلے افغانستان کی سرحد کراس کرنی پڑتی ہے اور پھر وہاں سے جنگل خیل کے لیے دوبارہ پیچھے آنا پڑتا ہے۔ طوالت کے ساتھ اس راستے کی حالت بھی بہت خستہ و خراب ہے، میں زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس راستے سے جنگل خیل تک گیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ مجھے وہ راستا استعمال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ افغانستان سے البتہ اس کا راستا اتنا دشوار گزار نہیں ہے۔''

''یہاں سے کتنا ٹائم لگ جائے گا؟''

''یہ آپ لوگوں کی رفتار پر منحصر ہے۔ نارمل رفتار سے چلیں تو دو سے تین دن لگ جائیں گے۔''

''اچھا طوفان خان اب ہم اجازت چاہیں گے۔'' اس کی بات ختم ہوتے میں نے اس سے ملنے کے لیے بازو پھیلاتے۔ ''اگر زندگی رہی تو ان شاء اللہ دوبارہ ملیں گے۔''

''ان شاء اللہ۔'' اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچا۔ ''بس میری یہ بات یاد رکھنا کہ وہ علاقہ کافی خطرناک ہے اور اپنے نام کی طرح وہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ جو طاقتور ہو وہی وہاں کا ملک اور سردار ہے اور علاقے کی اسی خوبی کی بنا پر چودھری اکبر نے اسے پسند کیا تھا۔ اسے وہاں گئے ہوئے تین چار ہفتے ہونے والے ہیں اب تک تو شاید اس نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے ہوں۔''

''ہم ضرور آپ کی ہدایات کا خیال رکھیں گے۔'' میں اس سے علیحدہ ہو کر بولا۔

امجد کو سے چھاتی لگا کر وہ اپنی ڈبل کیبن ٹویوٹا میں بیٹھتا ہوا بولا۔

''عمر جان...... چودھری اکبر سے مل کر گندہ پور قوم کے متعلق جو برا تاثر میرے دل میں اُجاگر ہوا تھا آپ سے ملنے کے بعد بالکل

زائل ہو گیا ہے۔"

"طوفان خان میں یہ تو نہیں کہتا کہ گنڈہ پور قوم کوئی بہت اچھی قوم ہے البتہ اتنا ضرور بتاؤں گا کہ چودھری اکبر کا تعلق گنڈہ پور قوم سے نہیں ہے۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا وہ چودھری اکبر ہے اور چودھری اس کا نام نہیں بلکہ قوم ہے۔"

"غلط فہمی دور کرنے کا شکریہ۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اور خدا حافظ۔" کہہ کر اس نے واپسی کے لیے گاڑی موڑ لی۔

"چل بھئی ماجے۔" میں نے جنگل خیل کے رستے کی طرف قدم بڑھائے۔ "بڑا شوق تھا تجھے وزیرستان کی سیر کرنے کا۔"

"تجھ سے تو کچھ کم ہی تھا۔"

میں خاموش ہی رہا تھا۔ نا معلوم جنگل خیل میں ہمارے لیے کون کون سے ہنگامے منتظر تھے۔

+ + +

جنگل خیل کا راستا کافی دشوار گزار تھا۔ چڑھائی بالکل سیدھی تھی اور تنگ راستے پر بمشکل ایک آدمی چل سکتا تھا۔ میں امجد سے چند قدم آگے تھا۔ جن حضرات کا پہاڑی علاقے سے واسطہ پڑ چکا ہو ان کے علم میں یہ بات ضرور ہو گی کہ چڑھائی چڑھنا کس قدر مشکل اور تکلیف دہ کام ہوتا ہے۔ شمالی علاقہ جات میں گزارے ہوئے عرصے کی بدولت ہم دونوں کو پہاڑوں میں زندگی گزارنے کا کافی تجربہ تھا۔ جب ہم وہاں نئے نئے تعینات ہوئے تھے تو ہم سے پہلے وہاں پہ موجود ساتھی ہمیں چڑھائیاں چڑھنے کی یہ ٹیکنیک بتلاتے تھے کہ "خود نہ تھکو بلکہ پہاڑوں تھکاؤ۔"

یعنی اتنا آہستہ چلو کہ سانس نہ چڑھے اور پہاڑ تمھارے چڑھنے کا انتظار کر کر کے تھک جائیں۔ اس وقت بھی ہم اس مقولے پر عمل پیرا ہو کر آہستہ آہستہ بلندی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ہم بغیر رکے مسلسل ایک گھنٹا محوِ سفر رہے یہاں تک کہ چند میٹر ہموار سطح آنے کے بعد راستا ہلکا سا دائیں مڑ کر ایک بار پھر بلند ہونے لگا اس مرتبہ ہمارے دائیں ہاتھ پر کھڑی چٹان تھی بالکل دیوار کی طرح سیدھی جسے ہم فوجی زبان میں "کلف" کہتے ہیں۔

میں تقریباً اوپر پہنچ گیا تھا جبکہ امجد مجھ سے چند قدم پیچھے تھا اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ "اف" کی آواز کے ساتھ دائیں جانب گرا۔ اس کے پھسلنے کی آواز سنتے ہی میں پیچھے کے جانب مڑا۔

"سنبھل کے ماجے۔" حالانکہ یہ بات کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور امجد بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس جگہ سے نیچے گرنے کا کیا مطلب ہے۔ مگر کہتے ہیں ناہونی شدنی ہو کر رہتی ہے۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود وہ راستے سے نیچے کی طرف کھسکا اور دوسرے ہی لمحے وہ بلندی سے دھکیلے گئے پتھر کی طرح اس سیدھی ڈھلان سے نیچے کی طرف بڑھا۔ میں گھبرا کر چیخا......

"امجد، د، د، د" خوف سے ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں بند ہو گئیں تھیں۔ دوبارہ آنکھیں کھولنے پر مجھے امجد ایک جھاڑی کو پکڑ کر لٹکا نظر آیا اس کی خوش قسمتی کہ وہ جھاڑی اس کے گرنے کے مقام سے چند میٹر نیچے زمین کے متوازی اُگی ہوئی تھی۔ نیچے گرتے ہوئے بھی

امجد نے اپنے حواس پر قابو رکھا تھا اور اس جھاڑی پر اپنی گرفت قائم کر لی تھی۔ ایسی جھاڑیوں کی جڑیں بہت مضبوطی سے پہاڑ میں پیوست ہوتی ہیں اور ان کی اسی مضبوطی کی وجہ سے اس وقت امجد اس جھاڑی کے ساتھ سیدھا لٹک رہا تھا۔ وہ غیر اہم سی جھاڑی جو چند لمحے پہلے ہماری نظر میں کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی اس وقت ہفت اقلیم کی دولت سے بھی زیادہ حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

''شاباش ماجے، اسے مضبوطی سے تھامے رہو...... اور نیچے نہیں دیکھنا۔ بس چند میٹر کا فاصلہ ہے میں ابھی تجھے کھینچ لیتا ہوں۔'' اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اپنی کلاشن کوف سے سلنگ نکالی مگر اس کی لمبائی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ امجد تک پہنچ سکتی۔ امجد کی اپنی گن اور کپڑے کا تھیلا نیچے گر چکے تھے۔ میں نے اپنے تھیلے میں موجود گرم چادر نکالی اور پنڈلی سے بندھے ہوئے خنجر کو کھول کر چادر کو لمبائی میں تین برابر ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔ ان ٹکڑوں اور سلنگ کو میں نے دوروسوں کو جوڑنے والی گانٹھ ریف ناٹ کی مدد سے مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ گانٹھوں کی مختلف اقسام ہم پہاڑی علاقے کے کورس میں بڑی تفصیل سے سیکھ چکے تھے۔ یہ کورس ہم نے رٹو سکول میں اپنی کمانڈو سروس کے دوران کیا تھا۔ قارئین کے لیے شاید دلچسپی بتاتا چلوں کہ گانٹھوں کی تقریباً 18 اقسام ہیں، ان کے بارے بیان کرنے کا تو یہ موقع نہیں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ گانٹھیں عام زندگی میں بھی بڑی مددگار اور مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی ریف ناٹ سے چادر کے ٹکڑے جوڑتے ہوئے مجھے یہ اطمینان حاصل تھا کہ وہ گانٹھ خود بخود کسی قیمت پر نہیں کھل سکتی تھی۔ تھوڑا سا نیچے ہو کر میں نے راستے میں اپنے بیٹھنے کے لیے ایک جگہ منتخب کی، اپنے دونوں پاؤں پہاڑ میں مضبوطی سے گڑے ہوئے پتھروں پر ٹکا کر میں نے رسّی امجد کے جانب لٹکا دی۔ سلنگ والی سائیڈ میں نے امجد کی طرف رکھی تھی اور سلنگ کے سرے پر پھانسی کے پھندے کی طرح کا حلقہ بنا دیا تھا تاکہ امجد اس میں سے اپنا ہاتھ گزار کر پکڑے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ سلنگ ہاتھ سے پھسل جانے کی صورت میں بھی وہ نیچے نہیں جا سکتا تھا۔

امجد کی نگاہیں میری جانب ہی مرکوز تھیں، جیسے ہی سلنگ کا حلقہ اس کے ہاتھ تک پہنچا اس نے جھاڑی پر بائیں ہاتھ کی گرفت قائم رکھتے ہوئے دایاں ہاتھ آہستہ سے رسّی کے حلقے کی جانب بڑھایا۔ ایک ہاتھ سے اپنے پورے بدن کو سہارنا بہت مشکل کام ہے اور جب سچویشن ایسی ہو کہ ہاتھ چھوٹنے کا مطلب صریحاً موت ہو تو پھر یہ کام اور بھی دشوار اور مشکل ترین ہو جاتا ہے، مگر وہ امجد تھا اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایک ہاتھ سے لٹکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سلنگ کو تھام لیا اور پھر دوسرا ہاتھ بھی جھاڑی سے ہٹا کر سلنگ پر جما دیا اور اس کے ایسا کرتے ہی اس کے تمام جسم کا بوجھ میرے دونوں بازوؤں پر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے چادر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پیچھے کے جانب لیٹ گیا۔ میری ذرا سی لغزش اور کمزوری سے ہم دونوں آسانی سے موت کے سفر پر روانہ ہو سکتے تھے۔ وہ بے جان پتھر جس پر میں نے اپنے دونوں پاؤں ٹکائے ہوئے تھے، مجھے بہت تقویت دی تھی اس کی غیر موجودی میں شاید مجھے زیادہ محنت کرنا پڑتی۔ پیچھے کی طرف جھکنے کی وجہ سے امجد میری نظروں سے اوجھل تھا لیکن خودساختہ رسّی کو لگنے والے جھٹکے اس کی پیش قدمی کے غماز تھے۔ وہ چند میٹر کا فاصلہ طے کرنے میں شاید امجد کو پانچ سے دس منٹ لگے ہوں مگر وہ منٹ ہمارے لیے صدیوں پر محیط ہو گئے تھے۔ اوپر پہنچتے ہی امجد میرے ساتھ بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی قمیص پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

''شہلا بی شادی سے پہلے بیوہ ہونے چلی تھی۔'' وہ اپنا سانس درست کرتے ہی بولا۔

''اس کے لیے تو بہتر ہی یہی تھا۔جس کام کے لیے اس نے شادی کے بعد دعائیں مانگنی ہیں اگر وہ شادی سے پہلے ہو جاتا تو کیا مضا نقہ تھا۔''

''غلط فہمی ہے تمھاری۔'' اس نے برا سامنہ بنایا۔''اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو وہ رو رو کر جان دے دیتی۔''

''اسے سادہ الفاظ میں تم شادیٔ مرگ کہہ سکتے ہو۔''

''اچھا بکواس کرنے کی ضرورت نہیں اور پانی پلاؤ۔''

''تمھارے غصے کو دیکھ کر لگتا ہے میں نے سچ بات کہی ہے۔'' میں پانی کی بوتل تھیلے سے نکال کر اس کے جانب بڑھائی۔

''ہونہہ!...... بڑا آیا سچا۔'' وہ پانی کی بوتل منہ سے لگا کر غٹا غٹ آدھی بوتل پی گیا۔ مجھے بھی اس وقت کافی پیاس محسوس ہو رہی تھی اس لیے بقیہ آدھی بوتل میں نے چڑھا لی اور خالی بوتل تھیلے میں رکھ لی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آگے پانی ہمیں کتنی دیر بعد میسر ہوتا، مگر ٹریننگ نے ہمیں یہ سکھلایا تھا کہ اگر کبھی ایسے حالات میں پھنس جاؤ جہاں پانی ملنے کی امید نہ ہو یا کم ہو تو اپنے پاس موجود پانی وقفے وقفے سے گھونٹ بھی دو گھونٹ اور کبھی زبان تر کر لینے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ ایک ہی مرتبہ سیراب ہو کر پانی پیا جائے اور ہماری اس وقت کی جدوجہد کا تقاضہ یہی تھا کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کر کے آگے جانے کے لیے خود کو تیار کرتے۔

''چلیں؟'' امجد نے پوچھا۔

''چلو۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ چند منٹوں بعد ہی ہم نسبتاً ہموار جگہ پر پہنچ گئے تھے اس کے بعد اترائی تھی اور اس طرف اِکا دُکا درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ چڑھائی کے برعکس اترائی میں بہت کم توانائی خرچ ہوتی ہے لیکن رستا دشوار ہونے کی صورت میں گرنے کا خطرہ اترائی میں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے اترائی بہت ہموار تھی اور نیچے لڑھکنے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم ٹہلنے کے انداز میں اترتے چلے گئے۔ اوپر کی نسبت نیچے درخت زیادہ تھے۔ ایک جگہ درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ہمیں پتھروں کے درمیان صاف و شفاف پانی چمکتا نظر آیا وہ ایک چھوٹا سا چشمہ تھا اور پانی ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع ہو گیا تھا۔

''کتنی خوب صورت جگہ ہے۔'' امجد چشمے اور اس کے ساتھ موجود درختوں کے جھنڈ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیٹھو کھانا کھا لیتے ہیں۔'' پانی کو دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی تھی۔

ہم دونوں کے پاس اپنا اپنا کھانا موجود تھا مگر امجد کا تھیلا نیچے گر چکا تھا۔اس کے لیے ہمیں صرف ایک بندے کے کھانے پر گزارہ کرنا پڑ گیا۔ یوں بھی ہمیں کھانے کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی۔ ہم کئی دن تک بھوک برداشت کر سکتے تھے۔کھانا کھا کر ہم نے چشمے کے ٹھنڈے پانی سے سیراب ہو کر پانی پیا اور پھر بوتل کو بھر کر وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

''امجد یہ گن رکھ لو۔'' میں نے کلاشن کوف اس کے جانب بڑھائی۔''میرے پاس پستول موجود ہے۔''

امجد نے خاموشی سے کلاشن کوف پکڑ کر کندھے سے لٹکالی۔ ہمارے سامنے ایک بڑی سی وادی تھی جو کافی سرسبز تھی۔ درختوں کے جھنڈوں کے ساتھ اِکا دُکا گھر بھی نظر آرہے تھے۔

''جانو..... تُو نے طوفان خان سے جنگل خیل کے متعلق کافی معلومات حاصل کیں تھیں، تیرے خیال کے مطابق ہم کب تک وہاں پہنچ جائیں گے۔''

''جہاں تک جنگل خیل کا تعلق ہے تو وہ اس وادی سے شروع ہو جاتا ہے۔'' میں نے اپنے سامنے پھیلی وادی کے جانب اشارہ کیا۔ ''البتہ یہاں خال خال گھروندے نظر آرہے ہیں وادی کے پار پہاڑی کراس کر کے کافی بڑے بڑے گاؤں شروع ہو جاتے ہیں اور جنگل خیل کا علاقہ افغان بارڈ بلکہ اس سے بھی کافی اندر تک چلا جاتا ہے۔ اس سارے علاقے کو جنگل خیل کہتے ہیں۔ پہچان کی خاطر ہر چھوٹے بڑے گاؤں کا اپنا نام بھی ہوتا ہے۔ اب اکبر خان اس سارے علاقے میں کہاں چھپا ہے، اس کے لیے ہم نے خود ہی تگ و دو کرنی ہے طوفان خان اس سے متعلق بس اتنا بتا سکا ہے کہ اکبر خان یہ وادی عبور کر کے سامنے والی پہاڑیوں کے پیچھے موجود کسی گاؤں میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جنگل خیل کے نام سے یہاں دو گاؤں بھی مشہور ہیں۔''

ہم پہاڑی سے نیچے اتر کر اس وادی میں چلنا شروع ہو گئے تھے۔ سورج کا سفر زوال کے جانب شروع ہو گیا تھا۔

''جانو صاحب !..... کہیں رات گزارنے کے لیے جگہ ڈھونڈو۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہاں کی رات پنجاب جیسی ہو گی۔''

''یہ بات تجھے نیچے لڑھکنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ دونوں گرم چادروں کا بیڑہ غرق کر کے یہ خیال آرہا ہے کہ رات کو سردی ہو گی۔''

''ملک جانو صاحب!..... میں ایڈوانس میں تجھے اس لیے بتا رہا ہوں کہ ملازمین کی شب بسری اور کھانے پینے کی ضرورت مالک کے ذمہ ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے جو مالک کھائے وہ تُو بھی کھا لینا اور جہاں سوئے گا تجھے بھی سلا دے گا۔''

''فلسفہ نہیں چلے گا ملک صاحب !۔''

''اگر اس بکواس کی بجائے تم دائیں بائیں نگاہ دوڑاؤ تو شاید کوئی موزوں جگہ مل ہی جائے۔''

''یہ میری نہیں تمھاری ذمہ داری ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

میں نے اسے جواب دینے کی بجائے دائیں بائیں غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران ہم بغیر رکے سیدھے چلے جا رہے تھے۔ اچانک ایک جھاڑیوں کے جھنڈ سے دو تین بکریاں اور انھیں ہنکارتی ہوئی ایک نوجوان لڑکی باہر نکلی وہ مقامی لباس میں ملبوس تھی۔ عورتوں کا مقامی لباس گھگرا۔ پاجامہ اور ایک بڑے دوپٹے پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ لباس ستر پوشی کے سارے شرعی تقاضے پورے کرتا ہے۔ سردیوں گرمیوں میں اس علاقے کی خواتین اس لباس میں ملبوس نظر آتی ہیں۔

ہم پر نظر پڑتے ہی وہ لڑکی ٹھٹک کر رک گئی اور جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کر کے چہرہ ڈھانپنے لگی۔

امجد نے کہا۔ ’’اسی سے رہائش کی بات نہ کرلیں؟‘‘

’’ماجے صاحب اگر تُو نے ضرور اکبر خان سے ملاقات سے پہلے مرنے کی ٹھان لی ہے تو ایسا کر لیتے ہیں؟‘‘

’’کیا مطلب ہے؟‘‘ وہ حیرانی سے بولا۔

’’مطلب یہ ہے کہ تم لاہور میں نہیں گھوم رہے۔ یہ وزیرستان ہے یہاں پرائی عورتوں سے بات کرنا۔ نہ صرف ناپسندیدہ اور معیوب ہے بلکہ کسی حادثے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ عورت کے بھائی، باپ یا شوہر کی صرف ایک گولی ضائع ہوگی اور ماجے صاحب جنت یا جہنم کا ٹکٹ لے کر پیا دیس سدھا دیں گے۔‘‘

’’کیوں میں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں کیا؟ یا میرے پاس ہتھیار نہیں ہے۔‘‘

’’اچھا دفع کرو اس بحث کو۔‘‘ میں نے جان چھڑائی۔ ’’اور شب بسری کا کچھ سوچو۔‘‘ اس وقت ہم لڑکی سے آگے بڑھ آئے تھے۔

مگر اس سے پہلے کہ امجد میری بات کا جواب دیتا۔ اس لڑکی نے ہمیں آواز دی۔

’’رورا !...... چہ تاسو مسافر یئے نو شپہ منگ کور کے اوکڑے‘‘ (بھائی اگر آپ لوگ مسافر ہو تو رات ہمارے گھر میں گزار لو۔)

ہم دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔

’’کیا کہہ رہی ہے؟‘‘ امجد مستفسر ہوا۔

’’کہہ رہی ہے کہ اگر مسافر ہو تو رات ہمارے ہاں گزار لو۔‘‘

’’واہ...... اسے کہتے ہیں نیت صاف اور منزل آسان۔‘‘

’’خورے ڈیرا مہربانی‘‘ (بہن بہت مہربانی) آپ کا گھر کس طرف ہے؟‘‘

’’سیدھے چلتے جائیں، اس بڑے درخت سے دائیں مڑ جانا۔‘‘ اس نے قریباً سو گز دور ایک نمایاں درخت کی طرف اشارہ کیا۔

اور میں سر ہلاتا ہوا امجد کو ساتھ لیے اس درخت کے جانب چل دیا۔ وہ بھی اپنی بکریوں کو ہنکاتی ہمارے پیچھے چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد میں ہم اس کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے، گھر کے باہر ایک صحت مند بوڑھا کلھاڑی کے ساتھ خشک لکڑیوں کے ٹکڑے کر رہا تھا۔ ہم پہ نظر پڑتے ہی اس نے کلھاڑی پھینکی اور کسی شناسا کی طرح بڑی گرمجوشی سے ’’پخیر پخیر‘‘ کہتے ہوئے ہمارے جانب بڑھا۔

’’السلام علیکم ماما۔‘‘ میں نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔

’’وعلیکم السلام۔‘‘ اس کا لہجہ نہایت شیریں اور اخلاص سے پُر تھا۔ اس نے پُر تپاک انداز میں ہم دونوں سے معانقہ کیا۔ ’’آپ لوگوں کو غالباً پلوشہ بیٹی لے کر آئی ہے۔‘‘

’’جی ابو جان۔‘‘ اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا جواب دیتا پلوشہ ہمارے پیچھے نمودار ہوئی۔

’’آؤ بیٹا بیٹھو۔‘‘ وہ ہمیں مکان کے سامنے پڑی ہوئی چار پائی کی طرف لے گیا۔

''بیٹی مہمانوں کے نہانے کے لیے باتھ روم میں پانی رکھ دو۔'' ہمیں چار پائی پر بٹھا کر وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوا۔اس کے انداز میں اتنی بے تکلفی اور شفقت تھی کہ ہم خود کو بِن بلایا مہمان سمجھنے کی بجائے اس کے خصوصی مہمان سمجھ رہے تھے۔

بیٹی کو پانی لانے کا کہہ کر وہ خود گھر کے اندر گھس گیا۔واپسی پر اس کے ہاتھ میں مٹی کی درمیانے سائز کی صراحی تھی جس میں وہ ٹھنڈا پانی لے کر آیا تھا۔پانی عجیب قسم کی فرحت بخش ٹھنڈک لیے ہوئے تھا۔پانی پینے کے دوران پلوشہ مکان کے سامنے بنے ہوئے پتھر کے باتھ روم میں پانی کی دو بالٹیاں رکھ چکی تھی۔

''ابو جان پانی رکھ دیا ہے۔مہمانوں کو کہیں نہالیں۔''

''جاؤ بیٹا ایک ایک کر کے نہالو۔'' وہ مشفق لہجے میں بولا اور میں سر ہلاتا ہوا باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ہم دونوں جب تک نہا کر تازہ دم ہوتے وہ خوشبودار قہوہ بنا کر لے آیا تھا۔نہانے اور قہوہ پینے سے ہماری تھکن بالکل اتر گئی تھی۔ اس دوران اس بوڑھے کا اندازِ گفتگو بالکل ایسا رہا جیسے وہ برسوں سے ہمارا واقف کار اور شناسا ہو۔

''بیٹا ایک منٹ میں وضو کر کے آتا ہوں پھر نماز پڑھتے ہیں۔'' ہمارے قہوہ پیتے ہی وہ اٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ وضو کر کے آگیا۔اس کی اقتدا میں ہم نے شام کی نماز باجماعت ادا کی نماز کے بعد وہ تو کھانے کا بندوبست کرنے کے لیے گھر میں گھس گیا جبکہ میں اور امجد اس بے لوث شخص کی مہمان نوازی پر تبصرے کرنے لگے۔

کھانا ہم نے عشاء کی نماز پڑھ کر کھایا۔مرغی کا سالن اور تندوری روٹیاں، ہم گنجائش سے بھی زیادہ کھا گئے تھے۔روٹی کے بعد قہوے کا دور چلا اس دوران ہم گپ شپ کرتے رہے۔امجد کے بارے یہ جان کر وہ پشتو نہیں جانتا اس بزرگ نے اس سے اردو میں حال احوال پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی اردو ایسی تھی کہ اس سے زیادہ پشتو امجد کو سمجھ آجاتی ۔مگر اس کا دل رکھنے کے لیے امجد سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا اور ٹکے سے ٹوٹ پھوٹے جواب بھی دیتا رہا۔مگر بزرگ کی اردو زیادہ دیر اس کا ساتھ نہ دے سکی اور امجد کی جان بخشی کرتے ہوئے وہ مجھ سے پشتو میں مخاطب ہوا۔

''بیٹا برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں؟''

''ماما جی ایک چھوڑ دس پوچھو۔'' میں سعادت مندی سے بولا۔

''آپ لوگ جنگل خیل کس سلسلے میں جا رہے ہو؟ اگر سیر و تفریح کا ارادہ ہے تو ہماری بہرام شاہ وادی بھی خوب صورتی میں جنگل خیل سے پیچھے نہیں آپ لوگ یہیں پر جتنا عرصہ جی چاہے رہ جاؤ میں آپ کو پوری وادی کی سیر کراؤں گا۔''

نہیں ماما ! ہم سیر و تفریح کے لیے نہیں بلکہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔''

''اگر آپ لوگوں کو کوئی اسلحہ وغیرہ یا نشہ وشہ چاہیے ہو تو وہ بھی میں آپ کی جگہ جنگل خیل جا کر لے آسکتا ہوں۔''

''ہماری غرض و غایت یہ بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا وجہ ہے۔ وہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ لوگ جنگل خیل کا رخ کریں۔''

''کیوں ماما؟''میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''وہ اس لیے بیٹا کہ آپ دونوں کے چہرے پر مجھے خاندانی شرافت اور سعادت مندی کے آثار نظر آرہے ہیں جبکہ جنگل خیل میں تو اپنے نام کی مثل جنگل کا قانون ہی چلتا ہے۔ وہاں پہ طاقت اور غنڈہ گردی کا راج ہے۔ پورے پاکستان، وزیرستان، افغانستان، اور روس کی مختلف ریاستوں کے لچے لفنگے وہاں جمع ہیں۔ مختلف گروہوں کی بادشاہی ہے آئے روز فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ جگہ شریفوں کے جانے کے لائق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ دونوں کا وہاں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔''

''ماما جی اللہ تعالیٰ آپ کو عزت اور زندگی دے کہ آپ نے ہمارے لیے اتنا کچھ سوچا مگر کاش ہم آپ کی بات ماننے کے قابل ہوتے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ماما جی میں گنڈہ پور ہوں......اور ایک گنڈہ پور سب کچھ بھلا سکتا ہے اپنے دشمن سے بدلہ لینا نہیں بھول سکتا۔''

''ہوں۔''کہہ کر بابا گہری سوچ میں کھو گیا اور پھر تھوڑی بعد اس نے پوچھا......

''آپ لوگوں کو کامل یقین ہے کہ آپ کا دشمن وہیں پہ چھپا ہے۔''

''جی''میں اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا پھر اس سلسلے میں مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''آپ کی دعاؤں کی ہمیں ہر آن ضرورت رہے گی۔''

''آپ دونوں کے پاس ایک ہی کلاشن کوف دکھائی دے رہی ہے اگر پسند کرو تو میں اپنی کلاشن کوف آپ لوگوں کے حوالے کر سکتا ہوں۔''

''جزاک اللہ ماما جی۔ گن کے علاوہ ہمارے پاس یہ پستول بھی موجود ہے۔''میں نے جیب سے گیرا گٹ مارک تھرٹین نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔''اور ویسے بھی ضرورت پڑی تو ہم وہیں سے خرید لیں گے پیسے کافی ہیں ہمارے پاس۔''

''بہر حال آپ لوگوں کے پاس آج شب سوچنے کے لیے موجود ہے اس بارے کوئی مناسب حل سوچ لو میں نہیں چاہتا کہ جنگل خیل کا اندھیرا آپ لوگوں کو نگل جائے۔''

''اللہ خیر کرے گا ماما جی......بس آپ ہمارے لیے خصوصی دعا کرنا۔''

''اچھا اب آپ لوگ آرام کرو۔ رات کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو طلب کر لینا۔''

وہ ہمیں بیٹھک میں چھوڑ کر گھر میں گھس گیا۔ اس کے جاتے ہی امجد کے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور مجھے بابا جی سے سنی

ہوئی تمام باتیں ازسرِ نواسے تفصیل سے سنانی پڑیں۔

”ویسے چودھری اکبر نے چھپنے کے لیے صحیح جگہ کا انتخاب کیا ہے۔“ تمام تفصیل سنتے ہی وہ بولا۔

”لازمی بات ہے جان تو ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے۔ چودھری بھی اپنے دفاع کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گا۔“

امجد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جسے غنیمت سمجھتے ہوئے میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں دن کی تھکن اور بے آرامی نے جلد ہی مجھے نیند کی آغوش میں دھکیل دیا تھا۔

+ + +

صبح کے وقت ہم روزمرہ کے معمولات اور ناشتے کے بعد جانے کے تیار کھڑے تھے بابا جس کا نام عبداللہ تھا نے ہماری بہت اچھے طریقے سے مہمان نوازی کی تھی۔ حالانکہ اس کے مکان اور کپڑوں وغیرہ کی حالت چیخ چیخ کر اس کی غربت کا اعلان کر رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی کچھ مالی امداد کر دوں مگر مجھے پتا تھا کہ اس نے کسی حالت میں بھی یہ امداد قبول نہیں کرنی تھی۔

امجد میری پریشانی بھانپ گیا تھا۔ اس لیے پنجابی میں کہنے لگا۔ ”اس کی بیٹی کو کسی بہانے کچھ رقم دے دو۔“ مجھے امجد کی ترکیب بہت بہتر لگی۔

”اچھا ماما اب ہم چلتے ہیں......لیکن ہماری چھوٹی بہن نظر نہیں آ رہی جو ہمیں مہمان بنا کر لائی تھی۔“

”وہ گھر میں ہی ہوگی۔ ناشتا کر کے اپنی ماں کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے گی اور پھر بکریاں لے کر وادی میں نکل جائے گی۔“

ہمیں یہ بتا کر وہ اپنی بیٹی کو آوازیں دینے لگا۔ ”بلوشہ۔ او بلوشے۔“

”جی ابو جان۔“ وہ سر پہ دوپٹہ درست کرتے گھر سے باہر آ گئی۔

”گڑیا ادھر آؤ۔“ میں نے اسے اپنی جانب بلایا اور وہ جھجکتے ہوئے ہمارے قریب آ گئی۔

”بہن آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ کی وجہ سے ہمیں کافی راحت و آرام ملا۔ میران شاہ سے چلتے وقت ہمیں پتا نہیں تھا کہ راستے میں ہماری ملاقات ایک ننھی سی بہن سے ہو جائے گی ورنہ ہم ضرور اپنی گڑیا کے لیے تحفے تحائف لاتے۔ بہر حال ابھی یہ تھوڑی سی رقم ہے اس سے اپنی مرضی کی کوئی چیز خرید لینا۔“ میں نے جب سے 5 ہزار کی رقم نکال کر اس کے جانب بڑھائی۔ اس نے گھبرا کر اپنے والد کے جانب دیکھا تو وہ پریشانی سے بولا۔

”بالکل نہیں بیٹا......آپ لوگوں کو آگے رقم کی بہت ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میں آپ دونوں کی جگہ پر اس کے لیے میران شاہ سے تحفے منگوا لوں گا۔“

”ماما جی آپ ہمارے درمیان بالکل نہیں بولیں گے۔ یہ بھائی اور بہن کا معاملہ ہے اگر اس نے رقم نہ لی تو ہم سمجھیں گے کہ اس نے ہمیں بھائی نہیں سمجھا تھا۔“

''نن......نہیں بھیا۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں اصل میں۔''

''اصل نقل چھوڑو۔'' میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بھائیوں سے تو بہنیں زبردستی رقم نکلوالیتی ہیں تم کیسی بہن ہو کہ بھائی کی دی ہوئی رقم کو ٹھکرا رہی ہو۔''

میری جذباتی دھمکی کارگر رہی اور اس نے جھجکتے ہوئے رقم لے لی۔

میری دیکھا دیکھی امجد نے بھی آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اتنی ہی رقم زبردستی اسے تھما دی۔

''اب ہم چلتے ہیں گڑیا، ہمارے لیے دعا کرنا۔'' یہ کہہ کر ہم دونوں عبداللہ خان سے بغل گیر ہو کر جنگل خیل کی راہ ہو لیے۔ جب تک ہم نظر آتے رہے باپ بیٹی وہیں کھڑے ہمیں جاتا دیکھتے رہے یہاں تک کہ درختوں کے جھنڈ نے ہمیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

''بہنیں بھی اللہ تعالی کی عجیب نعمت ہوتی ہیں۔'' امجد نے خاموشی کو توڑا۔

''ہاں یار......عورت کا ہر روپ ہی نرالا ہے......ماں کے روپ میں قدموں تلے جنت رکھتی ہے تو بیوی کے روپ میں راحت وسکون ہے بیٹی کے روپ میں سراپا رحمت اور بہن کے روپ میں عزت وحرمت کا نشان ہے۔''

''ویسے تیرے خیال میں ہم سامنے والی پہاڑی کس ٹائم تک عبور کر لیں گے۔'' اس نے موضوع بدلا۔ اسے پتا تھا کہ مزید اگر کچھ دیر اس موضوع پر بات ہوئی تو میں نے امی جان اور سعدیہ کی یادوں میں کھو جانا تھا۔

''حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے...... پہاڑی علاقہ ہے اور یہاں فاصلے دھوکا دیتے ہیں۔ اگر تجربے کی بات کروں تو تمھیں بھی یاد ہوگا کہ ہمارے انسٹرکٹرز کہتے تھے کہ سورج اگر آپ کی پشت پر چمک رہا ہو تو ہدف آپ کو اصل فاصلے سے دور نظر آئے گا اور ہدف اگر ارد گرد کی چیزوں سے بڑا ہو تو نزدیک نظر آئے گا۔ ابھی اس ہدف میں متضاد باتیں پائی جا رہی ہیں اس کا مطلب ہے یہ جتنی دور نظر آ رہا ہے یہ اس کا درست فاصلہ ہے۔ اس لحاظ سے ہم تین چار گھنٹوں میں اس پہاڑی کے بیس میں پہنچ جائیں گے البتہ اس کی چڑھائی چڑھنے میں کتنا ٹائم خرچ ہوگا یہ نزدیک جا کر اوپر چڑھنے والے راستے کو دیکھ کر پتا چلے گا۔''

''میں تم سے متفق نہیں ہوں۔'' امجد بولا۔ ''تمھاری پہلی بات تو درست ہے کہ سورج ہماری پشت پر چمک رہا ہے۔ مگر دوسری بات بالکل غلط ہے کیونکہ ہدف بے شک بڑا ہے مگر اس کے ارد گرد موجود پہاڑ بھی اسی نسبت سے بڑے ہیں، اس لحاظ سے یہ پہاڑی اپنے اصل فاصلے سے دور نظر آ رہی ہے اور اگلے دو گھنٹوں میں ہم اس کے بیس میں ہوں گے''......اور امجد کا تجزیہ درست نکلا۔ اگلے دو سوا دو گھنٹوں میں ہم پہاڑی کی بیس میں پہنچ چکے تھے۔ وہ کوئی اکیلی ٹیکری نما پہاڑی نہیں تھی بلکہ پہاڑیوں کا ایک مسلسل سلسلہ تھا اور اس سلسلے میں ہم خصوصی طور پر جس پہاڑی کی بات کر رہے تھے وہ ارد گرد کے پہاڑوں سے اس لحاظ سے مختلف تھی کہ باقی پہاڑیوں کے مقابلے میں اس پر سبزے کی بہتات تھی اس کی یہ نشانی ہمیں طوفان خان نے بتلائی تھی اور بعد میں عبداللہ خان نے اس کی تصدیق کی تھی۔

پہاڑی کے بیس میں پہنچ کر ہم آرام کے لیے چند لمحے بھی نہیں رکے تھے۔ ویسے بھی درختوں کے بیچ اوپر جانے کا راستا صاف نظر آرہا تھا اس لیے ہم نے اپنا سفر جاری رکھا، رفتار البتہ پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھی۔

''ارے اس جگہ سے اترنا تو ناممکن ہے۔'' اوپر پہنچتے ہی امجد اس پہاڑی کی نیچے اترتی سیدھی ڈھلان کو دیکھ کر واویلا کیا۔

''ادھر سے کس بیوقوف نے تجھے اترنے کا کہا ہے۔''

''تو پھر؟''

''ابھی ہم نے سکائی لائن پر ہی حرکت کرنی ہے۔''

''تو اس سے بہتر نہیں تھا کہ ہم اوپر چڑھنے کی بجائے نیچے ہی نیچے سفر کرتے اور جس جگہ اب نیچے اتریں گے۔ اسی کی مخالف سمت اوپر چڑھ جاتے۔''

''اگر گدھوں کو اعتراض نہ ہوتا تو میں ضرور تجھے گدھا کہتا۔ بیوقوف جو لوگ اس راستے کو استعمال کرتے رہے ہیں میں انھی کی رہنمائی کے مطابق چل رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے جس جگہ اترنے کا راستا ٹھیک ہو اس جگہ کی چڑھائی ناقابل عبور ہو۔''

''شکریہ آپ نے اپنے ہم جنسوں کا اعتراض مجھ تک پہنچا دیا۔''

ہم کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے...... اس خاموشی کو امجد نے ہی توڑا۔

''جانو صاحب!...... بھوکا مارنے کا ارادہ ہے۔ کچھ کھانے پینے کے بارے بھی سوچو۔''

''کوئی موزوں جگہ نظر نہیں پڑ رہی۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھائیں گے۔''

''چھوڑو چشمے کو...... بوتلوں میں پانی موجود تو ہے۔'' وہ راستے کے قریب ایک گھنے درخت کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ صبح سے ہم بغیر رکے چل رہے تھے لیکن کوئی خاص تھکن نہیں ہوئی تھی اور اس کی وجہ کمانڈو ٹریننگ تھی ورنہ ان علاقوں میں مسلسل اتنی دیر تک سفر کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہم چند منٹ پاؤں پسار کر پتھریلی زمین پر بیٹھ گئے۔ اس طرح بیٹھنے سے بڑا سکون مل رہا تھا۔ تیز دھوپ اور کٹھن سفر کی وجہ سے جسموں سے نکلنے والا پسینہ چند لمحوں میں ہی خشک ہو گیا تھا۔ پنجاب کے لحاظ سے ہمیں مارچ کے اخیر اور اپریل کے پہلے ہفتے کے موسم کی طرح کا موسم محسوس ہو رہا تھا۔ امجد نے کپڑے میں بند روٹی کھول کر درمیان میں رکھی۔ تندوری روٹی، جنگلی ساگ جس میں ممتا کی محبت اور ہمشیرہ کے پیار کی خوشبو رچی بسی تھی ہم چند لمحوں میں سب چٹ کر گئے۔

''جانو صاحب مجھے تو نیند آرہی ہے۔'' امجد پتھر پر سر ٹیک کر لیٹ گیا۔ ''اگر تُو نے جانا ہے تو بصد شوق تشریف لے جا سکتے ہو۔''

''ماجے!...... آگے راستا خطرناک ہے۔ روشنی میں جتنا سفر طے ہو جائے بہتر ہے رات گزارنے کے لیے کوئی ٹھکانہ بھی ڈھونڈنا ہے ہر جگہ پلوشہ بہن نہیں ٹکراتی کہ جو زبردستی مہمان بنا کر ساتھ لے جائے۔''

''اللہ کسی کو بھی تیرے جیسا سخت مالک نہ دے...... غضب خدا کا سارا دن خوار کرنے کے بعد بھی چند لمحوں کا آرام اسے برا لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔" ساری رات آرام ہی تو کرنا ہے۔" مگر وہ خاموش رہا تھا۔

اس مرتبہ ہماری رفتار پہلے کے مقابلے میں کچھ کم تھی۔کھانا کھانے کے بعد جسم آرام کا طلب گار ہوتا ہے۔مگر ہماری قسمت میں آرام نہیں تھا۔سورج غروب ہونے میں تھوڑی دیر ہی باقی تھی کہ ہم اترنے کی جگہ پہ پہنچ گئے۔اس کی نشانی طوفان خان اور عبداللہ خان کے مطابق پہاڑی سلسلے کا دو حصوں میں منقسم ہونا تھا۔ایک شاخ اسی سیدھائی میں چلی گئی تھی جبکہ دوسری شاخ بائیں طرف مڑ گئی تھی۔اس کے علاوہ پار کی پہاڑی اس جگہ آ کر ختم ہو گئی تھی اور وہاں ایک بڑا سا خشک نالہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ماجے...... یہاں سے اتر کر اس نالے میں سفر کرنا ہے۔"

"ویسے آپ ٹھیک کہہ رہے تھے یار اس جگہ سے اوپر آنا ناممکن ہے۔" اس نے آنے کی سمت کی چڑھائی کے جانب اشارہ کیا۔

"ہاں مگر اترائی بہت مناسب ہے۔" میں نیچے اترنے میں پہل کی، وہ بھی سر ہلاتے ہوئے میرے پیچھے چل پڑا۔ہم اب تک درمیان میں ہی تھے کہ سورج ڈوب گیا مگر اندھیرا نہیں چھایا تھا۔نالے کے درمیان اور پہاڑی کی تقریباً چوتھائی بلندی تک کافی گھنے درخت تھے ہم ان درختوں کے جھنڈ سے کوئی پچاس ساٹھ قدم دور تھے کہ اچانک وہاں سے تین افراد برآمد ہوئے ان کا رخ ہماری جانب ہی تھا، ہمیں دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکے گویا ہم پہ اسی وقت ان کی نظر پڑی تھی اور پھر ہماری طرف چل پڑے۔

"پہ دے لارہ تا سو سوک جینئی خونہ دہ لیدلے۔"(اس راستے پہ آپ نے کوئی لڑکی تو نہیں دیکھی) نسبتاً چھوٹے قد والے نے پوچھا۔وہ تمام مضبوط بدن اور میانہ قامت افراد تھے۔تمام کے سر پر عورتوں کی مانند لمبے لمبے بال تھے۔کلاشن کوفیں انھوں نے کندھوں سے لٹکانے کی بجائے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی تھیں۔مگر ہم سے بات کرنے والے کا قد باقیوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا اور اس کے پوچھنے کا انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حکم دینے کا عادی ہے۔ہم سے بھی اس نے اسی طرح حکمیہ لہجے میں بات کی تھی۔

جواباً میں نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"مجھے جھوٹ بولنے سے سخت نفرت ہے۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا اور کلاشن کوف میری طرف تان لی۔امجد نے کلاشن کوف کندھے سے لٹکائی ہوئی تھی۔مگر بدقسمتی سے مخالف نے بغیر کسی وجہ کے گن مجھ پر تان لی تھی۔امجد نے بعد میں گن کندھے سے اتارنے کی کوشش کی۔ مگر وہ امجد کو ایسا موقع نہیں دے سکتے تھے۔گولی چلنے کا دھماکہ ہوا، گولی اس کے سر سے چند انچ ہی اوپر گزری ہوگی۔

"کلاشن کوف لاندے غزار کا"(کلاشن کوف نیچے پھینک دو) مخاطب امجد تھا۔امجد نے ہونٹ بھینچتے ہوئے گن اپنے پاؤں میں گرا دی۔اس کے ساتھیوں نے بھی کلاشن کوفیں ہماری طرف سیدھی کر لی تھیں۔

"میرا نام ہیبت خان ہے اور میں نے بڑے بڑے بگڑوں ہوؤں کو سیدھا کیا ہے۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ سچ سچ بتا دو لڑکی کو کہاں چھپایا ہے۔" اس مرتبہ بھی پستہ قامت ہی بولا تھا۔جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ باقی دونوں یا تو اس کے ملازم تھے یا کم از کم رتبے میں اس سے نیچے تھے۔

''آپ ہیبت خان ہیں یا وحشت خان ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ اگر ہم نے کسی عورت یا لڑکی کو دیکھا ہوتا تو ضرور آپ کو مطلع کرتے۔ اس لیے بات بڑھانے سے بہتر ہے کہ آپ اپنی راہ لیں اور ہمیں بھی جانے دیں۔'' میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

''ہاہاہا...... سن رہے ہو حکم داد!...... بات بڑھانے سے بہتر ہے ہم اپنی راہ لیں۔ کل کا لونڈا ہیبت خان کو نصیحت کر رہا ہے۔'' اس کے دونوں ساتھی بھی ہنس پڑے تھے۔

''حکم داد ذرا ان کی تلاشی لو تاکہ پتا چلے یہ کتنے پانی میں ہیں۔ ایسے لونڈے کافی نقدی جیبوں میں لیے پھرتے ہیں۔''

ایک سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھا اس کا رخ میرے جانب تھا سب سے پہلی غلطی جو اس سے سرزد ہوئی وہ اپنی گن کو کندھے سے لٹکانے کی تھی۔ دوسرے نمبر پر وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں اور ہمارے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں چونکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو صرف گن فائیٹر ہوتے ہیں بچپن ہی سے ہتھیاروں کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے ان کا نشانہ بہت اچھا اور ہتھیار پر کنٹرول و قابو بہت بہتر ہوتا ہے مگر بغیر ہتھیار کے وہ جسمانی طاقت کے بل پر کسی کو زیر کرلیں تو دوسری بات ہے۔ خالی ہاتھ لڑنے کے فن سے بہر حال ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ اینڈتا ہوا میرے قریب پہنچا۔ اس کا ارادہ میری تلاشی لینے کا تھا جبکہ میں نے اس کے لیے کوئی اور پروگرام سوچا ہوا تھا۔ اس نے شاید کبھی اتنی لمبی چھلانگ نہ لگائی ہو جس طرح کہ اس وقت وہ اُڑ کر گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک کی کلاشن کوف گرجی مگر یہ اضطراری فائر تھا جو اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے اس نے گن کی نالی آسمان کی طرح کر کے کیا تھا۔

امجد کے لیے اتنی مہلت کافی تھی اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنے قدموں میں پڑی کلاشن کوف اٹھالی۔ حکم داد ہیبت خان اور اپنے دوسرے ساتھی کو ساتھ لیے نیچے گر گیا تھا۔

ان کے سنبھلنے سے پہلے امجد دھاڑا......

''خبردار کوئی حرکت نہ کرے۔'' امجد کی اردو شاید انھیں سمجھ نہیں آئی تھی کہ ہیبت خان نے لیٹے لیٹے ہی اپنی کلاشن کوف کا رخ ہماری طرف کرنا چاہا مگر امجد تیار تھا اس کی گن سے نکلنے والی گولی ہیبت خان کے بازو میں پیوست ہو گئی تھی۔

''اگر زندگی عزیز ہے تو ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' اس مرتبہ میں نے انھیں پشتو میں خبردار کیا۔

لیکن شاید انھیں زندگی عزیز نہیں تھی انھوں نے میری دھمکی کی قطعاً پرواہ نہ کی اور اس کی وجہ غالباً ان کا وہ جاہلی غرور و تکبر تھا جس کی بدولت وہ کسی کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور یہ غرور انھیں لے ڈوبا۔ اس مرتبہ امجد نے سنگل شاٹ کی بجائے سلیکٹو لیور کو برسٹ پر سیٹ کرتے ہوئے ٹریگر پریس کیا، شام کے سناٹے میں کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ گونجی اور تینوں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

''جانو غلط تو نہیں کیا؟''

''نہیں ٹھیک ہوا ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی بچ جاتا تو ہمارے لیے ایک نیا محاذ کھل جاتا۔''

''اب ان کا کیا کریں؟''

''ان کے پاس موجود ایمونیشن حاصل کرو اور چلتے ہیں یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں، گو فائرنگ یہاں آئے روز کا معمول ہے لیکن پھر بھی برے وقت کا کوئی پتا نہیں چلتا یہ نہ ہو کوئی ہمیں یہاں دیکھ لے اور ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کی شروعات ہو جائے۔''

ہم نے جلدی سے ان کی سرسری تلاشی لی نقدی اور ایمونیشن کو اپنے قبضے میں کرتے ہوئے ہم وہاں سے روانہ ہو گئے لیکن اس سے پہلے ان کی لاشیں راستے سے تھوڑا ہٹ کر موجود ایک گڑھے میں دھکیلنا نہیں بھولے تھے۔ کلاش کوفیں بھی ان کے ساتھ ہی گڑھے میں پھینک دی تھیں۔ یہ ایک وقتی احتیاط پسندی تھی ورنہ راستے میں کافی مقدار میں ان کا خون پھیلا ہوا تھا۔ جس سے آسانی سے ان کی لاشوں کی نشاندھی ہو جاتی تھی، لیکن رات کے وقت کسی کو بھی راستے میں پڑا خون نظر نہیں آسکتا تھا، صبح تک ہم نے یوں بھی اس جگہ سے کافی دور نکل جانا تھا۔

''ماجے!......اب راستے سے ہٹ کر چلنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، مگر آسمان کو دیکھ رہے ہو۔''

''کیا مطلب؟''میں نے اوپر دیکھا۔

''بادل دیکھو کس تیزی سے اکٹھے ہو رہے ہیں اگر بارش شروع ہو گئی تو ہم اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکیں گے۔''

''یہ تو ہے۔''میں نے اس کی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی اور شام کا ملگجا اندھیرا بادلوں کے باعث گہرا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں راستے سے آہستہ آہستہ دائیں ہٹتے جا رہے تھے۔

''رات گزارنے کے لیے کوئی موزوں جگہ بھی دھیان میں رہے۔''

''اس اندھیرے میں موزوں جگہ خاک ملے گی۔''مگر میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر دائیں بائیں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا رہا۔

''جانو!......اگر ہم کسی کے مہمان بن جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔''

''میں نے تو سوچا تھا کہ ڈاکٹر شہلا جیسی پڑھی لکھی لڑکی کا ساتھ تم پر کچھ اثر ڈالے گا مگر اس کے آثار نظر نہیں آرہے تیرا گدھا پن پہلے کی طرح روز افزوں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔''

''اس میں گدھے پن کی کیا بات ہے؟''

''بیوقوف......ہم تین آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں۔ اور ان کے گھر یا قبیلے کے لوگ قاتل کی تلاش ارد گرد کے علاقے سے ہی شروع کریں گے اور اس کے بعد ہمارا منظرِ عام پر آنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔''

''ہم نے کون سا ہفتہ گزارنا ہے۔ صبح ہوتے ہی نکل چلیں گے۔''

''اگر ہم اپنے دشمن کی تلاش میں اتنی دور کا سفر کر سکتے ہیں تو ان لوگوں کے لیے جنگل خیل تک ہمارا پیچھا کرنا کوئی اتنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''اچھا ٹھیک ہے یار!......نہیں ٹھہرتے کسی کے گھر میں؟''اس نے کلاشن کوف کو کندھے سے الٹا لٹکا لیا کیونکہ ہلکی ہلکی بوندیں گرنا

شروع ہوگئی تھیں اور بیرل میں پانی کے قطرے چلے جانے کی صورت میں بیرل کے زنگ پکڑنے کا خدشہ تھا۔ بارش کی رفتار میں آہستہ آہستہ تیزی آتی گئی۔ ہم مزید کچھ دیر اسی طرح بغیر آڑ کے رہتے تو مکمل بھیگ جاتے مگر خوش قسمتی سے آسمانی بجلی کی چمک میں میری نظر دائیں طرف چند قدم کے فاصلے پر موجود ایک کھوہ پر پڑی۔ یہ غیبی امداد تھی کیونکہ میرا غار کے دھانے کی جانب دیکھنا اور بجلی کا چمکنا ایک ہی لمحے میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ غار کے دھانے کے ساتھ ایک جھاڑی نما درخت بھی موجود تھا جس نے کافی حد تک اس کے منہ کو ڈھانپا ہوا تھا۔

''ماجے اس طرف۔'' میں پہاڑی کھوہ کی طرف بڑھ گیا۔ امجد بھی بغیر کچھ کہے میرے پیچھے چل پڑا۔

اچانک بارش کی رفتار میں اضافہ ہوا لیکن بارش کی تیزی بھی مجھے حفاظتی قدم اٹھانے سے باز نہ رکھ سکی۔ میں نے بائیں ہاتھ میں پستول تھامتے ہوئے دائیں ہاتھ سے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اسے جلا کر کھوہ کے اندر گھس گیا۔ کسی بھی نقصان پہنچانے والے درندے سے نمٹنے کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس چند گز لمبی غار میں کسی درندے کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرانی نہ ہوتی جتنی اس نوجوان لڑکی کو دیکھ کر ہوئی تھی جو ہمارے اندر داخل ہوتے ہی گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا ہراساں چہرہ اس خوفزدہ چوہیا کی مانند لگا جس نے بلی کو دیکھ لیا ہو اور اس کے لیے کوئی راہ فرار بھی نہ ہو۔

''جانو یہ کون ہے'؟'۔ امجد نے اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''اللہ کی مخلوق ہے بھائی۔''

''تت......تا......سو......سوک یئی۔'' (آپ کون لوگ ہو) وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''گھبراؤ مت ہم مسافر ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

یہ سن کر اس کے چہرے کی رنگت بحال ہونے لگی۔ چہرے کے نقوش سے وہ کافی دلکش اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ٹارچ آف کر دی روشنی میں خواہ مخواہ وہ جھجک محسوس کرتی۔

''آپ......آپ......کہاں سے آرہے ہیں......اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''ہم میران شاہ سے آرہے ہیں، جنگل خیل میں کام تھا۔''

''راستے میں آپ کو بہرام شاہ وادی کی طرف کوئی جاتے ہوئے ملا تھا۔''

''نہیں۔'' میں دانستہ جھوٹ بولا۔

''تھوڑی دیر پہلے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ آپ لوگوں نے کی تھی؟''

''نہیں۔'' ایک مرتبہ پھر میرا جواب نفی میں تھا۔

''ہوں۔'' کہہ کر وہ خاموش رہی۔

''آپ کیوں پوچھ رہی ہیں کہیں......آپ یہاں کسی کے ڈر سے تو نہیں چھپیں؟''

”نن.....نہیں تو۔“ وہ گڑبڑا گئی۔

”میٹوں تاں اے اوہا کڑی لگ رہی ہیے جدے بارے اومنحوس پچھ رہیا سی۔“ (مجھے تو یہ وہی لڑکی لگ رہی ہے جس کے بارے وہ منحوس (ہیبت خان) پوچھ رہا تھا۔“ امجد نیچے بیٹھتے ہوئے پنجابی میں بولا۔ تا کہ وہ لڑکی ہماری بات چیت نہ سمجھ سکے۔

”ٹھیک پہچانا۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”ویسے کیا خیال ہے اس کی مدد نہ کی جائے مجھے تو یہ مظلوم لگ رہی ہے؟“

”پنگا لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے مجھے جھڑکا۔ ”یہاں ہر دوسرا بندہ مظلوم ہے ہم کس کس کی مدد کرتے پھریں گے۔“

”خواہ مخواہ کی پنگا بازی کے حق میں تو میں بھی نہیں ہوں۔ میرا مقصد فقط اتنا تھا کہ اسے گھر والوں تک پہنچا دیا جائے......اور بس۔“

”ایک تو ہر خوب صورت لڑکی کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں مردوں میں ہمدردی کے جذبات اتنی شدت سے ابھرتے ہیں کہ انھیں مقصد سے بھی غافل کر دیتے ہیں؟“

”آ......آپ لوگ کس زبان میں باتیں کر رہے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں امجد کو کرارا سا جواب دیتا وہ لڑکی درمیان میں بول پڑی۔ لہجے میں موجود پریشانی اس سے نہ چھپائی گئی تھی۔

”ہماری آپس کی بات ہے، تمھارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔“ میرے لہجے میں چھپی بے رخی نے اسے چپ سادھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عورت تو نام ہی مجبوری کا ہے۔ رات کے اندھیرے اور اتنے خراب موسم میں دو اجنبی مردوں کے درمیان ایک ایسی لڑکی کا پھنس جانا جو خوب صورت بھی ہو کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

”تمھیں شاید میری بات بری لگی ہے......لیکن اگر ہمدردی کو ایک جانب رکھ کر سوچو تو تمھیں یہ غلط نہیں لگے گا۔ ضروری نہیں کہ یہ لڑکی وہی ہو جس کے بارے میں وہ پوچھ رہے تھے۔“ امجد دانستہ ہیبت خان کا نام گول کر گیا۔ ”اور اس کا گھبرانا یا جھجکنا اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس وقت میں دو اجنبی مردوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ دوسرا اگر ہم رسک لیتے ہوئے اسے ان مردار ہونے والوں کا بتا دیں تو یہ مطلوبہ لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس راز کو راز نہ رکھ سکے گی جب ہم اسے گھر والوں تک پہنچائیں گے تو اس بات کا لازمی چرچا ہو گا اور ہم منظر عام پر آ جائیں گے۔ ان کے دشمن ہمیں بھی اپنے دشمنوں کی فہرست میں شامل کر لیں گے۔ ٹھیک ہے زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن خواہ مخواہ اپنی توانائیوں کو ضائع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے، بے شک ایسی سرگرمیاں اس سے ہمیں غافل نہ کر سکیں گی......مگر دور ضرور کر دیں گی اور ہماری مشکلات میں اضافے کا باعث بنیں گی۔ باقی مرضی تیری اپنی ہے۔ اپنے ہر کام اور ارادے میں تو مجھے شانہ بشانہ پائے گا۔“

اس کی کھری کھری باتیں میری سوچ کو کسی اور جانب لے گئیں اور میں غار کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ امجد نے بھی میری خاموشی دیکھتے ہوئے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے کافی دیر تک مختلف سوچوں میں گم رہا یہاں تک کہ امجد کے بھاری سانسوں کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔ اسے پتا تھا کہ میرے لیے سونا مشکل ہو گا اس لیے وہ بے دھڑک سو گیا تھا۔ غار سے باہر

بارش اسی تسلسل سے جاری تھی مگر غار کے اندر ماحول کافی خوشگوار تھا۔ ہلکی خنکی محسوس ہونے کے باوجود اگر ایک کمانڈو سونے کی کوشش کرتا تو وہ آسانی سے کامیاب ہوسکتا تھا۔ جس طرح کہ امجد اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا وہ لڑکی رو رہی ہے۔ مجھ سے صبر نہ ہوسکا میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا......

''کیا ہوا......کیوں رو رہی ہو؟''

''ک......کک کچھ نہیں۔ میں رو تو نہیں رہی۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''تمھارا نام کیا ہے۔'' میں نے سلسلہ گفتگو دراز کیا۔ ہزار قسم کے دلائل دینے کے باوجود میں خود کو اس سے لاتعلق نہیں رکھ سکا تھا۔

''سعدیہ۔''

''کیا؟'' میرے لہجے میں حیرانی کا عنصر نمایاں تھا۔

''جی سعدیہ۔'' اس نے اپنا نام دہرایا۔

''اس غار میں کیسے پھنس گئی ہو؟'' میں نے اس سے وہ سوال پوچھا جو مجھے شروع میں پوچھنا چاہئے تھا۔

''مم......مم میں......اپنی بکری کو تلاش کر رہی تھی کہ بارش شروع ہوگئی مجبوراً مجھے یہاں پناہ لینی پڑی۔ میرا گھر یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے۔ بارش رکتے ہی چلی جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ اور انداز واضح طور پر اس کے جھوٹا ہونے پر چغلی کھا رہا تھا۔

''اب تو کافی دیر ہوگئی ہے۔ یہ نہ ہو گھر والے تیرے لیے پریشان ہوں۔''

''ن......نن نہیں میں انھیں بتا کر آئی تھی کہ اگر لیٹ ہو جاؤں تو پریشان نہیں ہونا میں بکری تلاش کر کے ہی واپس آؤں گی۔ یوں بھی ہماری کسی سے دشمنی تھوڑی ہے کہ انھیں پریشانی ہو؟''

''ہیبت خان سے بھی کوئی دشمنی نہیں۔'' میں نے ایسا سوال کیا کہ اس کی سٹی گم ہوگئی اور چند لمحوں تک وہ کچھ نہ بول سکی مگر جب بولی تو الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''ی......یہ ہے......بت......ک......کک......کون ہے۔''

''ہے نہیں تھا۔ ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا ہے۔ راستے میں ملا تھا کسی لڑکی کے بارے پوچھ رہا تھا۔ اظہار لاعلمی پر ہمارے ساتھ بھڑ گیا نتیجتاً اپنی اور دو ساتھیوں کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ لڑکی تم ہو۔''

''کک......کون سی لڑکی۔'' وہ گھبرا گئی۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں مم مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔''

''سعدیہ گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں نے تمھارے سامنے کوئی غلط بیانی نہیں کی یہ تمام باتیں بالکل سچ ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میری ساتھی سے بھی اسی موضوع پر بحث ہو رہی تھی کہ تیری مدد کی جائے یا نہ کی جائے مگر تمھارا نام سننے کے بعد میں اتنا کر سکتا ہوں کہ تجھے گھر والوں تک بہ خیریت پہنچا دوں۔ کیونکہ تم میری ایک عزیز ہستی کی ہم نام ہو جو ایک حادثے میں مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی

ہے۔البتہ اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے نہ رکھنا۔‘‘
’’گھر،کون سا......گھر۔‘‘وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔’’جب ایک مرتبہ لڑکی گھر سے باہر نکلتی ہے تو گھر والوں کا اعتبار اس سے اٹھ جاتا ہے ہمارے ہاں لڑکی گھر سے ایک مرتبہ ہی رخصت ہوتی ہے۔چاہے گھر والوں کی مرضی سے ہو،اپنی مرضی سے ہو یا اس کا سبب کوئی اور ہو۔اس کی واپسی بہر حال ممکن نہیں رہتی۔‘‘
’’کیا مجھے اپنی کہانی سنا سکتی ہو؟‘‘میں اس کے لہجے میں چھپے دکھ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔
’’میری کہانی بڑی مختصر سی ہے۔‘‘اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا دکھ سمٹ آیا۔’’میں ہیبت خان جیسے شقی القلب کے ظلم کا شکار ہوئی ہوں۔ہیبت خان اور اس کا بھائی باسمت خان دونوں لڑکیوں کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتے ہیں۔دور دراز علاقوں میں جا کر شادی کے بہانے کمسن لڑکیوں کو ان کے والدین سے خرید کر لے آنا اور پھر انھیں عرب کی مختلف ریاستوں کے رئیسوں کو بیچنا،اگر کسی دور دراز گاؤں میں کوئی اکیلی خوب صورت لڑکی انھیں مل جائے تو اسے یہ اغوا کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ایسی لڑکیوں کو یہ بہت سنبھال کر رکھتے ہیں کہ ان کا معاوضہ انھیں بہت اچھا ملتا ہے۔میں باسمت خان کی منکوحہ ہوں،مگر شادی کے بعد پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی اس نے مجھے چھوا تک نہیں تھا،ایک دن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ شراب کے نشے میں دھت گھر میں داخل ہوا اور پھر اپنے آپ کو مجھ سے باز نہ رکھ سکا۔جب ہیبت خان کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی کی خوب بے عزتی کی۔وہ دونوں اس وقت بیٹھک میں مصروف گفتگو تھے۔ہیبت خان میرے شوہر کو کہہ رہا تھا۔
’’تمھاری بے غیرتی کی وجہ سے اب کوئی رئیس بھی اسے خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔وہ ان چھوا مال مانگتے ہیں اور منہ مانگے دام ادا کرتے ہیں۔‘‘
’’بھائی جان کوئی بات نہیں۔‘‘باسمت خان دبے لہجے میں بولا تھا۔’’عرب رئیس نہ سہی لاہور کے کئی کاروباری اچھے داموں اسے خرید لیں گے۔پہلے بھی تو اس طرح کئی دانے ہم نکال چکے ہیں۔‘‘
’’لاہور بیوپاریوں اور عرب شیخوں کے معاوضے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے سمجھے۔‘‘
ہیبت خان نے کہا اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔’’بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تم اس طرح کرنا آج رات یہیں بیٹھک میں سو جانا غلطی تو تم سے ہو گئی ہے اب کچھ اپنے بارے بھی سوچ لیں کافی وقت گزر گیا ہے اس طرح کے کسی پیس سے لطف اندوز نہیں ہو سکا ہوں۔آج میری باری ہے۔‘‘ان کی باتیں سن کر میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی،ان کی گفتگو سے کچھ تو میں سمجھ گئی تھی باقی ملازمہ نے بتا ان کے کرتوتوں کے بارے آگاہ کر دیا اور میں اسی وقت ان کے گھر سے نکل بھاگی۔اپنے تئیں وہ اس بات سے مطمئن تھے کہ میں ان کے کردار سے لاعلم ہوں اور ان کی اسی بے خبری کی سے میں نے فائدہ اٹھایا،لیکن بدقسمتی سے میں تھوڑی دور ہی آئی ہوں گی کہ ہیبت خان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اس وقت وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کہیں سے آ رہا تھا اس نے میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔میرا ارادہ سیدھے راستے پر سفر کرنے کا تھا

مگر بعد میں مَیں نے راستے کو چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔اس کے بعد کے واقعات آپ کے علم میں ہیں۔"

"تیرا شوہر بے غیرت نکلا...... ہیبت خان کی دسترس سے اللہ تعالٰی نے تجھے محفوظ رکھا اور وہ جہنم واصل ہو چکا ہے۔اب ان شاء اللہ ہم تجھے خیریت سے والدین تک پہنچا دیں گے اس کے باوجود تم اتنی پریشان اور غمگین دکھائی دے رہی ہو۔گھر والوں کو جب تم اپنی کہانی سناؤ گی تو یقیناً وہ تمھیں قبول کرنے میں پس وپیش سے کام نہیں لیں گے۔"

"یہ بات اتنی بھی آسان نہیں ہے جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔میں ابھی تک باسمت خان کے نکاح میں ہوں۔اس نے قیمت چکائی ہوئی ہے میری...... پھر میرے والد نہایت غریب آدمی ہیں اور ہم جنگل خیل کے باسی ہیں جس میں ہر شخص اپنا جوابدہ خود ہوتا ہے جبکہ باسمت خان کی پشت پر اس کا پورا گاؤں ہے۔اگر اس کا گاؤں بھی اس کے ساتھ نہ ہو تب بھی ہمارا گھرانہ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس بار اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گئی تو بہت برا سلوک کرے گا میرے ساتھ...... میری وجہ سے اس کا بڑا بھائی بھی مارا جا چکا ہے۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ اپنی راہ لیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔یہ نہ ہو میری نحوست آپ لوگوں پر بھی پڑ جائے اور آپ لوگوں کو باسمت خان یا اس کے آدمیوں سے کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے۔"

"اس بات کی فکر تم مت کرو۔" میں اٹھ کر غار کے دھانے کی طرف بڑھ گیا تاکہ باہر بارش کا جائزہ لے سکوں۔بارش بالکل رک چکی تھی لیکن آسمان ابھی تک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔میں اندر آ کر بیٹھ گیا۔امجد کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز تواتر سے آ رہی تھی۔سعدیہ خاموش ہو گئی تھی۔میں نے بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی نیند مجھے تازہ دم کر سکتی تھی۔سونے کی کوشش کامیاب رہی اور چند لمحوں میں مَیں گہری نیند سو گیا۔

+ + +

آنکھ کھلی تو امجد دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا جبکہ سعدیہ غار کے کونے میں بے سدھ پڑی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ ذہنی طور پر ہم سے مطمئن ہو گئی تھی۔غار کے اندر ہلکی ہلکی ملگجی سے روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"ماجے...... کیا خیال ہے، چلیں۔"

"اس مصیبت کا کیا کریں گے۔" اس کا اشارہ سعدیہ کے جانب تھا۔

"یہ بہت بدقسمت لڑکی ہے ماجے۔اس کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔میرا خیال ہے اسے گھر تک پہنچا دیتے ہیں۔یہ ویسے بھی جنگل خیل کی باسی ہے اور ہماری منزل بھی جنگل خیل ہی ہے۔"

"مجھے پہلے سے پتا تھا ابن ہڈ صاحب کہ تیری رگ ہمدردی جب تک اپنی مرضی نہ منوالے گی پھڑکتی رہے گی۔"

"اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے ماجے......!"

"ہاں وہ ہے اس کی خوب صورتی...... اور وہ دوسری نہیں پہلی وجہ ہے۔"

''اس کا نام سعدیہ ہے۔'' میں نے اس کے مذاق کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور مختصر الفاظ میں اس کی کہانی دہرا دی۔

''اچھا اس کو جگاؤ تاکہ چلیں۔''

''سعدیہ'' میں نے اسے زور سے پکارا مگر وہ اسی طرح پڑی رہی۔

میں نے تھوڑا سا آگے ہوا اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر آہستہ سے ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کک......کیا بات ہے؟''

''سورج طلوع ہونے والا ہے۔ چلنے کی تیاری کرو۔''

''میں تیار ہوں۔'' وہ سنبھل گئی۔

اس کے ننگے پاؤں کو دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''تمھاری چپل کدھر ہے؟''

''چپل، مَیں ساتھ نہیں لا سکتی تھی۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں......مَیں ننگے پاؤں پھرنے کی عادی ہوں۔''

میں سر ہلا کر غار کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے پیچھے امجد اور اس کے پیچھے سعدیہ تھی۔ میں نے غار کے دہانے پر کھڑے ہو کر باہر جھانکا مگر کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ آسمان بھی بالکل صاف تھا۔

''کوئی نظر آ رہا ہے؟'' امجد نے پوچھا۔

''نظر خاک آئے چاروں طرف جھاڑیوں کے اتنے گھنے جھنڈ ہیں......سامنے کا علاقہ البتہ صاف ہے۔''

''پھر بسم اللہ پڑھو...... یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکلنے کی کوشش کریں۔''

''سعدیہ......! تمھارے خیال میں جنگل خیل کی طرف جانے کے لیے کون سا راستا اختیار کیا جائے؟''

''اگر اصل راستا اختیار کیا جائے تو وہ ڈابیر میں سے ہو کر گزرتا ہے اور ڈابیر باسط خان کا گاؤں ہے۔ اور وہ اپنے بھائی کی تلاش میں پاگل کتے کی طرح سرگرداں ہوگا۔ دوسرا راستا تھوڑا طویل ہے اور اس پہاڑی کے پیچھے سے ہو کر گزرتا ہے۔'' اس نے دائیں ہاتھ پر موجود ایک اکیلی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے...... پہاڑی والا رستا اختیار کرتے ہیں۔'' میں غار سے باہر آ گیا۔ سعدیہ میرے پیچھے ہولی جبکہ امجد اس سے پیچھے محتاط انداز میں دائیں بائیں کا جائزہ لیتے ہوئے چل پڑا۔

جلد ہی ہم نیچے اتر گئے۔ اترائی ایک بہت وسیع نالے میں ختم ہو رہی تھی......خوش قسمتی سے اس میں جا بجا درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے جس کی وجہ سے ہمارے دور سے نظر آنے کا خطرہ کم تھا۔ بائیں ہاتھ ڈھلانوں پر نظر آنے والے گھر اس جگہ آبادی کا پتا دے رہے تھے۔ ہم تینوں بغیر کوئی بات چیت کیے خاموشی سے اپنے راستے پر روانہ تھے۔ سعدیہ نے گھونگٹ کے انداز میں دوپٹہ چہرے پر ڈالا ہوا تھا۔

''ویسے آپ نے راستا کیوں بدلی کر لیا ہے۔'' امجد نے پوچھا۔ اور میں نے اسے سعدیہ سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتا دی۔

''تو کیا جس راستے کے بارے میں سعدیہ جانتی ہے اس سے باسمت خان لاعلم ہوگا؟''

''تیرا کیا خیال ہے......اصل راستا اختیار کریں؟''

''میرے خیال کی تجھے ضرورت ہوتی تو......کوئی بھی رستا اختیار کرنے سے قبل مجھ سے پوچھ لیتے۔''

''سوری یار۔''میں نادم ہو کر بولا۔''میرا خیال تھا تُو مجھ سے متفق ہوگا۔''

''میں تیری صرف ایک بات سے اتفاق کر سکتا ہوں اس کے علاوہ بالکل نہیں۔''

''کس بات سے؟''

''یہی کہ تم کہو اللہ ایک ہے۔اس کے علاوہ تیری کوئی بات میرے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے۔''

''اچھا فضول باتیں چھوڑو اور اپنا نقطہ نظر بیان کرو تاکہ میں اس کے متضاد اپنی کارروائی جاری رکھ سکوں۔''اس بات چیت کے دوران بھی ہمارا سفر جاری رہا۔

''اب اسی رستے پر چلتے رہو......نامعلوم باسمت خان اپنے بھائی کی موت سے باخبر ہے بھی یا نہیں......اور اگر اسے پتا چل گیا ہے......تو ہو سکتا ہے قاتلوں کی تلاش میں اس کا رخ بہرام شاہ کی طرف ہو۔''

مگر یہ امجد کی خام خیالی تھی، کیونکہ درختوں کے ایک جھنڈ سے جیسے ہی ہم باہر آئے دائیں ہاتھ موجود ڈھلان پہ ایک پتھر کے پیچھے کلاشن کوف گرجی۔ساتھ ہی کوئی بلند آواز سے دھاڑا''ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو۔''یہ بات گو پشتو میں کہی گئی تھی لیکن ہمارے ہاتھ اٹھتے دیکھ کر امجد نے بھی گن نیچے رکھ کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔

بڑے پتھر کے پیچھے سے چار افراد برآمد ہوئے۔

''آگے والا باسمت خان ہے۔''میرے پہلو میں کھڑی سعدیہ آہستہ سے بولی۔باسمت خان اپنے بھائی کے برعکس کافی لمبا تھا۔وہ تیزی سے ڈھلان سے اتر کر ہمارے سامنے آگئے۔

''تیرا کیا خیال تھا، تُو باسمت خان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے یار کے ساتھ نکل بھاگے گی؟''

باسمت خان نے سعدیہ کے سامنے رک کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔وہ اس وقت اپنے چہرے کو چھپائے کھڑی تھی، مگر کپڑوں اور جسمانی ساخت کی بدولت باسمت خان نے آسانی سے اسے پہچان لیا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو بھائی۔یہ میری بیوی ہے اور اس کا تیرے ساتھ کیا تعلق۔''میں اسے جانچنے کی خاطر بولا تاکہ پتا چل سکے کہ اس نے کس حد تک سعدیہ کو پہچانا تھا۔

''تیری تو یہ بہن ہے سالے۔''اس نے مجھے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ گھمایا، لیکن مجھے چھونے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہی۔ میں اپنے گھٹنوں میں خم دے کر تھوڑا سا نیچے ہوا اس کا ہاتھ میرے سر کے اوپر سے گزر گیا اور وہ اپنی جھونک میں مڑ گیا اسی موقع کو غنیمت سمجھتے

ہوئے میں بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھا اور اگلے لمحے وہ میرے بازوؤں کے شکنجے میں تھا۔اس کی پیٹھ میری چھاتی سے لگی ہوئی تھی جبکہ گیرا کٹ مارک تھرٹین کی خوفناک منرل اس کی کنپٹی سے لگ چکی تھی۔

''اپنے کتوں سے کہو رائفلیں نیچے پھینک دیں۔'' میں بڑی بے رحمی سے اپنے بازو کی گرفت اس گردن پر سخت کی۔اس کے تینوں آدمی شاک کی سی کیفیت میں ساکن کھڑے رہ گئے تھے جبکہ امجد نے میرے ایکشن لیتے ہی اپنے پاؤں میں پڑی گن اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی تھی۔

''تت تجھے یہ بہت مہنگا پڑے گا۔'' وہ خرخرایا۔

''دھمکی نہیں۔'' میں اپنی گرفت کو مزید سخت کیا۔''جو کہا ہے وہ کرو۔'' اس کی حلقوں سے ابلتی آنکھیں دیکھ کر اس کے تینوں ساتھیوں نے اضطراب میں اپنے ہتھیاروں کا رخ میرے جانب کیا مگر مجھ سے پہلے گولی ان کے ساتھی کو لگتی اس لیے پہلو بدل کر رہ گئے۔

''تیری بہتری اسی میں ہے کہ سردار کو چھوڑ دو۔'' ان میں سے ایک غصے سے دھاڑا۔

''میں کہہ رہا ہوں ہتھیار پھینک دو۔'' میں نے اپنی بات دہرائی مگر ہتھیار پھینکنے میں وہ متذبذب نظر آرہے تھے۔

''تمھیں میری بات کی زبان سمجھ نہیں آرہی؟ میں تین تک گنوں گا اگر اس دوران تم لوگوں نے ہتھیار نہ پھینکے تو......'' میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن معنی کے لحاظ سے میری بات مکمل تھی......تو کے بعد میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس بات سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔انھوں نے میری جانب تانے ہتھیاروں کی بیرل آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکادی مگر ہتھیار پھینکنے میں وہ ابھی تذبذب کا شکار تھے اور ان کی یہ مشکل امجد نے حل کر دی کہ جیسے ہی ان کی کلاشن کوفوں کی بیرلیں زمین کی جانب ہوئیں امجد نے یکدم کلاشن کوف کا ٹریگر پریس کر دیا، برسٹ پر سیٹ ہوئی گن سے گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور وہ تینوں چیختے ہوئے نیچے گر گئے۔امجد کی انگلی نے اس وقت تک ٹریگر پریس رکھا جب تک میگزین خالی نہ ہوگئی اور اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ امجد انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کوئی مرتے مرتے بھی ہم تینوں کو نشانہ بنالیتا۔

''تت......تت......تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔'' باسمت خان کے لہجے میں غصہ بھرا تھا۔مگر یہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے آخری الفاظ تھے۔اپنے بائیں بازو کی گرفت میں پھنسی اس کی گردن میں نے مخصوص جھٹکے سے توڑتے ہوئے اسے نیچے پھینک دیا۔امجد نے اپنی خالی میگزین پھینک کر باسمت خان کی گن سے بھری ہوئی میگزین اتار کر اپنی گن میں لگالی۔

میں نے باسمت خان کی سرسری سے تلاشی لی تو اس کی جیبوں سے نسوار، چرس کے بھرے ہوئے سگریٹ اور ایک لمبے پھل کا پتلا سا خنجر برآمد ہوا۔ان میں صرف خنجر ہی میرے کام کا تھا جو میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔باقی آدمیوں کی تلاشی لینے کی ضرورت ہم نے محسوس نہیں کی تھی اور اس کی وجہ ان کے جسموں سے نکلنے والا خون تھا۔جس نے ان کے لباس کو رنگدار کر دیا تھا۔ایک صاف سی کلاشن کوف البتہ میں نے اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکالی تھی۔سعدیہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں اپنی جگہ پہ منجمد کھڑی تھی۔

''چلو۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر آہستہ سے ہلایا تو وہ جیسے چونک پڑی۔

''ی یہ یہ تت تمام مم مر گئے۔''

''ہاں......اوراب چلو یہ نہ ہو ان کے ساتھی اکٹھے ہو جائیں۔''

ہم تینوں وہاں سے تیز قدموں سے روانہ ہو گئے۔ سعدیہ کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے مگر اس کے باوجود وہ بڑی ہمت سے ہمارے ساتھ قدم ملا کر چل رہی تھی۔

''جانو......!لاشوں کو اگر راستے سے دائیں بائیں پھینک دیتے تو اچھا تھا۔''

''اب دن کا ٹائم ہے اور ان کے جسموں سے نکلنے والا خون ہم کیسے چھپاتے پھریں گے۔ دفع کرو ایک دفعہ ہم جنگل خیل پہنچ گئے پھر کسی نے ہمیں نہیں پہچاننا۔ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ہماری کون سی دشمنی تھی کہ کوئی ہم پہ شک کرے گا؟''

''اور یہ مصیبت جو ہم ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔'' وہ شاکی لہجے میں بولا۔

''اس کو پہچاننے والے ہیبت خان اور باسط خان مردار ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ میرا نہیں خیال کہ کوئی اسے شکل سے پہچانتا ہوگا۔''

''پھر بھی یار ان سات مرنے والوں کے ورثا آخر چپکے تو بیٹھے نہیں رہیں گے۔ گو ان کو قتل کرتے وقت مجھے ذرا بھر بھی جھجک نہیں ہوئی اور نہ ابھی کوئی افسوس ہے کہ ان کے کرتوت ہی ایسے تھے، نامعلوم کتنے بے گناہوں کے قاتل ہوں گے اور پتا نہیں کتنی عورتوں کی عزت یہ لوگ خراب کر چکے ہوں گے۔ ان کا زمین کے اوپر چلنے کی بجائے زمین کے نیچے لیٹنا مخلوق خدا کے لیے بہتر ہے، لیکن ان کے پسماندگان تو یہ بات نہیں سوچیں گے نا۔ انھیں تو ان کے قاتل کی تلاش ہوگی اور اگر وہ ایک مرتبہ ہمارے ساتھ چلنے والی بی بی تک پہنچ گئے تو یہ شاید ہمارا راز نہ رکھ سکے۔'' امجد دانستہ اس کا نام لینے سے گریز کر رہا تھا تاکہ اسے یہ پتا نہ چل سکے کہ ہم اس کے متعلق محو گفتگو ہیں۔

''انھیں کیا پتا چلے گا کہ یہ گھر پہنچ گئی ہے؟''

''جناب جس راستے پر گامزن ہے یہ جنگل خیل کی طرف ہی جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن کسی کو یہ پتا تو نہیں نا کہ یہ قتل اس لڑکی کی ایما پر ہوئے ہیں اور ویسے بھی اس کے فرار کے متعلق چند لوگوں کو ہی خبر ہو گی۔ ان لوگوں کی تو دشمنیاں بھی اتنی زیادہ ہوں گی کہ شاید انھیں اپنے دشمنوں کے نام بھی یاد نہ ہوں اور یہ کارستانی بھی کسی ایسے ہی مضبوط اور ان کی ٹکر کے دشمن کے کھاتے میں جائے گی، اس مظلوم کی جانب تو کسی کا گمان بھی نہیں جائے گا۔''

''بہر حال یہ تیرا اندازہ ہے معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ باسط خان جس طرح ہماری گھات میں بیٹھا تھا اس طرح اس نے، علاقے سے نکلنے والے باقی راستوں کی بھی ناکہ بندی کروائی ہوگی۔ اس بات سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ انھوں نے کل رات ہی ہیبت خان پارٹی کی لاشیں تلاش کر لی تھیں اور یہ اندازہ انھوں نے فائر کی ڈائریکشن سے لگایا ہوگا اور اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو ابھی ہمارا تعاقب شروع ہو چکا ہوگا۔ باقی راستوں پر متعین ان کے آدمی لازمی طور پر ہماری فائرنگ سے اس جانب متوجہ ہو گئے ہوں گے اور اب شاید وہ جائے حادثہ پر پہنچنے والے ہوں۔'' امجد کا تجزیہ مجھے زیادہ حقیقت کے قریب محسوس ہوا۔

''تو......اب کیا کرنا چاہیے؟''

امجد نے جواب دیا۔''پھر یہ راستا ہمارے لیے موزوں نہیں ہے۔''

''کیوں نا، کچھ دیر ادھر چھپ کر انتظار کیا جائے اگر تیرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تو وہ ادھر سے ہی گزریں گے۔''

''ہاں......یوں ہی کرنا پڑے گا۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم راستے کے بائیں جانب موجود ڈھلان پہ پڑے بڑے بڑے پتھروں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گئے،اس طرح کہ راستا ہمیں آسانی سے دکھائی دیتا رہے۔

سعدیہ مستفسر ہوئی۔''ادھر کس لیے چھپ رہے ہو؟''

''ہمیں شک ہے کہ فائرنگ کی آواز سن کر دشمن اس طرح متوجہ ہوگا اور ابھی شاید وہ اسی راستے پر آ گے آئے......ویسے کیا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی اور راستا جنگل خیل کی طرف جاتا ہے۔''

''اگر جاتا بھی ہے تو میں اس سے لاعلم ہوں۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔اسی وقت مجھے دور درختوں کے جھنڈ سے ایک ڈبل کیبن ٹویوٹا نکلتی دکھائی دی اور پھر اس سے چند سیکنڈ بعد ایک اور گاڑی برآمد ہوئی۔امجد کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا اور ہم نے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے چھپنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ ہمارے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا ورنہ راستے پر گامزن ہونے کی وجہ سے اب تک ہم ان کی نظروں میں آ گئے ہوتے۔

دونوں گاڑیاں لاشوں کے پاس آ کر رک گئیں۔دونوں گاڑیوں میں پانچ پانچ افراد سوار تھے۔چند منٹ بعد ایک گاڑی تو تیز رفتاری سے ہماری جانب روانہ ہوگئی جبکہ دوسری گاڑی میں وہ لوگ لاشیں رکھنے لگے۔ہمارے سامنے آ کر گاڑی کی رفتار قدرے آہستہ ہوئی اور پھر ہمارے چھپنے کی جگہ سے چند سو گز مزید آگے جا کر وہ گاڑی رک گئی اور تمام نیچے اتر کر ہتھیار سونتے دائیں بائیں کے علاقے کو غور سے دیکھتے آگے بڑھنے لگے۔لاشیں اٹھانے والی گاڑی واپس ڈابیر کی طرف چل پڑی تھی۔

''اب کیا کریں؟''امجد مستفسر ہوا۔

''اب جو بھی کرنا ہے جلدی کرنا پڑے گا ورنہ لاشیں لے جانے والے جلد ہی واپسی کا قصد کریں گے۔''

''اگر ہم ان کی گاڑی قبضے میں کر لیں تو تیز رفتاری سے یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''اس میں ایک قباحت ہے......''امجد کا سوالیہ چہرہ دیکھ کر میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔''اور وہ یہ کہ اگر ہم نے سیدھے نکلنے کی کوشش کی تو ان کی گولیوں کی زد میں آنے کا خطرہ ہے۔اور واپس جانے کی صورت میں دوسری گاڑی والوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ ہے۔''

''ویسے انھوں نے جس طرح اس پہاڑی کو نظر انداز کر دیا ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس جانب سے جنگل خیل تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔''

''اگر ایک ٹرائی اس پہاڑی کو عبور کرنے کی کر لیں تو......''

''کوئی ضرورت نہیں......خواہ مخواہ اپنی توانائیوں کو ضائع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔''

''تو پھر......؟''

''تلاشی لینے والے جس انداز میں آگے جا رہے ہیں اس سے تو یہی لگ رہا ہے جیسے انھیں ہمارے آگے بڑھ جانے کا یقین ہوا اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں دوسری گاڑی آنے کے بعد جب وہ تلاشی لینے والوں کے ساتھ مل جائیں گے تو ہم اس گاڑی پر قبضہ کر کے ڈابیر کے راستے سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

''اور اگر انھوں نے دوسری گاڑی پر ہمارا تعاقب شروع کر دیا ؟''

''دوسری گاڑی کو ناکارہ کر کے ہی جائیں گے۔''

''خیال رہے ان کے پاس محدود رینج کے واکی ٹاکی بھی ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو اس کی مدد سے یہ ہماری ناکہ بندی کروالیں۔''

''اتنا رسک بہر حال لینا ہی پڑے گا۔ البتہ اس کو اس کے والد کی بجائے کسی اور مقام پر چھپانا پڑے گا تاکہ یہ ان کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''اس کا اشارہ سعدیہ کی جانب تھا۔

''چلو ایسا ہی کر لیتے ہیں۔''میں نے ڈابیر کے راستے پر نظریں جما لیں...... جلد ہی لاشیں لے جانے والی گاڑی واپس آتی دکھائی دی اس مرتبہ اس میں چند بندوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ لوگ لاشوں کی جگہ پہ گاڑی روک کر نیچے اترے۔ ایک بندہ گاڑی کے ساتھ کھڑا کر کے باقی تمام اردگرد کے علاقے میں پھیل گئے اور تلاشی لینے کے انداز میں آگے چل پڑے۔ ان میں سے دو آدمی ڈھلان پر چڑھ گئے اور دائیں بائیں پتھروں میں نظریں دوڑاتے ہماری جانب چل پڑے۔ سعدیہ کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا تھا امجد کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی چھا گئی۔ حالات ہماری توقع سے بھی بڑھ کر خطرناک ہو گئے تھے۔ ہم دونوں کلاشن کوفیں ہاتھ میں تھام کر ان کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو گئے نگران کی تعداد کافی زیادہ تھی ان کے کچھ ساتھی پہلے سے بھی موجود تھے۔ دو تین کو تو ہم پہلے ہلے میں مار گراتے مگر اس کے بعد انھوں نے بھی کسی آڑ کے پیچھے ہو جانا تھا اور پھر ان کے پیچھے گاؤں سے بھی کمک پہنچ جاتی۔ ہمیں سخت مرحلے کا سامنا تھا لیکن اس کے باوجود ہم گرفتاری دینے یا ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

+ + +

وہ آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ان کا فاصلہ گھٹتے گھٹتے 100 گز رہ گیا۔ امجد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے کھلنڈرے چہرے پر اس وقت بلا کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا یوں گھورنا فائر کرنے کی اجازت طلب کرنے کے لیے تھا۔ مگر میں نے اس کی امیدوں کے برخلاف نفی میں سر ہلا دیا۔ میرے خیال میں ان کے زیادہ قریب ہونے کی صورت میں فائر کھولنے پر ان کا زیادہ نقصان ہونے کی امید تھی۔

امجد نے نالے کے درمیان چلنے والوں پر شست باندھی ہوئی تھی جبکہ میری نظر ڈھلان کے اوپر ہماری طرف چل کر آنے والوں پر تھی اور پھر چند لمحوں بعد ہی وہ میری مطلوبہ رینج میں پہنچ گئے۔ میں نے آگے والے بندے پر شست لیتے ہوئے ٹریگر کی آزادنہ حرکت کو پورا

کیا،اوراس کے ساتھ ہی میں امجد کو فائر کرنے کا کہنے لگا تھا کہ اچانک ماحول تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔یہ فائر یہاں سے پہلے گزر جانے والی پارٹی نے کیا تھا۔یہ آواز گویا ہمارے لیے صوتِ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ہماری سیدھ میں آنے والے دونوں اشخاص بھاگتے ہوئے ڈھلان اترتے چلے گئے ڈبل ڈور ٹویوٹا کا ڈرائیور گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے تلاش لینے والوں کے متوازی ہی چل رہا تھا۔تمام پارٹی نالے میں اکٹھے ہو کر گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

''بال بال بچ گئے۔''امجد نے گہرا سانس لیا۔

''ہاں یار اللہ نے بچالیا۔''میں نے اس کی تائید کی۔''لیکن اب اٹھو تا کہ ان کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر کوئی پناہ ڈھونڈیں۔''

''کس طرف چلیں''۔وہ اٹھتے ہوئے بولا۔سعدیہ بھی ہمارے ساتھ کھڑی ہوگئی تھی اس کے زرد پڑتے چہرے کی رنگت خطرہ ٹلتے ہی بحال ہوگئی تھی۔

''میرے خیال میں انھی کے پیچھے چلتے ہیں۔''

''پاگل ہوگئے ہو کیا۔''بظاہر میری مخالفت کرنے کے باوجود اس نے میرے ساتھ قدم بڑھائے تھے۔سعدیہ تو ویسے ہی بے زبان جانور کس طرح ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔

''عقل استعمال کرو ماجے صاحب......!''میں نے اسے جھڑکا۔''یہ سارا علاقہ انھوں نے سرچ (تلاش) کرلیا ہے اب ان کی توجہ یا تو اس علاقے سے آگے رہے گی یا وہ پیچھے ہٹے تو گاؤں کی سمت تلاش کا آغاز کریں گے اور اس وقت سب سے محفوظ جگہ یہی درمیانی علاقہ ہے جس کو دونوں پارٹیاں سرچ کر چکی ہیں۔''

''ٹھیک ہے زیرو زیرو سیون صاحب۔''وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ دوبارہ نئے سرے سے اس علاقے کی سرچنگ شروع کردیں۔''

''کیوں یہ ایک کلومیٹر کا رقبہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ وہ دوبارہ اسی جگہ کی تلاشی لیں گے؟''

''ویسے ہی......دشمن کی عقل سے کیا بعید ہے۔''

''ماجے صاحب......!ہر کام یونہی نہیں ہوتا۔اس کے پیچھے کوئی سوچ کارفرما ہوتی ہے۔''

''مگر تیرے تو سارے کام تکے سے ہوتے ہیں۔اس لیے میں نے سوچا شاید سارے پٹھان ہی ایسے ہوتے ہوں۔''

''اچھا اپنی چونچ بند رکھو اور مجھے سوچنے دو۔''

''ہونہہ......یہ بھی نئی کہی کہ سوچنے دو۔یہ سوچ کہیں اس پٹھان کی طرح نہ ہو جو ساری عمر یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اس کی بہن کے تین بھائی ہیں تو اس کے دو کیوں ہیں۔''

مجھے پتا تھا کہ یہ ساری بکواس وہ اس ٹینشن کو زائل کرنے کے لیے کر رہا ہے جس کا شکار تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں ہوئے تھے۔اس کو

نظر انداز کرتے ہوئے میں سعدیہ سے مخاطب ہوا۔

"سامنے نظر آنے والا درختوں کا جھنڈ کتنے علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔" میرا اشارہ نالے کے درمیان موجود جھنڈ سے تھا جس کے اندر دشمنوں کی دونوں گاڑیاں غائب ہوئی تھیں اور اس وقت ہمارا رخ بھی اسی جانب تھا۔

"اس جگہ تو درخت اتنے زیادہ نہیں ہیں۔ البتہ اس کے بعد جو جنگل آتا ہے وہ کافی علاقے میں پھیلا ہوا ہے اور اس جھنڈ اور جنگل کے درمیان تقریباً کلومیٹر بھر علاقہ بغیر درختوں کے ہے۔"

"ہوں......اس کا مطلب ہے فائرنگ کی آواز اسی جنگل کے جانب سے آئی تھی۔ شاید وہاں پہ انھوں نے غلط فہمی سے کسی جانور پر فائر کر دیا ہو۔ کیونکہ اس ایک برسٹ کے بعد دوبارہ فائرنگ کی آواز نہیں آئی ہے۔"

"شاید" سعدیہ نے ہولے سے میری تائید کی۔ اس دوران ہم جھنڈ میں داخل ہو گئے تھے۔ راستے سے ہٹ کر ہم دبے قدموں آگے بڑھنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس جھنڈ کی تلاش وہ تفصیلاً کر چکے تھے۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ سب سے آگے امجد تھا اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے سعدیہ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے امجد نے رک کر ہاتھ کھڑا کر دیا اور اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اسے کوئی سرگرمی نظر آ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر اس سے مستفسر ہوتا یا خود سن گن لینے کی کوشش کرتا وائرلیس سیٹ پر کسی کی تیز آواز گونجی۔ بولنے والا پشتو میں محو گفتگو تھا اور وہ چند گز ہی دور تھا۔ ہم تینوں وہیں دبک گئے۔

"ورتہ اووایہ......اخوالا رباندے سومرہ کسان ناست دی ٹول دے خوار اولیگا۔"

(اسے بتاؤ اس راستے پر جتنے بندے موجود ہیں تمام ادھر بھیج دو)

"دامیے ورتہ ویلی دی......هغه تپوس کی زہ اخپل درشم یا پاتے شم۔" (یہ میں نے اسے بتا دیا ہے۔ وہ پوچھ رہا ہے وہ خود بھی ساتھ آجائے یا وہیں رہ جائے)

"هغه پہ یوازے هغلتہ سہ کوی۔" (وہ اکیلا وہاں کیا کرے گا)۔ "هغه دے ہم راشی" (وہ بھی آجائے)

"گل حسان الدین......وہ کہہ رہا ہے تم بھی ساتھ آجاؤ۔" اس مرتبہ اس کا مخاطب کوئی دوسرا تھا۔

ہم سے چند گز دوری پر موجود شخص انھوں نے اپنا رابطہ بحال رکھنے کے لیے وہاں چھوڑا ہوا تھا۔ چونکہ ان کے پاس موجود سیٹوں کا ملاپ لمبے فاصلے تک نہیں ہو سکتا تھا اس لیے درمیانی شخص دونوں گروپوں کا پیغام ایک دوسرے تک پہنچا رہا تھا۔ اصولی طور پر تو اسے کسی اونچی جگہ پر ہونا چاہئے تھا مگر شاید دھوپ سے بچنے کے لیے وہ نیچے سائے میں اتر آیا تھا۔ ویسے بھی وہاں اسے رابطے میں کوئی پرابلم پیش نہیں آ رہی تھی اس لیے وہیں ٹکا ہوا تھا۔ اس کی گفتگو سے میں نے جو اندازہ لگایا وہ یہی تھا کہ آگے جانے والے تمام جنگل کو سرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس مقصد کے لیے وہ دوسرے راستے کی ناکہ بندی کرنے والے تمام آدمیوں کو اپنے پاس ہی بلا رہے تھے۔

"دوبارہ کوئی نظر نہیں آیا؟" اس مرتبہ وہ آگے والوں سے مستفسر ہوا تھا۔

''نہیں......لیکن کب تک چھپیں گے۔ہم بھوسے کے ڈھیر سے سوئی نکال لیتے ہیں یہ تو پھر میں جیتے جاگتے آدمی ہیں۔''

''لڑکی نظر آئی تھی یا......''

''نہیں......مگر وہ حرام زادی بھی ان کے ساتھ ہی ہوگی۔''

ان کی گفتگو سے مجھے ساری کہانی پتا چل گئی تھی۔انھیں جنگل میں کچھ لوگوں کی جھلک نظر آئی تھی جن پر انھوں نے فائر کھولا مگر وہ وہیں جنگل میں کہیں غائب ہوگئے تھے اور وہ غلط فہمی سے انھیں اپنے مطلوبہ دشمن سمجھ رہے تھے۔

''اس سے پوچھو۔ہم بھی گل ہان الدین پارٹی کے ساتھ آجائیں۔یا یہیں ٹکے رہیں۔''اس مرتبہ میرے کانوں میں ایک دوسری آواز گونجی۔

''اس کا مطلب ہے یہاں پر ایک نہیں بلکہ دو افراد موجود ہیں۔''میں نے دل ہی دل میں سوچا۔پہلے والا یہی بات واکی ٹاکی پر اپنے سردار سے پوچھنے لگا اور اسے جواب ملا۔

''تم دونوں وہیں رہو۔اگر ضرورت پڑی تو میں آگے بلوا لوں گا۔''

ہم تینوں اس گھنی جھاڑی میں دبکے ہوئے تھے۔تھوڑی دیر بعد ہی جھنڈ کے سرے پر گاڑیوں کی آواز آئی۔گاڑیاں جھنڈ کے درمیان گزرنے والے راستے پر رواں تھیں۔

میں نے احتیاط سے جھاڑی سے سر نکال کر دیکھا تو مجھے آگے پیچھے تین ڈبل ڈور ٹویوٹا نظر آئیں،تینوں میں آٹھ نو،نو بندے سوار تھے۔یہاں پر پہلے سے موجود دشمن کے بندوں نے بھی گاڑیوں کی آواز سن لی تھی اس لیے وہ راستے کے جانب بڑھے اور ہمیں نظر آگئے۔دونوں میں ایک نوجوان اور دوسرا پختہ عمر کا تھا اور حلیہ ویسا ہی تھا جیسا کہ عموماً اس علاقے کے مردوں کا ہوتا ہے لمبے لمبے بال چھوٹی چھوٹی داڑھی اور کھردرے موٹے کپڑے کا لباس جسے دھلے شاید ہفتوں بیت چکے تھے۔

''افضل خان گاڑی لشکی سائیڈ تا کاچے منگ تیر شو۔''(افضل خان گاڑی تھوڑی سائیڈ پہ کرو تا کہ ہم گزر جائیں)سب سے آگے والی گاڑی سے ایک شخص چیخ کر بولا تھا۔

جواباً پختہ عمر کا شخص بولا۔''لگ صبر کوا......درروان یو۔''(تھوڑا صبر کرو آرہے ہیں۔)

ان دونوں نے شاید اپنے لیے گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔افضل خان اور اس کا ساتھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے درختوں کے بیچ لے آئے اور آنے والا گروپ آگے بڑھتا گیا۔

''ماجے کچھ سمجھ آرہی ہے؟''میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''کچھ کچھ۔''

''آگے جانے والوں کو شک ہے کہ ہم اس جھنڈ کے بعد موجود ایک جنگل میں چھپے ہوئے ہیں......اور اس جنگل کی تفصیلی تلاشی

لینے کے لیے انھوں نے مزید افراد کو طلب کر لیا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں یہاں موجود دونوں آدمیوں پر قابو پا کر گاؤں والے راستے سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے...... جب تک ان لوگوں کو خبر ہوگی ہم گاؤں کراس کر چکے ہوں گے۔''

''زندگی میں پہلی بار تُو نے کوئی عقل کی بات سوچی ہے۔''

اس کو متفق دیکھ کر میں سعدیہ کی طرف متوجہ ہوا۔''ہم دونوں ان کی سرکوبی کے لیے جا رہے ہیں تم یہیں لیٹی رہو۔''

''ٹھیک ہے۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ جھاڑی میں وہ مجھ سے جڑ کر لیٹی ہوئی تھی عام حالت میں شاید کسی غیر مرد کے اتنا نزدیک لیٹنے کا وہ سوچ بھی نہ سکتی ہو مگر اس وقت حالات نے اسے مجبور کیا ہوا تھا۔ میرے احساسات بھی اس کے جوان بدن کی حدت اور گداز پن سے غافل تھے۔

وہ دونوں گل ہان الدین پارٹی کے گزرتے ہی واپس اپنی جگہ پہنچ گئے تھے۔ میں اور امجد آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے اپنی جگہ سے رینگتے ہوئے نکلے اور کرالنگ کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف بڑھنے لگے۔ مگر تھوڑا سا آگے بڑھ کر ہی ہمیں رکنا پڑا کہ ایک تو سخت پتھریلی زمین پر کرالنگ کرنا مشکل تھا دوسرے زمین پر پڑے کنکروں سے ہمارے حرکت کرنے کی وجہ سے ہلکی ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی پتھروں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف تو ہم برداشت کر لیتے مگر ان کا ہلکا سا شور بھی ہمارے لیے صورِ اسرافیل ثابت ہو سکتا تھا۔ ہم ایک مرتبہ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے اٹھ بیٹھے۔ اس دفعہ ہم دونوں بیٹھی حالت میں ان کی طرف بڑھنے لگے۔ کمانڈو سروس ہو یا عام فوجی زندگی ہر دو میں دشمن تک اس کی بے خبری میں پہنچنے کے لیے کچھ چالیں سکھائی جاتی ہیں جن میں عام طور پر چیتا چال، بندر چال، بلی کے بچے کی چال اور بھوت چال بہت معروف ہیں۔ ان میں سے ہر چال موقع محل کی مناسبت سے اپنائی جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں سب سے بہتر بندر چال لگی۔ بڑے درختوں کے درمیان اُگی چھوٹی جھاڑیاں ہمارے بیٹھے ہونے کی صورت میں نظری آڑ مہیا کر رہی تھیں اور بیٹھ کر آگے بڑھنے کی صورت میں نہ تو ہمارے قدموں کی آواز آ رہی تھی اور نہ ہی رینگنے والی حالت کی طرح کنکروں سے کوئی شور اٹھ رہا تھا۔ ہم تھوڑا سا آگے ہی بڑھے تھے کہ ایک مرتبہ پھر ان کا وائرلیس سیٹ بول اٹھا۔

''جانان خان ہم پہنچ گئے ہیں۔''یہ آواز اسی شخص کی تھی جو اس سے پہلے افضل خان کی وساطت سے اپنے سردار سے بات چیت کر رہا تھا۔ اب چونکہ وہ خود ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا اس لیے براہِ راست ان سے مخاطب تھا۔

''گل ہان الدین ہم جنگل کے دوسرے سرے پر جمع ہیں۔ تم اسی طرف سے پھیل کر اندر داخل ہو جاؤ اس سمت سے ہم تمھاری طرف بڑھیں گے۔ راستے میں ہر جھاڑی اور درخت کو کھنگالتے آنا میں دیکھتا ہوں یہ سالے کیسے بچتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ میں ایسے ہی کر رہا ہوں۔''گل ہان الدین کی مؤدبانہ آواز سنائی دی اور ماحول میں ایک پھر صرف پرندوں کی آواز باقی رہ گئی۔ اس دوران ہم ان کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے وہ دونوں جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے جنگل واضح نظر آ رہا تھا ان دونوں کا رخ بھی اسی جانب تھا۔ امجد نے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کو خنجر کی طرح اپنے گلے پر پھیرا۔ مگر میں نے نفی میں سر ہلا دیا وہ انھیں ہلاک

کرنے کے بارے پوچھ رہا تھا مگر میں نے نفی میں سر ہلا کر اسے خواہ مخواہ کی خون ریزی سے منع کر دیا۔ اگر ان کی زندگی ہمارے لیے کسی نقصان کا باعث بنتی تو میں کبھی بھی انھیں زندہ چھوڑنے کا مشورہ نہ دیتا۔ ہم دونوں نے ایک ہی لے میں ان پر چھلانگ لگائی دونوں کا ہدف اس کے سامنے والا بندہ تھا۔ اس اچانک افتاد سے وہ حواس باختہ ہو گئے تھے مگر ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تھی کہ ہمارا ایک ایک ہاتھ سختی سے ان کے ہونٹوں پر جم گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے ہم نے ان کی کنپٹیوں پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا اور وہ ہمارے ہاتھوں میں جھول گئے۔ اس عمل کے دوران ہم اپنے چہرے ان سے چھپانے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی ہم نے ان کی چادروں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے اور سعدیہ کو آواز دیتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ امجدان کے ہتھیار بھی سمیٹ لایا تھا۔

میری آواز سنتے ہی سعدیہ جھجکتی ہوئی جھاڑی سے نکل آئی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے میں نے ان دونوں کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ان کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

''اس کو اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیتے تا کہ یہ تجھے راستا بتاتی جاتی۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس علاقے میں عورتوں کو فرنٹ سیٹ پر بٹھانے کا رواج نہیں ہے۔''

''کوئی کام رسم و رواج سے ہٹ کر بھی کر لیا کرو۔''

مگر میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سعدیہ سے مخاطب ہوا۔

''راستے کے بارے میری رہنمائی کرتی جانا۔''

اور وہ ''جی اچھا'' کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''ویسے آپ کا علاقہ تو جنگل خیل ہے۔ آپ کو ان راستوں کے بارے کیونکر اتنی معلومات حاصل ہیں۔''

''میں اپنے والد کے ساتھ تین چار مرتبہ میرن شاہ تک جا چکی ہوں اور اس دوران ہمارا گزر انھی راستوں سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وادی بہرام شاہ میں بھی میں کئی دفعہ جا چکی ہوں۔''

میں نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا اور گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔ پتھریلے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی تیزی سے رواں دواں تھی۔ دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈابیر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ راستے میں اکا دکا بندے ہمیں نظر آئے مگر انھوں نے گاڑی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

سعدیہ نے دائیں ہاتھ پر موجود ایک تنگ سے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سیدھا راستا ڈابیر بازار سے گزر کر جنگل خیل کی طرف جاتا ہے جبکہ دائیں طرف کے راستے سے ہم بغیر بازار سے گزرے جنگل خیل کی طرف جا سکتے ہیں۔ البتہ بازار والے راستے کی نسبت یہ راستا زیادہ خراب ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ جنگل خیل تک دوسرے راستے سے جدا ہی رہتا ہے؟''

”نہیں۔“ یہ چھوٹا سا ٹکڑا ہے آگے جا کر یہ دوبارہ ڈابیر اور جنگل کو ملانے والے بڑے راستے سے مل جاتا۔ اس میں اور دوسرے راستے میں بس اتنا فرق ہے کہ اس پر سفر کرتے ہوئے ہم بازار کو بائی پاس کر سکتے ہیں۔ عموماً اس راستے کو پیدل چلنے والے استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ دوسرے راستے سے چھوٹا پڑتا ہے۔“

”پھر تو یہی راستا ٹھیک رہے گا۔“ میں نے اس سے مشورہ لینے کے دوران گاڑی اس راستے کے سرے پر روکی ہوئی تھی۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے گاڑی اس راستے کی طرف موڑ دی۔ وہ کلومیٹر بھر کا فاصلہ تھا جو سعدیہ کے کہنے کے مطابق واقعی دشوار گزار تھا۔ آگے جا کر وہ ٹکڑا ڈابیر اور جنگل خیل کو ملانے والے بڑے رستے سے مل گیا تھا۔ جنگل خیل سے آتے ہوئے بازار دائیں طرف اور یہ شارٹ کٹ بائیں طرف پڑتا تھا۔ ان دنوں کے درمیان ایک بڑی ٹیکری حد بندی کا کام کر رہی تھی۔

بڑے رستے پر سفر کرتے ہمیں تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے سامنے سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔

”ماجے خطرہ ہے۔“ میں نے گاڑی روک دی۔”اور یہاں سے گاڑی موڑنا بھی مشکل ہے۔ کیا خیال ہے ریورس چلیں یا گاڑی چھوڑ دیں۔“

امجد نے بھی سامنے سے آنے والی گاڑی کو دیکھ لیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی مشورہ دیتا سعدیہ بولی۔

”یہ تو مسافر بردار گاڑی ہے۔“ اس کے پلے غالباً صرف خطرے کا لفظ پڑا تھا اور اس نے ہماری پریشانی بھانپ لی تھی۔

”مسافر بردار گاڑی؟“ میں حیرت انگیز شرمندگی سے بولا۔

”ہاں۔“ ڈابیر اور جنگل خیل کے درمیان لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے اور آمدورفت کا بڑا ذریعہ یہی گاڑیاں ہیں۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی اور اس کے ساتھ امجد کو بھی صورت حال سے آگاہ کرنے لگا جس نے گن کاک کر کے سیفٹی لیور فائر کی پوزیشن پر سیٹ کر لیا تھا۔

”تیرا کام بھی بس ٹینشن پیدا کرنا ہے۔“ اس نے سیفٹی لیور کو دوبارہ سیف پر کر لیا، گن البتہ اس نے کاک رہنے دی تھی۔

اس مسافر بردار گاڑی کے علاوہ ہمیں راستے میں چند اور گاڑیاں بھی ملیں۔ مزید ڈیڑھ دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم جنگل خیل کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔

میں نے سعدیہ سے پوچھا۔”دوسرا جنگل خیل کس سمت میں واقع ہے؟“

”دوسرا جنگل خیل؟“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”ہاں......دوسرا جنگل خیل...... میں نے سنا ہے کہ اس علاقے میں جنگل خیل نام کے دو گاؤں ہیں۔“

”ہو سکتا ہے......مگر میں اس بارے لاعلم ہوں۔“

”تمھارا گھر کس طرف ہے؟“

’’میرا گھر پیچھے رہ گیا ہے۔‘‘ وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

’’تُو نے بتایا نہیں؟‘‘

’’کیا فائدہ...... میں نے کون سا وہاں اترنا تھا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’وہاں اترنے کا مطلب تھا خود کو اور اپنے والدین کو دردناک موت کے حوالے کرنا۔‘‘ میں نے اور امجد نے پہلے سے مشورہ کیا ہوا تھا کہ اسے اس کے گھر کی بجائے کسی اور محفوظ مقام تک پہنچائیں گے اور جو بات ہمارے ذہنوں میں آئی تھی وہی سعدیہ کے دماغ میں بھی موجود تھی۔

’’پھر اب ہم آپ کہ کہاں اتار دیں۔‘‘ میں نے اس کی رائے جاننا چاہی۔

’’اگر میری زندگی عزیز ہے تو مجھے اپنے ساتھ ہی رکھو۔‘‘

’’دماغ جگہ پر ہے۔‘‘ میں حیرانی سے بولا۔’’ہم یہاں اپنے دشمن کی تلاش میں آئے ہیں تجھے کہاں سنبھالتے پھریں گے۔ ویسے بھی تیری وجہ سے ہم ڈابیر والوں کی نظر میں آسکتے ہیں اور اس پردیس میں ہم پورے گاؤں کے ساتھ دشمنی نہیں مول سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم ہم سے علیحدہ ہو جاؤ۔ تم یوں بھی عورت ہو کسی چاردیواری میں چھپ کر رہ سکتی ہو اور برقع پہن کر آزادانہ گھوم پھر بھی سکتی ہو۔‘‘

’’یہ جنگل خیل ہے جناب...... یہاں اکیلی عورت بالکل محفوظ نہیں اور میرا تو ماں باپ کے سوا اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے اپنا کہہ سکوں اور بدقسمتی سے ماں باپ کے پاس جانا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ ان کے علاوہ اس جہاں میں آپ دونوں کی ذات ایسی ہے جس پر میں اعتماد کرسکتی ہوں اور ایسا کرنے میں مَیں حق بجانب ہوں کہ جو مرد رات کے اندھیرے اور غار کی تنہائی میں ایک جوان عورت کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھتے ان جیسا با اعتماد اور کون ہوسکتا ہے۔‘‘

باقاعدہ عمارتی علاقہ شروع ہونے سے پہلے میں نے گاڑی درختوں کے گھنے جھنڈ کی طرف موڑی اور سعدیہ سے کہا۔

’’سعدیہ بی بی...... میں معافی چاہتا ہوں کہ ہم تجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے البتہ اتنی رقم دے سکتے ہیں کہ تم یہاں سے کسی پرامن پسند علاقے تک چلی جاؤ۔ شکل وصورت اللہ تعالیٰ نے اچھی دی ہے دوسرے علاقے میں جا کر کوئی بھی شریف آدمی تمھیں قبول کرنے میں تامل نہیں کرے گا۔‘‘

’’اپنے بارے کیا خیال ہے۔ آپ بھی تو شریف انسان ہیں۔‘‘ وہ بے باکی سے بولی اور میں حیرت سے اس کی جانب تکتا رہ گیا۔ مگر اس نے مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

’’یہ کیا بحث تم لوگوں نے شروع کی ہوئی ہے۔ گاڑی سے تو باہر نکل آؤ۔‘‘ امجد جو میرے گاڑی روکنے پر باہر نکل گیا تھا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اسے کچھ مت بتانا۔'' سعدیہ جلدی سے بولی۔

''تمھیں کیا پتا یہ کیا پوچھ رہا ہے۔'' میں حیرانی بولا۔

وہ ہنسی۔''گزارے لائق اردو میں بھی سمجھ لیتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''سکول تو جنگل خیل میں نہیں ہے البتہ ایک امام مسجد اور اس کی بیوی نے اپنا ذاتی مدرسہ بنایا ہوا ہے جس میں امام صاحب لڑکوں کو قرآن اور مذہبی کتابوں کا درس دیتے ہیں جبکہ اس کی اہلیہ چھوٹی بچیوں اور لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستا کرتی ہے۔ میں بھی انھی سے پانچ چھ سال تک پڑھتی رہی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے تم شروع سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو سمجھتی آ رہی ہو۔''

''ہاں...... جو بات چیت تم اردو میں کرتے تھے وہ آسانی سے سمجھ لیتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی دوسری زبان بولنا شروع کر دیتے تھے تو میرے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا۔''

''جانو صاحب۔ میں عرض کر رہا ہوں باہر تشریف لے آئیں۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اس کی بات پر سعدیہ کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تھا۔

''گدھے اسے اردو کی مکمل سمجھ آتی ہے۔'' میں نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے اسے جھڑکا۔

''مم مگر تو نے پہلے نہیں بتایا......اور اگر ایسی بات تھی تو تمھیں آپس میں اردو بولنی چاہیے تھی تاکہ مجھے بھی سمجھ آتی رہتی۔''

''مجھے بھی اس بات کا ابھی پتا چلا ہے۔''

''بھائی......اصل میں ہم پورا بول نہیں سکتا نا۔'' سعدیہ نے امجد کے سامنے صفائی پیش کی۔''البتہ سمجھ لیتا ہے۔''

''ہن آرام ای۔'' وہ میری طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں بولا اور میں فقط مسکرا دیا۔

''یہاں سے اب پیدل چلیں گے۔'' میں نے ان دونوں کو آگاہ کیا۔''کیونکہ اس گاڑی کی وجہ سے ہم پھنس سکتے ہیں۔''

''تے ایندا کے کریسوں'' (تو اس کا کیا کریں گے) اس کا اشارہ واضح طور پر سعدیہ کی طرف تھا اور اس کے اردو سمجھ لینے کے خیال سے اس نے سرائیکی میں بات کی تھی۔

''اے کمبل ہیے بھرا، اے نی جان چھوڑن لگا۔'' (یہ کمبل ہے بھائی یہ جان چھوڑنے والا نہیں ہے)

''اسی مارے آدھا ہم جو ہر کھڈ چ انگل نہ ڈتی کر۔'' (اسی لیے کہتا تھا کہ ہر سوراخ میں انگلی مت دیا کرو) اور میں نے صفائی پیش کرنے کی بجائے خاموش رہنا پسند کیا۔ جھنڈ سے نکل کر ہم جنگل خیل کی سمت بڑھ گئے۔ سعدیہ نے ایک بار پھر ایسے گھونگھٹ نکال لیا تھا کہ

اس کا چہرہ بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اب کیا ارادہ ہے۔کوئی لائحہ عمل سوچا ہے یا ویسے ہی جھک مارنے چل پڑے ہو۔''

''لائحہ عمل تو یہ ہے کہ سب سے پہلے رہائش کا بندوبست کریں گے تا کہ آرام سے چودھری کی تلاش کا آغاز کیا جا سکے۔''

''رہائش کے لیے ہوٹل تو ملنے سے رہے اور بالفرض کوئی ہوٹل مل بھی جائے تب اس میں ہم سعدیہ کو تو ہمراہ نہیں رکھ سکیں گے۔''

''یہ تو ہے۔'' میں تائید میں سر ہلایا۔''یہاں پر سرائے سسٹم رائج ہے ایک بڑے سے ہال میں تمام مسافروں کو چارپائی بستر وغیرہ مل جاتا ہے اور تمام وہیں پڑے رہتے ہیں۔''

''عورتیں بھی تو مسافر ہوتی ہوں گی......اور اس علاقے میں تو پردے کا رواج بھی ہے۔''

سعدیہ جو ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی ہماری غلط فہمی دور کرتے ہوئے بولی۔

''پردے کی پابندی صرف مقامی خواتین ہی کرتی ہیں۔افغانستان سے سیر و سیاحت کے لیے آنے والی خواتین عموماً بہت واہیات لباس میں نظر آتی ہیں (قارئین کی معلومات کے لیے درج کرتا چلوں کہ اس وقت افغانستان پر روس کا تسلط تھا) اور جہاں تک تعلق ہے رہائش کا تو اس کے لیے چھوٹے چھوٹے کوارٹروں سے لے کر بڑے بڑے مکان تک دستیاب ہیں۔بات صرف پیسے کی ہے کہ آپ کی جیب کتنی اجازت دیتی ہے۔''

''اچھا......'' میں حیرانی بولا۔''اس کا مطلب ہے رہائش کی یہاں کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

''بالکل ہی نہیں۔'' سعدیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یار وہ کون سی باتیں ہیں جو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کے لیے آپ کو پشتو میں بات کرنی پڑ رہی ہے۔'' امجد ہماری پشتو سے تنگ آ گیا تھا۔

''گدھے تجھے پتا ہے کہ یہ اردو صحیح طور پر نہیں بول سکتی۔پھر بکواس کرنے کا فائدہ؟''

''تو آپ ساتھ ساتھ مجھے بتاتے رہا کریں نا؟ میں ہونقوں کی طرح تمھارے چہروں کو تکتا رہتا ہوں۔''

''اچھا سنو......'' میں نے اس کے سامنے سعدیہ سے سنی معلومات دہرا دی۔

''ویسے کڑی سانوں گائیڈ تے بڑا اچھا کر رہی ہے۔'' وہ تعریفی لہجے میں بولا۔

''لازمی بات ہے اس علاقے کی رہائشی ہے اسے یہ بنیادی معلومات پتا نہیں ہوں گی تو کس کو ہوں گی۔''

اس دوران ہم جنگل خیل کی وادی میں داخل ہو گئے تھے۔پہاڑوں کے درمیان کافی وسیع قطعہ زمین تھا جس میں ہر جانب سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔عمارتی سلسلے میں زیادہ تر مکانات پختہ اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے البتہ خال خال کچی مٹی کے بلاکوں کے بنے ہوئے مکان بھی نظر آ رہے تھے۔راستے میں کافی خواتین ہمیں مردوں کے ساتھ ٹہلتی نظر آئیں تمام کا لباس ناکافی اور واہیات قسم کا تھا۔سعدیہ کے کہنے کے مطابق ان میں بڑی تعداد ازبک اور تاجک خواتین کی تھی۔(ازبکستان اور تاجکستان روس کی ریاستیں تھیں جو بعد میں روس

کے ٹوٹنے پر علیحدہ مملکتیں بن گئیں تھیں۔) اس کے علاوہ دوسرے علاقوں کے بھی کافی لوگ وہاں گھومتے نظر آ رہے تھے۔ جنگل خیل رقبے کے لحاظ اتنا وسیع نہیں تھا جتنا کہ وہاں آبادی کی کثرت تھی۔

سعدیہ کے کہنے پر ہم ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے استقبالیہ پر ایک جوان العمر شخص براجمان تھا۔

پہلے موجود دو گاہکوں کو نمٹانے کے بعد اس نے ہماری طرف متوجہ ہو کر شستہ اردو میں پوچھا......

"جی......آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں چند دنوں کے لیے دو کمروں کا کوارٹر چاہیے تھا۔"

"500 روپیہ ایڈوانس جمع کرا دیں 100 روپیہ کوارٹر کا یومیہ کرایہ ہے، پانچ دنوں سے زیادہ رہنے کی صورت میں پانچوں دن آپ کو مزید ایڈوانس جمع کرانا ہوگا۔"

"یہ لو ہزار روپیہ۔" میں نے سو سو کے دس نوٹ اس کے جانب بڑھائے۔ "باقی حساب دسویں دن کریں گے۔"

"پلیز نام پتا لکھا دیں۔" اس نے رجسٹر کھولا......

"لکھو عبداللہ ولد عبدالرحمٰن سکنہ ٹھٹھہ اور یہ عبدالرحمٰن ولد عبداللہ سکنہ جلال پور جٹان۔"

اس نے مسکراتے ہوئے دونوں نام درج کر لیے اسے معلوم تھا کہ میں نے دونوں نام فرضی بتلائے تھے مگر یہ ایک رسمی خانہ پُری تھی جس کی وجہ سے اس نے اصرار نہیں کیا تھا۔

"خاتون بھی آپ کے ساتھ ہیں نا؟" اس نے پیچھے کھڑی سعدیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں لیکن آج کے لیے۔" میں معنی خیز انداز میں آنکھ دبائی۔

"سر اگر کوئی کمی پاؤ تو ہمیں بھی خدمت کا موقع دینا۔" خوش اخلاق چہرے کے پیچھے اس کی مکروہ صورت جھلکی۔ "ہمارے پاس روس افغانستان، پاکستان کے مختلف شہروں اور مقامی ہر عمر اور ہر نسل کا مال وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ ریٹ بھی بہت مناسب ہیں۔"

"شکریہ......اگر ضرورت پڑی تو ضرور آپ کی پیش کش سے فائدہ اٹھائیں گے؟"

"بالکل جی......آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" اس نے اپنی پشت پر لٹکے چابی بکس سے رنگ میں بند چند چابیاں ہمارے جانب بڑھا دیں۔ "یہ آپ کے کوارٹر کی چابیاں ہیں۔"

"کوارٹر تک رہنمائی کے لیے......"

"ہاں سر یہ تو لازمی ہے۔" اس نے قطع کلامی کی۔ "بس آپ دو منٹ انتظار کریں بلکہ بیٹھیں......اصل میں کوارٹروں کو ہینڈل کرنے والے دونوں آدمی مہمانوں کو پہنچانے کے لیے گئے ہوئے ہیں جیسے ہی ان میں سے کوئی آتا ہے۔ بلکہ وہ آ گیا ہے......منظور ان صاحبان کو سات نمبر کوارٹر میں چھوڑ آؤ۔" ایک ادھیڑ عمر آدمی کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے ہانک لگائی۔

اور منظور نامی شخص۔ ”آئیں جی“ کہہ کر ہمیں ساتھ لیے ہوٹل سے نکل آیا ہوٹل سے سو، ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر چھوٹے مکان ایک سیدھی لائن میں تعمیر کیے گئے تھے منظور ہمیں ایک مکان میں لے گیا۔

”یہ ہے جی آپ کا 7 نمبر کوارٹر۔“

”شکریہ۔“ میں نے 10 روپے کا نوٹ بطور ٹپ اسے پکڑایا اور وہ سلام کر کے چلتا بنا۔ کوارٹر کا دروازہ کھول کر ہم تینوں اندر داخل ہو گئے۔ وہ کوارٹر دو کمروں ایک باتھ روم اور ایک کچن پر مشتمل تھا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا صحن۔ صحن میں کچن کی دیوار کے ساتھ خشک لکڑیاں ترتیب سے پڑی تھیں جو لازمی کچن میں جلانے کے کام آتی ہوں گی۔ کچن کو کھول کر دیکھا تو اس میں کھانا پکانے کے برتن اور تھوڑا بہت مصالہ رکھا ہوا تھا۔

”ماجے یہ چابیاں رکھو میں ذرا بازار سے کچھ پکانے کے لیے لے آؤں، ہوٹل میں کھانا کھانے سے بہتر ہے ہم خود کچھ پکا لیا کریں۔“

امجد نے سر ہلاتے ہوئے چابیاں میرے ہاتھ لے لیں۔ بازار تک جانے کے لیے مجھے اس ہوٹل سے گزر کر جانا پڑا جس سے ہم نے کوارٹر کرائے پر لیا تھا۔ میں ہوٹل کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ تین ڈبل ڈور ٹویوٹا ”زن“ سے میرے پاس سے گزر گئیں ان کے اندر بیٹھے ہوئے بندوں کو دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ وہ باسط خان کے آدمی تھے۔ وہ بڑی جلدی ہمارے پیچھے پہنچ گئے تھے اتنی جلدی ان کی آمد کی توقع کم از کم میرے گمان میں بھی نہیں تھی اچانک ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے میری دماغ میں در آیا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مجھے ایک بار پھر ہوٹل میں گھسنا پڑا، خوش قسمتی سے بکنگ والا شخص اس وقت تنہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس کے قریب پہنچا۔

”وعلیکم السلام۔ سناؤ عبداللہ بھائی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے۔ کہیں اس گنوار لڑکی نے تو مزہ کرکرہ نہیں کر دیا۔“ اس نے مکورہ انداز میں اپنی آنکھ میچی۔

”نہیں جناب...... اصل میں ایک اور مسئلہ تھا۔“

”حکم کرو...... ہمارے ہوتے ہوئے مسئلہ کیسے باقی رہ سکتا ہے۔“ وہ چاپلوسی سے بولا۔ میں اس کے سامنے کاونٹر پر جھک گیا۔ ”ہم نے کوارٹر کب کرائے پر لیا تھا؟“

”یہی کوئی گھنٹا بھر پہلے۔“

”نہیں......“ میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ”ہم نے پرسوں کوارٹر کرائے پر لیا تھا اور ہمارے ساتھ کوئی عورت بھی نہیں تھی۔“

”اوہ سوری......“ اس نے نوٹ جھپٹ کر جیب میں ڈالا۔ ”واقعی آپ لوگ تو پرسوں صبح آئے تھے، میں رجسٹر بھی ٹھیک کر لوں، یہ تو حقیقتاً بہت بڑی غلطی ہے۔“ اس نے میرے سامنے رجسٹر کھولا اور 15 کو 13 تاریخ سے بدل کر رجسٹر بند کر دیا۔

’’شکریہ۔‘‘میں اس سے ہاتھ ملا کر واپسی کے لیے مڑا۔

’’ایکسکیوزمی سر۔‘‘اس نے مجھے آواز دی۔

’’جی؟‘‘میں نے رک کر پوچھا۔

’’سر آپ نے دس دنوں کا ایڈوانس جمع کرایا تھا اور رجسٹر کے مطابق آپ کا عرصہ پرسوں سے شروع ہے۔اس لیے اب آپ آٹھ دن مزید کوارٹر استعمال کر سکتے ہیں۔کیونکہ......‘‘

’’میں سمجھ گیا یار......وضاحت کی ضرورت نہیں۔‘‘میں نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

’’تھینک یو سر۔‘‘وہ مطمئن ہو گیا اور میں سر ہلاتے ہوئے ہوٹل کے بیرونی دروازے کے جانب چل دیا۔یہ احتیاطی تدبیر ڈاہیر والوں کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں آئی تھی اور میں بغیر کسی تاخیر کے اس پر عمل کر گزرا تھا۔میرا اندازہ تھا کہ جنگل خیل میں سرسری سا چکر لگاتے ہی انھوں نے ہوٹلوں وغیرہ کی چیکنگ شروع کر دینی تھی،اور بازار سے ضروری سامان کی خریداری کے بعد جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے ان کی ایک گاڑی ہوٹل کے دروازے پر کھڑی دیکھی،میری بروقت احتیاط کام آ گئی تھی،لیکن اس کے باوجود میرے دل میں بکنگ کرنے والے آدمی کے جانب ایک ہلکا سا خدشہ موجود تھا جس کا تدارک میرے بس سے باہر تھا۔

میری سہولت کی خاطر امجد نے دروازے کی اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔سامان کچن میں رکھ کر میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

’’چل بھئی ماجے......بہت دنوں سے تیرے ہاتھ کا بنا ہوا لذیذ کھانا نہیں کھایا،ذرا اپنی قابلیت کے جوہر دکھاؤ تاکہ سعدیہ کو پتا چلے کہ تُو بھی کوئی سلیقے کا کام کر سکتا ہے۔‘‘

’’ملک صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کھانا پکانے کا مشورہ آپ نے دیا تھا اس لیے یہ زحمت بھی آپ خود کرنی پڑے گی۔دوسرے میں آپ کا منشی ہوں باورچی نہیں۔‘‘

’’بھائی نہیں ہے؟‘‘میں نے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرنا چاہا۔

’’یہ بہنوں کا کام ہوتا ہے۔‘‘اس نے میرا حملہ پسپا کیا۔

’’یار سودا سلف بھی میں اتنی دور سے جا کر لے آیا ہوں اب کچھ غیرت تم بھی کر لو۔‘‘

’’اس معاملے میں مَیں سخت بے غیرت ہوں۔‘‘وہ کہاں ہار ماننے والا تھا،لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے کھانا پکانے پر راضی کرنے کے لیے مزید کوئی دلیل دیتا سعدیہ بولی۔

’’اگر اجازت دو تو میں پکا لوں؟‘‘گو یہ بات وہ پشتو میں بولی تھی۔مگر امجد کو سمجھ آ گئی اور اس نے جلدی سے لقمہ دیا۔

’’دیکھو نا!......میری بہن کی موجودگی میں تم مجھے مجبور کر رہے تھے۔‘‘

''مگر سعدیہ تم ہماری مہمان ہو۔'' میں نے امجد کی بات پر توجہ دیئے بغیر رسمی سا انکار مناسب سمجھا۔

''آپ کا کون سا اپنا گھر ہے۔'' وہ اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی اور میں خاموش ہو گیا۔

''کچھ گھریلو سا ماحول نہیں بن گیا ملک صاحب۔'' امجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چلو اس کے ہونے سے کچھ سہولت تو مل گئی۔''

''ویسے اس کو کب تک اپنے ساتھ لیے پھریں گے؟''

''اب اسے کون سا ساتھ لیے پھرنا ہے؟ کوارٹر میں پڑی رہے گی۔ غریب جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے اس کو یہیں رہنے دو یہاں سے واپسی پر اس کے بارے کوئی مناسب حل سوچیں گے۔''

''چودھری کی تلاش سے متعلق کوئی لائحہ عمل سوچا ہے۔''

''جنگل خیل کا ماحول دیکھتے ہوئے یہ کام کافی دشوار گزار دکھائی دے رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے کھانا کھا کر نکلتے ہیں، حرکت میں برکت ہے شاید اس کا کوئی سراغ مل جائے۔''

امجد کا مشورہ کافی معقول تھا میں نے کہا۔'' کھانا کھا کر تھوڑا آرام کرتے ہیں رات کو نکلیں گے۔ یوں بھی میرے اندازے کے مطابق یہاں دن سے زیادہ رات کو رش ہونا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے اسی طرح کر لیتے ہیں۔'' وہ مجھ سے متفق ہو گیا۔

''اور ہاں ایک اہم بات۔'' مجھے اچانک ڈابیر والوں کو آمد یاد آئی اور میں امجد کو ان کی آمد اور اپنی احتیاطی تدبیر کے متعلق بتانے لگا۔

''کیا چکر ہے آج کل تیرا دماغ کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہو گیا۔''

میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد کھانا آنے تک ہم چودھری کی تلاش کے لیے کوئی متفقہ لائحہ عمل سوچتے رہے سعدیہ نے کھانا بہت اچھا بنایا تھا بالکل گھر کی یاد تازہ ہو گئی تھی کھانے کے بعد وہ چائے لے کر آ گئی چائے پی کر میں نے کہا۔

''ہم دونوں اسی کمرے میں رہیں گے۔ تم اپنے لیے ساتھ والا کمرہ سیٹ کر لینا۔ باقی فی الحال ہم سو رہے ہیں۔ اٹھ کر تھوڑی دیر بعد گھومنے کے لیے نکلیں گے تم نے اپنے کمرے کی کنڈی بند رکھنی ہے۔ البتہ بیرونی دروازہ ہم باہر سے بند کرتے جائیں گے۔ اگر ہمیں دیر ہو جاتی ہے تو گھبرانا نہیں۔''

''رات کے لیے کیا پکالوں؟'' میں چونکہ سبزی، گوشت اور دالیں وغیرہ اکٹھی لے آیا تھا اس لیے اس نے میرا مشورہ لینا ضروری سمجھا۔

''رات کے لیے؟ اللہ کی بندی اب کون سا دن ہے۔'' میں نے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کرتے کیا۔ تو وہ مسکرا دی۔

''پھر آپ لوگوں کو کس ٹائم جگا دوں؟''

''ہمیں جگانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے کمرے تک محدود رہو، جب تک کوئی کام نہ ہو ہمارے پاس آنے کی بالکل زحمت نہ کرنا۔''

آخری الفاظ کہتے ہوئے میرا لہجہ ہلکا سا خشک ہو گیا تھا۔

''جی اچھا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

''کیوں اتنے کڑوے لہجے میں بات کر رہے تھے؟''

''جوان لڑکی ہے ماجے صاحب......!اور اس کے ساتھ بے آسرا بھی، ہمارا نرم لہجہ اس کے دل میں غلط فہمی کا بیج بھی بو سکتا ہے جو بعد میں ہمارے لیے لاینحل مسئلہ ثابت ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ ابھی سے اسے غیر ہونے کا احساس دلایا جائے تا کہ بعد میں ہمارے لیے پرابلم نہ بنے۔''

''ٹھیک ہے بقراط صاحب۔اب سو جاؤ۔'' وہ لکڑی کی بنی ہوئی چار پائی پر ڈھیر ہو گیا

چار پائیوں کی بناوٹ ہو بہو ہمارے علاقے کی چار پائیوں جیسی تھی،لکڑی کا فریم جس کی بنائی کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے بان سے کی گئی تھی۔سونے سے پہلے مجھے واش روم جانے کی حاجت ہوئی اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔سعدیہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا کچن میں برتنوں کی کھنکھناہٹ سنائی دے رہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ برتن دھونے میں مصروف ہے۔واش روم سے باہر آنے پر بھی وہ مجھے کچن میں ہی مشغول دکھائی دی۔میں آرام کا ارادہ کیے کمرے کے جانب بڑھا مگر آرام شاید ہماری قسمت میں نہیں تھا اور اس کا سبب دروازے پر ہونے والی زوردار دستک تھی۔میں انھی قدموں پر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا سعدیہ بھی دستک کی آواز سن کر کچن سے نکل آئی تھی میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں آگے بڑھ کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی میرے بدترین اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔دروازے پر جانان خان کے آدمی کھڑے نظر آئے میں جلدی سے مڑ کر کمرے کے جانب بڑھا میری تیزی دیکھتے ہوئے سعدیہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔

''ماجے......!تیار ہو جاؤ خطرہ ہے۔'' میں اپنی کلاشن کوف سنبھال لی۔امجد پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی مگر وہ کمانڈو تھا جو امن کے دنوں میں بھی ایک آنکھ کھول کر سوتے ہیں اس وقت تو یوں بھی ہم خطرناک حالات سے دو چار تھے۔میں جب تک دروازے سے نکلتا وہ میرے پیچھے پہنچ گیا تھا۔اس وقت ایک مرتبہ پھر دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔

''ایک منٹ بھائی کپڑے تو پہننے دو۔'' میں نے انھیں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گویا میں باتھ روم میں ہوں۔

''ماجے......!میرا خیال ہے دائیں جانب کے کوارٹر کی دیوار پھلانگ کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں پچھلی سائیڈ پر تو انھوں نے لازماً بندے بٹھائے ہوں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔وہ تمام کوارٹر ایک سیدھی لائن میں تھے،کوارٹروں کے سامنے اور پشت پر تو ہر صورت خطرہ موجود تھا البتہ دوسرے کوارٹروں کا سہارا لے کر ہم وہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔امجد کوارٹر کی درمیانی دیوار پر چڑھا اور آہستگی سے دوسرے جانب اتر گیا۔میں نے سہارا دے کر سعدیہ کو بھی دیوار پر چڑھایا اور اس کے پیچھے خود بھی اوپر چڑھ گیا۔امجد

اگلے کوارٹر کی دیوار کے قریب پہنچ گیا تھا۔کوارٹر کے اندر چھائی خاموشی اس کے خالی ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔سعدیہ بغیر کسی سہارے کے دوسرے جانب اتر گئی۔اگلے کوارٹر میں کمرے کے اندر باتوں کی آواز سنائی دی مگر ہم دبے قدموں تیسرے کوارٹر کی دیوار پار کر گئے۔اس کوارٹر میں بھی بندے موجود ہونے کے باوجود ہمارا سامنا کسی سے نہ ہوا۔البتہ چوتھے کوارٹر کے صحن میں کرسیاں ڈالے ایک مرد اور دو جوان سال عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ہمیں دیکھتے ہی وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

کک......کیا بات ہے۔“مرد نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے پوچھا۔

”گھبرائیں نہیں ہم دشمنوں سے بچنے کے لیے بھاگ رہے ہیں۔“میں نے انھیں تسلی دی۔وہ کوارٹر اس لائن کا آخری کوارٹر تھا۔اس کے بعد نسبتاً بڑے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا،لیکن اس کوارٹر اور پہلے مکان کے درمیان ایک پتلی سی گلی گزر رہی تھی۔امجد نے دیوار سے اچک کر گلی میں جھانکا اور بولا۔

”خالی پڑی ہے۔“

”نکلو پھر۔“ہم تینوں دیوار سے گزر کر گلی میں آ گئے۔میں نے تھوڑا سا آگے بڑھ کر بڑی گلی میں جھانکا تو اپنے کوارٹر کے سامنے مجھے چند بندے کھڑے نظر آئے۔وہ سارے ہمارے کوارٹر کی طرف متوجہ تھے میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے ایک بندہ کوارٹر کی سامنے والی دیوار سے اچک کر کوارٹر کے اندر داخل ہو گیا؟ان کے صبر کا پیمانہ شاید لبریز ہو چکا تھا۔چند سیکنڈ کے بعد ہی دیوار سے کودنے والے نے کوارٹر کا دروازہ اندر سے کھول دیا اور وہ تمام تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔

”آجاؤ۔“میں ان سے بولا اور ہم نے دوڑ کر وہ چوڑی گلی کراس کر لی۔وہ پتلی گلی کافی طویل تھی ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہاں سے نکلتے چلے گئے۔سعدیہ کو ہمارا ساتھ دینے کے لیے تقریباً دوڑنا پڑ رہا تھا۔وہ غریب ابھی تک ننگے پاؤں تھی۔

”جانو صاحب!......اس کا مطلب ہے تیری احتیاط پسندی کام نہیں آسکی ہے۔“

”ہاں یار......اسی لیے تو اسے جنگل خیل کہتے ہیں۔بہر حال اب بکنگ والے کا صفایا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ ہمیں شکل سے پہچانتا ہے۔“

”وہ تو خیر ہو ہی جائے گا،پہلے سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈو۔“

”میرا تو خیال ہے کسی خالی کوارٹر یا مکان میں گھس کے رات گزارتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“اس نے میری تائید کی اور ہم چلتے چلتے گھروں کے بیرونی دروازوں کو غور سے دیکھنے لگے،سورج غروب ہو چکا تھا مگر اب تک اتنی روشنی باقی تھی کہ ہم گلی کے وسط سے تالوں کو دیکھ سکتے تھے۔ہماری محنت رنگ لائی اور جلد ہی ایک بڑے مکان کے باہر ہمیں تالا لٹکتا نظر آ گیا۔

”یہ کیسا رہے گا جانو؟“امجد مستفسر ہوا۔

''اچھا ہے...... اندر گھس کر دروازہ کھولو۔'' مکان کی دیواریں کافی اونچی تھیں دائیں بائیں کا جائزہ لے کر امجد اچھلا اور دیوار کے اوپر اپنی انگلیاں پھنسا کر اوپر چڑھ گیا۔ دیوار پہ اس نے زیادہ دیر نہیں گزاری تھی ایک سرسری نظر صحن میں دوڑا کر وہ نیچے کود گیا۔ منٹ ڈیڑھ منٹ کے بعد اس نے چھوٹی کھڑکی کھول دی میں اور سعدیہ جلدی سے اندر گھس گئے۔

''ایک دفعہ تسلی کر لیں یہ نہ ہو کوئی عارضی طور پر باہر گیا ہوا ہو اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں نے کمروں کے تالے توڑ کر دیکھنے شروع کر دیے، پہلے دو کمروں میں گرد کی ہلکی ہلکی تہہ دیکھنے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ چند دنوں سے ان کی کمروں کو کسی نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ باقی کمروں کے تالے توڑنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ہم نے انھیں بند رہنے دیا تھا۔

''آپ دونوں آرام کرو۔ میں ذرا بکنگ والے کی خبر لے لوں۔''

''دونوں چلے جاتے ہیں۔'' امجد نے مشورہ دیا۔

''نہیں۔'' میں نفی میں سر ہلایا۔ ''ایک بندے کا سعدیہ کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔''

''پھر آپ بھی آرام کریں...... اس سے بعد میں نبٹ لیں گے۔''

''دماغ ٹھیک ہے ماجے صاحب......! اس موذی نے ہماری مبارک شکلیں بہت اچھی طرح سے دیکھی ہوئی ہیں۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا''

اس دفعہ اس نے خاموش رہتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ میں نے ایک پرانی چادر اٹھا کر پگڑی کے انداز میں سر پر لپیٹی اور اس کا ایک پلو منہ کے گرد لپیٹ کر اپنے چہرے کو کسی حد تک ڈھانپ دیا۔

میں نے سعدیہ سے پوچھا۔ ''تمھیں ہتھیار چلانا آتا ہے؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ پستول اپنے پاس رکھو شاید تمھیں اس کی ضرورت پڑ جائے۔'' میں نے جیب سے پستول نکال کر اس کے جانب بڑھا دیا، ہم دونوں کے پاس یوں بھی کلاشن کوفیں موجود تھیں۔ تین کلاشن کوفیں ہم نے ڈاہیر والوں سے اپنے قبضے میں کی تھیں۔ جس میں سے ایک میرے پاس موجود تھی جبکہ دو گنیں ہم گاڑی میں بھول آئے تھے۔ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔ میں ہوٹل کی سمت چل پڑا لوگوں کی آمد و رفت میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی اور یہ چہل پہل اس بات کا اشارہ تھا کہ جنگل خیل کی راتیں بھی جاگتی تھیں۔ جلد ہی میں ہوٹل کے قریب پہنچ گیا، لیکن اندر داخل ہونے کی بجائے میں ناک کی سیدھ میں نکلتا چلا گیا البتہ ہوٹل کے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نظر اندر دیکھ کر بکنگ والے کی موجودی کا یقین کر لیا تھا۔ کافی آگے جا کر میں پیچھے مڑا اور ٹہلنے کے انداز میں واپس آنے لگا۔ دروازے کے سامنے مزید ڈیڑھ گھنٹے تک میری مٹرگشت جاری رہی۔ جس وقت بکنگ والے نے اپنی جگہ چھوڑی اس وقت رات کا اندھیرا خوب گہرا ہو چکا تھا مگر ہوٹل کے اندر روشنی کا خاطر خواہ بندوبست کیا گیا تھا جو لازمی طور پر جنریٹر کے مرہون منت

تھا کیونکہ ادھر سرکاری بجلی کا کوئی بندوبست نہیں تھا، اور ہوتا بھی کیسے جب یہ علاقہ کسی بھی حکومت کے زیر اثر نہیں تھا۔

اس کے باہر آتے ہی میں نے غیر محسوس انداز میں اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ گلیوں کے اندر اکا دکا آدمیوں کی موجودی جہاں میرے کام میں مانع ثابت ہوئی وہیں اسے بھی میرے تعاقب کی سرگرمی سے بے خبر رکھا۔ دو تین گلیاں مڑنے کے بعد آخر وہ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک کر اس کا تالا کھولنے لگا اور یہ دیکھ کر میں نے اطمنان کا گہرا سانس لیا گویا وہ اس کا مکان میں اکیلا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گلی سنسان نظر آئی البتہ ہم سے آگے دو بندے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جب تک وہ کواڑ کھول کر اندر داخل ہوتا میں اس کے سر پہ پہنچ گیا تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی اور اس کی یہ کوشش ناکام بناتے ہوئے میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

”کک کیا بات ہے کون ہو تم۔“

”خاکسار کو عبداللہ ولد عبدالرحمٰن کہتے ہیں۔“

”آ......آ......عبداللہ بھائی آپ“۔ وہ ہکلایا۔

”جی میں......تم نے کہا تھا ناں کہ اگر تمھارے لائق کوئی خدمت ہو تو میں بے جھجک بتا سکتا ہوں۔“

”ک، کک۔ کیوں نہیں۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”مگر اس کے لیے آپ کو ہوٹل میں تشریف لانا چاہیے تھا۔“

”نہیں اس خدمت کے لیے یہی جگہ مناسب رہے گی۔“ میں سرد لہجے بولا۔ ”تم آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولو۔“

”آ......آپ مجھے کسی غلط فہمی کا شکار لگ رہے ہیں۔“ وہ اپنے دل کے اندیشے زبان پہ لے آیا۔

”شاید......مگر آپ کوشش کر کے میری غلط فہمی دور کر سکتے ہیں۔“

”بب......بالکل سر......کیوں نہیں۔“

”تو چلو پھر دروازہ کھولو تا کہ غلط فہمی دور کی جائے۔“ میں اسے کلاشن کوف سے آگے دھکیلا۔

اور وہ مرے مرے قدموں سے اندر کی طرف چل پڑا۔ بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور جلا کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی حرکت وسکنات پہ میں نے گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی طرف سے ذرا سی بے قاعدگی پر میں اسے آڑے ہاتھوں لینے کے لیے تیار تھا اور اسی مقصد کے لیے میں نے ٹارچ جلائی تھی تا کہ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کوئی غلط حرکت نہ کر گزرے مگر ابھی تک وہ میرے خطرناک عزائم سے بے خبر تھا اس لیے اس نے کسی بھی قسم کی الٹی سیدھی حرکت سے گریز کیا تھا یا شاید وہ میرے ہاتھ میں موجود گن سے ڈرا ہوا تھا۔ اس نے اندرونی کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم اکٹھے کمرے میں داخل ہو گئے چارپائی کے ساتھ پڑی لکڑی کی تپائی پر ایک چھوٹا سا گیس سلنڈر رکھا ہوا تھا۔ اس نے تیلی جلا کر مینٹل کو آگ لگائی اور کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔

”بیٹھیں عبداللہ صاحب۔“ وہ گیس سلنڈر جلا کر بولا۔

''بیٹھنے کو چھوڑو...... مجھے صرف اتنا بتادو کہ میرے متعلق جانان خان کے آدمیوں کو معلومات پہنچانے کے عوض کتنی رقم وصول کی ہے؟''

''کک کون جانان خان......اور کیسی رقم آ......آپ نے کیسی باتیں شروع کر دی ہیں؟''

''جانان خان فرام ڈابیر مسٹر وعدہ خلاف......اگر تمھیں زیادہ رقم چاہیے تھی تو مجھے بتلاتے میں کوئی غریب تو نہیں تھا۔ تجھے منہ مانگی رقم ادا کر سکتا تھا۔ بہر حال اب تیری سزا یہی ہے کہ میری دی ہوئی تمام رقم بشمول ایڈوانس کرائے کے اور جانان خان سے حاصل کی ہوئی رقم میرے حوالے کر دو۔''

میری بات ختم ہوتے ہی اس کے چہرے پر چمک سی لہرائی تھی اور یہ چمک اتنی آسانی سے جان چھوٹنے کی تھی اس نے بغیر کوئی بحث کیے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک چھوٹی سی گڈی میرے جانب بڑھا دی۔

''یہ اکتیس سو روپے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے انھوں نے تجھے دو ہزار کی ہڈی ڈالی تھی۔'' میں زہر خند لہجے میں بولا اور اس نے مجرمانہ خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''تمھارا نام؟''

''شاکر خان۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''شاکر خان......تُو نے انھیں میرا اور میرے ساتھی کا حلیہ بتایا تھا؟''

''نن نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''سچ بتاؤ؟''

''صحیح کہہ رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''انھوں نے مجھ سے اس وقت سے دو تین گھنٹوں کے دوران آنے والے بندوں کے متعلق معلومات پوچھیں تھیں اور میں نے فقط یہ بتایا تھا کہ دو مرد کلاشن کوفوں سے مسلح تھے اور ان کے ساتھ ایک عورت تھی۔''

''چلو مان لیتا ہوں...... بہر حال مجھے افسوس ہے کہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اب اگر وہ جلدی میں میرے حلیے کے متعلق نہیں پوچھ سکے ہیں تو دوبارہ آ کر شاید انھیں یہ استفسار نہ بھولے۔''

''م......مم میں اب انھیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔'' میرے لہجے میں پائی جانے والی سنجیدگی نے اسے لرزا دیا تھا۔

''اگر تُو آرام سے نہیں بتانا چاہے گا تو پوچھنے کے اور بھی کئی طریقے ان کے پاس موجود ہوں گے۔''

''م......مم میں ق......ق......قیں۔'' الفاظ اس کے منہ میں ادھورے رہ گئے تھے۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی گردن کو بائیں بازو کی گرفت میں لیا اور مخصوص جھٹکے کے ساتھ اسے دنیا کے غموں سے نجات دلا دی۔

اسے مار کر پھینکنے کے بعد میں نے تمام کمرے کی تفصیلی تلاشی لی مجھے امید تھی کہ اپنی ساری رقم اس نے گھر میں ہی کہیں چھپا کر رکھی ہوگی کہ جنگل خیل میں بینک نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ مگر اس کی خواب گاہ باقی دو کمرے اور کچن جو کہ استعمال نہیں ہوتا تھا ان سب کو اچھی

طرح کھنگالنے کے بعد بھی مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے ایک گہری نگاہ اس کی خواب گاہ میں دوڑائی مگر ایسی کوئی چیز مجھے نظر نہ آئی۔ جسے میں نے چیک نہ کیا ہو یہاں تک کہ چارپائیوں تک کے نیچے میں نے اچھی طرح تلاشی لے لی تھی۔ صرف اس کے سرہانے لگی ہوئی تصویر جو تجریدی آرٹ کا نمونہ تھی مجھ سے رہ گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ہلایا تو وہ تختی کے ساتھ دیوار میں گڑی نظر آئی۔ میں نے پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکال کر کینوس اور اس کے نیچے موجود گتے کو چوکور شکل میں کاٹ دیا۔ اس ٹکڑے کے ہٹتے ہی تصویر کے پیچھے دیوار میں نصب چھوٹا سا سیف ظاہر ہو گیا۔ شاکر خان نے بلاشبہ بڑے سلیقے سے اسے چھپایا تھا۔ میرے پاس سیف کے تالے کے ساتھ متھا مارنے کا ٹائم نہیں تھا اس کے ساتھ زور آزمائی کرنا وقت کا ضیاع تھا۔ میں نے کلاشن کوف کو سنگل راؤنڈ فائر پر سیٹ کرتے ہوئے اس کی بیرل کو تالے کے سوراخ سے لگایا اور مسلسل دو دفعہ ٹریگر پریس کیا۔ زوردار دھماکے کے ساتھ سیف کا تالا ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو وہ چھوٹا سا سیف رقم سے بھرا نظر آیا۔ اس کے ایک خانے میں سونے کی چند اینٹیں اور کوئی دستاویزات پڑی تھیں۔ دستاویزات کو چھیڑے بغیر میں نے جلدی جلدی رقم اور سونے کی اینٹوں کو سمیٹا اور انھیں ایک کپڑے میں گھڑی کی طرح باندھ کر وہاں سے چل پڑا۔ گو یہاں پر فائر روزمرہ کا معمول تھے لیکن پھر بھی احتیاط لازمی تھی کوئی بھی پڑوسی اس فائر کی حقیقت جاننے کے لیے شاکر خان کے گھر جھانک کر دیکھ سکتا تھا اور اس کی وجہ سے خواہ مخواہ مجھے ایک اور جان لینی پڑتی۔ ڈابیر والوں سے اپنا آپ چھپانے کے لیے مجھے بڑی تگ و دو کرنی پڑ رہی تھی کیونکہ ہماری شناخت ظاہر ہو جانے کی صورت میں ایک لمبی دشمنی کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا اور پورے گاؤں یا کم از کم ڈابیر کے مخصوص گروپ سے لڑائی مول لینا ہم دو بندوں کے لیے ناممکن ہو جاتا۔ یوں بھی ہتھیار کا زمانہ تھا اور ٹریگر دبا کر ایک بچہ بھی چھ فٹ کے جوان کو زندگی کی قید سے نجات دلا سکتا تھا۔

شاکر خان کے گھر سے نکل کر میں اسی مکان کے جانب روانہ ہو گیا جہاں امجد اور سعدیہ چھپے ہوئے تھے، واپسی کے لیے میں چاہنے کے باوجود رستہ نہ بدل سکا کہ دوسرے راستے سے میں شاید اس مکان تک نہ پہنچ سکتا۔ اس بار بھی میں بغیر کسی حادثہ کے اپنی کمین گاہ میں پہنچ گیا۔ امجد بیرونی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا سن کر باہر آ گیا تھا۔ وہ کسی بھی ناگہانی صورت حال کے لیے تیار تھا۔

''کون؟''

''عمر۔'' میں مختصراً بولا۔

''کیا رہا۔''

''کامیابی۔''

''گڈ۔''

''سعدیہ کدھر ہے؟'' میں نے کمرے میں داخل ہو کر ٹارچ روشن کرتے ہوئے پوچھا۔

''ساتھ والے کمرے میں ہے۔'' امجد نے موم بتی روشن کرتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے بھی اس نے موم بتی جلائی ہوئی تھی مگر

دروازے پہ ہونے والی آہٹ اس کے بجھانے کا باعث بنی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' موم بتی کی روشنی میں اس کی نظر رقم کی گٹھڑی پہ پڑی۔

''کھول کر دیکھ لو۔'' میں نے پوٹلی اس کے جانب بڑھائی۔

''بھئی واہ..... کہیں ڈاکا ڈالا ہے شاید؟''

''یہ شاکر خان کا وہ خزانہ ہے جو اس نے پتا نہیں کون کون سے ناجائز طریقوں کے ذریعے اکٹھا کیا ہوگا؟''

''شاکر خان؟''

''یہ اسی بکنگ والے کا نام ہے۔ ویسے تو اس کی حرام کی کمائی سے مجھے بالکل غرض نہیں تھی مگر حالات کو دیکھ کر مجھے یہ گھٹیا کام کرنا پڑا۔''

''اچھا کیا ہے۔'' امجد پانچ سو کے نوٹوں کی گڈی اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔ جو یقیناً پچاس ہزار کے بقدر رقم ہوگی اس سے زیادہ رقم ابھی تک گٹھڑی میں پڑی تھی۔

''یہ بھی رکھو۔'' میں نے سو سو کے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف بڑھائی اور بقایا رقم سمیٹ کر اپنی جیبوں میں بھر لی۔ سونے کی اینٹیں ہم نے کپڑے میں لپٹی رہنے دیں تھیں۔

''یار جیبیں کچھ وزنی نہیں ہوگئیں۔''

''اس کا انتظام کل کرلیں گے۔ ایک دکان میں مجھے کمر سے باندھنے والے بیلٹ نظر آئے تھے بڑی رقم کو آسانی سے اپنے ساتھ گھمانے کا اس سے اچھا بندوبست اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''اب کیا ارادہ ہے۔''

''موم بتی بجھاؤ تھوڑا آرام کرتے ہیں۔'' میں بستر پر لیٹ گیا۔ ''مجھے امید ہے کہ یہ مکان فی الحال محفوظ رہے گا۔''

''صحیح کہا۔'' امجد نے پھونک مار کر موم بتی بجھادی اور ہم دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے۔

+ + +

میری آنکھ امجد کی آواز سے کھلی وہ کہہ رہا تھا......

''ملک صاحب اٹھ جاؤ کافی دیر ہوگئی ہے۔''

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں پھیلی روشنی سے اندازہ ہوا کہ سورج کافی اوپر آگیا تھا۔

''ساتھ باتھ روم ہے اس کے بیچ پانی کا بھرا ہوا ڈرم رکھا ہوا ہے۔ نہالو۔''

میں کمرے کے ساتھ بنے ہوئے باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو کمرے میں سعدیہ کا اضافہ ہوچکا تھا۔ وہ چھابے میں گرم گرم پراٹھے اور کیتلی قہوے کی بھرلائی تھی۔

''یہ بندوبست کہاں سے کیا؟''

''کچن میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔''

''یہ کام تمھیں اندھرے میں کرنا چاہیے تھا۔اس ٹائم تو دھواں دیکھ کر کوئی بھی اس جانب متوجہ ہو سکتا ہے۔''

''م.....مم مجھے خیال نہیں رہا تھا۔'' وہ پریشان ہو گئی۔

''آئندہ خیال رکھنا......اور ناشتا کر لیا ہے؟''

''کچن میں جا کر، کر لیتی ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل گئی۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' ناشتے سے فارغ ہو کر امجد مستفسر ہوا۔

''اب چلتے ہیں ذرا آوارہ گردی کے لیے۔''

''اِس مصیبت کا کیا کریں گے؟''

''شرم کرو یار وہ تمھاری اتنی خدمت کر رہی ہے اور تم اسے مصیبت کہہ رہے ہو۔''

''میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو تقریر سننے کے موڈ میں مَیں بالکل نہیں ہوں۔''

''یہ ادھر ہی رہے گی۔''

''اگر مکان کے مالک واپس آ گئے تب؟''

''تب یہ کہیں چھپ جائے گی۔اتنا بڑا مکان ہے،لیکن امید یہی ہے کہ کوئی آئے گا نہیں۔''

''چلو پھر نکلیں۔'' ہم دونوں سعدیہ کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے اس مکان سے باہر نکل آئے۔باہر نکلنے سے پہلے ہم نے گلی کے خالی ہونے کا یقین کر لیا تھا۔ہم سیدھے بازار پہنچے اور وہاں سے کمر سے باندھنے والے پرس خریدے کہ رقم کی وجہ سے ہماری جیبیں کافی بوجھل ہو رہی تھیں اس کام سے فارغ ہوتے ہی ہم نے اپنے لیے رہائش کی تلاش شروع کر دی۔اس مرتبہ ہم نے ہوٹلوں سے دور رہنے کی ٹھانی تھی، پھرتے پھراتے ہم جنگل خیل کے مضافات میں نکل آئے۔افغانستان کی طرف جانے والے راستے پر چائے کا کھوکھا دیکھ کر ہم چائے پینے بیٹھ گئے۔کھوکھے کا مالک پختہ عمر کا قبول صورت مرد تھا۔وہ خود چائے بنا کر اپنے گاہکوں کو سرو کر رہا تھا۔

''بھائی صاحب دودھ والی چائے مل جائے گی۔'' پہلے بیٹھے ہوئے دو گاہکوں کو قہوہ پیتے دیکھ کر میں نے اس سے پوچھنا مناسب سمجھا۔

''چائے کیا دودھ پتی ملے گی صاحب۔''

''اچھا دو کپ لے آؤ۔''

چائے تیار ہونے تک پہلے والے گاہک رخصت ہو گئے تھے۔چائے پیتے ہوئے میں نے امجد سے پوچھا۔

''ماجے کیا خیال ہے اسی سے رہائش کے متعلق بات نہ کر لی جائے؟''

”بسم اللہ کرو......نیکی اور پوچھ پوچھ۔“

”چائے پی کر میں نے اس سے کہا۔”بھائی جی ہم مسافر ہیں آپ کی نظر میں کوئی ایسا شخص ہو جو اپنا گھر کرائے پہ دینا چاہتا ہو؟“

”صاحب جی جنگل خیل میں تو کئی ہوٹل والے یہی کاروبار کرتے ہیں۔ہوٹل کے اندر کمروں کے علاوہ ان کے پاس کرائے کے کوارٹر اور بڑے مکان بھی دستیاب ہیں۔“

”نہیں وہ کرایہ زیادہ لیتے ہیں اور ہم نے کافی عرصہ یہاں پہ گزارنا ہے،ہمیں تو کوئی ایسی جگہ چاہئے جہاں کرایہ بھی کم ہو اور گھر کی بنی ہوئی روٹی بھی مل سکے البتہ کھانے کی ہم علیحدہ سے قیمت ادا کریں گے۔“

وہ چند لمحے سوچنے کے لیے بعد بولا۔”صاحب جی میری نظر میں تو کوئی ایسا شخص یا گھر نہیں ہے۔“

”اپنے بارے کیا خیال ہے تیرا؟“

وہ عجیب انداز میں ہنسا۔”صاحب جی میرے پاس چھوٹا سا گھر تو موجود ہے۔کھانا پکانے والا کوئی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ ماں باپ مر چکے ہیں۔بہن بھائی کوئی نہیں ہیں اور شادی ابھی تک ہوئی نہیں ہے،اس لیے کبھی خود پکا لیتا ہوں کبھی ہوٹل سے لے کر کھا لیتا ہوں۔“

”شادی کر لو نا؟“

”شادی......؟ کر لیں گے صاحب...... جب لڑکی کے باپ کا مطالبہ پورا کرنے کے قابل ہوا شادی ضروری کروں گا۔“اس کی آنکھوں میں گویا اَن دیکھی دولھن کے خواب اتر آئے تھے۔

”تمھارا نام؟“

”عبدالمجید......صاحب۔“

”عبدالمجید بھائی بات یہ ہے کہ ہم نے تیرے ہی گھر کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے،کھانا پکانے کی فکر نہ کر و اس کی ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں۔“

”مم......مگر میرے گھر میں تو ایک ہی چارپائی ہے۔“وہ گڑبڑا کر بولا۔

”تمھارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟“میں اس کی الجھن نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس درختوں کے جھنڈ کے پرلی سمت ہے۔“اس نے تقریباً تین سو گز کی دوری پر نظر آنے والے درختوں کے چھوٹے سے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا پھر یوں کرو بازار سے جا کر تین نئی چارپائیاں لے کر آجاؤ۔“میں نے ایک ہزار روپیہ اس کی جانب بڑھایا۔”لیکن خیال

رہے کسی کے سامنے ہماراذ کر نہ کرنا۔''

''مم......مگر صاحب جی؟''

''چھوڑو اگر مگر یار۔ جاؤ ہم یہیں تیرا انتظار کریں گے۔'' اور وہ متذبذب سا بازار کے جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے امجد کو اس سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتا دی۔ گھنٹے بھر بعد ہی عبدالمجید ایک گدھا گاڑی پر تین نئی چارپائیاں لادے بازار کی سمت سے آتا دکھائی دیا اور پھر وہ ہمارے قریب رکے بغیر اپنے گھر کے جانب نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے خوش قسمتی سے چاے پینے کے لیے کوئی گاہک نہیں آیا تھا اس کی واپسی تک ہم اس کے متعلق ہی مصروفِ گفتگو رہے تھے۔

''یہ لیں صاحب۔'' واپس پہنچتے ہی اس نے پانچ سو کا نوٹ اور کچھ ریزگاری میرے جانب بڑھائی۔

''چارپائیوں کی قیمت اور کرائے سے یہ رقم بچ گئی ہے۔''

''انھیں فی الحال اپنے پاس رکھو اور چلو ہمیں اپنا گھر دکھاؤ۔'' کھوکھا بند کر کے وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔ اس کے گھر کی لوکیشن ہمیں کافی پسند آئی تھی۔ اس کے ساتھ بقیہ معاملات طے کر کے اور اسے رات کے وقت اپنی آمد کا بتلا کر ہم اس سے رخصت ہو گئے۔ وہاں سے سیدھے ہم مکان میں واپس آئے لیکن بازار سے گزرتے وقت میں سعدیہ کے لیے زنانہ جوتی لینا نہ بھولا تھا۔ سعدیہ بڑی بے چینی سے ہماری منتظر تھی۔ دن کا بقیہ حصہ ہم نے اسی مکان میں گزارا۔ رات کا اندھیرا چھاتے ہی ہم وہاں سے نکل آئے تھے۔ عبدالمجید کے گھر تک ہم بغیر کسی حادثہ کے پہنچ گئے۔

اس کا چھوٹا سا مکان تین کمروں پر مشتمل تھا۔ کچن کے نام پر صحن کے کونے میں چھوٹے چھوٹے دو چولہے بنے ہوئے تھے۔ سارا مکان مٹی کے کچے بلاکوں سے بنایا گیا تھا۔ کمروں کی نسبت صحن کافی بڑا تھا۔ صحن کے اندر دو تین پیڑ بھی موجود تھے۔ ہمارے لیے کھانا اس نے تیار کر کے رکھا ہوا تھا، سعدیہ کا تعارف ہم نے اپنی قریبی عزیزہ کے طور پر کرایا تھا۔ کھانا کھا کر ہم تھوڑی دیر گپ شپ کرتے رہے اور اس کے بعد سو گئے۔ رہائش کا مسئلہ تقریباً حل ہو گیا تھا۔ اب ہم یکسو ہو کر چودھری کی تلاش کا آغاز کر سکتے تھے۔

عبدالمجید چہرے مہرے سے اچھے کردار کا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ غربت نے اس کے اندر ایک عجیب سی تواضع اور انکساری پیدا کر دی تھی، اگلی صبح جبکہ وہ اپنے کھوکھے پر جا چکا تھا ہم دونوں سعدیہ کو گھر میں چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

''ملک صاحب بس مصیبتے کا مسئلہ تو حل ہو گیا اب چودھری کی تلاش کا باضابطہ آغاز کر دینا چاہیے۔''

''سعدیہ کا مسئلہ کیسے حل ہو گیا؟''

''بھئی عبدالمجید غیر شادی شدہ ہے دوسری جانب سعدیہ ٹھہری بیوہ اب ان دونوں کی شادی کر دی جائے تو دونوں کا فائدہ ہوگا۔''

''بات تو تمھاری معقول ہے مگر پہلے سعدیہ سے پوچھنا پڑے گا۔ آیا اسے بھی یہ رشتہ قبول ہے یا......''

''یا وہ جانو کا انتظار کرے گی۔'' وہ میری بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب کسی ایک کو تو بخش دو ایک انڈیا میں جناب کی

منتظر ہے، دوسری رحمٰن خیل میں چشم براہ ہے اور تیسری یہاں ڈھونڈ لی۔''

''بکواس مت کرو۔'' میں چڑ گیا۔''میں نے کب رضیہ یا سعدیہ سے اظہار محبت کیا ہے۔ البتہ شیتل کو میں نے جھوٹی تسلی دینے کے لیے کہا تھا کہ اپنے مسائل سے نبٹنے کے بعد اس کے پاس انڈیا آنے کی کوشش کروں گا۔''

''تیرا سب سے بڑا مسئلہ تو لڑکیوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔''

''تیری بڑی مہربانی ہوگی اگر تُو اس موضوع کو ختم کر دے۔'' میں تنگ آتے ہوئے بولا۔

''چل پھر بازار چلتے ہیں تاکہ مختلف ہوٹلوں کے بکنگ والوں سے چودھری کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

''اب کی ہے نہ کام کی بات۔'' میں اسے شاباش دی۔ اور وہاں سے بازار کی طرف چل پڑے۔

جنگل خیل میں ٹوٹل پانچ چھ ہوٹل تھے اور تمام ہم نے شام تک چھان مارے مگر وہ چودھری کے نام یا اس کے حلئے سے ناواقف تھے اس دن ہم ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔

عبدالمجید ہمارا منتظر تھا ہمیں دیکھتے ہی مستفسر ہوا۔

''آپ نے دن کا کھانا کہاں کھایا ہے؟''

''شکر کروارات کے کھانے پہ آپہنچے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''مطلب یہ کہ جنگل خیل میں ہماری آمد کا مقصد اپنے دشمن کی تلاش ہے جس کا نام چودھری اکبر ہے۔ پہلے ہمیں سعدیہ کی فکر رہتی تھی اب چونکہ اس کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا ہے تو ہم نے بھی باقاعدگی سے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ تم سے بھی یہ درخواست ہے کہ اگر تمھیں چودھری اکبر کے متعلق کوئی خبر پتا چلتی ہے تو بغیر کسی تاخیر کے ہمیں بتا دینا اس کا حلیہ......'' اس کے ساتھ ہی میں نے چودھری اکبر کا حلیہ تفصیل سے اسے بتا دیا۔

''ٹھیک ہے عبداللہ بھائی مجھے جیسے ہی اس کے بارے کچھ معلوم ہوا میں ضرور آپ کو باخبر کر دوں گا۔''

اسی وقت سعدیہ کھانا لے کر آ گئی۔ ہمارے آگے کھانا رکھنے کے بعد وہ خود کمرے میں گھس گئی وہ ہمارے درمیان بیٹھنے سے احتراز برتتی تھی اور اس کی وجہ اس کی شرم و حیا تھی۔ غیر مردوں کے ساتھ رہنا اس کی مجبوری تھی ورنہ شاید وہ کب کی ہم سے علیحدہ ہو گئی ہوتی۔ دوسری طرف ہم دونوں بھی انسان ہمدردی کی بنا پر اسے ساتھ لیے پھرتے رہے ورنہ ہمیں بھی اسے ساتھ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''آپ دونوں کھانا کھاؤ میں نے سعدیہ سے کوئی بات کرنی ہے۔ کھانا بھی اس کے ساتھ کھالوں گا۔'' میں سعدیہ کے کمرے کے جانب بڑھ گیا۔

''السلام علیکم۔'' میں دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا۔

''آ......آپ۔'' وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سلام کا جواب تو دے دو۔''

''وعلیکم السلام......آئیں بیٹھیں۔''

''شکریہ۔'' میں کمرے میں پڑی اکلوتی چارپائی پر بیٹھ گیا۔وہ بھی چارپائی کے ایک کنارے پہ ٹک گئی۔

''سعدیہ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی تھی اس لیے تجھے زحمت دی۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی......حکم کرو؟''

''اس دن جنگل خیل میں داخل ہوتے وقت میں نے تمھیں ایک بات کہی تھی کہ کسی بھی پُر امن علاقے میں چلی جاؤ اور کسی شریف آدمی سے شادی کر لو مگر تم نے میری بات کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا تھا۔اب میں تھوڑے فرق کے ساتھ دوبارہ وہی بات کرنے کے لیے آیا ہوں کہ عبدالمجید بہت اچھا نیک خصلت اور شریف جوان ہے۔اس کے ساتھ شادی کر کے تمھاری کافی مشکلیں حل ہو جائیں گی۔اس کو بھی ایک اچھی شریک حیات کی ضرورت ہے۔اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمھاری نسبت اس سے طے کر دوں؟''

میں نے نپے تلے الفاظ کے ساتھ اپنی بات اس تک پہنچانے کی کوشش کی تھی میری بات ختم ہوتے ہی اس نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا اس کی نگاہ میں ہزاروں شکوے پنہاں تھے مگر زبان سے اس نے کسی گلے شکوے کا اظہار کرنے کی بجائے صرف اتنا کہا۔

''آپ میرے لیے بھلا ہی سوچیں گے میں آپ کی کسی بات سے انحراف نہیں کر سکتی۔''

''سعدیہ میں تمھارے جذبات سمجھتا ہوں، مگر افسوس کہ تم میرے حالات سے ناواقف ہو۔تمھارے لیے مختصراً اتنا ہی کافی ہے کہ میں شادی شدہ ہوں تمھارے جیسی شریف اور خوب صورت لڑکی کسی خوش نصیب کے حصے میں ہی آتی ہے۔باسمت خان ناشکرا تھا اس لیے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔باقی میں تمھیں دھوکے میں رکھ کر تیری معصومیت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھیں محفوظ ہاتھوں کے حوالے کر کے ہم اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے فارغ ہو جائیں کہ جس کے لیے ہم جنگل خیل آئے تھے۔''

''میں نے کوئی گلا شکوہ تو نہیں کیا آپ سے۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''کچھ شکوے ایسے ہوتے ہیں جو بے کہے مخالف تک پہنچ جاتے ہیں۔بہر حال ہم دونوں دوستوں کی کسی بات سے تمھاری دل آزاری ہوئی ہو تو درگزر کرنا اور یہ کچھ رقم رکھ لو۔'' میں نے پانچ سو والے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی سمت بڑھائی۔''یہ تمھیں اور تمھارے ہونے والے شوہر کو نئی زندگی کی شروعات میں مدد فراہم کرے گی۔اس کے علاوہ بھی اگر کوئی چیز چاہیے ہو تو بے تکلف بتا دینا۔''

''اتنی زیادہ رقم......مم میں......'' وہ گڑبڑا سی گئی۔

''کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔بھائی اس سے بھی بہت بڑھ کر بہنوں کیلیے کرتے ہیں، یہ تو ہماری مجبوری ہے کہ ہم پردیس میں ہیں۔''

''خدا ہر بہن کو آپ جیسے بھائی دے۔'' وہ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولی اور پھر اپنے آنسو چھپانے کے لیے میری جانب

سے رخ پھیرلیا۔ وہ آنسو شاید اپنے محبوب سے ہمیشہ ہمیشہ کی جدائی کی وجہ سے نکلے تھے یا بھائی ملنے کی خوشی میں باہر آئے تھے میں اس بات سے بے خبر تھا۔ میں نے اس کے جذبات کو نارمل کرنے کے لیے کہا۔

''اب یوں کرو کہ فٹافٹ کھانے کا بندوبست کرو میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

وہ جلدی سے بولی......

''اوہ معافی چاہتی ہوں، مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکے ہیں۔ میں ابھی لائی۔'' وہ باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی کھانا لے کر آ گئی۔ کھانا ہم دونوں نے اکٹھے کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے ایک دفعہ پھر اس کا عندیہ لینا چاہا۔

''سعدیہ یہ نہ سمجھ لینا کہ تم ہم پر بوجھ تھیں اور موقع ملتے ہی ہم نے تم سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ میں نے ابھی تک عبدالمجید سے تیرے بارے کوئی بات نہیں کی اگر تجھے وہ ناپسند ہو تو بے جھجک بتا دو۔''

''اگر میں عبدالمجید کو ٹھکرا بھی دوں تو کون سا مجھے کسی نے مل جانا ہے۔ اگر آپ نہیں تو پھر کوئی بھی شریف آدمی سہی جو اس پہاڑسی زندگی کو گزارنے میں مدد دے۔''

''گڈ۔'' میں تعریفی لہجے میں بولا۔ ''اس کو کہتے ہیں سمجھ داری۔''

کھانا کھا کر میں نے اس سے اجازت لی اور باہر آ گیا۔ امجد اور عبدالمجید گپیں ہانکنے میں مصروف تھے۔ عبدالمجید کی اردو سننے کے لائق تھی۔ مجھے دیکھتے ہی امجد چہکا۔

''کیا رہا؟''

''وہ تیار ہے......اب جناب کی مرضی معلوم کرنی ہے۔'' میرا اشارہ عبدالمجید کے جانب تھا۔

''اسے بھی آپ ہی سمجھائیں۔ میری تو آدھی باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔''

امجد کو ''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر میں عبدالمجید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''عبدالمجید ہیبت خان اور باسط خان کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں......آپ غالباً ڈابیر والے ہیبت خان اور باسط خان کی بات کر رہے ہیں؟''

''بالکل۔''

''ان کے بارے تو مجھے آج پتا چلا ہے کہ دونوں قتل ہو گئے ہیں۔''

''کب؟''

''دو تین دن پہلے۔''

''کیسے آدمی تھے؟''

''ٹھیک ہی تھے۔'' وہ مبہم لہجے میں بولا۔

”ان کے قتل کی وجوہات سے واقف ہو۔“

”بس لوگ مختلف قسم کی کہانیاں سنا رہے ہیں۔کوئی کہتا ہے ان کے قتل کے پیچھے ان کے چچازاد بھائی جانان خان کا ہاتھ ہے؟ کوئی ان کے دشمنوں کی کارستانی بتلاتا ہے۔کسی کی نظر میں باسمت خان کی بیوی کے آشنا کا کام ہے الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔“

”اچھا یہ بات ہے تو پھر اصل کہانی سنو۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے سعدیہ کی کہانی سنا دی۔اس کے ساتھ مختصراً اپنے بارے میں بتا دیا۔وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری گفتگو سنتا رہا۔

”اب تجھے پتا چل گیا ہوگا کہ ہمیں کیوں اس قسم کے مکان کی تلاش تھی۔“

”جج......جی جی۔“ وہ جو پوری طرح میری کہانی میں کھویا ہوا تھا اس یکدم استفسار پر بوکھلا سا گیا۔

”باسمت خان کی بیوی اب ہم دونوں کی منہ بولی بہن ہے۔بہت شریف اور صاحب کردار لڑکی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اپنی عزت بچانے کے لیے وہ اپنی جان پر کھیل گئی۔اللہ تعالیٰ کو اس کی زندگی منظور تھی ورنہ اب تک شاید اس کی بوٹیاں بھی چیل کوے کھا گئے ہوتے۔بہر حال منہ بولی بہن ہونے کے ناطے اس کی ذمہ داری ہم دونوں پر عائد ہوتی ہے اور بہنیں اپنے شوہر کے گھر ہی اچھی لگتی ہیں،اس وجہ سے ہم اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں،تیری نظر میں کوئی اچھا سا رشتہ ہو؟“

”م......مم میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر گڑبڑا گیا تھا۔

”اپنے بارے کیا خیال ہے تیرا۔“

”م......مم......میں۔“ چند لمحے تو اس کا منہ حیرانی سے کھلا رہا اور پھر جیسے ہی اس کی سمجھ میں میری بات آئی۔وہ جلدی سے چارپائی سے اٹھ کر میرے قدموں میں آبیٹھا۔

”عبداللہ بھائی......! خدا کی قسم شہزادیوں کی طرح رکھوں گا۔“ وہ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

”ارے کیا کر رہے ہو۔“ اس کے ردِعمل پر میں خفیف سا ہو گیا تھا۔مگر وہ میری بات ان سنی کرتا ہوا اپنی لے میں شروع رہا۔

”اگر ذرا سا بھی شکایت کا موقع دوں تو میرا سر اور آپ کا جوتا۔گردن بھی کاٹ دو تو اُف نہیں کروں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے بھئی۔میرے گھٹنے تو چھوڑ دو۔“ میں ہنستے ہوئے بولا۔

”نہیں پہلے مجھے یقین دلاؤ کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔“

میں نے اسے کان سے پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ ”ہائے“ کے ساتھ اٹھ گیا۔

”اب یقین آیا۔“

”کچھ کچھ۔“ وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”باقی شادی ہونے کے بعد آجائے گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو عبداللہ بھائی پھر کب؟''

''چار مہینے دس دن بعد؟''

''ک...... کک کیا مطلب؟''

''بیوقوف وہ بیوہ ہے۔عدت گزار کر ہی تجھ سے بیاہ کر سکتی ہے۔''

''میرے تو ذہن سے نکل گیا تھا۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''بہر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔اس نے بھی تجھے قبول کرنے کی رضامندی دے دی ہے اور اس سے یہی پوچھنے کے لیے میں تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس گیا تھا۔''

''اچھا......؟'' اس کے لہجے میں خوشگوار سے حیرت تھی۔''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' اس کی بات پر مجھے ہنسی آ گئی اور وہ بھی جھینپے جھینپے انداز میں ہنس پڑا۔اس کے بعد میں نے امجد کو بھی شامل گفتگو کرتے ہوئے عبدالمجید سے ہونے والی گفتگو سنا دی اور پھر رات گئے تک ہم اسی موضع پر مصروف گفتگو رہے۔عبدالمجید کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہماری کس طرح خاطر داری کرے۔سعدیہ جیسی خوب صورت لڑکی سے شادی اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

لیٹنے کے بعد بھی جب تک مجھے نیند نہ آ گئی عبدالمجید بستر پر کروٹیں لیتا نظر آتا رہا۔صبح بھی وہ ہم سے بہت پہلے اٹھ گیا تھا یا شاید اسے رات بھر نیند ہی نہیں آئی تھی۔

اگلے دو تین دن ہم نے چودھری کی تلاش میں گزارے، مگر اس کے بارے ہمیں کوئی سراغ نہ مل سکا اور پھر چند دن مزید جنگل خیل میں گزارنے کے بعد ہم نے عبدالمجید سے دوسرے جنگل خیل کے بارے معلومات حاصل کیں اور عارضی طور پر اس سے الوداع ہو کر دوسرے جنگل خیل کی طرف چل پڑے، رقبے کے لحاظ سے وہ پہلے والے جنگل خیل کے برابر ہی تھا البتہ اس کی آبادی اس سے کم تھی۔اس کے قرب وجوار میں کافی چھوٹے چھوٹے گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔اس تمام علاقے کو چھاننے میں ہمارے دو ہفتے گزر گئے مگر ہم ہنوز پہلے دن کی طرح چودھری کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی اطلاع پانے میں بھی ناکام رہے تھے۔وہاں سے واپس ہم عبدالمجید کے پاس آ گئے۔ہمارے بعد وہ بھی اپنے طور پر چودھری کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا مگر وہ بھی ہمیں کوئی خوشخبری نہ سنا سکا تھا دو دن اس کے پاس ٹھہرنے کے بعد ہم افغانستان کی سرحد پار کر گئے اور سرحدی علاقوں کو اچھی طرح چھان پھٹک کر مہینے بھر کے بعد جنگل خیل واپس آ گئے ان دونوں سفروں میں خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آیا جو قارئین کے گوش گزار کیا جائے۔

اس دن صبح کو اٹھ کر ہم سعدیہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے پراٹھوں کے ساتھ انصاف کرنے میں مشغول تھے۔امجد چائے کے گھونٹ کے ساتھ نوالا نگلتے ہوئے بولا......

''جانو صاحب!......میری مان لو طوفان خان نے ہمیں ڈبل کراس کیا ہے۔'' یہ بات وہ اس سے پہلے بھی چند مرتبہ کر چکا تھا۔

''یار ماجے!......وہ اس قسم کا بندہ لگتا تو نہیں تھا۔''

''یار لگنے کو چھوڑو دا گر اس بات پر جائیں تو تُو بھی شکل اور باتوں سے کافی شریف نظر آتا ہے تو کیا یہ حقیقت ہے؟''اور اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا کوئی کرارا سا جواب دیتا عبدالمجید ایک جھٹکے سے گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر اندر آیا اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں وہ شاید اپنے کھوکے سے بھاگ کر وہاں آیا تھا۔اس کی حالت دیکھ کر ہم بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔

''عبداللہ بھائی۔''وہ بمشکل چڑھی ہوئی سانسوں میں میرا نام لے پایا۔

''ہاں ہاں بولو کیا بات ہے۔''

''عبداللہ بھائی۔چو......چودھری میرے کھوکے پر بیٹھا چائے پی رہا ہے۔''اس نے اٹک اٹک کر اپنی بات مکمل کی۔

''کیا؟''مجھے لگا جیسے آسمان پھٹ کر میرے سر پر آن گرا ہو اور پھر پہلے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد ہم دونوں اپنی پوری رفتار سے عبدالمجید کے کھوکے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔وہ چند سو میٹر کا فاصلہ ہمیں کافی طویل محسوس ہو رہا تھا۔

+ + +

ہم دونوں پوری طاقت سے عبدالمجید کے کھوکے کی جانب دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔جونہی ہم نے درختوں کے جھنڈ کو عبور کرنے کے بعد عبدالمجید کے کھوکے کی طرف نگاہ دوڑائی ہمیں دو ڈبل ڈور ٹویوٹا گاڑیاں نظر آئیں،دونوں سفید کلر کی تھیں اور دونوں کا رخ ڈابیر کی طرف تھا۔جس وقت ہم نے درختوں کا جھنڈ عبور کیا اس وقت وہ سٹارٹ ہو کر چل پڑی تھیں،ان کا فاصلہ ہم سے ٹوٹل اڑھائی تین سو گز تھا اور وہاں سے انھیں نشانہ بنانا اتنا مشکل بھی نہیں تھا مگر ہم ایسا نہ کر سکے کہ تیزی میں ہم درستی بھول چکے تھے۔یعنی عبدالمجید سے چودھری کے متعلق سن کر ہم اتنے بدحواس ہوئے تھے کہ ہتھیار لانا ہی بھول گئے تھے۔اب مزید گاڑیوں کے پیچھے دوڑنا وقت کو ضائع کرنا اور اپنے آپ کو تھکانا تھا۔

''اس کو کہتے ہیں بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔''میں نے قدموں کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔''ہم نے سارے جنگل خیل کو چھان مارا ہے مگر ڈابیر کے متعلق ہمارا گمان ہی نہیں ہوا ہے کہ وہ یہاں چھپا ہوگا؟''

''ڈابیر کی سمت گاڑیوں کے رخ کو دیکھ کر تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈابیر میں ہی رہائش پذیر ہے۔''

''اس سمت میں اور کوئی قابلِ رہائش جگہ ہی نہیں ڈابیر کے علاوہ۔''اسی وقت مجید خان بھی ہم سے آن ملا۔

''بھاگ گئے؟''اس نے آتے ہی افسوس کا اظہار کیا۔

''یہ کس ٹائم تمھارے کھوکے پر پہنچے تھے؟''

''یہی کوئی آدھ پون گھنٹا ہوا ہوگا......کھوکے پر آتے ہی انھوں نے دودھ پتی کا آرڈر دیا اور بیٹھ گئے۔میرے پاس وہاں سے نکلنے کا کوئی بہانہ نہیں تھا مجبوراً میں دودھ پتی بنا کر انھیں پیش کرنے کے بعد ہی وہاں سے رفعِ حاجت کے بہانے نکل سکا۔''

”تُو نے کیسے پہچانا کہ وہ ہمارا مطلوبہ آدمی ہے۔“

”ایک تو آپ نے تفصیلاً اس کا حلیہ بتا دیا تھا دوسرے اس کے ساتھی بار بار اسے چودھری صاحب...... چودھری صاحب کہہ کر پکار رہے تھے اور یہ تو آپ کو بھی پتا ہوگا کہ اس علاقے میں چودھری نہیں ہوتے۔ سب سے بڑھ کر ان تمام کے پشتو بولنے کا لہجہ بالکل آپ ساتھا چونکہ ہمارے علاقے کی پشتو اور آپ کے علاقے کی پشتو میں واضح فرق ہے۔ اس لیے میں نے آسانی سے اسے پہچان لیا۔“

اس دوران ہم کھوکے پر پہنچ گئے تھے۔ وہاں چائے کے کپ کے نیچے پڑا ہوا پچاس روپے کا نوٹ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ لازمی عجلت میں تھے یا کسی اور وجہ کی بنیاد پر انھوں نے مجید کا انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور بل کی رقم کپ کے نیچے رکھ کر چلتے بنے تھے اور یہ اتفاق چودھری اکبر کی زندگی میں اضافے کا باعث بن گیا تھا۔

”ویسے جانو تمھیں شرم کرنی چاہیے۔“ امجد ایک چارپائی پر بیٹھ کر تکیہ گود میں لیتے ہوئے بولا۔ ”اتنے بڑے کمانڈو بنے پھرتے ہو اور دشمن کے پیچھے جاتے وقت ہتھیار گھر چھوڑ آئے۔“

”تُو کون سا ساتھ لے آیا تھا۔“

”میں نے تو تجھے خالی ہاتھ بھاگتے دیکھ کر سوچا کہ شاید خالی ہاتھ جانا ہے۔“

”کیوں تم ننھے بچے ہو نا جو میرے نقش قدم پر چلو گے۔“

”تم ملک ہو یار...... اور تیرا حکم ماننا میرا فرض ہے۔“

”میں نے کب حکم دیا تھا کہ ہتھیار چھوڑ آؤ۔“

”ہر حکم دیا تو نہیں جاتا...... ملازم تو بس آقا کو دیکھ کر چلتا ہے۔“

”اچھا اب یہ فضول بکواس چھوڑ و اور ڈابیر جانے کا سوچو۔“

”تو ڈابیر جانا کون سا مشکل ہے؟“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”ویسے بھی باسط خان کے آدمی کون سا ہمیں شکل سے پہچانتے ہیں کہ اپنے آدمیوں کا بدلہ لیں گے۔“

”نہیں ان سے تو خیر کوئی خطرہ نہیں۔ یوں بھی اس بات کو مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اب تو ہیبت خان اور باسط خان کا قائم مقام شاید ان کے قاتلوں کی تلاش پر مٹی ڈال چکا ہو۔“

”شاید ایسا نہ ہو۔“ امجد نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اب تک ان کے قاتلوں کی تلاش میں ہوں بہرحال یہ ان کا دردِ سر ہے ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

”تو پھر؟ کیا خیال ہے آج ہی چلیں۔“

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ اس نے میری تائید کی۔

''چلو اٹھو پھر۔''میں نے کھڑے ہو کر کہا اور وہ بھی میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''کہاں چل دیئے؟''۔''مجید جو ہاتھوں میں چائے پکڑے ہماری جانب آ رہا تھا پوچھنے لگا۔''چائے تو پیتے جاؤ۔''

''چائے کا ٹائم نہیں ہے۔''ہم لمبے قدموں سے گھر کی جانب چل پڑے اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم ٹویوٹا ہائی ایس میں بیٹھے ڈابیر کی جانب رواں دواں تھے۔ مجید خان نے ہمارے ساتھ آنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اسے ہم سعدیہ کی حفاظت اور خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے وہیں چھوڑ آئے تھے۔ گاڑی نے ڈابیر بازار میں ہمیں اتار دیا اور ہم چہل قدمی کے انداز میں بازار کے اندرونی جانب بڑھ گئے۔ دو پہر کا ٹائم تھا اور بازار میں کوئی خاص رش نہیں تھا۔

''اب کس سے اس موذی کا پوچھیں؟''

''صبر کرو پوچھ لیتے ہیں۔''میں نے اسے تسلی دی، لیکن میں اس کے اضطراب کو سمجھ رہا تھا اور خود بھی اس کش مکش میں مبتلا تھا کہ آیا ہم حقیقتاً چودھری کے قریب پہنچ چکے تھے یا مجید کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ڈابیر کی بجائے کسی غیر معروف مقام پر چھپا ہوا ہو۔ آخر اس کے ذہن میں بھی تو ہماری آمد کا خطرہ پوشیدہ ہو سکتا تھا اور اسی اندیشے سے میں اس کے بارے کسی سے پوچھ نہیں پا رہا تھا، مگر زیادہ دیر میری یہ کیفیت برقرار نہ رہ سکی اور خود پر قابو پاتے ہوئے میں ایک چھپر ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

''دوا چائے جوڑ کا ماما۔''(دو چائے بناؤ ماما) ہوٹل کے بوڑھے سے مالک سے مخاطب ہو میں نے کہا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہم دونوں سڑک کے کنارے پڑی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور دو خالی کپ لے آیا۔ چائے کے برتن اس نے ہمارے سامنے پڑی لکڑی کی ٹیبل پر رکھ دیئے اور واپسی کے لیے مڑنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے آواز دی۔

''خبرواورا ماما۔''(ماما بات سنو)

''جی۔''وہ رک گیا۔

''ہم نے چودھری اکبر سے ملنا تھا کیا آپ اس کی حویلی کا پتا بتا سکتے ہیں؟''

''چودھری اکبر؟''اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔''اس نام کے کسی بندے سے تو میں واقف نہیں ہوں۔''

''اس کو یہاں آئے ہوئے چند مہینے ہی ہوئے ہیں۔ اگر آپ ڈابیر میں رہائش پذیر ہونے والے کسی نئے آدمی سے واقف ہوں تو اس کا پتا بتا دیں شاید اس سے ہمیں چودھری کا ایڈریس معلوم ہو جائے۔''

''آپ کا مطلب میں سمجھ گیا۔ آپ اس طرح کریں کہ ملک جانان خان سے مل لیں اس سے آپ کو اپنے مطلوبہ بندے کے متعلق تمام معلومات مل جائے گی۔''

''اسکا گھر کس طرف ہے؟''میں مستفسر ہوا اور ہوٹل والے نے وہیں کھڑے کھڑے مجھے جانان خان کے گھر کی لوکیشن سمجھا دی۔ چائے پی کر ہم ہوٹل والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چل پڑے۔ میں نے امجد کو ہوٹل والے سے ہونے والی تمام گفتگو تفصیل سے

سنا دی۔

"یہ جانان خان...... یہ وہی نہیں ہے باسط خان کا آدمی۔"

"صحیح پہچانا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیا خیال ہے چلیں اس کے پاس؟"

"کس بہانے سے اسے ملیں گے؟"

"میرا خیال ہے، چرس یا اسلحے کے خریدار بن کے اس سے ملتے ہیں اس جیسے بندے ان قبیح کاموں میں ملوث ہوتے ہیں۔" امجد نے ایک قابل قبول مشورہ دیا۔

"گڈ...... بالکل ٹھیک ہے۔" میں اسے شاباش دی۔

"لیکن جانو صاحب!...... پہلے اپنی کلاشن کوف سے جان چھڑا لیں...... یہ ہم نے جانان خان کے آدمیوں سے ہی چھینی تھی۔"

"واقعی یار، صحیح یاد دلایا میرے تو ذہن سے ہی یہ بات نکل گئی تھی۔ چلو پہلے اس کو ٹھکانے لگاتے ہیں۔" بازار سے نکل کر ہم سیدھے گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑے۔ مگر ہمیں گاؤں سے باہر نہ نکلنا پڑا راستے میں ہی گن کو ٹھکانے لگانے والی ایک مناسب جگہ نظر آ گئی۔ وہ ایک کافی بڑا گڑھا تھا جس سے غالباً گھر بنانے کے لیے لوگ مٹی اٹھاتے رہے تھے۔ اس وسیع گڑھے کے اندر بنے ہوئے چھوٹے گڑھوں میں دو دن پہلے ہونے والی بارش کا پانی جمع کھڑا تھا۔ دائیں بائیں نگاہ دوڑاتے ہوئے میں نے اسی پانی سے بھرے ہوئے چھوٹے گڑھے میں گن کو پھینک دیا اور پھر وہاں سے واپس چل پڑے۔ جانان خان کی حویلی ڈھونڈنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی اس کی حویلی تک پہنچتے پہنچتے ہم نے اس سے ملاقات کا لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔

"جی کس سے ملنا ہے؟" بڑی مونچھوں اور لمبے بالوں والے چوکیدار نے ہمیں حویلی کے دروازے پر رکتے دیکھ کر استفسار کیا۔

"ملک جانان خان سے۔"

"وہ آپ کو جانتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "لیکن ہمارا اس کے ساتھ بہت ضروری کام ہے۔"

"کام کی نوعیت؟" وہ ہمارا انٹرویو لینے پہ تلا ہوا تھا۔

"کوئی چیز خریدنی ہے۔"

"ہوں۔" اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو میں پوچھ کر آتا ہوں۔"

اس کے آنے تک ہم خاموش کھڑے رہے۔

"آ جاؤ۔" تھوڑی دیر بعد ہی وہ نمودار ہوتا ہوا بولا اور ہم سر ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیے حویلی کے اندر ایک دیوار اٹھا کر

زنانہ اور مردانہ حصے تشکیل دیئے گئے تھے چوکیدار ہمیں لیے ایک کمرے میں جا گھسا جس کے اندر ترتیب کے ساتھ تین چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں مگر وہ وہاں رکنے کی بجائے ایک بغلی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔اس کمرے میں چار پائیوں کی بجائے فرشی قالین بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔جوتوں کے لیے تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر باقی سارے کمرے کے فرش کو قالین نے ڈھانپ رکھا تھا۔دیواروں کے اوپر سفید پینٹ کیا گیا تھا جبکہ فرش سے تین فٹ بلندی تک سبز پینٹ سے حاشیہ لگایا گیا تھا۔

''آپ بیٹھیں خان صاحب آرہے ہیں۔'' چوکیدار نے ہمیں قالین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ہم جوتے اتار کر قالین پر بیٹھ گئے ہمارے بیٹھتے ہی وہ باہر نکل گیا،ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا جلد ہی تین آدمی کمرے میں داخل ہوئے سب سے آگے درمیانی قامت کا سرخ رُو شخص تھا اس کے انداز سے ہم سمجھ گئے کہ وہ ملک جانان خان تھا اس کے پیچھے دو خوفناک صورت کے گرانڈیل افراد تھے جو لامحالہ اس کے باڈی گاڈ تھے۔ہم دونوں انھیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے تھے جانان خان نے ہم سے مصافحہ کر کے کہا......

''تشریف رکھیں۔'' اور ہمارے بیٹھنے کے ساتھ وہ خود بھی بیٹھ گیا البتہ اس کے باڈی گارڈ کھڑے رہے۔ابھی میں گفتگو کرنے کے لیے اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے ہی رہا تھا کہ ایک شخص چائے کے برتن اٹھائے اندر داخل ہوا،مہمان نوازی تو ویسے بھی اس کے علاقے کے لوگوں کا خاصہ ہے۔

''ہاں برادر اب بتائیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جانان خان مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب ہمیں ایک من چرس چاہئے...... کیا آپ مہیا کر سکیں گے؟ لیکن شرط یہ ہے کہ مال خالص ہونا چاہئے اور کچا مال بھی نہیں چاہئے پکی ہوئی چرس ہونی چاہئے۔''

مجھے چرس کے متعلق کوئی خاص معلومات نہیں تھیں بس اتنا پتا تھا کہ چرس کچی بھی ہوتی ہے جو پینے والے کو تیلی سے جلا کر پینے کے قابل بنانی پڑتی ہے اور پکی ہوئی بھی ہوتی ہے۔کچی چرس کی شکل بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے نسوار خشک ہو جائے اور پکنے کے بعد اس کی شکل تارکول جیسی ہو جاتی ہے۔اپنی اسی ادھوری معلومات کی بنیاد پر میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

''مل جائے گی مگر چند دن انتظار کرنا پڑے گا۔''

''چند دن نہیں بلکہ آپ کے پاس دو ہفتے ہیں۔ابھی ہمیں صرف نمونے کے لیے تھوڑی سی چرس چاہئے ہوگی جو ہم اپنے بڑے کے پاس دکھانے کے لیے لے جائیں باقی مال ہم اس کی اجازت سے لینے آئیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ لوگوں نے دوسری جگہ سے بھی نمونے کے لیے چرس لینی ہوگی اور جو آپ کے خان کو پسند آئے گی وہی آپ خریدیں گے؟''

''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔'' میں اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر آپ کے خان کو ہمارا مال پسند نہ آیا تو ایک من چرس جو میں آپ کے لیے منگواؤں گا اس کا میں کیا کروں گا؟'' اس نے ایک

جائز بات کی۔

اس کی بات سن کر میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر کہا......

''ملک صاحب......! پھر ایسے کریں کے کہ آپ ہمیں نمونے کے لیے چرس دے دیں وہ ہم اپنے خان کے پاس لے جاتے ہیں اگر اسے پسند آگئی تو ہم دوبارہ آ کر آپ کو بتائیں گے اس کے بعد آپ ہمارے مطالبے کے مطابق منگوا لینا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔'' آپ کو نمونے کے لیے کتنی چرس چاہئے ہو گی؟''

''پاؤ آدھ پاؤ ہو جائے تو کافی ہے اور اس مقدار کی پے منٹ ہم ابھی کریں گے۔''

''جاگیردار خان۔'' وہ اپنے ایک باڈی گارڈ سے مخاطب ہوا۔'' جاؤ منشی سے ایک پاؤ خالص چرس لے آؤ۔ اسے کہنا کہ وہ مال دے جو بعد میں ہم ایک من کی مقدار میں مہیا بھی کر سکیں۔''

ایک باڈی گارڈ۔'' جی خان جی۔'' کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

''ہمارے علاوہ آپ نے کس کس کے پاس جانا ہے۔'' جاگیردار کے کمرے سے نکلتے ہی وہ مستفسر ہوا...... اس کے اس سوال کا میں کافی دیر سے منتظر تھا۔

'' آپ کے علاوہ ڈابیر میں تو صرف چودھری اکبر کے پاس یہ مال مل سکتا ہے، اس کے علاوہ بھی اگر کوئی آدمی ایسا ہے یہاں تو اس کے متعلق آپ ہماری رہنمائی کر دیں بڑی مہربانی ہو گی۔''

''ڈیرہ اسماعیل خان والا چودھری اکبر؟'' وہ حیرانی سے مستفسر ہوا۔'' جو چند مہینے پہلے ہی یہاں آیا ہے۔''

''جی اس کے علاقے کا تو پتا نہیں ہے۔ صرف اس کا نام اور شہرت سنی ہے۔''

''غلط سنا ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔'' اس پرچون فروش کے پاس تمھیں 10,5 کلو سے زیادہ چرس نہیں مل سکتی۔''

''مگر بازار میں تو ایک بندہ اس کی بڑی تعریف کر رہا تھا۔'' میں نے دل میں بے ساختہ اٹھنے والی خوشی کی لہر کو دباتے ہوئے اپنی بات کا جواز پیش کیا۔ چودھری کے بارے یہ کنفرم ہو جانے کے بعد کہ وہ یہیں ڈابیر میں موجود تھا میرا جانان خان کے پاس آنے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب کسی ترکیب سے اس سے چودھری کی رہائش کی لوکیشن معلوم کرنی رہ گئی تھی۔

جانان خان نے جواب دیا۔''اس طرح کے بندے اسی طرح اپنی پبلسٹی کراتے ہیں۔''

اس کے جواب میں مَیں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ چوکیدار اجازت مانگ کر اندر داخل ہوا۔

''خان جی...... چودھری اکبر نام کا بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے اس کے ساتھ چار باڈی گارڈ بھی ہیں۔'' اس کی بات نے مجھے بے ساختہ پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ امجد کے پلے بھی یہ بات پڑ گئی تھی اس لیے وہ بھی چوکنا ہو گیا تھا۔

''چودھری اکبر؟'' جانان خان کے لہجے میں حیرانی تھی۔ ایک لحہ سوچ کر وہ بولا۔'' اسے بلا کر ساتھ والے کمرے میں بٹھاؤ میں آتا ہوں۔''

چوکیدار ''جی خان جی۔'' کہہ کر کمرے سے نکل گیا اور اس کے باہر جاتے ہی جانان خان نے کمرے میں موجود باڈی گارڈ سے کہا۔
''دروازہ اندر سے بند کردو۔'' اوراس نے سر ہلا کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔
''معاف کرنا برادر آپ سے کاروبار کے متعلق گفتگو تو تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ مگر ابھی تک میں آپ کا نام نہیں جان سکا ہوں۔'' ا

س مرتبہ اس کے مخاطب ہم دونوں تھے۔
''جی میرا نام عبداللہ اور اس کا نام عبدالرحمٰن ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''عبدالرحمٰن بھائی پشتو بولنا نہیں جانتا اس لیے یہ ہماری گفتگو میں شریک نہیں ہوسکا ہے۔ میرا تعلق لکی مروت سے ہے اور عبدالرحمٰن کا ہری پور سے لیکن ہم رہتے میرن شاہ میں ہیں۔''
''اچھا میں چودھری کو رخصت کردوں، پتا نہیں یہ کس مقصد کے لیے آیا ہے اس کے بعد آپ سے بات چیت ہوگی۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اور اگر آپ لوگ بھی اس سے ملنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آجاؤ۔''
''مہربانی خان صاحب ہم بعد میں مل لیں گے......اب نہ جانے وہ کس مسئلے کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہے'' اور جانان خان سر ہلاتا ہوا دروازے کے جانب بڑھ گیا۔ کمرے میں موجود اکلوتے باڈی گاڈ نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ دونوں ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ چونکہ چودھری کو اس نے اسی کمرے میں بلایا تھا اس لیے دروازہ کھلتے وقت ہم دونوں نے دروازے کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔
''وہ موذی کہیں ہمارے تعاقب میں یہاں نہ پہنچا ہو۔'' دروازہ بند ہوتے ہی امجد تشویش بھرے لہجے میں بولا۔
''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچا۔ بات رسمی تعارف سے گزر چکی تھی اور اس وقت چودھری اکبر احتجاجی انداز میں جانان خان سے مخاطب تھا۔
''ملک صاحب یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا؟ اور اس طرح دوسری مرتبہ ہو رہا ہے کہ آپ کے آدمیوں نے میرے سودے کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔''
''چودھری صاحب میں تمھاری بات نہیں سمجھا؟'' جانان خان نرم لہجے میں مستفسر ہوا۔
''ملک صاحب......آج جنگل خیل میں ایک آدمی کو ہم نے مال ڈیلیور کرنا تھا، زبانی کلامی بات ہو چکی تھی، لیکن جب ہم پہنچے تو آپ کے آدمی ہم سے پہلے جا کر اسے مال دے کر رقم وصول کر چکے تھے۔''
''تو اس میں تو سراسر اس بندے کی غلطی ظاہر ہو رہی ہے جس کے ساتھ آپ کی بات پکی ہو چکی تھی۔ وہ آپ ہی سے مال وصول کرتا۔ میرے آدمیوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ وہ تو بطور دکاندار اپنا مال ہر اس شخص کو بیچیں گے جو ان سے خریدنے آئے گا۔''
''مجھے اس بندے نے بتایا کہ آپ کے آدمیوں نے اسے میرے بارے یہ کہا کہ میں ملاوٹ والا مال بیچتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی چند الٹی سیدھی باتیں اس کے سامنے میرے بارے میں کی ہیں۔''
''چودھری صاحب آپ نے اسے کہنا تھا کہ اس طرح کسی کی باتوں میں آکر سودے کینسل نہیں ہوا کرتے۔ وہ آپ کے مال کا

معائنہ کر کے پھر ہم سے سودا کرتا۔"

"ملک صاحب۔آپ ساری بات خریدار کے اوپر ڈال رہے ہیں، حالانکہ آپ کے آدمی بھی اس کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔"چودھری کا لہجہ خاصا کڑوا تھا۔"بہر حال یہ دو دفعہ ہو چکا ہے اس کے بعد میں بھی آپ کے آدمیوں والا طریقہ کار اپناؤں گا۔بعد میں گلہ نہ کرنا۔"

جانان خان نے جواب دیا۔"چودھری مرد گلہ شکوہ نہیں کیا کرتے۔"

"چلو یہ بھی دیکھ لیں گے۔"چودھری کی آواز سے مجھے محسوس ہوا کہ اس نے بات مکمل کر لی تھی میں جلدی سے آ کر امجد کے ساتھ بیٹھ گیا اس جگہ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے آواز واضح سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"کیا بات چیت ہو رہی تھی؟"امجد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کوئی کاروباری معاملہ تھا بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"ویسے جانو۔ابھی موقع تھا کہ ہم ہلا بول کر چودھری کو قابو کر لیتے۔"

"بیوقوف وہ جانان خان کے گھر آیا ہوا ہے اور تجھے پتا ہونا چاہئے کہ اپنے گھر آئے دشمن کی بھی حفاظت میں یہ لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں۔تم خواہ مخواہ جانان خان کے ساتھ دشمنی کی داغ بیل کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟"

"سوری...... مجھے خیال نہیں رہا تھا۔"

میں جواباً کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ جانان خان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔اس کے پیچھے اس کے دونوں باڈی گاڈ بھی اندر داخل ہوئے۔

جانان خان اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"جاگیر دار بھائی......!صاحب کو مال چیک کراو۔"

جاگیر دار نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر میری جانب بڑھا دیا۔شاپر لے کر میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔

"ملک صاحب یہ ہمارا خان خود ہی چیک کرے گا۔"

"آپ تھوڑی سی پی کر دیکھیں۔"جانان خان نے ہلکا سا اصرار کیا۔

"ہم اس سے آج تک مستفید نہیں ہو سکے ہیں۔"میں مسکرایا۔میری بات سن کر جانان خان کے چہرے پر حیرانی کے اثرات نمودار ہوئے اور جب وہ بولا تو یہ حیرانی اس کے لہجے میں بھی ہویدا تھی۔

"عجیب بات ہے کاروبار کرتے ہو اور خود استعمال نہیں کرتے؟"

"بس ملک صاحب نئے نئے وارد ہوئے ہیں نا اس میدان میں۔"

''اب آپ یہ مال میرن شاہ لے کے جائیں گے؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''جی۔''میں مختصراً

''آپ کے خان کا نام کیا ہے؟''

''ملک حاجی بہادر خان۔''

''کیا......؟......تم حاجی بہادر کے بندے ہو۔''اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''جی۔''

''مگر وہ تو دگن میں رہتا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ اس قسم کے کسی کام میں ملوث نہیں۔'' جانان خان کے لہجے میں شکوک کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''وہ اب بھی دگن ہی میں رہتا ہے لیکن آپ کی آسانی کے لیے میں نے میران شاہ بتلا دیا کیونکہ دگن اتنا معروف نہیں۔ دوسرے وہ واقعی اس کاروبار میں ملوث نہیں ہے یہ کام اس کا دست راست طوفان خان سرانجام دیتا ہے۔''

''اچھا اچھا۔''اس نے اطمینان سے سرہلایا۔''بہر حال آپ لوگوں نے اور جس سے مال کے نمونے حاصل کرنے ہیں وہ کرلیں اور جتنے دن آپ ڈابیر میں ہیں میرے گھر میں مہمان رہیں گے۔''

''مگر ہم یہاں کسی سے واقف نہیں۔''

''آپ کی رہنمائی جاگیردار کردے گا ہمارے علاوہ چودھری اکبر، ملک دل شاد خان اور سبز علی خان اس کاروبار میں ملوث ہیں۔''

''آپ نے اس کی قیمت نہیں بتلائی۔''میں نے ہاتھ میں موجود چرس کے شاپر کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

''اس کا ریٹ اور یکمشت ایک من لینے کا ریٹ بھی جاگیردار بتادے گا۔ فی الحال آپ لوگ آرام کرو۔ میں بھی تھوڑا مصروف ہوں بعد میں گپ شپ ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہم سے مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی جاگیردار ہمیں وہاں سے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا جس میں چار پائیوں پر صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے تھے۔ وہ کمرہ یقیناً مہمانوں کے ٹھہرانے کے کام آتا تھا۔ جاگیردار ہمیں چرس کے ریٹ وغیرہ سے آگاہ کرنے کے بعد آرام کا مشورہ دیتے ہوئے رخصت ہوگیا۔ اس پاؤ بھر چرس کی پے منٹ کرنا میں نہیں بھولا تھا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی امجد نے سوالوں کی بوچھاڑ کردی، جواباً میں نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

''چلو یہاں تک تو ٹھیک ہوگیا۔ اب آگے کیا کریں گے؟''تفصیل جان کر وہ مستفسر ہوا۔

''پہلے چودھری کی رہائش کا جائزہ لے لیں، اس کے بعد کوئی لائحہ عمل طے کریں گے۔''

''تو اس وقت آرام کرنے کی کیا ضرورت تھی، جاگیردار کو ساتھ لے کر چلے جاتے یا ویسے ہی اس سے حویلی کا محلِ وقوع پوچھ لیتے،

تا کہ آج رات ہی اس کام کو نمٹا دیتے، ڈیڑھ مہینے سے اسے تلاش کر رہے ہیں اور اب اس کا پتا چلا ہے تو جناب کو آرام کی سوجھ گئی ہے۔''

''آرام سے ماجے، اب اس کا پتا تو چل گیا ہے خواہ مخواہ بے صبری کا مظاہرہ اچھا نہیں۔ گھنٹا ڈیڑھ آرام کر و عصر کو چلے چلیں گے۔''

یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر تھے کہ ایک شخص چھابے میں روٹیاں اور ترکاری کا ڈونگہ لیے حاضر ہوا۔ دن کے کھانے کا وقت قریباً گزر گیا تھا مگر اس کے باوجود انھوں نے کھانا بھجوادیا تھا اور ایسا شاید انھوں نے احتیاط کے طور پر کیا تھا۔ اتفاق سے ہم دونوں اس وقت تک کھانا نہیں کھا سکے تھے اس لیے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ترکاری پلیٹوں میں ڈالنے کا تکلف کیے بغیر ہم ڈونگے میں ہی جڑ گئے۔ کھانے کے بعد وہی آدمی قہوہ لے آیا اور ہمارے قہوہ پیتے ہی برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ روٹی کھانے کے دوران میرا ارادہ تھا کہ کھانے کے بعد جاگیردار سے چودھری اکبر کا پتا پوچھ کر اس کی حویلی کے جانب چلیں گے۔ مگر کھانا کھاتے ہی ایک عجیب قسم کی غنودگی میرے حواس پہ چھا گئی۔ بند ہوتی آنکھوں سے میں نے امجد کے جانب دیکھا تو اس کی حالت بھی مجھے خود سے مختلف نہ لگی۔ بے انتہا کوشش کے باوجود میں اپنے حواس قائم نہ رکھ سکا اور چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

+ + +

جب میں حواس میں آیا تو مجھے اپنے سر پر بہت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ سر جھٹک کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ امجد مجھے اپنے بائیں جانب زمین پر پڑا نظر آیا۔ ہم دونوں کی قمیصیں اتار لی گئی تھیں اور دونوں کے ہاتھ پشت کی طرف رسّی سے باندھ دیے گئے تھے۔ اپنے علاوہ مجھے اس کمرے میں ذی روح تو کیا بے جان چیز بھی نظر نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی امجد کے جسم میں بھی حرکت پیدا ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''یہ کیا جانو صاحب؟''

''وہی جو تم دیکھ رہے ہو۔'' میں اطمینان سے بولا۔

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''یہی ان کی مہمان نوازی ہے جس کے تم گن گا رہے تھے؟''

''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ماجے۔ ہر قوم میں چودھری اکبر جیسے گھٹیا افراد موجود ہوتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنے علاقے کی روایات کا پاس رکھے۔ ویسے بھی کسی علاقے کے رواج کو ہم وہاں کے لوگوں کی اکثریت کے مزاج سے پہچانتے ہیں۔ اگر انفرادی طور پر کوئی بد خصلت ہو تو اس کی بری عادات کو ہم پورے علاقے یا پوری قوم پر منطبق نہیں کر سکتے۔''

''اب مجھے فلسفے سے قائل کرنے کی کوشش نہ کرو بقراط صاحب۔''

''اچھا چھوڑو اس بحث کو اور میری رسّی کھولنے کی کوشش کرو۔'' میں کہنیاں ٹیک کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ایک کمانڈو کے مزاج کے مطابق ہم پریشان ہونے کی بجائے حفاظتی اقدامات میں جڑ گئے، میں نے اپنی پیٹھ امجد کے جانب موڑی اور وہ دانتوں سے میرے ہاتھوں سے بندھی رسّی کھولنے لگا۔ تھوڑی محنت کے بعد ہی وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور میرے ہاتھوں پر رسّی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے

بعد امجد کی رسّی کھولنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ رسّی کھولنے کے بعد ہم نے وہ رسّی اس طرح اپنے ہاتھوں پر لپیٹ لی کہ ضرورت پڑنے پر ہم ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کرا سکتے تھے

''یار ہم جتنا ان سے لڑنے سے گریز کر رہے ہیں اتنا ہی ان سے لڑائی ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔'' امجد دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''ان سے لڑنا کوئی مشکل نہیں ہے ماجے......! مگر یہ فالتو پنگا ہوگا اور خواہ مخواہ ہمارا ٹائم ضائع ہوگا۔ دوسرے اگر اس لڑائی میں ہم دونوں سے کوئی ایک بھی وقتی طور پر ناکارہ ہوگیا تو چودھری کے خلاف ہماری طاقت آدھی رہ جائے گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہماری پوری طاقت چودھری کے خلاف استعمال ہو۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے اور دوسرے رخ کے مطابق ہم دونوں ملک جانان خان کے آدمیوں سے لڑتے ہوئے یہاں سے عدم آباد بھی روانہ ہو سکتے ہیں، گولی یہ نہیں دیکھتی کہ سامنے کمانڈو ہے یا کوئی عام بندہ اور اس علاقے کے لوگ زبانی کلامی جمع خرچ کی بجائے بندوق کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔''

''بس اپنی بزدلی کو کسی نہ کسی مصلحت کا نام دیئے رکھنا۔''

''چلو...... یونہی سہی۔'' میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''ویسے جانو...... یہ ایک دم ان کو کیا سوجھی؟ اچھا کھلا پلا کر اس حال میں لے آئے۔''

''ان کے آنے کی دیر ہے پتا چل جائے گا۔''

''ٹائم کیا ہوگا۔ اب تک اچھی خاصی روشنی محسوس رہی ہے؟'' امجد نے کہا۔''جہاں تک میرا اندازہ ہے تو ہم کافی دیر بیہوش رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے دوسرا دن طلوع ہو چکا ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔''اچھا ان کے آتے ہی ہلا بول دینا چاہیے یا...... ان کو پوچھ گچھ کا موقع دینا چاہیے۔''

''کمانڈو ٹریننگ کا تقاضا تو یہی ہے کہ انھیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر چھاپ لیا جائے...... مگر پھر ان سے پوچھ گچھ میں دشواری پیش آئے گی اور ہمارے قابو آنے کے بعد وہ ہم سے جھوٹ بھی بول سکتے ہیں، دوسری صورت میں ہو سکتا ہے ان سے بات چیت کرنے کے دوران کوئی افہام و تفہیم کا پہلو بھی نکل آئے۔''

''اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حملہ کرتے ہوئے ہم خود ہی پار ہو جائیں۔'' میں نے تاریک پہلو کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو پھر قسمت کی بات ہے؟...... موت کے ڈر سے ہم اپنے ارادے تو مؤخر نہیں کر سکتے وہ تو بستر پر لیٹے ہوئے بھی آ سکتی ہے، تو نے سنا ہوگا کہ اس دنیا میں آنے کی ترتیب تو موجود ہے یعنی حمل ہوگا اس کے آٹھ، نو، دس ماہ بعد بچہ پیدا ہوگا...... لیکن جانے کی کوئی ترتیب موجود نہیں ہو سکتا ہے پوتا دادا سے پہلے مر جائے، بیٹا باپ سے پہلے فوت ہو جائے یہ تو مالک الملک کی منشا ہے، اس کی مرضی ہے۔ بندہ غریب

تو اس ضمن میں بے بس اور لاچار ہے اور یہ وہ واحد حقیقت ہے جس کا منکر کوئی نہیں، چاہے کوئی دیندار ہو چاہے دنیادار، چاہے کوئی مسلم ہو چاہے بے دین، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر بھی اس کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"آج تو بڑے فلسفے بگھارے جا رہے ہیں۔" میں ہنستا اور وہ بھی ہنس پڑا ہم کافی دیر گپ شپ میں مشغول رہے یہاں تک کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری اور ہم خاموش ہو گئے۔ دروازہ کھول کر ایک ملازم سرکنڈوں سے بنا ہوا اسٹول اٹھائے اندر داخل ہوا جس کو ہماری زبان میں موڑھا کہتے ہیں۔ موڑھا کمرے کے وسط میں رکھ کر وہ باہر نکل گیا جبکہ اس کے پیچھے اندر داخل ہونے والوں میں ایک جاگیردار خان اور دوسرا، باڈی گارڈ تھا دونوں دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں بعد جانان خان اندر داخل ہوا اور آ کر موڑھے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی جوانو کیا حال ہے۔" اس کا لہجہ استہزائی تھا۔ دونوں باڈی گارڈ اس کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جواباً ہم دونوں خاموش ہی رہے۔

"آپ لوگ خفا خفا سے لگ رہے ہو۔"

"ملک صاحب...... آپ کے ہاں مہمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔" میں نے شکوہ کیا۔

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "اس بات پہ مجھے خفت بھی ہو رہی ہے مگر کیا کیا جائے کہ مہمانوں کی شکل میں ہماری جان کے دشمن قریب آنے کوشش کرتے ہیں تو پھر ایسا کرنا ہماری مجبوری بن جاتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میں حیرانی سے بولا۔ "آپ کی جان کے دشمن ہم کیسے ہو گئے؟"

"بچکانہ باتیں مت کرو عبداللہ خان یا جو بھی نام ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے جانان خان سویا ہوا ہے۔ ہیبت خان اور باسمت خان کے قتل کے بعد ہم نے جو تفتیش کی اس کے مطابق ان دونوں کو قتل کرنے والے دو لمبے تڑنگے نوجوان ہیں۔ جن کی عمر 24 سے 28 سال کے درمیان ہے۔ گندمی رنگت سیاہ آنکھیں ایک کے بال ہلکے بھورے جبکہ دوسرے کے سیاہ، ایک پشتو بول سکتا ہے اور دوسرا پشتو نہیں جانتا وغیرہ وغیرہ۔"

ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی بات جاری رہی۔ "تم شاید سوچ رہے ہو کہ میں یہ اپنی طرف سے گھڑ رہا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ تمھاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ تمھارا حلیہ ہمیں اس کوارٹر بکنگ کرنے والے سے پتا چلا تھا جو بعد میں قتل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو بندہ تمھیں کوارٹر تک چھوڑنے گیا تھا اس نے بھی اس کی تائید کی تھی، سب سے بڑھ کر وادی بہرام شاہ کے عبداللہ خان سے ہم نے ہیرا پھیری سے تمھارا حلیہ اگلوا لیا تھا جس کے ہاں تم لوگوں نے رات گزاری تھی۔ اب تم سوچو گے ہم عبداللہ خان تک کیسے پہنچے تو یہ بھی میں بتائے دیتا ہوں میران شاہ سے ڈابیر آتے ہوئے اتفاقاً عبداللہ خان کا گھر ہی راستے میں پڑتا ہے اور وہ حد درجہ کا مہمان نواز ہے یہ بات ممکن ہی نہیں کہ کوئی اس جانب سے جنگل خیل کی طرف آئے اور عبداللہ خان کی مہمان نوازی سے مستفید نہ ہو سکے۔ بہر حال اس سب کے باوجود میں تمھیں نہ تو باسمت خان اور ہیبت خان کا قاتل گردانتا ہوں اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی سزا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ نادانستگی میں سہی تمھاری وجہ سے

مجھے ڈابیر کی سرداری ملی اور اسی وجہ سے تمھارے بارے تمام معلومات حاصل ہو جانے کے باوجود میں نے تمھیں تلاش کرنے یا کرانے کی بالکل کوشش نہیں کی یہ معلومات بھی مجھے ہیبت خان اور باسمت خان کے مرنے کے دو تین دن بعد مل گئی تھیں۔ رہی بات باسمت خان کی بیوی کی تو میرا خیال تھا شاید اسی کے چکر میں تم لوگوں نے باسمت خان اور ہیبت خان کا کام تمام کیا تھا مگر اب جبکہ تم اس واقعے کے ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی میرے پاس آ پہنچے ہو اور وہ بھی بوگس قسم کے سمگلر بن کر۔ بیوقوف تم لوگ حاجی بہادر اور طوفان خان کا نام لے رہے ہو جن سے ہم خود مال مطلب چرس وافیون وغیرہ منگواتے ہیں کیونکہ حاجی بہادر اس علاقے کا سب سے بڑا چرس وافیون سپلائیر ہے۔ بہر حال اب تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم چپ چاپ بغیر اپنی ہڈیاں تڑوائے یہ بتا دو کہ تم دونوں کس کے لیے کام کرتے ہو؟ اور مجھے قتل کرنے میں تمھارا کون سا مفاد پوشیدہ ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھیں کم سے کم سزا دی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اصل حقائق سے آگاہ کر دو باسمت خان ہیبت خان کو قتل کرنے اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ کرنے کی وجوہات سے پردہ اٹھا دو تو شاید میں تمھاری جان بخشی کر دوں ورنہ تو میرے آدمی باسمت خان اور ہیبت خان کے قاتلوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اگر انھیں پتا چل جائے کہ میں ان کے سرداروں کے قاتلوں سے مذاکرات کر رہا ہوں تو شاید وہ مجھے بھی معاف نہ کریں۔ البتہ جاگیردار خان اور صاحب گل کی بات اور ہے۔“ اس نے اپنے باڈی گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میرے باڈی گارڈ نہیں بلکہ بھائیوں کی طرح ہیں۔ خیر یہ ایک ضمنی بات تھی اب تم بغیر کوئی بات چھپائے سب کچھ بیان کر دو۔“

”ہمارے پاس آپ کو بتانے کے لیے کوئی ایسی کہانی نہیں ہے جس سے ہم آپ کے نام نہاد اندیشوں کی تصدیق کر سکیں۔“

”ہوں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے میری ساری بکواس رائیگاں گئی۔ تم لوگ لاتوں کے بھوت ہو...... باتوں سے نہیں مانو گے۔...... بہر حال تمھاری مرضی۔“ وہ جاگیردار کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اسے تفتیش کے دوسرے طریقے سے آگاہ کرو۔“

”جی خان جی۔“ کہہ کر اس نے کلاشن کوف اپنے ساتھی صاحب گل کو پکڑائی اور میری طرف خطرناک ارادے سے بڑھا۔ اس کے بڑھنے کا انداز اس بات کا مظہر تھا کہ اسے میری جانب سے کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ ایک تو میں بندھا ہوا تھا۔ دوسرے وہ مجھ سے ناواقف تھا۔

جانان خان کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اپنے ہاتھ رسی سے آزاد کرا لیے تھے۔ امجد بھی لازمی طور پر میرے انداز کو دیکھتے ہوئے ایکشن کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ جانان خان دلچسپ نظروں مجھے گھور رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھے ہی چھینٹی لگنی تھی اس کے بعد کہیں امجد کا نمبر آتا۔

قریب آ کر جیسے ہی جاگیردار جارحانہ انداز میں جھکا اور اس کا ہاتھ میرے گریبان کے جانب بڑھا میں یکدم اوپر کو اچھلا میرے سر کی بھرپور ٹکر اس کی ٹھوڑی پر لگی وہ لڑکھڑاتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے دائیں ہاتھ کو پکڑ کر جھٹکے سے گھمایا اور اس کے ساتھی صاحب گل کی طرف دھکیل دیا۔ اس میں طاقت کے ساتھ ٹیکنیک کا گہرا عمل دخل تھا کہ پہلے میں نے اس کے قدموں کو ان بیلنس کیا اور پھر ایک چکر دے کر اس کی سوچوں کو وقتی طور پر درہم برہم کرتے ہوئے اسے اس کے ساتھی پر پھینک دیا۔ اس کے بجائے اسے یرغمال بنا لینا میرے لیے زیادہ آسان تھا مگر اس میں یہ قباحت تھی کہ اس کا کمانڈر بچ کر نکل جاتا اور ہم ایک مرتبہ پھر پھنس جاتے اور دوبارہ ان کے قابو میں آنے کا مطلب صریحاً موت تھی۔ اسے دھکیلنے کے بعد میں رکا نہیں تھا بلکہ اسی تسلسل میں میں موڑھے

پر ہکا بکا بیٹھے جانان خان پر جا پڑا اور اگلے ہی لمحے پشت کے جانب اس کا دایاں بازو مروڑ کر اپنا بایاں ہاتھ میں اس کے گلے میں حمایل کر چکا تھا۔

دوسری جانب امجد بھی حرکت میں آچکا تھا۔ جاگیردار صاحب گل سے ٹکرایا اور دونوں نیچے گر گئے اس سے پہلے وہ سنبھلتے امجد ان کی کلاشن کوفوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ ایک کلاشن کوف سلنگ اپ کر کے دوسری فائرنگ پوزیشن میں پکڑتے ہوئے وہ اُلٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو میرا ردِعمل بھی یہی ہوتا کیونکہ ہم دونوں کمانڈو کے تربیت یافتہ تھے اور ایسی صورتِ حال میں کمانڈوز کا دماغ ایک ہی دائرے میں کام کرتا ہے۔ وہ ساری کارروائی ہم نے بغیر کسی منصوبے کے سرانجام دی اور ہر دو نے بخوبی اپنا کردار ادا کر دیا تھا۔

امجد کے پوزیشن سنبھالتے ہی میں نے جانان خان کا بازو آزاد کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے ماہرانہ انداز اس کی جیبوں کو ٹٹولا اور اس کی جیب میں پڑا پستول نکال کر اسے آہستہ سے سامنے کی طرف دھکیلا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے سامنے دوڑتا چلا گیا۔

''اب بتاؤ ملک جانان خان تجھے بے بس لوگوں سے تفتیش کرنے کے اور کتنے طریقے آتے ہیں۔''

''تت تم بچ کر نہیں جا سکتے۔ حویلی میں چاروں جانب میرے آدمی بکھرے ہوئے ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں مجھے دھمکی دینے کی کوشش کی مگر اس کی لڑکھڑاتی اور متوحش آواز اس کی دھمکی کے کھوکھلا ہونے کی غماز تھی۔

''بھول ہے تمھاری جانان خان...... جب تک تمھارے آدمیوں کو تمھاری ہلاکت کا پتا چلے گا ہم اس علاقے سے بہت دور جا چکے ہوں گے...... کیوں؟ میں غلط کہہ رہا ہوں جاگیردار خان۔'' جانان خان سے بات کرتے کرتے میں جاگیردار سے مخاطب ہوا جو شعلہ بار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مگر میری بات کا ان دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''ماجے......! کیا خیال ہے انھیں گولی سے ماریں یا کوئی اور طریقہ اختیار کریں۔'' میں ان کی خاموشی دیکھتے ہوئے امجد سے مستفسر ہوا۔

''نہیں بھئی!...... میں تو بالکل بے گناہوں کا خون بہانے کے حق میں نہیں ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''صحیح کہا۔'' میں جانان خان سے مخاطب ہوا۔ ''ملک صاحب بیٹھیں میں آپ کو اصل بات بتا دوں۔'' مگر اس بار بھی جانان خان خاموشی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ شاید اسے بچنے کے امکانات صفر سے بھی کم دکھائی دے رہے تھے۔

''بہر حال ملک صاحب آپ پریشان نہ ہوں ہم نہ پہلے آپ کے دشمن تھے اور نہ ہی اب ہیں۔ یہ اقدام ہمیں اس لیے اٹھانا پڑا تاکہ آپ کو احساس دلائیں کہ اگر ہم آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہوتے تو کب کا ایسا کر چکے ہوتے اور ماجے انھیں گنیں واپس کر دو۔'' اس سے بات کرتے کرتے میں امجد سے بولا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے دونوں کلاشن کوفیں جاگیردار اور صاحب گل کے قریب جا کر ان کی طرف بڑھا دیں۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ میں موجود پستول جانان خان کی طرف بڑھا دیا جو اس نے میکانکی انداز میں لے لیا۔ جاگیردار اور صاحب گل کے چہروں پر بھی حد درجہ حیرت چھا گئی تھی۔

''اب بیٹھ جائیں ملک صاحب...... تاکہ میں آپ کو اصل کہانی سنا سکوں۔''

''نہیں یہاں نہیں۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ ''چلو میری آرام گاہ میں۔''

''چلیں۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

''جا گیر دار...... مہمانوں کے کپڑے اور سامان وہیں پہ لے آؤ، اس کے علاوہ اچھے سے کھانے کا بندوبست بھی کرو کہ 25,24 گھنٹوں میں انھوں کچھ نہیں کھایا۔''

''ٹھیک ہے خان جی۔''

''صاحب گل تم بھی جا گیر کے ساتھ چلے جاؤ۔'' اور صاحب گل، جا گیر خان کے ساتھ چل پڑا۔

''آپ چلیں میرے ساتھ۔'' جانان خان کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا۔ موت کو اتنا قریب آ کر پلٹتے دیکھ کر اس کا رویہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں انھیں ختم کر کے آسانی سے نکل سکتے تھے مگر ایک تو یہ خواہ مخواہ کی خون ریزی ہوتی دوسرا اس کے بعد ہم اطمینان سے چودھری کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکتے تھے۔ جبکہ یہ چال چل کے ایک تو ہم نے جانان خان کی نظروں میں اپنی پوزیشن صاف کر لی تھی دوسرے اس سے ہمارا ضمیر بھی مطمئن تھا۔

جانان خان کے ساتھ چلتے ہوئے ہم اس کی آرام گاہ میں پہنچے وہ کشادہ کمرہ کافی پُر تکلف انداز میں سجایا گیا تھا۔ ہلکے آسمانی کلر کی دیواریں، اسی رنگ کے کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے پردے، خوب صورت صوفہ سیٹ۔ فرش پر بچھا ہوا نرم ایرانی قالین۔ دیواروں سے لٹکتی ہوئی خوب صورت تصاویر۔ وہ کمرہ واقعی ایک ملک کے شایانِ شان تھا۔

''آپ لوگ پہلے نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں، کھانا کھائیں اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔'' اور میں نے سر ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کیا تھا۔

+ + +

پُر تکلف کھانے سے فارغ ہو کر ہم خوشبودار قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے گل ہان کو اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ جا گیر دار اور صاحب گل بھی وہیں وجود تھے......

''باسمت خان اور ہیبت خان اپنی غلطی سے مارے گئے۔ پہل ہماری طرف سے نہیں ہوئی تھی، ہمارا آپ کے پاس آنے کا مقصد فقط چودھری اکبر کا پتا معلوم کرنا تھا۔ باقی چرس خریدنے کی کہانی بلاشبہ جھوٹی تھی مگر یہ بات بلاشبہ صحیح ہے کہ ہمارے طوفان خان سے تعلقات ہیں۔ اگر آپ کو ہماری بات میں کسی قسم کا شبہ ہو تو آپ بے شک اپنا کوئی بندہ طوفان خان کے پاس تصدیق کے لیے بھیج دیں اسے چودھری کے ساتھ ہماری دشمنی اور ہمارا چودھری کی تلاش میں جنگل خیل کی طرف آنے کی بارے سب معلوم ہے۔''

''مجھے آپ کی بات میں بالکل بھی شک نہیں ہے، باقی چودھری اکبر نے جو ظلم کیا ہے اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اب اگر

میرے لائق کوئی کام ہو تو حکم کرو میں اپنے بندوں کے ساتھ مل کر چودھری کے خلاف جنگ میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔" جانان خان نے پُرخلوص آفر کی۔

"مہربانی ملک صاحب...... اگر آپ کی مدد کی ضرورت پڑی تو ہم ضرور آپ کو زحمت دیں گے اب آپ صرف اتنی مہربانی کریں کہ ہمیں چودھری کے گھر کا ایڈریس سمجھا دیں۔"

"میں جاگیردار خان کو آپ کے ہمراہ بھیج دیتا ہوں۔ یہ آپ کو اس کا مکان دکھلا کر واپس آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔" اب ہم چلتے ہیں، چند دن اس کے گھر کی نگرانی کریں گے اور موقع ملتے ہی اس پر وار کرنے کی کوشش کریں گے۔" یہ کہہ کر میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، میری تقلید میں باقی تمام بھی کھڑے ہو گئے۔ جانان خان سے رخصتی مصافحہ کر کے ہم اس کی حویلی سے باہر نکل آئے۔ جاگیردار خان بھی ہمارے ساتھ تھا، اس کے باوجود کہ میں نے اسے اچھی خاصی چوٹ لگائی تھی اس کا رویہ میرے ساتھ خوشگوار ہی تھا۔

"عمر جان صیب!...... ایک بات پوچھوں؟" حویلی سے نکل کر ہم تھوڑا ہی چلے ہوں گے کہ جاگیردار مجھ سے مخاطب ہوا۔ کہانی سناتے وقت میں انھیں اپنے اصلی نام بتا چکا تھا۔

"پوچھو؟"

"کل چودھری، خان جی سے ملنے آیا تھا اور آپ دونوں بھی خان جی کے پاس موجود تھے۔ اس وقت آپ لوگوں نے کیوں چودھری پر حملہ نہیں کیا؟ حالانکہ اس وقت وہ آپ کی موجودی سے لاعلم تھا آپ بڑی آسانی سے اسے ٹھکانے لگا سکتے تھے۔"

"اس کی دو وجوہات ہیں...... پہلی...... وہ ملک صاحب کے گھر آیا تھا اور ہمیں اندیشہ تھا کہ اس کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی پر ملک صاحب خفا ہو جائے گا۔ دوسرا ہم نے اسے گولی مار کر قتل نہیں کرنا بلکہ اذیت ناک موت کے حوالے کرنا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کرو گے؟"

"ارادہ تو یہی ہے۔" میں اثبات میں بولا۔

"میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں...... اگر میری کسی بھی قسم کی مدد چاہیے ہو تو ضرور حکم کرنا۔"

"شکریہ جاگیردار بھائی، آپ کی دعاؤں سے زیادہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

انھی باتوں کے دوران ہم ایک زیرِ تعمیر عمارت کے قریب سے گزرے۔ جاگیر نے ہمیں بتایا......

"یہ حویلی چودھری اکبر کی ہے...... لیکن اس کی تعمیر ابھی تک مکمل نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ ملک امجد خان کے مکان میں رہائش پذیر ہے۔"

"ملک امجد خان خود بھی اسی مکان میں رہتا ہے؟"

"نہیں...... ملک امجد کی اپنی حویلی ڈابیر کے اندر ہی واقع ہے۔ یہ مکان تو اس نے بہت پہلے پہاڑی ڈھلوان پر بنایا تھا۔ اس وقت

ڈابیر کی آبادی بہت کم تھی۔ بعد میں جب یہ شہر پھیلا تو اس نے بھی شہر کے وسط میں جگہ لے کر اپنی حویلی بنائی اور اپنے خاندان سمیت اس میں منتقل ہوگیا البتہ وہ مکان بھی جوں کا توں موجود رہا اور وقتاً فوقتاً امجد خان اسے مختلف سرگرمیوں میں استعمال کرتا رہا آج کل اس مکان میں چودھری اکبر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔''

انھی باتوں کے دوراں ہم ڈابیر کے مضافات میں نکل آئے تھے۔

''وہ سامنے نظر آنے والا مکان ملک امجد خان کا ہے جس میں چودھری رہائش پذیر ہے۔''

جاگیردار خان نے درمیانے فاصلے پر نظر آنے والے مکان کی طرف اشارہ کیا جو کافی بلندی پر واقع تھا۔''

''ٹھیک ہے جاگیردار بھائی اب آپ جاسکتے ہیں۔'' میں رک گیا۔''اب ہم جانیں اور ہمارا کام۔''

''مگر میری مدد کی ضرورت پڑسکتی ہے آپ کو۔''

''فی الحال تو کوئی ضرورت نہیں پڑسکتی۔ کیونکہ ہم نے دور دور سے اس مکان کا جائزہ لینا ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ ہم سے مصافحہ کر کے رخصت ہوگیا اور ہم ٹہلنے کے انداز میں مکان کی سمت بڑھنے لگے۔ اکادکا مکانات چودھری کے گھر کے قرب وجوار میں بھی نظر آرہے تھے اس لیے ہمیں اس طرف آتے دیکھ کر چودھری یا اس کے آدمی چوکنا نہیں ہوسکتے تھے۔ اپنے چہرے چھپانے کے لیے ہم نے چادر کی پگڑی باندھ کر اس کے لٹکنے والے پلو مقامی انداز میں اپنے چہرے کے گرد اس طرح لپیٹ لئے تھے کہ صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ چودھری کے مکان تک ایک کچا ٹریک جارہا تھا اور یہ ٹریک گاڑیوں کے مسلسل آنے جانے کی وجہ سے بنا تھا۔ ہم دونوں مکان والی ٹیکری کے گرد گھوم کر اس کی پشت پر موجود پہاڑی پر چڑھنے لگے اور پھر ایک مناسب بلندی پر پہنچ کر ہم دونوں بیٹھ گئے، مگر مکان کی بناوٹ اس طرح تھی کہ اس کا اندرونی حصہ پھر بھی ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ مکان کے سامنے کے دائیں اور پشت کی طرف بائیں کونے میں دو مورچے بنے ہوئے تھے۔ گویا دونوں مورچے کراس میں تھے اور انھی دونوں مورچوں سے مکان کے چاروں اطراف کی نگرانی کی جاسکتی تھی۔ مٹی کے بلاکوں سے بنی ہوئی دیواریں جنھیں لپائی کیا گیا تھا اچھی خاصی بلند تھیں۔ ہم وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر مکان کے اندر گھسنے کے منصوبے پر بات چیت کرتے رہے۔ مگر بظاہر اندر داخل ہونا مشکل نظر آرہا تھا۔ مزید تھوڑی دیر وہیں گزار کر ہم نیچے اترنے لگے۔ اس نگرانی کا مجھے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا تھا ہم رات کو وہاں آنے کا فیصلہ کیا اور نیچے اتر آئے۔ عصر کا ٹائم ہوگیا تھا ہم ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے واپس آبادی میں پہنچ گئے۔ پگڑیاں کھول کر ہم نے چادروں کو کندھوں پر رکھ لیا کہ مسلسل پگڑی باندھے رکھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔

بازار سے گزرتے ہوئے، جینز پہنے ہوئے ایک لڑکی ہماری طرف بڑھی، اور قریب آکر نامانوس زبان میں کچھ بولنے لگی۔ وہ زبان مجھے فارسی کے مشابہ لگی لڑکی کی عمر 25,24 سال تھی اور وہ خاصی خوب صورت لڑکی تھی مگر اس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات اس کے اندر عجیب سی بے رونقی کو اجاگر کر رہے تھے۔ اس قبیل کی کافی لڑکیاں ہم نے جنگل خیل میں بھی دیکھی تھیں ان کے ساتھ انھی کی طرح کے

لڑکے بھی ہوتے تھے اور یہ عموماً گروپ کی شکل میں نظر آتے۔ مگر ہمارے ساتھ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی ایسی لڑکی ہم سے مخاطب ہوئی تھی۔

میں انگلش میں بولا۔

"We cant under stand What are you Saying?"

(آپ کیا کہہ رہی ہیں ہم نہیں سمجھ سکے ہیں)

"I said you can get me on a hash cigrate"

(میں نے کہا چرس کے ایک سگریٹ کے بدلے آپ مجھے حاصل کر سکتے ہیں)

''اب کیا خیال ہے؟'' اس کی بات سنتے ہی امجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس کا قصور نہیں ہے ماجے...... اس کے زندگی گزارنے کے فلسفے نے اسے اتنا ہی سمجھایا ہے۔ بچپن ہی سے بُری سوسائٹی اور پھر مادر پدر آزاد معاشرے نے ان کے اندر اخلاقیات کے نام پر کچھ نہیں چھوڑا ہوتا۔''

وہ لڑکی ہماری آپس کی باتوں سے یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہم اس کی آفر پر غور کر رہے تھے۔ میں نے اس کی ملتجی نظروں کو دیکھتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا میرا ارادہ اسے چند روپے دے کر اپنی جان چھڑانے کا تھا۔ مگر جیب میں پڑی ہوئی پاؤ بھر چرس سے میرا ہاتھ ٹکرایا۔ یہ چرس میں نے ضائع کرنے کے بہانے اپنی جیب میں رکھ چھوڑی تھی مگر بعد میں میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ یہ اس کے حوالے نہ کروں، لیکن پھر خیال آیا کہ میرے نہ دینے سے اس نے کون سا توبہ کر لینی ہے میں نے تو ویسے ہی ضائع کرنی ہے، وقتی طور پر ہی اس کا دل خوش ہو جائے گا۔ میں نے چرس کا پیکٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

"What is this?" وہ مستفسر ہوئی۔

"Hash" میں مختصراً بولا۔

''آپ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''نہیں...... یہ حقیقت ہے آپ کھول کر دیکھیں۔'' اس نے پیکٹ لے کر کھولا تو حیرانی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ چرس کی عادی تھی اور اسے خوب پہچان تھی۔ وہ میرے ساتھ لپٹتے ہوئے بولی۔

''اوہ...... اتنی چرس کے لیے تو میں پوری زندگی آپ کی خدمت کر سکتی ہوں۔''

''کیا کر رہی ہو۔'' میں نے خفت سے اسے پرے دھکیلا۔

''کک کیوں میں نے کیا غلط کر لیا۔'' وہ پریشان سے بولی۔

''غلط صحیح چھوڑو اور یہاں سے پھوٹنے کی بات کرو۔'' امجد جو کافی دیر سے خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا، غصیلے لہجے میں بولا۔

''مگر...... یہ...... چرس...... پیسے......'' وہ گڑبڑا سی گئی شاید اس کا خیال تھا کہ ہم اس سے چرس کے پیسے لینا چاہ رہے تھے، ورنہ اتنی

مقدار میں چرس بغیر کسی وجہ کے کوئی پاگل ہی کسی کے حوالے کر سکتا تھا۔

''چلو اسے سمجھانا مشکل ہے۔''میں نے امجد کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور ہم دونوں اسے ہکا بکا چھوڑ کر جانان خان کی حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔

''بس کوئی خوب صورت لڑکی نظر آ جائے تو رال ٹپک پڑتی ہے جناب کی۔ اب کیا ضرورت تھی پنگا بازی کی۔ اس کی زبان سے ہم ناواقف تھے تُو نے ضرور انگلش جھاڑنی تھی......اور دوسرا تُو نے اتنی زیادہ چرس اس کے حوالے کر دی، وہ اُلو کی پٹھی ساری کی ساری آج ہی پھونکنے کی کوشش کرے گی اور جائے گی جان سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس کے پاس یہ چرس کوئی آوارہ گروپ دیکھ لے تو وہ اسے ذبح کرنے سے بھی نہیں رکیں گے۔''

میں نے اسے جواب دینے کی کوشش نہ کی اور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ موڑ مڑتے وقت میں نے پیچھے دیکھا تو وہ لڑکی اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی۔

جانان خان کی حویلی تک امجد کے کوسنے جاری رہے۔ چوکیدار نے ہمیں دیکھتے ہی سلام کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں اس کمرے کی طرف بڑھ گئے جس میں ہمیں بے ہوشی کی دوا ملا قہوہ پلایا گیا تھا۔ شام کا ٹائم ہو گیا تھا۔ ہم آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

''میرے ذہن میں تو ایک اور پلان آیا ہے۔ جانو۔''

''کیا؟''میں مستفسر ہوا۔

''کیوں نا......ہم چودھری اکبر کو راستے میں روک کو اغوا کرنے کی کوشش کریں جس طرح دگن میں طوفان خان کو اغوا کیا تھا۔''

''ماجے میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ طوفان خان آخر تک یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ہم اس کے خلاف کیا کرنے والے ہیں کیونکہ بطور دشمن وہ ہم سے ناواقف تھا ورنہ اتنی آسانی سے کبھی بھی قابو نہ آتا۔ دوسرے وہ اکیلا تھا اور اس بزدل نے تو پانچ چھ باڈی گارڈ ہر وقت اپنے ساتھ لگائے ہوتے ہیں اور اسے راستے میں روکنے کا نتیجہ صرف مقابلے کی صورت میں نکلے گا۔ جس میں اسے زندہ پکڑنا کارِ محال ہو گا......اور سب سے بڑی بات یہ کہ چودھری ہماری صورتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس وجہ سے تیرا یہ پلان بالکل ناقابل قبول ہے۔''

''تو پھر حویلی میں گھسنے کی کوشش کرنی پڑے گی ورنہ اس کے علاوہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

''ہاں اب تم نے صحیح کہا۔''میں اس کی تائید کی۔''اس کے علاوہ اور کوئی بھی صورت ان حالات میں قابلِ عمل نہیں ہے۔''

''مگر حویلی میں گھسنا بھی تو کافی مشکل نظر آ رہا ہے اور اگر ہم اچانک پن حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے تو شاید چودھری بھاگ جائے۔ یوں بھی وہ قلعہ بند ہوں گے اور اپنے گھر کے چپے چپے سے واقف۔ جبکہ ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس کے گھر میں کمرے کتنے ہیں۔''

''اس بارے جانان خان سے مشورہ کرتے ہیں شاید کوئی مناسب صورت نکل آئے۔''

میں نے کہا اور وہ کھڑا ہو گیا......

''آؤ پھرابھی چلیں۔کیونکہ میں چاہتا ہوں ہمیں آج رات ہی اپنا کام ختم کر لینا چاہیۓ۔''

''ماجے میں تم سے بھی زیادہ بے چین ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ ہم تیزی میں درستی بھول جائیں۔اس مرتبہ اگر چودھری ہم سے بھاگ گیا تو شاید زندگی بھر نہ ملے۔'' مگر امجد خاموش رہا ہم جانان خان کے کرے کی طرف بڑھ گئے۔

جانان خان کمرے میں جاگیردار خان سے گپ شپ کرتا ہوا ملا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی وہ ''بخیر'' کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔

اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔''سناؤ بھئی کیا رہا؟''

''حویلی دیکھ لی ہے۔اب آپ سے مشورہ کرنے آئے ہیں تاکہ کوئی حتمی لائحہ عمل طے کر سکیں۔''

''ضرور ضرور، کیوں نہیں۔آپ صورت حال کی وضاحت کریں تاکہ مجھے مشورہ دینے میں آسانی رہے۔''

''ملک صاحب......!بات صرف اتنی ہے کہ ہم چودھری کو زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔جبکہ اس کی حویلی میں ہمیں کافی سخت پہرہ نظر آیا ہے اور اندر گھسنے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ دوبدو مقابلہ کی نوبت آجائے گی۔جس کے نتیجے میں چودھری کا زندہ ہمارے ہاتھ آنا کچھ مشکل سا لگتا ہے۔بلکہ ایسی صورت پیش آنے پر ان پر قابو پالینے کے چانس بھی ففٹی پرسینٹ ہیں۔دوسرے اگر ہم اسے راستے میں روک کر پکڑنے کی کوشش کریں تب بھی بات نہیں بنے گی کہ ایک تو وہ ہمیں شکل سے پہچانتا ہے اور اس کے علاوہ اس کے ساتھ چار پانچ باڈی گارڈز بھی ہوتے ہیں تو یہاں بھی وہی صورت حال درپیش ہونے کا خطرہ ہے۔کافی دیر مغز ماری کرنے کے بعد ہم نے آپ سے رہنمائی لینے کی بابت سوچا ہے،اس ضمن میں آپ کہیں اس سوچ میں نہ پڑ جانا کہ ہمیں آپ کی جسمانی طور پر کوئی مدد چاہیۓ۔ہمیں تو بس کسی مناسب مشورے کی احتیاج ہے۔''

''برادر اپنی مدد کی پیش کش میں اس سے پہلے بھی کر چکا ہوں اور دوبارہ بھی یہی کہوں گا کہ میں اور میرے بندے بالکل حاضر ہیں، لیکن اس میں صرف اتنی قباحت ہے کہ چودھری کے خلاف آپ ہمیں صرف رات کو استعمال کر سکتے ہیں کھلم کھلا اس کے خلاف کسی بھی کارروائی میں آپ کے شانہ بشانہ نہیں لڑ سکتے کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں ملک دلشاد خان اور سبز علی خان جن کے ساتھ چودھری کے اچھے تعلقات ہیں ہمارے خلاف میدان میں اتر آئیں گے۔ان کے نزدیک چودھری سے میری دشمنی کی وجہ کاروباری رقابت ہوگی۔وہ دونوں بھی اسی کاروبار میں ملوث ہیں اور آج اگر میں چودھری کو راستے سے ہٹانے کا اقدام کر سکتا ہوں تو کل کلاں ان کے خلاف بھی اس قسم کی کوئی کارروائی کر سکتا ہوں حالانکہ میں ان سے ڈرتا نہیں ہوں لیکن پھر بھی ان کی مخالفت میرے لیے چھوٹے موٹے مسائل پیدا کر سکتی ہے۔''

''ملک صاحب......آپ موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔''یہ ساری بحث ہم کر چکے ہیں اور ہمیں آپ کی مجبوریوں کا بھی احساس ہے۔اس کے باوجود بھی اگر ہمیں آپ کی ضرورت ہوتی تو ہم قطعاً نہ کتراتے مگر آپ کی مدد حاصل کر کے بھی ہم اسے صرف قتل کرنے میں ہی کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارا ارادہ اسے زندہ پکڑنے کا ہے۔آپ کوئی مناسب ترکیب بتائیں،کوئی اچھا سا مشورہ دیں اور

بس...... باقی ان شاء اللہ ہم خود اس سے نبٹ لیں گے۔''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے کمرے میں خاموشی چھائی رہی اور پھر اس خاموشی کو جانان خان کی آواز نے ہی توڑا۔

''جہاں تک میرا اندازہ ہے چودھری کے تقریباً سات یا آٹھ بندے ہیں۔ گھر سے باہر نکلتے وقت اس کے ساتھ پانچ چھ بندے موجود رہتے ہیں اس کا مطلب ہے اس کی غیر موجودی میں اس کی حویلی میں زیادہ سے زیادہ دو بندے حاضر ہوتے ہیں اور ان سے آنکھ بچا کر اگر آپ لوگ حویلی میں گھس جاؤ اور چودھری کے کمرے میں چھپ کر بیٹھ جاؤ تو اس پر قابو پانا قطعاً مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اب اس کی غیر موجودی میں آپ اس کے گھر میں اس کے ملازمین کی نظر بچا کر کیسے داخل ہوتے ہیں یہ آپ کی اپنی صوابدید ہے۔''

''بات تو پھر بھی وہیں کی وہیں رہی...... آخر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ ہم اگر اس کے بندوں کو ہلاک کر کے اندر چھپتے ہیں تو چودھری واپسی پر ان کی گمشدگی کو محسوس کرتے ہی چوکنا ہو جائے گا۔''

''اس کا بھی ایک طریقہ ہے''۔ وہ کسی کہنہ مشق استاد کی طرح بولا۔ ''مگر اس میں اخلاقی قدروں کی قربانی دینی پڑے گی۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''دیکھو عمر جان...... عورت ہمیشہ مردوں کی کمزوری رہی ہے۔ بڑے بڑے عقلمندوں کو یہ ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اگر تم کوئی ایسی عورت تلاش کر سکتے ہو جو چودھری کے ملازمین کو چند لمحوں کے لیے ڈیوٹی سے غافل کر دے تو تمھارا کام آسان ہو جائے گا۔''

''اوہ...... ویری گڈ'' میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''واقعی آپ سرداری کے لائق ہیں۔ بہت خوب یہ ایسی تجویز ہے کہ ہمارا دماغ کبھی بھی اس تک رسائی حاصل نہ کر سکتا۔''

میرے تعریفی جملے سنتے ہوئے جانان خان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جاگیردار کہنے لگا۔

''پرسوں ملک امجد خان کے بیٹے کی شادی ہے اور چودھری لامحالہ اس میں شرکت کے لیے جائے گا تم پرسوں تک کوئی عورت تلاش کر لو اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔''

''گڈ......'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''ہم اب چلتے ہیں، چلو امجد۔''

''کھانا کھا کر چلے جاتے۔'' جانان خان نے مشورہ دیا۔

''نہیں...... کھانا ان شاء اللہ واپسی پر کھائیں گے۔'' میں نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے امجد نے میرا ساتھ دیا تھا۔

''کچھ مجھے بھی تو پتا چلے کہاں چل دیئے؟'' کمرے سے نکلتے ہی امجد مستفسر ہوا اور میں نے مختصر لفظوں میں اسے ساری بات بتا دی۔

''یار...... مشورہ تو اچھا ہے مگر بات کچھ معیوب ہے۔''

''ہم شریف زادی تھوڑی ان کے پاس بھیجیں گے؟''

''مگر ایسی لڑکی آئے گی کہاں سے؟''

''یار میرا ارادہ اسی لڑکی کو استعمال کرنے کا ہے...... جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے پاؤ بھر چرس دی تھی۔''

''اب تک وہ تیرے ذہن سے نہیں نکلی؟''

''اچھا دفع کرو اسے...... تم بتاؤ کس کو بھیجیں؟''

''اس کیٹگری کی کئی مل جائیں گی۔''

''شاید وہ ہمارے ساتھ مخلص نہ ہوں۔ جبکہ اس پر ہمارا بہت بڑا احسان ہے۔ امید ہے وہ ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔''

''اچھا ملک صاحب !......وہی سہی مگر سوچ لو یہ بات مجھے اچھی نہیں لگ رہی اور دوسرا وہ ملے گی کہاں؟''

''بازار کا چکر لگاتے ہیں شاید مل جائے۔'' میں امید بھرے لہجے میں بولا اور امجد سر ہلا کر رہ گیا۔ ہم اسی راستے پر چل پڑے جہاں ہمیں وہ لڑکی ملی تھی۔

''ویسے یہ ٹائم مناسب نہیں ہے۔ اس اندھیرے میں ہم اسے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ لاہور یا کراچی کا بازار تو ہے نہیں کہ روشنی ہو۔''

''بازار میں اچھی خاصی روشنی ہوتی ہے۔ پیٹرومیکس کے جلنے اور جنریٹروں سے جلائی گئی ٹیوب لائیٹوں کی روشنی میں ہم اسے پہچان لیں گے۔''

''تم تو خیر اسے اندھیرے میں بھی پہچان لو گے۔ آخر جناب کو اس سے گلے ملنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔'' اس نے مجھے چھیڑا۔

''بکواس کرنا کوئی تم سے سیکھے۔''

''کیوں غلط کہا ہے؟'' وہ مسکرایا۔ مگر اسے جواب دینے کی بجائے میں ارد گرد نگاہ دوڑانے لگا ہم بعینہ اسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں وہ ہمیں ملی تھی۔ اس جگہ روشنی کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور ہم شاید اسی رو میں آگے بڑھ جاتے مگر اچانک راستے کے بائیں جانب ایک سرخ نقطہ چمکتا ہوا نظر آیا۔

''ماجے!......اس طرف کوئی سگریٹ نوشی میں مصروف ہے۔''

''چلو۔'' اس نے میری تائید کی۔ سگریٹ پینے والا جو بھی تھا اس نے ہماری آواز سن کر کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر اس کے سمت جلائی تو خوشی کے ساتھ ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہی لڑکی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے سگریٹ نوشی میں مصروف تھی اور یہ کہنے کی تو غالباً ضرورت نہیں کہ وہ سگریٹ چرس کے بھرے ہوئے تھے۔ اپنی پسندیدہ چیز ملنے کے بعد اس نے مزید دائیں بائیں پھرنا پسند نہیں کیا تھا اور وہیں بیٹھ کر اپنی حسرتیں پوری کرنے لگی تھی۔ ہمارے قریب پہنچنے کا بھی اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور اسی انداز میں بیٹھی رہی تھی۔

''ہیلو گڈ گرل۔'' میں نے گفتگو کی ابتداء کی۔

''کون؟'' اس نے نشے سے بوجھل آنکھیں اٹھائیں۔

''یہ ہم ہیں۔'' میں نے ٹارچ کا رخ اپنے چہرے کی طرف کیا۔

'یو......سویٹ بوائے۔'' وہ کھڑے ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''مجھے پتا تھا تم ضرور واپس آؤ گے؟''

میں نے نرمی سے اس کی گرفت سے آزاد ہو کر کہا۔

''اچھا......وہ کیسے؟''

''بس میرا دل کہہ رہا تھا۔'' اس نے ایک دفعہ پھر مجھ سے لپٹنے کی کامیاب کوشش کی۔

''اچھا اب اس سے ملو۔'' میں نے اسے دوبارہ خود سے علیحدہ کر کے امجد کی طرف متوجہ کیا۔

''اوہ......سوری۔'' اس نے امجد کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''ان پر تو میری نظر ہی نہیں پڑی تھی۔''

''ہاں جانو کی موجودی میں مَیں خاک نظر آتا۔'' امجد اردو میں بولا۔

''کیا کہا؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''میں نے کہا۔ ''تھینک یو۔'' امجد مسکرایا۔

''آپ کا بھی بہت بہت شکریہ۔'' اس نے بھی جواباً مسکراہٹ اچھالی۔

وہ لہجے اور انداز سے بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ یوں بھی چرس کا نشہ پینے والے کی عقل کو افیون، ہیروئن یا کوکین کی طرح خبط نہیں کرتا۔ بلکہ کہنے والوں سے تو یہاں تک سنا ہے کہ شراب اور بھنگ کا نشہ بھی چرس سے زیادہ ہوتا ہے۔ بہر حال ان خرافات سے اللہ تعالیٰ کی ذات نے آج تک محفوظ رکھا ہے اس لیے اس بارے میری معلومات واجبی سی ہے۔ البتہ اس وقت اس لڑکی کی عادات واطوار میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ نشے میں ہے۔

''اچھا ہم تمھیں لینے آئے ہیں۔''

''ہاں چلو۔'' میرا ہاتھ تھام کر اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ یا جھجک کے میرے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔ اس کے پُراعتماد انداز نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ مگر بعد میں سوچنے پر مجھے اس کا یہ عمل اتنا حیران کن نہ لگا کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے چھننے کا اسے کوئی افسوس ہوتا۔ وہ کوئی مشرقی لڑکی تو تھی نہیں کہ اپنی عزت وعصمت کا خوف کرتی۔ دولت سے وہ قبیل ویسے تہی دامن ہوتی ہے۔ لے دے کے ایک چرس ایسی چیز تھی جو اس کے نزدیک قیمتی تھی مگر وہ ہم خود اس کے حوالے کر چکے تھے تو چھین لیے جانے کا ڈر کیسا؟

تھوڑی دیر بعد ہم جانان خان کی حویلی میں پہنچ گئے تھے۔ دربان نے اسے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

''جانان خان کو بتلا دینا کہ ہم واپس پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے دربان کو بتلا دیا اور اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

لڑکی کو لیے ہم سیدھے مہمان خانے میں پہنچے کمرے کے اندر ٹیوب لائٹ جل رہی تھی جو جنریٹر کی مرہون منت تھی۔ جنریٹر کے چلنے کی ہلکی ہلکی آواز ہمارے کانوں میں آ رہی تھی وہ اس وسیع وعریض حویلی کے کسی کونے میں رکھا گیا تھا۔ ورنہ نزدیک ہونے کی صورت میں جنریٹر کی آواز کانوں کو خاصی ناگوار گزرتی ہے۔

''بیٹھو۔'' میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور وہ آہستہ سے بیٹھ گئی۔ اب تک اس نے ہمارے مقصد کے متعلق استفسار نہیں کیا تھا کہ ہم کیوں اسے ساتھ لے آئے تھے اور اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے اپنے طور پر کوئی مطلب اخذ کیا ہوا تھا۔ وہ جینز کی پتلون اور ہلکے سرخ رنگ کی شرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے لباس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا کہ اسے پانی کی صورت دیکھے عرصہ بیت چکا ہے اور یہی وجہ تھی کہ اس لڑکی کے بدن سے کافی ناگوار سی بو اٹھ رہی تھی۔

''میرا نام جان، اور اس کا امجد ہے۔ آپ کا نام؟''

''آپ مجھے لزا کہہ سکتے ہیں۔''

''اچھا مس لزا سب سے پہلے تو آپ ایسا کریں کے نہا لیں اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔''

''مم...... میں ایسے ہی ٹھیک ہی ہوں۔'' وہ گھبرا گئی۔

''ٹھیک کدھر ہو، آئینہ دیکھا ہے...... بھوت نظر آ رہی ہو۔''

''مم...... مگر نہا کر...... پہنوں گی کیا؟'' اس نے جان چھڑانی چاہی۔

''کپڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر باتھ روم کی طرف دھکیلا اور وہ مرے مرے قدموں سے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے باتھ روم میں گھستے ہی میں نے امجد سے کہا۔

''تم بیٹھو میں ابھی آیا۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''لزا کے لیے کپڑوں کا بندوبست کرنے۔''

''بازار جاؤ گے؟''

''نہیں...... جانان خان سے کہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں باہر کی طرف چل پڑا مگر اس سے پہلے کہ میں کمرے سے نکلتا جانان خان ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے جاگیردار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔

''وعلیکم السلام...... آئیں ملک صاحب میں آپ کی طرف ہی جا رہا تھا۔''

''حکم کرو۔'' وہ بشاشت سے بولا۔

''زنانہ شلوار قمیص چاہیے تھی۔''

''خیر تو ہے۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''ہاں بس ایک لڑکی تو ہم پکڑ لائے ہیں مگر وہ ہے غیر ملکی اب اسے اپنے علاقے کی عورت کا روپ دینا ہے۔''

''شلوار قمیص تو مشکل ہے۔البتہ میں مقامی لباس لے آتا ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل گیا۔

''عمر جان صاحب!...... یہ عورت کدھر سے مل گئی؟'' جاگیردار امجد کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا اور میں نے مسکراتے ہوئے اسے لزا کے ملنے کی کہانی سنا دی۔

''اسی لیے ملک صاحب کی تجویز سنتے ہی آپ عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تلاش میں چل پڑے تھے؟''

ملک جانان خان جلد ہی کپڑوں کے بنڈل کے ساتھ لوٹ آیا۔گلابی رنگ کا گھگرا جس پر سبز اور سفید کشیدہ کاری کی گئی تھی اس کے ساتھ اسی رنگ کی شلوار اور دوپٹہ مجھے کافی خوب صورت لگا۔

کپڑوں کا بنڈل اس سے لے کر میں باتھ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''لزا یہ کپڑے لے لو۔'' میں نے دروازے پر دستک دے کر اسے آواز دی اور خود دروازے سے تھوڑا سا ہٹ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اس نے دروازہ کھول دینا ہے اور وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔

''دے دو۔'' اس نے مکمل دروازہ کھول دیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اندازے سے کپڑے اس کی جانب بڑھا دیئے اور پھر واپس امجد پارٹی کے پاس آبیٹھا۔

جاگیردار جانان خان کو لزا کی بابت تفصیل بتلا رہا تھا جبکہ امجد نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے گن کی صفائی کرنی شروع کر دی تھی۔وہ اس منصوبے کے حق میں نہیں تھا مگر میری طرح اس کے ذہن میں بھی اس کا متبادل حل نہیں آ رہا تھا اس لیے خاموش تھا،البتہ خاموش تائید کے باوجود اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس نے کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔

چند لمحے بعد ہی لزا باتھ روم سے برآمد ہوئی۔دوپٹے کو اس نے سکارف کی طرح گلے میں لپیٹ لیا تھا۔اسے دیکھ کر جانان خان اور جاگیردار حیران رہ گئے تھے بلکہ وہ کیا خود ہمیں بھی حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ان کپڑوں میں وہ اتنی دلکش پیاری اور پُرکشش لگ رہی تھی کہ اگر ہم اس کا دوسرا روپ نہ دیکھ چکے ہوتے تو کبھی بھی اسے اس منصوبے میں استعمال کرنے کی کوشش نہ کرتے۔

''او ہلک دا خوڈیرا ښکلی دے۔'' (او لڑکے یہ تو بہت خوب صورت ہے) جانان خان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی اور ہولے سے بولی۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں جان؟''

''بہت اچھی اور بہت خوب صورت۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''شکریہ۔'' کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''کھانا منگواؤں......؟ بھوک لگی ہے یا نہیں؟۔'' میں مستفسر ہوا۔

''کل صبح چائے کے ساتھ ایک ڈبل روٹی کھائی تھی۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''ملک صاحب کھانا تو منگوالو۔'' میں جانان خان سے مخاطب ہوا۔

''جاگیردار......کھانا لے آؤ......میں بھی یہیں کھاؤں گا۔'' مخاطب وہ جاگیردار سے تھا مگر اس کی نظریں لزا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

جاگیر۔''جی خان جی۔'' کہہ کر چلا گیا۔

''اس سے آپ نے بات کر لی ہے۔'' اس کا اشارہ لزا کی جانب تھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔''مگر یہ آسانی سے مان جائے گی۔''

''ہوں۔'' کہہ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔امجد بڑے انہماک سے کلاشن کوف کی صفائی میں مصروف تھا۔میں بھی خاموشی سے جاگیردار کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

لزا زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی اور ہولے سے بولی۔

''آپ کتنے آدمی ہو......؟''

''کیا مطلب؟'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''مطلب......آپ یہی چار مرد ہو......یا اور بھی ہیں؟''

'''' میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھ سکا ہوں کہ ہماری تعداد سے آپ کا کیا تعلق۔''

''وہ......وہ دراصل......میں آپ کے ساتھ اس لیے آئی تھی کہ میں نے سمجھا آپ صرف دو آدمی ہو جبکہ یہاں لگتا ہے آپ لوگوں کی کافی تعداد ہے اور میں اکیلی۔کیسے......؟'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی مگر میں اس کے مفہوم سے پوری طرح آگاہ ہو گیا تھا اور یہ آگاہی نامہ میرے لیے فقط شرمندگی کا باعث ہی بن سکا تھا امجد نے بھی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں جلدی سے بولا۔''نہیں نہیں لزا ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔''

مگر اسے یہ باور کرانا بہت مشکل تھا کہ ہم اسے کسی مذموم مقصد کے لیے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے،اس نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی تھی اور جس تہذیب کی وہ پروردہ تھی اس تہذیب میں عورت اور مرد کا صرف ایک ہی رشتہ تھا اور وہ تھا جسمانی تعلق کا رشتہ۔جبکہ ہمارا معاشرہ عورت کو کئی پاکیزہ رشتوں کی صورت میں ہمارے سامنے لاتا تھا۔جس کی ہر صورت ہمارے لیے قابل احترام،مقدس اور قابل عزت

تھی۔اس نے جس خدشے کا اظہار دبے الفاظ میں کیا تھا وہ اس بات کا مظہر تھا کہ اس کم عمری میں اسے ایک یا اس سے زیادہ تلخ تجربات ہو چکے تھے۔

''کیا مطلب......ایسی کوئی بات نہیں ہے کا؟''اب حیرانی ہونے کی باری اس کی تھی۔

''پہلے کھانا کھالیں...... پھر بتاتا ہوں۔'' جاگیردار کو کھانے والے برتنوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں بولا،وہ اثبات میں سرہلا کر رہ گئی تھی۔ایک دوسرا ملازم بھی جاگیردار کے ہمراہ تھا۔کھانے والے برتن ٹیبل پر رکھ کر وہ دونوں باہر نکل گئے تھے،جاگیر دار خان بھی جانان خان کے احترام میں ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔

کھانے کے دوران جانان خان مستفسر ہوا۔

''یہ لڑکی آپ سے کیا پوچھ رہی تھی؟''

لزا چونکہ انگریزی میں بات کرتی رہی تھی اس لیے جانان خان کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔امجد اور میں بھی کوئی اتنی اچھی انگلش نہیں بول سکتے تھے بس گزارے لائق سمجھ بول لیتے تھے۔اسی طرح لزا کو بھی انگلش پر اتنا عبور نہیں تھا،نا معلوم اس کی مادری زبان کون سی تھی،لیکن جانان خان تو اس معاملے میں بالکل کورا تھا۔

''یہ پوچھ رہی تھی کہ ہم اس سے کیا کام لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''میں بات کو گول مول کیا۔

''تو پھر آپ نے کیا بتلایا؟''اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں بتلایا۔کھانے کے بعد یا پھر کل صبح اس سے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔'' کھانا کھانے کے بعد ملازم چائے لے آیا چائے پی کر میں نے لزا سے پوچھا......

''تمھیں مزید کوئی چیز درکار ہے؟''

''اگر سگریٹ مل جاتے؟......اس کے ساتھ تھوڑی سی چرس بھی۔''

''کیا؟''اس کی بات نے مجھے حیران کر دیا تھا۔''پاؤ بھر چرس کا کیا ہوئی؟''

''وہ میں ساتھ لیے تھوڑی پھر سکتی ہوں......؟وہ تو میں نے اسی درخت کے ساتھ ایک مناسب جگہ پر چھپا دی تھی۔''

''ملک صاحب!......سگریٹ اور چرس مل جائے گی۔''

''کیوں نہیں......یہ لو۔''اس نے گولڈ لیف کی ڈبی میری جانب بڑھائی اس میں چرس سے بھرے سگریٹ موجود ہیں۔''

ڈبی لے کر میں نے لزا کی طرف بڑھادی......

''اس میں چرس سے بھرے سگریٹ موجود ہیں۔اب تم آرام کرو صبح کام سے متعلق بات چیت کریں گے۔''اسے کہہ کر میں جانان خان سے مخاطب ہوا۔

''چلیں ملک صاحب تاکہ یہ آرام کر سکے۔''

''ہاں......ہاں کیوں نہیں۔'' وہ اٹھ گیا۔ جبکہ امجد میری بات سن کر اس سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا۔

''جان تم تو میرے ساتھ رہ جاؤ نا۔'' لزا لجاجت سے بولی۔

''نہیں لزا!......میں فی الحال آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا اور کیوں نہیں رہ سکتا اس بارے پھر کبھی بات کریں گے۔ اب تم ہمیں اجازت دو اور خود بھی آرام کرو۔''

اسے ہکا بکا چھوڑ کر ہم باہر نکل آئے۔

جانان خان نے پوچھا۔''اب یہ کیا کہہ رہی تھی؟''

میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ وہ لزا میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے مگر پھر مصلحت آڑے آگئی۔ میں نے بات کو گول مول کر دیا۔

''اب بھی وہ اس کام کے متعلق استفسار کر رہی تھی جو ہم اس سے لینا چاہتے ہیں؟''

''تو بتا دینا تھا ناں اسے۔''

''نہیں صبح بتلائیں گے تفصیل کے ساتھ۔''

وہ بولا۔''چلو جیسے تمھاری مرضی۔'' اس دوران ہم آرام گاہ میں پہنچ چکے تھے۔

میں نے کہا۔''ملک صاحب ہمیں بھی کوئی کمرہ دکھا دیں تاکہ تھوڑا آرام کر لیں۔''

''تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں......پھر سو جانا۔'' وہ مصر ہوا۔

''صبح گپ شپ ہو گی انشاءاللہ لگائیں گے۔ فی الحال ہم تھکن محسوس کر رہے ہیں۔'' میں نے جان چھڑائی۔

''ٹھیک ہے......آپ آرام کریں۔'' خلاف توقع وہ راضی ہو گیا۔''یہ ساتھ والا کمرہ خالی پڑا ہے۔'' اس نے اپنی آرام گاہ سے متصل کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

ہم مصافحہ کر کے کمرے سے نکل آئے۔ دوسرے کمرے میں بھی لکڑی کی دو رنگین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بلکہ اس حویلی کے ہر کمرے میں مجھے اس طرح کی چارپائیاں اور ان کے اوپر بچھے ہوئے بستر دکھائی دیئے تھے۔ شاید جانان خان کے ہاں مہمانوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔ ہم کمرے میں گھستے ہی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ امجد خلافِ توقع چپ تھا۔ پہلے تو میں نے سمجھا شاید جانان خان کی وجہ سے خاموش ہے مگر اکیلے ہونے کے بعد بھی اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

''ماجے خیر تو ہے؟'' میں نے اس کی طرف کروٹ بدلی۔''کافی دیر سے چپ ہو؟''

''جانو!......میں اس ترکیب کے حق میں نہیں ہوں۔ میرا ضمیر اس پر بالکل راضی نہیں......ایک معصوم لڑکی کو استعمال کرنا کہاں کی مردانگی ہے۔''

''اس کے علاوہ چارہ بھی تو کوئی نہیں۔ دوسرے ہم اسے کون سا موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔ اسے صرف ایک خطرہ ہے جو

اس کی نظر میں شاید خطرے کی بجائے انجوائے منٹ ہو، وہ کوئی پارسا لڑکی تو ہے نہیں۔ سنا نہیں تھا کتنی بے باکی سے اس موضوع پر محوِ گفتگو تھی۔"

"کچھ بھی ہے...... اگر تم نے اسے استعمال کیا تو میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔" امجد نے حتمی لہجے میں کہا اور میں حیرانی سے اس کے چہرے کی جانب تکتا رہ گیا۔

+ + +

ماجے کیا ہو گیا ہے تمھیں؟...... لزا کو یہاں لانے سے پہلے میں تمھیں یہ سب کچھ بتا چکا ہوں، اس وقت تو تُو نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"اس وقت بھی میں اس کے حق میں نہیں تھا، لیکن بعد میں غور کرنے پر تو یہ بات مجھے نہایت معیوب لگی۔"

"اس میں کون سی قباحت کی بات ہے۔ لزا کوئی باعصمت اور پردہ دار لڑکی تو ہے نہیں۔"

"یار تم نے تو گنڈہ پوروں والی خو ہی بدل ڈالی ہے۔ چودھری کے غلیظ کتوں کے سامنے ایک لڑکی کو چارہ بنا کر پیش کر رہے ہو اور اس میں تمھیں قباحت نظر نہیں آ رہی، تیرے نقطہ نظر سے تو ہیرا منڈی کے سارے دلال بے قصور اور برحق ہیں کیونکہ وہ بھی تو آبرو باختہ عورتیں ہی گاہکوں کو پیش کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" میں چڑ گیا۔ "تمھیں ہمیشہ الٹی سوجھتی ہے۔"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ تم سوچو تو سہی آخر ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اپنی دشمنی میں ایک بے قصور لڑکی استعمال کرنا کہاں کی بہادری ہے۔ اب ہم اتنے عاجز ہو گئے ہیں کہ چودھری کے خلاف عورتوں کا سہارا لیں گے۔ کبھی نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

"تو...... کیا کریں؟"

"کچھ بھی کرو...... لیکن اصولوں پر سودے بازی نہیں ہو گی۔ چودھری کو ہم نے ڈھونڈ نکالا ہے، اس کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ کبھی تو ایسا موقع ہاتھ آئے گا جب اس پر ہاتھ ڈال سکیں۔"

"اور اگر اس سے پہلے وہ غائب ہو گیا پھر؟"

"ہونہہ...... ایسے ہی غائب ہو جائے گا، کوئی جن بھوت ہے کیا؟...... اور بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو پھر ڈھونڈ لیں گے۔ پہلے بھی تو وہ ہم سے چھپ کر ادھر آیا ہوا ہے۔"

"مگر مجھ سے مزید صبر نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا ہوں جلد سے جلد اس کے گندے وجود سے دھرتی کو پاک کر دوں۔"

"میں تم سے بھی زیادہ بے چین ہوں...... لیکن بے صبری میں کام بگاڑنا نہیں چاہتا۔ یاد ہے نا چاچا فاضل نے کیا کہا تھا کہ "اوبا ہلی کتی اندھے کو نگرے جیندی ہیے۔" (جلد باز کتیا اندھے بچے پیدا کرتی ہے) امجد نے سرائیکی کی مشہور کہاوت بیان کی۔

"پھر لزا کا کیا کریں؟"

"کرنا کیا ہے۔ صبح اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیتے ہیں اور میں اس سے نکاح پڑھانے سے تو رہا۔ شہیلا بی بی کافی بے چینی

سے میری منتظر ہوگی، البتہ تم چاہو تو شیتل کا بہترنعم البدل ہے وہ بھی کافرہ ہے یہ بھی مسلمان نہیں ہے اور نشے بازی کی لت بونس میں۔''

''بک بک اچھی کر لیتے ہو۔'' میں خفت سے ہنسا۔''تو نے شیتل کو دیکھا نہیں ورنہ ایسا کہنے کی جرأت کبھی نہ کرتے۔ ہندو ہونے کے باوجود اس نے اپنی عصمت پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔''

''اس کی برائی کے لیے اس کا ہندو ہونا کافی ہے۔''

''بالکل غلط ہے۔'' میں نے نفی میں سرہلایا۔''تو نے سنا نہیں کہ کسی کافر سے نہیں بلکہ اس کے کفر سے نفرت کرو۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''اور اگر وہ کافر کی بجائے کافرہ ہو تو اسے گلے سے لگانے میں بھی کوئی قباحت نہیں۔''

''اس فالتو گفتگو کے بجائے اگر چودھری اکبر پہ قابو پانے کے لیے کوئی پروگرام تشکیل دیا جائے تو مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے اس فضول بحث سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''درست کہا، لیکن اس سے بھی مناسب یہ ہے کہ میں سو رہا ہوں اور تم بطور مالک ہونے کے کوئی اچھا سا منصوبہ سوچو۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے آرام سے لیٹ گیا اور میں نے بھی اس کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں، لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی لزا کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا پروگرام میں نے ترک کرنا مناسب سمجھا شاید امجد نہ ہوتا تو میری نظر اس پہلو کی طرف نہ جاتی۔ چودھری کی دشمنی میں میں ایسا کام کرنے جا رہا تھا کہ جس کے نتائج غلط نکلنے کی صورت میں مجھے پچھتانے کا موقع بھی نہ ملتا اور ہو سکتا ہے میرا ضمیر ساری عمر مجھے ملامت کرتا رہتا۔ چودھری کو زندہ پکڑنے کے لیے میں رات گئے تک مختلف منصوبے بنا بنا کر انھیں رد کرتا رہا اور آخر میں ملک جانان خان سے دوبارہ اس موضوع پر بات چیت کرنے کا پروگرام بنا کر مطمئن ہو گیا وہ جہاں دیدہ شخص لازمی طور پر کوئی مناسب قسم کا مشورہ دے سکتا تھا۔

+ + +

صبح ہم بمشکل حوائج ضروریہ سے فارغ ہوئے تھے کہ جانان خان کی طرف سے بلاوا آ گیا۔

''خان جی ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ملازم ہمیں یہ بتا کر باہر نکل گیا۔

''جانان خان کی مہربانیاں کچھ زیادہ نہیں بڑھ رہی ہیں۔'' امجد ملازم کی پشتو سمجھ گیا تھا۔

''صحیح کہا۔'' میں نے اثبات میں سرہلایا۔''کل سے میں بھی اس کے انداز میں واضح تبدیلی محسوس کر رہا ہوں اور اس کی وجہ شاید لزا ہے۔''

''کیا مطلب ہے؟'' امجد کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''بار بار لزا کے متعلق استفسار کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسے اس کی ذات سے کافی دلچسپی ہے۔''

''وہ تو خیر تمھیں بھی کافی ہے۔'' امجد مجھ پہ چوٹ کرنے سے باز نہ آیا۔ اس دوران ہم جانان خان کے کمرے تک پہنچ گئے تھے اس لیے میں امجد کی بات کا جواب نہ دے سکا۔

جانان خان بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ ہمارے سلام کا جواب خوشدلی سے دیتے ہوئے اس نے اٹھ کر ہم دونوں سے مصافحہ کیا

اور ہمیں ساتھ لیے بیٹھ گیا۔

”عمر بھائی!......رات کیسی گزری؟“

”اللہ کا شکر ہے ملک صاحب...... بہت اچھی......آپ سنائیں۔“

”اور امجد بھائی آپ کا۔“

”الحمدللہ......دعا ہے آپ کی۔“

”ل عمر بھائی آپ کو ناشتے پر بلانے کا مقصد یہ ہے کہ ایک تو آپ چند دن کے مہمان ہیں۔ پھر چلے جائیں گے اور میں چاہتا ہوں آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جائے دوسرے ایک چھوٹی سی غرض بھی تھی میرا ارادہ تو گزشتہ رات ہی آپ کو یہ سب کچھ بتلانے کا تھا، مگر رات آپ تھکے ہوئے تھے اس لیے میں نے زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔ اب جو کچھ میں کہنے لگا ہوں آپ امجد بھائی کو بتا کر مشورہ کرلیں اور پھر مجھے دوپہر کے کھانے تک جواب دے دینا۔“

”ملک صاحب!......آپ حکم کریں ہمارے بس میں جو کچھ ہوا ہم ضرور کریں گے۔“

”لزا کو آپ صرف اسی کام کے سلسلے میں ہی لائے تھے نا؟ جس کا مشورہ میں نے دیا تھا۔“

”جی ہاں۔“ میں نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

”اگر میں کہوں کہ لزا کو آپ اس مقصد کے لیے استعمال نہ کریں تو کیا آپ میری بات مان لیں گے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مگر اس کا نعم البدل کیا ہوگا...... ہمارے پاس آج کا دن ہے اور اتنے قلیل عرصے میں ہم کوئی ایسی لڑکی نہیں ڈھونڈ سکتے جو ہمارے ساتھ لزا کی طرح مخلص ہو۔“

لزا کے متعلق اس کی دلچسپی کل سے صاف نظر آرہی تھی اور اس کے تمہید باندھنے سے ہی مجھے انداز ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ مگر میں اس کے منہ سے یہ سب کچھ سننا چاہ رہا تھا۔

”ضروری تو نہیں کہ اس کے لیے کوئی لڑکی استعمال کی جائے۔ لڑکی کے بغیر بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔“

”کیسے؟......یہی تو میں جاننا چاہ رہا ہوں“ میں نے اس کی بات میں دلچسپی لی۔

”کل شادی میں شرکت کی غرض سے چودھری لاز ماً جائے گا اور شادی کا ہنگامہ رات گئے ہی ختم ہوگا۔ دوسرے چودھری کا کھانا شادی والے گھر میں ہی ہوگا کیونکہ مجھے اور میرے آدمیوں کو بھی کھانے کا دعوت نامہ ملا ہوا ہے۔ کل شام کو جب چودھری شادی کی تقریب میں الجھا ہوگا اگر ہم گاڑی میں کھانا لے کر چودھری کے گھر جائیں اور اس کے گھر میں موجود محافظوں کو یہ تاثر دیں کہ یہ کھانا شادی کے گھر سے آیا ہے اور اس دوران ان محافظوں کی نظر بچا کر آپ دونوں وہیں چھپ جاؤ تو کیسا رہے گا؟“

اس کا منصوبہ سن کر میں حقیقتاً خوشی سے اچھل پڑا......

''اگر یوں ہو جائے تو کیا کہنے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ میری تجویز سے متفق ہیں۔'' وہ جیسے خوشی سے کھل اٹھا۔

''بالکل......اس سے اچھی تجویز ہو ہی نہیں سکتی۔''

''یعنی لزا اس منصوبے سے خارج ہو گئی، اب اس کا کیا کرو گے؟'' اس نے لزا کے متعلق میری رائے جاننی چاہی۔ مگر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں میں اس کی بات لوٹائی۔

''آپ ہی بتائیں اس کا کیا کرنا چاہیے؟۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ''عمر بھائی حقیقت یہ ہے کہ لزا مجھے پسند آ گئی ہے اور میں مستقل اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں اور یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا کہ میں کتنی آسانی سے اس کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہوں۔''

''ملک صاحب آپ کی بات بجا سہی مگر اس کا فیصلہ تو لزا خود کر سکتی ہے کہ آیا وہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہے یا نہیں رہنا چاہتی۔''

''اگر آپ مہربانی کریں تو اس سے یہ سب کچھ پوچھ کر مجھے بتلا سکتے ہیں کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا۔ دوسرے آپ اسے میرے ساتھ رہنے کے فوائد بھی صحیح طریقے سے سمجھا سکتے ہیں۔''

''اتنا تو خیر ہم کر دیں گے اور شاید وہ مان بھی جائے۔ مگر آپ کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ ایک تو وہ نشے کی عادی ہے دوسرے اس کا ماضی بھی کوئی اتنا صاف نہیں ہے۔ آگے آپ کی مرضی۔''

''مجھے وہ اپنی ہر خامی سمیت قبول ہے۔''

''جیسے تمھاری مرضی......لزا کو جاگنے دو ہم اس سے بات کر لیتے ہیں۔''

''امجد سے تو مشورہ کر لو۔''

''اسے چھوڑیں آپ۔''

''چلو پھر لزا کے پاس چلتے ہیں شاید وہ جاگ گئی ہو۔'' جانان خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''نہیں فی الحال آپ رہنے دیں ہم اکیلے میں اس سے بات کر لیتے ہیں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے لیکن مجھے اس کے فیصلے سے جلدی آگاہ کرنا۔'' اور میں سر ہلاتا امجد کو ساتھ لیے باہر آ گیا۔

''یہ کیا آپ لوگ مسلسل لزا کے پیچھے پڑے تھے۔'' کمرے سے نکل کر امجد مستفسر ہوا اور میں ہنستے ہوئے بولا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

''کیا مطلب؟'' امجد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا اور میں نے مختصراً اسے جانان خان سے ہونے والی گفتگو بتا دی۔

"ہاں یہ تجویز ٹھیک ہے۔" وہ بھی جانان خان کے منصوبے سے متفق ہو گیا۔" کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر ہمارے ضمیر پر تو کوئی بوجھ نہیں پڑے گا ناں؟"

اور لزا کو جانان خان کے حوالے کر دینے کے بارے تیری کیا رائے ہے۔"

"اس بات کو لزا کی مرضی پر چھوڑ دو...... ہم نے کوئی ٹھیکہ نہیں لیا بچھڑے ہوؤں کو ملانے کا۔" اس دوران ہم لزا کے کمرے کے قریب پہنچ چکے تھے یوں تو جانان خان کی آرام گاہ سے اس کمرے کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا مگر ہم نہایت سُست روی سے چلتے ہوئے وہاں پہنچے تھے اس لیے میں نے امجد کو تمام تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے مستقبل کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹا کر ہم اندر داخل ہو گئے امجد مجھ سے ایک قدم پیچھے تھا وہ تکیہ موڑ کر کمرے کے پیچھے رکھے دونوں ہاتھ گردن سے لپیٹے جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کر میری جانب بڑھی۔

"جان تم کہاں تھے۔ دیکھو کتنی دیر سے تیری منتظر ہوں؟"

اس کی پیش قدمی سے ہی مجھے اس کے ارادے کا پتا چل گیا اور حفظ ما تقدم کے طور پر میں نے جلدی سے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا۔ میری اس حرکت پر ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہوا مگر پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"رات کیسی گزری۔" میں نے نارمل لہجے میں پوچھا۔

"بہت اچھی گزرتی اگر آپ میرے ساتھ ہی رہتے۔" اس نے اپنا ہاتھ امجد کی طرف مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

میں اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔" بیٹھو تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"بولو۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"لزا ہم تمھیں جس مقصد کے لیے لائے تھے وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب آپ ہماری طرف سے فارغ ہیں اگر جانا چاہتی ہیں تو جا سکتی ہیں۔ البتہ جس بندے کی یہ حویلی ہے اس کی خواہش ہے کہ آپ اس کے ساتھ ہی رہیں وہ آپ کی تمام ضروریات کو پورا کرتا رہے گا۔ ہم دونوں تو چونکہ خود اس کے مہمان ہیں اور شاید کل پرسوں تک یہاں سے چلے جائیں اس لیے آپ سے الوداع ہونے آئے ہیں۔ اگر ہمارے لائق کوئی خدمت ہو یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ بے تکلف بتا سکتی ہیں۔"

"حویلی کا مالک کون ہے؟"

"وہی...... جس نے کل ہمارے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا تھا۔"

"آپ لوگوں نے کہاں جانا ہے...... اور اگر میں آپ کے ساتھ جانا چاہوں تو......؟"

''بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ہم دشمن دار لوگ ہیں اور ہمارے ساتھ رہنے سے آپ کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

''مجھے پتا ہے آپ مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ مایوسی سے بولی۔''بہر حال میں کچھ عرصہ تک یہیں رہنا چاہوں گی اگر اس کا رویہ میرے ساتھ اچھا رہا تو ٹھیک ہے ورنہ یہ زمین کافی وسیع ہے۔''

''او کے پھر ہمیں اجازت دو۔'' میں کھڑا ہو گیا۔''ہم نے اب کسی کام سے جانا ہے۔'' امجد نے بھی میری تقلید کی تھی اس کے تاثرات اس بات کے غماز تھے کہ وہ میری باتوں سے متفق ہے۔

لزا نے بے دلی سے ہمیں الوداع کہا وہ ہمارے انداز کو دیکھتے ہوئے سمجھ گئی تھی کہ ہم اس سے جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔

وہاں سے ہم سیدھے جانان خان کے پاس پہنچے جو بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ اسے لزا کے اثبات کی خوش خبری سنا کر ہم اپنے کمرے میں آگئے اور اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے لگے۔

+ + +

سرخ رنگ کی ڈبل ڈور درمیانی رفتار سے چودھری اکبر کے مکان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جاگیر دار ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ شمع گل بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور امجد نے چہروں پر ڈھاٹے لپیٹے گاڑی کے کیبن بیٹھے تھے۔ جبکہ عقبی حصے میں بھی دو ملازم سوار تھے ان کے ساتھ روٹیوں کا چھابہ اور تین دیگچے بھی پڑے ہوئے تھے چھابے پر بڑی سی چادر پڑی ہوئی تھی تاکہ روٹیاں گرد آلود نہ ہوں۔ تینوں دیگچوں میں نمکین ،میٹھے چاول اور دنبے کا روسٹ گوشت موجود تھا اور یہی مینو آج شادی والے گھر میں مہمانوں کو پیش کیا جانا تھا۔

گزشتہ رات ہم اکٹھے بیٹھ کر اس منصوبے پر تفصیلاً بحث کر چکے تھے۔ اس لیے ہر آدمی کو اپنا کام ازبر تھا۔

گاڑی چودھری کی حویلی کے سامنے رک گئی فرنٹ سیٹ پر جاگیر دار کے ساتھ بیٹھے ہوئے شمع گل نے گاڑی سے باہر آ کر گیٹ کھٹکھٹانے کے لیے قدم بڑھائے مگر اس سے پہلے دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی اور ایک پہلوان نما شخص برآمد ہوا اسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی موصوف تھا کہ جس وقت سب سے پہلے چودھری اکبر سے میری ہاتھا پائی ہوئی تھی تو یہ اس کے ساتھ موجود تھا اس کے علاوہ ایک اور پہلوان بھی اس وقت چودھری کے ساتھ تھا اور ان دونوں کو میں نے مار مار کر لمبا کر دیا تھا اور اسی خدشے سے کہ ان کا سامنا نہ ہو جائے میں نے اور امجد نے اپنے چہروں کے گرد کپڑے لپیٹے ہوئے تھے۔

پروگرام کے مطابق شمع گل اس سے مستفسر ہوا۔

''گھر میں کتنے آدمی موجود ہو۔ ہم کھانا لے کر آئے ہیں۔''

پہلوان نے حیرانی سے پوچھا۔''کہاں سے؟''

''امجد خان کے گھر سے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ جو لوگ بارات میں کسی مجبوری کے باعث شرکت نہیں کر سکے ہیں ان کے گھروں تک کھانا پہنچایا جائے۔ اب جلدی سے بتاؤ کہ یہاں کتنے افراد ہیں ہم نے اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔''

"یہاں تو ہم دو آدمی موجود ہیں۔"

"دوسرا کدھر ہے۔" شمع خان کے اچانک سوال پہ پہلوان بے ساختہ بولا۔

"وہ پچھلے مورچے میں کھڑا ہے۔"

"اچھا آپ برتن لے آئیں۔ لیکن خیال رہے میٹھے چاول، نمکین چاول اور روسٹ کے لیے علیحدہ علیحدہ برتن لانے ہیں۔"

پہلوان سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گیا، تھوڑی دیر بعد ہی وہ تین مختلف برتن اور روٹیوں کے چھابے کے ساتھ لوٹ آیا۔ گاڑی میں پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے جلدی جلدی اس کے برتن چاولوں اور روسٹ وغیرہ سے بھر دیئے۔

شمع گل ان دونوں ملازموں سے بولا۔ "یہ کھانا بھائی صاحب کے ساتھ گھر کے اندر تک چھوڑ آؤ کیونکہ تمام برتن اکیلے لے جانا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

اور چونکہ یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا اس لیے وہ بغیر کسی حجت کے "جی اچھا" کہہ کر گاڑی سے اترے اور پہلوان کے ساتھ چل پڑے۔ پہلوان رسماً بھی انکار نہ کر سکا۔ ان کے حویلی میں داخل ہوتے ہی ہم دونوں پھرتی سے گاڑی سے باہر آئے اور جاگیر دار کی سمت الوداعی ہاتھ ہلا کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ حویلی کے اندر گھس کر ہم نے سامنے نگاہ دوڑائی پہلوان ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف بڑھتا دکھائی دیا جو لازماً ان کا کچن تھا۔ اگر ہم دوڑ کر اصل عمارت میں چھپنے کی کوشش کرتے تب بھی عمارت تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ پہلوان کچن کے دروازے تک پہنچنے والا تھا اور اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دوڑنے سے ہمارے پاؤں سے ہونے والی آہٹ سن کر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا اور ہمارا سارا پلان فیل ہو جاتا اور ہمارے وہاں چھپنے کے لیے کوئی گنجائش بھی باقی نہ رہتی۔ ہم بجلی کی سی سرعت سے ایک فیصلے پر پہنچے اور گیٹ کے ساتھ موجود چھوٹے سے کمرے میں گھس گئے۔ یہ کمرہ چوکیدار کے لیے بنایا گیا تھا لیکن عام کمرے کے برعکس یہ اونچا تھا اس کے دو پورشن اوپر نیچے بنائے گئے تھے گویا اندر سے یہ دو منزلہ تھا۔ اوپر والے پورشن پر چڑھنے کے لیے لکڑی کی ایک سیڑھی لگائی گئی تھی۔ نیچے ایک چارپائی پڑی تھی جس پہ کھجور کے پتوں سے بنی ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ایک میلی سی چادر بھی پڑی ہوئی تھی۔ اس مختصر سے کمرے میں ہمیں کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں ہم کمرے میں گھسنے والے کسی شخص کی نگاہ سے چھپ سکتے۔ اوپر والا پورشن بھی اس لحاظ سے موزوں نہیں تھا۔ کمرے میں گھسنے والے نے لازماً ڈیوٹی کے لیے اوپر چڑھنا تھا۔ لے دے کے دروازے کے کواڑ تھے جن کے پیچھے خود کو چھپانے کی کوشش کی جاسکتی تھی مگر وہ کوشش بھی اس صورت میں کامیاب ہوتی کہ کمرے میں داخل ہونے والا بغیر دائیں بائیں غور کیے دوسری منزل پر چڑھ جاتا۔ اگر چارپائی کے اوپر ایسی چادر بچھی ہوتی جس کی وجہ سے کمرے میں داخل ہونے والے کو اس کے نیچے چھپا ہوا بندہ نظر نہ آسکتا تو وہ ایک بہترین جگہ تھی لیکن بدقسمتی سے اس کے اوپر چٹائی بچھی تھی اور اس کے نیچے چھپنے والا بغیر کسی تردد کے نظر آسکتا تھا۔

میں نے دروازے کی درز سے جھانکا جانان خان کے دونوں ملازم پہلوان سے الوداعی مصافحہ کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ ان کے دروازے سے باہر نکلنے تک پہلوان صحن میں کھڑا رہا۔ اس کے بعد یقینی طور پر اس نے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا، گو اس پر قابو پانا ہمارے لیے

کوئی مشکل نہیں تھا مگر اس صورت میں ہمارا پلان فیل ہو جاتا اور چودھری اپنے ملازموں کی غیر موجودی سے بدک بھی سکتا تھا۔

لیکن اس دن شاید ہماری قسمت عروج پر تھی کہ جیسے ہی گاڑی کے سٹارٹ ہو کر چلنے کی آواز آئی پہلوان نے گیٹ میں موجود کھڑکی کی کنڈی اندر سے لگائی اور عمارت کے پچھواڑے کی جانب چل پڑا۔

وہ جیسے ہی میری نگاہ سے اوجھل ہوا میں نے آہستگی سے دروازے کا کواڑ کھول کر باہر جھانکا وہ حویلی کی پشت کی جانب مڑتا دکھائی دیا، میرے اندازے میں وہ اپنے ساتھی کو کھانے کی اطلاع دینے جا رہا تھا۔ یہ چند لمحے ہمارے لیے غنیمت تھے ورنہ بعد میں ہم چوہے کی طرح اس کمرے میں پھنس جاتے۔

''امجد چلو۔'' اس کے عمارت کے پیچھے غائب ہوتے ہی میں نے تیز لہجے میں کہا اور ہم دونوں تیزی سے اندرونی عمارت کی طرف بڑھے۔ ہماری حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ ہمارے پاؤں کی آواز نہ نکلے اور ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہے۔ ہم اندرونی عمارت کے قریب پہنچنے والے تھے کہ میرے کانوں میں پہلوان کی آواز آئی جو ساتھی کو کھانے کے لیے بلا رہا تھا۔ اس نے شاید مورچے کے اوپر چڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ اس کی زوردار آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی حویلی کا طرز تعمیر مقامی تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ عبور کر کے ہم اندر داخل ہوئے، ایک مختصر سی گیلری تھی جس کے دونوں جانب اور سامنے کی طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ ان کے سامنے والے کمروں کے ساتھ ملحق اور بھی بہت سارے کمرے موجود ہوں گے کیونکہ مقامی لوگ کمرہ در کمرہ تعمیر کے عادی تھے۔ اس کی وجہ شاید اس سردی کی شدت کو کم کرنا ہو جو اس علاقے میں ریکارڈ پڑتی ہے۔

''اس منحوس کا کمرہ کون سا ہو سکتا ہے؟'' امجد نے برآمدے کے مین دروازے کے کواڑ بند کر دیئے۔

''جو کمرہ سب سے زیادہ پُرتعیش اور سجا ہوا ہو گا وہی اس کا ہو گا...... آخر چودھری ہے''۔ میں جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر آگے بڑھ گیا۔ گو جس وقت ہم اندر داخل ہوئے تھے اس وقت ابھی تک سورج غروب نہیں ہوا تھا مگر عمارت کے اندر روشنی کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں کیا گیا تھا اس لیے گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ برآمدے کے مین دروازے کے ساتھ دو کھڑکیاں موجود تھیں جو بند تھیں ان کو کھولنے سے گیلری میں خاطر خواہ روشنی پھیل سکتی تھی مگر ہم اس قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

تھوڑی دیر اندرونی عمارت میں گھومنے کے بعد ہی ہم نے چودھری کی خواب گاہ تلاش کر لی تھی لکڑی کا جہازی سائز بیڈ اور فرش پر بچھا ہوا ایرانی قالین دیکھتے ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ چودھری کی خواب گاہ تھی۔ وہاں چھپنے کے لیے سب سے بہترین جگہ بیڈ لگا، ہم اس کے نیچے گھس کر آرام سے لیٹ گئے تھے۔

''یہاں تک تو ڈن ہو گیا اب آگے کیا کرنا ہے؟'' امجد چارپائی کے نیچے لیٹتے ہی بولا۔

''ماجے اس کتے کے ساتھ جتنے بندے موجود ہیں یہ رحمٰن خیل کے ہیں اور میرے گھر کو جلانے میں یہ بھی برابر کے شریک ہیں۔ چودھری کو گرفتار کرنے کے بعد ان میں سے ایک بھی نہیں بچنا چاہیے''۔

''میر خیال ہے ایک ادھ ہی پہرہ دیتا ہوگا باقی سوجاتے ہوں گے، کیونکہ چودھری کو یہاں کسی سے خطرہ نہیں ہے۔''

''کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی...... ہوسکتا ہے تمام سوجاتے ہوں یہ بھی ممکن ہے تین چار آدمی بیک وقت جاگتے ہوں۔''

''ایک دفعہ چودھری پر قابو پالیں پھر دیکھا جائے گا۔'' امجد نے کہا اور ہم دونوں نے خاموشی سادھ لی۔ وقت تھم سا گیا تھا۔ سکینڈوں والی سوائی کی حرکت بھی اتنی سُست ہوگئی تھی گویا کوئی چیز اسے حرکت سے روک رہی ہو۔ میرا دماغ اس وقت عجیب وغریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ وقت قریب آگیا تھا جس کا میں کافی عرصے سے منتظر تھا اپنے پیاروں کی صورتیں میری میری نگاہوں میں گھومنے لگیں، سعدیہ، عدنان، امی ابو، حاکم، احمد، محمد جان، بھابی بھتیجے تمام کے ہنستے مسکراتے چہرے میری آنکھوں میں پانی بھرتے گئے میں ان میں کسی کو بھی چودھری کے ظلم سے نہیں بچاسکا تھا، لیکن چودھری کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر کے میں اپنے دکھتے ہوئے زخموں پر مرہم رکھ سکتا تھا۔

ہمیں اس بیڈ کے نیچے، بہت سا وقت گزارنا پڑا وہ رات میری زندگی کی طویل ترین رات تھی اور پھر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں چودھری کے کمرے سے باہر ہمیں بہت سے بندوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں ہم نے بے ساختہ چھو کر ایک دوسرے کے جاگنے کو یقینی بنایا۔

دروازہ کھلا اور چودھری کی منحوس آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''شادی خان...... کرم شاہ کو بولو جرنیٹر جلدی آن کرے۔''

''جی چودھری صاحب۔'' ایک دوسرے بندے کی آواز آئی مگر اس کے جانے سے پہلے جرنیٹر سٹارٹ ہونے کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور کمرے میں ٹیوب لائیٹ کی دودھیا روشنی پھیل گئی۔ چارپائی کے نیچے سے مجھے چودھری کے جوتے نظر آرہے تھے۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''تم لوگ آرام کرو صبح جنگل خیل مال لے کر جانا ہے۔ شادی خان۔ کرم شاہ اور میر علی تینوں صبح سویرے نکل جانا۔ مجھے جگانے کی ضرورت نہیں۔''

''کتنا مال لے جائیں؟'' شادی خان مستفسر ہوا۔

''ان کی ڈیمانڈ کتنی تھی؟''

''دس کلو''

''15 کلو لے جانا۔ شاید زیادہ ضرورت پڑ جائے۔''

''ٹھیک ہے چودھری صاحب۔'' اس مرتبہ بھی شادی خان بولا شاید وہ کوئی منشی ٹائپ چیز تھا۔ ''اور کچھ؟''

''نہیں شکریہ۔ آپ لوگ آرام کریں۔'' اور تمام بندے سلام کہتے ہوئے چودھری کے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد چند لمحے چودھری اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔

اس دوران ہم چپ چاپ خاموشی سے لیٹے رہے۔ یوں بھی اس قسم کی سچوئیشن میں ہم بغیر بولے ایک دوسرے کے ارادے کو سمجھ لیتے تھے۔ باتھ روم سے باہر آ کر وہ بیڈ کے نزدیک آیا اور جھک کر کوئی چیز اٹھانے لگا اور پھر ہلکی سے کھنکھناہٹ سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چابیاں تھیں۔ چابیاں اٹھا کر وہ مڑا اس کے قدم مجھے بیڈ کی پائنتی کی طرف بڑھتے نظر آئے میں نے بیڈ کے نیچے سے سر نکال کر دیکھا وہ دیوار کے ساتھ لٹکی ایک بڑی سی تصویر کو اتار کر نیچے رکھ رہا تھا۔ تصویر کے پیچھے ایک سیف کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح کا سیف میں نے بکنگ کلرک کے گھر بھی دیکھا تھا جو بعد میں میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ میں چارپائی کے نیچے سے نکل آیا، امجد نے بھی میری تقلید کی تھی، چودھری سیف کا دروازہ کھول کر اس میں منہمک تھا۔

''چودھری!'' میں نے آہستہ سے پکارا۔

وہ بدک کر پیچھے مڑا۔ ''ت......تت......تم......تم......عم......عمر۔'' اس آنکھیں حیرت وخوف کے ملے جلے تاثرات سے پھیل گئیں تھیں۔

''بڑی تیز یادداشت ہے چودھری......میں تو سمجھ رہا تھا تُو مجھے بھول گیا ہوگا؟''

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے چور نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا مگر اس کے دیکھنے سے پہلے امجد آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف چل پڑا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے کیا کرنا تھا۔

''عمر جان۔ مم میں تیرے ساتھ سس سودا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پیسے لے لو۔'' اس نے سیف کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے علاوہ میرے اکاؤنٹ میں کافی رقم موجود ہے۔ تمام تمھارے حوالے کر دوں گا۔''

''چودھری رقم تو نہیں البتہ دوسری شرط پر سودا ہو سکتا ہے۔''

''کک......کون سی۔'' وہ ہکلایا۔ ''مجھے تیری تمام شرائط منظور ہیں۔''

''بڑی آسان سی شرط ہے......میرے گھر والے واپس کرو۔''

''عمر جان کک کوئی مم ممکن شرط بتلاؤ۔''

''بتا دوں گا۔'' میں سرد لہجے میں بولا اور دوسرے لمحے میرا بایاں مکہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پہ لگا وہ اچھل کر سیف کے دروازے سے ٹکراتے ہوئے نیچے گر پڑا۔ اس کے منہ سے ایک بلند کراہ خارج ہوئی تھی مگر اس کے بعد وہ بے حس وحرکت ہو گیا۔

''ماجے!......اسے باندھنے کے لیے کوئی رسی دیکھو۔'' میں اس کے متعلق کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے امید تھی کہ وہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے بیہوش ہو گیا تھا۔

''سلنگ سے باندھ لیتے ہیں۔'' وہ اپنی کلاش کوف سے سلنگ نکالنے لگا۔

''نہیں بستر کی چادر سے پٹیاں پھاڑ لو۔'' اور وہ سر ہلاتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ بیڈ کی چادر سے اس نے خنجر کی مدد سے دو پٹیاں

لمبائی کے رخ پھاڑیں اوران سے چودھری کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے۔

''اس کے منہ پر بھی پٹی باندھ دو۔'' میں نے چادر سے مزید ایک پٹی پھاڑ کر امجد کی جانب بڑھائی، اس نے سر ہلاتے ہوئے پٹی لے کراس کے منہ پر باندھ دی۔

''تم اس کا خیال رکھو۔ میں ذرا باہر والے سورماؤں سے نمٹ لوں۔''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' یہ ادھر محفوظ ہے دونوں چلتے ہیں۔ تیرا اکیلا جانا مناسب نہیں۔ البتہ اسے بیڈ کے نیچے چھپا دیتے ہیں۔''

اس نے چودھری کو بیڈ کے نیچے گھسیٹر دیا۔ ایک لمحے کے لیے سوچ کر میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کنڈی کھول کر میں نے آہستہ سے باہر جھانکا، کوئی بھی نظر نہ آیا دوسرے کمرے کو عبور کر کے ہم گیلری میں آگئے گیلری خالی پڑی تھی اوراس میں ایک ٹیوب لائیٹ جل رہی تھی۔ برآمدے والا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں اس لیے ہمارے باہر سے دیکھے جانے کا خطرہ موجود نہیں تھا البتہ گیلری کے ساتھ موجود کمروں سے کوئی باہر جھانکتا تو ہم آسانی سے نظر آجاتے۔

''پہلے کمرے یا باہر۔'' امجد دھیمی آواز میں مستفسر ہوا۔

''تم کمرے سنبھالو......میں باہر جاتا ہوں۔''

''اس سے بہتر یہ ہوگا کہ تم برآمدے کے دروازے کے ساتھ چھپ کر مجھے پروٹیکشن مہیا کرواور میں کوشش کرتا ہوں کہ بغیر شور شرابے کے انھیں مردار کردوں، لیکن اس کے برعکس ہونے کی صورت میں تم اندر باہر دونوں سائیڈوں کو باآسانی کور کرلو گے۔''

مجھے اس کی تجویز مناسب لگی اور میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے برآمدے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

دروازے کے ساتھ میں اس طرح چھپ کر کھڑا ہوگیا کہ اندر باہر دونوں طرف نظر ڈال سکوں، امجد نے میری پوزیشن دیکھ کر اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا اور دبے قدموں نزدیکی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر آہستہ سے دباؤ ڈال کراس نے میری جانب دروازے کے بند ہونے کا اشارہ کیا اور دستک دینے کی اجازت مانگی۔

میں اثبات میں سر ہلانے ہی والا تھا کہ بجلی کی سی سرعت سے ایک سوچ میرے دماغ میں ابھری اور میں نے اشارے سے اسے روک کراس کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ بھی میری طرف چل پڑا۔

''کیا بات ہے؟''

''اندر سے کچھ پوچھا گیا تو تمھارے لیے پشتو میں جواب دینا مشکل ہوگا اس لیے تم میری جگہ چلے جاؤ اور یہ کام مجھ پہ چھوڑ دو۔''

امجد سر ہلاتا ہوا برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پوزیشن میں ہوتے ہی میں نے دروازے کو ہلکے سے کھٹکھٹایا۔

''سہ چل دے ھلکہ؟'' (کیا بات ہے لڑکے) کمرے میں موجود آدمی نے چارپائی سے اٹھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی (پشتو میں

ھلک لڑکے کو کہتے ہیں مگر اکثر لوگ اسے بطور تکیہ کلام بھی استعمال کرتے ہیں اور ایسے آدمی بعض دفعہ تو اپنے سے بڑی عمر والے کو بھی لڑکا کہہ دیتے ہیں۔اس وقت بھی کمرے میں موجود آدمی نے اسی معنی میں مجھے لڑکا کہا تھا)

''ورخو کولاؤ کہ''(دروازہ تو کھولو) میں نے اپنی آواز پہلوان کی طرح بھاری اور کرخت بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں مجھے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی،خوش قسمتی سے اندر موجود آدمی بغیر میری آواز پر توجہ دیئے کسی اور سے مخاطب ہوا۔

''ھلکہ نورتاج ورکولاؤ کہ''(اولڑکے نورتاج اٹھو دروازہ کھولو)

''اس کا مطلب ہے کمرے میں کم از کم دو آدمی تو لازماً موجود ہیں۔''میرے دماغ میں سوچ ابھری مگر مزید کچھ سوچنے سے پہلے دروازے کے اندرونی جانب پاؤں کی آہٹ ابھری اور میں ہمہ تن گوش دروازے کی جانب متوجہ ہوگیا۔کنڈی کھلنے کی آواز سنتے ہی میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا تاکہ دروازہ کھلتے ہی اس کی نظر مجھ پہ نہ پڑے اور میری تدبیر کارگر رہی دروازہ کھولنے والے کو جب کوئی سامنے نظر نہ آیا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلا میں اس کے استقبال کے لیے تیار تھا،کلاشن کوف میں نے دیوار کے ساتھ کھڑی کردی تھی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ حتی الوسع فائر کی نوبت نہ آئے۔

وہ قریباً میرا ہم عمر ہی تھا مجھے دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھلا مگر چیل کی طرح اس پہ جھپٹتے ہوئے میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر اس طرح رکھا کہ اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ گئی دوسرا بازو اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے میں نے بھرپور جھٹکا دیا اور کھٹک کی آواز سے اس کا منکا ٹوٹ گیا۔اس کے تڑپتے جسم کو آہستہ سے زمین پر لٹا کر میں تیزی سے کمرے میں گھس گیا اندر ہلکی پاور کا بلب روشن تھا۔اس روشنی میں ایک بندہ ہلکی چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹا نظر آیا دوسری چارپائی خالی پڑی تھی،اس پہ سونے والا ہمیشہ کے لیے سو گیا تھا۔

میں نے سونے والے کی چادر کھینچ کر اتاری۔

''کک......کیا......ہے۔''وہ گڑبڑاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''بات یہ ہے مسٹر کہ عمر جان گنڈہ پور ولد ہاشم جان گنڈہ پور اپنا بدلہ لینے پہنچ گیا ہے۔''اسے سفرِ آخرت پر روانہ کرنے سے پہلے میں نے اسے اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھا۔

''عم......مر......تت تم......مم میں...... یہاں'' اس سے کوئی بات نہ بن پڑی۔مگر میرے پاس اس سے ڈائیلاگ بازی کا ٹائم نہیں تھا اور اس کی گردن توڑتے ہوئے اسے بھی میں نے ساتھی کے پاس پہنچا دیا۔گیلری میں پڑے بندے کو اندر گھسیٹ کر میں دروازے کو بند کر کے باہر نکل آیا۔

دیوار کے ساتھ کھڑی کلاشن کوف اٹھا کر میں نے امجد کو دو انگلیاں کھڑی کر کے بتلا دیا کہ کمرے میں صرف دو آدمی تھے۔اگلا دروازہ مجھے کھلا ہوا ملا۔کواڑ کو آہستہ سے دھکیلتے ہوئے میں نے اندر جھانکا مگر اندر گھپ اندھیرا تھا۔جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر جلائی تو اس کی باریک روشنی میں مجھے کمرہ خالی نظر آیا۔اس کے بعد والا کمرہ بھی مجھے خالی ملا اس کمرے کے اندر دو مزید اندرونی کمرے بنے ہوئے تھے۔

اندرونی کمرے میں چار پائیوں پر بستر ے تو بچھے ہوئے تھے مگر سونے والا کوئی نہیں تھا۔اب گیلری کی اس لائن میں آخری کمرہ رہ گیا تھا۔البتہ مخالف سمت کے کمرے میں اب تک نہیں دیکھ سکا تھا۔

آخری کمرے میں جھانکنے پر بھی مجھے خالی کمرہ ہی نظر آیا البتہ اس کمرے کے ساتھ موجود اندرونی کمرے میں مجھے بند دروازے کی درزوں سے روشنی نکلتی ہوئی نظر آئی ۔ میں دبے قدموں اس جانب بڑھ گیا۔دروازے کی کھلی درزوں سے جھانکنے پر اندر چار آدمی تاش کے پتے پکڑے خاموشی سے اس میں منہمک نظر آئے۔ان کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ جوا کھیل رہے ہیں۔ورنہ گپ شپ کی گیم میں ان کے درمیان ہلڑ بازی مچی ہوتی۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دباؤ ڈالا اور یہ محسوس کرتے ہی کہ دروازہ کھلا ہے میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔اس خاموش ماحول میں دروازہ کھلنے کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ چاروں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

’’کون ہو تم؟‘‘ سوال پوچھنے والے کی آواز سے میں پہچان گیا۔وہ شادی خان تھا۔

’’نہیں پہچانا۔‘‘

’’تم عمر جان ہو نا؟‘‘ اس مرتبہ کرم شاہ پہلوان بولا۔

’’صحیح پہچانا......میں ہی وہ بدنصیب عمر جان ہوں جسے تم لوگوں کے ظلم نے کہیں کا نہ رکھا۔‘‘

’’مم مگر ہم نے کیا کیا ہے۔تیری دشمنی تو چودھری صاحب کے ساتھ تھی ہم تو اس کے ملازم ہیں۔‘‘ میرے لہجے میں ابلتے ہوئے غم و غصے کی شدت نے پہلوان کو لرزا دیا تھا۔

’’افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میرے پاس تمھیں تڑپا تڑپا کر مارنے کا ٹائم نہیں ہے۔ بہر حال تمھاری قسمت۔‘‘ یہ کہتے ہی میں نے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کر کے ٹریگر پریس کر دیا۔’’تڑتڑ‘‘ کی آواز میں ان کی کربناک چیخیں گونجیں اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ میں چند لمحے وہیں پہ کھڑا ان کے تڑپنے کا نظارا کرتا رہا۔انھیں مارتے ہوئے مجھے عجیب سی تسکین محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے کسی سختی سے مطالبہ کرنے والے قرض خواہ کو میں نے اس کے قرض کی ادائی کر دی ہو۔میری محویت فائرنگ کی آواز سے ٹوٹی۔ میں جلدی سے باہر نکلا میرے اندازے کے مطابق فائر کرنے والا امجد تھا۔باہر نکلنے پر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

’’جانو صاحب دو تھے۔‘‘ میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا وہ آہستہ سے بولا۔

’’چھ کو میں نے بھی جہنم کا ٹکٹ پکڑا دیا ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے یہ اتنے ہی تھے مگر احتیاطاً میں صحن میں چکر لگا آتا ہوں تم بقایا کمرے دیکھ لو۔‘‘ امجد نے مشورہ دیا اور میں سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا جبکہ امجد کا رخ صحن کی طرف تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں چودھری کے بیڈ روم میں اکٹھے ہو گئے تھے امجد کا خیال درست نکلا کہ چودھری کے علاوہ اس گھر میں کوئی

نہیں بچا تھا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے۔'' امجد نے چودھری کو چارپائی کے نیچے سے گھسیٹا

''اسے ساتھ لے کر جانا ہے۔ میں اسے آسان موت کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے میری ذات کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ میں بھی اسے ایسا ہی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں یہ زندہ رہے مگر اس کی زندگی موت سے بدتر ہو۔ یہ موت مانگے مگر موت نہ ملے اور اس کی زندگی کی خوشیاں اور راحتیں میں چھین لوں اور یہ جیتی جاگتی حسرت بن جائے یہ......'' میں شاید کچھ اور بھی کہتا مگر امجد نے میری بات کاٹی......

''ٹھیک ہے جانو......اب چلو کیونکہ یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ یہ نہ ہو فائرنگ کی آواز اس کے کسی ہمدرد کو اس جانب متوجہ کر دے اور ہمارے لیے خواہ مخواہ ایک لاحاصل مشغلہ شروع ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے چلو۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

''اس رقم کا کیا کریں۔'' امجد نے سیف کے کھلے دروازے سے جھلکتی رقم کی طرف میری توجہ دلائی۔

''یہ بھی ساتھ لے چلتے ہیں......راستے میں کام آئے گی۔''

اور امجد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک تکیے کا کور اتار کر اس میں وہ ساری دولت بھر لی۔ اس کے علاوہ سونے کی کچھ اینٹیں بھی وہاں پڑی تھیں وہ سمیٹ کر امجد نے اسی تھیلے میں ڈال دیں۔

''یہ پکڑو میں اسے سنبھالتا ہوں۔'' اس نے تھیلا میری جانب بڑھایا۔

امجد نے چودھری کے سر کے بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باہر کے جانب چل پڑا۔ اس کی اس حرکت سے چودھری کے خلاف اس کے دل میں موجود نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

چودھری نے ہوش میں آ کر غوں غاں شروع کر دی مگر منہ پر پٹی بندھے ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ ہم دونوں بھی اس کی تکلیف پر توجہ دیے بغیر چلتے رہے بلکہ ہمارا تو مقصد ہی اسے اذیت دینا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں چھپر نما گیراج بنا ہوا تھا جس میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک ڈبل کیبن کی عقبی نشستوں کے درمیان چودھری کو پٹخ کے امجد خود بھی پیچھے ہی بیٹھ گیا تھا۔ میں نے سٹیرنگ سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ گیٹ پر پہنچ کر میں نے گاڑی روکی امجد نے گیٹ کھولا اور ہم ایک مرتبہ پھر چل پڑے۔

''جانان خان سے ملو گے؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''اس نے ہماری مدد کی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ راستے کے بارے میں بھی اس سے معلومات لینی ہیں، جس راستے سے ہم چل کر آئے ہیں اس راستے سے اس منحوس کو ساتھ لے جانا مشکل ہو گا، اس ڈھائی من کی لاش کو کون کندھوں پر اٹھائے گا۔ جبکہ افغانستان کے راستے سے ہم لاعلم ہیں البتہ جانان کو ضرور اس راستے کے بارے معلوم ہو گا۔''

"چلے گا تو خیر یہ اپنے پاؤں پر۔ البتہ تم افغانستان والے رستے کو بہتر سمجھتے ہو تو یونہی سہی۔" ہم جس وقت جانان خان کی حویلی میں پہنچے وہ جاگ رہا تھا کیونکہ اطلاع دینے والے ملازم کے ساتھ ہی وہ باہر آ گیا تھا اب وہ جاگنا ہماری وجہ سے تھا یا لزا کی قربت نے اسے سونے نہیں دیا تھا اس بات سے میں لاعلم تھا۔

"آپ لوگ اندر کیوں نہیں آ رہے......اور کیا بنا آپ کے کام کا؟" وہ ایک ہی سانس میں دو سوال کر گیا۔

"ملک صاحب ہم کامیاب ہوئے ہیں اور اس وقت ہم سفر کی تیاری میں ہیں ادھر رکنا ہم موزوں نہیں سمجھتے۔ آپ کے پاس آنے کا مقصد ایک تو آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ کے تعاون سے ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے۔ دوسرا ہمیں افغانستان کے راستے سے چودھری کو اپنے ساتھ لے جانا ہے اور راستے کے بارے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

"آپ لوگ اندر تو چلیں نا؟ کچھ چائے پانی ہو جائے۔ صبح چلے جانا ابھی تو یوں بھی صبح ہونے میں دو تین گھنٹے ہی باقی ہیں۔"

"شکریہ ملک صاحب۔ مگر ہم اندر جانے سے معذرت کریں گے۔"

"جیسے تمھاری مرضی......اور راستا اتنا مشکل نہیں ہے آپ لوگ جنگل خیل سے سیدھا آگے نکلو گے تو............" جانان خان نے راستے کے بارے میں مختصر الفاظ میں کافی کارآمد باتیں بتلا دیں۔ آخر میں بولا۔"عمر جان اگر تم یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھے کہہ سکتے ہو؟"

"بہت مہربانی ملک صاحب اب اجازت۔ یار زندہ صحبت باقی۔" میں نے معانقے کے لیے بازو پھیلا دیے، اس سے مل کر ہم گاڑی میں بیٹھے اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے۔ تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے ہم بمشکل صبح کی اذانوں کے ٹائم جنگل خیل پہنچ گئے۔ گاڑی کا رخ عبدالمجید کے گھر کی طرف موڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے آج کا دن سعدیہ کے ہاں گزاریں۔ ایک تو کچھ آرام کر لیں گے کہ آگے ہمیں بہت لمبا سفر درپیش ہوگا اس کے علاوہ دونوں سے الوداعی ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

امجد نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

دوسری دستک پر ہی عبدالمجید نے دروازہ کھول دیا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے خوابیدہ چہرے پر خوشی کی چمک لہرائی جو اس بات کا مظہر تھی کہ وہ ہمیں دل سے پسند کرتا تھا۔ ہم دونوں سے مل کر اس نے گاڑی کے لیے مکمل دروازہ کھول دیا۔ گاڑی صحن میں روک کر ہم نے چودھری کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور ایک خالی کمرے میں منتقل کر کے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ہماری باتوں کی آواز سے سعدیہ بھی جاگ گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"بھیا بڑی دیر لگا دی۔"

"ہاں گڑیا۔" میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔"مگر تیری دعا سے کامیاب ہوئے ہیں۔"

’’شکر ہے اللہ کا۔‘‘ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

’’اچھا تم فٹافٹ تگڑا سا ناشتا تیار کرو تا کہ ہم کھا پی کر آرام کرنے کے لیے لیٹیں۔ سخت تھکے ہوئے ہیں۔‘‘

’’ابھی لو بھائی۔‘‘ وہ سرعت سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک پُر تکلف ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں آرام کے لیے لیٹ گئے تھے مگر اس سے پہلے مجید کو چودھری کا خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہیں بھولے تھے۔

+ + +

’’بھیا، آپ لوگ کچھ دن رک نہیں سکتا۔‘‘ سعدیہ کی اردو سننے لائق تھی۔

امجد مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ’’نہیں بہن ہم نہیں رک سکتا۔ خو چہ امارا ادھر بوہت کام ہے۔‘‘

’’کچ دن تو رک سکتا ہے نا۔ پر چلا جانا۔‘‘ سعدیہ ملتجی لہجے میں بولی۔

’’نہیں کچ دن بی نہیں رک سکتا۔‘‘ امجد اسی کے انداز میں بولا۔

’’دیکھو سعدیہ بات یہ ہے کہ اگر ہم چند رک جائیں تو کیا ہوگا۔ کل نہیں تو پرسوں ہمیں لازماً جانا پڑے گا۔ تو ان چند دنوں کا کیا فائدہ۔ بچھڑنا جب مقدر میں ہو تو پھر کل کیا اور پرسوں کیا۔‘‘

میری بات سن کر اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ مجھے پتا چل گیا کہ خاموش رہ کر وہ اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ میں اسے خوش کرنے کی خاطر عبدالمجید سے بولا۔

’’مجید خان یوں کرو سعدیہ کو ابھی ابھی اپنے ماں باپ سے ملوانے لے جاؤ اور کوشش کرنا کہ واپسی پر انھیں اپنے ساتھ ہی لے آؤ۔‘‘

’’کک کیا مطلب ہے‘‘ وہ جیسے گہری حیرانی سے بولی۔ ’’مم میں کیسے امی ابو سے مل سکتی ہوں دشمنوں کے کانوں میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو میرے ساتھ مجید بھی جان سے جائے گا۔‘‘

’’ہم نے جاناں خان سے صلح کر لی ہے۔ وہی ہیبت خان اور اور باسمت خان کا وارث ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ اب وہ تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔‘‘

’’سچ بھیا؟‘‘ وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔

’’بالکل سچ......اور تمھارا گھر تو یہاں سے نزدیک ہی ہے نا؟‘‘

’’ہاں...... پیدل گھنٹا، پون گھنٹا لگ جائے گا۔‘‘

’’چلو پھر تم دونوں نکلو......اور شام تک واپس پہنچنے کی کوشش کرنا کیونکہ ہم آج یہاں سے شام کا کھانا کھا کر نکل چلیں گے۔‘‘

’’جی اچھا۔‘‘ کہہ کر وہ شاکی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے اور مجید خان کے گھر سے نکلتے ہی میں امجد سے بولا۔ ''چل بھئی ماجے چودھری کا انٹرویو کرلیں۔''

''اسی مقصد کے لیے تُو نے انھیں کہیں بھیجا ہے۔'' امجد مسکرا کر بولا۔

''ہاں......'' میں اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ ''مگر کہیں اور نہیں ان کے اپنے گھر۔''

''اچھا کیا یار...... کچھ اس کی دل بستگی کا سامان بھی ہوجائے گا۔'' امجد بولا اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی کنڈی اندر سے لگادی۔

ہم دونوں چودھری کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، اسے ہوش آچکا تھا۔

''اسے کھولو امجد!'' میرے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

امجد نے آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔ وہ دونوں کلائیوں کو مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''سناؤ چودھری کیا حال ہے۔'' میں موڑھا لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ مگر وہ خاموش رہا۔ میں نے موڑھے پر بیٹھے بیٹھے اپنی داہنی ٹانگ اس کے ماتھے پر رسید کی اس کا سر ایک دھماکے سے زمین سے ٹکرایا کمرے کا فرش کچا ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ چوٹ نہ آئی اور وہ کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے چودھری۔''

''عمر جان تم اچھا نہیں کر رہے۔'' یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ میں اس پہ چیل کی طرح جھپٹا اور لاتوں گھونسوں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔

''میں اچھا نہیں کر رہا ہوں سؤر کی اولاد...... کتے کے بچے......'' میرے منہ سے مغلظات کا لاوا ابل پڑا۔ چودھری زمین پر لڑھکنیاں لگا کر میری ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا جوابی کارروائی کی کوشش اس نے نہیں کی تھی۔ سر پر لگنے والی ایک ضرب سے وہ دیناو مافیہا سے بے خبر ہوگیا اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی امجد نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔

''بس کر جانو وہ بیہوش ہوچکا ہے۔''

میں چڑھی ہوئی سانسوں سے پیچھے ہٹ آیا۔ ''اسے دوبارہ باندھ دو ماجے کیونکہ یہ جتنی دیر میرے سامنے رہے گا میرا خود پر قابو نہیں رہے گا۔'' میں کمرے سے نکل آیا۔

امجد بھی چند منٹ بعد میرے پاس پہنچ گیا۔

''جانو تُو نے اس کے لیے حتمی طور پر کیا سوچا ہے؟''

اور میں اسے اپنے پروگرام کے بارے بتانے لگا۔ میری بات ختم ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی......

''میں تم سے سو فیصد متفق ہوں۔''

اس کے بعد میں نے اسے راستے کے بارے جانان خان سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کیا اور ہم راستے کے بارے

لائحہ عمل طے کرنے لگے۔ ہم کافی دیر وہیں بیٹھے رہے یہاں تک کہ سورج کی روشنی پیلی ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ سورج غائب ہو گیا۔ اندھیرا چھانے سے پہلے مجید خان اور سعدیہ واپس پہنچ گئے۔ سعدیہ کے چہرے پہ چھائے تاثرات اس کی بے پایاں خوشی کو ظاہر کر رہے تھے۔

''والدین کو ساتھ کیوں نہیں لائے ہو؟''

''وہ کل آئیں گے...... کیونکہ انھوں سامان وغیرہ سمیٹنا تھا''

''تم بھی آج کی رات ان کے پاس ٹھہر جاتیں۔''

'آج آپ نے یہاں سے جانا ہے نا...... وہ توان شاء اللہ اب ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔''

''اچھا اب تم کھانا پکا لو تا کہ ہم کھائیں اور نکلیں۔''

اور وہ ''جی اچھا'' کہتے ہوئے کچن کی جگہ کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے جاتے ہی مجید خان آہستہ سے بولا۔ ''عمر جان بھائی سعدیہ کے والدین کو ہم نے یہ بتایا ہے کہ ہم شادی کر چکے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں اسے تسلی دی۔ ''تم بس دن گنتے رہو جیسے ہی 4 مہینے اور 10 دن پورے ہوں چپکے سے دو گواہوں کی موجودی میں اس سے نکاح پڑھا لینا۔''

امجد نے کہا۔ ''جانو...... چودھری کی کمائی سے کچھ رقم انھیں بھی دے دو، نئی زندگی شروع کرنے میں مدد ملے گی غریبوں کو۔''

''جاؤ رقم کا تھیلا لے آؤ، آدھی رقم انھی کو دے دیتے ہیں...... ہم نے اتنی ساری رقم کا کیا کرنا ہے؟''

''عمر بھائی اس سے پہلے بھی آپ نے کافی رقم سعدیہ کو دی تھی جو اس نے میرے حوالے کر دی ہے اس کے علاوہ کچھ سونا بھی آپ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اتنا کچھ کافی ہے نا'' عبدالمجید احتجاجی لہجے میں بولا۔

''مجید خان یہ رقم ہم نے اپنے دشمن سے وصول کی ہے۔ اس لیے کہ اس نے ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ جانی بھی اور مالی بھی۔ بدلہ لینے کا حق ہم رکھتے ہیں تم چونکہ نئی زندگی شروع کر رہے ہو اور ہماری منہ بولی بہن کے شوہر بھی ہو تو ہمارا حق بنتا ہے کہ حتی الوسع تمھاری مدد کریں اور اس کے بعد اگر کبھی تنگی یا مالی مشکل محسوس کرو تو بے جھجک ہمارے پاس رحمٰن خیل آجانا۔ عمر جان گنڈہ پور کا نام کسی کے سامنے بھی لو گے وہ تمھیں مجھ تک پہنچا دے گا۔''

''آپ سے ملنے تو ان شاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔'' اس کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''خود اگر نہ بھی آنا چاہو ہماری بہن کو ضرور بھیج دینا۔''

''اس کے بغیر تو اب میں ادھورا ہوں۔'' عبدالمجید نے جھینپتے ہوئے کہا۔ اسی وقت امجد بھی رقم کا تھیلا لے آیا میں نے اس میں سے آدھی رقم اور سونے کی تمام اینٹیں عبدالمجید کے حوالے کر دیں۔

''ات...... اتنی زیادہ رقم۔ عم عمر جان بھائی۔'' وہ ہکلایا۔

"ہاں مجید خان...... بھائی اس سے بھی زیادہ بہنوں کے لیے کرتے ہیں۔" "اب جاؤ اس رقم کو کہیں سنبھال کر رکھ لو۔"

امجد نے پوچھا۔ "کس ٹائم نکلیں گے؟"

"بس کھانا کھاتے ہی نکلتے ہیں۔"

+ + +

کھانا کھانے کے بعد ہم نے چودھری کو گاڑی کی پچھلی نشستوں کے درمیان فرش پر لٹا کر اوپر سے کمبل ڈال کر اسے چھپا دیا۔ ہمارے کھانا کھانے کے دوران مجید نے چودھری کو بھی کھانا کھلا دیا تھا۔ ایک جذباتی مکالمے کے بعد ہم ان سے الوداع ہو کر نکل آئے سعدیہ بڑی مشکل سے ہم سے جدا ہوئی تھی وہ باری باری ہم دونوں سے لپٹ کر بڑی شدت سے روئی تھی اتنے مختصر ساتھ کے بعد اتنی جذباتیت کی وجہ ہمارے وہ احسان تھے جو ہم نے اس کی ذات پہ کیے تھے، اس کے علاوہ اس کا حقیقی بھائی بھی کوئی نہیں تھا جس کی وجہ سے ہماری جدائی اسے بہت شاق گزری تھی۔

"جانو کمینے تُو جہاں سے بھی رخصت ہوتا ہے اپنے پیچھے رونے والے چھوڑ جاتا ہے۔" امجد اپنی آنکھوں کے نم کو نے خشک کرتے ہوئے بولا۔

"میری قسمت ہی ایسی ہے ورنہ میں کب یوں چاہتا ہوں۔" اس چھوٹے سے مکالمے کے بعد گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ ہم نے ایک پٹرول پمپ پہ رک کر گاڑی کی ٹینکی فل کرائی اور تیل کا ایک کین فل کرا کے گاڑی کے پیچھے رکھ دیا تاکہ راستے میں ایندھن کی پرابلم نہ بنے۔ جنگل خیل بازار سے دو تین دن کا راشن اور پانی وغیرہ بھی میں نے گاڑی میں لوڈ کر لیا تھا۔ چودھری کی تلاش میں گھومتے ہوئے بھی ہم نے افغانستان کی سرحد عبور کر چکے تھے مگر اس وقت ہم بائی روڈ نہیں گئے تھے۔ جنگل خیل سے نکلتے ہی امجد بولا۔

"جانو!...... میں سو رہا ہوں تھک جانا تو مجھے اٹھا دینا۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اس نے ایک کمبل تہہ کر کے سر کے نیچے رکھا اور پچھلی نشست پر لیٹ گیا۔ جبکہ میں جانان خان اور عبدالمجید سے حاصل کی گئی معلومات کی روشنی میں اپنے راستے پر گامزن رہا اور پھر اگلے دو دن ہم انھی دشوار گزار راستوں پر باری باری ڈرائیونگ کرتے ہوئے محوِ سفر رہے۔

راستے میں دو تین دفعہ چند گھنٹوں کے لیے رک کر ہم اپنی معمول کی ضروریات بھی پوری کرتے رہے۔ تیسرے دن شام کو ہم خرلاچی کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے اس وقت اس چیک پوسٹ پر اتنی چیکنگ نہیں ہوتی تھی یوں بھی ڈیوٹی پر موجود محافظوں کو بخشش دیتے وقت ہم نے کنجوسی نہیں دکھائی تھی۔ انھوں نے ہمیں کوئی بڑا اسمگلر سمجھا تھا۔ خرلاچی سے ہم پارہ چنار بائی پاس کرتے ہوئے ٹل اور پھر وہاں سے کوہاٹ پہنچے۔ کوہاٹ میں رات گزار کر اگلی صبح ہم نے پشاور کا رخ کیا۔ راستے میں ایک دو جگہ پولیس نے ہمیں روکا مگر کرنسی نوٹوں کی سوندھی خوشبو نے انھیں بولنے کے قابل نہ چھوڑا۔ چودھری کی اپنی دولت اس کے خلاف استعمال ہو رہی تھی۔ حرام کی دولت کا اتنا عبرت ناک انجام اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

پشاور شہر میں داخل ہونے کے بجائے ہم نے اس کے مضافات میں گھوم پھر کر نسبتاً ایک ویران سی عمارت تلاش کر لی جو عام آبادی سے ہٹ کر بنی ہوئی تھی۔ عمارت کے بیرونی دروازے پر لٹکا زنگ آلود تالا چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ عرصہ دراز سے کوئی اس عمارت میں داخل نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں اندرونی کمروں کو بھی تالے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کا تالا توڑ کر ہم اندر داخل ہوئے۔ کمرہ سامان سے عاری تھا۔ باقی کمروں کے تالے بھی باری باری کھول کر دیکھنے پر ہمیں دو تین ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں اور ایک دو لوہے کے بکسوں کے اور کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی۔ دو چارپائیوں کو جھاڑ کر ہم نے بیٹھنے کے قابل بنایا، چودھری کو گاڑی سے نکال کر گرد آلود فرش پر پھینکا۔ کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔

"اس خنزیر کی بندشیں ڈھیلی کر دو یہ نہ ہو اسی طرح بندھے بندھے ہی جہنم رسید ہو جائے۔"

امجد سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھا اور اسے کھول دیا۔ بندشیں کھل جانے کے چند لمحے بعد تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا اور پھر کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کی کلائیوں اور پنڈلیوں پر رسی کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے۔ اپنی کلائیوں اور پنڈلیوں کو مسلنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"عمر جان تم مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے؟ اس طرح ذلیل و خوار کر کے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

"بڑی جلدی اکتا گئے چودھری۔" میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ چھا گئی۔ "ابھی تو شروعات ہے چند دن بعد تم موت کی آرزو کرو گے مگر موت تیرے قریب نہیں پھٹکے گی۔ میں تمھیں اس قابل بھی نہیں چھوڑوں گا کہ تم خودکشی کر سکو۔ تیرا کیا خیال ہے گنڈا پور سے دشمنی پالنا اتنا آسان ہے اور یاد ہے نا میں نے تھانے میں تجھے کہا تھا مجھے قتل کر دو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے مگر تم اس وقت اپنی طاقت اور چوہدراہٹ کے زعم میں تھے اور ظلم پر ظلم کرتے گئے۔ یہ بھول گئے کہ بدلہ بھی لیا جا سکتا ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں تیرے ہر ظلم کا گن گن کر بدلہ لوں۔"

"تت تم کیا کرنا چاہتے ہو۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"چودھری...... اصولاً تو مجھے تیرے گھر والوں کو تیری آنکھوں کے سامنے آگ میں زندہ جلا دینا چاہئے تھا تاکہ تجھے بھی پتا چلتا کہ اپنوں کو تکلیف میں دیکھ کر کیا محسوس ہوتا ہے مگر افسوس کہ اس دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جو تجھے عزیز ہو۔ تیری مثال تو اس سانپ کی سی ہے جو بھوکا ہو کر اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے۔ اپنے والد اور بھائی کا قاتل تُو خود ہے۔ اپنی ماں بہن کو دھوکا دینے والا ان کے دکھ پر کیسے کڑھ سکتا ہے۔ تم جیسے خود غرض اس دنیا میں صرف اپنی ذات کے لیے زندہ رہنا جانتے ہیں اور تمھارے جیسے شخص کو تکلیف دینے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ تمھیں ذاتی طور پر اذیت دی جائے اور یہی میں کروں گا۔" یہ کہتے ہی میں اس ٹوٹی پھوٹی چارپائی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا اور اسے زدوکوب کرنے کا دل پسند مشغلہ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ امجد نے بھی میرا ساتھ دیا۔ چند لمحے وہ ہمارے درمیان فٹ بال بنا رہا اور اس کے بعد بیہوش ہو کر تمام تکالیف سے عارضی طور پر آزاد ہو گیا۔ ہم دونوں چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔

"ڈاکٹر کی تلاش میں کس وقت نکلو گے؟" امجد چارپائی پر بیٹھتے ہی مستفسر ہوا۔

''بس جارہا ہوں......تم اس کا خیال رکھنا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ اسے ایک مرتبہ پھر باندھ دو۔''

امجد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی جانب بڑھ گیا جبکہ میرا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔

+ + +

''ایکسکیوزمی سر۔'' میں میڈیکل سٹور کے کیش کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوا۔

''جی فرمائیں۔'' وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔

''سر میں یہاں پہ اجنبی ہوں کیا آپ پشاور کے کسی ماہر سرجیکل سپیشلسٹ تک میری رہنمائی کر سکتے ہیں۔''

''پشاور میں تو کئی ماہر سرجن موجود ہیں۔ مہنگے سستے۔ سرکاری، غیر سرکاری آپ کو کس قسم کا سپیشلسٹ درکار ہے۔''

''غیر سرکاری جس کے پاس اپنا ذاتی آپریشن تھیٹر موجود ہو۔''

''ڈاکٹر کرم الدین خان اور ڈاکٹر اے کے شیروانی دونوں کے ذاتی کلینک میں آپریشن تھیٹر کی سہولت موجود ہے مگر یہ خیال رکھنا کہ ان کی فیس اور بل ادا کرنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔ اس لیے عموماً غریب آدمی تو کیا متوسط طبقہ کے لوگ بھی ان کے کلینک کا رخ کرنے سے گھبرتے ہیں۔'' اس نے کافی تفصیلی جواب دیا۔

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ دونوں ڈاکٹروں کے فرضی نام تحریر کیے گئے ہیں کیونکہ دونوں ڈاکٹر حیات ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کہانی میں کچھ مواقع پر مشہور افراد کے فرضی نام تحریر کیے گئے۔ یوں بھی ناموں کی اس تبدیلی سے کہانی کے پلاٹ یا واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ (مصنف)

''تھینک یو سر۔'' میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ ''اگر زحمت نہ ہو تو ان دونوں کا ایڈریس لکھ دیں۔''

اور اس نے سر ہلاتے ہوئے ایک کاغذ پر دونوں ڈاکٹرز کا پتا لکھ کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سٹور سے نکل آیا۔ اس جگہ سے چونکہ ڈاکٹر کرم الدین خان کا کلینک نزدیک تھا اس لیے میں وہاں پہنچا مگر استقبالیہ سے پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب عارضی طور پر شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں ڈاکٹر اے کے شیروانی کے کلینک میں پہنچا۔

''سر ڈاکٹر صاحب تو اس وقت آپریشن میں مصروف ہیں۔ آپ ویٹنگ روم میں انتظار فرمائیں جیسے ہی فارغ ہوتے ہیں میں آپ کو اطلاع کر دوں گی۔'' استقبالیہ پر بیٹھی لیڈی مؤدبانہ لہجے میں بولی اور میں سر ہلاتے ہوئے ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا جلد ہی ڈاکٹر صاحب فارغ ہو گئے استقبالیہ کی طرف سے مطلع ہونے پر میں ڈاکٹر کے کمرے کی طر

ف بڑھ گیا۔

''اسلام علیکم!''

''وعلیکم السلام......بیٹھیں۔'' اس نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں ''شکریہ'' کہتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''فرمائیں؟''

''ڈاکٹر صاحب...... بات ذرا راز داری کی ہے اس لیے براہ مہربانی اگر آپ کام نہ کرنا چاہیں تو اسے اپنے تک ہی محدود رکھیے گا؟''

''مسٹر...... ڈاکٹر نام ہی راز داری کا ہے...... تم کھل کر بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔''

''سر!...... میں دشمن دار آدمی ہوں، پچھلے دنوں میں میرا ایک آدمی گولی لگنے سے زخمی ہوا ہے۔ ہماری لاپروائی اور علاج میں سستی کی وجہ سے زخم کافی بگڑ گیا ہے۔ اب ہوسکتا ہے کہ اس کی ٹانگ ہی کاٹنی پڑے جائے۔ بہرحال یہ تو ڈاکٹر کا مسئلہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ البتہ ہم اس کا علاج اس طرح راز داری سے کرانا چاہتے ہیں کہ کسی کو خبر نہ۔ کسی سے میری مراد پولیس وغیرہ سے ہے۔ باقی رہی فیس کی بات تو اس کی آپ فکر نہ کریں وہ ہم منہ مانگی ادا کریں گے۔''

چند لمحے وہ خاموشی سے میرے چہرے کو تکتا رہا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس کی خاموشی زیادہ دیر برقرار نہ رہی......

''تمھیں کس نے بتایا ہے کہ میں غیر قانونی کام کرتا ہوں؟''

''کسی نے بھی نہیں۔'' میں نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ سے پہلے میں ڈاکٹر کرم الدین خان کے کلینک پر گیا تھا مگر وہ عارضی طور پر شہر سے باہر گیا ہوا ہے اس لیے میں آپ کے پاس آگیا اور آپ کے انکار کرنے کی صورت میں کسی اور ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا۔ یہ کوئی زور زبردستی کی بات تو ہے نہیں نا؟''

''60 ہزار لگیں گے؟''

''70 ہزار دوں گا۔ 50 ہزار پیشگی اور 20 ہزار بعد میں لیکن کام میری مرضی کا ہوگا اور آپ کے علاوہ کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔''

''منظور ہے۔'' اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی۔ 70 ہزار اتنی معمولی رقم نہیں تھی۔ بے شک وہ کوئی غریب آدمی نہیں تھا مگر دولت ایک ایسی چیز ہے جس میں اضافہ ہر دنیادار کی خواہش ہوتی ہے۔ ''البتہ کام کے دوران مجھے اسسٹنٹ کی ضرورت پڑے گی اور وہ قابل اعتماد آدمی ہے۔''

''نہیں...... آپ کے علاوہ کوئی نہیں۔ اسسٹنٹ کی جگہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔''

''مگر......'' اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

''یہ 50 ہزار ہیں...... باقی کام کی تکمیل کے بعد۔''

''مریض کس ٹائم لاؤ گے۔'' پیسے دراز میں رکھتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔

''جو ٹائم آپ مناسب سمجھیں۔''

''رات کو کیسا رہے گا؟''

''صحیح ہے.....کیا مریض کو ادھر لانا پڑے گا؟''

''ہاں.....''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''اس کلینک کے پیچھے والا گیٹ آپ کے لیے کھلا ہوگا۔ وہاں سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر ایک لوہے کا دروازہ ہے وہ بھی آپ کو کھلا ملے گا اور اسے کھولتے ہی آپ کو سیڑھیاں اترنی پڑیں گی، سیڑھیوں کے اختتام پر آپریشن تھیٹر کا دروازہ ہے۔ میں رات کو نو بجے پہنچ جاؤں گا۔''

''کیا کلینک رات کو بند ہو جاتا ہے؟''

''نہیں.....لیکن اس کا آپ پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ یوں بھی عقبی سمت سے آئیں گے۔''

''او کے ڈاکٹر صاحب پھر رات کو ملاقات ہوگی۔''میں نے اٹھ کر اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔

''اس رقم کی رسید؟''وہ بھی میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''مرد کی زبان سے بڑی کوئی رسید نہیں ہوتی۔''میں نے کہا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

+ + +

امجد شدت سے میرا منتظر تھا۔ میں نے چودھری کے سامنے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

''فنٹاسٹک۔''وہ تعریفی لہجے میں بولا۔''اس کا مطلب ہے اپنا کام بہت کم باقی رہ گیا ہے چلو اچھا ہوا ڈاکٹر شہلا غریب بھی بے صبری سے میری منتظر ہوگی۔''

''ہاں یار خوش قسمت ہو۔''میں نے جانتے بوجھتے شہلا کے ذکر کو اجاگر کیا۔''چوہدرانی سے شادی کرنا ہر شخص کی قسمت میں نہیں ہوتا اور چوہدرانی بھی وہ جو ڈاکٹر ہو۔''

امجد میرا مزاج آشنا تھا اسے پتا چل گیا کہ میں نے کیوں اس طرح کی بات کی ہے۔ اس نے چاہت سے شہلا کی باتیں چھیڑ دیں۔ اس دوران میں نے چودھری کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا۔ مگر کچھ کہنے کی بجائے وہ ڈھیٹ بنا امجد کی شہلا کے متعلق گفتگو سنتا رہا۔ میں نے جب دیکھا کہ اپنی بہن کے ذکر پر بھی اسے کوئی غیرت نہیں آ رہی تو امجد کو خاموش کرا کر اس سے مخاطب ہوا......

''چودھری......میرے خلاف تُو نے جو کرنا تھا بڑی سفاکی سے کیا میرے والدین بیوی بچے بھائیوں بھتیجوں بھابیوں تمام کو بے دردی سے نذر آتش کر دیا۔ تیری وجہ سے میں دشمن ملک میں در بدر پھرا، اس کی خفیہ ایجنسیوں کے تشدد کا نشانہ بنا، اپنے ملک کی پولیس کے لیے مشق ستم بنا۔ میرے پیارے چچا کی ٹانگیں ٹوٹیں، میری بہن پاگل ہوئی۔ ان سب کے علاوہ مجھے جو ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑی، ایسی ذہنی تکلیف جو شاید پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کر دے۔ تیرے یہ تمام جرائم اس بات کے متقاضی تھے کہ میں تمھیں دیکھتے ہی بے دردی سے قتل

کر دیتا۔ مگراس کا نقصان یہ تھا کہ تمھیں پہنچنے والی تکلیف اور اذیت اس تکلیف سے بہت کم ہوتی جو مجھے برداشت کرنی پڑی، کئی راتیں جاگ کر گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بھائی جو میرے بازو تھے ان کو مارنے کے جرم میں تیرے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے اس کے بدلے تیری آنکھیں نکال دوں۔ باپ سے نسبت کے تفخر پر معاشرے میں ہماری ناک اونچی ہوتی ہے اس کے بدلے تیری ناک کاٹ دوں۔ بیوی کی زیب وزینت سے ہم تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بدلے تیرے چہرے کے نقوش بگاڑ دوں۔ اپنے چچا کی ٹانگوں کے بدلے تیری ٹانگیں کاٹ دوں۔ ماں ہمیں بولنا سکھاتی ہے اس کا بدلہ تیری گندی زبان کاٹ کر لوں اور مجھے ان سب کی جدائی میں جو اذیت اٹھانی پڑی ہے اس کی جزا میں تجھے زندہ رکھوں اور میرا خیال ہے تُو مجھ سے متفق ہوگا اور فکر نہ کرنا میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے وہ یہ تمام کام بڑے سائنٹیفک انداز میں کرے گا۔ اس ضمن میں تیری حرام کی کمائی بڑی کارآمد ثابت ہوئی ہے۔''

میرے پُرسکون لہجے کو سن کر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمودار ہوئے چند لمحے تو وہ خوف کی شدت سے بات نہ کر سکا اور جب بولا تو فقط معافی مانگنے اور گڑگڑانے کے کوئی قابل ذکر بات اس نے نہ کی مگراس کے یہ الفاظ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کی بکواس کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم دونوں وہیں بیٹھ کر وہ کھانا کھانے لگے جو میں بازار سے لے آیا تھا۔ اس دوران منتوں اور زاری سے تھک کر چودھری منہ سے مغلظات اُگلنے لگا۔ اس کا مقصد شاید ہمیں غصہ دلانا تھا تاکہ طیش میں آکر ہم اسے قتل کر دیں۔ مگر اتنے بچے ہم بھی نہیں تھے۔ میں نے کہا۔

''چودھری جتنا بھونک سکتے ہو بھونک لو۔ چند گھنٹے بعد تیری یہ گندی زبان کاٹ دی جائے گی۔''

''عمر جان تجھے تیری ماں کا واسطہ...... تیرے باپ کا......'' مگراس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا میں نے اس کے منہ پر اپنے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر جڑ دی۔

''اپنی گندی زبان سے ان کے نام مت لو چودھری۔ ان کو تو تُو نے اس بڑھاپے میں زندہ آگ میں جلا دیا ہے۔ پتا ہے آگ میں جلنے پر کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ ٹھہرو تجھے بتلاتا ہوں...... ماجے!...... ذرا لائیٹر دینا۔''

امجد نے لائیٹر نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے لائیٹر جلا کر چودھری کے پاؤں کے نیچے پکڑ لیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی وہ یوں لرزنے لگا۔ جیسے اسے کرنٹ لگائے جا رہے ہوں۔ چمڑا جلنے کی سڑانڈ کمرے میں پھیل گئی اور تکلیف کی شدت سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر ہم دونوں ان ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے لگے۔

+ + +

حسب وعدہ ڈاکٹر اے کے شیروانی نے کلینک کا عقبی دروازہ کھلا رکھا تھا۔ دروازہ اتنا چوڑا تھا کہ ہم گاڑی سمیت اندر گھس گئے۔ گاڑی عقبی صحن میں روک کر ہم نیچے اترے بڑا گیٹ بند کر کے میں نے امجد کو چودھری کے بیہوش بدن کو اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود ڈاکٹر کے

بتائے گئے راستے پر ہولیا۔امجد مجھ سے چند قدم پیچھے تھے۔

ہم آگے پیچھے چلتے آپریشن تھیٹر میں پہنچ گئے۔نو بجنے میں چند منٹ رہتے تھے۔میں جان بوجھ کر چند منٹ پہلے پہنچا تھا۔چودھری کو آپریشن ٹیبل پر لٹا کر ہم ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے۔ڈاکٹر ٹھیک نو بجے تھیٹر میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر کے......

''السلام علیکم۔'' کہتے ہوئے ہماری طرف بڑھا۔''میرا خیال ہے میں ٹائم پہ ہی پہنچا ہوں۔''

''بالکل ڈاکٹر صاحب۔''اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور ٹیبل پر پڑے چودھری کی طرف بڑھا۔

''اچھا یہ ہے مریض۔'' وہ چودھری کے قریب رک گیا۔''یہ بیہوش کیوں ہے اور اس کی تو دونوں ٹانگیں صحیح نظر آرہی ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب۔''میرا لہجہ بالکل بدل گیا۔''میرے پاس اتنا ٹائم تو نہیں ہے کہ میں آپ کو اپنی مکمل کہانی سنا سکوں مختصراً اتنا سمجھ لو کہ اس شخص کے ہاتھوں میرے تمام گھر والے زندہ جلے ہیں اور اب میں اسے عبرت کا نمونہ بنانا چاہتا ہوں۔آپ نے بس اتنا کرنا ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں رانوں سے کاٹ کر علیحدہ کر دو۔دونوں ہاتھ کندھوں سے تھوڑا نیچے کاٹ دو۔ایک آنکھ نکال دو ناک اور زبان کاٹ دو چہرے کے نقوش بگاڑ دو۔اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ یہ مرنے نہ پائے۔''

میری بات سن کر ڈاکٹر کے چہرے پر حیرانی کے ساتھ خوف کے بھی تاثرات ابھرے اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''آ......آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں نے وہی کہا ہے جو آپ نے سنا ہے۔''

''مم،مگر میں،میں ایسا......کیسے کر سکتا ہوں؟''

''تم کرو گے ڈاکٹر۔''امجد خوفناک لہجے میں بولا۔''ورنہ ہم یہی سب کچھ تیرے ساتھ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔البتہ معاوضے کی فکر نہ کرو جتنا پہلے دیا تھا مزید اس سے دگنا ملے گا۔''

وہ تھوک نگل کر بولا۔''مم......مگر......یہ ظ......ظلم ہے۔''

''تجھے یہ اس لیے ظلم نظر آرہا ہے کہ تُو نے ہمارے بچوں کے جلے ہوئے بدن نہیں دیکھے ہماری بہنوں کے ناقابل شناخت چہرے نہیں دیکھے۔ہمارے والدین کے راکھ ہوتی ہڈیاں نہیں دیکھیں۔اگر تم نے ان سب کا مشاہدہ کیا ہوتا تو کبھی بھی اسے ظلم نہ کہتے۔''

امجد کی بات سن کر اس نے لاچارگی سے میری جانب دیکھا۔میں گیرا کٹ مارک تھرٹین نکال کر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔میرا مقصد اسے خوفزدہ کرنا تھا۔

''اگر میں آپ کو ایسے ڈاکٹر کا ایڈریس دوں جو یہ کام بخوبی سرانجام دے۔''

''شٹ اَپ۔''اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے امجد دھاڑا۔''شروع ہو جاؤ ہمارے پاس تیری بکواس سننے کے لیے بالکل ٹائم نہیں۔''

امجد کی دھاڑ سن کر وہ کانپ سا گیا تھا۔کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر وہ مرے مرے قدموں سے چودھری کی طرف بڑھا۔اگلے دو گھنٹوں میں چودھری کی دونوں ٹانگیں اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کے باقی اعضاء بھی کم ہونے لگے۔جس وقت ڈاکٹر نے اپنا کام ختم کیا اس وقت دن نکل آیا تھا۔آپریشن ٹیبل پر چودھری کی بجائے ایک عجیب ہیئت کا جسم پڑا تھا۔آپریشن ختم کر کے ڈاکٹر بے جان سے انداز میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔امجد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر اس کی طرف بڑھائیں اور بولا۔"یہ ایک لاکھ روپیہ ہے اور ڈاکٹر صاحب میں اپنے رویے کی معذرت چاہتے ہوئے آپ کو اتنا بتلا دوں کہ یہ شخص انسان نہیں درندہ تھا،اور یہ اس سے بھی زیادہ برے سلوک کا مستحق تھا۔"

ڈاکٹر نے رقم کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا امجد نے وہ گڈیاں زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیں اور چودھری کو نہایت احتیاط سے اٹھا کر کہا۔

"چلو جانو۔"اور میں بھی ڈاکٹر کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔

چودھری کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر میں اپنے مقصد کے بندے کی تلاش میں نکلا۔جو کہیں چھ سات گھنٹوں کی تلاش کے بعد مجھے مل سکا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں صاحب۔"میرا مطمع نظر جان کر اس کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔ایسی مشینوں کی دیکھ بھال مجھے خوب آتی ہے۔"

"مشین؟"میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

"جی صاحب۔ہماری اصطلاح میں اسے مشین ہی کہتے ہیں نوٹ چھاپنے والی مشین چار مشینیں میرے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ویسے آپ نے قیمت نہیں بتائی اس کی۔"

"بالکل مفت۔"

"نہیں صاحب آپ مذاق کر رہے ہیں۔اتنی قیمتی چیز آپ مفت میرے حوالے کر دیں گے۔"اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"بلاشک و شبہ۔تم ابھی چلو میرے ساتھ۔"

"آپ صحیح کہہ رہے نا؟"اس کے لہجے میں اب تک بے یقینی تھی۔

"سچ کہہ رہا ہوں بھائی۔تم آؤ تو سہی۔وہ شخص میرا دشمن ہے اور دشمن سے انتقام لینے کا اس سے بہتر طریقہ مجھے نظر نہیں آیا۔"وہ میرے ساتھ چل پڑا مگر جب تک میں نے چودھری اس کے حوالے نہ کر دیا بے یقینی اس کے اندر ہلکورے لیتی رہی۔

"سر میں اپنی گاڑی منگوالوں۔"چودھری کو دیکھ کر وہ خوشی سے گڑ بڑا سا گیا تھا۔

"اپنی گاڑی اور بندے بھی منگوالو۔اس کے علاوہ یہ چابی پکڑو۔"میں نے اس کی جانب ڈبل ڈور ٹویوٹا کی چابی بڑھائی۔"صحن میں جو گاڑی کھڑی ہے یہ ہم علاقہ غیر سے لائے تھے اگر اس کی نیم پلیٹ اور کاغذات وغیرہ بنوالو تو استعمال کر سکتے ہو۔"

''سس۔ص صاحب آپ مجھ پہ اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں۔کہیں میرے خلاف کوئی سازش تو تیار نہیں ہو گئی۔''

''تُو ہے نا امریکہ کا صدر کہ تیرے خلاف ہم سازش کریں گے۔''امجد ہنسا۔''بیوقوف اس گاڑی کے علاوہ ہم کافی رقم بھی تیرے حوالے کریں گے اور یہ سب کچھ اس لیے کہ تم اس منحوس کا علاج کرواتے رہنا۔بس ہمارا یہی مطالبہ ہے کہ یہ مرنے نہ پائے۔''

''میں بھلا اسے مرنے دے سکتا ہوں؟''

''یہ رقم بھی رکھو۔''امجد نے اپنی جیب سے چودھری کی حرام کی کمائی کی آخری پونجی نکالی۔''اور اب ہم چلتے ہیں۔''

''آخری بات۔''میں نے کہا۔''اسے پشاور سے ڈیرہ اسماعیل خان جانے والے بس اڈے پر پکار کھنا۔''

''ایسے ہی ہوگا صاحب آپ بے فکر رہیں۔''

رقم، گاڑی اور چودھری کو اس بھکاری مافیا کے سرغنہ کے حوالے کر کے ہم اس مکان سے باہر نکل آئے۔کچھ قارئین تو شاید بھکاری مافیا سے واقف ہوں جنھیں علم نہیں ان حضرات کی معلومات میں اضافے کے لیے لکھتا چلوں کہ پاکستان میں بھیک مانگنے کا کاروبار بہت منظم انداز میں پھیلا ہوا ہے۔اس کاروبار سے وابستہ افراد کم عمر بچوں کو اغوا کرا کے ان کے مختلف اعضاء کو کاٹ کر یا سائنٹیفک انداز میں ٹیڑھا میڑھا کر کے ان سے بھیک منگواتے ہیں۔آپ لوگوں نے کئی دفعہ فٹ پاتھ پر ایسے اجسام پڑے دیکھے ہوں گے جو از خود حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔اگر آپ ان پر نظر رکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ ان کی نگرانی کرنے والے باقاعدہ وہاں موجود ہوتے ہیں۔بہر حال یہ ایک لمبا موضوع ہے اور اہل قلم اس پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے ہمارا چونکہ یہ موضوع نہیں ہے اس لیے ہم اصل کہانی کی طرف بڑھتے ہیں۔

وہاں سے ہم سیدھے ایک متوسط طبقے کے ہوٹل میں پہنچے شام ہو چلی تھی۔کمرا بک کرا کے ہم نے کھانا کھایا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو گئے۔ایک بہت بڑا بوجھ ہمارے سروں سے اتر گیا تھا۔دوسرا ہم کافی دنوں سے بے آرام بھی تھے۔اس لیے اگلے دن سورج چڑھے ہی ہماری آنکھ کھل سکی۔روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر ہم نے ناشتا کمرے میں ہی منگوا لیا۔چائے پیتے ہوئے امجد مستفسر ہوا۔

''جانو اب کیا ارادہ ہے؟''

''ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے اور اب مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا کہ کیا کروں گھر چلتے ہیں، چچا فاضل سے مشورہ کر کے ہی ہم کچھ طے کر سکیں گے۔''

''جانو صاحب!......میرا مطلب ہے شیتل کے بارے کیا سوچا ہے میں تو جاتے ہی امی ابو کو شہلا کے ماموں کے ہاں بھیجنے والا ہوں آگے میری قسمت۔''

''شیتل تو ماضی کا ایک سہانا باب ہے۔اب تو سعدیہ کی طرح اس کے سپنے ہی باقی ہیں۔''

''کیا بات کر رہے ہو یار!......ادھر آتے وقت ہی تو اس کا لکھا ہوا خط تجھے ملا تھا۔''

''اس بات کو 4 ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے ماجے صاحب، جو ماضی ہے۔ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی اس بات کا مجھے روزِ روشن کی طرح یقین ہے......وہ اب بھی مجھے چاہتی ہے اس بارے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''تُو نے تو اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ چودھری کو اس کے انجام تک پہنچا کر اس سے ملنے کے لیے جاؤ گے۔''

''میں ضرور بالضرور اس سے ملنے کے لیے جاتا اگر وہ ایک عام شکل وصورت کی لڑکی ہوتی مگر وہ حسن کی دولت کے ساتھ دنیاوی دولت سے بھی مال مالا ہے اور ایسی لڑکی کو چاہنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں مل جائیں گے۔ اب تو شاید وہ ایک لٹے پٹے جانو کو پہچاننے سے ہی انکار کر دے۔''

''اتنا قنوطی بننے کی ضرورت نہیں۔'' امجد نے مجھے سمجھایا۔ ''چاہتیں اتنی آسانی سے دل سے رخصت نہیں ہوا کرتیں۔ اگر وہ تجھے چاہتی تھی تو کسی کو بھی جیون ساتھی بنانے سے پہلے وہ تمھیں ضرور مطلع کرے گی۔''

''ہو سکتا ہے اس نے خط وغیرہ لکھا ہو مگر ہمیں بھی تو گھر سے رخصت ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔'' امجد نے تائید سر ہلایا۔ ''بہر حال گھر جا کر دیکھ لیں گے اگر کوئی خط آیا ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ خود اسے خط لکھ کر معلوم کر لینا۔''

''خط تو پتا نہیں اسے کب ملے میرے پاس اس کا فون نمبر موجود ہے۔ فون کر کے اس سے بات چیت ہو سکتی ہے۔''

''ہاں یاد آیا۔ تُو نے پہلے بھی ایک مرتبہ اس سے بات کی تھی۔ اس وقت تو اس کا نمبر تجھے زبانی یاد تھا۔''

''اب بھی زبانی یاد ہے۔''

''چلو پھر ناشتا کر کے چلتے ہیں اور میرا مشورہ یہی ہے کہ گھر جانے سے پہلے انڈیا کا ایک چکر لگ جائے تو بہتر رہے گا، بعد میں جاتے ہوئے پرابلم ہو گی۔''

اور میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ناشتا کرنے کے بعد ہم ہوٹل سے نکل آئے۔ پی سی او پر جا کر ہم کافی دیر اس کا نمبر ملانے کی کوشش کرتے رہے مگر ہمیں اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر پی سی او والے کی یہ بات سن کر ہم پی سی او سے نکل آئے۔

''سر یہ نمبر استعمال میں نہیں ہیں۔''

''عجیب بات ہے یار گھر اور آفس دونوں نمبر بند مل رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے شیتل نے جان بوجھ کر یہ نمبر بدلی کرا دیئے ہیں۔ شاید تیرے ساتھ بیوفائی کرنے سے پہلے اس نے رابطے والے سسٹم کو ختم کرنا ضروری سمجھا ہو۔''

''میں سو فیصد آپ سے متفق ہوں۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

''چلو پھر گھر چلتے ہیں۔''اس نے مشورہ دیا۔

''یونہی کرنا پڑے گا۔''

وہاں سے ہم ہوٹل پہنچے اپنا سامان سمیٹا، بقایا جات کی ادائی کی اور بس اڈے کی طرف چل پڑے۔امجد شہلا کی یادوں میں ڈوبا ہوا تھا اور گاہے گاہے مجھ سے بھی اپنی حالت پہ تبادلۂ خیال کر رہا تھا جبکہ میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی جسے میں فقط بوریت کا نام دے سکتا تھا۔ وہ کام جسے میں نے مقصدِ حیات اور زندگی کا محور سمجھا تھا پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور اس کے بعد زندگی میں کوئی ایسی خواہش باقی نہیں تھی جس کے لیے بے تابی ہوتی، شاید شینل کی محبت مجھے ایک مرتبہ پھر انڈیا جانے پر مجبور کرتی مگر اس کی طرف سے ٹیلی فون نمبروں کی تبدیلی اس بات کا واضح اعلان تھا کہ وہ مجھے اپنے دل و دماغ سے کھرچ چکی تھی، اس بات سے میری انا ہلکی سی مجروح ہوئی تھی اور دل کے کسی کونے میں مدہم سے غم کا احساس بھی ہو رہا تھا مگر اس سے پہلے میں جتنی چوٹیں کھا چکا تھا اس کے مقابلے میں یہ دکھ کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے تو جس دن سے شینل نے محبت کا اظہار کیا تھا اس کے دن سے ہی اس کے بچھڑنے کا یقین تھا اور اسی وجہ سے میں نے اس کی یادوں کو اپنی سوچوں کا محور نہیں بنایا تھا۔ شینل کے کسی کو ساتھی بنانے کے فیصلے سے میں ہلکا سا خفا ہونے کے باوجود مطمئن تھا۔ان حالات میں اس کا کام بھی یہی بنتا تھا۔ میں نے بھی تو کبھی اس سے امید افزاء بات نہیں کی تھی اور اس کے باوجود شینل جیسی لڑکی سے یہ گلہ رکھنا کہ وہ میرا انتظار کیوں نہ کر سکی عبث تھا۔ یہ بھی اس کا بڑا پن تھا کہ اس نے اپنا فون نمبر تبدیل کر کے میرا سامنا کرنے سے احتراز برتا تھا، وہ شاید اپنے وعدوں پر شرمندہ تھی۔

میں کوسٹر میں بھی انھی خیالوں میں ڈوبا رہا امجد نے ایک دو دفعہ مجھے مخاطب کیا لیکن میری غائب دماغی محسوس کرتے ہوئے اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ رحمٰن خیل کے اسٹاپ پر اتر کر ہم آہستہ قدموں رحمٰن خیل کی طرف چل پڑے۔ پہلوان ہوٹل کے اڈے کی رونق وہی تھی جو برسوں سے چلی آ رہی تھی۔

''بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو؟''

''ہاں یار......بس عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے۔''

''گھر جا کر یہ ساری بوریت دور ہو جائے گی۔''

''ماجے اب گھر ہماری قسمت میں کہاں۔''

''بن جائے گا یار!......گھر بھی بن جائے گا بس ایک فصل اٹھانے کی دیر ہے۔''اس نے مجھے تسلی دی۔

''مکان بلاشبہ بن جائے گا اور میری مراد گھر سے تھی کہ مکان کو ہم گھر نہیں کہہ سکتے۔''

''کیا تُو ہمیں اپنا نہیں سمجھتا؟''

''تُو تو پہلے بھی میرا اپنا تھا جب امی ابو، بھائی اور سعدیہ زندہ تھیں اور تیرا اپنا ایک الگ مقام ہے میرے دل میں کسی کا نعم البدل بننے کی صورت میں تجھے بھی کھو دوں گا۔''

"یہ ساری بوریت اور قنوطی پن تجھ پر اس لیے طاری ہے کہ ایک تو تُو یکدم فارغ ہوگیا ہے اور کوئی کام تجھے سوجھ نہیں رہا دوسرا شیتل سے تجھے اس کام کی توقع نہیں تھی جو وہ کر گزری بہر حال فکر مت کر و رضیہ موجود ہے نا اس سے مل کر اپنا غم غلط کر لینا۔" امجد سنجیدگی سے بات کرتے کرتے مذاق پہ اتر آیا۔

"رضیہ تجھے ہی مبارک ہو میں اس کے بغیر ہی بھلا۔ البتہ مصروفیت والی بات تُو نے خوب کہی۔ میرا تو خیال ہے کل پرسوں سے اپنی حویلی پر کام شروع کرا دوں یوں کب تک اسلم بھائی کے گھر ٹکے رہیں گے۔"

"ایسے ہی کر لیں گے مگر ایک مہینے کے اندر اندر یہ کام مکمل کرانا پڑے گا کیونکہ میں مزید شہلا سے دور نہیں رہ سکتا۔"

"بلے بھئی بلے......اتنی جلدی ہے تو خیمہ لگا لیتے ہیں۔"

"خیمہ کیوں؟......وہ تیری شیتل جیسی نہیں ہے کہ آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی کوئی اور شریک سفر ڈھونڈ لیا۔"

"اچھا اب بک بک بند کر وہ سامنے اسلم بھائی نظر آ رہا ہے۔" میں نے اسلم بھائی کو سفید ٹوپی کے ساتھ گھر سے نکلتے دیکھ کر کہا۔ وہ شاید شام کی نماز کے لیے جا رہا تھا۔ مگر ہم پہ نظر پڑتے ہی وہ تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا اور گرم جوشی سے ملا۔

"کس ٹائم پہنچے ہو؟"

"ابھی اترے ہیں گاڑی سے اور سیدھے ادھر ہی آ گئے۔"

"گھر نہیں گئے کیا؟" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"گھر؟......مگر گھر تو رہنے کے قابل نہیں تھا۔"

"رہنے کے قابل کیا وہ بہت ہی اچھے انداز میں تعمیر کر لیا گیا ہے۔ آپ آئیں امی جان اور اپنی بہن سے ملیں پھر چلتے ہیں۔" مجھے لے کر وہ گھر میں گھس گیا جبکہ امجد بیٹھک میں چلا گیا۔

جمیلہ باجی باورچی خانے میں تھی۔ "اکرم کی ماں دیکھو تو کون آیا ہے۔ اسلم نے اونچی آواز میں اسے پکارا اس نے باہر جھانکا اور مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر آئی اور مجھ سے لپٹ گئی، میرے ماتھے اور سر پر بوسے دیتے ہوئے وہ رونے لگی۔ ممانی جان بھی ہماری آواز سن کر اندرونی کمرے سے نکل آئیں۔

"عمر پتر یہ تُو ہے۔" وہ ہم دونوں بہن بھائی کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بناتے ہوئے بولی "شکر ہے تو آ گیا ہے۔ یہ پگلی تُو ہر وقت تجھے یاد کر کے روتی رہتی تھی۔"

"ہاں ماں جی میں آ گیا ہوں اور ان شاء اللہ اب کبھی نہیں جاؤں گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ تھوڑی دیر ہم اس طرح جذباتی کیفیت میں رہے، پھر ممانی جان مجھے لے کر چارپائی پر بیٹھ گئیں اور جمیلہ باجی چائے بنانے لگیں۔ اسلم بھائی گھر سے نکل گیا تھا شاید وہ مغرب کی نماز پڑھنے گیا تھا۔

چائے بننے تک ممانی جان مجھ سے سفر کا حال احوال پوچھتی رہی۔ میرے جانے کی غرض وغایت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے مختصر لفظوں میں اسے چودھری کے انجام سے آگاہ کر دیا تھا۔ جیسے ہی چائے تیار ہو کر آئی میں تھرماس اور ایک کپ امجد کو بیٹھک میں پکڑا آیا اور پھر آ کر ممانی اور باجی سے گپ شپ کرنے لگا۔ جمیلہ باجی اللہ کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ مزید تھوڑی دیر گزرنے کے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی، اسی وقت اسلم بھائی بھی گھر میں داخل ہوا......

''عمر بھائی۔ میں نے گھر میں آپ دونوں کی آمد کا بتلا دیا ہے سب بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''کیا یہ گھر سے ہو کر نہیں آئے تھے؟'' ممانی حیرانی سے مستفسر ہوئی۔

''نہیں ماں جی۔'' اسلم سعادت مندی سے بولا۔

''پھر تو......''

''ہاں ماں جی۔'' اسلم نے جلدی سے قطع کلامی کی۔ ''گھر جا کر اسے معلوم ہو جائے گا، آپ رہنے دیں۔''

''کیا معلوم ہو جائے گا۔'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا اس کا انداز مجھے بڑا عجیب لگا تھا۔

''یہی کہ آپ کا گھر بہت خوب صورت بن گیا ہے۔ تجھے تو پتا ہے امی جان نے اگر تفصیل بتلانی شروع کر دی تو ساری تفصیلات بتا کر دم لیں گی اور آپ لوگ مزید کئی گھنٹے لیٹ ہو جاؤ گے۔''

میں اس کی وضاحت سے مطمئن تو نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی میں نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور باجی اور ممانی جان سے اجازت لے کر ان کے گھر سے نکل آیا۔ امجد کو بھی اسلم بھائی نے بیٹھک سے بلا لیا اور ہم اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گلی میں داخل ہوتے ہی اپنے گھر کا دروازہ مجھے ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمکتا دمکتا نظر آیا۔ چچا جان نے غالباً پرانے طرزِ تعمیر کے مطابق حویلی بنائی تھی۔ اسلم بھائی ڈیوڑھی کے دروازے تک ہمارے ساتھ آیا اور پھر وہاں سے واپس لوٹ گیا۔ گیٹ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے چچا جان امجد کے امی ابو اور بہنیں تمام ہمارے انتظار میں صحن میں کھڑے تھے۔ مکان وہی تھا مگر مکین بدل گئے تھے، تباہ ہونے کے باوجود مٹی کا مکان دوبارہ اپنی اصلی حالت بلکہ اس سے بھی بہتر حالت میں تعمیر ہو گیا تھا مگر اس کے مکین واپس نہیں آ سکتے تھے۔ میرے اندر عجیب سی بے چینی پھیل گئی تھی اور پھر چچا فاضل کی مہربان بانہوں میں آ کر میری بے چینی کو ذرا سا سکون ملا۔

''پتر کیا رہا؟'' اس نے شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''اللہ نے کامیاب کیا ہے۔'' میں آہستہ سے بولا۔

چچا کے بعد میں امجد کے ابو سرفراز انکل اور آنٹی خدیجہ سے ملا امجد کو اس کی بہنوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ہم صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔

خدیجہ آنٹی ہمارے لیے کھانا گرم کرنے کے لیے کچن میں گھس گئیں۔ چچا فاضل مجھ سے مخاطب ہوا۔

''پتر!......تم بیٹھومت اپنے مہمان سے جا کر مل آؤ۔ بلکہ اسے ادھر ہی لے آؤ تا کہ وہ بھی تیرے ساتھ کھانا کھا لے۔''

''میرا مہمان؟'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں ہاں تیرا مہمان۔''

''کون ہے؟''

''خود جا کر دیکھ لو تیرے کمرے میں ہوگا۔ کوئی پرانا دوست ہے تیرا۔'' اور میں بے پناہ تجسس لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس گھر کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ چچا فاضل نے پچھلی تعمیر کے مطابق سب کچھ بنوایا تھا۔ وہ در و دیوار جن میں کبھی عدنان کے قہقہے گونجتے تھے، سعدیہ کی پیار بھری سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں، امی ابو کی شفقت اور ڈانٹ بھری نصیحتیں ملتی تھیں۔ بالکل خاموش تھیں۔ چچا فاضل کے سامنے سے ہٹتے ہی ان مانوس در و دیوار نے میرے دل میں عجیب سی رقت بھر دی تھی میں بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکے اپنے کمرے دروازے تک پہنچا۔

یہ وہ دروازہ تو نہیں تھا جس نے میری جانِ حیات سعدیہ کے حیات آفریں ہاتھوں کا لمس چکھا ہوا تھا البتہ بناوٹ اور شکل کے لحاظ سے بالکل اس کے مشابہہ تھا۔ میں ایک لمحے دروازے کے سامنے رک کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ تمام کمرہ مجھے خالی دکھائی دیا مگر کمرے میں بکھری خوشبو کسی کی موجودی کا پتا دے رہی تھی اور یہ خوشبو میرے لیے انجان نہیں تھی البتہ اس خوشبو کو سونگھ کر جو نام میرے ذہن میں اُبھر رہا تھا وہ حیران کن ضرور تھا۔ میں نے دروازے سے چند قدم آگے بڑھائے۔ مجھے شک تھا کہ کمرے میں موجود شخصیت باتھ روم میں چھپی تھی مگر میری یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوئی جب مجھے پیٹھ پیچھے قدموں کی آواز آئی میں جھٹکے سے پیچھے مڑا لیکن وہ جو بھی تھا بلکہ تھی وہ بڑی شدت سے میرے ساتھ لپٹ گئی۔

''جان۔'' اس کے منہ سے نکلی مترنم مانوس آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

''شیتل تم؟'' میں نے اسے زبردستی خود سے علیحدہ کر کے اس کا روشن چمکتا ہوا حسین و جمیل چہرہ دیکھا اور پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''ہاں جان میں۔'' وہ عجیب وارفتگی سے بولی۔ ''میں تجھے بھلا نہ پائی تیرے بغیر رہ نہ سکی۔ تُو تو کل بھی میرے بنا جی سکتا تھا اور آج بھی تجھے اس میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی۔ مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔''

میں مجرم ہوں مجھے اقرار ہے جرم محبت کا
مگر پہلے خطا پر غور کر لو پھر سزا دینا

''شیتل پگلی تو اچھی طرح میری مجبوریوں سے واقف ہے تجھ سے جدا ہو کر جب میں اپنے گاؤں پہنچا اور جو کچھ مجھ پہ بیتی وہ میں تجھے فون پر بتا چکا ہوں باقی کی کہانی تجھے چچا کی زبانی معلوم ہو گئی ہو گی۔ کیا تجھے لگتا ہے کہ ان حالات میں مَیں تجھ سے کسی قسم کا وعدہ وعید کر سکتا تھا۔''

''میں تو فقط ایک جھوٹی تسلی کی طلب گار تھی۔'' اس نے اپنا سر ذرا سا پیچھے کر کے میری آنکھوں میں جھانکا اور دوبارہ اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

"شیتل آج میں آزاد ہوں۔ اپنے سارے ضروری کام میں نے نمٹا لیے ہیں آج میں جھوٹ موٹ نہیں بلکہ سچائی سے، یہ درخواست کر رہا ہوں...... حالات سے لڑتے لڑتے میں ٹوٹ چکا ہوں، بکھر چکا اپنی محبت اور اپنے پیار سے مجھے سمیٹ لو۔"

"اسی لیے تو اپنا وطن چھوڑ کر آئی ہوں اور یہ جو بار بار تم مجھے شیتل کہہ کر پکار رہے ہو تو تمھاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اب میرا نام سعدیہ ہے۔"

اس کی بات سن کر میرے دل میں جو جذبات اٹھے انھیں لفظوں کا جامہ پہنانا مشکل تھا اور اس کام کے لیے میں نے الفاظ کی بجائے اعضاء کا سہارا لیا۔

جانے کتنی دیر ہم نے اسی محویت میں گزاری۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے ہمیں ایک دوسرے سے دور ہونے پر مجبور کر دیا۔ دروازہ کھولے بغیر امجد چہکا۔ "قبلہ اگر تعارف ہو چکا ہو تو چلیں غریب سا بندہ بھوکے پیٹ کھانے پر آپ کا منتظر ہے اور کھانا ایک مرتبہ ٹھنڈا ہو چکا ہے دوسری مرتبہ میں اسے ٹھنڈا نہیں ہونے دوں گا اور نہ ہی تیرے لیے تیسری مرتبہ گرم کیا جائے گا...... خدا حافظ۔"

"یہ امجد ہے نا؟" شیتل نے مسکراتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"ٹھیک پہچانا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو کھانا کھا لیں۔"

کھانا کھانے کے دوران چچا فاضل نے بتایا کہ جیسے ہی ہم بنوں روانہ ہوئے تھے اگلے دن شیتل رحمٰن خیل پہنچ گئی تھی اور چند دنوں کے اندر ہی اس نے چچا فاضل، چچا سرفراز آنٹی خدیجہ اور امجد کی بہنوں کو اخلاق، محبت اور خدمت سے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ وہ کافی رقم ساتھ لائی تھی اور چچا فاضل سے بے پناہ اصرار کر کے اس نے حویلی پر کام شروع کرا دیا تھا۔ یہ اس کی خواہش تھی کہ حویلی کو پرانے طرز تعمیر پر بنایا جائے۔

کھانے کے بعد تمام لوگ غیر محسوس انداز میں ہمیں اکیلا چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ ہم دونوں صحن سے اٹھ کر کمرے میں آ بیٹھے، رات گئے تک ہم باتوں میں مشغول رہے۔ شیتل مجھے میرے جانے کے بعد کے واقعات سنانے لگی۔ میرے انڈیا سے آتے ہی اس نے چوری چھپے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد زیادہ دن وہ فیکٹریوں کو نہ سنبھال سکی کہ تجربے کی کمی کے ساتھ اسے شوق بھی نہیں تھا۔ آخر کار دونوں فیکٹریاں اور جائیداد بیچ کر اس نے زیادہ تر پیسہ سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک میں جمع کرایا اور میرے لیے پاکستان آ گئی۔ اس سارے کام میں شیش ناگ نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ وہ برملا اسے اپنی بہن کہتا تھا اور شیتل کے بقول یہ سب کچھ اس نے میرے اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے کیا تھا جو میں نے اسے زندہ چھوڑ کر کیا تھا۔

نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر ہم ساری رات اکیلے کمرے میں اکٹھے نہیں گزار سکتے تھے بزرگوں کی موجودی ہمارے لیے بہت بڑی رکاوٹ تھی اور اس بات سے شیتل اچھی طرح واقف تھی۔ وہ بمشکل مجھے خدا حافظ کہہ کر امجد کی بہنوں کے کمرے میں سونے کے لیے چل دی۔

+ + +

ایک ہفتے کے اندر اندر ہماری شادی ہو گئی۔ اپنی شادی میں مَیں نے بڑی یاد سے رضیہ میر نیاز خان کو بلایا تھا اور اس نے بھی بڑے اہتمام سے شادی میں شرکت کی مگر شیتل کی شکل وصورت دیکھ کر اسے کوئی بات کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ البتہ آخری دن مجھے مبارک باد دینے

کے بہانے میرے قریب آ کر اس نے فقط اتنا کہا۔

’’جان مبارک ہو۔تم اپنے دعوے میں سچے نکلے۔‘‘

میری شادی کے ایک ہفتے بعد امجد کی شادی بھی شہلا چودھری سے ہوگئی۔ میں نے اپنی آدھی زمینیں زبردستی امجد کے نام کردی تھیں۔ شیتل بہت اچھی، فرمانبردار اور محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی۔شادی کے ایک سال بعد ہی اس نے مجھے ایک پیارے سے بیٹے کا تحفہ دیا جس کا نام اس نے بڑی چاہت سے عدنان رکھا۔

عدنان کی پیدائش کے ایک مہینے بعد امجد اور میں چودھری اکبر کو دیکھنے کے لیے گئے تھے وہ لوہے کی ایک ریڑھی پر چیتھڑوں میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔اس کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے تھے شاید جس بندے کے حوالے ہم اسے کر کے آئے تھے وہ اس کے زخم ٹھیک ہونے دینا نہیں چاہتا تھا اور اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ اس حالت میں چودھری کو بھیک زیادہ ملتی تھی۔ اس ناگفتہ بہ حالت کے باوجود چودھری نے ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری اور اس کے بعد اس کی آنکھوں میں نفرت کے بجائے التجا جھلکنے لگی اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ

’’عمر جان مجھے معاف کردو۔میں نے بہت سزا کاٹ لی ہے۔بہت اذیت برداشت کرلی ہے اب مجھے موت کی بھیک دے دو۔ بس بہت ہو چکا۔تُو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا اب زندگی بھی لے لو۔میں تیرا مجرم تھا تو نے اپنی پسندیدہ سزا سے مجھے ہم کنار کیا اسے میں زیادتی تو نہیں کہتا لیکن اگر زیادتی ہے بھی تب بھی میں تجھ سے کوئی گلا نہیں کرتا بس تم مجھے موت کا تحفہ دے دو خدا تمھاری عمر دراز کرے تمھارے بیوی اور بچوں کو تمھاری آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔اب مجھے معاف کردو، معاف کردو۔معاف کرو۔‘‘

مگر ہم پر اس کی یہ التجائیں اثر نہ کرسکیں۔اس کے بعد ہم نے ہر چھے ماہ بعد اس کے پاس جانے کا معمول بنالیا اور پھر وہ ہمارا پانچواں چکر تھا جب میں اس کی خاموش التجاؤں کو نہ ٹال سکا اور بازار سے مٹھائی خرید کر میں نے اس میں زہر ملایا۔اس کی ریڑھی کے نزدیک پہنچ کر میں نے اس میں چند سکے ریزگاری پھینکی اور مٹھائی کی ڈلی جیب سے نکال کر اس کے منہ کی طرف بڑھائی۔’’یہ لے چودھری تیرے دکھوں کا اختتام کرنے والی مٹھائی ہے۔‘‘

چودھری نے شکرگزار نظروں سے میری جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے منہ کھول لیا۔یہ اڑھائی سالوں میں پہلی مسکراہٹ تھی جو اس کے لبوں پر ابھری تھی۔ چونکہ اس کی سماعت ٹھیک تھی اس لیے میں نے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ وہ اپنے آخر وقت سے بے خبر نہ رہے۔اس کے مٹھائی نگلتے ہی ہم تیزی سے وہاں سے پھوٹ لیے کیونکہ مٹھائی میں بہت زوردار زہر ملا ہوا تھا۔وہ دن ہوٹل میں گزار کر جب اگلے دن ہم واپسی کے لیے بس اڈے پہنچے تو چودھری والی جگہ پر ایک نابینا فقیر بیٹھا نظر آیا۔چودھری اپنے اعمال کے ساتھ اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گیا تھا۔

+ + +

چند سالوں بعد ہی امجد اور میں چار چار بچوں کے باپ بن گئے تھے۔

وہ دوپہر کا وقت تھا میں زمینوں کا چکر لگا کر لوٹا۔ ہاتھ منہ دھو کر جیسے ہی میں چار پائی پر بیٹھا سعدیہ نے (شیتل) لسی کا کٹورا، روٹیوں کا چھابہ اور سالن میرے آگے رکھ دیا۔ گھر میں ملازمہ موجود ہونے کے باوجود وہ میرے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند کرتی اتنے سال گزر جانے کے باوجود اس کی محبت میں مجھے کوئی کمی یا ٹھہراؤ نظر نہیں آیا تھا بلکہ اس کی محبت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

''جان پتا ہے شہلا باجی اور امجد بھائی نے فصل کٹائی کے بعد مری جانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔''میں نے پہلا نوالا ہی منہ میں رکھا تھا کہ وہ آہستہ سے بولی۔

''پھر؟''میں نوالہ چباتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''اگر ہم بھی ان کے ساتھ......؟''

''نہیں ہم ادھر نہیں جائیں گے۔''اور پھر اس کی شکوہ کرتی نگاہوں کو دیکھ کر بولا۔

''ہم انڈیا جائیں گے۔ ٹھاکر چاچا، شیش ناگ اور تیرے دوسرے رشتہ داروں کو ملنے۔''

''سچ جان۔''وہ خوشی سے لرزتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

''ہاں شیتل بالکل سچ۔''میں مسکراتے ہوئے بولا اور اس نے سر میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

(ختم شد)

☆......☆......☆

ریاض عاقب کوہلر کی آنے والی کتابیں

* ابن الذبیحین ﷺ (سیرت پاک)
* دلدل (ناول)
* دو اور دو ایک کم پانچ (طنز و مزاح)
* جنونِ عشق (رومانوی ناول)
* بردہ (زیر طبع)
* وفا ہے ذات عورت کی (رومانوی ناول)